ISSN-2249-636X
ماہنامہ
دربھنگہ
تمثیلِ نو
اکیسویں صدی میں
اردو
صحافت
اور
دیگر تخلیقات...
مدیر اعزازی : ڈاکٹر امام اعظم
Meer Zaheer Abass Rustmani

پی جی شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ میں ۴؍اپریل ۲۰۱۵ء کو اردو جریدہ "تمثیل نو" دربھنگہ (جولائی ۲۰۱۴ء – جون ۲۰۱۵ء) کی رونمائی کرتے ہوئے (دائیں سے) ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ڈاکٹر ارشد جمیل، ڈاکٹر امام اعظم، پروفیسر انیس صدری (صدر، شعبۂ اردو)، پروفیسر رئیس انور اور پروفیسر عبدالرؤف

یوم آزادی (۱۵؍اگست ۲۰۱۵ء) کے موقع پر ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا کے مشاعرہ میں کلام پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم۔ دیگر شعراء میں (دائیں سے) شمیر یوسف (نقیب مشاعرہ)، احمد معراج، شگفتہ یاسمین غزل، عروسہ عرشی، مشتاق دربھنگوی، حلیم صابر، اشرف یعقوبی، سحر مجیدی، بشریٰ سحر وغیرہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے دو روزہ سیمینار بعنوان "اردو صحافت کے ۲۰۰ رسال" منعقدہ ہوٹل کریسٹ وو، کولکاتا مورخہ ۱۹؍ستمبر ۲۰۱۵ء میں (دائیں سے) پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر شہناز نبی، جناب سید فیصل علی، جناب ف س اعجاز، ڈاکٹر نصرت جہاں اور مقالہ پڑھتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم

مانو ریجنل سینٹر کولکاتا میں قومی یوم تعلیم مورخہ ۱۱؍نومبر ۲۰۱۵ء کے موقع پر منعقدہ تقریب میں (دائیں سے) جناب عبدالوارث سفر (استاد، مدرسہ عالیہ، کولکاتا)، پروفیسر طارق جمیلی (پورنیہ)، جناب ابواللیث جاوید (نئی دہلی) اور ڈاکٹر امام اعظم

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

اشاعت: پندرہواں سال	ماہنامہ "تمثیل نو" دربھنگہ	اجراء: مارچ ۲۰۰۱ء
شمارہ: ۲۹	جولائی ۲۰۱۵ء تا جون ۲۰۱۶ء	جلد: ۱۵

زرتعاون

فی شمارہ: ۱۵۰ روپے، سالانہ ۳۰۰ روپے، خصوصی تعاون: ۱۰۰۰ روپے، تاحیات (بھارت) ۱۰۰۰۰ روپے
پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): ۸۰۰ روپے، دیگر ممالک (سالانہ) ۲۰ امریکی ڈالر، ۳۰ پونڈ

رابطہ: مدیر "تمثیل نو" محلہ: گنگوارہ، پوسٹ: سارا موہن پور، دربھنگہ-846007، (فون: 06272-258755)

Email-imamazam96@gmail.com imamazam96@yahoo.com

پرنٹر، پبلشر و آنر ڈاکٹر امام اعظم نے دربھنگہ آفسیٹ پریس، دربھنگہ سے چھپوا کر
دفتر "تمثیل نو" اردو ادبی سرکل، محلہ: گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ۔ 846007 سے شائع کیا۔

ترتیب

مجھے کچھ کہنا ہے!

اردو جریدہ ''تمثیلِ نو'' مارچ ۲۰۰۱ء سے دربھنگہ میں جاری ہوا اور اب تک پورے آب و تاب کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ اردو کا رسالہ نکالنا بڑے جوکھم کا کام ہے۔ اس رسالے کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ہوتی رہی ہے اور اس کے کئی مخصوص شمارے مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ ناقدوں کے علاوہ پی ایچ ڈی کے طلبا بھی خصوصی طور پر اس سے استفادہ کررہے ہیں۔ گذشتہ شمارے پر بھی بہت سے خطوط آئے ہیں اور بیشتر ہمعصر اخبارات و رسائل نے تبصرے بھی شائع کئے ہیں۔

پیشِ نظر شمارہ اکیسویں صدی میں اردو صحافت کی پیش رفت پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل مضامین یقینی طور پر اردو صحافت کے ارتقائی جائزے میں اہم کردار ادا کررہے ہیں کہ ان کے بطون میں نئی معلومات ہیں، جن سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے گا، ایسا یقین ہے۔ اس شمارے میں ہمارے عہد کے مستند فکشن نگار صدیق عالم پر بھی دو مضامین ہیں، دیگر مستقل کالموں کے تحت بہت ہی معیاری تخلیقات شامل ہیں، جن سے قارئین کی آسودگی ہوگی۔ ''تمثیلِ نو'' کی یہ روایت رہی ہے کہ ادبی و ثقافتی خبریں اور وفیات کا کالم اتنا تفصیلی اور مستند ہوتا ہے کہ قارئین اسے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس شمارے کا ایک اہم مضمون ''مسجدِ اقصیٰ کا سفر'' ہے جو پروفیسر شمیم باروی کے مسجدِ اقصیٰ کے سفر کی روداد ہے۔ قارئین اسے پڑھ کر محظوظ بھی ہوں گے اور اپنے اندر حرارتِ ایمانی بھی پیدا کریں گے۔

''تمثیلِ نو'' میں اتنی ساری کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں کہ بیشتر قارئین کی یہ رائے ملتی ہے کہ یہ شمارہ 'تبصرہ نمبر' بن گیا ہے۔ ہم ان قلم کار حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو کتابیں بھیجتے ہیں اور ان مبصروں کے بھی شکر گزار ہیں جو اس جریدے کے لئے کتابیں پڑھ کر تبصرہ کرنے کی زحمت اٹھاتے ہیں۔ ''تمثیلِ نو'' کے خطوط کا کالم بھی اہم ہوتا ہے۔ اس میں گذشتہ شمارے پر ناقدانہ نظر ڈال کر ہماری حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ حسب سابق یہ تمام چیزیں اس شمارے میں بھی موجود ہیں۔

امید ہے کہ قارئین اس شمارے کو بھی پسند فرمائیں گے اور اپنی قیمتی رائے سے نوازیں گے۔

قارئینِ ''تمثیلِ نو'' کو عیسوی سالِ نو (۲۰۱۶ء) اور ہجری سالِ نو (۱۴۳۷ھ) کی ڈھیر ساری مبارک باد!

ادبی و ثقافتی خبریں

● قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی اور ساہتیہ اکاڈمی، دہلی کے تعاون سے سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ''مجاز کی شاعری اور اس کی میراث: بازدید'' کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار کا اہتمام ۲۶-۲۷ فروری ۲۰۱۵ء کو کیا گیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر زماں آزردہ نے کہا کہ ''مجاز اپنے عہد کا بڑا شاعر تھا جس نے اپنے عہد کے برافروختہ نوجوان نسل کے غم و غصے کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے کا کام کیا۔ اس نے زندگی کے نغمے گنگنائے، ترقی پسندی کے سائے میں شام اور صبح کی آزادی کے خواب دیکھے۔'' پروفیسر زماں آزردہ، پروفیسر شارب ردولوی، جناب قیصر شمیم اور کالج کے پرنسپل پروفیسر اقبال جاوید نے

مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے تقریب کا آغاز کیا۔ پروفیسر اقبال جاوید نے بتایا کہ اس دو روزہ سیمینار کے بعد آئندہ کالج کے زیرِ اہتمام ایک اور سیمینار کا انعقاد کیا جائے گا جو پرویز شاہدی کی شخصیت اور کارناموں پر محیط ہوگا۔ مجاز کی نظموں اور غزلوں کو معروف فنکار سہیل رانا نے اپنی مسحور کن آواز میں پیش کر کے سامعین کا دل جیت لیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر دیب پریا سانیال نے کی۔ پروفیسر شارب ردولوی نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ''مجاز کو میں نے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ وہ میرے قیام لکھنؤ کے زمانے میں اکثر میرے ہوسٹل کے کمرے میں آجاتے تھے۔ پھر مجاز میرے ہم وطن بھی تھے۔'' پہلے دن کے اختتامی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے حضرت قیصر شمیم نے کہا کہ سیمینار کے عنوان کے تحت اس بات کی تحریک دی گئی ہے کہ مجاز کو ان کی شاعری، ان کے میراث کو پڑھو، سمجھو اور دوبارہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو جس کا بڑی خوبصورتی سے مقالہ نگاروں نے مظاہرہ کیا۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر شارب ردولوی، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر نصرت جہاں، پروفیسر محمد نعمان خان، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر عمر غزالی، مقصود دانش، ڈاکٹر شبانہ نسرین، ڈاکٹر دیبا ہاشمی، زوجیب عالم، ڈاکٹر فرحت آرا کہکشاں نے مقالے پڑھے۔ سیمینار کنوینر ڈاکٹر نصرت جہاں نے کالج کے طلبا و طالبات اور معززین شہر کا شکریہ ادا کیا۔

● معروف نقاد، افسانہ نگار اور دانشور پروفیسر معین الدین جینابڑے (شعبۂ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی) کی ۲۰؍ مارچ ۲۰۱۵ء کو مانو کولکاتا ریجنل سینٹر آمد پر ان کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم نے کہا کہ موصوف کی آمد کی اطلاع کلکتہ یونیورسٹی کے سیمینار سے ملی۔ رابطہ ہوا اور وہ حاضر ہوئے۔ ۲۰۰۱ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریفریشر کورس میں ہم لوگ ساتھ تھے۔ اُن دنوں وہ ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔ ۲۰۱۲ء میں بہار یونیورسٹی مظفر پور کے ایک سیمینار میں صرف علیک سلیک ہوئی اور کئی برسوں کے بعد آج باضابطہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات، فکشن، شاعری اور موجودہ ادبی منظرنامے پر ڈاکٹر جینابڑے کی کافی نظر ہے۔ تحریر اور تقریر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شمیم حنفی وغیرہ کے بعد نئی نسل میں جینابڑے اردو تنقید کا ایک نمایاں نام ہے۔ معین الدین جینابڑے نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کلکتہ ریجنل سینٹر میں ڈاکٹر امام اعظم کی موجودگی سینٹر کی کامیابی کی ضامن ہے۔ امام اعظم ایک اچھے عالم، ادیب اور ادبی صحافی ہیں۔ علم و دانش سے ان کا تعلق سرسری نہیں۔ ان کا علمی انہماک اور اردو درسیات کے تعلق سے ان کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ میں خود کو بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کی دوستی کا شرف حاصل ہے۔ ان سے ہمارا تعلق خاطر دو دہائیوں کے عرصے کو محیط ہے اور اس دوران ان کی سنجیدہ و ثقہ شخصیت کے کئی پہلو مجھ پر روشن ہوتے رہے ہیں۔ تام کی برکتوں کی سعادت ڈاکٹر امام اعظم کو جس طرح میسر آئی ہے وہ اہلِ دنیا کے لیے حسبِ توفیق لائقِ رشک ہے۔ مانو کے اس علاقائی مرکز کے لیے یہ امر باعث خوش نصیبی ہے کہ امام اعظم اس کے سربراہ ہیں۔ ان کی ادارت میں نکلنے والا ادبی جریدہ ''تمثیلِ نو'' کے تازہ شمارے کی دھمک سنائی دے رہی ہے جو انھوں نے کلکتہ شہر کی منظوم تاریخ کی شکل میں پیش کیا ہے۔'' پھر موجودہ ادبی منظر

نامے پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر ''بزمِ شہرِ نشاط'' کے صدر جناب بلال حسن کے ساتھ صابر رضا شمسی ارولی، شاہد اقبال، محمد آفتاب عالم وغیرہ بھی موجود تھے۔

● گلوبل اسکول آف انڈیا، دھنباد کے زیرِ اہتمام مورخہ ۲۸ رمارچ ۲۰۱۵ء کی شام ڈاکٹر سیف اللہ خالد کی رہائش گاہ پر ڈاکٹر امام اعظم کی دھنباد آمد پر پروفیسر سیّد منظر امام کی صدارت میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی۔ نقابت کے فرائض شان بھارتی (مدیر ''رنگ'' دھنباد) نے خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے۔ اس موقع پر جناب نجم عثمانی نے ڈاکٹر امام اعظم کو معتبر شاعر اور دیانت دار صحافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھیں اردو سے بے پناہ محبت ہے۔ خود کو انھوں نے اردو کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین نے امام اعظم کو ایک منفرد اور مستند شاعر قرار دیا۔ جناب شان بھارتی نے ''تمثیلِ نو'' کے حوالے سے اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ صدرِ نشست پروفیسر سیّد منظر امام نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے جذباتی انداز میں کیا۔ صاحبِ اعزاز ڈاکٹر امام اعظم نے کہا کہ ''میں سنسکرت کا طالب علم تھا لیکن والدین نے ہمیں گھر میں اردو، عربی، فارسی کی تعلیم دی اس لیے مجھے اردو سے محبت ہوگئی اور اردو کا ہی ہوکر رہ گیا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اردو سے محبت کی وجہ سے ہی ہوں۔ اردو اتحاد اور تہذیب کی زبان ہے۔ آپ بھی اردو سے اپنے گھر کو آباد کیجیے۔ اردو آج مڈل کلاس اور غریبوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ بعد ازاں کولکاتا پر انھوں نے اپنی طویل نظم ''یہی کولکاتا ہے!'' کے کچھ بند سنائے جسے حاضرین نے داد سے نوازا۔ اس موقع پر ایک شعری نشست بھی ہوئی جس میں ڈاکٹر اقبال حسین، احمد فرمان، سہیل فصیحی، امتیاز دانش نگری، نجم عثمانی، شان بھارتی اور شہاب اختر نے اپنے کلام سنائے۔ آخر میں ڈاکٹر سیف اللہ خالد نے شعرا، ادبا، صحافی اور مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نشست کے خاتمے کا اعلان کیا۔

● اردو جریدہ ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ (جولائی ۲۰۱۴ء - جون ۲۰۱۵ء) کی رسمِ اجراء مورخہ ۳ راپریل ۲۰۱۵ء کو ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے پی۔جی شعبۂ اردو میں پروفیسر انیس صدری (صدر، شعبۂ اردو) کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ اس موقع پر رسمِ اجراء کرتے ہوئے پروفیسر انیس صدری نے کہا کہ ''تمثیلِ نو'' بے حد مقبول جریدہ ہے۔ میں جس دیار میں بھی جاتا ہوں، وہاں اس رسالے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شمارہ ۳۷۶ رصفحات پر مشتمل ہے اور ہر اعتبار سے متنوع ہے۔ اور شماروں کی طرح اس شمارے کی پذیرائی بھی ادبی حلقوں میں ہوگی۔ پروفیسر رئیس انور نے کہا کہ ''تمثیلِ نو'' کے تازہ شمارے میں کافی مواد جمع ہے۔ ریسرچ اسکالرس کے علاوہ عام قاری بھی اس سے استفادہ کریں گے۔ کلکتے کی منظوم اور منثور تاریخ بے حد محنت اور الگ زاویے سے لکھی گئی ہے جس میں اس دور کے کلکتے اور آج کے کولکاتا کی بازیافت ملتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ارشد جمیل، پروفیسر عبد الرؤف اور ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے تمثیلِ نو کے تازہ شمارے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ شمارہ اتنا ضخیم ہے اور کافی مواد اس کے اندر موجود ہے۔ نیز کولکاتا شہر کی تاریخ کو ڈاکٹر امام اعظم نے بالکل نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ مدیرِ اعزازی ڈاکٹر امام اعظم نے کہا کہ ''اردو کا رسالہ نکالنا جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔ ادھر کئی برسوں سے ''تمثیلِ نو'' کے موضوعاتی شمارے شائع ہو رہے ہیں اور موضوعاتی شمارے میں زیادہ دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ اگر اردو کے عام اور خاص

قاری اردو جریدے اور کتابیں خرید کر پڑھنے لگیں تو اردو کا بھلا ہوگا۔ اس شمارے میں شہر کولکاتا کے خصوصی مطالعہ کے علاوہ ڈاکٹر سید تقی عابدی اور پروفیسر منصور عمر (مرحوم) پر خصوصی گوشے ہیں نیز تحقیقی وتنقیدی مضامین، افسانے، انٹرویو، نظمیں، غزلیں، تبصرے، وفیات اور ادبی وثقافتی خبریں بھی اس شمارے کی زینت بڑھا رہی ہیں۔ بطور خاص کلکتہ کی منظوم تاریخ بھی شامل کی گئی ہے۔ اداریہ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' میں اردو زبان وادب کو درپیش مسائل کو سامنے لانے کی خاکسار نے سعی کی ہے۔

● مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی یاد میں ایک شاندار سہ روزہ ''جشنِ اقبال'' تقریبات کا انعقاد ۲۹-۳۱ رمئی ۲۰۱۵ء کو ہوا۔ ۲۹ رمئی کو افتتاحی تقریب کا اہتمام شہر کی خوبصورت جلسہ گاہ، نذرل منچ میں ہوا۔ اس رنگارنگ تقریب میں مغربی بنگال کی وزیر اعلیٰ محترمہ ممتا بنرجی نے علامہ اقبال کو بعد از مرگ ''ترانۂ ہند'' ایوارڈ سے نوازا جو علامہ کے پسر زادے اور پاکستان کے معروف قانون داں جناب ولید اقبال نے قبول کیا۔ اس اعزاز کو قبول کرنے کے لئے اکاڈمی نے پہلے علامہ اقبال کے صاحب زادے جسٹس جاوید اقبال کو مدعو کیا تھا، مگر وہ اپنی درازیٔ عمر اور ناسازیٔ طبیعت کے سبب تشریف نہیں لا سکے۔ اسی تقریب میں اکاڈمی کی جانب سے محترمہ ممتا بنرجی کو ''پاسبانِ اردو'' کا اعزاز بھی دیا گیا۔ افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے محترمہ ممتا بنرجی نے علامہ اقبال کو آفاقی شاعر قرار دیا جن کی شہرت، عظمت اور مقبولیت جغرافیائی سرحدوں سے بالاتر ہے۔ محترمہ ممتا بنرجی جو اپنی اردو نوازی کے لئے بے حد مقبول ہیں، نے اسی منچ سے یہ اعلان بھی کیا کہ عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا میں اردو کا شعبہ کھولا جائے گا اور جلد ہی اس میں ''اقبال چیئر'' کا قیام بھی ہوگا۔ وزیر اعلیٰ کی نظموں پر مشتمل کتاب ''تمنا'' کی رونمائی بھی اس تقریب میں کی گئی۔ افتتاحی تقریب کی نظامت کا فریضہ معروف فلم اداکار جناب رضا مراد نے اپنی پاٹ دار مگر سلیس وشستہ زبان میں کیا جس سے حاضرین کافی محظوظ ہوئے۔ اسی تقریب میں ادبی کتب پر اکاڈمی کے سالانہ انعامات بھی تقسیم کئے گئے۔ افتتاحی تقریب کے خاتمے پر ۹ ربجے شب روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کولکاتا کی جانب سے ایک شاندار عشائیے کا اہتمام گینگیس بینکٹ، ہوٹل پارک میں کیا گیا تھا جس میں اخبار کے مدیر اعلیٰ محترم وسیم الحق اور محمد ندیم الحق (ایم پی) نے مہمانوں کی عزت افزائی کی۔ تقریبات کے دوسرے دن ۳۰ رمئی کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی سینٹرل اردو لائبریری میں خوبصورت اور پروقار 'گوشۂ اقبال' کا افتتاح ہوا جس میں علامہ اقبال کے فن اور شخصیت کے حوالے سے نادر ونایاب کتب رکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد علامہ اقبال کی حیات وخدمات پر بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد اکاڈمی کے مولانا ابوالکلام آزاد آڈیٹوریم میں ہوا جس میں ملک و بیرونِ ملک سے آئے ۱۱ رمقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کئے، جن میں پروفیسر خالد ندیم (سرگودھا، پاکستان)، پروفیسر عبدالحق (دہلی)، پروفیسر شارب ردولوی (لکھنؤ)، ڈاکٹر اقبال مسعود (بھوپال)، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر (ممبئی)، ڈاکٹر شیخ عقیل احمد (دہلی)، ڈاکٹر نعمان خان (نئی دہلی)، ڈاکٹر زین رامش (ہزاری باغ)، ڈاکٹر شمیل اختر (نئی دہلی)، ڈاکٹر شاہ حسین احمد (آرہ) محترمہ سپرنا باسو (دہلی) وغیرہ شامل تھے۔ تقریبات کے آخری دن ۳۱ رمئی ۲۰۱۵ء کی شام رابندر ناتھ ٹیگور کی یادگار جلسہ گاہ رابندر سدن میں شاندار بین الاقوامی مشاعرے کا

انعقاد کیا گیا جس میں بیرونِ ملک سے عزیز نبیل (قطر) اور جلیل نظامی (قطر) تشریف فرما تھے۔ مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے فرمائی جب کہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے۔ دیگر شعرا میں ڈاکٹر نسیم نکہت، پاپولر میرٹھی، پاپولر میرٹھی، چھلو لکھنوی، وسیم بریلوی، عزم شاکری، منظر سلطان، سنیل کمار تنگ، شہزادہ انجم برہانی، انجم بارہ بنکوہ، قیصر شمیم، حلیم صابر، شبیر ابروی، شگفتہ یاسمین غزل، روشن لال روشن، حبیب ہاشمی وغیرہ شامل تھے۔ تقریبات کو کامیاب بنانے میں ممبرِ پارلیمنٹ (لوک سبھا) اور سابق وزیر سیاحت حکومت ہند جناب سلطان احمد، ممبرِ پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) اور ایگزیکٹیو ایڈیٹر روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' جناب ندیم الحق اور اکاڈمی کے وائس چیئرمین پروفیسر سیّد منال شاہ القادری نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔

● قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے نئے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم (اصل نام: سیّد علی کریم، وطن گیا، بہار) نے ۵؍جون ۲۰۱۵ء کو اپنا عہدہ سنبھالا۔ انھوں نے اپنی استقبالیہ تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''میں اردو کا خادم ہوں اور اردو کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کے ۲۰؍ریجنل مراکز کی تجویز وزارت کو سونپی جائے گی تاکہ کونسل کے دائرۂ کار کو پورے ملک میں وسعت اور رفتار دی جائے۔ پی ایچ ڈی اور ایم فل کے ۵۰؍ریسرچ اسکالرز کو وظائف دینے کا بھی منصوبہ ہے تاکہ اردو میں تحقیق کو بڑھاوا دیا جائے۔''

واضح ہو کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں اور اس کے صدر کے عہدے پر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے دورِ صدارت میں ہی شعبۂ اردو کی پچاسویں سالگرہ کا جشن بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا جس کی دھمک برسوں تک سنائی دے گی۔ ۲۰۱۴ء میں کینیڈا کی ایک ادبی انجمن ''رنگ منچ کینیڈا'' نے انھیں تاحیات خدمات ایوارڈ سے نوازا ہے۔ امید ہے کہ موصوف اپنے وژن، ٹھوس منصوبہ بندی اور وسیع النظری کے ساتھ ملک میں اردو کے فروغ کیلئے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کریں گے۔ اب تک ان کی ۲۶؍کتابیں (تصنیفات و تالیفات) منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں ''عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ'' (۱۹۸۷ء)، ''قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ'' (۲۰۰۱ء-۱۹۹۲ء)، ''اردو فکشن کی تنقید'' (۱۹۹۶ء)، ''جدید تنقید کا منظرنامہ: اساس، استنباط'' (۲۰۰۳ء)، ''کلیاتِ نظام اردو خطبات: جلد اول-دوم'' (۲۰۱۰ء-۲۰۱۴ء)، ''نوطرزِ مرصع: مع فرہنگ و مقدمہ'' (۲۰۱۴ء) اہم ہیں۔ ان کے زیرِ نگرانی کثیر تعداد میں طلبا و طالبات نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ہیں۔

● ۹؍جون ۲۰۱۵ء کو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی مجلسِ عاملہ میں حضرت مولانا سیّد محمد ولی رحمانی (سجادہ نشیں، خانقاہ رحمانی مونگیر) کو بورڈ کا کارگزار جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ مولانا محترم طویل مدت سے بورڈ کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور سکریٹری ہونے کے ساتھ بورڈ کے تحت چلنے والی تحریکِ اصلاحِ معاشرہ کے کنوینر بھی ہیں۔ ان کی قیادت میں بورڈ نے آئینی حقوق بچاؤ تحریک بھی کامیابی کے ساتھ چلائی تھی۔ اپنی مدبرانہ و عالمانہ صلاحیتوں کے سبب موصوف کو دو مرتبہ بہار قانون ساز کاؤنسل کا چیئرمین بھی بنایا گیا تھا۔ اس موقع پر شہر دربھنگہ کے معروف آرتھو سرجن ڈاکٹر اجیر الحق نے مولانا محترم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا کی ہے کہ ان کی موجودہ ذمہ داری مسلم پرسنل لاء بورڈ کے لئے زیادہ سے زیادہ سودمند ثابت ہو۔

• بورڈ آف ٹرسٹیز، شفیع مسلم ہائی اسکول، دربھنگہ کے چیئرمین ڈاکٹر اجیر الحق (آرتھوسرجن) کے مطابق شفیع مسلم ہائی اسکول اور ڈاکٹر ذاکر حسین ٹیچرس ٹریننگ کالج کے احاطے میں ۱۶؍جون ۲۰۱۵ء بروز منگل مطابق ۲۸؍شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ بعد نماز مغرب نوتعمیر شدہ مسجد کا افتتاح ہوا۔ واضح ہو کہ شفیع مسلم ہائی اسکول کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا قیام ۱۹۳۳ء میں عمل میں آیا تھا اور عرصے سے وابستگان اور متعلقین کی دیرینہ خواہش تھی کہ اس کے احاطے میں ایک مسجد کا قیام عمل میں آئے تاکہ کیمپس میں موجود افراد کو نماز کی ادائیگی کے لیے دور نہ جانا پڑے۔ یہ ادارہ بالکل لب سڑک ہے اور اس کے احاطے میں مذکورہ بالا دو درس گاہوں کے علاوہ شفیع مسلم آئی ٹی آئی و دیگر مراسلاتی کورسز بھی کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر اجیر الحق (چیئرمین، بورڈ آف ٹرسٹیز)، ایس ایم جاوید اقبال (سکریٹری، شفیع مسلم ہائی اسکول)، ڈاکٹر شارق حسین (سکریٹری، ڈاکٹر ذاکر حسین ٹیچرس ٹریننگ کالج)، ڈاکٹر مزمل حسین آرزو (پرنسپل، ڈاکٹر ذاکر حسین ٹیچرس ٹریننگ کالج)، ڈاکٹر ابصار الحق وغیرہ موجود تھے۔

• ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرشاد تیواری کی صدارت میں ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ گوہاٹی میں ۲۲؍جون ۲۰۱۵ء کو ہوئی جس میں ۲۳؍ہندستانی زبانوں کے لیے یووا ایوارڈ (یوتھ ایوارڈ) ۲۰۱۵ء، ۲۴؍ہندستانی زبانوں کے لیے بال ساہتیہ پرسکار (ادب اطفال ایوارڈ) ۲۰۱۵ء کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں یوتھ ایوارڈ کے لیے جواں سال شاعر امیر امام کو ان کی کتاب 'نقشِ پا ہواؤں کے' (شعری مجموعہ) کے لئے منتخب کیا گیا۔ امیر امام کا شمار اردو کے ذہین نوجوان شاعروں میں ہوتا ہے۔ ادب اطفال ایوارڈ کے لیے اردو میں بانو سرتاج کی کتاب 'بچوں کے لیے یک بابی ڈرامے' کو منتخب کیا گیا۔ بانو سرتاج کی بچوں کے لیے اب تک ۲۸؍کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں 'دنیا کارٹون اور کامک کیریکٹرز کی'، 'جنگل میں منگل'، 'پکیا اور پری چھم'، 'کہانی میں کہانی پیڑوں کی کہانی'، 'مرغے میاں کی ککڑکوں' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بانو سرتاج گزشتہ تیس برسوں سے ہر عمر کے بچوں کے لیے کتابیں لکھ رہی ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے نظموں کے ساتھ ڈرامے اور ناول بھی لکھے ہیں۔ وہ سترہ برسوں سے جنتا کالج آف ایجوکیشن (بی ایڈ) کی پرنسپل ہیں۔ دیگر یوتھ انعام یافتگان میں بانسدا اشیکھر (انگریزی)، اندرا دانگی (ہندی)، نرائن جھا (میتھلی)، سمرن ڈھالیوال (پنجابی)، رتو پریہ (راجستھانی)، رشی راج جانی (سنسکرت) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سال کشمیری میں ایوارڈ نہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ایوارڈ ان کتابوں کے لئے دئے گئے ہیں جن کے لکھنے والوں کی عمر یکم جنوری ۲۰۱۵ء کو ۳۵؍سال یا اس سے کم ہے۔ یہ ایوارڈ پچاس ہزار روپے اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔

• الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ گنگوارہ کے زیر اہتمام 'ادبستان' میں ۱۶؍رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ بمطابق ۴؍جولائی ۲۰۱۵ء کو ایک مخصوص دعوت افطار کا اہتمام کیا گیا۔ افطار سے قبل دعا کا اہتمام کیا گیا جس میں رمضان المبارک کی عبادات کی قبولیت کے ساتھ محمد ظفر المنان ظفر فاروقی مرحوم کی مغفرت کے لئے خصوصی طور پر دعائیں کی گئیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر عالم گیر شبنم نے کہا کہ مرحوم والدین کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی اور دیگر نیک کام صدقۂ جاریہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ یہاں

تعلیمی مرکز قائم ہو جس سے قوم وملت کے بچے مستفید ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان کے لائق فرزند ڈاکٹر امام اعظم ان کے اس خواب کو پورا کر چکے ہیں۔ آج اس تعلیمی ہب میں حکومت بہار سے منظور شدہ مدرسہ، حکومت ہند سے منظور شدہ آئی ٹی آئی، حکومت بہار سے منظور شدہ مدرسۃ البنات فاروقیہ (وسطانیہ درجہ) مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی کا ریسورس سینٹر اور نادر کتب کی ایک لائبریری قائم ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان و ادب کے فروغ کیلئے مارچ ۲۰۰۱ء سے ادبی جریدہ ''تمثیل نو'' کی پابندی سے اشاعت ہو رہی ہے۔ دعوت افطار میں ڈاکٹر عالمگیر شبنم، اعجاز کریم شوکت، سیّد متین اشرف، محمد کریم اللہ، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، محمد عباس علی، محمد علاؤالدین (ایڈوکیٹ)، مولانا محمد مستقیم احمد، مولانا عبدالصمد، بزمی، عزمی، اسامہ حسن، حزیفہ حسن، رافع حسن، حافظ محمد سلطان علی، نوا امام، شرجیل احمد احسانی، فضا امام اور ڈاکٹر امام اعظم وغیرہ نے شرکت کی۔ سابق پولیس افسر جناب محمد ظفر المنان ظفر فاروقی مرحوم (رحلت: ۱۳ر رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ) کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام ۱۳ر رمضان المبارک کو مدرسۃ البنات فاروقیہ، گنگوارہ کے صدر مدرس مولانا محمد مستقیم کی قیادت میں کیا گیا جس میں اہلِ خانہ کے علاوہ مولانا عبدالصمد و دیگر طلباء بھی شامل ہوئے۔

● ''عبید حارث کے فن میں ایک شاعر اور ایک مصور دونوں کی کارفرمائی صاف طور سے محسوس ہوتی ہے اور یہی اس شعری مجموعے ''اطراف'' کی نمایاں شناخت ہے۔'' ان الفاظ میں صدر جلسہ ہز ہائی نس مولانا امیر الدین ملک (پیشوائے اتباع ملک بدر) نے نئی نسل کے ذہین شاعر عبید حارث کی ہمت افزائی کرتے ہوئے نیشنل ہیومن فارنیڈ فل فاؤنڈیشن، ناگپور کے زیر اہتمام بتاریخ ۲۰ر جولائی ۲۰۱۵ء بوقت شب منعقدہ پروگرام میں ''اطراف'' کا اجرا کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی اور پروفیسر دانش غنی نے اپنے مقالات سے عبید حارث کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل اور ڈاکٹر ارشد جمال نے اپنی تقریر میں عبید حارث کی تازہ کاری اور Boldness کی تعریف کی۔ اس جلسہ میں فائن آرٹ گروپ کامٹی اور وِدربھ مائنارٹی ملٹی پرپز رورل ڈیولپمنٹ ایجوکیشنل سوسائٹی، ناگپور نے میمنٹو، شال اور گلدستہ سے شاعر کا خیر مقدم کیا نیز ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی اور پروفیسر نصرت مینو نے تحائف پیش کیے جبکہ صادق الزماں صاحب (ڈپٹی ڈائرکٹر ٹیکسٹائلز، حکومت مہاراشٹر) نے ''اطراف'' کی ایک جلد مبلغ پانچ ہزار روپے میں خرید کر اپنی ادب نوازی کا ثبوت دیا۔ آخر میں عبید حارث نے اپنی غزلوں اور نظموں سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ اس پروگرام کی نظامت محمد ایوب صاحب نے فرمائی اور خالد انور کے اظہار تشکر پر جلسے کا اختتام ہوا۔

● یکم اگست ۲۰۱۵ء کو ادارہ ''ہم نوا'' کولکاتا کا افتتاحی پروگرام اور عالمی مشاعرہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے مولانا ابوالکلام آزاد اوڈیٹوریم میں شام چھ بجے منعقد ہوا۔ مسلسل بارش کے باوجود اس پروگرام میں ادباء، شعراء، صحافی، وکلاء اور ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ مشاعرے کی صدارت حضرت قیصر شمیم نے [illegible] کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیے۔ مہمانانِ خصوصی کی [illegible] سے اسٹیج پر جناب سید شہاب الدین حیدر، جناب حفیظ الرحمٰن، جناب شاہ محمد قادری، جناب خالد عباد اللہ، ڈا[illegible] امام

اعظم، جناب قمر الدین ملک وغیرہ رونق افروز تھے۔ تقریب کا آغاز جناب غلام مدنی قادری نے تلاوت قرآن پاک سے کیا اور جناب سحر مجیدی نے نعتیہ کلام پیش کیا۔ اس کے بعد شعراء ومہمانان کرام کا استقبال ''ہم نوا'' کے سکریٹری جناب فراغ روہوی اور ان کے معاون جناب سید عثمان جاوید نے مشترکہ طور پر صافہ بندی اور گلدستے سے کیا۔ سب سے پہلے ادارہ ''ہم نوا'' کے تعلق سے اظہار خیال کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ادارے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی گئی ساتھ مفید مشورے بھی روشن ہوئے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں جناب سید شہاب الدین حیدر' جناب حفیظ الرحمٰن' جناب شاہ محمد قادری' آچاریہ جمال احمد جمال (مروئی والا) جناب خالد عباد اللہ' جناب قمر الدین ملک' جناب پرویز اقبال و دیگر مقررین صاحبان نے اپنی اپنی بات سامنے رکھی۔ تمام مقررین نے ادارہ ''ہم نوا'' کی تشکیل و بنیاد کو مغربی بنگال کے لیے خوش آئند قرار دیا۔ مشاعرے کے تعلق سے حضرت قیصر شمیم نے کہا کہ ترقی پسند تحریک شروع ہونے سے قبل مشاعرے کا افتتاح مشاعرے کے صدر کیا کرتے تھے۔ آج اتنے برسوں بعد اس روش کی یاد تازہ کردی گئی۔ شاہی دربار اور خواص کی محفلوں سے مشاعرہ کا سلسلہ رفتہ رفتہ عوام تک پہنچا تو مشاعرے کے افتتاح میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ تقریری دور کے بعد عالمی مشاعرہ کے خوبصورت دور کا آغاز ہوا۔ اس یادگار مشاعرے میں جن شعراء و شاعرات نے اپنی شرکت درج کرائی ان میں دوحہ قطر سے تشریف لائے مہمان شاعر جناب افتخار راغب' جناب خورشید علیگ (بحرین)' جناب دلشاد نظمی (دوبئی)' جناب جلال عظیم آبادی (بنگلہ دیش)' جناب فاروق عادل (لکھنؤ)' جناب سلیم تابش (لکھنؤ)' جناب خورشید دلدار نگری (غازی پور)' جناب حبیب ہاشمی' ڈاکٹر امام اعظم' آچاریہ جمال احمد جمال (مروئی والا)' جناب فراغ روہوی' جناب خمیر یوسف' جناب اکبر حسین اکبر' ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی' جناب عمران راقم' جناب ارشاد آرزو' جناب نسیم فائق' جناب نوشاد مومن' جناب ابوالکلام نامی' محترمہ ریحانہ نواب' محترمہ شگفتہ یاسمین غزل' محترمہ عروسہ عرشی' جناب ارم انصاری' کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ عالمی مشاعرہ ۱۰ بجے شب کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ دیگر اہم مہمانوں میں جناب پرویز اقبال' جناب فرید خاں' جناب صادق ضیا' جناب مظہر ربانی بیگ' محترمہ عاصمہ سعید وغیرہ شامل تھے۔ اخیر میں ادارہ ''ہم نوا'' کے جوائنٹ کنوینر جناب سید عثمان جاوید نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

● ایم ایم ماڈل اسکول، امداد علی لین کولکاتا میں کولکاتا ورکنگ جرنلسٹ اینڈ رائٹرس فورم کے زیر اہتمام روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ کے مدیر ایس ایم اجمل فرید کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد ۹ راگست ۲۰۱۵ء کو ہوا جس میں ذرائع ابلاغ سے جڑی ہوئی اہم شخصیات اور سماج کے مختلف شعبوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ جواں سال صحافی نوراللہ جاوید کے تلاوت قرآن مجید کے بعد مانو کے کولکاتا ریجنل ڈائریکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے مرحوم کے اوصاف حمیدہ بیان کرتے ہوئے ان کے پسماندگان اور اہل خاندان کے بارے میں شرکائے مجلس کو واقف کرایا اور خراج عقیدت کے طور پر اجمل فرید مرحوم کے نام ایک منظوم تعزیت ''بیاد اجمل فرید'' بھی پیش کی۔ مرحوم کی یاد میں نواوہ کے بزرگ شاعر احسان ثاقب کی نظم ''رہرو ملت بھی چل بسے'' کو محمد شہاب الدین ویشالوی (ادب نواز) نے پیش کیا۔ بعد ازاں اورینٹل چیمبر آف کامرس کے صدر نشیں شعیب احمد فیصل نے مرحوم کی خوبیاں کرتے ہوئے

ان کی وفات حسرت آیات پر رنج وغم کا اظہار کیا۔ آچاریہ جمال احمد جمال (مروئی والے) نے مرحوم سے اپنی دو ملاقاتوں کا ذکر کیا اور کہا کہ دونوں ہی ملاقاتوں میں انھوں نے ایک انسان کی تمام خوبیوں کا مرقع مرحوم کی ذات میں پایا۔ انھوں نے کہا کہ شاعر، ادیب، صحافی مرتے نہیں ہیں وہ اپنی تخلیقات میں زندہ رہتے ہیں۔ بنگلہ سہ روزہ ''میزان'' کے مدیر مسیح الدین نے کہا کہ وہ ہر چند مرحوم سے براہ راست واقف نہیں تھے لیکن اس جلسے میں آ کر پتہ چلا کہ وہ گونا گوں خوبیوں کے حامل تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ جلسہ کے مہمانِ خصوصی معروف سماجی شخصیت جناب ناصر احمد (مالک پندرہ روزہ ''استقلال'' کولکاتا) نے مرحوم سیّد محمد اجمل فرید کو ایسا دیدہ ور شخص بتایا جو نرگس کی ہزاروں برس کی بے نوری کے بعد خاکِ گیتی سے پیدا ہوتا ہے اور اپنی روشنی سے ہر سُو تابانی بکھیرتا ہے۔ انھوں نے ملّی کاموں کے لئے مرحوم کی ستائش کی۔ ملّی اتحاد پریشد کے سکریٹری جناب عبدالعزیز کی دعاؤں کے ساتھ جلسے کا خاتمہ ہوا۔ شرکائے مجلس میں پروفیسر محمد سلیمان خورشید، روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کولکاتا کے محمد فاروق، یواین آئی اردو سروس کے نوراللہ جاوید، ظفر جنید فاطمی، شکیل احمد، شکیل افروز اور دیگر شامل تھے۔

● مسکان فاؤنڈیشن، رشڑا، ضلع ہگلی (مغربی بنگال) کی جانب سے ضرورت مند طلبا کی حوصلہ افزائی کے لئے ۲۱ر اگست ۲۰۱۵ء کی شام رشڑا کے چمپا روڈ پر ایک شاندار تعلیمی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں مادھیامک اور ہائر سیکنڈری امتحانات میں علاقے کی بچیوں کے درمیان ٹاپ کرنے والی شگفتہ یاسمین اور عظمیٰ شفیق اشفاق کو ان کی بہترین کارکردگی کی بنیاد پر لیپ ٹاپ دئے گئے جب کہ بہتر نمبر لانے والے فرسٹ ڈویژن کے ۸۴ر بچے بچیوں کے درمیان وظیفہ کا چیک تقسیم کیا گیا۔ رشڑا بستی میں اپنی نوعیت کے اس پہلے جلسے اور بچوں کی حوصلہ افزائی کے پروگرام میں لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کر کے اپنی اخلاقی حمایت کا مظاہرہ کیا اور قانونی پسماندگی کے خلاف اس فاؤنڈیشن کی جدوجہد کو سراہا۔ پروگرام کا آغاز حافظ سعید کی تلاوت کلام پاک سے ہوا جب کہ نائلہ انجم، شائقہ انجم اور فریدہ خاتون نے نعت شریف پیش کی۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب شمس الزماں انصاری (ایم ایم آئی سی، کولکاتا میونسپل کارپوریشن) نے اپنے خطاب میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بنگال میں مسلمانوں کا اپنا میڈیکل کالج یا انجینئرنگ کالج نہیں ہے۔ انھوں نے جنوبی ہند میں قائم اداروں کے طرز پر کولکاتا میں بھی ایسے تعلیمی اداروں کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ۱۰۰ر ایسے مسلمان اس پروجیکٹ کے لئے مالی قربانی دینے کو تیار ہو جائیں تو یہ پروگرام نہایت آسانی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ نیز انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر اس پروجیکٹ کے لئے مالی تعاون کے ساتھ لوگ آگے بڑھیں تو وہ خود ۲ر کروڑ روپے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ رشڑا کے بچوں کو بامقصد تعلیم حاصل کرنے اور ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کا مشورہ دیتے ہوئے انھوں نے رشڑا میں اچھے کوچنگ سینٹر کا قیام کے لئے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا۔ بزمِ شہر نشاط کے صدر جناب بلال حسن نے مسکان فاؤنڈیشن کی کوششوں کی ستائش کی اور کہا کہ اس ادارے نے ضرورت مند طلبا اور طالبات کی امداد کے لئے اس جس طرح سے منصوبہ بنایا ہے، وہ مثالی ہے۔ انھوں نے مسکان فاؤنڈیشن کی تعلیمی کمیٹی کے چیئرمین فیروز انجم کی تعریف کی اور ان کے نیک جذبوں کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس بھی ادارے کا ایک حصہ بن چکے ہیں اور ہر قدم

پر اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ معروف سماجی خدمات گار اور فورم فار آر ٹی آئی ایکٹ اینڈ اینٹی کرپشن کی سربراہ ایڈوکیٹ نازیہ الٰہی خان نے کہا کہ علم ایک ایسی نعمت ہے جو انسان کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔ انھوں نے کہا کہ کچھ کر دکھانے کا حوصلہ رکھنے والوں کے سامنے کبھی کوئی راہ بند نہیں ہوتی۔ طالب علم کی زندگی پانی کی طرح ہوتی ہے جو اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ دور کر کے اپنا راستہ خود بنالیتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ مزدوروں کی اس بستی میں ایسے لعل و گہر بھی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی صفر سے شروع کی لیکن آج وہ دوسروں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ انھوں نے طالب علموں کے لئے اپنے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ دیگر مہمانان کرام جنھوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر پروگرام میں حصہ لیا اور اپنی تقریروں سے طلبا و طالبات کو حوصلہ دیا ان میں ڈاکٹر شکیل اختر، مانو ریجنل سینٹر کولکاتا کے ڈائریکٹر ڈاکٹر امام اعظم، جبریل انٹرنیشنل اسکول کولکاتا کے سربراہ ڈاکٹر صباح اسماعیل ندوی، اسمبلی آف اینجلز اسکول کے ڈائریکٹر ایس ایم ذکی، ڈاکٹر شکیل احمد، ابن حمید چاپدانوی اور پرویز بھٹا چاریہ و دیگر شامل تھے۔ پروگرام کی نقابت خواجہ احمد حسین نے بخوبی انجام دی جبکہ سرفراز انصاری نے انکا تعاون کیا۔ شمس الزماں انصاری نے پروگرام سے پہلے ایک لاکھ روپے کا تعاون کیا اور آئندہ سال کے پروگرام کیلئے بھی ایک لاکھ روپے کا تعاون پیش کیا۔ جناب بلال حسن نے ۵۰؍ ہزار روپے کا تعاون کیا اور آئندہ پروگرام کے لئے مزید ۵۰؍ ہزار روپے کا تعاون کرنے کا اعلان کیا۔ مسکان فاؤنڈیشن تعلیمی کمیٹی کے چیئرمین فیروز انجم، صدر محمد فاروق اور سکریٹری شہزادہ شاہد اقبال نے رشڑا کے کامیاب طلبا و طالبات کی حوصلہ افزائی کی۔ پروگرام کے آخری میں طلبا نے ایک ڈراما اسٹیج کیا جس میں مسلم لڑکیوں کو پیش آنے والے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا۔ اس جلسے کو کامیاب بنانے میں رشڑا ورکنگ کمیٹی کے اراکین احسان احمد، ماسٹر محمد نسیم، پرویز انجم، ماجد خریشی، شوکت علی، شرافت حسین و دیگر نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس موقع سے شمس افتخاری، احمد معراج، عدنان حسن وغیرہ بھی موجود تھے۔

● پندرہ روزہ ''استقلال'' کے زیر اہتمام جمہوریت اور اقلیت کے عنوان سے انڈین میوزیم کے آسوتوش ہال میں مورخہ ۲؍ اگست ۲۰۱۵ء کو ایک قومی سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا جناب التمش کبیر نے جمہوری نظام اور اقلیتوں کے حقوق کے عنوان سے اپنے خطاب میں کہا ہندوستان کے آئین میں اقلیتوں چاہے وہ لسانی اقلیتیں ہوں، سب کو یکساں حقوق، یکساں درجہ دیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزاد نے ملک کی آزادی کے بعد سب سے زیادہ تعلیم پر توجہ دی کیوں کہ وہ جانتے تھے تعلیم قومی ترقی کے لئے کلید کا درجہ رکھتی ہے۔ سابق چیف الیکشن کمشنر جناب ایس وائی قریشی نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ ووٹ ہمارا صرف جمہوری حق نہیں بلکہ ہماری قومی ذمہ داری کا حصہ ہے۔ ملی رہنما مولانا اسرار الحق قاسمی (ایم پی) نے غیر جمہوری قوتوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غیر جمہوری طاقتیں ملک کی سالمیت و جمہوریت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ اس ملک کے غریب و کمزور عوام کو متحد ہونا ضروری ہے۔ مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کولکاتا کے ڈائریکٹر جناب سیتارام شرما نے کہا کہ مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔ وہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ ملک تقسیم ہو۔ انھوں نے آزادی کے بجائے ہندو۔ مسلم اتحاد کو پسند کرنا بہتر سمجھا۔ تھامس ڈی سوزا

نے کہا کہ ملک کا شہری ہونا سب سے بڑے فخر کی بات ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اقلیتوں سے ہی اس ملک کی جمہوریت باقی ہے۔ اس لیے اقلیتوں پر جب جب ظلم ہوا ہے، تب تب اس ملک کی جمہوریت پر منفی اثرات پڑے ہیں۔ ممتاز صحافی اور سابق ایم پی راجیہ سبھا جناب احمد سعید ملیح آبادی نے کہا کہ اگر مولانا آزاد باحیات ہوتے تو آج اقتدار پر بیٹھی فسطائی قوتیں انھیں جیل میں ڈال دیتیں کیوں کہ مولانا فسطائیت کے خلاف اور ہندو۔ مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ باطل کو ایک دن مٹنا ہوگا جس طرح فرنگی کو بھی ہمارے ملک سے جانا پڑا۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز جناب ناصر احمد کی افتتاحی تقریر سے ہوا جب کہ صدارت مغربی بنگال اسمبلی کے سابق اسپیکر ہاشم عبدالحلیم نے کی اور نقابت کے فرائض ڈاکٹر محمد منصور عالم نے انجام دیئے۔ اس سیمینار کے دوسرے سیشن میں مولانا خالد غازی پوری نے اسلام اور جمہوریت کے حوالے سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ قوم ترقی کی معراج تک نہیں پہنچ سکتی جب تک اس قوم کے لوگوں میں جرأت پیدا نہ ہو۔ اعجاز احمد اسلم (مدیر اعلیٰ ''ریڈینس ویوز'' ویکلی) نے کہا کہ ہم ووٹروں کی کیا حیثیت ہے یہ ہر ووٹر ہی بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ مالدار مزید مالدار بنتا جا رہا ہے اور غریب غربت کی سطح سے نیچے جا رہا ہے۔ جناب سوبھن سنگھ عطیانہ، جسٹس بابولال جین، جناب کلیان چودھری، پروفیسر معید الاسلام وغیرہ نے بھی جمہوریت اور اس کی اہمیت کے تعلق سے اپنی قیمتی آرا پیش کیں۔ صدر سیمینار جناب ہاشم عبدالحلیم نے کہا کہ دستور نے ہم اقلیتوں کو حقوق دیے ہیں جنھیں کوئی بھی سلب نہیں کر سکتا۔ ہمیں چاہئے کہ پوری بیداری کے ساتھ حق رائے دہندگی کا استعمال کریں تاکہ ایسی حکومت قائم ہو جو ہم سبھوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ اخیر میں ''استقلال'' کے مدیر سلمان اختر نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ شہر اور بیرون شہر کی معزز شخصیات اس سیمینار میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھیں۔

● جناب مشتاق احمد نوری معروف افسانہ نگار، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں اور وہ بہار سرکار کی ملازمت میں ڈپٹی ڈائریکٹر (آئی پی آر ڈی) کے عہدہ سے سبکدوش ہو چکے ہیں جہاں ان کی کارکردگی نمایاں رہی۔ ملازمت کے دوران ہی انھوں نے تین سال (۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۶ء) بہار اردو اکاڈمی کے سکریٹری کا عہدہ بھی سنبھالا تھا۔ اردو سے ان کی محبت اور ان کے کام کرنے کے طریقے سے بہار سرکار اچھی طرح واقف ہے، اسی لیے ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھیں پھر سے اگست ۲۰۱۵ء میں بہار اردو اکاڈمی کا سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ اردو داں حلقہ کے لیے یہ خبر انتہائی باعثِ مسرت ہے کہ بہار اردو اکاڈمی کے ذریعہ نوری صاحب اردو کی جڑوں کو مزید مضبوط کریں گے اور اس کی نشو و نما میں نمایاں کارکردگی کا ثبوت دیں گے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے بیان میں کہا کہ مشتاق احمد نوری صاحب کی انتظامی صلاحیت بے حد عمدہ ہے۔ وہ بڑے سلیقے سے کام کرتے ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی پیدائش ۷؍مئی ۱۹۵۰ء کو گوگی بوتھا، فاربس گنج، ارریہ میں ہوئی۔ وہ بی ایس سی، بی ایڈ اور ایم ایڈ کے بعد حکومت بہار کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ سے وابستہ ہوئے۔ موصوف ۱۹۶۷ء سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے اور خطوط اردو جریدہ ''تمثیلِ نو'' میں تواتر سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان سے میرے مراسم اس وقت سے ہیں جب وہ سمستی پور (بہار) میں پوسٹیڈ تھے۔ نومبر ۲۰۱۳ء میں

کولکاتا میں اپنے دیرینہ رفیق اور معروف صنعت کار جناب جمیل منظر کے یہاں ایک تقریب میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے اور ہوٹل گریسٹ ووڈ میں ان کے مہمان رہے۔ پھر مانور ینجل سینٹر کولکاتا میں مولانا آزاد کے یوم ولادت کی تقریب (۱۱ر نومبر ۲۰۱۳ء) کو بطور مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ بہار اردو اکاڈمی کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے جناب سلطان اختر اور پروفیسر اعجاز علی ارشد (وائس چانسلر، مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ) اور مجلسِ عاملہ کے رکن کی حیثیت سے پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر سید احمد قادری اور ڈاکٹر زر نگار یاسمین کی نامزدگی بھی خوش آئند ہے اور انھیں بھی مبارک باد پیش کی گئی ہے۔

● بہار انتظامیہ کے سینئر ڈپٹی کلکٹر اور اردو کے معروف و منفرد شاعر، ادیب اور دانشور خورشید اکبر نے ڈپٹی ڈائریکٹر اردو کی حیثیت سے محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے اردو ڈائریکٹوریٹ میں اگست ۲۰۱۵ء میں اپنے عہدہ کا جائزہ لیا۔ موصوف اپنی اصول پسندی اور اعلیٰ انتظامی صلاحیت کے سبب ایک شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جائزہ لینے کے بعد اپنے رفیقوں سے کہا کہ ہمیں اپنی منصبی ذمہ داریوں کو پوری ایمان داری اور لگن کے ساتھ ادا کرنا چاہئے تاکہ اردو ڈائریکٹوریٹ کو مزید معنویت حاصل ہو اور اردو زبان کی مزید فروغ و اشاعت کا کام ہو سکے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دوسری زبان اردو کے فروغ اور توسیع کے لیے ہمیں منصوبہ بند طریقہ سے عملی اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں ہمیں آپ سب کا سرگرم تعاون چاہئے۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ انھیں صدر نشیں مشاورتی کمیٹی بہار کی شکل میں جناب شفیع مشہدی جیسی اردو کی عبقری شخصیت کی سرپرستی حاصل ہے۔ جناب امتیاز احمد کریمی جیسے فعال اور اردو پرور ڈائریکٹر کے ساتھ اردو کی خدمت کا موقع ملا ہے۔ خورشید اکبر کی دل نواز اور پرخلوص شخصیت کے پیش نظر اردو ڈائریکٹوریٹ میں ان کا والہانہ استقبال ہوا اور تمام رفقائے کار نے انھیں بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ واضح ہو کہ خورشید اکبر عالمی سطح پر معروف شاعر، ادیب اور ناقد کے ساتھ ساتھ اردو جریدہ ''آمد'' کے مدیرِ اعلیٰ بھی ہیں۔

● معروف شاعر اور مشاعروں کے حوالے سے اردو کے سفیر ڈاکٹر ماجد دیوبندی اردو اکاڈمی دہلی کے وائس چیئرمین نامزد کئے گئے۔ امید ہے کہ وہ اردو اکاڈمی دہلی کو ترقی کی نئی منازل پر لے جائیں گے اور اردو زبان و ادب کی خدمات بحسن و خوبی انجام دیں گے۔ ان کی نامزدگی سے متعدد ادبی و تعلیمی اداروں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ جناب اروند کیجریوال کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ایک فعال اور متحرک شخص کو اس عہدے کے لئے منتخب کر کے اپنی اردو نوازی کا ثبوت پیش کیا۔ ماجد دیوبندی سے توقع ہے کہ وہ اردو اکاڈمی دہلی کی تمام سرگرمیوں کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کریں گے۔

● ڈاکٹر رضا حیدر (ڈائریکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی) انجمن ترقی اردو ہند کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور خازن مقرر کئے گئے۔ موصوف نے اپنے تاثرات میں کہا کہ یہ میرے لئے بڑے ہی اعزاز کی بات ہے کہ انجمن کے عہدیداروں نے مجھے اس اہم منصب سے سرفراز کیا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آنے والے دنوں میں نہ صرف انجمن ترقی اردو ہند اور غالب انسٹی ٹیوٹ بلکہ دہلی اور بیرونِ دہلی تمام بڑے ادارے مل کر اردو زبان و ادب اور ملک کی تہذیب و ثقافت و روایت کو آگے بڑھائیں گے۔

● اردو کے بزرگ ادیب اور افسانہ نگار ڈاکٹر کیول دھیر کے فن اور شخصیت کے حوالے سے دہلی یونیورسٹی اور جے پرکاش یونیورسٹی چھپرہ کے دو ریسرچ اسکالرز نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر طارق کو ان کے تحقیقی مقالے'' کیول دھیر بحیثیت افسانہ نگار'' کے موضوع پر ایم فل کی ڈگری تفویض کی ہے۔ انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ارتضیٰ کریم کے زیر نگرانی مکمل کیا ہے جب کہ رضیہ سلطانہ کو'' ڈاکٹر کیول دھیر: شخصیت اور افسانہ نگاری'' کے موضوع پر ان کے تحقیقی مقالے پر جے پرکاش یونیورسٹی چھپرہ (بہار) کی طرف سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ مقالہ نگار رضیہ سلطانہ نے ڈاکٹر ابوالحیات، پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو، زیڈ اے. اسلامیہ کالج سیوان (بہار) کے زیر نگرانی ریسرچ مکمل کیا ہے۔ '' ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانوں کے نسوانی کردار'' موضوع پر ریسرچ اسکالر سمیرا ملک نیشنل یونیورسٹی اسلام آباد (پاکستان) میں ریسرچ کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر کی عالمی پہچان بطور افسانہ نگار ہے لیکن مختلف ادبی موضوعات پر اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں ان کی اب تک ۹۹ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی زبان میں ان کی کہانیوں کی ۱۰۰ ویں کتاب عنقریب شائع ہو رہی ہے۔ پنجاب سرکار کا سب سے بڑا ادبی انعام شرومنی اردو ساہتیہ کار کے علاوہ بہار، اتر پردیش، بنگال اور پنجاب سرکار کی طرف سے متعدد بار انھیں انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ سارک ممالک کی صوفی فاؤنڈیشن اور ہاؤس آف کامنز (پارلیمنٹ) کینیڈا کے علاوہ عالمی سطح پر انھیں درجنوں انعامات و اعزازات حاصل ہو چکے ہیں۔

● مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکاڈمی ممبئی اور علم رہبر ایجوکیشن سوسائٹی امراتی کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان ''تعلیم میں سماج، سرپرست اور اساتذہ کا کردار'' اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت ڈاکٹر لطیف سبحانی نے کی۔ عبدالرشید نشاط اور ڈاکٹر محمد شفیع (سیمینار کنوینر) نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ سہ ماہی ''صداقت'' کے مدیر ڈاکٹر ناصر الدین انصار نے ''تعلیم میں سرپرست کا کردار'' کے عنوان سے نہایت پر مغز مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر محمد ایوب نے ''تعلیم میں اساتذہ کا رول'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر لطیف سبحانی نے اپنی صدارتی تقریر میں ''تعلیم کی اہمیت و ضرورت اور ہماری ذمہ داریاں'' پر تبصرہ فرمایا۔ اس کے بعد محفلِ مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر لطیف سبحانی کی۔ ابتدا عبدالعلیم کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوئی۔ ارم مہر فاطمہ نے حمد باری تعالیٰ پڑھی۔ صالحہ زم زم و عاقب احمد نے نعت خوانی کی۔ محفلِ مشاعرہ میں عبدالصمد رضا، ضیا وزخمی، غلام محبوب عاصی، ادیب علیمی، اقبال ساحل، علی سبحان زیدی، حسین ساہسی، فیروز اخلاق، رحمٰن روشن، لیاقت علی خاں میثاق، تو قیر ربانی اور صدرِ مشاعرہ ڈاکٹر لطیف سبحانی نے اپنے کلام پیش کر کے سامعین سے خوب داد حاصل۔ اس جلسے میں اسکول کے اساتذہ، طلبا و طالبات اور شہر کی معتبر و معزز ہستیاں کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ عبدالرشید نشاط نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

● دربھنگہ پارلیمانی حلقے کے کیوٹی اسمبلی حلقہ سے ۲۰۱۵ء میں راجد امیدوار ڈاکٹر فراز فاطمی کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی شاندار کامیابی سے حلقے کے عوام کو زعفرانیت سے نجات ملی ہے۔ ماشاء اللہ موصوف کو کچھ کرنے کی بے پناہ آرزو اور قوم کی خدمت کا جذبہ ورثے میں ملا ہے۔ وہ بحیثیت ڈاکٹر جسمانی امراض کا علاج کرتے ہیں، اب وہ سماجی

بیماریوں کا پتہ لگا کر انھیں دور کریں گے۔ انشاء اللہ۔ اس بار کا بہار اسمبلی انتخاب فسطائی اتحاد بمقابلہ سیکولر اتحاد تھا اور پوری دنیا کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ بہار میں عظیم اتحاد کی یہ تاریخ ساز کامیابی ملک کی سیاست کو ایک نیا رخ دے گی۔ شہر کے معروف آرتھو سرجن ڈاکٹر اے حق نے مذکورہ جملے کہتے ہوئے ڈاکٹر فراز فاطمی کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دی۔ راجد لیڈر وکیل احمد (ایڈوکیٹ) نے بھی نومنتخب ایم ایل اے کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ اس بار کے اسمبلی انتخاب میں بھاجپا اور آر ایس ایس جیسی فرقہ پرست طاقتوں کو عوام نے مسترد کر دیا اور عظیم اتحاد کی تاریخی جیت ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ کیوٹی اسمبلی حلقہ سے فعال اور نوجوان ایم ایل اے ڈاکٹر فراز فاطمی کی کامیابی دراصل سیکولر مزاج کی کامیابی ہے۔ اس سیٹ پر عرصۂ دراز سے زعفرانی رنگ چڑھا ہوا تھا جسے سیکولر اتحاد نے اتار دیا ہے۔ وکیل احمد نے سابق مرکزی وزیر محمد علی اشرف فاطمی کی نمایاں خدمات کا بھی ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بالخصوص اردو کے فروغ اور ملی مفاد کو ہندوستان بھر میں جس طرح انھوں نے تقویت بخشی ہے اور دربھنگہ کو ملک کے تعلیمی نقشے پر نمایاں کیا ہے، یہ یقیناً ناقابلِ فراموش ہے۔ راجد کے محبوب احمد خاں نے کیوٹی اسمبلی حلقے سے ڈاکٹر فراز فاطمی کی کامیابی پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کی اور کہا کہ نوجوان کسی بھی ملک کی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ فراز فاطمی بھی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے امید ہے کہ وہ اپنے اسمبلی حلقے کی چوطرفہ ترقی میں ہر مثبت قدم اٹھائیں گے۔ بہار کے عوام نے اس اسمبلی انتخابات میں جس دوراندیشی کا ثبوت پیش کیا ہے، وہ پورے ملک کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ شری نتیش کمار، شری لالو پرساد، جناب محمد علی اشرف فاطمی وغیرہ کو بھی عظیم اتحاد کی کامیابی بہت بہت مبارک ہو۔ مذکورہ تمام افراد نے سابق وزیر جناب عبدالباری صدیقی کو علی نگر اسمبلی حلقے سے شاندار کامیابی پر انھیں بھی مبارک باد پیش کی۔

- معروف آرتھو سرجن ڈاکٹر اجیر الحق (حق منزل، الل پٹی، دربھنگہ) نے محمد ہارون رشید (ایم ایل سی، جنتا دل متحدہ، سوپول، بہار) کو بہار قانون ساز کونسل کا ڈپٹی چیئرمین بلامقابلہ منتخب ہونے پر انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دی نیز وزیر اعلیٰ بہار جناب نتیش کمار و دیگر کو بھی مبارک باد پیش کی گئی۔ محمد ہارون رشید نہایت فعال، متحرک اور پارٹی کے لیے Divotee رہے ہیں اور دوبار انھیں وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے ایم ایل سی نامزد کیا ہے۔ محمد ہارون رشید ابتدائی دنوں سے ہی سرگرم رہے اور جے پی تحریک میں بھی ان کی شمولیت رہی۔ بہار قانون ساز کونسل کے لیے موصوف کا انتخاب نیک فال ہے۔ ان کے انتخاب پر انجینئر عزمی اجیر، ڈاکٹر رزمی اجیر، ڈاکٹر حنا آرزو، وکیل احمد (ایڈوکیٹ) اور ڈاکٹر امام اعظم نے بھی مبارک باد پیش کی۔

- کفایت دہلوی (کوآرڈی نیٹر مجلس فروغ اردو ادب) کے بموجب عالمی شہرت یافتہ ادبی تنظیم مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کے زیر اہتمام دوحہ شیرٹن ہوٹل کے ہال میں ۱۹ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقسیم اور عالمی مشاعرہ کا انعقاد ۶ رنومبر ۲۰۱۵ء کو کیا گیا۔ یہ ایوارڈ وزارت الثقافت والفنون والتراث، دولت قطر کے مشیر جناب موسیٰ زین الموسیٰ کے ہاتھوں اردو زبان وادب کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ہندوستان سے ممتاز فکشن نگار مشرف عالم ذوقی اور پاکستان کے نامور نقاد و شاعر پروفیسر خورشید رضوی کو پیش کیا گیا۔ جناب موسیٰ زین الموسیٰ نے

اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ مجلس گزشتہ کئی برسوں سے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمات انجام دے رہی ہے جو ناقابل فراموش ہے۔ اس موقع پر قطر کے وزیر برائے الثقافت والفنون والتراث، دولت قطر عالیجناب ڈاکٹر حماد عبدالعزیز الکواری کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ مجلس فروغ اردو ادب کے چیئرمین محمد عتیق نے ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہندستان میں ایوارڈ جیوری کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پاکستان میں ایوارڈ جیوری کے چیئرمین انتظار حسین کا بطور خاص شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اس فنکشن کے انعقاد میں خصوصی تعاون کے لیے وزارت ثقافت والفنون کا شکریہ بھی ادا کیا۔ محمد عتیق نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر خورشید رضوی برصغیر کی تہذیب وشرافت اور وضع داری کا مرقع ہیں اور مشرف عالم ذوقی اسی دم توڑتی ہوئی تہذیب کے نوحہ خواں۔ ان کی تحریروں میں یہ اندیشے جگہ جگہ سے جھانکتے اور متنبہ کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ سائنس کی بے لگام ترقی تہذیبوں کو نگل جائے گی اور بالآخر انسان ایک روبوٹ کی سطح پر آجائے گا۔ سوئس بیل ہوٹل کے شاندار ہال میں مشرف عالم ذوقی نے ایوارڈ کی تقریب سے قبل اپنی تقریر میں دہشت گردی کو ادیبوں کے لئے ایک بڑا چیلنج قرار دیا نیز انھوں نے اپنے نئے ناول نالۂ شب گیر کے حوالہ سے عورتوں کے تحفظ کے مسئلہ کو سامنے رکھا۔ ذوقی نے کہا کہ نئی صدی کے پندرہ برسوں میں نہ صرف تہذیب بدلی ہے بلکہ دنیا کی عورتوں میں بھی نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج بھی ان تبدیلیوں کے باوجود عورت محفوظ نہیں۔ اس موقع پر شافع قدوائی نے مشرف عالم ذوقی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں دور حاضر کا اہم ناول نگار قرار دیا۔ شافع قدوائی نے نالۂ شب گیر کا ذکر خصوصی طور پر کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ ناول عورت کو نئی مضبوطی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس موقع پر ایم صبیح بخاری نے کہا کہ مجلس کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس نے اس برس دو بڑی ادبی شخصیتوں کو اپنے ادبی ایوارڈ سے نواز اور انھوں نے اسے قبول فرمایا۔ ہندوستانی سفارت خانے کی چانسری کے سربراہ نے کہا کہ بیرون ممالک میں اس طرح کے پروگرام کے انعقاد سے اردو کی مقبولیت اور اس کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی نوع کے پروگراموں سے اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہوگا۔ نظامت کے فرائض شوکت علی ناز اور سید فرتاش سید نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ اس تقریب میں ایوارڈ یافتگان کی خدمات پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل ایک یادگاری مجلّہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ۱۹ ویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کی تقریب پذیرائی پروفیسر شافع قدوائی اور امجد اسلام امجد کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ آخر میں عالمی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستان سے منور رانا، پاپولر میرٹھی، راشد انور راشد، خوشبیر سنگھ شاد اور محشر آفریدی کے علاوہ پاکستان سے انور شعور، امجد اسلام امجد اسلم کولسری، شاہد محمود ذکی نے شرکت کی۔ یہ عالمی مشاعرہ نہایت حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ رات دو بجے اختتام پذیر ہوا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر خورشید رضوی نے کی اور نظامت کے فرائض سید فرتاش سید نے ادا کیے۔

- قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام ''اردو صحافت کے ۲۰۰ رسال'' کے عنوان سے دوروزہ قومی سیمینار کا اہتمام کولکاتا کے ہوٹل کریسٹ ووڈ میں ۱۹-۲۰ ستمبر ۲۰۱۶ء کو کیا گیا۔ کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے سیمینار کے انعقاد کے حوالے سے کہا کہ کونسل نے پہلی مرتبہ اردو صحافت کے نام پر سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ اس لئے کیا ہے

تا کہ اردو صحافت کا تعلق عوام سے جوڑا جائے اور اس کی روشن تاریخ نئی نسلوں تک پہنچایا جائے۔ آئندہ ایک سال تک ملک بھر میں سیمینار کا انعقاد کیا جائے گا۔ امید ہے کہ کونسل کا یہ سیمینار اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوگا اور قدیم و جدید نسل کے درمیان روابط مضبوط ہوں گے۔ ممتاز و مقتدر صحافی احمد سعید ملیح آبادی (سابق مدیر روزنامہ ''آزاد ہند'' کولکاتا) نے کہا کہ اردو صحافت کی ابتدا ۱۸۲۲ء میں خواہ ''جامِ جہاں نما'' سے ہوئی ہو یا ۱۸۱۰ء میں ''اردو اخبار'' سے، ہمیں اس تنازع میں پڑنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ ایک بات جو مسلّم ہے وہ یہ کہ اردو اخبار کا مولد و مسکن کلکتہ ہی رہا ہے۔ آج یہاں اردو صحافت کے دو سو سال مکمل ہونے کی تاریخ مرتب کی جارہی ہے، اس اہم کام کے لئے میں قومی کونسل کے ذمہ داران کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کی آزادی تک اردو صحافت نے کبھی بھی اپنے مقصد سے روگردانی نہیں کی بلکہ پورے خلوص اور لگن کے ساتھ مقصد کی تکمیل کی جدو جہد کی۔ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے اردو صحافت کو جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ اردو اخبارات اور اردو صحافت اشتعال انگیزی اور جذباتیت کو فروغ دینے کی بجائے سنجیدہ روش سے کام لے۔ انھوں نے مزید یہ بھی کہا کہ اردو صحافت کو قدیم سوچ سے نکل کر جدید تقاضوں سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے۔ جذباتیت کے سہارے مسائل حل نہیں ہو سکتے بلکہ اردو کو جدید نسلوں تک پہنچانے کے لئے ہمیں غور و فکر کرنا چاہئے۔ پروفیسر شہناز نبی نے سیمینار کے دوسرے دور کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ادب کو ہم سلام کرتے ہیں مگر آج کی اردو صحافت مولانا آزاد سے آگے نہیں بڑھی۔ آج کے بہت سے صحافی ادب کے معاملات کو نہیں جانتے۔ ف۔ س۔ اعجاز (مدیر ماہنامہ ''انشاء'' کولکاتا) نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ پہلے ہم یہ سمجھ لیں کہ قومی اردو کونسل اردو صحافت کے ۲۰۰ رسال مکمل ہونے پر سیمینار کا انعقاد کر رہی، جشن نہیں منا رہی ہے۔ ''جامِ جہاں نما'' کو ہی اردو کا پہلا اخبار تسلیم کیا جاتا ہے جو ۲۷ رمارچ ۱۸۲۲ء میں کولکاتا (کلکتہ) سے جاری ہوا۔ اس سیمینار میں بزرگ صحافی وسیم الحق (مدیر اعلیٰ روزنامہ ''اخبار مشرق'')، پرویز حفیظ مدیر ''ایشین ایج'' کولکاتا، جناب عبدالعزیز وغیرہ بھی صدارتی پینل میں موجود رہ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شرکائے بحث میں انجم عظیم آبادی، اساتذہ اور طلبا و طالبات بھی شریک ہوئے۔ کچھ صحافیوں مہتاب عالم، نور اللہ جاوید و دیگر نے یہ کہا کہ اردو اخبار اصل میں کمیونٹی اخبار ہوتا ہے چنانچہ کمیونٹی کی خبریں اردو اخباروں میں ملتی ہیں۔ انگریزی اخبار تو ہماری کمیونٹی کے بارے میں ایک سطر بھی نہیں لکھتا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر نصرت جہاں (صدر، شعبۂ اردو، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا) نے بحسن و خوبی کی اور اظہار تشکر ابوذر ہاشمی (نیشنل لائبریری) نے پیش کیا۔ کونسل کے وائس چیئرمین جناب مظفر حسین بہ نفس نفیس پورے سیمینار میں موجود رہے اور اظہار خیال بھی کیا۔ مقالہ پیش کرنے والوں میں محمد وسیم الحق (اخبار مشرق)، ڈاکٹر نوشاد مومن، ڈاکٹر ندیم احمد، ابوذر ہاشمی، شیخ الماس حسین، ڈاکٹر امام اعظم، کریم رضا مونگیری (مدیر ''عکاس'')، انیس رفیع، ظہیر انور، امان اللہ محمد، عاصم شہنواز شبلی، ایم نصر اللہ نصر، جہانگیر کاظمی، نور الصباح وغیرہ شامل تھے۔ این سی پی یو ایل کے ریسرچ افسر ڈاکٹر کلیم اللہ اور ڈاکٹر قاسم انصاری بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر افتخار احمد نے بھی ایک اجلاس کی نقابت کی۔ سیمینار

کے اختتام پر کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سامعین اور کولکاتا کے صحافیوں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جس طرح کولکاتا نے اس سیمینار کی پذیرائی کی ہے اس کی مثال ملک کے دیگر حصوں میں ملنا مشکل ہے۔ سیمینار کے تمام اجلاس میں مقامی صحافیوں، اساتذہ، طلبا و طالبات اور علم و ادب کے شائقین کی بڑی تعداد موجود تھی۔

● مانو ریجنل سینٹر کولکاتا میں ۱۱؍نومبر ۲۰۱۵ء کو 'قومی یومِ تعلیم' کے موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت ریجنل ڈائریکٹر ڈاکٹر امام اعظم نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر معروف ڈراما نگار، شاعر، ناقد اور محقق پروفیسر طارق جمیلی اور معروف افسانہ نگار، ادیب اور شاعر جناب ابواللیث جاوید موجود تھے۔ نوجوان شاعر و ادیب شاہد اقبال نے نقابت کے فرائض ادا کرتے ہوئے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک عبقری شخصیت کا نام ہے۔ موصوف نے ہندوستان کے اولین وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے جس جدید ہندوستان کا خواب دیکھا تھا، وہ آج شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آرہا ہے۔ عبدالوارث سفر (استاد، مدرسہ عالیہ اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ، کولکاتا) نے کہا کہ مولانا آزاد کا تعلق کلکتہ سے بھی تھا بلکہ کلکتہ ان کے لیے وطنِ ثانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج ہندوستان میں اعلیٰ و تکنیکی تعلیم کے فروغ کے لئے جو ادارے موجود ہیں ان میں سے بیشتر مولانا آزاد کے عہدِ وزارت میں ہی قائم کیے گئے تھے۔ جناب ابواللیث جاوید نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا ہندوستان کے بڑے سیاست داں، ادیب، شاعر، مفسرِ قرآن اور ایک درد مند دل کے مسلمان تھے۔ ملک و قوم کے لیے ان کی قربانیاں اگر فراموش کی گئیں تو اسے اتنی بڑی شخصیت کے ساتھ بے وفائی سمجھا جائے گا۔ وہ ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم تھے جنھوں نے ہندوستان کے تعلیمی ڈھانچے کو ایک خوب صورت شکل دی اور آنے والے دنوں کے لیے ہندوستان کی علمی رہنمائی کی۔ اردو صحافت میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جو اپنی مثل آپ ہیں۔ پروفیسر طارق جمیلی نے سامعین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''مولانا آزاد بڑے مجاہدِ آزادی اور ماہرِ تعلیم، مفسرِ قرآن اور صحافی تھے۔ انھوں نے ایک نئے طرزِ تحریر کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا حافظہ بے پناہ تھا۔ احمد نگر جیل سے انھوں نے جو خطوط لکھے، انھیں ''غبارِ خاطر'' کے نام سے کتابی شکل دی گئی، جو ملک کی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ مفسرِ قرآن کی حیثیت سے سورہ فاتحہ کی تفسیر ادبی شہ پارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ خاص طور پر تقسیمِ وطن کے بعد جامع مسجد دہلی کی سیڑھی سے ان کی تاریخی تقریر ادبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے قیمتی اور گراں قدر تسلیم کی جاتی ہے۔'' انھوں نے ''مولانا ابوالکلام آزاد کی بلند قامتی'' کے عنوان سے ایک مختصر سی تحریر بھی پیش کی۔ ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہماری یہ یونیورسٹی 'مانو' امام الہند مولانا آزاد کے نامِ نامی سے منسوب ہے، جیسا کہ ان کے نام سے ملک بھر میں بہت سے ادارے قائم ہیں۔ مولانا کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ ایک عالمِ دین، مجاہد آزادی، ادیب، ماہرِ تعلیم اور صحافی کی حیثیت سے ان کی شناخت قائم ہے۔ ان کے رسالے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' جو کلکتہ سے ہی شائع ہوتے تھے، اردو صحافت میں انقلابی حیثیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے جدید ہندوستان کا جو خواب دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان کی تعلیمات پر زیادہ سے زیادہ عمل کریں۔ انھوں نے اپنی تقریر کا خاتمہ چند قطعات سے کیا۔ اس تقریب میں ریجنل سینٹر کے دیگر اسٹاف رجیل شاداب اور محمد اشتیاق بھی موجود تھے۔

● جاوید نہال فاؤنڈیشن، کلکتہ کی جانب سے ادارہ کے چیئرمین ڈاکٹر اقبال جاوید (پرنسپل، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا) کی جانب سے اردو کے مشہور شاعر، ادیب، محقق اور صحافی جناب احمد الیاس کو ۲۱ر نومبر ۲۰۱۵ء کی شام ۶ ر بجے استقبالیہ دیا گیا جہاں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اردو کے معروف افسانہ نگار ابواللیث جاوید بھی جلوہ افروز تھے۔ محفل کی صدارت معروف ادیب و مترجم جناب ایم علی (بیل گھیا) فرمار ہے تھے۔ تقریب کا آغاز دانش تنویر (اخبارِ مشرق) کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ رسمِ گل پوشی کی ادائیگی کے دوران غلام حیدر نے صدرِ جلسہ، جاوید اختر نے ابواللیث جاوید اور محمد شہاب الدین ویشالوی ادب نواز نے میزبانِ جلسہ کو پھولوں کا ہار پہنایا جب کہ خود میزبان نے مہمانِ خاص کو گلدستہ اور شال پیش کیا۔ سیّد محفوظ عالم نے سپاس نامہ پڑھا جسے ابواللیث جاوید کے دستِ مبارک سے احمد الیاس کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ مہمانِ خصوصی کا پانچواں شعری مجموعہ ''محاذِ شب'' کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ سیّد محفوظ عالم نے اپنا مضمون (احمد الیاس: حیات وخدمات کا مختصر جائزہ) پڑھ کر احمد الیاس کا بھر پور تعارف پیش کیا۔ اظہارِ خیالات کے دور میں سب سے پہلے ڈاکٹر اقبال جاوید نے احمد الیاس کو بنگلہ دیش کا عندلیب شادانی ثانی قرار دیا۔ ابواللیث جاوید نے ان کی شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے ان کے کئی اشعار بھی سنائے۔ خود احمد الیاس نے اپنی تقریر کے دوران بنگلہ دیش میں اردو کی زبوں حالی، سرکاری ادارہ بنگلہ- اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن کے منصوبوں اور خود اپنی سرگرمیوں کے تعلق سے معلومات فراہم کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ہر ہفتے تین روز ڈھاکے سے ۳۵ ر کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہوئے بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن محمد پور پہنچتے ہیں اور اردو کی ڈوبتی نسوں میں تازہ خون دوڑانے کے لیے بنگلہ کی مدد سے صورتِ حال کی تکلیف دہ فضا کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں موصوف نے نہ صرف وہاں کی مستند اردو کتابوں کو بنگلہ بلکہ بنگلہ کی تازہ تخلیقات کو اردو میں منتقل کرنے کا سلسلہ بھی جاری کیا ہے۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہاں کے بنگلہ ادبا و شعرا کے رشحاتِ قلم کا اردو ترجمہ یہاں کے رسائل میں شائع ہوں تا کہ انھیں مزید کام کرنے کا حوصلہ ملے۔ وہ ڈھاکہ میں ٹیگور کے تعلق سے ایک سیمینار یا جلسہ منعقد کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا ہے، جس کے لیے کلکتے سے بھی وہ بعض ٹیگور شناس حضرات کو مدعو کرنا چاہتے ہیں۔ صدرِ جلسہ نے صاحبِ اعزاز کی خدمات کا اعتراف، ان کے ارادوں کی ستائش اور اردو کی ترقی کے لئے ان کے بے لوث جذبوں کو سلام کیا۔ نظامت کے فرائض اشرف احمد جعفری نے انجام دیئے۔ دانش تنویر کے اظہارِ تشکر کے بعد چیئرمین کی جانب سے لذتِ کام و دہن کا اہتمام بھی کیا گیا۔ دیگر حاضرین میں سیّد ایاز احمد روہوی، شوکت علی، محمود یٰسین، محبوب رضا (مدیرِ اعلیٰ پندرہ روزہ ''سرپرست'')، محترمہ صبرینہ جاوید (بیگم اقبال جاوید)، ڈاکٹر شبانہ جاوید وغیرہ اہم ہیں۔

● خانقاہِ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں مفکرِ اسلام حضرت مولانا سیّد محمد ولی رحمانی متفقہ طور پر ۲۹ ر نومبر ۲۰۱۵ء کو امارتِ شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ کے ساتویں امیرِ شریعت منتخب کر لئے گئے۔ اس موقع پر انھوں نے فرمایا کہ یہ نازک ذمہ داری اربابِ حل و عقد نے جس اعتماد کے ساتھ سونپی ہے، انشاء اللہ اسے ٹھیس نہیں لگنے دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد مجھے آپ لوگوں کی مضبوط، مربوط اور مستحکم معاونت کی ضرورت ہے۔ اداروں کا استحکام ملت کی

شناخت ہے۔ سیمانچل کے مرکزی ضلع ارریہ کے دارالعلوم رحمانی زیرو مائل میں منعقد ارباب حل وعقد کے اجلاس میں انھیں اتفاق رائے سے اس عہدہ کے لئے منتخب کیا گیا۔ امارت کے امیر کا انتخاب امارت شرعیہ کے دستور کے مطابق ارباب حل وعقد کرتے ہیں جن کی کل تعداد آٹھ سو گیارہ ہے اور جن کا تعلق بہار، اڑیسہ، جھارکھنڈ اور بنگال سے ہے۔ حضرت مولانا محمد ولی رحمانی کے والد امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور دادا قطب عالم حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی دینی، علمی وملی خدمات سے پورا ملک واقف ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جہاں ان کے دادا کی دین ہے تو آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ ان کے والد کی فکر کا نتیجہ ہے۔ مولانا ولی رحمانی کی ولادت ۵/جون ۱۹۴۳ء کو ہوئی اور ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت خانقاہ رحمانی مونگیر میں اپنے والد کی سرپرستی میں ہوئی۔ بعدۂ آپ نے ۱۹۶۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ ۱۹۷۰ء میں آپ نے ایم اے کی سند بھی حاصل کی۔ مولانا محمد ولی رحمانی امارت شرعیہ کے کاموں سے شروع سے جڑے رہے ہیں۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے ۲۰۰۵ء میں انھیں نائب امیر شریعت بنایا گیا۔ امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید محمد نظام الدینؒ کے وصال کے بعد وہ کارگزار امیر شریعت کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ موصوف آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ ملک وملت کی حفاظت کے لئے انھوں نے کئی کامیاب تحریکیں چلائی ہیں جن میں رحمانی سپر-۳۰ اور رحمانی فاؤنڈیشن جیسے خدمت گزار ادارے اہم ہیں۔ اسلامی علوم و قوانین میں مہارت کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں دنیاوی علوم وقوانین پر دسترس عطا کی ہے۔ موصوف کی تاریخ پر بھی گہری نظر ہے اور شعر وادب سے بھی لگاؤ ہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۶ء تک وہ بہار قانون ساز کونسل کے رکن نیز دوبار ڈپٹی چیئرمین بھی رہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

● بہار اردو اکادمی پٹنہ کے ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کے تحت ۱۳/دسمبر ۲۰۱۵ء کو ملت کالج، دربھنگہ میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد ہوا جس میں دربھنگہ کے تین بزرگ شعراء اویس احمد دوراں، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی اور ذکی احمد کو اعزاز سے نوازا گیا۔ بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری، پرو وائس چانسلر پروفیسر سید ممتاز الدین، ڈاکٹر محمد رحمت اللہ پرنسپل ملت کالج اور ڈاکٹر مشتاق احمد پرنسپل مارواڑی کالج کے ہاتھوں تینوں شعراء کو اکادمی کی جانب سے مومنٹو، توصیفی سند، شال اور اکیس اکیس ہزار روپے کا چیک دیا گیا۔ اس موقع پر پرو وائس چانسلر سید ممتاز الدین نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ بہار اردو اکادمی نے ''اکادمی آپ تک'' پروگرام کا جو انوکھا سلسلہ شروع کیا ہے، اس کے تحت ہر ضلع میں پہنچ کر وہاں کے بزرگ شعراء وادباء کو اعزاز سے نوازنا یقیناً ایک اچھی پہل اور لائق تعریف کاوش ہے۔ صدر تقریب نے طلبہ وطالبات کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہا کہ آپ ایسی ترقی کریں کہ ملت کو آپ پر فخر ہو اور لوگ ہماری ملت کی طرف عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور آپ ملک کو درپیش مسائل کے حل کرنے میں اہم کردار نبھائیں۔ سابق صدر، شعبۂ اردو متھلا یونیورسٹی پروفیسر رئیس انور نے کہا کہ اویس احمد دوراں یوں تو ترقی پسند شاعر ہیں لیکن ان کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے پروپیگنڈہ اور نعرہ بازی یا مریضانہ ذہنیت انداز کی اشتراکیت سے بچتے ہوئے شاعری کی۔ ذکی احمد چندن پٹوی کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق احمد نے کہا کہ ان کی شاعری کو ہمارا تخیل

سے پھوٹا ہوا وہ چشمہ ہے جو حیاتِ انسانی کے ساحلِ رنج و غم اور انبساط و فخر سے ٹکراتے ہوئے اپنا سفر طے کرتی ہے اور سمندر میں مل کر بھی اپنے قطرہ ہونے کا احساس کراتی ہے۔ پروفیسر شاکر خلیق نے کہا کہ ذکی احمد فطری اور جینوئین شاعر ہیں۔ سادگی اور سلاست ان کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ احتشام الحق نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی غزل اور نظم دونوں کے شاعر ہیں۔ دونوں میں ان کی اپنی منفرد خصوصیات ہیں۔ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے طرزی صاحب کے حوالے سے کہا کہ وہ نئی نسل کے قلم کاروں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور ان کی ترقی اور ناموری میں حصہ دار بھی بنتے ہیں۔ جناب مشتاق احمد نوری (سکریٹری، بہار اردو اکاڈمی) نے اس موقع پر کہا کہ اس سے قبل بہار اردو اکاڈمی پٹنہ اردو اکاڈمی بن کر رہ گئی تھی لیکن میں نے یہ پہل کی ہے کہ ایسے شعراء جن کی بڑی ادبی خدمات رہی ہیں، اور اب وہ عمر کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں، ان کے گھر تک پہنچ کر اکادمی ان کی خدمات کا اعتراف کرے اور انھیں اعزاز سے نوازے۔ گیا میں ۲۸ رنومبر ۲۰۱۵ء کو فرحت قادری، ناوک حمزہ پوری اور شاہد احمد شعیب کو انعامات سے نوازنے کے بعد یہ دوسرا پروگرام دربھنگہ میں منعقد ہوا ہے۔ اس کے بعد تیسرا پروگرام مغربی چمپارن کے بیتیا اور چوتھا پروگرام سیمانچل کے ارریا میں ہوگا۔ اس موقع پر مہمانان کے ہاتھوں احتشام الحق کی مرتبہ کتاب ''طرزی اور طرزِ سخن''، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی کتاب ''دیدہ ورانِ بہار'' جلد چہارم اور ابرار مجیب کی کتاب ''رات کا منظر نامہ'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقع پر اردو اکاڈمی کی جانب سے دوسری نشست میں ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی صدارت میں مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر اویس احمد دوراں، نیاز احمد (سابق اے ڈی ایم)، ڈاکٹر ایم کمال الدین، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر عبدالقیوم ساقی، عطا عابدی، منور عالم راہی، حیدر وارثی، آرزو دستوی، رفیق انجم، فاروق اعظم انصاری، منظر ریونڈھوی، فردوس علی، منصور خوشتر، عرفان احمد بیدل، جنید عالم آروی، منظر صدیقی، انام الحق بیدار، خون چندن پٹوی، ندا عارفی، صبا در بھنگوی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرہ کی نظامت ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ کی۔ مذکورہ دونوں نشستوں میں ڈاکٹر ایس ایم جاوید اقبال، ڈاکٹر احتشام الدین، ڈاکٹر جمال اویسی، اظہر نیر، ڈاکٹر ایوب راعین، نظر عالم، ڈاکٹر عالمگیر شبنم، عطاء الرحمن، شکیل احمد سلفی، افلاک منظر، عقیل صدیقی، ڈاکٹر محمد بدرالدین، محمد ساجد اقبال، زاہد انور، محمد شمشاد وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات اور دانشوروں نے شرکت کی۔ مشتاق احمد نوری کے شکریہ کے کلمات کے ساتھ دونوں پروگرام اختتام پزیر ہوئے۔ واضح ہو کہ اکاڈمی نے ۳ رجنوری ۲۰۱۶ء کو بیتیا میں شہر کی معزز شخصیت اور سابق ہیڈ ماسٹر اردو ہائی اسکول سید ہاشم رضا کی زیر صدارت ایک تقریب منعقد کر کے حسرت شادانی، شاکر کریمی اور عظیم اقبال کو اعزازت دئے اور ان حضرات پر پروفیسر صفدر امام قادری، ایس اے شکیل، ڈاکٹر ظفر امام اور ایم ایم وفا نے جامع گفتگو کی۔

● ۱۷ دسمبر ۲۰۱۵ء کو اردو کے معروف ادیب، شاعر اور کالم نگار شیم طارق کو ان کی تنقیدی کتاب ''تصوف اور بھکتی'' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ۲۰۱۵ء دینے کا اعلان کیا گیا۔ اردو کے معاصر ادبی منظر نامہ پر شمیم طارق کا نام محتاج تعارف نہیں۔ اب تک ان کی ڈیڑھ درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ شمیم طارق نے اپنی کتاب 'تصوف اور بھکتی' میں تصوف اور بھکتی کے حقیقی مفاہیم تک رسائی کے علاوہ دونوں کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کرنے کی بھی کوشش کی

ہے۔ دہلی میں ساہتیہ اکادمی ایگزیکیٹو بورڈ کے اجلاس کے بعد ۲۳ ہندستانی زبانوں کے لیے اکادمی کے اعلیٰ ادبی ایوارڈز کا اعلان ایک پریس کانفرنس میں اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے ایس راؤ نے کیا۔ بنگلہ زبان کے ایوارڈ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ ایگزیکیٹو بورڈ کی صدارت ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرساد تیواری نے کی۔ یہ ایوارڈ ساہتیہ اکادمی کے امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈز ۱۶ر فروری ۲۰۱۶ء کو نئی دہلی میں منعقد ہونے والی ساہتیہ اکادمی کی ایک پروقار تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔ اس بار جن اہم شاعروں کو ایوارڈ سے نوازا گیا ہے ان میں برجندر کمار برہما (بوڈو)، دھیان سنگھ (ڈوگری)، رام درش مشرا (ہندی)، کے وی ترو ملیش (کنڑ)، کشیتری راجن (منی پوری) اور رام شنکر اوستھی (سنسکرت) کے نام قابل ذکر ہیں۔ چھ افسانہ نگاروں کو بھی ایوارڈ سے نوازا گیا جن میں کولا سیکیہ (آسامی)، منموہن جھا (میتھلی)، گپتا پردھان (نیپالی)، وبھوتی پٹنا یک (اڑیہ)، میا راہی (سندھی) اور وولگا (تیلگو) شامل ہیں جبکہ سائرس مستری (انگریزی)، کے آر میرا (ملیالم)، جسوندر سنگھ (پنجابی) اور مدھو آچاریہ آشاوادی (راجستھان) جیسے اہم ناول نگاروں کو بھی ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ رسک شاہ (گجراتی) اور اے مادھون (تمل) کو تنقیدی مضامین، اُدے بھمبرے (کونکنی)، ربی لال توڈو (سنتھالی) کو ڈرامے کے لیے اور بشیر بھدرواہی (کشمیری) کو تنقید کے لیے ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس بار یکم جنوری ۲۰۰۹ء سے ۳۱ر دسمبر ۲۰۱۳ء کے دوران پہلی بار شائع ہونے والی نمائندہ کتابیں زیر غور آئیں۔

● مسلم انسٹی ٹیوٹ کولکاتا کی لٹریری سب کمیٹی کے زیر اہتمام ایک شاندار محفلِ مشاعرہ کا انعقاد ۱۸ر دسمبر 2015ء بوقت ۷ر بجے شام انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر نیاز احمد خاں آڈیٹوریم میں ہوا۔ مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر جناب قیصر شمیم نے فرمائی جب کہ جناب ضمیر یوسف نے نقابت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دئے۔ افتتاحی کلمات ڈاکٹر دبیر احمد (خازن، ادارہ ہذا) نے اور خیر مقدمی کلمات ادارے کے ایجوکیشن سکریٹری ڈاکٹر نعیم انیس نے پیش کئے۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں آچاریہ جمال احمد جمال، شاہد اقبال، بشریٰ سحر، ڈاکٹر امام اعظم، فیروز اختر، نسیم فائق، مشتاق جاوید، الف سین قادری، شگفتہ یاسمین غزل، ریحانہ نواب، کوثر پروین، ڈاکٹر زرینہ زریں، ارم انصاری، شمیم انجم وارثی، فراغ روہوی، اشرف یعقوبی، ڈاکٹر نوشاد مومن، شرف الدین ظرف، ڈاکٹر شاہد فروغی، ابوالکلام نامی، مشتاق ہاشمی، ضمیر یوسف اور حضرت قیصر شمیم شامل تھے۔ مشاعرے کے خاتمے پر انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی جنرل سکریٹری شیخ شمشیر عالم (آئی آر ایس) نے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ کی مختلف فعال سب کمیٹیوں میں سے ایک لٹریری سب کمیٹی بھی ہے۔ جس کے زیر اہتمام آج کا یہ خوبصورت مشاعرہ منعقد ہوا۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ زبان وادب کے فروغ کیلئے ہمیشہ سے اپنا مثبت کردار ادا کرتا چلا آرہا ہے۔ کچھ دنوں قبل سہ لسانی شام افسانہ کا انعقاد کیا گیا تھا اور آج محفل مشاعرہ کا کامیاب انعقاد کیا گیا۔ جس کے لئے سب کمیٹی کے اراکین خصوصاً چیئرمین قمرالدین ملک اور سکریٹری ساجد خان کو مبارکباد۔ انسٹیٹیوٹ کے لٹریری سکریٹری ساجد خان نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے محفل کے خاتمے کا اعلان کیا۔

● ڈاکٹر اقبال واجد، صدر گوشۂ ادب، الجبیل، سعودی عرب کو جب یہ اطلاع ملی کہ اس شہر میں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر ومحقق جناب اسلم بدر تشریف لائے ہوئے ہیں تو ان کے اعزاز میں شعری نشستوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔

شہر کی ایک فعال ادبی انجمن 'گوشۂ ادب' نے بھی 'ایک شام اسلم بدر کے نام' منعقد کرنے کا فیصلہ لیا اور یہ شام نہایت تزک و احتشام کے ساتھ 'اوشیان ریسٹورنٹ' کے کانفرنس ہال میں ۲۴ر دسمبر ۲۰۱۵ء کو منائی گئی۔ تقریب کے وقار کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر مکرم علی خان (علیگ) صدارت کی کرسی پر جلوہ افروز تھے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے، جدہ سے تشریف لائے ہوئے شاعر و محقق محترم سید نعیم حمید الحامد شریک تھے اور مہمان اعزازی کے طور پر سعودی بحریہ کی ریسرچ لیبارٹری کے محترم ڈاکٹر وجاہت فاروقی (علیگ)۔ جلسے کے آغاز میں راقم (اقبال واجد) نے صدر و دیگر مہمانان کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہوئے اسلم بدر کی شخصیت و شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی۔ یہ جلسہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ پہلے حصے میں اسلم بدر کی تازہ ترین شعری تخلیق 'بوند سمندر' کا اجراء ڈاکٹر مکرم علی خان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سید نعیم الحامد نے اسلم بدر کی خدمت میں اعزازیہ کے طور پر گوشۂ ادب کی جانب سے ایک میمنٹو پیش کیا۔ بعد ازاں جناب محمد فیاض نے 'اسلم بدر، مشاعرے سے بوند سمندر تک' کے عنوان سے ایک دلچسپ خاکہ پڑھا، جسے خاصا پسند کیا گیا۔ راقم (اقبال واجد) نے بھی اسلم بدر کی شعری جہات پر روشنی ڈالی اور 'بوند سمندر' پر اپنی رائے پیش کی۔ جلسے کے دوسرے دور میں شعرائے کرام نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا جن میں سعید اشعر، ایوب صابر، ثاقب جونپوری، سید باقر نقوی علیگ، ڈاکٹر اقبال واجد، ابوشارق، ضیاء الرحمٰن صدیقی، محمد عبد السلیم، ڈاکٹر سجاد سید، اقبال طالب، ڈاکٹر نعیم حمید الحامد اور صاحبِ اعزاز اسلم بدر شامل تھے۔ 'علم' کے عنوان سے اسلم بدر صاحب نے ایک پر مغز نظم بھی سنائی، جس کے کئی کئی شعر بار بار سنے گئے۔ جلسے کا اختتام صدر جلسہ ڈاکٹر مکرم علی خان (علیگ) کے خطبۂ صدارت پر ہوا۔ خطبہ کے دوران ڈاکٹر صاحب نے قدیم علی گڈھ روایات کے کچھ دلچسپ واقعات سنائے اور اپنے مخصوص انداز میں مشاہیر کے اشعار پر پیروڈیاں بھی سنائیں۔

- شہر کی معروف سماجی شخصیت جناب جمیل منظر کی رہائش گاہ ''چھایا گھیرا'' میں جشن سال نو کی ایک خوبصورت شام یکم جنوری ۲۰۱۶ء کو منعقد کی گئی جس میں شہر کی مقتدر ہستیوں نے شرکت کی۔ افتتاحی کلمات جناب جمیل منظر نے ادا کئے جب کہ محمد سلیم (ایم پی لوک سبھا)، محمد نظام الدین (سابق ایم ایل اے مغربی بنگال اسمبلی) اور جناب شمس الزماں انصاری (ایم ایم آئی سی، کولکاتا میونسپل کارپوریشن) نے اپنی موجودگی سے محفل کو یادگار بنایا اور اظہار خیال بھی کیا۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت بہار اردو اکاڈمی کے سکریٹری اور معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے اپنے تاثرات پیش کئے۔ اسی پروگرام میں جناب شمس الزماں انصاری اور جناب قمر الدین ملک کو استقبالیہ دیا گیا اور ان کی خدمت میں شال اور میمنٹو پیش کئے گئے۔ ڈاکٹر بیساکھی بنرجی نے اظہارِ تشکر پیش کیا۔ بزرگ ادیب سید نور الہدیٰ (صدر، بزمِ احباب) نے ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی کی کتاب ''تفہیم و تقلیب'' کی رسمِ رونمائی کے بعد اس پر اظہارِ خیال کیا اور اپنی ایک غزل بھی پیش کی۔ اس کے بعد مشاعرے کا انعقاد زیرِ صدارت بزرگ شاعر و صحافی انجم عظیم آبادی کیا گیا جس میں فراغ روہوی، ڈاکٹر نوشاد مومن، مشتاق انجم، نسیم عزیزی، احمد کمال حشمی، ارشد جمال حشمی، اشرف یعقوبی، حلیم صابر، آچاریہ جمال احمد جمال، جاوید ہمایوں، فیروز اختر، شمیم انجم وارثی، منظر کبریا، شفیق الدین شایاں، ارم انصاری، ڈاکٹر افتخار احمد، احمد معراج، عروسہ عرشی، بشریٰ سحر، سلمیٰ سحر، نظیر راہی وغیرہ نے اپنے اشعار سنائے۔ ڈاکٹر

امام اعظم نے اپنی ایک خوب صورت نظم ''امیدِ صبحِ فردا'' پیش کی۔ بزرگ شاعر جناب علقمہ شبلی نے اس موقع کے لئے ایک قطعہ کہا جو روزنامہ ''آبشار'' میں ۲رجنوری ۲۰۱۶ء کو شائع ہوا :

سالِ نو کے خیر مقدم کے لئے　　خوب ہے یہ محفلِ شعر و سخن
لائقِ تحسین ہے کاوش یہ جمیل　　داد کیوں دیں گے نہ اس کی اہلِ فن

● این سی پی یو ایل دہلی کے تعاون سے بزم اصنام، وشاکھا پٹنم کے زیر اہتمام ۱۰رجنوری ۲۰۱۶ء کو ایک قومی سیمینار بعنوان ''اکیسویں صدی میں اردو کی خواتین قلم کار'' زیرِ صدارت معروف ناقد، محقق، شاعر اور صحافی پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار کے مہمانِ خصوصی این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر و معروف ناقد و محقق پروفیسر ارتضیٰ کریم تھے۔ دیگر معزز مہمانوں میں آئی ایچ فاروقی، پروفیسر ایم اقبال احمد (سابق وائس چانسلر) اقتدار حسین، موسیٰ قاسم مہدی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سیمینار میں اس موضوع پر ملک کی مختلف ریاستوں سے ۱۴رقلم کاروں نے الگ الگ اصنافِ ادب کے حوالے سے مقالے پڑھے جن میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر سیّد فاضل حسین پرویز، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر رونق شہری، ڈاکٹر حسن نظامی، ڈاکٹر اقبال حسین، اطیب اعجاز، احمد معراج وغیرہ اہم ہیں۔ سیمینار کے موضوع کی افادیت اور غرض و غایت پر ڈائریکٹر موصوف نے سیر حاصل تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ ملک و قوم کی ترقی میں مردوں کے شانہ بشانہ خاتون قلم کاروں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج ادب کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جہاں خاتون قلم کار موجود نہ ہوں۔ صدر سیمینار پروفیسر ہرگانوی نے پڑھے گئے ہر مقالے کی نوعیت، سمت اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کی نقابت خالق ادیب نے بحسن و خوبی انجام دی۔ جناب عثمان انجم نے ۱۱۶رصفحات پر مشتمل مذکورہ ۱۴رمقالوں کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا جس کی رسمِ رونمائی مہمانِ خصوصی پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ علاوہ ازیں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''خواتین کے افسانچے'' اور محترمہ ترنم جہاں (کولکاتا) کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی سے انٹرویوز'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اخیر میں مہمانِ خصوصی کے ہاتھوں مقالہ نگاروں کو میمنٹو اور توصیفی سند سے نوازا گیا اور ''بزمِ اصنام'' کے صدر عثمان انجم نے کلماتِ تشکر ادا کرتے ہوئے سیمینار کے اختتام کا اعلان کیا اور تمام حاضرین کو شہر کے عالی شان ہوٹل بدھل پارک میں ظہرانے پر لے جایا گیا۔

● ادارہ ''ہم نوا'' کولکاتا کے زیرِ انصرام معروف شاعر سراج دہلوی (او پی اگروال) کے اعزاز میں ایک تقریب ۲۴رجنوری ۲۰۱۶ء کی شب بھارتیہ بھاشہ پریشد ہال میں منعقد کی گئی جس کی صدارت حضرت قیصر شمیم نے فرمائی۔ مہمانانِ خاص کی حیثیت سے جناب ندیم الحق (ایم پی راجیہ سبھا)، شہر کی دلنواز شخصیت جناب صلو چودھری، ماہنامہ ''سہیل'' کے مدیرِ اعلیٰ جناب جمیل منظر، آل انڈیا کانگریس پارٹی کے جنرل سکریٹری جناب شکیل احمد خاں، ویمنس ریزنٹس کمیٹی کی چیئر پرسن محترمہ نازیہ الٰہی خان اور ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی جلوہ افروز تھے۔ ان کے علاوہ کلکتہ دوردرشن کے نیوز ڈائریکٹر جناب خورشید ملک، مغربی بنگال پردیش کانگریس کمیٹی کے چیئرمین جناب خالد عباداللہ، انجمن ترقی اردو (مغربی بنگال) کے نائب صدر جناب حفیظ الرحمٰن، محترمہ روحی علی خاں' کاٹن گیلری کے مالک جناب قمرالدین ملک، جناب شمیم رحمانی بھی موجود تھے نیز شہر نشاط کی معزز ہستیاں بھی شریکِ بزم تھیں۔ نظامت کے فرائض جناب

ضمیر یوسف نے بحسن وخوبی انجام دیئے۔ تقریب کے پہلے دور میں محترم ندیم الحق کے دست مبارک سے معروف شاعر جناب سراج دہلوی "محبِ اردو ایوارڈ" سے نوازے گئے یہ اعزاز خوبصورت میمنٹو ایک شال اور آچاریہ جمال احمد جمال کے منظوم خراجِ عقیدت پر مشتمل تھا۔ جناب سراج دہلوی کا تعارف ان کے دیرینہ رفیق جناب صلو چودھری نے بڑی تفصیل سے کرایا جو بے حد دلچسپ تھا۔ دوسرے دور میں معتبر شاعر فراغ روہوی کے شعری مجموعہ "در خواب پہ دستک" کی رسم رونمائی جناب ندیم الحق کے مبارک ہاتھوں سے عمل میں آئی۔ آخری دور میں عالمی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں حضرت قیصر شمیم کے علاوہ جناب سراج دہلوی (دہلی)، جناب طارق متین (مونگیر)، جناب افتخار راغب (قطر)، جناب مقصود انور مقصود (قطر)، جناب ساگر ترپاٹھی (ممبئی)، جناب شگفتہ سہسرامی (سہسرام)، جناب خورشید دلدارنگری (دلدارنگر)، جناب خمار دہلوی (دہلی)، جناب زاہد عیش (دھنباد)، جناب س۔ ع۔ مقیت (گیا)، جناب اسلم سیفی (گیا) محترمہ سونیتا ترپاٹھی (الہ آباد) محترمہ فلک سلطان پوری (سلطان پور)، جناب حبیب ہاشمی، ڈاکٹر امام اعظم، آچاریہ جمال احمد جمال، جناب فراغ روہوی، جناب عمران راقم، ڈاکٹر عقیل احمد عقیل، جناب ارشاد آرزو، جناب شکیل گونڈوی، جناب خواجہ احمد حسین، محترمہ شگفتہ یاسمین غزل اور محترمہ عروسہ عرشی نے اپنے کلام سے مشاعرے کے حسن کو وقار بخشا۔ شری رگھوناتھ اگروال' جناب فراغ روہوی، جناب سید عثمان جاوید، آچاریہ جمال احمد جمال، عبدالخالق (بابو بھائی)، جناب عطاالحق صدیقی' جناب غلام مدنی قادری' محترمہ عاصمہ سعید' محترمہ سعدیہ صدف' محترمہ حجاب آفرین' محترمہ درخشاں نگار اور صالحہ سنبل نے میزبانی کے فرائض بحسن خوبی انجام دیئے۔ یہ تقریب گیارہ بجے شب کو اختتام پذیر ہوئی۔

● آج کے دور میں اگر آگے بڑھنا ہے اور ترقی کرنا ہے تو دو قسم کی تعلیم چاہئے ایک جدید تعلیم اور دوسری اخلاقی تعلیم۔ اس کیلئے ہر شخص کے ایک ہاتھ میں مذہب کی کتاب دوسرے ہاتھ میں کمپیوٹر ہو۔ مذہب انسان کو اخلاقیات سکھاتا ہے۔ کمپیوٹر جدید علم سے روشناس کراتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر مملکت برائے توانائی جناب پیوش گوئل نے سائنسی سٹی آڈیٹوریم، کولکاتا میں مورخہ ۲۸ر جنوری ۲۰۱۶ء کو راشٹریہ انسٹی ٹیوٹ آف اسکل اینڈ ایجوکیشن کے زیر انتظام منعقدہ کانفرنس "تعلیم کی طاقت" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اچھی تعلیم ہی سماج کو زمرد بنا سکتی ہے۔ اس پیغام کو ہم گھر گھر لے جائیں تو ہندوستان کو عالمی طاقت بننے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ انھوں نے کانفرنس ہال میں موجود ہر شخص کو اپنے موبائل میں محفوظ نمبروں پر تعلیم کی طاقت سے متعلق پیغامات بھیجنے کی گزارش کی۔ اس کانفرنس کے صدر اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر جناب ظفر سریش والا نے کہا کہ وقت آگیا ہے کہ اب ہمارے گھروں میں کھانے پکانے کی باتیں ہونے کی بجائے یہ باتیں ہونی چاہئیں کہ ہمارا بچہ آئی اے ایس، آئی پی ایس یا میڈیکل، انجینئرنگ میں داخلہ لے گا یعنی تعلیم پر فوکس ہونا چاہئے۔ ہمیں اپنے ذہنوں سے یہ نکالنا ہوگا کہ ہم تعصب کے شکار ہیں یا ہم مجبور ہیں۔ انھوں نے اقلیتوں کو تعلیم میں سدھار اور سماج میں پوری سرگرمی سے کام کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ آر آئی ایس ای مختلف طبقات اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تعلیم کا پیغام عام کرنے میں مصروف ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے بہت سی اسکیم چل رہی ہیں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا ئی بورڈ کے نائب صدر مولانا کلب صادق نے کہا کہ عالم اپنے علم سے لوگوں کو جوڑتا ہے لہٰذا آپ کو علما کا احترام کرنا چاہئے۔ یونین بینک آف انڈیا کے چیئرمین جناب ارون تیواری نے کہا کہ جدید ہندوستان کی سب سے قدیم یونیورسٹی کلکتہ یونیورسٹی ہے۔ کلکتہ تعلیم کا گیٹ وے ہے۔ ہمیں اب یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہندوستان کا ہر بچہ تعلیم یافتہ ہوگا۔ مکہ مسجد، چنئی کے پیش امام جناب شمس الدین محمد نے کہا کہ جس قوم نے دنیا کو تعلیم کے بارے میں بتایا افسوس کہ آج اس قوم کو تعلیم کی اہمیت بتانا پڑ رہا ہے۔ مسجدوں کو تعلیم گاہ بنائیں۔ یہ مسلمانوں کی تعلیم گاہ اور پارلیمنٹ ہے۔ وائس چانسلر، یونیورسٹی آف الہ آباد پروفیسر رتن لال ہنگلو اور معزز چانسلر یو ایس ٹی ایم میگھالیہ جناب محبوب الحق نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ پورا ہال شہر کے معززین خواتین وحضرات سے بھرا ہوا تھا۔ نظامت کے فرائض ممبئی کے تیواری جی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ تقریب کے خاتمے پر ایک پرتکلف عشائیہ کا بھی اہتمام تھا۔

● معروف ناقد، محقق، شاعر اور صحافی پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''خواتین کے افسانچے'' کا اجراء جناب احمد جاوید (ریزیڈنٹ ایڈیٹر، روزنامہ ''انقلاب'' پٹنہ) کے ہاتھوں ۲۹ رجنوری ۲۰۱۶ء مانو ریجنل سینٹر کولکاتا میں عمل میں آیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر مانو کولکاتا)، جناب فراغ روہوی (سکریٹری، ہم نوا)، جناب طارق متین (مونگیر)، جناب سیّد عثمان جاوید (سکریٹری، منزل)، جناب خواجہ احمد حسین، جناب سیّد ایاز احمد روہوی، جناب محمد شہاب الدین ویشالوی (ادب نواز)، شاہد اقبال، راحیل شاداب وغیرہ موجود تھے۔

● آراین ایل فورس، گارڈن ریچ، کولکاتا کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سیمینار بہ عنوان ''اردو ناولوں میں عورتوں کے مسائل'' کا انعقاد اکاڈمی آف فائن آرٹس، کیتھڈرل روڈ، کولکاتا کے کانفرنس ہال میں ۳۰ رجنوری ۲۰۱۶ء کو کیا گیا۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور) نے کی۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا اور پھر منعام مومن (طالبہ، درجہ چہارم، سینٹ تھامس اسکول، کولکاتا) نے اپنی مترنم آواز میں نعت پاک پیش کی۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شمیم انور (سابق صدر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) نے سیمینار کے موضوع کو سراہا اور چیف فنکشنری ڈاکٹر نوشاد عالم کو مبارک باد دی۔ پروفیسر موصوف نے مقالہ خوانی کے پہلے دور کی صدارت بھی کی۔ اس سیشن میں کل پانچ مقالے پڑھے گئے۔ پہلے مقالہ میں ایاز احمد روہوی (کولکاتا) نے ''راشد الخیری کے ناولوں میں نسوانی کردار'' کے حوالے سے عورتوں کے مسائل بیان کیے۔ انھوں نے مولانا راشد الخیری کے حوالے سے اپنی گفتگو میں جذبات واحساسات کی پیشکش کو ملحوظ رکھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ) نے ''رشید النساء کے ناول میں تعلیم نسواں کے مسائل'' کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے اردو کی پہلی خاتون ناول نگار رشید النساء کے ناول ''اصلاح النساء'' کا باریک بینی سے تجزیہ کیا اور انیسویں صدی میں پائے جانے والے ان مسائل پر بطور خاص توجہ مرکوز کی جن سے عورتوں بالخصوص مسلمان عورتیں اس وقت دوچار تھیں۔ تیسرا مقالہ جناب احمد جاوید (پٹنہ) نے ''مشرف عالم ذوقی کے ناول 'نالۂ شب گیر' میں نسوانی امپاورمنٹ'' کے حوالے سے پیش کیا۔ انھوں نے اس ناول کی خوبی بیان کرتے ہوئے عورتوں کے عصری مسائل اور ان سے نبرد آزما معاشرے کو اپنے مطالعے میں رکھا۔ جناب انجم رومان (آسنسول) نے ''ایک ناول کی میلی ہیروئن'' کے عنوان سے

اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے راجندر سنگھ بیدی کے کردار 'رانو' کے حوالے سے عورتوں کے مسائل گنوائے۔ اس سیشن کی واحد خاتون مقالہ نگار ڈاکٹر ترنم مشتاق نے پریم چند کے ابتدائی چند ناولوں میں نسوانی کرداروں کے باطن میں جھانکتے ہوئے عورتوں کے مسائل کو پیش کیا۔ انھوں نے اس نکتہ پر اصرار کیا کہ عورتوں کے مسائل بدستور قائم ہیں البتہ تعلیمی بہتری آئی ہے۔ وقفۂ طعام کے بعد مقالہ خوانی کا دوسرا دور پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی صدارت میں شروع ہوا۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر شبنم پروین (کولکاتا) نے پڑھا۔ انھوں نے عصمت چغتائی کے ناولوں کے حوالے سے عورتوں کے مسائل اور سماجی پابندیوں کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر ریحانہ فاطمہ (بجنور) نے اس اجلاس کا دوسرا مقالہ بعنوان ''نذیر احمد کے ناولوں میں خواتین کے مسائل'' پڑھتے ہوئے نذیر احمد کے ناولوں کے تجزیاتی معالعے سے سروکار رکھا۔ ڈاکٹر نصرت جہاں (کولکاتا) نے اپنے مقالے ''اردو ناول نگاری اور عورتوں کے مسائل'' میں ناول کی ڈھائی سوسالہ تاریخ سے ان نسوانی مسائل کو سامنے رکھا جہاں نظر کم جاتی ہے۔ انھوں نے موضوعاتی اعتبار سے عورتوں کے کئی مسائل گنوائے۔ شاہد اقبال (کولکاتا) نے اپنے مقالے ''انیسویں صدی کے نمائندہ اردو ناولوں میں نسوانی مسائل'' میں ''مراۃ العروس'' سے لے کر ''امراؤ جان ادا'' تک اردو کے ابتدائی چھ اہم ناولوں میں عورتوں کے مسائل کا جائزہ لیا۔ پانچواں مقالہ ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائریکٹر، مانو کولکاتا) نے پیش کرتے ہوئے کولکاتا کے اہم ناول نگار صدیق عالم کے ناول ''چار رنگ کی کشتی'' میں عورتوں کے مسائل'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے اس ناول کے خاص نسوانی کرداروں کلیسا اور رکھائی کے حوالے سے جنس اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر خاص توجہ رکھی۔ ان کا مقالہ شہر کولکاتا سے وابستہ موضوع پر تھا اس لیے اسے بطور خاص سراہا گیا۔ اس سیشن کے آخر میں صدرِ اجلاس پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنا مقالہ ''شائستہ فاخری کے ناول میں عورتوں کے اکیسویں صدی کے مسائل'' پیش کیا جو شائستہ فاخری کے ناول کے جنسی پہلوؤں اور خصوصاً سروگیسی جیسے مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے اس طرف توجہ مبذول کرائی کہ خواتین ناول نگاروں نے جنس پر قلم اٹھانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ یہ اردو ادب کے لیے نہایت خوش گوار بات ہے۔ انھوں نے اس ناول میں مصنفہ کی ذہنی پختگی کا ذکر بھی کیا۔ صدارتی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے مذکورہ تمام مقالوں کی تعریف کی اور چند ایک مقالے میں در آئی غیر ضروری گفتگو سے اجتناب کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ صدارتی خطبے سے قبل مٹیا برج کے بزرگ ادیب حاجی محمد اسماعیل نے سمینار میں پیش کیے گئے مقالوں پر اپنی رائے کا اظہار جامع انداز میں کیا۔ اس سمینار میں سوالات قائم کر کے سامعین نے یہاں کی روایت کو برقرار رکھا۔ جناب مقصود دانش، احمد جاوید، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر ترنم مشتاق، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اس بحث و مباحثہ میں حصہ لیا۔ حاضرین بھی سمینار اور مقالوں سے پوری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آخر تک نشستوں پر دلجمعی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ ناظم جلسہ ڈاکٹر افتخار احمد (کولکاتا) نے پورے سمینار کی نقابت کی ذمہ داری بحسن و خوبی نبھائی۔ ادارے کے چیف فنکشنری اور سمینار کنوینر ڈاکٹر نوشاد عالم نے اپنی تقریر میں پڑھے گئے مقالوں کو جلد ہی کتابی صورت میں لانے کا اعلان کیا۔ آخر میں اس ادارے کی جانب سے ۶ رجنوری ۲۰۱۳ء کو اسی مقام پر منعقد کیے گئے سمینار ''منٹو: فن اور

شخصیت'' میں پیش کیے گئے مقالوں پر مشتمل کتاب جسے ڈاکٹر نوشاد عالم نے ترتیب دی ہے، کا اجرا پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ حکیم سعید احمد نے ادارے کی جانب سے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ سیمینار کے حاضرین میں ایم نصر اللہ نصر، مقصود دانش، فراغ روہوی، ضیاء الدین ندیم (صدر، ادارۂ ہذا)، مبشرہ خلیل (نئی دہلی)، ایس ایم راشد، ہمدم نعمانی، اشرف احمد جعفری، سیّد محمد راشد، عبدالوارث سفر، شوکت علی، مشتاق مشفق، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر شبانہ خاتون ثمن، احمد معراج، محمد شہاب الدین ویشالوی (ادب نواز)، ڈاکٹر شاہین جمیل، محمد جمیل، ڈاکٹر مہ ناز وارثی، ڈاکٹر حسنیٰ بانو، سیّد محفوظ عالم، غلام حیدر، عارف الرحمٰن، شبیر خاں، جاوید اقبال، اشوک مائتی، رئیسہ ناہید، محمد شکیل، شیوانی منا وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ مستورات کی بھی اچھی خاصی تعداد سیمینار ہال میں موجود تھی۔

● بزمِ شہرِ نشاط کلکتہ کے صدر جناب بلال حسن کے دولت کدے پر ۳۱ر جنوری ۲۰۱۶ء بوقت ۱۱ر بجے دن بھاگل پور سے تشریف لائے معروف ادیب، شاعر، صحافی ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''مغربی بنگال کے ہم عصر ادیب و شاعر'' کا اجراء محترم بلال حسن کے ہاتھوں ہوا۔ اس رسم رونمائی کی صدارت جناب طارق متین (مونگیر) نے فرمائی۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد اور شرکاء میں جناب کامران حسنین، جناب عمیر حسن، احمد معراج اور شمس افتخاری موجود تھے۔ معزز صدر اور دیگر حاضرین نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو ان کی کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں مغربی بنگال کے ۲۵ر شعراء و ادباء کی ادبی حیثیت اور کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے جس سے مصنف موصوف کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے جناب بلال حسن کا شکریہ ادا کیا۔ بلال حسن صاحب کے اظہار تشکر کے بعد یہ محفل اختتام پذیر ہوئی۔

● ادارہ 'محفل خوش رنگ' کے زیر اہتمام ایک تقریب ۳۱ر جنوری ۲۰۱۶ء کی شام کو سرت سدن ہال' ہوڑہ میدان میں زیر صدارت حضرت قیصر شمیم منعقد ہوئی۔ اس یادگار پروگرام کا آغاز تبریز وارثی کی نعت پاک سے ہوا۔ امسال اردو کے نامور ادیب پروفیسر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو منشی پریم چند ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اور جدید لب و لہجے کے معتبر شاعر فراغ روہوی کو داغ دہلوی ایوارڈ سے نواز کران کی پذیرائی کی گئی جب کہ مشہور سیاسی اور سماجی رہنما شری بنیے بخشی کو مدر ٹریسا ایوارڈ سے نوازا گیا۔ نائب سکریٹری احمد معراج نے مہمان خصوصی' صدر محترم اور صاحبان اعزاز کو اپنے پر کیف لہجے میں اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ صاحبان اعزاز کے علاوہ صدر جلسہ حضرت قیصر شمیم' سرپرست نازیہ الٰہی خان' ڈاکٹر امام اعظم' آچاریہ جمال احمد جمال' خورشید ملک (اسسٹنٹ ڈائریکٹر دوردرشن نیوز)' حلیم صابر' سید عثمان جاوید (سکریٹری ادارہ ''منزل'' کلکتہ)' قاسم علیگ' قمرالدین ملک' نثار احمد (سابق ACP)' ریحانہ خاتون (کونسلر)' اسماعیل پرواز' ڈاکٹر عرش منیر' شاہینہ جاوید' ثمینہ خاتون' خواجہ احمد حسین' طارق متین (مونگیر)' ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ) کی گلپوشی کی گئی۔ ناظم محفل خواجہ احمد حسین نے خوبصورت انداز میں مقررین کو دعوت دی جن میں نازیہ الٰہی خان' اسماعیل پرواز' نثار احمد' خورشید ملک' ریحانہ خاتون' شاہینہ جاوید' طارق متین' ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے پروگرام اور صاحبان اعزاز کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے سکریٹری محمد افضل خان کی کاوشوں کو سراہا۔

مشہور ناقد، محقق، شاعر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی ہمہ جہت شخصیت سے متعلق ڈاکٹر امام اعظم نے جامع مضمون پڑھا۔ مخدوم ارشد طارق متین، دائم غواصی اکبر حسین اکبر، شمس افتخاری رئیس اعظم حیدری، ڈاکٹر شاہد فروغی اور اسماعیل پرواز نے منظوم تہنیتی اشعار صاحبان اعزاز کی خدمت میں پیش کئے۔ سب سے پہلے ۱۸۹ رکتابوں کے مصنف پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی خدمت عالیہ میں میمنٹو، میڈل، شال اور سپاس نامہ کی شکل میں حضرت قیصر شمیم، خورشید ملک، نازیہ الٰہی خان، قمر الدین ملک، جمال احمد جمال، نے مشترکہ طور پر اعزاز پیش کیا۔ ڈاکٹر مشتاق انجم نے سپاس نامہ پڑھا۔ دوسرا اعزاز جو مدر ٹریسا کے نام سے منسوب تھا معروف سیاسی اور سماجی شخصیت شری نیچے بخشی کی خدمت میں میمنٹو، شال، میڈل اور سپاس نامہ کی شکل میں نثار احمد اور خورشید ملک نے پیش کیا۔ ڈاکٹر راج محمد نے بنگلہ میں کویتا ئیں ڈاکٹر مناظر عاشق اور نیچے بخشی کی خدمات کے اعتراف میں پیش کیں۔ روشنی خاتون نے سکریٹری رپورٹ موثر انداز میں پڑھی اور ثمینہ خاتون نے صاحبان اعزاز اور محترمہ نازیہ الٰہی خان کے تعلق سے انگریزی میں ایک نظم سنائی اس طرح جلسہ میں اردو، بنگلہ اور انگریزی زبانوں کی تخلیقات سے لسانی ہم آہنگی کا خوبصورت منظر نامہ سبھوں کو پسند آیا۔ بے غم وارثی نے فراغ روہوی سے منسوب آچاریہ جمال احمد جمال کی منظوم تہنیت پیش کی۔ اس کے بعد نازیہ الٰہی خان نے خوبصورت مومنٹو، مڈل، شال پر مشتمل اعزاز، جدید لب ولہجے کے معتبر شاعر جناب فراغ روہوی کی خدمت میں پیش کیا۔ صاحبان اعزاز، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، شری نیچے بخشی، فراغ روہوی نے کوزے میں دریا کو سمیٹتے ہوئے پر مغز تقریریں کیں اور ادارہ ''محفل خوش رنگ'' کے سکریٹری محمد افضل خان کی بطور خاص تعریف کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ آخر میں صدر جلسہ حضرت قیصر شمیم نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ قلم کاروں اور سماجی کارکنوں کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ پوری اردو دنیا میں اس کا اچھا اثر ہوتا ہے۔ موصوف نے اس سلسلے کو قائم رکھنے کا مفید مشورہ بھی دیا۔ شرکاء وسامعین میں نصر اللہ نصر، شمشاد عالم (ہیڈ ماسٹر)، وحشی ہوڑوی، ڈاکٹر الف انصاری، ڈاکٹر واصف اختر، ڈاکٹر علی اکبر، عارف حسین (ایڈووکیٹ)، فہیم الدین فہیم (ایڈووکیٹ)، ابر لکھنوی (ایڈووکیٹ)، بسمل یوسفی، سلطان ساجد، اشرف یعقوبی، الحاج محمد سلیم (سابق کونسلر)، عابد رضا، یوسف اختر، پروفیسر اگم شرما، آر پی سنہا، شفیق الدین شایاں، شمیم ساگر، کلیم آذر، جاوید مجیدی، آتش رضا، سلطان الحیات، خورشید وارثی، الیاس چشتی، محمد سلیم انصاری، وقار عالم، آتش رضا، محمد عالمگیر صحافی، ظفر سراج صحافی، نیلوفر روشن آرا، ثمینہ تبسم (ہیڈ مسٹریس)، رخسانہ باجی، مسرت باجی، شاہدہ باجی، نثار استاذ صابر علی، شمیم ماسٹر، فہیم اختر، ڈاکٹر سلطان ساحر، ماسٹر ظہیر السلام، شمس الحق، غلام جیلانی، بے غم وارثی اور عبدالرحیم ہلچل کنوینر کی حیثیت سے جلسے میں پیش پیش تھے۔ انتظام میں ادارہ ''محفل خوش رنگ'' کے کارکنان مستعدی سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس جلسے میں خواتین کی اچھی تعداد نے محفل کو مزید بارونق کر دیا۔ اس جلسے کو دوردرشن، کولکاتا نے coverage کیا۔ صاحبان اعزاز سے اردو اور پروگرام کے تعلق سے انٹرویو بھی لیا جس میں شری نیچے بخشی، مناظر عاشق ہرگانوی، فراغ روہوی شامل تھے۔ پروگرام کے اختتام پر جنرل سکریٹری محمد افضل خان نے تمام شرکاء اور سامعین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

● معروف ادیب مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی (نائب ناظم، امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ) کی مورخہ ۴؍فروری ۲۰۱۶ء کو مانو ریجنل سینٹر کولکاتا میں حاضری ہوئی۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ مانو کی تعلیمی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کریں، سو آج یونیورسٹی کے کاموں کی مفصل جانکاری انھیں فراہم ہوئی۔ اسی درمیان ان کی تازہ تصنیف ''حرف آگہی'' (ادب، شاعری، تنقید اور نئی کتابوں پر تنقیدی اور تاثراتی تحریریں) کی رسم رونمائی ڈاکٹر امام اعظم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ رسم رونمائی کی ادائیگی کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ ''مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ بیک وقت ادیب، محقق کے ساتھ ساتھ عالم دین اور اچھے خطیب بھی ہیں اور نائب ناظم، امارت شرعیہ کی حیثیت سے ملک بھر میں اپنی علمی اور دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے تعلقات عرصہ سے ہیں۔ یہ ان کی بیسویں کتاب ہے۔ میں انھیں تہنیت پیش کرتا ہوں۔'' صاحب کتاب مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے حاضرین سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''آج کے ادب کو سماجی تناظر میں زیادہ بہتر انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بعد اصلاً اب ادب کی 'گھر واپسی' ہو رہی ہے۔ اگر یہ واپسی صالح اقدار کے فروغ کا ذریعہ بن جائے تو ہم ادب سے سماج کی اصلاح کا بڑا کام لے سکتے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اردو ادب سے قاری کا رشتہ کمزور ہوتا جارہا ہے جس میں بڑا عمل دخل ادب میں گروہ بندی کا ہے اور اس گروہ بندی کے نتیجے میں ادب کو سخت نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ الفاظ کے استعمال میں ترسیل کے پہلو کو غالب رکھا جائے اور اجنبی تشکیلیات کی قبیل کے الفاظ سے اجتناب برتا جائے تاکہ ادب عام قاری کی پہنچ سے باہر نہ ہو۔'' ''حرف آگہی'' کے اجراء کے موقع سے کتاب کے مصنف مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید فرمایا ''ڈاکٹر امام اعظم کی شخصیت ادب، تنقید، شاعری اور صحافت کے حوالے سے بڑی وقیع ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور ان کے کام کرنے کا انداز انسانیت نوازی سے معمور ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائریکٹر کولکاتا کی حیثیت سے انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ لائق ستائش ہیں اور قابل تقلید بھی۔'' اس موقع پر کمال احمد صدیقی، اشرف احمد جعفری، مولانا رئیس احمد رحمانی (مبلغ، امارت شرعیہ، کولکاتا)، مولانا ضمیر الدین قاسمی (قاضی شریعت، امارت شرعیہ، کولکاتا)، مولانا نورالحق رحمانی (استاذ فقہ و تفسیر المعہد العالی، پھلواری شریف)، جناب ایم نصر اللہ نصر (ہوڑہ)، سید ایاز احمد روہوی، شہاب الدین ویشالوی (ادب نواز)، شاہد اقبال، راحیل شاداب وغیرہ بھی موجود تھے۔

● اُردو ادب بالخصوص شاعری کی سب سے بڑی ویب سائٹ ریختہ ڈاٹ او آر جی کے زیر اہتمام اردو کا عظیم الشان جشن نئی دہلی میں آئی این جی سی اے میں منعقد کیا گیا۔ اس سہ روزہ (۱۲ تا ۱۴؍فروری ۲۰۱۶ء) جشن میں اردو کی ممتاز ہستیوں سمیت فلم اور فنون لطیفہ کی مشہور ہستیوں نے شرکت کی۔ اُردو کے اس جشن میں کم و بیش ۸۲؍ہزار لوگوں نے شرکت کی اور اپنے پسندیدہ پروگرام کے ساتھ ساتھ اردو میلہ اور فوڈ کورٹ سے لطف اندوز ہوئے۔ واضح ہو کہ اس بار جشن میں انواع و اقسام کے کھانوں کے علاوہ اردو تہذیب کی یادگار مثلاً خطاطی اور نقاشی جیسی چیزیں لوگوں کو متوجہ کر رہی تھیں۔ جشن ریختہ کا افتتاح دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقع پر ریختہ فاؤنڈیشن

کے بانی سنجیو صراف نے اردو کی عظیم تہذیبی روایات کا ذکر کیا اور اس زبان کی خوبصورتی پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام لوگوں کا استقبال کیا۔ اس جشن میں ہر طرح کے شائقین ادب کی دلچسپی کا سامان موجود تھا، مشاعرہ، قوالی، کتابوں کا اجرا، میر و غالب کے شعری محاسن پر گفتگو، مضطر خیر آبادی کے کمیاب کلام سے تعارف، منٹو، بیدی، کرشن چندر اور اختر الایمان کی ادبی خدمات سے مخصوص متعدد سیشن میں گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، انور مقصود، گلزار، جاوید اختر، شبانہ اعظمی، نندتا داس، شمیم حنفی، حمید شاہد، آصف فرخی، اسد محمد خان، امتیاز علی، تگما نشو دھولیا، نغمہ سحر این ڈی ٹی وی، کوثر منیر، فریدون شہریار، کمار وشواس اور جاوید صدیقی جیسی ممتاز شخصیات کو سامعین نے پوری دلچسپی سے سنا اور محظوظ ہوئے۔ عام شائقین ادب کی رائے میں یہ جشن دلی کے ادبی کیلنڈر کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ گلزار نے اپنے مخصوص سیشن میں کہا کہ 'اردو کو وقت کے ساتھ بدلنا ہوگا لیکن فوری ضرورت اردو رسم الخط کو مقبول بنانے کی ہے کیونکہ ہندوستان میں نوجوان نسل اب اردو پڑھنا نہیں جانتی۔ یہ بہت خوبصورت رسم الخط ہے، اسے فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو زبان بدلے گی نہیں تو مر جائے گی، زبان کا بدلنا ضروری ہے، اگر کوئی بھی زبان وقت کے ساتھ نہیں بدلے گی تو کلاسک بنا کر طاق میں رکھ دی جائے گی۔ مشہور بالی ووڈ اداکارہ نندتا داس نے اپنے مخصوص سیشن میں کہا کہ سعادت حسن منٹو اردو کے ایسے ادیب ہیں جن کی ادبی خدمات سرحد کی دونوں جانب یکساں سراہی جاتی ہیں۔ نندتا آج کل اس لیجینڈری فکشن نویس کی زندگی پر فلم بنا رہی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ منٹو نے اپنی زندگی میں اظہار رائے کی آزادی کے لئے جو جدو جہد کی وہ آج کے دور کی اہم ضرورت ہے۔ اس جشن میں شبانہ اعظمی اور جاوید اختر نے 'کیفی اور میں' کے تحت کیفی کی داستان سنائی۔ اس تین روزہ تقریب میں الگ الگ شعبوں کے لوگوں نے شرکت کی۔ ان میں کالج کی ایک طلبہ پرگتی اروڑا بھی شامل تھیں۔ ان کا کہنا تھا اردو سے میرا پہلے کوئی تعلق نہیں تھا، میری دلچسپی نئی نئی ہے، کافی اچھی لینگویج ہے، کافی تہذیب والی لینگویج ہے، یہ بہت کم الفاظ میں بہت کچھ کہنے والی زبان ہے اور یہ تاثر غلط ہے کہ اس زبان میں صرف پرانے لوگوں کی دلچسپی ہے، ہم جیسے نوجوانوں کی بھی بہت دلچسپی ہے۔ اس جشن میں منٹو کے ایک غیر ملکی دیوانے owen نے سامع کے طور پر شرکت کی اور بات کرتے ہوئے کہا کہ میں نے لکھنؤ میں اردو سیکھی اور آج اس جشن میں اردو کلچر کی رنگارنگی دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ ریختہ نے اس زبان کے جشن کو منانے کا جو سلسلہ شروع کیا وہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس جشن میں ایک بڑی خوبی یہ بھی رہی کہ معروف اداکار عرفان خان نے تینوں دن سامع کے طور پر شرکت کی اور اپنے ٹوئٹر ہینڈل سے جشن کے ماحول اور سنجیو صراف صاحب کی ضیافت کی خوب تعریف کی۔ وہ مشاعرے کے دوران لہک لہک کر داد دیتے دیکھے گئے۔ مشاعرے میں انور مسعود، محمد علوی، خوشبیر سنگھ شاد، شارق کیفی، فاضل جمیلی اور عباس تابش کو لوگوں نے بڑی دلچسپی سے سنا۔

● معروف شاعر اور ادیب پروفیسر شہپر رسول نے ۱۵ر فروری ۲۰۱۶ء کو شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے صدر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھال لی۔ ان کی معیادِ کار تین سال کی ہوگی۔ پروفیسر موصوف گذشتہ ۴۰ر برسوں سے شعری اور ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۶ء کو بچھگاؤں، ضلع امروہہ (اتر پردیش) میں اور تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی۔ انھوں نے اپنا تحقیقی مقالہ "اردو غزل میں پیکر تراشی:

آزادی کے بعد" جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں پروفیسر عنوان چشتی کے زیر نگرانی مکمل کیا۔ ان کی کتابیں "صدف سمندر"، (۱۹۸۸ء) "پیمانۂ صفات" (۱۹۹۵ء)، "اردو غزل میں پیکر تراشی" (۱۹۹۹ء)، "چشم دروں" (۲۰۰۰ء)، "سخن سراب" (۲۰۰۲ء)، "نقش و رنگ" (۲۰۰۷ء)، "کارنامۂ شوق" (۲۰۰۹ء) شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ موصوف نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی متعدد مشاعروں اور سیمناروں میں شرکت کی ہے۔ انھیں شعری و ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد اعزازات و انعامات سے بھی نوازا گیا ہے نیز کتابوں پر دہلی، مغربی بنگال، اتر پردیش اکاڈمیوں نے بھی انعامات دئے ہیں۔

• سرزمینِ سر سید علی گڑھ میں انجمن فروغ سائنس (شاخ علی گڑھ) کے زیر اہتمام "دوسری قومی اردو سائنس کانگریس" مورخہ ۲۰ اور ۲۱ رفروری ۲۰۱۶ء کو منعقد ہوئی۔ ملکِ عزیز میں اردو زبان میں سائنس پر کام کرنے والوں کا یہ منفرد اجتماع تھا۔ عوامی دلچسپی کے اردو سائنسی مضامین یعنی پاپولر سائنس لکھنے والے ملک کی مختلف ریاستوں اور شہروں میں بستے ہیں اور ماہنامہ "سائنس" (دہلی) گذشتہ ۲۴ ربرسوں سے ان کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنا ہوا ہے۔ ماہنامہ "سائنس" (مدیر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز) بھی انجمن فروغ سائنس کا ترجمان ہے جو بلاناغہ شائع ہو رہا ہے۔ گذشتہ برس انجمن فروغ سائنس کے زیر اہتمام اولین قومی اردو سائنس کانگریس کا انعقاد دہلی کالج میں کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ یہ سائنسی اجتماع علی گڑھ میں کیا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پالی ٹیکنک آڈیٹوریم میں اس کا افتتاحی اجلاس وائس چانسلر ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ کی زیر صدارت منعقد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں NBRI کے سابق ڈائرکٹر اور اردو سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری معروف سائنسداں پروفیسر اقتدار حسین فاروقی مہمانِ خصوصی اور ڈاکٹر محمد اسلم پرویز (وائس چانسلر MANUU) مہمانِ اعزازی کے طور پر مدعو تھے۔ اس افتتاحی اجلاس میں مہمانان کا تعارف ڈاکٹر عبدالمعز شمس (ماہرِ امراض چشم و معتمد اعزازی، انجمن فروغ سائنس) اور استقبال پروفیسر ظفر احسن نے کیا۔ وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ نے اپنے خطاب میں حاضرین سے کہا کہ "آج کل مسلمانوں میں سائنسی رجحان اور مزاج نہیں پایا جاتا۔ اسی سبب ہماری قوم کافی پچھڑی ہوئی ہے۔ جب تک مسلمان سائنس سے خود کو مربوط نہیں کرتے تب تک حالات تبدیل نہیں ہوں گے۔ ہمیں مجموعی طور پر سائنسی مزاج پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔" اجلاس سے مخاطب ہوتے ہوئے اقتدار حسین فاروقی صاحب نے کہا کہ "کسی زبان کے حوالے سے سائنس کانگریس کا انعقاد از خود ایک کارنامہ ہے۔ ہم نے کبھی دوسری زبان کے حوالے سے سائنس کانگریس منعقد ہوتے نہیں پائی۔ مسلمانوں میں سائنس کا مزاج بنانے اور سائنسی و معاصر علوم سے دلچسپی پیدا کرنے کی ہر کوشش کی حوصلہ افزائی لازمی ہے۔ اس قسم کی کانفرنسیں اس جانب بڑا مقصد پورا کرتی ہیں۔ آپ نے کہا کہ جب تک مسلمان تسخیرِ نفس، تسخیرِ قلوب اور تسخیرِ دنیا کا رجحان نہیں پیدا کریں گے تب تک اسلام کا اصل پیغام پہنچا نہیں سکتے۔"

پروگرام کے خصوصی مقرر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز (وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد) نے "سائنس کیوں" کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے سائنس کی ضرورت و اہمیت برائے دعوتِ دین اور ماہنامہ "سائنس" کے اجراء و اشاعت کی از ابتدا تا حال روداد بیان کرتے ہوئے کہا کہ "دہلی میں ۱۷۶۴ء میں مدرسہ

غازی الدین کا قیام ہوا اور اسی مدرسے نے سب سے پہلے اردو میں سائنسی علوم کو منتقل کیا تھا۔ اردو میں سائنسی مواد کے فقدان کی وجہ سے انجمن فروغ سائنس (دہلی) کا قیام ۱۹۹۲ء میں عمل میں آیا اور ۱۹۹۴ء سے ماہنامہ "سائنس" جاری کیا گیا جو بلاناغہ ۲۲رسال سے جاری ہے۔" انھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ لفظ علم کے لغوی معنی "سائنس" ہی ہیں اور اس کے معنی میں نامعلوم سے معلوم کی طرف چلنا ہے۔ڈاکٹر عابد معز (حیدرآباد) نے سائنس نگاروں کا ایک تجزیہ پیش کیا جس میں ان کی عمر اور تعلیمی مراتب کا اجمالی شماریاتی جائزہ شامل تھا۔اس اجلاس میں سووینیر نیز اردو سائنس نگاروں کی ڈائریکٹری اور فہرستِ کتب کا اجرا بھی عمل میں آیا۔بعض سائنس نگاروں اور سائنس کے خدمتگاروں کو 'نشانِ امتیاز' کا اعزاز دیا گیا۔اس پروگرام کے کنوینر اسعد فیصل فاروقی کے اظہار تشکر پر اس سیشن کا اختتام ہوا اور دوپہر سے مقالہ خوانی کے مختلف سیشن دو دنوں تک جاری رہے۔یہ سیشن شعبۂ ریاضیات کے علاوہ ابن سینا اکیڈمی (دودھ پور) میں جاری رہا۔کل چھ اجلاس میں ملک کی مختلف ریاستوں اور شہروں سے آئے ہوئے پچاس سے زیادہ مقالہ نگار اور سیکڑوں مندوبین شریک ہوئے جن میں حیدرآباد، دہلی، رانچی (پروفیسر احمد سجاد)، کشمیر، ناگپور، اکولہ، اورنگ آباد، بھیونڈی (مہاراشٹر)، کولکاتا، لکھنؤ، بھوپال (ڈاکٹر محمد احسن، ریجنل ڈائریکٹر، مانو بھوپال)، گڑگاؤں، جھریا، نوئیڈا وغیرہ سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ بھی مقالہ نگاروں نے مختلف موضوعات پر سیر حاصل مطالعات و نتائج کو جدید ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے پیش کیا۔اختتامی اجلاس ابن سینا اکیڈمی میں حکیم ظل الرحمٰن صاحب کی سربراہی میں منعقد کیا گیا اس اجلاس میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے مہمان کی حیثیت سے شرکت کر کے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور سائنس نگاری کی حوصلہ افزائی کی ضرورت پر زور دیا۔خصوصاً ایسے پروگراموں کی مالی سرپرستی کرنے کی جانب توجہ دلائی۔ اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر راشد حیات نے فرمائی اور اس کے کنوینر ڈاکٹر خالد سیف اللہ تھے۔کانگریس کے جملہ شرکا کی خدمت میں انجمن فروغِ سائنس کی جانب سے سند تفویض کی گئی۔ اس اجلاس میں شاہین نظر نے سالِ گذشتہ ہم سے بچھڑنے والے سائنس نگاروں کیلئے تعزیتی قرارداد پیش کی۔ سائنس کانگریس کے اختتام پر ایک قرارداد تیار کی گئی جسے ڈاکٹر ریحان انصاری (بھیونڈی) نے تمام حاضرین کی جانب سے پیش کیا۔اس دو روزہ کانگریس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور شہر کی اہم شخصیات نے شرکت کی اور کانفرنس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ان میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر سید اقبال علی، ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن، پروفیسر عبداللطیف، پروفیسر سید مسعود احمد، ڈاکٹر مرسلین نصیر، ذیشان احمد، ڈاکٹر عبدالاحد، ڈاکٹر بلال احمد، شمیم الزماں و دیگر شخصیات شامل رہیں۔اظہارِ تشکر کے کلمات ڈاکٹر عبدالمعز شمس (معتمد اعزازی ادارہ ہذا) نے ادا کیے۔

● پندرہ روزہ "سرپرست" کے زیرِ اہتمام ۲۱رفروری ۲۰۱۶ء کو محمد علی پارک، کولکاتا میں یومِ عالمی مادری زبان کے موقع پر جشنِ اردو اور کل ہند مشاعرہ کا کامیاب انعقاد ہوا۔مشاعرہ کا افتتاح ریاستی وزیر برائے دمکل و ہنگامی خدمات جاوید احمد خاں نے کیا۔اس موقع پر سابق مرکزی وزیر محمد علی اشرف فاطمی، فیض احمد خاں (کونسلر وارڈ نمبر ۶۶)، رحمت عالم انصاری (کونسلر وارڈ نمبر ۱۳۷)، شمشیر نیوز، شمیم احمد، ڈاکٹر مشتاق احمد، خواجہ احمد حسین وغیرہ نے مادری زبان کی اہمیت کے حوالے سے اپنی باتیں رکھیں جب کہ سابق مرکزی وزیر محمد علی اشرف فاطمی نے کہا کہ" اردو کو

روزی روٹی سے جوڑنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ اردو اسکول کا طالب علم رہنے کے بعد میں نے بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سیول انجینئرنگ کی ڈگری لی اور مجھے اردو کا طالب علم ہونے کے باوجود کہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مانو کے ذریعہ اردو میں بہتیرے کورسز کرائے جارہے ہیں۔" اس موقع پر معروف مصور وسیم ریاض کپور کو "ممتاز مصور"، بشمبھر نیور کو "فخر صحافت"، فیض احمد خاں کو "درخشندہ ستارہ"، الحاج رحمت عالم انصاری کو "با اعتماد و بھروسہ مند چہرہ"، پوجا اگروال کو "بزنس پرسن آف دی ایئر"، احمد علی وارثی کو "خدمتِ خلق ایوارڈ"، اوینا ش کمار اگروال کو "سماجی کارکن"، ریحانہ خاتون کو "خاتونِ آہن" اور شمیم احمد کو "تاحیات خدمت ایوارڈ" دیئے گئے۔ پہلے دور کی نظامت پندرہ روزہ "سرپرست" کے مدیرِ اعلیٰ محبوب رضا نے کی۔ اس کے بعد کل ہند مشاعرہ زیرِ صدارت حبیب ہاشمی اور زیرِ نقابت ڈاکٹر کلیم قیصر انجام پذیر ہوا۔ مشاعرے کے دیگر شعراء میں طاہر فراز، ڈاکٹر نزہت انجم، ڈاکٹر نسیم نکہت، حسن کاظمی، جمیل خیر آبادی، حامد بھساولی، افضل منگلوری، سہیل عثمانی، نواب آرزو، مصداق اعظمی، رحمت اللہ اچانک، کلیم ثمر، کشش وارثی، طارق متین، مرلی دھر طالب (آئی پی ایس)، نظیر راہی، جمال احمد جمال، فراغ روہوی، ڈاکٹر امام اعظم، مشتاق ہاشمی، خواجہ احمد حسین شامل تھے۔ مشاعرہ میں دیر رات گئے ساڑھے تین بجے تک سامعین اپنی نشستوں پر براجمان ہوکر شعراء کے کلام سے لطف اندوز ہوتے رہے جو مشاعرہ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

وفیات

● کولکاتا کی معروف ملی شخصیت عطاء الرحمٰن (ولادت یکم مئی ۱۹۴۵ء بمقام دہلی) کا انتقال ۳۱؍ مارچ ۲۰۱۵ء کو ہوگیا۔ یکم اپریل کو نمازِ جنازہ مسجد ناخدا میں ہوئی اور تدفین سولہ آنہ قبرستان، خضر پور میں عمل میں آئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں بیوہ گلزار بیگم کے علاوہ دو بیٹے محمد شاہد الرحمٰن اور محمد ساجد الرحمٰن (مقیم جدہ) اور ایک بیٹی حنا (دہلی) ہیں۔ مرحوم ماہنامہ "انشاء" کولکاتا کے مدیر معروف شاعر، ادیب اور صحافی ف۔س۔ اعجاز کے بڑے بھائی تھے۔ مرحوم انجمن خدام الحجاج کے اعزازی سکریٹری، مسلم یتیم خانہ کلکتہ کے نائب صدر اور رویتِ ہلال کمیٹی، مسجد ناخدا کے کنوینر تھے ساتھ ہی اشاعتی ادارہ "اعجاز پرنٹرس" کے مالک تھے۔ اپنے پریس سے انھوں نے دین کی تبلیغ و اشاعت کا بڑا کام کیا۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں مرحوم نے "فانوس" نامی ایک اردو ڈائجسٹ جاری کیا جو ملک کا اولین اردو ڈائجسٹ تھا۔ ۱۹۶۸ء تک اس کی باقاعدگی سے اشاعت ہوتی رہی۔

● اردو کے ممتاز صحافی جی ڈی چندن (گربچن داس چندن) کا ۷؍ اپریل ۲۰۱۵ء کو احمد نگر مہاراشٹر میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی ولادت باغبان پور، لاہور میں ۸؍ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ہوئی تھی۔ موں نے اپنی تمام عمر اردو صحافت کی خدمت میں گزاری۔ اردو صحافت کی تاریخ پر انجہانی اتھارٹی بھی تھے۔ ان کی اہم کتابوں میں "اردو صحافت پر ایک نظر"، "اردو صحافت کا سفر"، "جام جہاں نما: اردو صحافت کی ابتدا"، "جمنا داس اختر: شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات" کے علاوہ اردو صحافت کی تاریخ و تدوین پر سینکڑوں مقالے و مضامین شامل ہیں۔ انھیں دہلی اردو اکاڈمی اور اتر پردیش اردو اکاڈمی نے صحافتی خدمات کے خصوصی ایوارڈ سے نوازا تھا۔ جی ڈی چندن نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور جرنلزم میں ڈپلوما بھی کیا تھا۔ تقسیم سے پہلے

اگست ۱۹۴۷ء میں ہجرت کی اور ۱۹۴۸ء میں حکومت ہند کے پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) میں ملازمت اختیار کی جہاں سے اگست ۱۹۸۰ء میں شعبۂ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔ وہ روزنامہ ''منصف'' (حیدرآباد) سے بھی وابستہ رہے۔ احمد نگر میں ہی ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

● معروف افسانہ نگار اور صحافی ڈاکٹر مظہر سلیم (ولادت: ۳؍جنوری ۱۹۵۹ء بمقام ملکہ پور، ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر سابق ایڈیٹر سہ ماہی ''تشکیل'' بھیونڈی) کا ۲۱؍اپریل ۲۰۱۵ء کی صبح ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا ہے۔ وہ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں کے ساتھ مراٹھی زبان سے بھی واقف تھے۔ ان کا پیشہ ورانہ کیریئر میونسپل ٹیچرس ٹریننگ کالج، ماہم سے شروع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے انجمن اسلام انگلش ہائی اسکول، ممبئی، گلشنِ اسلام اردو ہائی اسکول اندھیری اور ایس ای ایم ٹی جونیئر کالج میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۲ء سے ۲۰۱۴ء تک ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے، جن میں ایک مجموعہ ''بھیتر باہر کا آدمی'' ہندی افسانوں پر مشتمل ہے۔ اردو افسانوں کے مجموعے میں جہاد، اپنے حصے کی دھوپ، نیا منظر نامہ اور منحیاں شامل ہیں۔ ہم عصر افسانہ نگاروں میں ان کا نام اس لئے اہم ہے کہ انھوں نے عصری مسائل کو اپنی نظر سے دیکھا اور اچھے برے پہلوؤں کو علامتی انداز میں نشان زد کیا ہے۔ وہ ادبی صحافی بھی تھے۔ ''تشکیل'' بھیونڈی کی ۱۹۸۸ء سے ۲۰۱۳ء تک ادارت کی، جس کے کئی خصوصی شمارے بھی اس درمیان منظرِ عام پر آئے۔ انھیں کئی ایوارڈ و اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔

● ممتاز فکشن نگار اقبال متین ۵؍مئی ۲۰۱۵ء کو اپنی رہائش گاہ ایرپلی (حیدرآباد) میں رحلت فرما گئے۔ وہ ۲؍فروری ۱۹۲۹ء کو حیدرآباد (دکن) کے رام کوٹ محلے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے اولین افسانوں کے مجموعے ''اجلی پرچھائیاں'' ہی سے ادبی حلقوں میں شناخت بنالی تھی۔ ابتدا میں اقبال متین شاعری بھی کرتے تھے مگر ان کا اصل میدان افسانہ نگاری بنا۔ وہ ممتاز ترقی پسند شاعر و ادیب مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور سلیمان اریب جیسوں کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ انھوں نے زندگی کے کئی حقائق کو طشت از بام کیا تھا اور اپنے بے باک قلم کو ترجمان بنایا تھا اسی لئے ان کے افسانوں کو مقبولیت ملی۔

● معروف صنعت کار اور بانی گجرات امبوجا سیمنٹ، سریش نیوٹیا (ولادت ۱۹۳۶ء) کا ۷؍مئی ۲۰۱۵ء کو کولکاتا میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لینے والے سریش نیوٹیا گنگا۔جمنی تہذیب کی زندہ مثال تھے اور ان کی اردو نوازی بے مثل تھی۔ اردو ادیبوں اور شاعروں سے ان کی دیرینہ مراسم تھے۔ شہر کولکاتا کی باغ و بہار شخصیت اور گینزبک ریکارڈ یافتہ جناب صلو چودھری سے ان کی گہری دوستی تھی۔ جب صلو صاحب نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا تو سب سے زیادہ خوشی سریش جی کو ہوئی اور وہ فخر سے اس کی کاپیاں اپنے حلقۂ احباب میں دکھاتے تھے۔ انھیں ۲۰۰۸ء میں پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ آنجہانی سریش نیوٹیا کی رحلت پر سابق رکن پلاننگ کمیشن اور سابق چانسلر، مانو حیدرآباد، کالم نگار و ادیبہ محترمہ سیدہ سیدین حمید نے ۱۰؍مئی ۲۰۱۵ء کو اپنے کالم مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا کولکاتا میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنا بڑا بھائی قرار دیا۔

● معروف افسانہ نگار ڈاکٹر م.ق.خان (ولادت: ۱۱؍جنوری ۱۹۴۰ء بمقام موضع بیروہ، ضلع گیا) کا ۲۶؍مئی ۲۰۱۵ء

کو گیا (بہار) میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم انگریزی کے استاد تھے لیکن اردو میں افسانے لکھتے تھے۔ گیا شہر کی ادبی مجلسوں ومحفلوں میں اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ ان کے افسانے سیاسی اور اخلاقی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مقاصد کو سامنے رکھ کر ظالم و مظلوم کے تقاضے سے اپنے افسانوں کو منور کرتے تھے۔ ان کے علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی اور بزمِ شہر نشاط نے انھیں اعزازات سے نوازا۔

● معروف شاعر، محقق اور ادیب ش.م. عارف ماہر آروی (اصل نام شیخ محمد عارف ماہر آروی) کا انتقال ۳۰ رمئی ۲۰۱۵ء کو محلہ برہ بترا، آرہ، ضلع بھوجپور میں ہوگیا۔ وہ آرہ کی ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں، اردو زبان وادب کے بے لوث خادم اور حقیقی معنوں میں چلتی پھرتی انجمن تھے۔ وہ شاعر، محقق، ادیب کی حیثیت سے معروف تھے۔ ان کی عمر تقریباً ۸۰ رسال تھی۔ مرحوم سے راقم کے تعلقات برسوں سے تھے اور ان سے مراسلت بھی تھے۔ وہ نہایت خلیق اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی جس کی شادی دربھنگہ کے فیض اللہ خاں محلے میں ہوئی تھی، اسی سلسلے میں ان کا دربھنگہ آنا جانا ہوتا تھا۔ ان کی تخلیقات ''تمثیلِ نو'' میں باقاعدہ شائع ہوتی تھیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات ریجنل سینٹر دربھنگہ میں ۴ رجون ۲۰۰۷ء کو ہوئی تھی۔ مرحوم پٹنہ ہائی کورٹ سے ایک عرصہ قبل سبک دوش ہوچکے تھے۔ ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

● معروف افسانہ نگار، ڈراما نویس اور صحافی سعید پریمی (اصل نام سعید الدین احمد) کا ۹ رجون ۲۰۱۵ء کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا اور بعد نماز ظہر ۳ رگوبرا قبرستان تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم اسلامیہ ہائی اسکول میں تاریخ کے استاد تھے۔ ان کے سینکڑوں افسانے اخبارات ورسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ''چہرے کی واپسی'' اور ''میرے اپنے'' نیز ان کا ناولٹ ''میری بستی میرے لوگ'' مقبولِ عام ہوچکے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی آپ بیتی ''اَن کہی'' کے نام سے شائع ہوئی۔ وہ روزنامہ ''آبشار'' کی مجلسِ ادارت سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ مارکسوادی کمیونسٹ پارٹی کے پرانے رکن تھے۔ ۲۰۰۰ء میں وہ کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے کونسلر بھی منتخب ہوئے اور ایم ایم آئی سی بھی رہے۔ پسماندگان میں بیوہ مہ جبیں نبی کے علاوہ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ ان کی رحلت پر بزرگ شاعر علقمہ شبلی کا قطعہ آزاد ہند میں شائع ہوا تھا:

جن کی شہرت تھی پریمی سے ادب کی بزم میں	اٹھ گئے محفل سے اپنی وہ سعیدِ خوش خصال
ان کی تربت پر نزولِ رحمتِ یزداں رہے	بخش دے ساری خطائیں ان کی ربِّ ذوالجلال

● معروف شاعر وصحافی ڈاکٹر سرور عثمانی (اصل نام سرور جاوید، ولادت: ۱۶ رجولائی ۱۹۴۶ء بمقام موضع: رجہت، ضلع نوادہ) کا ۲۶ رجون ۲۰۱۵ء کو رانچی میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم ایک اچھے شاعر، صحافی اور زندہ دل انسان بھی تھے۔ ان کے والد قیوم اثر ایک اہم سوشلسٹ لیڈر تھے۔ سرور عثمانی نے شاگردِ غالب علی پیر بیگھوی پر تحقیقی مقالہ قلمبند کر کے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد یونین بینک کی ملازمت اختیار کرلی۔ ان کے دو شعری مجموعے ''جانم'' اور ''رفتہ رفتہ'' کے نام سے زیرِ ترتیب تھے۔ ایک ناولٹ ''غزلم'' بھی اشاعت کے مرحلے میں تھا۔ جنوری ۱۹۷۹ء میں انھوں نے ایک ادبی ماہنامہ ''اب'' کے نام سے نکالا تھا جو بعد میں ''مفاہیم'' کے نام سے معروف

ہوا۔ اس کے کئی شمارے مثلاً ''جدید اردو کہانی نمبر''، ''۱۹۸۰ء کا ادب نمبر'' وغیرہ دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔

● ہندی کے ممتاز ادیب شاعر، ناقد کملیش (اصل نام کملیش چرن شکلا) کا ۲۷؍جون ۲۰۱۵ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کی آخری رسومات ۲۸؍جون کو دہلی کے لودھی روڈ میں ادا کی گئی۔ آنجہانی ۱۹۳۸ء میں گورکھ پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ وہ ہندی ادب میں کملیش کے نام سے اپنی شناخت رکھتے تھے۔ ایمرجنسی کے دوران وہ ۱۹؍ماہ تک تہاڑ جیل میں بند رہے۔ ۱۹۵۸ء میں ''کلپنا'' ہندی میگزین کے ادارتی بورڈ میں شامل تھے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۷ء تک مشہور سماج وادی لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے پرائیوٹ سیاسی سکریٹری بھی رہے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک ''پرتی پکشہ'' کے بانی مدیر رہے۔ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۴ء تک نرالا سریجن پیٹھ بھارت بھون کے صدر رہے۔ ان کے ۳؍مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے جن میں ''جرتکارو'' (۱۹۸۵ء) اور ''کھلے میں آوارہ'' (۲۰۰۸ء) اہم ہیں۔ وہ روسی ادب پر بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے دنیا کے مشہور شاعر پابلو نیرودا کی نظموں کا ہندی ترجمہ بھی کیا تھا۔ ان کے قریبی دوستوں میں اشوک واجپئی کے نام قابل ذکر ہیں۔

● نامور ناول نگار عبداللہ حسین (اصل نام محمد خان، ولادت ۱۴؍اگست ۱۹۳۱ء) کا طویل علالت کے بعد لاہور میں ۴؍جولائی ۲۰۱۵ء کو انتقال ہوگیا۔ عبداللہ حسین نے باگھ، قریب، نشیب (کہانیوں کا مجموعہ) اور نادار لوگ جیسے کئی مقبول ناول تحریر کیے لیکن ان کی اصل وجہ شہرت، ان کا ناول ''اداس نسلیں'' (۱۹۶۳ء) بنا جسے نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سطح پر بھی بہت پذیرائی ملی۔ بی بی سی (لندن) نے عبداللہ حسین کی کہانی "The Return of Journeys" کی اساس پر "Brothers in trouble" کے نام سے ایک فیچر فلم بھی بنائی تھی۔ انگلینڈ میں قیام کے دوران عبداللہ حسین نے اپنے ناول ''اداس نسلیں'' کا انگریزی ترجمہ "The Weary Generations" کے نام سے کیا تھا۔ انگریزی میں ان کا پہلا ناول "Emigre Journeys" کے نام سے 2000 میں لندن سے شائع ہوا۔ اس کے بعد عبداللہ حسین ''افغان گرل'' کے نام سے ایک ناول لکھ رہے تھے۔ ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے انھیں ۲۰۱۲ء میں پاکستان کے سب سے بڑی ادبی ایوارڈ ''کمال فن'' سے نوازا تھا جب کہ ''اداس نسلیں'' پر انھیں آدم جی ایوارڈ بھی ملا تھا۔

● معروف شاعر اور ادیب بشر نواز (ولادت ۱۸؍اگست ۱۹۳۵ء، ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹر) کا انتقال ۹؍جولائی ۲۰۱۵ء کو انتقال ہوگیا۔ اسی دن بعد نماز عصر ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''رائیگاں'' (۱۹۷۲ء) شائع ہوا تھا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''اجنبی سمندر'' ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ ''نیا ادب نئی نسل'' شائع ہو چکا ہے۔ ان پر ویزول سینٹر اورنگ آباد نے ایک ڈاکومینٹری فلم بھی تیار کی تھی۔ انھوں نے ساگر سرحدی کی مشہور زمانہ فلم ''بازار'' میں نغمہ نگاری بھی کی۔ انھوں نے ٹی وی سیریل امیر خسرو کا اسکرپٹ بھی تیار کیا تھا۔ وہ ایک تخلیقی فن کار تھے۔ ان کی شاعری میں روایت کی پاسداری بھی ہے اور جدیدیت کی آبیاری بھی۔ انھیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ کے علاوہ ریاستی اردو اکاڈمی کے ایوارڈ بھی تفویض کیے گئے تھے۔ پسماندگان میں چار بیٹے اور سات بیٹیاں ہیں۔ ان کا مشہور شعر :

ہم نے خود موم کی مانند پگھلنا چاہا — چاہتے تو کسی پتھر کی جی لیتے

• روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ کے مدیر جناب ایس ایم اجمل فرید (ولادت ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۹ء) کا ۱۵ر جولائی ۲۰۱۵ء بمطابق ۲۷ر رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ عین افطار کے وقت انتقال ہوگیا۔ انھیں ۳ر روز قبل برین ہیمرج ہوا اور انھیں بغرض علاج دہلی لے جایا گیا جہاں وہ اپولو ہسپتال میں زیرِ علاج رہے۔ وہاں سے انھیں ۱۵ر جولائی کو پٹنہ میڈیکل کالج ہسپتال کے آئی سی یو میں داخل کرایا گیا اور کچھ وقت کے بعد وہیں ان کی روح پرواز کرگئی۔ ان کی نمازِ جنازہ ۱۶ر جولائی ۲۰۱۵ء کو بعد نمازِ ظہر انجمن اسلامیہ ہال میں ادا کی گئی اور تدفین شاہ گنج قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی رحلت سے صحافتی، ادبی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ روزنامہ ''قومی تنظیم'' کو ایک پودے سے تناور درخت بنانے میں مرحوم نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، وہ ایک روشن باب ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ان کے والد ایس ایم عمر فرید نے دربھنگہ سے ہفتہ وار ''قومی تنظیم'' کا اجرا کیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں یہ اخبار دربھنگہ سے پٹنہ منتقل ہوگیا اور ۱۹۸۶ء سے آفسیٹ پر شائع ہونے لگا۔ تقریباً ۳۰ر برسوں تک مرحوم نے اس اخبار کی ذمہ داری سنبھالی۔ ان کی قیادت میں یہ اخبار ۱۶ر اپریل ۲۰۰۴ء سے جھارکھنڈ کے دارالحکومت رانچی سے، ۲ر فروری ۲۰۱۲ء سے اتر پردیش کے لکھنؤ اور اسی کے آس پاس کولکاتا (مغربی بنگال) سے اس کی اشاعت شروع ہوئی تھی۔ ۲۲ر ستمبر ۲۰۰۵ء سے اس اخبار کی رنگین طباعت شروع ہوئی تھی۔ ۱۹۹۹ء میں قومی تنظیم پبلی کیشن پرائیوٹ لمیٹڈ بنا۔ دہلی ایڈیشن کی تیاری ابھی چل ہی رہی تھی کہ اجمل صاحب نے داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اس اخبار کو ملت کا ترجمان بنانے میں مرحوم کے ساتھ ان کے بڑے بھائی چیف ایڈیٹر ایس ایم اشرف فرید اور چھوٹے بھائی مینیجنگ ایڈیٹر ایس ایم طارق فرید کو جاتا ہے۔ مرحوم اپنے ماتحت کام کرنے والوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور کبھی سخت زبان کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۲ر بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ راقم (ڈاکٹر امام اعظم) سے ان کے دیرینہ مراسم تھے اور اکثر فون پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔

• مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر بشیشر پردیپ کا ۲۰ر جولائی ۲۰۱۵ء کو حرکتِ قلب بند ہوجانے کے سبب انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہیں۔ ان کی آخری رسوم بھینسا کنڈ میں ادا کی گئیں جس میں شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان کے بیشتر افسانے نسوانی کرداروں کے خانگی مسائل پر مبنی تھے۔ ان کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر مجیب علی صدیقی کی کتاب ''ڈاکٹر بشیشر پردیپ: فکر و فن'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی عمر تقریباً ۹۰ر برس تھی۔

• بزرگ صحافی، شاعر، محقق اور مورخ جناب اکمل یزدانی جامعی (ولادت: ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء) ۲۵ر جولائی ۲۰۱۵ء کو رات کے آخری پہر ۳-۳۵ر بجے اپنی رہائش گاہ (منور منزل، پوناس، ضلع کشن گنج) میں دارِ فانی سے دارِ بقا کو کوچ کرگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اسی روز ۳ر بجے دوپہر نمازِ جنازہ علاقے کے مشہور عالم جناب عابد حسین نے پڑھائی اور آبائی قبرستان میں ہزاروں اشک بار آنکھوں نے انھیں سپردِ خاک کیا جن میں مولانا اسرار الحق قاسمی (ایم پی)، جناب تسلیم الدین (ایم پی)، اختر الایمان (سابق ایم ایل اے) کوچا دھامن، ماسٹر مجاہد عالم (موجودہ ایم ایل اے)، پروفیسر احمد حسن دانش، شمس جلیلی ایڈوکیٹ، ڈاکٹر گلریز، ڈاکٹر ضمیر عالم اور ہزاروں شاگردان شامل تھے۔

ابتدائی دنوں میں مرحوم نے مولانا یونس، سلیمان چک ہنگر نوہسا، ضلع پٹنہ سے اپنے گھر پر درس لیا۔ ۱۹۴۳ء میں کلانند ودیالیہ گڑھ بنیلی پورنیہ سے میٹرک کیا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ سی ایم کالج دربھنگہ میں متعلم رہے جہاں ان کے مراسم جناب مولانا عبدالعلیم آسی، مظہر امام، شاداں فاروقی، حسنین سید جامعی و دیگر افراد سے قائم ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا جہاں ۱۹۵۰ء میں بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ چوں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) انھیں بحیثیت شاگرد بے حد عزیز رکھتے تھے، اس لیے ان کی ہی خواہش پر ۱۹۵۲ء میں میرٹھ کالج، آگرہ یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے کیا جہاں ماہر معاشیات جناب بھٹنا گر کی شاگردی کا شرف انھیں حاصل رہا۔ مولانا اسلم جیراج پوری، شفیع الدین نیر، ڈاکٹر عابد حسین اور ڈاکٹر محمد مجیب کے بھی وہ محبوب شاگرد رہے۔ مرحوم نے پہلے کامل پھر اکمل تخلص فرمایا اور ادبی، علمی، سماجی و ملی حلقوں میں اکمل یزدانی جامعی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی درجنوں مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابیں منظر عام پر آکر داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔ مطبوعہ کتابوں میں پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت، پورنیہ کے دو ولی، کھگڑا، کھگڑا امیلہ اور راجگان کھگڑا، حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ کے اسفار بہار اور مکتوبات منور (اس علاقے کے جید بزرگ حضرت مولانا منور حسینؒ خلیفہ حضرت شیخ الحدیث شیخ محمد زکریاؒ سہارن پوری کے مکاتیب کی ترتیب) شامل ہیں نیز ان کے علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی مضامین ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی ایک روداد ''کھگڑا امیلہ مشاعرہ کی ایک جھلک'' اردو جریدہ ''تمثیلِ نو'' جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء نیز فارسی سے ترجمہ شدہ نظم ''سو سال پہلے کا کلکتہ'' جولائی ۲۰۱۳ء تا جون ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئی۔ وہ راقم الحروف (ڈاکٹر امام اعظم) کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور ''تمثیلِ نو'' کا شدت سے انتظار کرتے۔ موصوف ایک کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ان کے یہاں غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی ملتی ہیں۔ پابند اور آزاد دونوں طرح کی نظموں پر طبع آزمائی کرتے تھے نیز حمد اور نعت بھی کہتے تھے۔ مرحوم جن دنوں جامعہ میں زیر تعلیم تھے تو انھوں نے ۲۵ ستمبر ۱۹۴۹ء کو انجمن تعمیر پسند مصنفین کی بنیاد رکھی جس کا مقصد جامعہ نگر کے ان شعراء و ادباء کو منظم کرنا تھا جو ادب برائے تعمیر کے حامی ہوں اور اس کے جلسے ہر ماہ کے آخری اتوار کو ہوا کرتے تھے۔ (بحوالہ: سہ روزہ ''الانصاف'' الہ آباد ۱۳ راکتوبر ۱۹۴۹ء ص: ۴) جب جامعہ سے واپس کشن گنج لوٹے تو وہاں بھی حلقۂ تعمیر پسند مصنفین قائم کیا جس کی نشستیں برابر ہوتی رہتیں جن میں تعمیر پسند ادب کے حامی ادباء و شعراء کے افسانے، نظمیں، غزلیں، قطعات اور رباعیات پیش کی جاتی تھیں۔ ان پر تنقید اور تبصرے بھی ہوتے تھے۔ (بحوالہ: پورنیہ میں چند ماہ، پرواز اصلاحی ''پورنیہ نمبر'' ۱۹۵۵ء ص: ۵)۔ شاعری میں مرحوم نے داتا ندوی سہرامی سے اصلاح لی جو سید سلیمان ندوی کے ہم سبق تھے۔ اکمل یزدانی نے اپنے علاقے کشن گنج سے سہ روزہ ''انسان''، ہفت وار ''ساحل'' و ''آئینہ'' اخبارات و رسائل نکالے۔ ''انسان'' کا ''پورنیہ نمبر'' جو ۱۹۵۴ء-۱۹۵۵ء کے درمیان شائع ہوا، اس کی تحقیقی حیثیت مسلم ہے۔ انھوں نے اپنے علاقے میں سلیمان اکاڈمی، بہادر گنج، کشن گنج، ذاکر حسین لائبریری، بیرنگر، ارریا، بزم ذاکر حسین ارریا، منور اکاڈمی کشن گنج، منور ہیلی کیشن پورنیہ، دارالعلوم بہادر گنج وغیرہ ادارے قائم کیے جن کے بانی جنرل سکریٹری بھی رہے نیز دیدار بخش ہائی اسکول، بیرنگر، بسہریا (موجودہ ضلع ارریا)

قائم کیا جہاں کے بانی ہیڈ ماسٹر بھی رہے اور وہیں سے ۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء کو عزت و افتخار کے ساتھ وظیفہ یاب ہوئے۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین بہار کے گورنر ہوئے تو اپنے محبوب شاگرد اکمل یزدانی کے قائم کردہ اسکول بھی تشریف لائے اور تقریباً ۲ رگھنٹوں تک قیام کیا۔ مرحوم نے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ سے شرف بیعت کیا اور ان کے خلیفہ حضرت مولانا امام الدین سے خلافت ملی۔ حضرت منور حسین اور حضرت مولانا امام الدین کے زیر تربیت بھی رہے اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اپنے مکان کا نام حضرت منور حسین کے نام پر منور منزل رکھا۔ ان کے پسماندگان میں ۴ ربیٹے ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ)، ڈاکٹر غلمان یزدانی، ریان یزدانی اور ڈاکٹر محمد نعمان یزدانی کے علاوہ ۲ ربیٹیاں ہیں۔ مرحوم ۶ رماہ پہلے ایک فریکچر سے دوچار ہوئے تھے اور تب سے صاحب فراش تھے۔

● بھارت کے سابق صدر اور ممتاز سائنس داں و میزائل مین آف انڈیا ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام (اصل نام ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام ولادت ۱۵ ر اکتوبر ۱۹۳۱ء بمقام رامیشورم، تمل ناڈو) کا ۲۷ رجولائی ۲۰۱۵ء کو حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ اس وقت آئی آئی ایم شیلانگ میں ایک تقریب سے خطاب کر رہے تھے کہ گر پڑے۔ انھیں فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا جہاں ان کی وفات کی تصدیق کردی گئی۔ ان کی وفات پر مرکزی حکومت نے ۷ ردنوں کے قومی سوگ کا اعلان کیا۔ ان کے جسد خاکی کو گوہاٹی کے راستے پہلے دہلی لے جایا گیا اور پھر وہاں سے رامیشورم لے جایا گیا جہاں ۳۰ رجولائی ۲۰۱۵ء کو پورے سرکاری اعزازات کے ساتھ ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کو حکومت ہند کی طرف سے ۱۹۸۱ء میں پدم بھوشن، ۱۹۹۰ء میں پدم وبھوشن اور ۱۹۹۷ء میں ملک کا اعلیٰ ترین شہری اعزاز بھارت رتن سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں ملک و بیرون ملک کی کئی مشہور جامعات نے انھیں ڈاکٹر کی اعزازی سند سے نوازا تھا۔ ۲۵ رجولائی ۲۰۰۲ء کو انھوں نے ملک کے گیارہویں صدر کی حیثیت سے حلف لیا اور ۲۵ رجولائی ۲۰۰۷ء کو اس عہدے کی میعاد مکمل کی۔ انھوں نے ہندوستان کو ایک عظیم اور طاقتور ملک بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ ان کی بیشتر کتابوں میں اس تصور کا خاکہ پیش کیا۔ ان کی سربراہی میں 'اگنی' اور 'پرتھوی' جیسے میزائلوں کا کامیاب تجربہ کیا گیا جس سے ملک کی دفاعی طاقت میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ اس زبردست کارنامے پر انھیں 'میزائل مین آف انڈیا' کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۹۹ء میں انھیں ملک کا سائنسی مشیر بنایا گیا۔ مرحوم رامیشورم قصبے کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد زین العابدین ماہی گیر تھے۔ ان کی والدہ کا نام آشی اماں تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ ان کا بچپن جدوجہد میں گزرا۔ ابتدائی دور میں انھوں نے اپنے غریب والدین کی مدد کے لئے گھوم گھوم کر اخبار بھی فروخت کیا۔ ان کی اہم کتابوں میں "Wings of Fire" (اردو میں "پرواز" کے نام سے ترجمہ کیا گیا)، انڈیا 2020ء اور "Ignited Minds" اور "My Journey" (اردو ترجمہ "میرا سفر") اہم ہیں۔ مرحوم نے پوری زندگی مجرد گزاری۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "اپنی پہلی جیت کے بعد آرام نہ کریں اس لئے کہ اگر دوبارہ ناکام ہوئے تو لوگ آپ کی پہلی کامیابی کو محض اتفاق سے تعبیر کریں گے۔...... خواب دیکھا کیجئے اس لئے کہ خواب فکر اور فکر عمل کو مہمیز کرتے ہیں۔ خواب وہ نہیں

جو ہم سوتے میں دیکھتے ہیں بلکہ خواب وہ ہے جس کو پورا کرنے کے لئے ہم راتوں میں جاگتے ہیں اور اس کو پورا کئے بغیر سوتے نہیں۔..... خوبصورتی دل میں ہوتی ہے۔ چہرے میں نہیں۔'' مرحوم سیکولر اور گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ وہ ہر مذہب کی دل سے قدر کرتے۔ انھوں نے ۴ر فروری ۲۰۰۴ء کو امارت شرعیہ بہار جا کر مولانا منت اللہ رحمانی پارامیڈیکل کا افتتاح کیا اور ۳۱ر مئی ۲۰۰۴ء کو خانقاہ رحمانی مونگیر میں سورۃ فاتحہ کی تلاوت کی اور کہا کہ سائنس کو انھوں نے قرآن سے سیکھا ہے اور ان کی تعلیم بھی مدرسے میں ہوئی ہے۔

● دربھنگہ شہر کی معروف ملی شخصیت ڈاکٹر سید عبدالحلیم کا طویل علالت کے بعد ۷ر اگست ۲۰۱۵ء کو بعد نماز جمعہ دربھنگہ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تجہیز و تکفین ۸ر اگست کو ۲ر بجے دن میں لہریا سرائے کے چک زہرا قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی عمر تقریباً ۷۰ر سال کی تھی۔ موت کا سبب گردوں کا بے کار ہو جانا تھا۔ مرحوم مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند کے نائب صدر، صوبائی جمعیۃ اہلحدیث بہار کے صدر اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تھے نیز دربھنگہ کے مشہور تعلیمی ادارہ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ کے جوائنٹ سکریٹری، سلفیہ اسکول کے ڈائرکٹر اور سلفیہ یونانی میڈیکل کالج کے جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز رہ کر دینی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہے تھے۔ مرحوم مسلم پرسنل لا بورڈ کے تاسیسی نائب صدر اور ہندوستان کی معروف شخصیت ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم اپنی تعلیمی سرگرمی اور ملی خدمات کے لیے پوری ریاست میں پہچانے جاتے ہیں۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ مرحوم مریضوں کا علاج، معاینہ مفت میں کیا کرتے تھے۔

● معروف ادیبہ حمیدہ سالم (ولادت ۱۹۲۶ء، رُدولی یوپی) کا ۱۶ر اگست ۲۰۱۵ء کو جامعہ نگر، نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین ۷ار اگست کو جامعہ نگر اوکھلا قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں شوہر ابو سالم، بیٹا عرفان سالم اور بیٹی سنبل وارثی ہیں۔ مرحومہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی خاتون ایم اے تھیں۔ ان کی تصنیفات میں شورش دوراں، ہم ساتھ تھے، پرچھائیوں کے اجالے اور ہردم رواں ہے زندگی اہم ہیں۔ مرحومہ ممتاز ترقی پسند شاعر اسرار الحق مجاز کی چھوٹی بہن اور معروف شاعر اور نغمہ نگار جاوید اختر کی خالہ تھیں۔ اپنے بھائی مجاز کے انتقال کے بعد ان کی زندگی پر مبنی طویل سوانحی مضمون ''جگن بھیا'' کو کافی سراہا گیا تھا اور ان کے ایک ایک جملے سے بہن کی محبت ٹپکتی تھی۔

● ملک کی خاتون اول محترمہ سوورا مکھر جی (اہلیہ صدر جمہوریہ ہند شری پرنب مکھر جی ولادت: ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۰ء، بمقام جیسور، غیر منقسم بنگال) کا ۱۸ر اگست ۲۰۱۵ء کی صبح نئی دہلی کے آرمی ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ پھیپھڑوں کے سرطان کے عارضہ میں مبتلا تھیں۔ وہ ۱۰ر برس کی عمر میں کلکتہ آ گئیں اور یہاں تاریخ اور سیاسیات میں ماسٹر ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۵۷ء کو ان کی شادی شری پرنب مکھر جی سے ہوئی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی بڑی مداح محترمہ سوورا مکھر جی کو موسیقی، مصوری اور دیگر فنون لطیفہ میں گہری دلچسپی تھی۔ ان کی ایک شناخت ربندر سنگیت کی ماہر مغنیہ کی بھی تھی۔ انھوں نے بنگلہ زبان میں دو کتابیں ''چوکھیر آلوئے'' (سابق وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی کے ساتھ ان کے نزدیکی مراسم کا ذکر) اور ''چینا آچینائی چین'' (چین کا سفرنامہ) ہے۔

● معروف شاعر، ادیب وصحافی عتیق مظفر پوری (ولادت یکم دسمبر ۱۹۵۴ء) کا ۱۸ر اگست ۲۰۱۵ء کو پٹنہ کے پارس

سپر اسپیشلٹی ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ تدفین ۱۹؍اگست کو بعد نمازِ مغرب ان کے آبائی وطن موضع مبیش استھان، اورائی بلاک، ضلع مظفر پور میں عمل میں آئی۔ مرحوم روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' سے وابستہ تھے۔ انھوں نے پندرہ ''سائبان'' ۲۰۰۳ء میں جاری کیا تھا۔ قبل ازیں ہفت روزہ ''اخبارِنو'' کو بھی اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ اپنا ہفت روزہ ''تیسرا راستہ'' بھی نکالا تھا۔ مرحوم کی ادبی وصحافتی خدمات کئی دہائیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین شادی شدہ بیٹیاں اور چار بیٹے بشمول جاوید رحمانی (صحافی، ''ہماری زبان'' دہلی)، ڈاکٹر تنویر عالم، ڈاکٹر محمد عادل اور ڈاکٹر محمد مختار عالم ہیں۔

● معروف ادیب وشاعر کامران ندیم (ولادت ۱۷؍ستمبر ۱۹۶۱ء بمقام راولپنڈی، پاکستان) کا انتقال ۱۹؍اگست 2015ء کو ایڈیسن شہر، صوبہ نیوجرسی، امریکہ میں ہوگیا۔ وہ برسوں سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ آزاد نظم اور نثری نظم خوب کہتے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''وحشت ہی سہی'' ۲۰۱۳ء میں منظرِ عام پر آیا تھا اور وہ پرنٹنگ کے کاموں سے وابستہ تھے۔ پسماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹا ہے۔ ان کی بیوہ نے مرحوم کے نام پر ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے اور پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرحوم پر بہت جلد کتاب منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ مئی ۲۰۱۴ء میں دھنباد (جھارکھنڈ) سے معروف افسانہ نگار اور صحافی پروفیسر سید منظر امام اپنی عزیزہ ڈاکٹر ثمرینہ حسن کے پاس امریکہ گئے تو اپنے بچپن کے دوست معروف ادیب وشاعر محمد سالم سے ملنے نیوجرسی گئے جہاں ان سے ملنے مرحوم کامران ندیم آئے اور بڑی اچھی ملاقات رہی۔

● بزرگ اردو صحافی منیر نیازی (ولادت: یکم دسمبر ۱۹۳۶ء) کا ۲۶؍اگست 2015ء کو ان کے آبائی وطن غازی پور کے گورسرا گاؤں میں انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصہ سے بیمار تھے۔ منیر نیازی نے ہندی صحافت سے اپنا کیریئر شروع کیا تھا مگر جلد ہی روزنامہ ''آزاد ہند'' کولکاتا سے وابستہ ہوگئے اور کئی دہائیوں تک ''آزاد ہند'' میں نیوز ایڈیٹر کی ذمہ داریاں سنبھالتے رہے۔ پھر کچھ دنوں کے لئے ''آزاد ہند'' سے ترکِ تعلق کر کے وہ دہلی چلے گئے تھے اور یو این آئی کی اردو سروس سے جڑ گئے۔ ''آزاد ہند'' کے فروخت ہونے کے بعد اخبار کے نئے مالکان کی دعوت پر دوبارہ کلکتہ آئے اور کچھ عرصے تک صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر صحت کی خرابی کی بنا پر تقریباً ۲؍سال قبل وہ اپنے آبائی وطن غازی پور چلے گئے اور وہیں آخری سانسیں لیں۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹیاں (تمام شادی شدہ) اور تین بیٹے ہیں۔

● معروف شاعر حفیظ انجم کریم نگری (تلنگانہ) کا انتقال ۱۵؍ستمبر 2015ء کو حرکتِ قلب بند ہونے سے ہوگیا۔ مرحوم کی عمر ۶۲؍سال تھی۔ حمد، نعت، منقبت، ہائیکو، دوہے، قطعات، نظم اور گیتوں پر مشتمل ان کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ''گونج'' نظام آباد نے ان پر نمبر شائع کیا اور ''رنگ'' و دیگر پرچوں میں ان پر گوشے بھی شائع ہوئے۔ بے حد مخلص انسان تھے اور اردو کے رسائل وجرائد سے کافی ہمدردی رکھتے تھے۔

● ریاست منی پور کے گورنر، مہاراشٹر کے سابق وزیر اور کانگریس کے سینئر لیڈر ڈاکٹر سید احمد (ولادت: ۳۱؍جولائی ۱۹۴۲ء بمقام فیض آباد، اترپردیش) کا مختصر علالت کے بعد ممبئی کے لیلاوتی ہسپتال میں ۲۷؍ستمبر 2015ء کو انتقال

ہوگیا۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا سید ذیشان احمد (کانگریس لیڈر) اور ۲؍بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کانگریس کے دور اقتدار میں ۲؍بار کابینی وزیر کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں اور ممبئی کے ناگپاڑہ اسمبلی حلقے سے ۵؍بار منتخب ہوئے تھے۔ ان کی کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۶ء کو مصطفیٰ بازار، بائی کلا کے رحمت نگر قبرستان میں صبح ۱۱؍بجے انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم نے ۱۹۷۵ء میں عملی سیاست میں قدم رکھا اور کانگریس میں شامل ہوئے۔ ۴؍ستمبر ۲۰۱۱ء سے ۱۵؍مئی ۲۰۱۵ء تک جھارکھنڈ کے آٹھویں گورنر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ نامور شیعہ عالم دین سید روح ظفر نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

● مولانا طیب عثمانی ندوی (ولادت ۳۰؍ستمبر ۱۹۳۰ء) کا ۲۹؍ستمبر ۲۰۱۵ء کو انتقال ہوگیا۔ انھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۱۹۴۴ء میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۵۲ء میں سند فضیلت حاصل کی۔ پھر وہ جدید عصری تعلیم کے حصول میں مشغول ہو گئے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد چند ماہ انھوں نے کلکتے کی صحافتی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور پھلواری شریف (پٹنہ) کے ہفتہ وار اخبار ''نقیب'' میں مدیر مقرر ہوئے۔ پھر لکھنؤ سے ۱۹۵۴ء میں ادبی ماہنامہ ''نئی نسلیں'' کے معاون مدیر ہوئے۔ انھوں نے بہت سنجیدگی سے اپنے قلم کا استعمال کیا اور اسلامی ادب کے فروغ میں پوری تن دہی کے ساتھ حصہ لیا اور اپنے پسندیدہ موضوعات اور شخصیات پر متوازن تحریریں پیش کرتے رہے۔ ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی (بھٹکل) ان کے صاحب زادے ہیں اور ان کی راہ پر نہایت بردباری کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

● معروف شاعر منظر سلطان (ولادت ۸؍جون ۱۹۵۴ء، بمقام بیتیا) کا یکم اکتوبر ۲۰۱۵ء کو پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کا جسد خاکی پٹنہ سے بیتیا لایا گیا جہاں بعد نماز عصر ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ادبی رسائل کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی دنیا میں کافی مقبول تھے۔ مشاعروں کی نظامت بھی بحسن و خوبی انجام دیتے تھے۔ پہلے اپنے اصل نام انیس احمد سے چھپا کرتے تھے۔ منشا ٹولہ، بیتیا میں رہائش تھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد بیتیا کورٹ میں محرر ہو گئے اور ناظم بھارتی اور ان کے شاگردوں نے ادبی سنگم کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کے عرصہ تک مرحوم سکریٹری رہے۔ ناظم بھارتی کی وفات کے بعد وہ صدر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ بزرگ اور نوجوان نسل کے درمیان ان کی حیثیت ایک پل کی تھی۔ ان کا ایک بہت مشہور شعر ملاحظہ ہو:

یہ املتاس کے پتوں سا لرزتا سورج
کسی منظر کی طرح یاد رہے گا برسوں

● ممتاز قانون داں، ادیب اور دانشور جسٹس جاوید اقبال (ولادت ۵؍اکتوبر ۱۹۲۴ء، بمقام سیالکوٹ) کا انتقال طویل علالت کے بعد ۳؍اکتوبر ۲۰۱۵ء کو لاہور میں ہوگیا۔ وہ عرصۂ دراز سے کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا تھے اور شوکت خانم میموریل ہسپتال، لاہور میں زیرِ علاج تھے۔ ان کی نماز جنازہ اسی روز آرینٹل کالج (پنجاب یونیورسٹی) کے صدر شعبۂ فارسی پروفیسر معین نظامی نے پڑھائی اور ۳۰-۴؍بجے شام گلبرگ، لاہور میں تدفین عمل میں آئی۔ پسماندگان میں بیوہ ریٹائرڈ جسٹس ناصرہ اقبال اور دو بیٹے ولید اقبال اور منیب اقبال ہیں۔ مرحوم شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے چھوٹے اور چہیتے صاحب زادے تھے۔ مرحوم نے اپنے والد بزرگوار سے جب وہ برطانیہ میں

تھے، گراموفون کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے ایک نظم ''جاوید کے نام'' کہی تھی جو ''بال جبریل'' میں شامل ہے، جس کا مشہور شعر ملاحظہ ہو:

خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر　　　　مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

مرحوم نے ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرس، ۱۹۴۸ء میں انگریزی اور فلسفہ میں ماسٹر ڈگریاں، ۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی آف کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ ابتداً انھوں نے لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کردی اور ترقی پاتے پاتے ۸؍مارچ ۱۹۸۲ء کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے جہاں انھوں نے ۵؍اکتوبر ۱۹۸۶ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد انھیں سپریم کورٹ آف پاکستان کا سینئر جج مقرر کیا گیا جہاں سے وہ ۴؍اکتوبر ۱۹۸۹ء کو سبکدوش ہوئے۔ مرحوم تین مرتبہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں وہ حکومتِ امریکہ کی دعوت پر وہاں گئے اور کالجوں و یونیورسٹیوں میں اقوام متحدہ کے مستقبل پر خطبات پیش کئے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی ''اپنا گریباں چاک'' ۲۰۰۲ء میں لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف و مرتب تھے جن کی تفصیل اس طرح ہے: "Idealogy of Pakistan" (1959), Strayed Reflection : A Notebook of Iqbal" (1961), "Legacy of Quaid-e-Azam" (1968) Published in Urdu & English both, ''مئے لالہ فام'' (علامہ اقبال پر لکھے گئے مضامین کا انتخاب ۱۹۶۸ء)، ''زندہ رود'' (۱۹۸۴ء، تین جلدوں میں اقبال کی سوانح اردو میں)، افکارِ اقبال (۱۹۹۴ء، اقبال کے نظریات کی ترجمانی)، Pakistan and the Islamic Liberal Movement (1994)، جہانِ جاوید (ڈرامے، افسانے، مقالے)، Islam & Pakistan's Identity, The Concept of state in Islam: A Re-Assessment، اپنا گریباں چاک (خود نوشت)، خطباتِ اقبال۔

ان کی رحلت پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے تعزیتی جلسہ منعقد کیا تھا، جب کہ معروف صحافی و شاعر انجم عظیم آبادی نے قطعہ کہا تھا جو روزنامہ ''آبشار'' کولکاتا میں ۴؍اکتوبر ۲۰۱۵ء کو شائع ہوا:

چل بسے جاوید جو اقبال کے فرزند تھے　　　　باپ کا سایہ ولید اقبال کے سر سے اٹھا

ایک بیرسٹر، سیاست داں، مفکر اور ادیب　　　　آہ! سب کو چھوڑ کر وہ جا بسے دارالبقا

● معروف عالم، مفکر اور امیر، امارت اہلحدیث، صادق پور، پٹنہ مولانا عبدالسمیع جعفری ندوی (عمر تقریباً ۸۰؍سال) کا طویل علالت کے بعد شری رام اسپتال میں ۵؍اکتوبر ۲۰۱۵ء کو رات کے ۱۱ بجے انتقال ہوگیا۔ تدفین ۶؍اکتوبر کی صبح ۱۰ بجے عیدگاہ سبزی باغ پٹنہ میں ہوئی۔ مولانا مرحوم کے صاحب زادے شیخ غازی بن عبدالسمیع اصلاحی نے نماز جنازہ پڑھائی مرکزی جامع مسجد میر شکار ٹولہ، پٹنہ سے متصل آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کی سخاوت و فیاضی میں سادگی تھی اور ایک بلند پایہ عالمِ دین اور اعلیٰ درجہ کے منتظم تھے۔ وہ بلا تفریق مذہب و مسلک جھارکھنڈ اور بنگال کے لوگوں میں بے حد مقبول تھے۔

● سابق وزیر حکومت بہار محمد مشتاق منا (موضع: محی الدین پور، کالج روڈ، کشن گنج، بہار ولادت ۱۸ر دسمبر ۱۹۵۳ء) کا طویل علالت کے بعد ۷ر اکتوبر ۲۰۱۵ء کو انتقال ہو گیا۔ اگلے روز بعد نماز ظہر تدفین عمل میں آئی۔ موصوف بیحد فعال، ملنسار اور غریبوں کے ہمدرد تھے۔ انھیں بزرگوں سے بیحد عقیدت تھی۔ وہ ۱۹۸۰ء میں پہلی بار ایم ایل اے ہوئے اور لگاتار ۳ر بار منتخب ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں جناب لالو پرساد کی قیادت والی حکومت میں وہ کابینہ وزیر برائے اقلیتی فلاح اور کھیل کود بنائے گئے۔ انھوں نے بہار اردو اکاڈمی کے گرانٹ کو ۲۵ر لاکھ تک کر دیا۔ ان ہی کے دور میں بہار اردو اکاڈمی وزارت اقلیتی فلاح کے ماتحت آیا۔ مارواڑی کالج، کشن گنج سے انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے اور ایل ایل بی تھے۔ اپنے اساتذہ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی عملی سیاست سے وابستہ تھے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۸ء تک وارڈ کونسلر بھی رہے۔ ان کے خاص دوستوں میں مشتاق احمد نوری (سکریٹری، بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ) کے نام اہم ہیں۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ۳ر بیٹے منظر کریم رضوی، ظفر اقبال، دانش رضوی اور ۳ر بیٹیاں ہیں۔

● معروف فکشن نگار منظر قدوسی (اصل نام شبیر احمد ولادت ۱۵ر نومبر ۱۹۳۶ء بمقام شموگا) کا طویل علالت کے بعد ۱۵ر اکتوبر ۲۰۱۵ء کی صبح بنگلور میں انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ اسی روز بعد نماز ظہر بنگلور عیدگاہ میں ادا کی گئی اور تدفین تلک نگر قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم ملازمت کی وجہ سے ایران اور عرب ممالک میں بھی رہے۔ ''پھلجھڑیاں'' ان کے طنز و مزاح پر مبنی فکر انگیز مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے چار ناول ''رامو''، ''ناہیدہ''، ''زلیخا'' اور ''اٹوٹ رشتہ'' شائع ہو چکے ہیں۔ وہ حافظ قرآن بھی تھے۔ انھوں نے آپ بیتی بھی لکھی تھی جو ''روداد قفس'' کے نام سے شائع ہوئی نیز اور بھی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ وہ نہایت مخلص اور اخلاق مند انسان تھے۔

● امیر شریعت امارت شرعیہ بہار و جھارکھنڈ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید نظام الدین (ولادت: ۳۱ر مارچ ۱۹۲۷ء بمقام گھوری گھاٹ، ضلع گیا) کا ۱۷ر اکتوبر ۲۰۱۵ء کی شام ۶ر بجے رانچی میں انتقال ہو گیا۔ ان کا جسد خاکی رانچی سے پٹنہ لایا گیا اور نماز جنازہ ۱۸ر اکتوبر ۲۰۱۵ء کو بعد نماز ظہر ادا کی اور تدفین حرمین قبرستان، خلیل پورہ، پھلواری شریف پٹنہ میں عمل میں آئی۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پہ ہوئی اور ثانوی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں ہوئی۔ ۱۹۴۲ء-۱۹۴۱ء میں، مرحوم نے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کی اور مدرسہ ریاض العلوم مغربی چمپارن اور مدرسہ رشید العلوم، چترا میں استاد رہے۔ ۱۹۶۵ء میں مولانا امارت شرعیہ کے ناظم بنائے گئے۔ یکم نومبر ۱۹۹۸ء سے مرحوم موصوف تادم مرگ امیر شریعت کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۹۱ء میں وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے جنرل سکریٹری ہوئے اور تاحیات اس عہدے پر قرار رہے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس منتظمہ کے رکن ہوئے نیز وہ اسلامی فقہ اکاڈمی کے سرپرست بھی تھے اور شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت بھی تھے۔ ۲۰۰۸ء میں انھیں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (آئی او ایس) نے تاحیات خدمات ایوارڈ سے نوازا۔ مولانا مرحوم نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کو مضبوط اور متحد رکھنے میں بے حد اہم رول ادا کیا اور انھوں نے مسلمانوں کے بہت سے ملی مسائل بھی حل کیے۔ پسماندگان میں بیوہ

کے علاوہ چھ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

● دہلی اردو اکادمی کے بانی سکریٹری سید شریف الحسن نقوی (ولادت ۷/اکتوبر ۱۹۲۹ء، بمقام سندیلہ) کا یکم نومبر ۲۰۱۵ء کی صبح سروج ہسپتال، پیتم پورہ، دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ گردوں اور دل کے عارضہ میں مبتلا تھا۔ جب وہ محکمۂ تعلیم میں تھے تبھی انھیں اردو، کا نوڈل افسر بنایا گیا تھا۔ پھر ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکادمی کے قیام کے بعد انھیں سکریٹری کا اضافی چارج دیا گیا اور ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن کی حیثیت سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۱ء تک مستقل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ پسماندگان میں بیوہ نجمہ نقوی کے علاوہ تین بیٹے فضل علی، فضل حسن اور فضل حسین شامل ہیں۔ نماز جنازہ بعد نماز مغرب ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

● مغربی بنگال اسمبلی کے سابق اسپیکر اور معمر سی پی ایم لیڈر ہاشم عبدالحلیم (ولادت ۵/جون ۱۹۳۵ء) کا انتقال کولکاتا کے ایک نرسنگ ہوم میں ۲/نومبر ۲۰۱۵ء کو ہوگیا۔ اگلے روز گوبرا قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ۱۹۸۲ء سے ۲۰۱۱ء تک لگاتار ۲۹/برسوں اسپیکر کے عہدے پر فائز رہ کر انھوں نے ایک ریکارڈ قائم کیا تھا۔ مرحوم بایاں محاذ حکومت کے دور اقتدار میں ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۲ء وزیر قانون وانصاف تھے۔ مرحوم اپنی انسان دوستی اور بذلہ سنجی کے لیے مشہور تھے۔ پسماندگان میں ایک بیٹی فوزیہ (لندن) اور دو بیٹے فاروق حلیم اور ڈاکٹر فواد حلیم ہیں۔

● ہندی اور انگریزی فلموں کے ممتاز اداکار سعید جعفری (ولادت ۸/جنوری ۱۹۲۹ء، بمقام مالیر کوٹلہ، پنجاب) کا ۱۵/نومبر ۲۰۱۵ء کو لندن میں ان کی رہائش گاہ پر برین ہیمرج کے سبب انتقال ہوگیا۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو زبان پر عبور حاصل کیا۔ پھر وینبرگ ایلن اسکول، مسوری میں داخلہ لے کر برطانوی لب ولہجے کی انگریزی بول چال سیکھی اور بالآخر الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ نوجوانی میں ہی انھیں تھیٹر اور اسٹیج سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ ان کی کیریئر کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۹۵۲ء میں انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں انگلش اناؤنسر کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ جلد ہی انھوں نے نئی دہلی میں اپنی تھیٹر کمپنی شروع کی۔ ۱۹۵۷ء میں فل برائٹ وظیفے کے تحت کیتھولک یونیورسٹی آف امریکہ سے ماسٹر ان ڈراما کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں وہ لندن کی رائل اکادمی آف آرٹ چلے گئے اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں سعید جعفری نے برطانوی پردۂ سیمیں پر کافی شہرت حاصل، جب انھوں نے فلم "My Beautiful Laundrette" (۱۹۸۵ء) اور ٹیلی ویژن سیریل ''تندوری نائٹس'' میں شاندار اداکاری کی۔ ہندی فلموں میں انھیں شہرت اس وقت ملی جب انھوں نے ستیہ جیت رے کی مشہور فلم ''شطرنج کے کھلاڑی'' میں ایک لکھنوی نواب کا کردار نبھایا۔ اس فلم کے لئے انھیں بہترین معاون اداکار کا فلم فیر ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ جن اہم فلموں میں انھوں نے اداکاری کی ان میں ''چشم بد دور'' (۱۹۸۱ء)، ''گاندھی'' (۱۹۸۲ء)، ''رام تیری گنگا میلی'' (۱۹۸۵ء)، ''دل'' (۱۹۹۰ء) اور ''حنا'' (۱۹۹۵ء) شامل ہیں۔ انھوں نے اداکارہ مدھر جعفری سے شادی کی تھی جن سے ان کی تین بچیاں ضیا، میرا اور سکینہ ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں مدھر جعفری سے علیحدگی کے بعد سعید جعفری نے ۱۹۸۰ء میں کاسٹنگ ڈائریکٹر جینیفر سوریل سے شادی کرلی تھی۔ ۱۹۹۵ء میں انھیں برطانوی حکومت کی

جانب سے ''آرڈر آف دی برٹش ایمپائر'' (OBE) سے نوازا گیا۔ واضح ہو کہ یہ اعزاز حاصل کرنے والے وہ پہلے ایشیائی ہیں۔ ۲۰۱۶ء میں بعد از مرگ انھیں حکومت ہند کی جانب سے ''پدم شری'' ایوارڈ دیا گیا۔

● معروف شاعر و ادیب جمیل الدین عالی (اصل نام: نواب زادہ مرزا جمیل الدین احمد خان ولادت ۲۰ر جنوری ۱۹۲۵ء بمقام دہلی) کا انتقال ۲۳ر نومبر ۲۰۱۵ء کو کراچی (پاکستان) میں ہوگیا۔ انھیں ذیابیطس اور تنفسی عارضے لاحق تھے۔ نمازِ جنازہ کراچی کی طوبیٰ مسجد میں اسی روز ادا کی گئی جب کہ تدفین بذرتالائنس کے فوجی قبرستان کراچی میں عمل میں آئی۔ ان کے والد امیر الدین احمد خان لوہارو (ہریانہ) کے نواب تھے، جب کہ والدہ خواجہ میر درد کے خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ۱۹۴۴ء میں ان کی شادی طیبہ بانو سے ہوئی جن سے دو بیٹے راجو جمیل اور مراد جمیلی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا، جہاں جمیل الدین عالی کے وزارتِ اقتصادیات میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک انھوں نے پاکستان کے ''قصرِ صدارت'' میں آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ وہ کچھ دنوں پاکستان پیپلز پارٹی کے رکن کی حیثیت سے عملی سیاست سے بھی وابستہ رہے۔ بعدہٗ انھیں متحدہ قومی موومنٹ کی طرف سے چھ برسوں کے لئے سینیٹ کا ممبر نامزد کیا گیا۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ کالم نگاری بھی کی۔ ان کی غزلوں، گیتوں، قومی نغموں اور ملی ترانوں کے ساتھ دوہے بھی بہت مشہور ہوئے۔ انھوں نے کئی ڈرامے بھی سپردِ قرطاس کئے۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''اے میرے دشتِ سخن''، ''غزلیں، دوہے، گیت'' (چھ اشاعتیں)، ''جیوے جیوے پاکستان'' (پانچ اشاعتیں)، ''لاحاصل'' (تین اشاعتیں)، ''نئی کرن'' اور ''دوہے'' (اردو اور دیوناگری خطوں میں) شامل ہیں، جب کہ ''دنیا مرے آگے''، ''تماشا مرے آگے''، ''آئس لینڈ'' اور ''حرفے'' ان کے سفرنامے ہیں۔ ان کی وفات پر انجم عظیم آبادی نے قطعہ کہا جو روزنامہ ''آبشار'' کولکاتا کے ۲۵ر نومبر ۲۰۱۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ملاحظہ کریں:

دہر سے اٹھے جمیل الدین عالی آہ! آہ! شاعرِ خوش فکر، دانشور، صحافی اور ادیب
بخش دے ان کی خطائیں، کر انھیں جنت نصیب رب اکبر دے انھیں تو اپنی رحمت میں پناہ

● معروف ادیب اور ماہنامہ ''آج کل'' کے سابق مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی (ولادت: ۱۹۴۲ء، بمقام گورکھپور، یوپی) کا انتقال ۳۰ر نومبر ۲۰۱۵ء کو طویل علالت کے بعد ساکیت سٹی ہسپتال میں بوقتِ صبح انتقال ہوگیا۔ بعد نمازِ ظہر نمازِ جنازہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ادا کی گئی اور باٹلا ہاؤس قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ مرحوم نے کیریئر کا آغاز سینٹرل انفارمیشن سروس سے کیا تھا۔ وہ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۷ء تک فلم پبلسٹی آفیسر کے عہدے پر تعینات رہے پھر وزارتِ اطلاعات و نشریات کے محکمے پی آئی بی میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۰ء تک وہ آل انڈیا ریڈیو گورکھپور سے وابستہ رہے اور سینٹرل مانیٹرنگ سروس، نئی دہلی میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۲ء تک پبلی کیشن ڈویژن کے ادبی ماہنامے ''آج کل'' کے ایڈیٹر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ان کے اداریوں اور متفرق مضامین کے دو مجموعے ''مکالمہ'' اور ''مضامین ہفت رنگ'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور انھوں نے ایک مونوگراف حفیظ جونپوری پر بھی ترتیب دیا تھا۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے ہیں۔ مرحوم مخلص اور شریف النفس انسان تھے۔

● معروف اداکار، ڈراما نگار اور ادیب کمال رضوی (ولادت: ۱۹۳۰ء بمقام گیا، بہار) کا طویل علالت کے بعد ۱۷ دسمبر ۲۰۱۵ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کے والد پولیس میں ملازم تھے۔ مرحوم ۱۹۵۸ء میں پاکستان منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے کراچی اور لاہور میں رہائش اختیار کی۔ مرحوم نے لاہور سے تھیٹر کا آغاز کیا جس میں ان کے ڈرامے ''بالا کی بدذات'' کو کافی شہرت ملی۔ اس کے بعد لاہور میں پاکستان ٹیلی ویژن کا جب آغاز ہوا تو وہ ٹی وی سے منسلک ہوئے اور انھوں نے ٹی وی کے لئے ''چور مچائے شور''، ''میرا ہمدم میرا دوست''، ''الف نون''، ''مسٹر شیطان'' اور ''آرٹ گیلری'' جیسے سپر ہٹ ڈرامے لکھے۔ ان میں سے بعض میں انھوں نے اداکاری کے علاوہ ڈائریکشن بھی دی۔ انھوں نے زندہ رہنے کے لئے بڑی جہد وجہد کی۔ روزنامہ ''امروز'' میں کالم نگاری کی۔ انگریزی کتب کے ترجمے کئے، جن میں ڈیل کارنیگی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

● بزرگ صحافی سید عبدالرافع (ولادت: اپریل ۱۹۴۰ء بمقام پٹنہ سٹی) کا ۲۱ دسمبر ۲۰۱۵ء کو طویل علالت کے بعد پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۶۱ء میں روزنامہ ''اخوت'' کلکتہ سے ہوا۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں وہ روزنامہ ''آزاد ہند'' کلکتہ سے وابستہ ہو گئے۔ تقریباً ۱۰ برس کلکتہ میں صحافتی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۱ء میں وہ پٹنہ چلے آئے اور روزنامہ ''صدائے عام'' میں مترجم کے فرائض انجام دینے لگے۔ اپریل ۱۹۸۱ء میں مرحوم روزنامہ ''قومی آواز'' پٹنہ سے منسلک ہو گئے، جہاں انھوں نے سب ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۹۱ء میں ''قومی آواز'' کے بند ہونے کے بعد مرحوم روزنامہ ''قومی تنظیم'' سے وابستہ ہوئے نیز نومبر ۱۹۹۲ء میں امارت شرعیہ کے ترجمان ہفت روزہ ''نقیب'' میں بحیثیت مدیر کام کرنے لگے اور تادمِ مرگ ان دونوں ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی نبھاتے رہے۔ دسمبر ۲۰۱۵ء میں بہار اردو اکادمی، پٹنہ نے انھیں ۵۱ ہزار روپئے کے صحافتی ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔ مرحوم نہایت خلیق اور خداترس انسان تھے۔ مرحوم وضع دار اور اخلاقی قدروں کے پاسدار تھے۔ انکساری اور عاجزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ صرف صحافی ہی نہیں تھے، بلکہ اردو ادب پر ان کی گہری نظر تھی اور ''قومی تنظیم'' میں ادبی کتابوں پر اکثر ان کے تبصرے شائع ہوا کرتے تھے۔ راقم الحروف سے گہرے مراسم تھے اور میری کئی کتابوں پر انھوں نے قومی تنظیم میں تبصرے بھی کئے تھے۔

● اپنے زمانے کی ممتاز فلمی اداکارہ سادھنا (پورا نام سادھنا سیودسانی ولادت ۲ ستمبر ۱۹۴۱ء بمقام کراچی، سندھ) کا طویل علالت کے بعد ممبئی کے ہندوجا ہسپتال میں ۲۵ دسمبر ۲۰۱۵ء کو انتقال ہو گیا۔ انھوں نے بالی ووڈ کی ۳۵ سے زائد فلموں میں کام کیا اور اپنی اداکاری اور حسن سے بالی ووڈ میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ۶۰ کی دہائی میں ان کے منفرد ہیر اسٹائل ''سادھنا کٹ'' نے نوجوان لڑکیوں کو اپنا دیوانہ بنالیا۔ ان کی رحلت پر انجم عظیم آبادی نے قطعہ لکھا:

دلوں پر راج کرتی تھی کبھی جو | اجل کی گود میں وہ سو گئی ہے
نہیں ہے سادھنا دنیا میں باقی | چمک اپنی دکھا کر کھو گئی ہے

● بزرگ شاعر وادیب صفوت علی صفوت کا ۳۱ دسمبر ۲۰۱۵ء کو نیویارک امریکہ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی دو کتابیں

''مثنوی وقت'' اور ''مثنوی رسول'' بڑی وقیع ہیں اور اردو شاعری میں اس کے حوالے سے مرحوم یاد کیے جائیں گے۔ انھوں نے انگریزی میں بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے انگریزی مضامین بھی اہمیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ انھوں نے صدر براک اوباما سے متعلق انگریزی میں ایک کتاب Tiambic لکھی۔ مرحوم شریف النفس اور خلیق انسان تھے۔

● معروف سماجی کارکن اور دانشور یم اے مجید (اصل نام: عبدالمجید ولد عبدالودود مرحوم) کا انتقال ۳ رجنوری ۲۰۱۶ کو ۳ ربجے صبح اپنے آبائی گاؤں موضع جتوار پور چوتھ، ضلع سمستی پور میں ہوگیا۔ ۴ رجنوری ۲۰۱۶ کو ان کی تدفین بعد نماز ظہر ۳ ربجے دن اپنے کے آبائی قبرستان میں والدہ کے قریب عمل میں آئی۔ مرحوم ۲۲ رستمبر ۲۰۱۵ کو اپنے وطن تشریف لے گئے تھے۔ وہیں عیدالاضحیٰ منائی اور پھر لوٹ کر کولکاتا نہیں ہوا۔ مرحوم کی ولادت ۲۱ رنومبر ۱۹۲۱ء کو ان کی نانیہال جتوار پور چوتھ، ضلع سمستی پور میں ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد جب ان کی عمر ۶ رسال کی تھی، وہ اپنے خالو شیخ محمد تقی جان جو لاولد تھے، کے ساتھ کولکاتا چلے آئے۔ انھوں نے کلکتہ مدرسہ (مدرسۂ عالیہ) سے ۱۹۳۸ء میں میٹرک اول درجے سے پاس کیا۔ ۱۹۴۰ء میں آئی اے رپن کالج (موجودہ سریندر ناتھ کالج) سے فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور کئی جگہوں سے وظیفے بھی حاصل کیے۔ اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) سے ۱۹۴۲ء میں بی اے (فارسی آنرز) کا امتحان فرسٹ کلاس سے پاس کیا۔ پھر انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں داخلہ لیا اور امتحان دینے ہی کو تھے کہ ان کے خالو خالہ کا انتقال ہوگیا۔ اس حادثے کے سبب ان کی تعلیم متاثر ہوئی اور وہ امتحان میں شریک نہ ہوسکے۔ بعد میں ۱۹۵۹ء-۱۹۶۱ء کے سیشن میں انھوں نے ایم اے فارسی کا امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ یونیورسٹی بھر میں اول پوزیشن حاصل کرنے پر انھیں عبدالحلیم ٹراویلنگ فیلوشپ بھی دی گئی جس کے تحت ایران جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع تھا مگر خانگی مصروفیات کے سبب وہ ایسا نہیں کرسکے۔ مرحوم کی شادی موضع راجہ پور، ضلع مظفر پور کے عبدالعزیز صاحب کی صاحب زادی آسمہ خاتون سے ہوئی جن سے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ بڑے بیٹے ایم اے عالم گیر (سینئر سب ایڈیٹر یو این آئی، دہلی) جن کا انتقال ۸ رجون ۲۰۱۴ء کو ۵۵ رسال کی عمر میں ہوگیا۔ ان کی شادی موضع جیور، دربھنگہ کے زبیر علوی مرحوم کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ دوسرے لڑکے ایم اے جہانگیر کی شادی ڈاکٹر عبدالقدوس، راجہ پور، مظفر پور کی لڑکی سے ہوئی اور موصوف کی سمستی پور میں بیگ اور لگیج کی دکان ہے۔ تیسرے بیٹے جے اے گلزار کولکاتا میں کاروبار کرتے ہیں۔ ان کی شادی بھیرو پور، حاجی پور (ویشالی) کے رضی احمد صاحب کی بچی سے ہوئی۔ بڑی بیٹی مہر النساء بیگم کی شادی معروف ادیب ڈاکٹر ایم اے نصر (استاد، شعبۂ اردو، خضر پور کالج) سے ہوئی جو دولت پور، حاجی پور کے باشندہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۹۷ء میں ملازمت کے دوران ہوا۔ دوسری بیٹی نجم النساء یاسمین کی شادی محمد اسرار، چین پور (ویشالی) سے ہوئی، جو کاروبار پیشہ ہیں۔ تیسری بیٹی فاطمہ زہرا نسرین کی شادی جاوید موضع برہولیا، ضلع دربھنگہ سے ہوئی۔ وہ بھی بزنس مین ہیں۔ مرحوم ایم اے مجید کی رحلت ایک شخص کی نہیں ادبی، سماجی اور ملی خدمات کی ہے۔ مرحوم حکومت مغربی بنگال کے محکمہ خوراک میں مختلف عہدوں پر فائز ہوکر سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے اسلامیہ کالج (موجودہ مولانا آزاد کالج) میں اعزازی لیکچرار فارسی کی خدمات بھی انجام دیں۔ مرحوم ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء اور ۵۳-۱۹۵۴ء

تک شہر کے معروف ادارہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری، ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء تک انجمن ترقی اردو ہند کلکتہ کے جنرل سکریٹری، ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۳ء تک انجمن ترقی اردو ہند (شاخ مغربی بنگال) کے جنرل سکریٹری، ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۵ء تک اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول کی مجلسِ انتظامیہ کے جنرل سکریٹری، ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۵ء تک سی ایم او ہائی اسکول کی مجلسِ انتظامیہ کے جنرل سکریٹری، ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۱ء کے درمیان سی ایم او گرلس ہائی اسکول کی مجلسِ انتظامیہ کے جنرل سکریٹری، ۱۹۵۱ء سے تادم آخر دہلی میڈیکل اسپتال کے جنرل سکریٹری، ۱۹۵۱ء سے تادمِ آخر یتیم خانہ اسلامیہ کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن اور ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۱ء تک اسلامیہ ہسپتال کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۳۰ر برسوں تک انجمن مفید الاسلام کی کمیٹی کے رکن، نائب صدر اور فائنانس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ شہر کی قدیم ادبی انجمن "بزمِ احباب" کے بھی وہ رکن رہے ہیں۔ ایران سوسائٹی، کولکاتا کے سابق جنرل سکریٹری اور صدر بھی رہے۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں اپنی قیام گاہ میں ۲۵ر مارٹ لین، کولکاتا میں دو انجمنیں بھی قائم کی تھیں۔ ۴۰ برسال تک "انڈوایرانیکا" (مجلہ ایران سوسائٹی، کولکاتا) کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی لگاتار ادا کرتے رہے۔ ایسی شخصیتیں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ ان کی رحلت پر ایران سوسائٹی نے ۲۹ر جنوری ۲۰۱۶ء کو ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا۔ پندرہ روزہ "استقلال" کے مالک ناصر احمد نے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے پوری زندگی معاشرے کی فلاح و بہبود کی فکر میں گزاری۔ ان کی رحلت پر انجم عظیم آبادی کا قطعہ (مطبوعہ روزنامہ "آبشار" کولکاتا) ملاحظہ ہو:

خوبیاں مرحوم میں تھیں بے شمار — خلق کی خدمت رہا ان کا شعار
آہ! رخصت ہوگئے عبدالمجید — بخش تو ان کی خطا پروردگار

• جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید (ولادت ۱۲ر جنوری ۱۹۳۶ء، بمقام قصبہ بج بہاڑہ، ضلع اننت ناگ، جموں کشمیر) کا ۷ر جنوری ۲۰۱۶ء کو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، نئی دہلی میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ دہلی سے ان کے جسدِ خاکی کو بذریعۂ طیارہ سری نگر لے جایا گیا جہاں سے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ انھیں ان کے آبائی قصبے بج بہاڑہ لے جایا گیا اور آبائی قبرستان میں آخری رسومات ادا کی گئیں۔ مرحوم کا شمار ملک کے ذہین اور ماہر سیاست دانوں میں ہوتا تھا۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی محبوبہ مفتی اننت ناگ سے رکن پارلیمنٹ ہیں اور اپنے والد کی موت کے بعد پی ڈی پی کی سربراہ بنائی گئیں۔ مفتی سعید نے اپنی ابتدائی تعلیم بج بہاڑہ کے مختلف سرکاری اسکولوں میں حاصل کی۔ بعدہٗ سری نگر کے ایس پی کالج سے قانون، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس سے ۱۹۸۷ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۸۶ء میں آنجہانی راجیو گاندھی کی قیادت والی مرکزی کابینہ میں انھیں شامل کیا گیا۔ وہ ۱۹۶۷ء میں پہلی مرتبہ اپنے حلقۂ انتخاب بج بہاڑہ سے جموں وکشمیر اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۸۷ء میں انھوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے آنجہانی وی پی سنگھ کی جنتا دل میں شمولیت اختیار کی تھی جہاں انھیں ۱۹۸۹ء میں ملک کا وزیر داخلہ منتخب کیا گیا تھا۔ آزاد ہندستان کی تاریخ میں وہ پہلے مسلم مرکزی وزیر داخلہ

ہیں۔ انھوں نے ۱۹۹۸ء میں پی ڈی پی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت بنائی جس کے وہ بانی و سرپرست رہے۔ مفتی محمد سعید پہلی بار ۲/ نومبر ۲۰۰۲ء میں جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ پھر یکم مارچ 2015ء کو ان کی پارٹی نے بی جے پی کے ساتھ اتحاد قائم کر کے جموں و کشمیر میں حکومت بنائی اور انھیں دوسری بار ریاست کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا۔ بزرگ صحافی و شاعر انجم عظیم آبادی نے ان کی رحلت پر ایک قطعہ کہا جو ۸/ جنوری ۲۰۱۶ء کے روزنامہ ''آبشار'' کولکاتا میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو :

نازشِ کشمیر تھے مفتی سعید　　خدمتیں ان کی رہی ہیں بے شمار

سر سے اس کے باپ کا سایہ اٹھا　　کیوں نہ ہو محبوبہ مفتی اشک بار

● معروف ادیب و افسانہ نگار ڈاکٹر ساغر برنی (اصل نام محمد ساغر خاں ولادت : ۱۷/ ستمبر ۱۹۵۰ء) کا انتقال ۱۶/ جنوری ۲۰۱۶ء کو نئی دہلی میں ہو گیا۔ ان کا جسدِ خاکی اسی روز ان کے آبائی گاؤں چنڈیانا، بلند شہر (اتر پردیش) لے جایا گیا۔ وہیں بعد نمازِ عصر تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم ۲۰۱۳ء میں جمشید پور کے ورکرس کالج کے شعبۂ اردو کے صدر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے اور انھیں کینسر کا مہلک مرض ۱۱ برسوں سے لاحق تھا۔ سبکدوشی کے بعد جولائی ۲۰۱۴ء میں وہ مع اہل خانہ نئی دہلی منتقل ہو گئے اور وہیں یمنا وہار میں ایک فلیٹ خریدا۔ مرحوم آزاد کتاب گھر، ساکچی، جمشید پور کے مالک عبدالستار کے بڑے بھائی تھے۔ ساغر برنی بے حد مخلص انسان تھے۔ انھوں نے کافی مضامین اور افسانے لکھے، جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو افسانہ: بدلتی جہتیں'' بہت جلد شائع ہونے والا ہے۔ مرحوم نے جمشید پور میں ادبی چوپال کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے وہ صدر بھی رہے۔ پسماندگان میں بیوہ زیب النساء اور اکلوتی بیٹی آشتی خانم ہیں۔ ان کی رحلت کے بعد چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو کے صدر اور معروف افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے تعزیتی جلسہ منعقد کیا۔

● معروف سماجی شخصیت اور انسان اسکول، کشن گنج کے روحِ رواں جناب سید حسن کا انتقال ۲۵/ جنوری ۲۰۱۶ء کو ہو گیا۔ مرحوم ۳۰/ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اپنی نانیہال جہان آباد میں پیدا ہوئے۔ جس دور میں ان کی پیدائش ہوئی اس دور میں ہندوستان میں خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم عام نہیں تھی لیکن ان کے گھرانے میں تعلیم کا چلن تھا۔ ان کے والدین نے ان کا داخلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درجہ چہارم میں کرایا اور وہیں سے بی اے کی تعلیم ۱۹۴۶ء میں مکمل کی۔ اس کے بعد وہ جامعہ میں ہی استاد مقرر ہوئے جہاں ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۸ء تدریسی ذمہ داریاں نبھائیں۔ بعدۂ وہ مدراس چلے گئے جہاں کالج آف فزیکل ایجوکیشن سے ٹریننگ لی اور دوبارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ گئے جہاں ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۴ء درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۵ء میں مرحوم ریاستہائے متحدہ امریکہ گئے جہاں لنکن یونیورسٹی میں ۱۹۵۵ء -۱۹۵۶ء کے درمیان ۷۴ کریڈٹ پوائنٹس حاصل کیے۔ ۱۹۵۷ء میں ایم ایس ان ایجوکیشن کا کورس مکمل کیا اور ۱۹۶۵ء میں وہیں سے پی ایچ ڈی کی۔ اسی یونیورسٹی میں ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۲ء تعلیمی نفسیات، علم اعداد و شمار کے استاد کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ۱۴/ نومبر ۱۹۶۶ء کو آپ نے انسان اسکول کے نام سے ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی جو

ابتداً ایک پھوس کے مکان میں چلتا تھا۔ سابق وزیر اعلیٰ بہار آنجہانی کرپوری ٹھاکر اور سابق گورنر بہار اخلاق الرحمٰن قدوائی بھی اس اسکول میں تشریف لائے اور ان کے مشن کی پذیرائی کی۔ مرحوم کو تعلیم و تربیت سے کافی دلچسپی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ طلباء سند یافتہ ہونے کے بجائے تعلیم یافتہ ہوکر سامنے آئیں۔

● معروف ترقی پسند ادیب، افسانہ نگار اور صحافی عابد سہیل کا ۲۷ رجنوری ۲۰۱۶ء کو ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ ممبئی سے ان کا جسدِ خاکی لکھنؤ لایا گیا جہاں سیکڑوں سوگواروں کے درمیان ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کی تقریباً ۲۵ رکتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی وہ اہم آواز تھے۔ ان کی ولادت ۲۷ رنومبر ۱۹۳۲ء کو اورئی میں ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد لکھنؤ آگئے اور انجمن ترقی پسند مصنّفین سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے ساتھ گفتگو کرنا ادب کے ایک پورے دور اور تاریخ کے ساتھ مکالمہ کرنے کے مترادف ہے۔ غالباً ان کی آخری کہانی ماہنامہ ''آج کل'' میں ''ہتک'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی وفات سے اردو ادب کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔

● تمل ناڈو میں اردو کے اختراع پسند شاعر سجاد بخاری (ولادت ۱۶ ستمبر ۱۹۵۱ء) کا انتقال ۲ رفروری ۲۰۱۶ء کو ہوگیا اور تدفین ۳ رفروری کو عمل میں آئی۔ وہ مدراس یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے۔ سرمدی پبلی کیشنز کے نام سے ایک ادارے کے مالک بھی تھے جس کے تحت انھوں نے تمل اور اردو میں کئی درجن کتابیں شائع کی تھیں۔ وہ گذشتہ ۴۵ ربرس سے اردو اور تمل میں شاعری کر رہے تھے۔ ان کے شعری ادب کے اعتراف میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''سجاد بخاری کی شاعرانہ جہتیں'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ کتاب ایک طرح سے اہم بھی ہے کہ اس میں ۶۰ ر رنگین تصویریں اور ۱۶ ربلیک اینڈ وہائٹ تصویریں شامل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سجاد بخاری کے تعلقات مشاہیرِ ادب سے کتنے وسیع تھے۔ انھوں نے غزل، آزاد غزل، نثری غزل اور نثر نگاری میں تجربے کیے تھے۔ حمد، نعت، مناجات، دعا، ہائیکو، رباعی، قطعہ اور مثنوی میں بھی فکر و خیال کی تطہیر کی ہے۔

● پروفیسر اسد الزماں اسد (ولادت: ۲۷ رجنوری ۱۹۳۶ء) سابق صدر، شعبۂ اردو، ہگلی محسن کالج، ضلع ہگلی (مغربی بنگال) کا ۲ رفروری ۲۰۱۶ء کو انتقال ان کی رہائش گاہ واقع تانتی باغ میں ہوا اور اسی روز بعد نمازِ عشاء ۳ رنمبر گوبرا قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم ۱۹۹۶ء میں تدریسی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوئے تھے۔ ان کی رحلت پر انجم عظیم آبادی کا ایک قطعہ جو ۷ رفروری ۲۰۱۶ء کو روزنامہ ''آبشار'' کولکاتا میں شائع ہوا تھا، ملاحظہ فرمائیں :

نیک انسان ، صاحب ادراک　　مہر و اخلاص کے وہ پیکر تھے
آہ ! بزمِ سخن ہوئی سونی　　شاعرِ خوش بیاں اسد اٹھے

انھوں نے فیض احمد فیض کے فن اور شخصیت پر ایک مجلّہ ''فیض شناسی'' (اشاعت ۱۹۹۰ء) مرتب کیا تھا جسے مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے شائع کیا تھا۔ ان کی دوسری کتاب ''سوغات'' ہے جس میں حسرت موہانی، آغا حشر کاشمیری، پریم چند اور رضا علی وحشت پر مختلف لوگوں کے مضامین ہیں۔ اس کی اشاعت ۱۹۸۴ء میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے کی تھی۔ اکاڈمی کے گورننگ باڈی کے سابق رکن اور بزمِ احباب، کولکاتا کے بھی رکن تھے۔

پسماندگان میں بیوہ اور بچے ہیں۔ نیک اور شریف النفس انسان تھے۔ اکثر ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے شاعری بھی کی۔

● عظیم فکشن نگار انتظار حسین (ولادت: ۷ر دسمبر ۱۹۲۳ء بمقام موضع ڈبیائی، ضلع بلند شہر، اتر پردیش) کا ۲ر فروری ۲۰۱۶ء کو لاہور کے ایک ہسپتال میں شدید نمونیا کے سبب انتقال ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ ان کی کتابوں میں "گلی کوچے"، "کنکری"، "دن اور داستان"، "آخری آدمی"، "شہر افسوس"، "کچھوے"، "چاند گہن"، "بستی" (ناول)، "ذرّے"، "علامتوں کا زوال"، "پانی کے قیدی" (ڈرامے) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی ایک کتاب "جستجو کیا ہے؟" شائع ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے مختلف اسفار پر مبنی سوانح حیات ہے۔ انھیں پاکستان، ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ سے کئی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ انھیں مین بکر انٹرنیشنل ایوارڈ کے لیے ۲۰۱۳ء میں نامزد کیا گیا تھا نیز فرانس سے انھیں ۲۰۱۴ء میں ادب کا ایک اعلیٰ شہری ایوارڈ بھی ملا۔ ساہتیہ اکاڈمی نے انھیں منشی پریم چند صدی کے موقع پر پریم چند فیلوشپ کا اعزاز دیا۔ ان کی حیثیت ایک صحافی کی بھی تھی۔ پاکستان سے نکلنے والے رسالہ "ادبِ لطیف" کے مدیر بھی رہ چکے تھے اور وہاں کے انگریزی اخبار "ڈان" اور اردو روزنامہ "ایکسپریس" کے لیے پابندی سے کالم لکھتے تھے۔ ان کی رحلت پر ممتاز ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا "انتظار حسین کا انتقال ایک معمولی واقعہ نہیں۔ وہ شہاب ثاقب کی طرح اردو ادب کے آسمان پر ایک انمٹ روشن لکیر چھوڑ گئے۔ ان جیسا ہمہ جہت ادیب اور فکشن نگار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے کوثر و تسنیم اور گنگا جمنا میں دھلی ہوئی اردو سے ایک ایسی ثقافتی اور تخلیقی زبان وضع کیا اور داستانی اسلوب کی بازیافت کر کے ایک ایسا تخلیقی محاورہ خلق کیا جس سے ان کا انفراد ہمیشہ کے لئے قائم ہوگیا...... انھوں نے یہ بھی کہا کہ انتظار حسین کے پائے کا کوئی دوسرا ادیب فکشن میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر امام اعظم نے کہا "انتظار حسین نے ہمیشہ اپنے افسانوں اور ناولوں میں نئے موضوعات کو تلاش کیا ہے جس کا سلسلہ متھ سے جوڑا ہے۔ انھوں نے افسانہ اور ناول کے ذریعہ سماج میں موجود خرابیوں کو مبہم انداز میں بیان کر کے معاشرے کو صحت مند بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں واقعات حقیقی روپ میں نظر آتے ہیں اور رشتے کی فطری تہذیب کو اپنے زبردست قلم سے مصور کر کے وقار عطا کیا ہے۔ ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیت کو بتانے کے لئے انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا وہ ان کا اپنا ہے۔"

● جدید لب و لہجے کے ممتاز شاعر ندا فاضلی (اصل نام مقتدیٰ حسن، ولادت ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۸ء بمقام دہلی) کا انتقال ۸ر فروری ۲۰۱۶ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ہوگیا۔ ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ پدم شری ندا فاضلی کا بچپن اور جوانی گوالیار میں گذرا جہاں سے انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ان کے اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا جہاں سے ان کا خاندان دہلی آگیا۔ ان کے والد بھی شاعر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ان کے والدین پاکستان چلے گئے۔ ندا فاضلی نے ہندوستان کو ترجیح دی۔ مرحوم عوام اور خواص دونوں کے شاعر تھے۔ ان کا شعر زبان زدِ عام ہے:

دنیا جسے کہتے ہیں جادو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے، کھو جائے تو سونا ہے

ہم عصر شاعروں میں ندا فاضلی منفرد لہجہ رکھتے تھے اور اپنی غزلوں، نظموں اور دوہوں کے ذریعہ مقبولِ عام بھی تھے۔ وہ جتنے بڑے ادبی شاعر تھے اتنے ہی بڑے مشاعروں کے بھی شاعر تھے۔ فطری حقیقتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہونے کی خوبی ان میں تھی۔ انھوں نے ادھ ننگی حقیقتوں کو ریشمی پردے سے ڈھک کر اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے مشاہدے اور تجربے شمع کی طرح پگھلتے نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ فلمی دنیا میں گذرا۔ ان کے جن نغمات نے جادو جگائے، ان میں "آ بھی جا"، "تو اس طرح سے مری زندگی میں شامل ہے"، "ہوش والوں کو خبر کیا" وغیرہ۔ ندا فاضلی بچپن میں ایک مندر سے بھجن کی آواز سن کر شاعری کی طرف راغب ہوئے اور انسانیت کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ میرا اور کبیر سے استفادہ کیا اور غالب و میر سے متاثر ہوئے۔ ندا فاضلی ملازمت کی غرض سے ممبئی آئے اور ہندی میگزین "دھرم یگ" اور "بلیز" میں کافی دنوں تک لکھتے رہے۔ ان کا شاعرانہ لہجہ لوگوں کو پسند آیا۔ اس طرح فلم والوں کی نظریں ان پر پڑیں۔ جن فلموں میں انھوں نے نغمے لکھے ان میں "آپ تو ایسے نہ تھے"، "ناخدا"، "ہرجائی"، "انوکھا بندھن"، "رضیہ سلطان"، "وجے"، "اس رات کی صبح نہیں"، "تمنا"، "سرفروش"، "سُر"، "دیو"، "یاترا" اہم ہیں۔ ان کی ۲۴ رکتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں "لفظوں کے پھول"، "مور ناچ"، "آنکھ اور خواب کے درمیان"، "سفر میں دھوپ تو ہوگی"، "کھویا ہوا سب کچھ"، "دنیا ایک کھلونا ہے" ان کے مقبول مجموعے ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں ندا فاضلی کو اسٹار اسکرین ایوارڈ برائے بہترین نغمہ نگاری فلم "سُر" کے لئے اور ۲۰۱۶ء میں بالی ووڈ مودی ایوارڈ دیے گئے۔ وہ مشاعروں کے بھی بے حد مقبول شاعر تھے۔ راقم الحروف کی کنوینر شپ میں ۲۹-۳۰ر مارچ ۲۰۰۷ء کو مانو ریجنل سینٹر دربھنگہ اور قومی اردو کونسل، دہلی کے اشتراک سے قومی سیمینار "پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار" اور عالمی مشاعرے میں ندا فاضلی بھی موجود تھے۔ بعدہٗ کولکاتا کے مولانا شوکت علی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرے ۲۰۱۳ء میں بھی ندا فاضلی کے ساتھ راقم کو کلام سنانے کا موقع ملا۔ جدیدیت کے دور میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

- معروف ادیبہ ڈاکٹر خالدہ خاتون (بنت جناب ڈاکٹر نصیر الزماں عباس مرحوم، پرنسپل گورنمنٹ ٹریننگ کالج، ترکی، مظفر پور، بہار، ساکن: موضع اعتبار پور، نزد شرف الدین پور، ضلع مظفر پور، بہار) کا انتقال ۱۸ر فروری ۲۰۱۶ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے مظفر پور کے ایک پرائیوٹ ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کا جسدِ خاکی موضع ریونڈھا، جالے، دربھنگہ لایا گیا جہاں ۱۹ر فروری کو بعد نماز جمعہ تدفین عمل میں آئی۔ ان کے خاوند ڈاکٹر نورالاحد سکندر (ایگریکلچرل سائنس داں اور اسٹیٹ فارمرس کمیشن بہار کے مشیر) ہیں۔ مرحومہ کے مضامین رسائل وجرائد میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی کتاب "ڈاکٹر محمد حسن کی ڈراما نگاری" بہت مشہور ہوئی۔ مرحومہ صفی اختر (مہدولی) کی ماموں زاد بہن بھی تھیں۔

- معروف ادیب اور شاعر زبیر رضوی کا انتقال (ولادت ۱۵ر اپریل ۱۹۳۵ء بمقام امروہہ) ۲۰ر فروری ۲۰۱۶ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کا جسدِ خاکی ان کے آبائی گاؤں امروہہ، یوپی لے جایا گیا جہاں بعد نماز عشاء ان کی تدفین عمل

میں آئی۔ان کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ اردو اکاڈمی دہلی کے سہ روزہ سیمینار ''اردو زبان کے فروغ میں فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ڈرامے کی خدمات'' میں خطبۂ صدارت پیش کررہے تھے۔ دورانِ تقریر ہی وہ جذباتی ہوکر پانی پینے کے لئے کرسی پر بیٹھ گئے۔اسی وقت انھیں دل کا شدید دورہ پڑا۔اکاڈمی کے وائس چیئرمین ماجد دیوبندی اوران کے رفقاء انھیں جی بی پنت اسپتال لے گئے جہاں ڈاکٹروں نے ان کی موت کی تصدیق کردی۔پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ان کی اہم نگارشات میں ''لہر لہر ندیا گہری''، ''خشتِ دیوار''، ''مسافتِ شب''، ''دامن''، ''پرانی بات ہے''، ''دھوپ کا سائبان'' اور نظموں کا ایک انتخاب ''صدا'' وغیرہ شامل ہیں۔مرحوم آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر اسپورٹس (دہلی) کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔فنون لطیفہ پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں جن کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی جن میں عصری ہندوستانی تھیٹر (اردو ہندی تھیٹر کے حوالے سے)، یک بابی اردو ڈرامے، آزادی کے بعد اردو اسٹیج ڈرامے، ہندوستانی سینما ۱۰۰ ار برسوں کا سفر بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔مرحوم مشہور ادبی جریدہ ''ذہنِ جدید'' کے مدیر بھی تھے اوران کا رسالہ خاص حلقوں میں مقبول تھا جس میں ادب کے ساتھ ساتھ سماجی اور فلمی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔وہ یار باش قسم کی شخصیت تھے اوران کا حلقہ وسیع تھا۔مرحوم دہلی اردو اکاڈمی کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔امروہہ کے مشہور علمی و روحانی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ان کے دادا حضرت سید احمد حسن محدث امروہوی تھے۔ان کے والد مولانا سید محمد میاں رضوی دارالعلوم چلہ (امروہہ) کے مہتمم تھے اور والدہ واعظہ تھیں۔زبیر رضوی نے نظمیں اور گیت لکھ کر اپنی انفرادیت قائم کی تھی۔وہ مشاعروں کے بھی مقبول شاعر تھے۔ان کی رحلت پر معروف صحافی انجم عظیم آبادی کا قطعہ مطبوعہ روزنامہ ''آبشار'' ۲۱ر فروری ۲۰۱۶ء ملاحظہ ہو:

آہ! اٹھے زبیر رضوی بھی	نامور شاعر و ادیب تھے وہ
خلد میں دے جگہ انھیں یارب	نکتہ داں اور اک خطیب تھے وہ

- کرناٹک اردو اکاڈمی، بنگلور کی چیئرپرسن ڈاکٹر فوزیہ چودھری (عمر تقریباً ۵۲ر سال) کا انتقال ۲۴ر فروری ۲۰۱۶ء اکاڈمی کے لائبریری ہال میں منعقدہ پروگرام ''حاصلِ مطالعہ'' میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران تقریباً ۷ر بجے شام حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔دورانِ تقریر وہ مائک سمیت منہ کے بل گر پڑیں۔انھیں نزدیکی ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے ان کی موت کی تصدیق کردی۔مرحومہ کا جسدِ خاکی ان کی رہائش گاہ واقع فریزر ٹاؤن لایا گیا اور ۲۵ر فروری ۲۰۱۶ء کو بعد نمازِ ظہر تدفین عمل میں آئی۔پسماندگان میں شوہر اور تین بیٹیاں ہیں۔مرحومہ کا وطن گلبرگہ تھا۔مرحومہ بنگلور کے کئی کالجوں میں اردو کی پروفیسر تھیں۔تقریباً ۲ر سال قبل جب انھیں اکاڈمی کا چیئرپرسن بنایا گیا تو انھوں نے تدریسی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔مرحومہ شعلہ بیان مقرر، بے باک اور نڈر خاتون تھیں اور عملی طور پر اردو سے بے حد محبت کرتی تھیں۔بچوں کے ادب پر ان کی خاص نظر تھی۔اکاڈمی کا رسالہ ''اذکار'' کے علاوہ ''ادیب''، ''غبارہ'' (برائے اطفال) ان کی ادارت میں شائع ہورہے تھے۔

ادارہ مذکورہ افراد کی رحلت پر سوگوار ہے۔.................. ڈاکٹر امام اعظم

ارشد مینا نگری، مالیگاؤں

حمد باریٔ تعالیٰ

نظر نظر میں ضیا ہے تیری، دلوں میں ہر دم خیال تیرا
ہر ایک شئے میں تری تجلی، کہاں نہیں ہے جمال تیرا

ہزار کوشش ہوئی جہاں میں، سمجھ نہ پایا کوئی بھی تجھ کو
تو ہر جگہ ہے مگر ہے اوجھل، عجیب ہے یہ کمال تیرا

تو ہی ہے خالق، تو ہی ہے داتا، تو ہی ہے مالک، تو ہی ہے آقا
کرم ترے ان گنت ہیں لیکن، ہر اک کرم بے مثال تیرا

مکان فانی، گمان فانی، ہمارا سارا جہان فانی
ازل بھی تو ہے، ابد بھی تو ہے، وجود ہے لازوال تیرا

بہت نوازا ہے تو نے ہم کو، ہماری پھر بھی یہ التجا ہے
غموں کی دولت ہمیں بھی دیدے، خوشی سراسر ملال تیرا

تری عطا سے، تری رضا سے، جسے تو چاہے دکھائے ورنہ
مجال کس کی جو دیکھ پائے، نظر اٹھا کر جلال تیرا

انجم عثمانی، دھنباد

نعتِ پاک ﷺ

وہ آ گئے جہاں میں تو روشن جہاں ہوا
ہر نقشِ پائے ختم رسلؐ کہکشاں ہوا

بس ایک پل میں سارے مناظر بدل گئے
صحرا جو کل تھا آج وہ اک گلستاں ہوا

مجبور و بے نوا کو نئی زندگی ملی
کچھ اس طرح علاجِ غمِ بیکساں ہوا

پہنچے مکاں سے آپؐ حدِ لامکاں تلک
زیرِ قدم زمیں تو کبھی آسماں ہوا

ان سے ہی انجم چشم کرم کی ہے التجا
وہ مہرباں ہوئے تو خدا مہرباں ہوا

● معروف شاعر سہیل فصیحی کا انتقال ۱۵رجنوری ۲۰۱۶ء کو واسع پور، شمشیر نگر، دھنباد میں ہو گیا اور اسی روز بعد نماز عصر ان کی تدفین شمشیر نگر قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم ۹رفروری ۱۹۶۸ء کو مئوناتھ بھنجن یوپی میں پیدا ہوئے اور عرصہ دراز سے یہاں مقیم تھے۔ موصوف نعت گو کی حیثیت سے اس دیار میں شناخت رکھتے تھے۔ انکی رحلت پر ادارہ اہلِ قلم اور کلبی، جھریا کے سکریٹری ڈاکٹر اقبال حسین نے اپنے ادارے کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کی اور انھوں نے اس میں اعلان کیا کہ میں ان کے بکھرے پڑے کلام کو یکجا کر کے کتابی شکل دوں گا۔ مرحوم نہایت خلیق انسان تھے۔ انکے مراسم پروفیسر سیّد منظر امام، انجم عثمانی، شان بھارتی، ڈاکٹر رونق شہری، ڈاکٹر حبیب عادل وغیرہ سے اچھے تھے۔ راقم الحروف کی ملاقات بھی ان سے تھی۔ ان کا ایک مشہور شعر اس طرح ہے:

اس کے رحم و کرم پر ہمیں گماں ہے بہت
وہ اپنے ناتواں بندوں پہ مہرباں ہے بہت

پروفیسر شمیم باروی

مسجد اقصیٰ کا سفر

۱۹۸۳ء میں للت نارائن متھیلا یونیورسٹی دربھنگہ کے شعبہ بوٹنی، پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ کی جانب سے طلباء کے تعلیمی سفر (اکسکرشن ٹور) میں میں بھی شریک ہوا تھا۔ طلباء پنچ مڑھی (مدھیہ پردیش)، ممبئی اور گوا تک گئے تھے۔ گوا کے شہر ڈونا پولا میں بین الاقوامی سائنٹفک سمپوزیم/سیمینار میں شریک ہوا۔ قریب ہی ساحل سمندر پر گھومنے اور سمندر میں غسل کرنے کا موقع ملا۔ دوران غسل یہ خیال آیا کہ اسی ساحل سے شمال کی جانب، ممبئی کی بندرگاہ سے عازمین حج، جہاز سے جدہ کے ساحل تک پہنچتے تھے یعنی اس ساحل کے پار جدہ کا ساحل ہے۔ اسی لمحے میں نے بارگاہ رب العزت میں دعا کی کہ اے اللہ! جب آپ نے سمندر کے اس کنارے تک پہنچا دیا ہے تو مجھے اس پار کے ساحل تک بھی پہنچا دیجئے جہاں آپ کا مبارک گھر کعبہ ہے۔ اللہ پاک کے حضور میری دعا قبول ہوگئی اور ۱۹۸۶ء میں والدہ محترمہ (مرحومہ) کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی۔ وہاں وقت نکال کر جدہ کے ساحل پر کھڑا ہوگیا اور اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ اللہ کا مزید کرم یہ ہوا کہ ۲۰۰۳ء میں اہلیہ کے ساتھ دوبارہ سعادت حج بیت اللہ سے سرفراز ہوا۔ پھر تو اللہ کا کرم پہ کرم ہوتا رہا کہ ۲۰۰۸ء اور ۲۰۱۲ء میں رمضان المبارک میں عمرہ کی ادائیگی کے ساتھ مسجد حرام اور مسجد نبوی دونوں میں عشرہ اخیرہ میں معتکف ہونے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام میں تین مساجد انتہائی مبارک اور بابرکت ہیں، جہاں دنیا بھر کے مسلمانوں کو سفر کرکے پہنچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلی مسجد حرام (مکہ معظمہ) میں ہے۔ دوسری مسجد نبوی مدینہ منورہ میں ہے اور تیسری مسجد اقصیٰ ہے جو بیت المقدس میں ہے۔ حرمین شریفین کی دونوں مساجد میں تو حج، عمرہ و زیارت کے لئے دنیا بھر کے مسلمان حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن مسجد اقصیٰ میں مسلمانوں کی حاضری نہیں ہورہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے عربوں پر حملہ کرکے مصر و اردن کے کئی حصوں پر قبضہ کرلیا۔ اسی جنگ میں اردن سے بیت المقدس مع مسجد اقصیٰ چھین لیا اور آج تک بیت المقدس اسرائیل کے قبضہ میں ہے۔ اسرائیل یہودیوں کی مملکت ہے۔ ۱۹۲۳ء میں عالم اسلام زبردست المیہ سے دوچار ہوا اور ساڑھے تیرہ سو سالہ خلافت اسلامیہ کو ختم کردیا گیا۔ مسلمانوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانیہ، فرانس اور امریکہ نے مل کر ایک سازش کے تحت فلسطین کے بڑے حصے پر دنیا بھر کے یہودیوں کو بسایا اور ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو ایک ملک ''اسرائیل'' (یہودی مملکت) کا اعلان کردیا۔ عرب ممالک کچھ نہ کرسکے۔ مختصر عرصے میں اسرائیل کا جور و ستم بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اس نے بیت المقدس پر بھی قبضہ کرلیا۔ بیت المقدس کا تعلق تینوں بڑے مذاہب اسلام، عیسائیت اور یہودیت سے ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام نے بیت المقدس کا شہر آباد کیا۔ ان کے صاحب زادے نبی حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہیکل سلیمانی (عبادت گاہ) تعمیر کی۔ اس مقام کو اللہ تعالیٰ نے بڑی برکتوں سے نوازا ہے اور بڑی تعداد میں یہاں انبیاء کرام مبعوث ہوئے۔ مسجد اقصیٰ یہودیوں کا قبلہ رہا ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ اس لئے مقدم ہے کہ یہ ان کا ''قبلۂ اوّل'' رہا ہے۔ حضور پاک محمد ﷺ مکی زندگی میں مسجد اقصیٰ کی جانب رخ کرکے

نماز پڑھتے رہے۔ ہجرت کے بعد بھی سولہ ماہ تک مسجد اقصیٰ ہی قبلہ رہا۔ حالاں کہ آپ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ خانۂ کعبہ کو قبلہ بنایا جائے۔ اس کے لئے بار بار آپ ﷺ آسمان کی جانب منہ اٹھا کر وحی کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مدینہ کی ایک مسجد میں دوران نماز وحی نازل ہوئی کہ آپ نماز میں اپنا منہ قبلہ کی جانب کر لیں۔ آیت کا ترجمہ: اے محمد ﷺ! ہم تمہارا آسمان کی طرف منہ پھیر پھیر کر دیکھنا دیکھ رہے ہیں سو ہم تم کو اسی قبلہ کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو منہ کرنے کا حکم دیں گے۔ تو اپنا منہ مسجد حرام (کعبہ) کی طرف پھیر لو اور تم لوگ جہاں ہوا کرو نماز میں اسی مسجد (کعبہ) کی طرف منہ کیا کرو...... سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۴۴) دوران نماز آپ ﷺ نے اور تمام مقتدیوں نے اپنا رخ بالکل پیچھے مڑ کر کعبہ کی طرف کر لیا۔ اس مسجد کا نام مسجد قبلتین پڑ گیا کہ اس مسجد میں ایک نماز دو قبلہ کی جانب پڑھی گئی۔ مدینہ منورہ سے مسجد اقصیٰ شمال کی جانب ہے اور مکہ معظمہ جنوب کی جانب۔ اس لئے مدینہ منورہ میں قبلہ جنوب کی جانب ہے۔ مسجد اقصیٰ کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں ماہ رجب میں پیارے نبی پاک ﷺ کو اللہ رب العزت نے معراج کی سعادت سے سرفراز کیا۔ قرآن مقدس کے پندرہویں پارے کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے۔ ترجمہ: وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے (محمد ﷺ) کو مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے (سورہ بنی اسرائیل آیت: ۱) حضور پاک ﷺ براق پر سوار ہو کر مسجد اقصیٰ پہنچے اور اللہ کے حکم سے وہاں موجود تمام انبیاء کرام (تقریباً سوا لاکھ) کی نماز میں امامت فرمائی۔ اس کے بعد آسمان کی سیر کے لئے لے جائے گئے۔ معراج سے واپسی پر دوبارہ انبیائے کرام کی امامت کی۔

۱۶ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، خلیفہ دوم نے دوران خلافت بیت المقدس فتح کیا اور اپنے مقام پر مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی۔ خلافت بنوامیہ کے خلیفہ عبدالملک نے مسجد کو وسعت دے کر از سر نو تعمیر کیا۔ یہ تعمیر ۷۰۵ء، (۸۶ھ) میں عبدالملک کے صاحبزادہ خلیفہ ولید کے عہد میں مکمل ہوئی۔ ۷۴۶ء میں شدید زلزلے نے جب اس عمارت کو منہدم کر دیا تو عباسی خلیفہ منصور نے ۷۵۴ء، (۱۳۶ھ) میں اس کی دوبارہ تعمیر کرائی۔ اس کے بعد عباسی خلیفہ محمد المہدیٰ نے ۷۸۰ء، (۱۶۳ھ) از سر نو تعمیر کیا۔ ۱۰۳۳ء میں دوبارہ زلزلہ سے عمارت مسمار ہوگئی تو دو سال بعد ۱۰۳۵ء، (۴۲۶ھ) میں فاطمی خلیفہ علی ظاہر نے تعمیر کا شرف حاصل کیا۔ اس درمیان مسلمانوں میں کمزوری آئی اور ۱۰۹۹ء، (۴۹۲ھ) میں صلیبی جنگ کے دوران عیسائیوں نے مسجد اقصیٰ پر قبضہ کر لیا۔ مسجد کے گنبد کے حصے کو گرجا گھر اور عمارت کو رہائش کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے ۸۸ر سال بعد مشہور سلطان غازی صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں دوبارہ بیت المقدس فتح کیا تب سے یہ مسلمانوں کے قبضہ میں رہا لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں میں ضعف کے آثار نمایاں ہوئے، حتیٰ کہ ۱۹۲۳ء میں خلافت اسلامیہ کا اختتام ہوگیا۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مسجد اقصیٰ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ تا دم تحریر اسرائیل کا قبضہ باقی ہے۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ مسجد اقصیٰ کے نیچے ہیکل سلیمانی دفن ہے نیز انبیاء کے تبرکات بھی اسی میں ہیں۔ اب صیہونی منصوبہ بندی ہے کہ مسجد اقصیٰ کو شہید کر کے ہیکل سلیمانی تعمیر کی جائے۔

۲۰۱۲ء میں عمرہ سے واپسی پر میرے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ مجھے تیسری بابرکت مسجد، مسجد اقصیٰ کا سفر کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے عہد کیا کہ کالج سے سبکدوشی کے بعد فوراً مسجد اقصیٰ کا سفر کروں گا۔ ۲۰۱۳ء کے ۳۱ر اگست کو

میں ریٹائر ہو گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد معمول کی مصروفیات کے بعد ۲۰۱۴ء کے اوائل میں دہلی میں حج وعمرہ کا انتظام کرنے والے ایک ٹریولنگ ایجنٹ سے رابطہ کیا اور مسجد اقصیٰ کے سفر کے لئے ویزہ کی حصولیابی پر گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ دہلی کے اسرائیلی سفارت خانہ نے ایسا ویزہ ابھی تک نہیں دیا ہے۔ پھر بھی اس نے ضروری فارم وغیرہ بذریعہ ای-میل مجھے فراہم کیا اور ویزہ کی درخواست سفارت خانہ میں جمع ہوئی لیکن کئی مہینے کے انتظار کے بعد بھی ویزہ نہیں ملا۔ دریں اثنا میں دیگر ضروری کاموں میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً دو ماہ تک تبلیغی اسفار کرتا رہا اور اجتماعات میں شریک ہوا۔ میں سالِ رواں کے ماہ رجب کے وسط میں دہلی گیا اور دوبارہ تمام مطلوبہ کاغذات کے ساتھ اسرائیلی سفارت خانہ میں ویزہ کی درخواست دی۔ ایک ماہ کے انتظار کے بعد بھی مجھے ویزہ نہیں ملا۔ وسط شعبان گزر چکا تھا، رمضان المبارک کی آمد آمد تھی اس لئے دربھنگہ واپسی کا پروگرام بنانے لگا۔ اسی درمیان ٹریولنگ ایجنٹ کے دفتر سے فون آیا کہ آپ کی درخواست لمبی مدت تک زیرِ غور تھی، اب سفارت خانے کے سفیر آپ سے انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔ آپ بارہ بجے دن میں ۲۴؍شعبان کو اسرائیل سفارت خانہ پہنچیں۔ میں وقت پر سفارت خانہ جو اورنگ زیب روڈ کے قریب تھا پہنچ گیا۔ یہاں مجھے زبردست سیکوریٹی چیکنگ سے گزارا گیا۔ الف لیلوی انداز میں صحن سے تنہا گزرنے کیلئے کہا گیا۔ سامنے برآمدہ کے دائیں جانب دروازے کے ہینڈل سے عجیب وغریب قسم کی آوازیں سنائی دیں۔ میں ہدایت کے مطابق ہینڈل تھامے رہا، یہاں تک کہ دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوا۔ ایک چھوٹا کمرہ تھا، کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ایک دریچہ نما کاؤنٹر جس میں مضبوط شیشہ لگا ہوا تھا، پر بلایا گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا بارعب شخص سامنے آ بیٹھا۔ غالباً یہ اسرائیلی سفیر تھا۔ چند لوگ اس کے پشت پر باادب کھڑے تھے۔ اس نے اپنے سر پر ہیڈ فون لگایا اور مجھے باہر رکھے ٹیلیفون اٹھانے کا اشارہ کیا۔ انگریزی میں اس نے گفتگو شروع کی۔ مختلف قسم کے سوالات پوچھے۔ آپ کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ آپ کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟ ابھی آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟ آپ کے بینک اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے؟ آپ اسرائیل کیوں جانا چاہتے ہیں؟ وہاں کہاں کہاں جائیں گے؟ کتنے دنوں کے لئے جائیں گے؟ وغیرہ۔ میں نے تمام سوالات کے جواب دیے۔ میں نے کہا کہ میرا مقصد بیت المقدس کی زیارت ہے، قبلہ اول مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنی ہے! بیت المقدس کی دوسری مساجد میں بھی حاضری کا ارادہ ہے نیز بیت اللحم (جائے پیدائش حضرت عیسیٰ علیہ السلام) بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ دو تین دنوں کا قیام ہوگا۔ واپسی کے سفر میں مکہ معظمہ میں عمرہ کر کے وطن واپس ہو جاؤں گا۔ میرا بایوڈاٹا اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ہندوستان بھر میں میری سائنسی ریسرچ کی تفصیلات اور سائنسی سمپوزیم/سیمینار وغیرہ کی شرکت اور ماحولیاتی سائنسداں کی حیثیت سے مجھے بین الاقوامی فیلوشپ ایوارڈ سے نوازے جانے کی تفصیلات پر گفتگو کر کے وہ متاثر ہو گیا اور مسکراتے ہوئے بولا "چلئے ٹھیک ہے میں آپ کو اسرائیل کے سفر کے لئے ویزہ ریکومنڈ کر رہا ہوں۔ اپنے ٹریول ایجنٹ سے کہیں کہ کل وہ یہاں سے آپ کا ویزہ لے جائے۔ اس کا آخری جملہ تھا...... گو! انجوائے اسرائیل!"

سفارت خانے میں کل دو گھنٹے میں رہا۔ باہر میرا چھوٹا بیٹا عاقب مجتبیٰ تشویش میں مبتلا تھا۔ کئی بار اس نے گارڈ سے میری خیریت دریافت کی۔ میں باہر آیا تو وہ پرسکون ہوا۔ میرے ایجنٹ نے بتایا کہ اسرائیل نے تین ماہ کا ویزا دیا ہے۔ دو تین دن میں سعودی کا ویزہ مل گیا۔ پروگرام کے مطابق مجھے مسجد اقصیٰ میں دو دن ٹھہرنا تھا۔ میرا اسفار اردن

کے راستے تھا۔ پورے سفر کا ایر ٹکٹ مجھے مل گیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے پہلی رمضان المبارک مطابق ۲۰ جون ۲۰۱۵ء کو صبح ساڑھے نو بجے اتحاد ایئر بس طیارے نے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایر پورٹ پرواز کیا۔ روانگی کے وقت اہل خانہ مضطرب نظر آئے۔ اسرائیلی فوج کے گولی مار دینے کی خبر عام تھی۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ موت وحیات مقرر ہے، میں اسرائیل پہنچ کر فوراً فون کردوں گا اور انشاء اللہ عمرہ سے فارغ ہوکر ۱۰ ار رمضان تک واپس آجاؤں گا۔ آپ سب لوگ دعا کریں۔ میں روزے سے تھا۔ کھانے پینے کا سوال نہیں تھا۔ چار گھنٹے کی پرواز کے بعد طیارہ ابوظہبی طیران گاہ پہنچا۔ وہاں کا مقامی وقت بارہ بجے دن تھا۔ ابوظہبی سے ایک گھنٹہ بعد اتحاد ایرلائنس کا دوسرا طیارہ مقامی وقت کے مطابق دوپہر ایک بج کر دس منٹ پر روانہ ہوا اور تین گھنٹے بیس منٹ کی پرواز کے بعد ملکہ عالیہ انٹرنیشنل ایئرپورٹ تین بج کر تیس منٹ پر پہنچا۔ عمان اردن کا دارالحکومت ہے۔ پروگرام کے مطابق آج ہی مغرب کی نماز مسجد اقصیٰ میں ادا کرنی تھی۔ بیت المقدس میں مغرب کا وقت سات بج کر پچاس منٹ تھا۔ میں عجلت سے ساتھ معمول کی چیکنگ وغیرہ سے فارغ ہوا اور ایجنٹ کی ہدایت کے مطابق عمان کے لئے فیس ادا کر کے ٹرانزٹ ویزا کے کاؤنٹر پر قطار میں لگ گیا۔ قانون کے مطابق ویزہ پہنچنے پر (On arrival) دیا جاتا ہے۔ چند منٹ کے بعد میرا نمبر آگیا۔ میں نے اپنا پاسپورٹ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کو پیش کیا۔ اس نے ایک نظر پاسپورٹ پر ڈالی اور مجھے تشویش کی نگاہ سے دیکھا۔ اور انگریزی میں سوال کر بیٹھا" آپ ہندوستان سے آرہے ہیں؟" میں نے کہا" جی ہاں!"۔" آپ اسرائیل جارہے ہیں؟" میں جواب دیا" جی ہاں!" اتنا سننا تھا کہ وہ بالکل ہڑبڑا گیا اور کاؤنٹر سے باہر نکل آیا۔ اس کے چہرہ پر خوف نمایاں تھا۔ مجھے ساتھ لے کر تیز قدموں سے ایک دفتر پہنچا، جہاں تین حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے اعلانیہ انداز میں ان سے کہا کہ" یہ ہندوستان سے آرہے ہیں اور اسرائیل جارہے ہیں۔" یہ سنتے ہی دفتر میں موجود ان لوگوں پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ انہوں نے انگریزی میں ایک ہی سانس میں کئی سوالات کرڈالے۔" آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ اسرائیل کیوں جارہے ہیں؟ آپ کا مقصد کیا ہے؟ ہم لوگ آپ کو ممبئی واپس کریں گے۔" میں نے اطمینان سے سوالوں کے جواب دیے کہ" میں مسجد اقصیٰ کی زیارت کے لئے آیا ہوں۔ بیت المقدس میں دو دنوں کا قیام ہوگا۔ وہاں سے عمرہ کے لئے مکہ معظمہ جاؤں گا اور وطن واپس ہوجاؤں گا۔" میرے جواب کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ لگاتار عربی میں کچھ بولتے رہے۔ میں نے درخواست کی کہ میں عربی نہیں سمجھتا، انگریزی میں بات کریں۔ لیکن انہوں نے کچھ دھیان نہیں دیا۔ کچھ لوگ ادھر ادھر آنے جانے لگے۔ ایک شخص اپنے کمپیوٹر پر مصروف ہوگیا۔ میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر تھا کہ آخر میری آمد پر اس قدر متوحش اور پریشان کیوں ہیں؟ تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک انگریزی میں مجھ سے گویا ہوا" اب آپ ادھر ادھر نہ جائیں۔ یہیں ٹھہریں۔ افطار کے وقت ویزہ امور کے صدر صاحب آئیں گے اور آپ سے بات چیت کریں گے۔" اب عملی طور پر ان لوگوں نے مجھے ایک طرح سے گرفتار کرلیا۔ مجھے اپنا سفری سامان لینے پر بھی پابندی لگادی۔ دفتر کے ایک جانب ایئرپورٹ کی مسجد تھی، جس میں نماز پڑھنے سے نہیں روکا۔ عصر کی نماز کے بعد دفتر کے نزدیک ایک بینچ پر مجھے بٹھائے رکھا۔ کل ملا کر پونے پانچ گھنٹے اسی عالم میں رکھا گیا۔ ہر تھوڑی دیر پر یہ دھمکی دی جاتی رہی کہ مجھے ہندوستان واپس کردیا جائے گا۔ ایک موقع پر مجھے دفتر میں بلا کر کہا گیا کہ" آپ اخراجات کے لئے کتنی رقم ساتھ لائے ہیں۔" میں نے کہا" میرے پاس چار سو ڈالر ہیں۔" انہوں نے کہا کہ

''جب تک آپ کے پاس ایک ہزار ڈالر نہیں ہوں گے، آپ آگے نہیں جا سکتے ہیں۔'' میں پریشان ہوتا رہا اور اللہ رب العزت سے دعا کرتا رہا۔ ٹریولنگ ایجنٹ نے تمام اخراجات تخمینہ کر کے چار سو ڈالر ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا۔ اس کے لئے مجھے چونتیس ہزار روپے کا ڈالر خریدنا پڑا تھا۔ احتیاطاً میں نے اپنا انٹرنیشنل اے ٹی ایم (ATM) کارڈ اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ میں نے انہیں اے ٹی ایم کارڈ دکھایا کہ ضرورتاً میں اس سے مزید رقم کی نکاسی کر سکتا ہوں۔ انہوں نے اے ٹی ایم مشین کی جانب اشارہ کر کے کہا کہ وہاں چل کر مجھے دکھاؤ کہ تمہارے کارڈ میں کتنی رقم موجود ہے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ میرے اے ٹی ایم کارڈ سے کوئی رقم نکال نہ لے۔ اس لئے میں نے کارڈ کو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھ لیا۔ مجھے سخت افسوس ہو رہا تھا کہ آج میں مسجد اقصیٰ نہیں پہنچ سکوں گا۔ کل کے لئے فکر دامن گیر تھی۔ میں اللہ رب العزت سے خیر کی دعا مانگتا رہا۔ پرسکون رہنے کی کوشش کرتا رہا کہ اللہ سب اچھا کرتا ہے۔ اس افراتفری میں افطار کا وقت ہو گیا۔ دفتر کے لوگوں نے انتہائی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ مجھے روک کے رکھا تھا۔ خود افطار کیا لیکن مجھے افطار کے لئے پوچھا تک نہیں جب کہ میں بھی روزے سے تھا۔ میں نے طیارے پر ملنے والا کھانا تو نہیں کھایا کہ روزے سے تھا لیکن ایئر ہوسٹس نے درخواست پر ایک چھوٹا کھانے کا پیکٹ دیا تھا۔ میں نے اسی سے افطار کیا، نمازِ مغرب ادا کی۔ رات کے کھانے کی فکر ہوئی۔ ایئرپورٹ کے اس حصے پر کھانے کی کوئی معقول چیز نہیں تھی۔ اللہ کا شکر کہ ایک دینار میں نصف درجن روٹیاں ملیں، مگر کوئی سالن نہیں ملا۔ پانی کا ایک بڑا بوتل بھی ایک دینار میں ملا۔ وہاں کرنسی دینار بہت مضبوط ہے۔ ایک دینار ڈیڑھ ڈالر کے مساوی ہے۔ میں اب بھی حیران تھا کہ یہ لوگ مجھ سے خوف زدہ کیوں ہیں۔ تاخیر سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ میں ایک ضعیف اور ریٹائرڈ شخص ہوں اور اسرائیل جا رہا ہوں۔ مسجد اقصیٰ کی طرف جانے والوں پر اسرائیلی فوجی گولیاں چلاتے ہیں۔ لوگ خوف سے وہاں نہیں جاتے ہیں اور میں بے خوفی سے وہاں جا رہا ہوں یعنی میں ایک خودکش بمبار بن سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میں عمان ایئرپورٹ کو ہی اڑا دوں یا اسرائیل جا کر وہاں دھماکہ کروں تو اردن اور اسرائیل کے درمیان کشیدگی یا جنگ چھڑ سکتی ہے کیوں کہ میں عمان سے اسرائیل جا رہا ہوں۔ عام طور پر مجھے سمجھ میں آیا کہ حکومت کی پالیسی ہے کہ اسرائیل کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دیا جائے اور صلح کن رہا جائے۔ ایئرپورٹ سے حکام نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ آپ نے اسرائیل جانے کے لئے ہمارے ملک کا انتخاب کیوں کیا؟ بہر حال مغرب کے ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد مجھے دفتر میں بلایا گیا اور حکام نے مجھے خوش خبری سنائی اور انگریزی میں کہا کہ ہم لوگ آپ کو اسرائیل جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ آپ کاؤنٹر پر جائیں اور ویزہ حاصل کریں۔ میں نے اللہ کا شکریہ ادا کیا۔ بھاگا ہوا کاؤنٹر پر پہنچا۔ وہاں پہلا شخص موجود تھا۔ اس نے ڈالر لینے سے انکار کیا اور ایکسچینج سے دینار خریدنے کو کہا۔ میں نے ساٹھ ڈالر دے کر چالیس دینار حاصل کیا۔ میرے پاسپورٹ پر ٹرانزٹ ویزہ لگا۔ بعدہٗ مجھے ایرپورٹ سے باہر نکلنے کی اجازت ملی۔ مجھے اپنے سامان جو ایک سوٹ کیس تھا، کی فکر تھی۔ آدھ گھنٹہ تک تلاش کرنے کے بعد بھی نہیں ملا۔ اس سے متعلقہ کاؤنٹر نے کھوج بین کے بعد کہا کہ سوٹ کیس تو ابوظہبی طیران گاہ پر ہی چھوٹ گیا۔ میں پھر پریشان ہو گیا لیکن ان لوگوں نے بتایا کہ رات کے گیارہ بجے ابوظہبی سے فلائٹ آنے والی ہے، آپ کا سوٹ کیس آ جائے گا۔ مجھے وہ شب عمان ایرپورٹ پر گزارنا پڑی کیونکہ رات کو بارڈر کا سفر نہیں ہوتا ہے۔ میں مسجد میں رہا۔ نمازِ عشا ادا کی،

تراویح پڑھی۔ نیند نہیں آئی۔ گیارہ بجے کی فلائٹ اور پھر تین بجے کی فلائٹ سے بھی میرا سوٹ کیس نہیں آیا۔ اب وہاں کے عملہ نے بتایا کہ کل گیارہ بجے دن کو ضرور آجائے گا۔ اکیس جون (۲؍رمضان المبارک) کو میں نے بعد نماز فجر آگے کے سفر پر روانگی کا فیصلہ کیا کیوں کہ بائیس جون کو مجھے واپس ہونا تھا۔ آدھی رات کے بعد جدہ کیلئے فلائٹ مقرر تھی۔ ٹیکسی وہاں بہت مہنگی ہے۔ میں نے بس پکڑی جو عمان شہر ہوتے ہوئے اردن کے بارڈر پہنچا۔ چوان ڈالر کرایہ ادا کیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر ہوا۔ وہاں پھر تلاشی، کسٹم وغیرہ کے مراحل سے گزرتا ہوا دوسری بس پر سوار ہوا اور تیرہ ڈالر کرایہ ادا کیا جس نے اسرائیل کے سرحد پر پہنچا دیا۔ وہاں یہودیوں کے علاوہ فلسطینی مرد و خواتین کی اچھی خاصی بھیڑ تھی جو عمرہ کر کے واپس آئے تھے اور کچھ عمرہ کے لئے جا رہے تھے۔ اس لئے مجھے معمول کی چیکنگ وغیرہ میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ میرے پاسپورٹ پر اسرائیل میں داخلے کا مہر ثبت ہوا، کچھ افراتفری رہی، مگر ایک خاتون آفیسر نے مجھے باہر نکلنے میں رہنمائی کی۔ اب میں فلسطین کی فضا میں سانس لے رہا تھا لیکن اسرائیل کے قبضہ والا حصہ تھا۔ یہاں سے یروشلم (بیت المقدس) پچاسی کیلومیٹر دور تھا۔ بس کے ٹکٹ کاؤنٹر پر اردو بولنے والا تھا۔ اس نے تعجب سے مجھے دیکھا کہ آپ ہندوستان سے یہاں کیسے آئے؟ یہاں تو کوئی نہیں آتا۔ میں نے کہا۔ بس مسجد اقصیٰ کی زیارت کیلئے آیا ہوں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ لیکن مجھے ہدایت کی کہ ہوشیار رہئے گا اور اپنا خیال رکھئے گا۔ بس ڈرائیور کو بلا کر کہا کہ ان کو القدس کے دروازے کے قریب اتار دینا۔ میں عمان ایئرپورٹ کی ساری تلخیوں کو بھول گیا اور بس کے دریچے سے فلسطین کے فضاؤں، پہاڑوں اور ریگزاروں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ تقریباً دو گھنٹہ کے سفر کے دوران فلسطین کی تاریخ میں گم رہا۔ یہاں کی چٹانوں کا رنگ مٹی جیسا تھا۔ درخت بہت کم تھے۔ گاہے گاہے کھجور کے درخت نظر آجاتے تھے۔ یہاں تک کہ یروشلم شہر میں داخل ہوا۔ اس شہر میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے۔ اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ کئی منزلہ ہوٹلوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔ بازار میں چہل پہل تھی۔ میں بیحد مسرور تھا کہ میں انبیاء کی سرزمین بیت المقدس پہنچ گیا ہوں جس کے چاروں طرف اللہ نے برکتیں رکھی ہیں لیکن یہاں یہودیوں کا قبضہ ہے۔ شاید اسی لئے یہ شہر مجھے اداس اداس نظر آیا۔ ایک مقام پر بس ٹھہر گئی۔ ڈرائیور نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ مجھ سے بولا آپ اس جانب بڑھیں آپ القدس پہنچ جائیں گے۔ میں سڑک پر اتر گیا۔ میرے ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھا، میرا سوٹ کیس جس میں کپڑے اور دیگر سامان تھے، وہ تو ابوظہبی میں تھا۔ میں سڑک پر آگے بڑھا، شہر پر جدیدیت کا غلبہ نظر آیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ سڑک کے کنارے مسجد اقصیٰ نظر آجائے گا لیکن سڑک کی بائیں جانب ایک فلک بوس قلعہ نظر آیا۔ بہت ہی خوبصورت بلند دروازہ سامنے تھا۔ یہاں اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ یہ القدس کا قلعہ تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس دروازے سے داخل ہو جایئے دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد بائیں ہاتھ پر مبارک مسجد کے احاطے میں آپ پہنچ جائیں گے۔ سڑک سے دروازہ تک کا راستہ نشیب تھا۔ یہاں انتہائی حسین خم کھاتی ہوئیں سیڑھیاں تھیں۔ قلعہ کی دیواریں اور سیڑھیاں بہت جاذب نظر تھیں لیکن ان کی دیکھ بھال صحیح نہیں ہو رہی تھی۔ کئی جگہ شگاف وغیرہ نظر آئے جو مرمت طلب تھے۔ میں بے تابانہ انداز میں دروازہ میں داخل ہو گیا۔ بائیں جانب مڑنے کے بعد ایک بین الاقوامی قسم کا بازار نظر آیا جہاں انواع واقسام کی دوکانیں تھیں اور دنیا بھر کے لوگ، مرد عورت، کالے گورے، لمبے ناٹے بڑی بے فکری سے گھوم پھر رہے تھے۔ میں بازار کے مناظر کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ بائیں جانب گھومنے پر کھلا آسمان

اور باغ کی صورت میں زیتون کے درخت نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ اب میں مسجد اقصیٰ کے احاطے میں پہنچ گیا ہوں۔ میرے قدم تیز ہوئے لیکن اچانک میں نے دیکھا کہ چاروں طرف سے اسرائیلی فوجیوں نے مجھے گھیر کر رائفل کی زد میں لے لیا۔ میں جیسے خواب سے جاگا۔ انہوں نے سوالوں کی بوچھار کردی۔ میں نے سفر کا مقصد، پاسپورٹ، اسرائیلی وزیر کا ذکر کیا اور کہا کہ کل میں واپس ہو جاؤں گا۔ لیکن ایسا لگا کہ میرے جواب سے ان کو کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ میں زبردست آزمائش میں پڑ گیا۔ مجھے لگا کہ جو بات میں سنتا آرہا تھا کہ اسرائیلی فوجی گولی مار دیتے ہیں وہ وقت آگیا! لیکن اللہ نے مجھ پر رحم کیا۔ میں بالکل نہیں گھبرایا۔ مرنا تو ایک دن ہے ہی، آج ہی سہی! میں اللہ سے رجوع ہوا۔ اچانک فوجیوں نے ایک گزرتے ہوئے شخص کو آواز دی، وہ ایک نوجوان تھا۔ فوجیوں کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن وہ شخص میرے قریب آیا اور مجھ سے اردو میں بات چیت کرنے لگا۔ پورے احترام سے ایک قسم کا انٹرویو لیا۔ میں نے اس کے ہر سوال کا جواب دیا۔ اپنے بارے میں پاسپورٹ' اسرائیلی ویزہ' سفر کا مقصد بتایا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اب ایک رات ہی میرا مسجد اقصیٰ میں قیام ہوگا، کل واپس چلا جاؤں گا اور عمرہ کر کے وطن روانہ ہو جاؤں گا۔ میرے جواب سے وہ مطمئن نظر آیا۔ اس نے فوجیوں کو میری جانب مخاطب کیا اور مجھ سے کہا کہ "آپ سورہ فاتحہ کی تلاوت کریں۔" میں نے پرسکون انداز میں تلاوت کی۔ وہاں پر موجود لوگ میری تلاوت پر خوش نظر آئے۔ اس نوجوان شخص نے فوجیوں سے غالباً عبرانی زبان میں گفتگو کی جو یہودیوں کی زبان ہے۔ فوجیوں نے میری جانب دیکھا اور اپنی رائفلیں نیچی کرلیں اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اللہ کے فضل وکرم سے ۲۱ رجون ۲۰۱۵ء کو دوپہر کے وقت میں مسجد اقصیٰ بیت المقدس کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ وہ نوجوان شخص تیزی سے میرے قریب آیا اور مجھ سے معذرت کرنے لگا کہ "میں نے جو باتیں آپ سے کیں، وہ میری ڈیوٹی تھی۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے۔ اسرائیلی فوجی ایسا ہی کرتے ہیں۔" اس نے کئی بار معافی مانگی۔ میں بہت متاثر ہوا اور اس سے مصافحہ کیا اور کہا کہ "اللہ ہم سب کو معاف کرے۔" وہ خوش ہو گیا۔ میری نظر سب سے پہلے سنہرے گنبد والی ہشت پہلو مسجد پر پڑی، جو گنبد صخرا سے مشہور ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر جنوب کی جانب مسجد اقصیٰ کا سرمئی رنگ کا گنبد نظر آیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ دائیں جانب حمام اور وضو خانہ تھا۔ میں فارغ ہوا اور وضو کیا۔ پھر مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا۔ ظہر کی جماعت ہو چکی تھی لیکن ہر تھوڑی دیر پر جماعت کی نماز ہو رہی تھی۔ رمضان کی وجہ سے فلسطینیوں کی آمد و رفت مستقل جاری تھی۔ میں نے بھی ایک جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد قیام شب کے لئے جگہ تلاش کرنے باہر نکلا۔ لیکن مجھے بتایا گیا کہ رات کا قیام آپ مسجد اقصیٰ میں کر سکتے ہیں۔ میرا مسئلہ ایک ہی رات کا تھا۔ چند منٹ آرام کرنے کے بعد میں احاطہ میں گھومنے نکلا۔ گنبد صخرا والی مسجد میں نفل نماز ادا کی۔ اس مسجد کے چاروں طرف آٹھ دروازے ہیں۔ وہاں کئی مساجد نظر آئیں۔ میں کافی تکان محسوس کر رہا تھا۔ عصر کی اذان ہوئی۔ نماز عصر کے بعد مسجد ہی میں رہا۔ مسجد کے باہر کافی بڑا میدان تھا، جس کے درمیان فوارہ اور وضو کا انتظام تھا۔ افطار کے وقت اس میدان میں فلسطینیوں کا بہت ہجوم تھا اور افطار کا اچھا انتظام تھا لیکن ان لوگوں نے میری جانب توجہ نہیں کی۔ میں نے مسجد ہی میں روٹی اور کھجور سے افطار کیا۔ احاطے میں کھانے کا ہوٹل وغیرہ نہیں تھا۔ میرے ساتھ اللہ کا مزید فضل یہ رہا کہ ۲۰، ۲۱ راور ۲۲ رتینوں دن روزہ

میں نہ بھوک لگی نہ پیاس لگی اور عمان ایرپورٹ پر لی گئی روٹی تینوں رات کھانے ،سحر اور افطار میں کھاتا رہا۔

مسجد اقصیٰ ایک بڑی مسجد ہے جس میں پانچ ہزار سے زیادہ افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ انتہائی حسین و خوبصورت ہے لیکن دیکھ بھال سے محروم ہے۔ اس میں قبلہ یعنی جنوب کی جانب ایک بڑا گنبد ہے جو اس کی شناخت ہے۔ ایک اور گنبد ہے اور چھوٹے بڑے چند مینارین ہیں۔ مسجد اندر کی جانب اپنے ستونوں کی وجہ سے شمال تا جنوب تین حصوں میں منقسم ہے۔ درمیانی حصے کی چھت انتہائی خوبصورت اور منقش ہے لیکن رنگ و روغن کی کمی تھی۔ یہاں کئی امام ہیں۔ انہیں حرمین شریفین (مکہ ۔مدینہ) کے امام کی طرح باڈی گارڈ حفاظت کے ساتھ امامت کے لئے لاتے ہیں اور واپس پہنچاتے ہیں۔ مسجد کی قبلہ کی دیوار کے بعد بہت گہری کھائی ہے۔ مسجد کا گنبد زیر مرمت تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد بیس رکعت تراویح کی نماز حرم شریف میں ادا کی جانے والی نماز کی طرح پڑھی گئی۔ بہت طبیعت لگی۔ کھانا کھا کر میں نے سونے کی کوشش کی۔ چند حضرات نے تہجد کی نماز ادا کی۔ صبح صادق ہوتے ہی فجر کی اذان ہوئی۔ میں اگلی صف میں جگہ لینے آگے گیا۔ حفاظتی نقطۂ نگاہ سے امام اور پہلی صف کے بعد ایک چوبی حصار بنا ہوا تھا۔ امام کے داخلہ کے لئے خوبصورت شیشے کا دروازہ ہے۔ اسی مقام پر انتہائی خوبصورت شیشے کے دروازہ سے متصل منبر ہے۔ یہ منبر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بنوایا تھا اور انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ نماز کے بعد میں نے آگے بڑھ کر امام صاحب سے ملاقات کی۔ انہوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ انگریزی میں گفتگو کی بہت خوش ہوئے اور بولے یہاں تو کوئی نہیں آتا ہے، آپ ہندوستان سے تشریف لے آئے۔ بہت دیر تک میرا ہاتھ تھامے رہے۔ چند دن مسجد اقصیٰ میں ٹھہرنے کیلئے کہا۔ میں نے معذوری کا اظہار کیا کیونکہ میرا پروگرام مقررہ تاریخوں کے ساتھ تھا۔ انہوں نے مجھے خوب دعاؤں سے نوازا اور یہ بھی کہا کہ میں یہ بھی اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ ہر سال رمضان المبارک میں مسجد اقصیٰ تشریف لائیں۔

میں مزید چند گھنٹے مسجد اقصیٰ میں ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن سوٹ کیس کی فکر تھی، جس میں عمرہ کی چادر وغیرہ تھی۔ نئی چادر خریدنے کے لئے میرے پاس ضروری ڈالر نہیں بچے تھے۔ عمان ایرپورٹ سے ہی احرام باندھ کر جدہ کی فلائٹ پکڑنا تھی۔ اس لئے ۲۳ر جون کو طلوع آفتاب سے قبل بادل نخواستہ واپسی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اسرائیل کی سرحد پر حکام نے پچین ڈالر ملک میں آنے کی فیس کے نام وصول کی اور میں ظہر سے قبل عمان ایئرپورٹ پہنچ گیا۔ اللہ کے فضل سے میرا سوٹ کیس مل گیا۔ پروگرام کے مطابق آدھی رات کے بعد تین بج کر دس منٹ پر رائل جارڈن ایئرلائنس کے طیارہ سے دو گھنٹہ کی پرواز کے بعد سوا پانچ بجے صبح جدہ پہنچا۔ مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ ۳ر دن مکہ معظمہ میں اور ۳ر دن مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ ۲۹ر جون کو شب کے ۱۱ر بجے جدہ سے جیٹ ایئرویز کی پرواز سے ممبئی اور پھر ممبئی سے تیس جون کو دہلی پہنچا۔ پرواز سات گھنٹے کی ہوئی۔ دس دنوں کا یہ سفر اللہ کے فضل و کرم سے پورا ہوا۔ دسویں رمضان المبارک کا افطار اہل وعیال کے ساتھ دہلی میں کیا۔ اہل وعیال نے شکوہ کیا کہ میں نے مسجد اقصیٰ سے فون نہیں کیا۔ عمان اور بیت المقدس میں فون کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس لئے میں نے مکہ معظمہ سے اہل وعیال کو فون کیا تھا۔ تین دنوں تک وہ سب بیحد پریشان رہے تھے۔

....

"گوشۂ باروی"، محلہ چک رحمت (بھیگو)، دربھنگہ-۴ (موبائل: 09431468196)

انجم عظیم آبادی

ٹیگور جینتی کا مشاعرہ اور ساحر لدھیانوی

۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی۔ ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی صدارت میں اس کی کل ہند کانفرنس منعقد کی گئی۔ ادب برائے زندگی نصب العین ٹھہرا۔ پورے ملک میں اس کی شاخیں بننے لگیں۔ کلکتے میں بھی اس کی شاخ قائم ہوئی۔ ترقی پسندوں کے ایک قائد پرویز شاہدی کہلائے جب کہ اس قافلے میں سالک لکھنوی ابتدا ہی سے شریک رہے۔ بعد میں ابراہیم ہوش، مظہر امام، عاقمہ شبلی، احسان ورجنگوی اور دوسرے شامل ہوتے گئے اور پھر ایسا ہوا کہ بنگال کے اردو ادب پر یہ تحریک غالب ہوتی چلی گئی۔ صدیوں سے چلی آ رہی روایتی شاعری کی طنابیں اکھڑنے لگیں۔ کلاسیکی و روایتی شاعری کے سن رسیدہ دلدادگان تو اس نئے شعری رجحانات کو ناپسندیدگی سے دیکھ رہے تھے لیکن ۴۰-۴۵ کے پیٹھے میں رہنے والے اور نئی نسل کا جھکاؤ اس جانب ہونے لگا اور پھر ایسا ہوا کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی تک اسی کا غلبہ رہا۔ چھٹی دہائی کے آس پاس جدیدیت نے بھی سر اٹھایا۔ شعراء و ادباء کی نئی نسل اس جانب بھی متوجہ ہوئی۔ اس تحریک کی بھی دھوم مچی لیکن ۲۵ ربرسوں کے بعد اسے مراجعت کرنی پڑ گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سے جڑے بہتوں کو یہ کہنا پڑا کہ ادب کی ڈھائی دہائی ضائع ہو گئی جب کہ ۱۵ ربرسوں تک ہی ترقی پسند تحریک برصغیر کے ادباء و شعراء پر چھائی رہی اور اس نے انمٹ نقوش قائم کئے۔ آج انجمن کی سرگرمیاں پہلے کی طرح نہیں لیکن کسی نہ کسی طور ترقی پسند تحریک کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔ آج بھی اس رجحان کے تحت کی جانے والی شاعری سن کر سامعین کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ آ جاتا ہے کہ یہ ترقی پسندانہ کلام ہے۔ انجمن کی سرگرمیاں ہوں یا نہ ہوں۔ ترقی پسند تحریک کو جو کام کرنا تھا وہ کر گزری۔

اردو شعر و ادب کو فروغ دینے میں مشاعروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بیسویں صدی کو ہم عوامی مشاعروں کے استحکام اور فروغ کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں۔ ترقی پسند شاعروں کے زیر سرپرستی ہونے والے مشاعروں میں زیادہ تر اس فکر کے شاعروں کی شرکت ہونے لگی تھی۔ ۱۹۶۰ء میں ٹیگور جینتی کے موقع پر ترقی پسند تحریک سے جڑے شعراء اور ادباء کی تحریک پر ''جو بو سنگھ'' کے بینر تلے اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا شاخ مغربی بنگال سے وابستہ رہنماؤں کی سرپرستی میں کلکتے کے پارک سرکس میدان میں کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ وسیع و عریض پنڈال میں خوبصورت شہ نشیں رونق میں اضافے کا باعث تھی۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا۔ پردہ نشیں خواتین کے لئے الگ انتظام تھا۔ باریک پردوں کے انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ اس زمانے کے مقبول و معروف شعرائے کرام بالخصوص ترقی پسند شاعروں کی آمد کے اشتہارات تو جاری کر دیئے گئے تھے لیکن ساحر لدھیانوی کا نام اس مشاعرے کے حوالے سے بہت زیادہ مشہور ہوا۔ یہ لکھنا غلط نہ ہوگا کہ ترقی پسند شاعروں کی شہرت و مقبولیت غزلوں سے زیادہ ان کی نظموں کا حصہ زیادہ رہا ہے۔ مشاعروں میں ان کی نظمیں ہی سامعین کی خصوصی توجہ کا باعث بنتی ہیں۔ آج بھی ان کے اشعار سے زیادہ نظموں کا ہی حوالہ دیتے ہیں۔ اسی قبیل کے شاعروں میں ترقی پسند شاعر اور فلمی نغمہ نگار

ساحرلدھیانوی بھی ہیں جن کے تعلق سے مشہور شاعروصحافی ابراہیم ہوش نے راقم الحروف سے کہا تھا کہ انجم! ساحر اگر اور کچھ بھی نہیں کہتے تو ان کی دائمی شہرت کے لئے ان کی نظم ''تاج محل'' ہی کافی تھی۔ چہ جائیکہ ادب سے فلم تک ان کی دیگر نظمیں بھی چھائی ہوئی ہیں۔ ٹکٹ خرید کر میں بھی مشاعرہ گاہ پہنچا۔ تقریباً دس ہزار کا مجمع دیکھ کر مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ۶۰ء میں میں ''بزم شاکری'' کا رکن تو بن گیا تھا لیکن باضابطہ طور پر شاعری نہیں کیا کرتا تھا البتہ مقامی اور غیر مقامی کچھ شاعروں سے شناسائی ضرور ہوگئی تھی۔ ان ہی میں شاہد جمیل بھی ہیں جنہوں نے بعد میں اپنے تخلص کے ساتھ شاکری کا اضافہ کرلیا تھا۔ اس زمانے میں وہ سنٹرل کالج (مولانا آزاد کالج) یونین کے عہدہ دار ہوا کرتے تھے اور اپنی ادبی وسیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ انہوں نے جب مجھے گیلری میں دیکھا تو اپنے ساتھ اسٹیج تک لے آئے اور وہیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ حضرت رضا مظہری کے بازو میں جگہ خالی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ اس وقت جن شاعروں کو میں پہچانتا تھا ان میں پرویز شاہدی، سالک لکھنوی، مظہر امام، سید سجاد ظہیر کو مصروف پایا جب کہ ابراہیم ہوش، علقمہ شبلی، رضا مظہری، سراج علی آبادی، شاہد جمیل اور مصطفےٰ ناشاد دونوں ہی ساحر کو لانے اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنے کی ذمے داریاں دی گئی تھیں۔ مصطفےٰ ناشاد وہی ہیں جنہوں نے کرشن چندر کے ناول ''الٹا درخت'' کا بنگالی میں ترجمہ کر کے ادب میں اپنی ایک جگہ بنالی تھی اور آج بھی وہ ایک بنگالی ہفت روزہ سے وابستہ ہیں۔ مشاعرے کی صدارت سندر لعل کر رہے تھے۔ سجاد ظہیر، سالک لکھنوی اور مظہر امام نے باری باری مشاعرے کے حوالے سے اپنے کلمات نذرِ سامعین کئے۔ صدر محفل کی افتتاحی تقریر کے بعد مشاعرے کی کارروائی شروع کردی گئی۔ کئی شاعروں کے پڑھنے کے بعد شاہد جمیل کی معیت میں ساحر اسٹیج کی جانب بڑھتے نظر آئے۔ میرے قریب ہی جگہ خالی تھی وہیں بیٹھ گئے۔ ان کے ساتھ دو نوجوان لڑکیاں بھی آئی تھیں وہ بھی وہیں بیٹھ گئیں۔ میرے استفسار پر پرویز شاہدی نے بتایا کہ ساحر اپنے ایک دوست بھاٹیہ کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں ان کے میزبان کی ہیں۔ شاعروں نے ساحر کو سامنے بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ کے اشارے سے ہی تاثر دیتے رہے کہ ٹھیک ہے۔ ساحر کو پاس بیٹھے ہوئے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی کہ اپنے پسندیدہ شاعر کو اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ ساحر کو بلانے کا اصرار ہونے لگا۔ کچھ دیر کے انہیں زحمتِ کلام دی گئی۔ سفید سوٹ میں ملبوس سجے ہوئے الٹے بال، چہرے پر سرخی مائل جو ولایتی پینے کی ایک پہچان بھی ہوتی ہے۔ اپنے بائیں ہاتھ میں اپنی طویل نظم ''پرچھائیاں'' پر مشتمل کتابچے کو دبائے مائک پر حاضر ہوگئے۔ سامعین کے حلقے سے آواز ابھری کہ برسات کی رات..... برسات کی رات''۔ موصوف نے کہا کہ بھائی میں ممبئی سے 'برسات کی رات' منانے نہیں آیا ہوں۔ یہ فلم کسی سنیما ہال میں چل رہی ہوگی کل دیکھ لیں۔ اور از حد پسندیدہ نظم ''پرچھائیاں'' سنانے لگے۔ دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں کے پس منظر میں کہی جانے والی اس نظم کو لوگ نہایت انہماک سے سن رہے تھے۔ یہ نظم ذو بحرین ہے۔ جوں ہی بحر بدلی رضا صاحب کی زبان سے نکلا بحر بدل گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ نظم پردۂ سیمیں کی طرح مناظر پیش کر رہی ہے۔ کتابچہ دیکھے بغیر انہوں نے پوری نظم پیش کردی۔ جس قدر انہماک اور اشتیاق سے یہ نظم سنی گئی اور جو تاثر قائم ہوا وہ اور کسی کے حصے میں نہیں

آیا۔ مشہور پلے رائٹر اور ترقی پسند شاعر راہی معصوم رضا جو اُس وقت صرف ریسرچ اسکالر تھے اپنے پاؤں میں عیب ہونے کی وجہ سے مائک تک آتے آتے لڑکھڑا گئے تو مجمع سے یہ آواز آئی کہ ''پی کے ہے، پی کے ہے'' بزم شاگری کے سینئر شاعروں نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ سجاد ظہیر اور سالک لکھنوی حضرت شاکر کلکتوی کو مشاعرے میں مدعو کرنے آئے تھے لیکن انھوں نے خود نہ جا کر ناظم سلطان پوری کو بھیج دیا تھا۔ اس وقت ناظم صاحب ترنم سے اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے۔ مطلع تھا:

کس شغل کو اپنائیں آخر ترے سودائی
ہنسنے میں بھی رسوائی رونے میں بھی رسوائی

غواص قریشی کے شاگردان حشمت فتح پوری اور کئی بار ایم ایل اے رہے کامریڈ ابوالحسن (حسن اعظمی) سی پی آئی سے وابستہ تھے۔ دونوں کو بھی پڑھنے کا موقع دیا گیا تھا۔ اس زمانے کے سامعین جس طرح سخن فہمی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اب وہ بات کہاں، ابتدا تا آخر گیلریاں سامعین سے بھری کی بھری نظر آئیں۔ ساحر بار بار اٹھ کر جاتے اور فوراً واپس بھی آجاتے۔ میں پریشان کہ آخر یہ حضرت جاتے کہاں ہیں۔ شاہد نے بتایا کہ ان کے لئے اسٹیج کی ایک جانب گوشۂ مے نوشی بنایا گیا ہے۔ صبح کے تقریباً ۴ بجے ساحر کو پھر آواز دی گئی۔ اس بار ''لومبا کا قتل'' نظم پیش کی۔ واضح ہو کہ اقوام متحدہ کا جنرل سکریٹری لومبا ایک حبشی تھا جس کا قتل ہو گیا تھا، سیاسی حلقوں میں اس کے قتل سے یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ چونکہ وہ ایک سیاہ فام تھا اور گوروں کو یہ برداشت نہیں ہوا۔ جو بھی ہو اس نظم نے بھی دھوم مچائی تھی اور اس کا ایک بند تو لوگوں کی زبان پر چسپاں ہوا:

تم نے جس خون کو مقتل میں چھپانا چاہا   آج وہ کوچہ و بازار میں آنکلا ہے
ظلم پھر ظلم ہے اور ظلم کی اوقات ہی کیا   خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
کہیں شعلہ، کہیں نعرہ کہیں پتھر بن کر

ساحر داد دینے میں بخالت سے کام لے رہے تھے۔ لیکن جب منزل لکھنوی نے یہ مطلع پڑھا:

منتیں کر کے ہم مناتے ہیں
اور وہ ہیں کہ روٹھ جاتے ہیں

تو ساحر جیسے خواب سے بیدار ہو گئے۔ غضب کا حسن غضب کا ترنم، انہوں نے خوب داد دی۔ منزل کو پہلی بار اور آخری بار اس مشاعرے میں سننے کا اتفاق ہوا۔ مشاعرہ صبح دم اختتام کو پہنچا۔ ساحر رخصت ہونے کے لئے اٹھے تو صف نسواں سے گوری گوری کلائیاں اور مخروطی انگلیاں نظر آئیں۔ ساحر آٹوگراف دینے لگے۔ تاریخی طور پر کامیاب ہونے والے اس مشاعرے کی جان ساحر ہی تھے۔ وہ ۵۹ برسوں کی عمر پا کر دنیائے فانی سے اٹھ گئے۔ پدم بھوشن ایوارڈ انہیں مل چکا تھا۔ اگر عمر طویل پاتے تو ملک کے بڑے سے بڑا انعام ان کے حصے میں بھی آجاتا۔

....

موبائل: 09674430727

شاہد حسین لعل پوری

زباں در زباں

تغیر کو ثبات ہے۔ اسی طرح زبان کو بھی فنا نہیں۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اور اس کے بعد بھی اپنے بندوں سے ہم کلام ہوگا یعنی زبان ہمیشہ جاری و ساری رہے گی البتہ اس کی ہیئت مختلف ہوگی۔ مطلب یہ کہ زبان ہمیشہ سے تغیر پذیر رہی ہے اور رہے گی۔ زبانی تغیر کی دو اقسام ہیں۔ اول تغیر بجانب بہتری، جسے ہم ارتقاء کا نام دیتے ہیں۔ اور دوئم تغیر بجانب ابتری۔ اول الذکر کی بہترین مثال اردو زبان ہے جو لشکری زبان کی طرح رونما ہو کر آج ادب کی دنیا میں ایک مقام رکھتی ہے۔ موخر الذکر میں پالی، پراکرت، اور عبرانی زبانیں آتی ہیں۔ ان کی زندگی میں ایک وقت آیا جب یہ تغیر سے ہمکنار نہیں رہ سکیں اور معدوم ہو گئیں۔

زبان کی ارتقاء کی پہلی منزل آواز ہے۔ مختلف آوازوں کو خطوط کی شکل دی گئی جو حروف کہلائے اور مختلف حروف کے اشتراک کو لفظ کا نام دیا گیا جو باہمی آدان پردان کا ذریعہ بنا۔ ایک لفظ کا مستعمل ہو جانا اس کی پہلی منزل ہے اور اس کا عام فہم ہو جانا دوسری منزل اور اس کا ادب میں جگہ پالینا اس کے ارتقاء کی انتہا ہے۔ ''چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نینا ملا کے۔'' امیر خسرو نے اسے ادب کے بام عروج پر سرفراز فرما دیا۔ ہری ونش رائے بچن نے ''میرے انگنے میں تمہارا کیا کام ہے'' کو قلم زد کر دیا، بس یہ ادب کا حصہ بن گیا۔ میں نے جو اپنے نام کے بعد لعل پوری لکھا تو میرے چچا زاد بھائی مولانا مفتی اعجاز احمد صاحب کو اعتراض ہوا۔ بھائی اعجاز صاحب الجامعۃ العربیہ اشرف العلوم، کنہواں کے سابق معلم ہیں۔ مدرسہ اشاعت اسلام، بہار شریف کے بانی اور ناظم اعلیٰ ہیں۔ بڑے مدبر شخص ہیں۔ اسلامیات پر اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ زبان و ادب سے بھی دلچسپی ہے۔ ایک روز میرے گھر مہمان ہوئے۔ کہنے لگے'' آپ لعل پوری کیوں لکھتے ہیں؟ لعل پوروی کیوں نہیں؟ قاعدہ کے مطابق لعل پورہ والوں کے لئے لعل پوروی درست ہے نہ کہ لعل پوری۔ لعل پوری تو لعل پور والوں کے لئے مناسب ہے۔''

میں نے کہا'' بھائی! یہ زبان کا سفر ہے، جو منزل بہ منزل اسی طرح جاری رہتا ہے۔ آج لعل پوروی ہے تو کل لعل پوری ہے۔ ویسے لعل پور نام کی کوئی جگہ ہے کیا؟''

وہ خاموش ہو گئے۔ شاید کرۂ ارض پر لعل پور کو ڈھونڈ رہے تھے۔ عصر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ ہم دونوں نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ پھر انہوں نے مجھ سے رخصت لی۔ میں انہیں دروازہ تک چھوڑنے کے لئے جانے لگا تو انہوں نے کہا'' آپ بیٹھئے نا، میں چلا جاؤں گا۔''

میں نے کہا'' نہیں بھائی، آج کل دستور ہے کہ جب تک دور سے ہاتھ ہلا کر الوداع نہیں کیا جاتا ہے، مہمان نوازی مکمل نہیں ہوتی۔''

''الوداع کہا جاتا ہے۔'' انہوں نے میری تصحیح کی۔

میں نے کہا'' چلئے بھئی، الوداع نہیں کرتا، ودا کر دیتا ہوں۔ اگر میری وجہ کر اردو لغت میں ایک لفظ کا اضافہ ہو

گیا تو یہ بھی اس کی ارتقاء کی جانب ایک قدم ہوگا۔"

وہ مسکراتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اترتے چلے گئے اور میں اوپر اپارٹمنٹ کی چھت پر چلا گیا اور انہیں اوپر سے ہی ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔

وہاں اپارٹمنٹ کی چھت پر کچھ لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس کھیل کے باضابطہ آغاز سے قبل لڑکیاں ایک دائرہ بنا کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ایک لیڈر لڑکی نرسری رائم کی طرح کچھ پڑھتی جاتی ہے اور ہر لفظ پر ایک ایک لڑکی کو چھوتی جاتی ہے۔ آخری لفظ پر جس لڑکی کو چھوتی ہے وہ آؤٹ ہو جاتی ہے۔ باقی ماندہ لڑکیوں کے ساتھ پھر یہ عمل دہرایا جاتا ہے اور آخری لڑکی آؤٹ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کئی راؤنڈز (rounds) کے بعد سب سے آخری لڑکی جو بچ جاتی ہے اسے "چور" کا نام نامی اسم گرامی عطا کر کے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے اور کھیل کا آغاز ہوتا ہے۔ اتفاقاً میری ہی بچی چور بنانے کا کارنمایاں انجام دے رہی تھی۔ مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں وہ کیا پڑھ رہی تھی۔ قریب آکر میں نے جو سنا اسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

کوکا پیو پائپ سے، ایپل کاٹو نائف سے
آج کا زمانہ ہے، جوتے کھاؤ وائف سے

میں سناٹے میں آ گیا۔ دل پہ ایک چوٹ سی لگی۔ بھائی اعجاز ہوتے تو سر پیٹ لیتے۔ "الوداع" کے ساتھ "کہنا" کا استعمال حسب بلاغت ہے جس کی وہ مجھے ترغیب دے رہے تھے۔ زبان پر جب وہ اتنی توجہ دیتے ہیں تو یہاں پر نہ جانے انہیں کیسا لگتا۔ میرے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ میں خوش تھا کہ میں اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کر رہا ہوں۔ انہیں ایسی تہذیب سے روشناس کرا رہا ہوں جہاں باہمی محبت کی موجیں ٹھاٹھیں مارتی ہیں۔ ان کے دلوں میں صحیح عقائد نقش کرا رہا ہوں۔ بڑوں کا ادب کرنا، شرم وحیا کی اوڑھنی ڈالنا سکھا رہا ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے گھر میں اردو کا بول بالا ہے۔ مگر اس پیاری سی بھولی بھالی بچی نے کتنے سہل انداز میں احساس دلا دیا کہ ہمارے بچوں کی پرواز کس جانب ہے:

اس طرح آمدِ شبِ تار کی امید نہ تھی
دعوت درک نگاہی بھی تھی، حیرانی بھی

میں اس حیرانی کی کیفیت سے تب اُبھرا جب ایک لڑکی مجھ سے لپٹتے ہوئے میرے پیچھے جا کر چھپ گئی۔ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ بھی لڑکیاں دنیا و مافیہا سے بے خبر کھیل میں منہمک تھیں۔ وہاں ٹھہرنا اب مجھے بہت گراں گذر رہا تھا۔ دل پر ایک بوجھ لئے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترتا ہوا اپنے فلیٹ میں آکر صوفہ پر بیٹھ گیا۔ بڑی عجیب سی پچویشن تھی۔ کہاں تو میں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے بہترین نظم کی تھی۔ سب سے اچھے اسکول میں داخلہ دلوایا تھا۔ گھر میں مہذب ماحول تھا۔ مگر یہ کیا؟ آج مجھے ایسے الفاظ سننے پڑے، وہ بھی اپنی ہی بیٹی کی زبانی! وہ بیٹی جس کی میں اب تک قسمیں کھایا کرتا تھا کہ بہت ہی پیاری اور برکتوں والی بیٹی ہے۔ بے شک وہ ابھی ان الفاظ کے معنی کی نوعیت کو نہیں سمجھتی، مگر جب تک وہ سمجھنے کے قابل ہوگی تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی اور اس کے تحت الشعور

میں منفی خیالات گھر کر چکے ہوں گے۔ مردوں کے بارے میں بالعموم اور شوہروں کے بارے میں بالخصوص۔

ان ہی خیالوں میں غلطاں و پیچاں تھا کہ میری بچی کھیل کر واپس آئی۔ مجھے سلام کیا اور میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اور ایک لمحہ کے بعد بڑی معصومیت سے پوچھا: ''کیا ہوا پاپا؟''

میں جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ بیگم صاحبہ آ گئیں۔ میرا چہرہ پڑھنا انہیں خوب آتا تھا۔ بھانپ گئیں کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ میں نے اپنی بچی سے مخاطب ہو کر کہا:

''بیٹا...... وہ...... ذرا...... وہ سنائیں تو جو آپ چھت پر 'چوز' بنانے کے لئے بول رہی تھیں۔''

اس سے قبل کہ ہماری بیٹی وہ فقرے دہراتی بیگم سمجھ گئیں کہ معاملہ کیا ہے، یوں گویا ہوئیں:

''اوہو، یہ بات ہے! مگر دیکھئے جناب، ایک آپ ہی زبان داں نہیں ہیں۔ ہم اپنی زبان خود تخلیق کرتے ہیں۔ دیکھا! کیسا لگا؟'' ان کے ہونٹوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

''شعر اچھا ہے۔'' میں نے طنز کیا۔

''چلئے، آپ نے اسے شعر کی سند عطا کر دی۔ بہت بہت شکریہ۔'' انہوں نے میرے طنز کا ذرہ برابر بھی نوٹس لئے بغیر جواب دیا۔ ایک لمحہ کے بعد پھر بولیں ''کیوں نہ ہو! یہ شعر بحر اور ردیف وقافیہ پر پورا اترتا ہے؛ اور ایک پیغام بھی ہے۔''

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا، کہ میری بیگم بھی اردو زبان پر اتنی پکڑ رکھتی ہیں!

بے شک ہمارے گھروں میں اردو بولی جاتی ہے مگر غور فرمائیں تو ایک اور زبان بھی ہمارے گھروں میں رائج ہے یعنی زباں درزباں۔ یہ زبان ہے مستورات کی۔ ان کی زبان ہم سے الگ ہوتی ہے۔ ان کے محاورے واستعارے الگ ہیں۔ ان کی تشبیہیں جداگانہ ہوتی ہیں، اشارے وکنائے مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے احساسات بھی ہمارے احساسات سے میل نہیں کھاتے۔ میں نے اس نام نہاد شعر کے معنی اور اس کے منفی اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''مگر بیگم، ہمیں اپنے بچوں کو ایسے سبق نہیں دینے چاہئیں جو آگے چل کر ان کی شخصیت پر منفی طور پر اثر انداز ہوں۔''

''آپ اس کے لئے بالکل فکرمند نہ ہوں۔'' فوراً جواب ملا۔ ان کی آواز میں اعتماد کی جھلک تھی۔ ''انشاءاللہ وہ ایک perfect lady کی شکل میں اُبھرے گی اور میں اس کا ہاتھ کسی ایسے لڑکے کے ہاتھ میں دوں گی جو نام نہاد مجازی خدا نہ ہو کر حقیقت پسندی کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ ہماری بیٹی کے احساسات وجذبات کو بخوبی سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اسے اس کا صحیح مقام دے۔''

میں حیرت زدہ چپ چاپ انہیں تک رہا تھا۔ وہ بولے جا رہی تھیں۔

''اب رہی زبان کی بات، تو ایسے فقرے آپ کو اور بھی سننے کو ملیں گے، اور وہ سب صرف اس لئے کہ آپ لوگوں نے اب تک ہمیں وہ مقام نہیں عطا کیا ہے جس کے ہم حقدار ہیں۔ جناب من! ہم نہ ہوں تو آپ کی شان وشوکت کے واسطے کچھ بھی باقی نہ ہو۔ یاد رکھیں! مردوں کی شان وشوکت کی ساری چیزیں مونث ہیں۔ مثلاً داڑھی ومونچھ!

ٹوپی وشیروانی؛ چھڑی، لاٹھی؛ تلوار، بندوق؛ حکومت و سلطنت؛ ہمت و طاقت؛ حکمت و رفعت؛ دولت و حشمت؛ عقل و تعلیم؛ نماز؛ عبادت؛ زمین، جائیداد؛ صنعت، حرفت؛ یہ ساری کی ساری مل کر ایک ساتھ آپ کی شان و شوکت کو چار چاند لگا رہی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر ہم بیویاں باعث رحمت ہیں۔''

''لیکن محترمہ، اس فہرست میں بدعت، وحشت، ذلت، نفرت کا اضافہ کر لیں اور نکبت تو صرف آپ ہی کو زیبا ہے۔'' میں نے انہیں صلاح دی۔

''محبت بھی ہماری ہی میراث ہے۔'' فوراً دوٹوک جواب ملا۔ ''جناب عالی، آپ تو محبت اور خدمت کا فرق بھی نہیں پہچانتے۔ ہم محبت کرتے ہیں اور آپ اسے خدمت پر محمول کر لیتے ہیں۔ ہم محبت کرتے ہیں، محبت! خالص، سچی محبت۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر تھرتھراتی ہوئی بھرائی آواز میں بولیں ''اب تو بس اتنی ہی تمنا ہے کہ میں سہاگن کی شکل میں اس داعی اجل کو لبیک کہوں، اور اللہ رحیم و کریم سے وہاں بھی اپنے لئے آپ کو مانگ لوں۔''

مجھ پر تو جیسے بجلی گری۔ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پا رہا تھا۔ وہ گھوم کر دیوار کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مگر میں نے دیکھ لیا تھا، وہ اپنی آنکھوں میں آنسو کے چھلکتے قطروں کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں، جو آخر کار ان کے سرخ رخسار پر ڈھلک گئے۔ مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے انہیں جذبات کی اس عمیق گہرائی سے نکالنے کے لئے کہا ''دیکھئے بھئی! آپ بے شک ہم سے محبت کرتی ہیں مگر اس معاملہ میں ہم ذرا خود غرض ہی ثابت ہوا کئے ہیں۔ آپ مجھ سے قبل گئیں تو میری خدمت کون کرے گا؟''

''میں اس کا انتظام کر کے جاؤں گی۔'' انہوں نے منہ پھیرے ہی پھیرے جواب دیا۔

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ آپ کے لئے ایک دوسری لا دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باورچی خانہ کی طرف جانے لگیں۔ کچھ شرمائی سی، کچھ گڑبڑائی سی۔

''کیا واقعی؟'' میں نے انہیں چھیڑا۔

وہ تڑپ کر پلٹیں اور بولیں ''یقین نہیں آتا؟ میں انشاء اللہ اس امتحان میں بھی پوری اتروں گی۔ مگر آپ اس سے عشق مت فرمانے لگئے گا۔''

میں اپنے دونوں کان پکڑ کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ان کی آنکھیں اٹھیں، چار ہوئیں۔ اب صرف ان کی سرخ بھیگی آنکھیں تھیں اور میں تھا۔ اور کچھ بھی نہ تھا۔ میں وبھور ہو گیا۔ اُدھر وہ آنکھوں کی زبان سے کہہ رہی تھیں، ''میں آپ پر قربان!'' اِدھر میرا دل پکار رہا تھا ''اے اللہ یہ طلسم نہ ٹوٹے!''

شراب خوش گوارم ہست و یار مہرباں ساقی
ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

....

موبائل : 09771422145

پروفیسر ایم نہال

کچھ یادیں کچھ باتیں

ڈاکٹر ایم نہال ۱۵ رفروری ۱۹۵۸ء میں پوریاہاٹ، ضلع: ڈمکا (جھارکھنڈ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم محمد عبدالحئی (سابق پولس افسر) دہیاواں، چھپرہ (بہار) نے ریٹائرمنٹ کے بعد محلہ چک رحمت، بھیگو، دربھنگہ میں سکونت اختیار کرلی۔ ڈاکٹر ایم نہال نے شعبۂ لائف سائنس، جے این یو سے ایم فل و پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور ایمس، نئی دہلی سے ضعیفی و ذیابطیس کے مسئلے پر پوسٹ ڈاکٹرل تحقیق کی۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں ایل این متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ حیوانیات میں لیکچرار ہوئے اور اسی شعبے میں یو جی سی کے تعاون سے علومِ ضعیفی کے منفرد کورس کا آغاز بانی پروفیسر کے طور پر کیا جہاں ضعیفوں کی دیکھ بھال کا یک سالہ پی جی ڈپلوما شروع ہوا۔ نیز موصوف نے قومی خلائی تنظیم (ISRO)، وزارتِ سائنس وٹکنالوجی کے تعاون سے یونیورسٹی ہذا میں سیٹلائٹ انٹرایکٹیو ٹرمینل قائم کیا۔ ۲۰۰۴ء تا ۲۰۰۷ء میں ایل این متھلا یونیورسٹی میں ڈیولپمنٹ آفیسر کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ جولائی ۲۰۱۰ء میں صدر جمہوریہ ہند نے ڈاکٹر ایم نہال کو سینٹرل یونیورسٹی آف بہار کے بانی رجسٹرار کے عہدے پر فائز کیا۔ پھر جون ۲۰۱۵ء میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر امرتیہ سین نے انھیں نالندہ (انٹرنیشنل) یونیورسٹی (راج گیر، بہار) کا بانی رجسٹرار مقرر کیا۔ پھر ذاتی اسباب کی بنا پر وہاں سے مستعفی ہوکر ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے پی جی شعبۂ حیوانیات سے وہ دوبارہ جڑ گئے۔ موصوف اپنے خاص میدان یعنی سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں اور اس کا سہرا وہ اپنی والدہ محترمہ ام آسیہ مرحومہ کو دیتے ہیں۔ زیرِنظر عنوان ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' کے تحت کئی بین الاقوامی شخصیات کے تعلق سے ان کی چند نگارشات ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ میں شائع ہوئی ہیں۔ عصمت چغتائی کے حوالے سے زیرِنظر یادداشت ''تمثیلِ نو'' کے جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۲ء شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس شمارے میں اسے دوبارہ شائع کیا جارہا ہے!............ ادارہ

۱۹۸۵ء کے دسمبر کی آخری رات۔ پروفیسر نجمہ ظہیر باقر جے این یو، نئی دہلی کی رہائش گاہ سالِ نو یعنی ۱۹۸۶ء کو خوش آمدید کہنے کا Venue تھی۔ کچھ مخصوص لوگ مدعو تھے۔ مشہور افسانہ نگار عصمتؔ چغتائی اور روسی ریسرچ اسکالر آئنہ Ayena مہمانانِ خصوصی تھیں۔ میں ان دنوں میڈم باقر کے ساتھ .Ph. D کر رہا تھا۔ مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ عصمت آپا اپنے خاص رنگ و انداز میں تکلف کو بالائے طاق رکھ کر ہر شریکِ محفل سے باتیں کررہی تھیں۔ پیش ہیں قارئین کی دلچسپی کے لیے اس گفتگو کے کچھ اہم حصے :

عصمت : نجمہ! تمہارا یہ طریقہ مجھے بے حد پسند آیا۔ سالِ رواں کو الوداع کہنے کا۔ تمہیں اور تمہارے میاں علی کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتی۔ اجنبیت تو سالِ نو کی صفت ہوتی ہے۔

نجمہ : آپا! اسی لیے تو یہ الوداعی نہیں، نئے سال کی پارٹی ہے۔

عصمت : تمہاری باتیں ہمیشہ ہی تم سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔ علی تم بس اللہ پر ایمان لے آؤ۔ بڑی ہی پیاری شریکِ حیات ہے تمہاری۔

علی : شکریہ! مگر خیر کہ آپ نے شریکِ سال نہیں کہا۔

عصمت : ہاں! یہ باقی لوگ کون ہیں؟

(نجمہ باقر، آئینہ، میرا اور دیگر شرکاء کا تعارف کرا دیتی ہیں۔ آئینہ ایک بے حد خوبصورت لڑکی تھی جو ماسکو یونیورسٹی سے Academic Exchange پروگرام کے تحت جے این یو آئی ہوئی تھی اور اردو زبان پر ریسرچ کر رہی تھی۔ اس کا گورا گلابی چہرہ، سرخ لب اور اجنبی آنکھیں سب کو بار بار دعوت دے رہی تھیں۔ آپا بھی اس کے سے سحرِ حسن سے بچ نہ سکیں۔)

عصمت : آئینہ! تم بڑی خوبصورت ہو۔

آئینہ : جی شکریہ! ایسی بھی تو کوئی بات نہیں ....

عصمت : ارے نہیں! جب میری ۷۶ سالہ بوڑھی اور گرد آلود آنکھیں تمہارے حسین چہرے کو بار بار بوسہ دے رہی ہیں تو تم خوبصورت تو ہو ہی۔ بس مان جاؤ۔

جانتی ہو مجھے مادے کی اس شکل سے پیار ہے یعنی انسان سے۔ اس سے زیادہ خوبصورت کچھ اور نہیں ہوتا اور اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ ہے خوبصورت ہونے کا احساس۔ مگر سب سے بڑھ کر ہے چاہے جانے کا احساس! دیکھو! چشمے سے بھی تمہارے گالوں پر رنگوں کی آمیزش دیکھ رہی ہوں۔ وہ خون جو تمہاری رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے، آکسیجن بانٹنے کے لیے کیا رنگ لایا ہے۔ (آگے بڑھ کر آئینہ کے چہرے کو چوم لیتی ہیں۔) میں نے کئی کتابیں پڑھی ہیں۔ فلسفے کی کونین نگلی ہے۔ صرف ایک ہی راستہ نظر آیا ہے جو مجھے مادے کی انسانی شکل میں بار بار دلا سکتا ہے۔ پنر جنم یعنی آواگمن کا راستہ۔ (آئینہ جواب تک محوِ حیرت اور سراپا ہمہ تن گوش تھی، بول پڑی۔)

آئینہ : مگر ایسے بار بار آنے کا کیا فائدہ جب ہر بار نئی شروعات کرنی پڑتی ہے۔ پچھلا تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا جو کام آئے۔

(میں آئینہ کے اس Comment پر چونک جاتا ہوں۔ واقعی کتنی بڑی بات کتنی سادگی سے کہہ ڈالی تھی۔)

عصمت : تو اس میں پریشانی کیسی۔ ایک تو خوبصورتی اور وہ بھی اجنبی جامہ میں۔

آئینہ : نہیں! میں جسم نہیں فکر و خیال کی بات کر رہی ہوں۔

عصمت : تم فرسودہ عمل کی بات کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں خوبصورت نہ کہ خوب سیرت کہا ہے۔ سیرت تو بہت بعد کی Relative سچائی ہے۔ ایک Judgement ہے۔

آئینہ : مگر عمل سیرت بناتی ہے اور سیرت مقصد دیتی ہے۔ ورنہ حیات ہی کیوں ہوتی؟

عصمت : دیکھو تمہارے گالوں کے رنگ بدلنے لگے۔ تمہاری معصوم آنکھیں چپٹی ہو رہی ہیں۔ یہی خرابی ہے جو خوبصورتی کو ختم کر ڈالتی ہے۔ محسوس کرو کہ تم خوبصورت ہو اور چاہے جانے کے قابل ہو۔

(میں اپنے آپ کو روک نہیں پاتا ہوں۔)

نہال : مگر آپا! انسان جو مادے کی سب سے خوبصورت شکل ہے، کیا دوسری مادی اشکال سے عملاً مختلف اور برتر نہیں ہونا چاہیے۔

عصمت : بالکل ہونا چاہیے اور اسی لیے ہوتا بھی ہے مگر جب ہم پیمانہ بناتے ہیں خود کو اور دوسروں کو Judge کرنے کا تو اپنی شکلیں بگاڑ لیتے ہیں۔ جب اپنی پیدائش میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہوتا تو پیمائش میں کیوں دخل اندازی کرتے ہیں۔

نہال : میں مسلمان ہوں اور یہ میرا ایمان ہے کہ اصل خوبصورتی خوب سیرتی سے ہی آتی ہے۔ رہا سوال Judgement کا تو وہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ آخر خالق اور مخلوق کے رشتے کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ بس ظاہری حسن اور بے مقصد حیات سے؟

عصمت : بس بس۔ یہی بدصورتی ہے کہ میں مسلمان ہوں، تم کرسچین ہو اور وہ ہندو۔ یہ ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔ ارے ہم صرف انسان ہیں اور وہی بنے رہیں۔ (کچھ دیر خاموش ہو جاتی ہیں۔)

چلو مان لیتے ہیں دوسرا جنم نہیں ہو سکتا۔ مگر جلائے جانے یا دفنائے جانے کے بعد میں مٹ نہیں جاؤں گی۔ پھر آؤں گی۔ ہری ہری مخملی دوب کی شکل میں۔ پھولوں کی مسکراہٹ میں، پتیوں کی سرسراہٹ میں۔ مجھ پر بھی بھنورے منڈلائیں گے۔ پتہ ہے کیوں؟ اس لیے کہ میں خوبصورتی کی بات کر رہی ہوں۔ بھنورے کا لمس پا کر کلی انگڑائی لیتی ہے اور پھول بن جاتی ہے۔ پھول بننا احساس حسن کی دلیل ہے جسے خود سے بیگانہ نہیں ہونا چاہیے۔ حسن دین نہیں ہے ایک کیفیت سرور ہے جو جسم کے ہالے سے ہی ابھرتی ہے مگر تب جب کوئی چاہنے والا ہو۔ حسن کو فانی کہنے والے اس کی انگنت شکلوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ کافر تو وہ ہے جو اسے نہ مانے۔

(اسی دوران رات کے بارہ بجے کا وقت قریب آ جاتا ہے اور یہ گفتگو رک جاتی ہے۔ سال نو آ جاتا ہے اور مبارکبادی کے بعد میں اپنے ستلج ہوسٹل واپس آ جاتا ہوں۔)

....

رابطہ: پروفیسر، پی جی شعبۂ حیوانیات، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ (بہار) موبائل: 09835043342

ڈاکٹر امام اعظم

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز: اردو میں سائنسی موضوعات کی اہم شخصیت

اردو میں سائنسی موضوعات پر جن قلم کاروں کی تخلیقات معتبر مانی جاتی ہیں، ان میں ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے تسلسل سے عام فہم زبان میں سائنس کی گتھیوں کو سلجھا کر روشن باب کھولے ہیں، جن میں شناخت کے عوامل ہیں اور تخلیقی، تحقیقی اور فکری رویے ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع ہوتے ہیں، فضائی کثافت، آبی کثافت، خوراک کا مسئلہ، بڑھتی ہوئی آبادی پر روک، پٹرول کے بعد اور رجنگلات جیسے اہم موضوع کے ساتھ سورج، توانائی، چاند، ستارے اور ان جیسے آشنا و نا آشنا موضوعات پر انھوں نے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں جن سے واسطہ عام انسانوں کو روز پڑتا ہے۔ وہ بوٹانی (علم نباتات) کے استاد رہے ہیں لیکن اردو میں لکھ کر سرمایۂ علم و ادب میں اضافہ بھی کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نومبر ۱۹۸۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ نباتات سے وابستہ ہوئے جہاں انھوں نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر ذاکر حسین دہلی کالج سے وابستہ ہوئے، جہاں ۲۲ رسال شعبے میں وہ استاد رہے۔ اپریل ۲۰۰۵ء میں اسی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اپنی تدریسی و انتظامی زندگی کا بڑا حصہ یہاں گزارتے ہوئے اکتوبر ۲۰۱۵ء میں اس وقت فارغ ہوئے جب انھیں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدر آباد) کے شیخ الجامعہ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا گیا۔ ۲۰ ر اکتوبر ۲۰۱۵ء کو انھوں نے اس عہدے کا جائزہ لیا۔ واضح ہو کہ موصوف مارچ ۱۹۹۸ء تا جون ۱۹۹۹ء مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے دہلی ریجنل سینٹر میں تاسیسی ریجنل ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے تھے۔ اس دوران دیگر علمی و سماجی خدمات سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ ۱۹۹۴ء میں وہ 'اسلامک فاؤنڈیشن فار سائنس اینڈ انوائرنمنٹ' سے تعلیمی / ماحولیاتی رضا کار کے طور پر وابستہ ہوئے۔ جون ۲۰۱۳ء میں انھوں نے 'مینا قرآنک ایجوکیشن ٹرسٹ' کی بنیاد ڈالی اور اب بھی بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ قرآن، سائنس اور ماحولیات کے تعلق سے وہ ہمیشہ سے سرگرم عمل رہے ہیں اور دنیا کے بہت سے ممالک میں اس موضوع پر خطاب بھی کر چکے ہیں۔

سائنسی مضامین پر مشتمل ان کی تین کتابیں ''سائنس کی باتیں''، ''سائنس نامہ'' اور ''سائنس پارے'' شائع ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ قرآن اور علم کے رشتے کو اجاگر کرنے والی ان کی کتاب ''قرآن، مسلمان اور سائنس'' کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں نیز اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ان کی ادارت میں اردو ماہنامہ ''سائنس'' (اجراء: فروری ۱۹۹۴ء) شائع ہو رہا ہے۔ ان کی کتاب ''سائنس پارے'' پر نوبل انعام یافتہ سائنس داں پروفیسر عبدالسلام نے اپنی رائے اس طرح دی ہے:

''اردو میں سائنسی لٹریچر کی فراہمی اس برصغیر کا ایک اہم مسئلہ ہے۔...... مجھے بے حد خوشی ہے کہ ڈاکٹر

محمد اسلم پرویز اردو میں عام فہم سائنسی مضامین نہ صرف یہ کہ پابندی سے لکھ رہے ہیں، بلکہ ان کی تحریروں نے سائنس کے تقریباً سبھی جدید موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں سائنسی صحافت کو از سر نو زندہ کرنے میں اس نوجوان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔......"

ڈاکٹر خلیق انجم (جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند) ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی کتاب "سائنس کی باتیں" پر رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"......اردو والوں میں سائنس کے مختلف شعبوں میں ماہرین کی تعداد بہت کم ہے اور جو ہیں وہ اپنی مادری زبان، اردو کی طرف سے احساسِ کم تری میں کچھ ایسے مبتلا ہیں کہ اردو میں نہیں بلکہ انگریزی میں لکھنا پسند کرتے ہیں۔...... اردو زبان میں اسلم صاحب جیسے ذہین، محنتی اور باصلاحیت نوجوان کی آمد پر ہمیں لال قالین بچھا کر ان کا استقبال کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے وائس چانسلر بننے پر معروف صحافی شاہد صدیقی (ایڈیٹر "نئی دنیا" دہلی) لکھتے ہیں:

"......حیدرآباد میں قائم اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر ایک قابلِ اردو اور ملت کی ہمدرد شخصیت کا تقرر عمل میں لایا گیا ہے جو یونیورسٹی کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں کیوں کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے مقاصد کے ساتھ قائم کی گئی یونیورسٹی کو ایک ایسی شخصیت دی گئی جو اردو داں بھی ہے اور اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے ان کا شاندار ریکارڈ موجود ہے۔......"

("گواہ" اردو ویکلی حیدرآباد ۳۰ر اکتوبر-۵ر نومبر ۲۰۱۵ء)

معروف طنز و مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز (حیدرآباد) نے ان کی تقرری پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"......ڈاکٹر اسلم پرویز اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ ایسے اردو والے نہیں جو اردو کی روٹی کھا کر اسے نقصان پہنچا رہے ہیں بلکہ اردو کی خدمت کر کے خود نقصان اٹھا لیتے ہیں۔" (ایضاً)

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز مدیر "گواہ" حیدرآباد کا ماننا ہے:

"...... چوں کہ سائنس کے اہم ترین شعبہ سے ان (ڈاکٹر محمد اسلم پرویز) کا تعلق ہے، اس لیے حقیقت پسندی ایسے افراد کی پہچان ہوتی ہے۔ حیات بخش "سنجیونی" کہاں چھپی ہوتی ہے، اور اس کا استعمال کیسے کیا جانا چاہیے، وہ جانتے ہیں۔" (ایضاً)

موصوف کی سائنسی موضوعات سے دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک وہ ۴۰۰ر سے زائد سائنسی نگارشات قلم بند کر چکے ہیں نیز چار ریاستوں کے نصابی کتب میں ان کے ابواب شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کے سائنسی نکات ذکر و فکر کے لحاظ سے شعور و آگہی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ وہ معلومات بہم پہنچا کر نئی قدروں اور موشگافی کے متحرک کردار کے امین بنتے ہیں اور اطلاقی طریق کو عصر سے روشناس کرتے ہیں۔ انھوں نے جدید اضافی سیاق میں صحت مند اشکال کو نئی کثیر الوضع سائنسی ادبیت بخشی ہے۔ اسی لیے ان کی تحریر معتبر اور قابلِ قدر قرار پاتی ہے۔

....

ڈاکٹر امام اعظم

بصارتِ فکری

(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کی نذر)

ادب میں پھر نگارِ ساختیت
معانی ساز لفظوں کی صداقت
سرِ لوح و قلم فکری بصارت
پسِ موضوع نباتاتی حقیقت
جنونِ عشق ہر عنواں میں پنہاں
گلوں کی وادیاں ہوں یا بیاباں
ہر اک شئے ہے بہ مثلِ حسنِ تاباں
شرار و سنگ بھی تخلیقی عنواں
بڑے مبہم ہیں اجمالی اشارے
چھپے ہیں خاک میں بھی چاندتارے
تھے آب و گل بھی رخشندہ کنارے
دھنک آوردہ تحقیقی نظارے
خرد سازی کے سائنسی حوالے
وقارِ عزم کے روشن ستارے
کہاں ملتے ہیں اب ایسے جیالے
جو فن میں ڈال دے فکری اجالے
نیا گوشہ ، نئی تاریخ سازی
'قرآنی' آیتوں کی سرفرازی
زباں کو بخش دی وہ دل نوازی
سخن کو مل گئی جدت طرازی
مبارک آپ کو 'پرویز اسلم'
سدا قائم رہے یہ عزمِ پیہم
دعا مقبول ہوجائے یہ اعظم
طلسمِ عزم ہو کچھ اور محکم

....

(بشکریہ: ''گواہ'' اردو ویکلی، حیدرآباد مورخہ ۱۸-۲۴؍دسمبر ۲۰۱۵ء)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

اکیسویں صدی میں اردو صحافت

صحافت عربی لفظ ہے جو ''صحیفہ'' سے نکلا ہے۔ اس لفظ کا مترادف Journalism ہے جس کا ماخذ لاطینی لفظ Diurnal ہے۔ Webster Dictionary میں لفظ صحافت کی وضاحت اس طرح ملتی ہے:

"Writing Designed for publication in a newspaper or public magazine writing characterised by a direct presentation of facts or discription. Writing designed to appeal to current popular taste or current public interest."

یعنی اخبار و رسائل میں چھاپنے کی غرض سے تحریری مواد کی تیاری کا نام صحافت ہے۔ جس میں عوامی مذاق اور حالیہ دلچسپیوں سے متعلق امور بالواسطہ طریقہ پر اپنی اصلی شکل وصورت میں پیش کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ فن فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے مؤثر ذرائع ابلاغ کے اندر بھی کارفرما ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو صحافتی نظام ترکیب درج ذیل شعبوں میں منقسم ملتے ہیں:

(۱) ادارتی شعبہ (۲) تکنیکی شعبہ (۳) تجارتی شعبہ (۴) انتظامی شعبہ

لیکن اس کے لئے اردو صحافت کو کئی مرحلے سے گذرنا پڑا ہے۔

تبادلۂ آبادی، قتل وخون اور اردو کے خلاف نفرت کی مہم نے اردو صحافت کو متاثر کیا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد اور رنگ برنگی تہذیب کی زبان اردو کی چشم پوشی باضابطہ طور پر ہوتی رہی ہے۔

اردو کو مسلمانوں کی زبان ثابت کرنے کی سازشیں ہوتی رہی ہیں۔ اس کی ابتدا فورٹ ولیم کالج میں ہوئی تھی۔ ہندوستان کی آزادی تک پہنچتے پہنچتے متعصب اور کٹر ذہنیت والوں کی وجہ سے یہ پودا پروان چڑھا اور اکیسویں صدی آتے آتے توانا درخت بنتا گیا جس کے سایے میں اردو زبان کو پنپنے میں دشواری ہوتی رہی ہے۔ اردو والے بھی مخلص نہیں ہیں۔ ان سب کا اثر اردو صحافت پر بھی پڑا ہے جو مضرت رساں ہے۔ ایک اور وجہ صحافت کی تکنیکی تعلیم کا فقدان ہے۔ ہندوستان گیر پیمانے پر اردو صحافی تکنیکی تعلیم سے ناواقف ہیں۔

عام طور پر سرکاری سرپرستی یعنی اشتہار حاصل کرنے کے لئے اخبار نکالا جاتا ہے جس میں جذبے کے فقدان کی وجہ سے نہ تو کسی قسم کی بالغ نظری آتی ہے، نہ قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور نہ کسی طرح کا رجحان یا میلان ابھر کر سامنے آتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو اخبار کے مالکان کے ذریعہ اردو صحافیوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اخبار کے مالکان زیادہ تر ایسے لوگوں کو کام دیتے ہیں جو بے روزگار ہیں۔ جنھیں معمولی تنخواہ دے کر زیادہ سے زیادہ محنت کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ پڑھے لکھے یہ لوگ ترجمہ کرنے اور نیوز بنانے سے لے کر پروف ریڈنگ تک کا ''عہدہ''

سنبھالتے ہیں۔ اداریہ تو لکھتے ہی ہیں جس پر کسی کا نام نہیں ہوتا۔ اس کا سارا کریڈٹ اخبار کے مالک یا ایڈیٹر (عام طور پر مالک ہی ایڈیٹر ہوتے ہیں) کو جاتا ہے۔ مالک سرمایہ لگاتا ہے۔ اشتہار حاصل کرنے اور سیاسی لوگوں سے تعلقات بڑھانے کی تگ ودو کرتا ہے۔ اخبار میں کام کرنے والوں کے مسائل سے اسے دلچسپی نہیں رہتی۔ اکیسویں صدی کے برسوں میں بھی اس ''روایت'' میں تیزی آئی ہے۔

ایک اور وجہ عالموں اور دانشوروں کی اردو صحافت سے عدم وابستگی بھی ہے۔ آزادی سے قبل دانشور طبقہ ہی اخبار سے وابستہ ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد یہ طبقہ دور ہوتا گیا اور اکیسویں صدی آتے آتے وہ ''بندھوا اسٹاف'' کی حیثیت سے کام کرنا پسند نہیں کرتے۔

ان سب کے باوجود ہندوستان میں اکیسویں صدی میں زندگی کے تمام شعبوں کا حال احوال اردو صحافت میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر افضل مصباحی نے اپنے مضمون ''پرنٹ اور الکٹرونک میڈیا'' میں اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

> ''تاریخ، حالات حاضرہ، سرکاری اعلانات، عدالتوں کے فیصلے، عوامی رائے، کھیل کود، انٹرٹینمنٹ، فیچر، انسانی زندگی سے متعلق خبریں، سیاست، تہذیب وتمدن، پیار ومحبت، شاعری، پیدائش وموت، تفریق یوم پیدائش ووفات، جرائم، کارٹون، اشتہارات، مضامین، خبروں کے تجزیے، قارئین کے خطوط، سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی سرگرمیاں، تعلیم، ملازمت، صحت، طب، سائنس وٹکنالوجی وغیرہ سے متعلق معلومات، قومی اور بین الاقوامی خبریں، ایجادات وانکشافات، علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں، موجودہ حالات اور دوسروں پر اس کا اثر، تنقیدی اور ذاتی مضامین، پروفائل، تبصرے، لطیفے اور چٹکلے وغیرہ، شہر کی سرگرمیاں، لیکچرس، حکایات، تقریریں، سیمینار، جلسے جلوس، کانفرنس، ورکشاپ، طبی کیمپ، میلے، فلم، موسم کے حالات، تجارت، صنعت، حرفت وغیرہ سے جزمی اطلاعات وغیرہ۔ گویا آج کے اخبارات زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہیں۔''

اکیسویں صدی میں اردو صحافت کے محرکات اور مقاصد میں تبدیلی ضرور آئی ہے اور لوگ اسے پیشہ اور پروفیشن کے طور پر اپنا رہے ہیں۔ مجبوری یا ضرورت جو بھی وجہ ہو۔ پیشہ کے معنی ویبسٹر ڈکشنری میں اس طرح ہے:

> ''پیشہ کا مطلب ایک دھندا ہے جس کیلئے خاص لیاقت، معلومات، مشق ومہارت کے ساتھ اکثر طویل اور بھرپور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جو اسے اختیار کرنے والوں کو مسلسل مطالعے اور اس طرح کے کام کا ذکر کرتا ہے جس کا مقصد خدمت خلق ہو۔''

لیکن آج اردو صحافت میں بھی جائز اور ناجائز طریقے سے روپے کمانے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرد صحافت کی مثال سامنے آنے لگی ہے۔ یہ دراصل تجارت کی منزل ہے۔ اس کا اصل مقصد ذاتی فائدہ ہوتا ہے۔ ذاتی کے مفہوم میں گروہ یا کمپنی بھی شامل ہیں۔ زرد صحافت کے سلسلے میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد نے تلقین اور تنبیہ اس طرح کی تھی:

''اخبار نویس کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے اور چاندی اور سونے کا تو سایہ بھی اس کے لئے سم قاتل ہے۔ جو اخبار نویس رئیسوں کی ضیافتوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی اعانت ،قومی عطیہ اور اسی کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں، وہ بہ نسبت اس لئے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں، بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر رئیسوں کی دیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچے ''کام ایڈیٹری کا'' کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے ہیں۔''

اکیسویں صدی کی اردو صحافت میں فروخت کرنے کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے کیونکہ صحافت کی دکان سجانے والے اپنے منافع کو اولیت دیتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ بھی ہندوستان میں اردو صحافت کی ترسیل ہوتی رہی ہے۔ آج اکیسویں صدی میں خبروں کے ساتھ ان میں مذاکرے، مباحثے، انٹرویو، تبصرے اور ادبی تخلیقات پیش کی جاتی ہیں۔ جس طرح مطبوعاتی صحافت میں مختلف ذوق کی نمائندگی کے لئے مواد پیش کیا جاتا ہے اسی طرح ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا دائرہ عمل بیحد پھیلا ہوا ہے جس کے عمل درآمد کے لئے سیاسی، ثقافتی، سائنسی، ادبی اور سماجی امور سے متعلق ماہرین، نامہ نگار، ناکر، اینکر، انجینئر، پروڈیوسر، پروگرام ایگزیکٹو وغیرہ عہدے دار ہر منٹ کا نشریہ تیار کرتے ہیں اور تکنیکی ضروریات پر نظر رکھتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ آج اردو صحافت کی ترسیل میں وسعت اور ہمہ گیری آئی ہے۔

جہاں تک مطبوعاتی صحافت کی بات ہے اکیسویں صدی میں اردو اخبار و رسائل کی تعداد روز افزوں ہے۔ چند ریاستوں کے بعض اخبار و رسائل کی مختصراً تفصیل اس طرح ہے:

بہار اور جھارکھنڈ نے بھی اردو صحافت کے فروغ میں زبردست حصہ لیا ہے۔ گذشتہ پندرہ برسوں میں قومی تنظیم، راشٹریہ سہارا، انقلاب، سنگم، عظیم آباد ایکسپریس، اردو ایکسپریس، پندار، فاروقی تنظیم، انقلاب جدید، رفیق، ہمار نعرہ، آدرش، امن چین، سیکولر محاذ، گرم ہوا، زبان و ادب، کوہسار جرنل، مریخ، آمد، امروز، جدید اسلوب، الکوثر، انتخاب، ادبی نقوش، بہار کی خبریں، تمثیل نو، جہان اردو، دربھنگہ ٹائمز، اصناف ادب، الجیب، نقیب، ابجد، مفاہیم، رنگ، مباحثہ، وقت، وائس آف بہار، موج ادب، افق ادب، اردو ٹوڈے، اردو جرنل، بزم اتحاد، جریدہ، عکس، عہد نامہ، گل وصنوبر، مجلّہ، اور اک، عوامی نیوز وغیرہ کی کہکشاں ہے۔ بعض وجوہ کی بنا پر ان دنوں چند نہیں شائع ہو رہے ہیں۔

اتر پردیش سے نیا دور، آگ، الفرقان، الفاظ، کتاب، معلم اردو، قومی آواز، عزائم، شب خون، فروغ اردو، امکان، اکادمی، گل کدہ، الحسنات، نور، میرٹھ میلہ، گلبن، خرام، رضوان، سیاست جدید، ترنیم کش، لمحے لمحے، معارف، شاندار، خبرنامہ، سبق اردو، تفہیمات، اشرفیہ، راشٹریہ سہارا، بزم سہارا، عالمی سہارا، تنقید، نوائے طب و صحت، تحریک ادب، مبشر عصر، اچھا ساتھی، سائنس اور کائنات، فکر و نظر، ادبی گزٹ، لاریب، پہچان، بچوں کا تحفہ وغیرہ شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اکیسویں صدی میں ہی دم توڑ چکے ہیں۔

دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہے جہاں سے کثرت سے اخبار و رسائل نکلتے رہے ہیں۔ ان دنوں الجمعیۃ، پرتاپ، ملاپ، ہند سماچار، نئی دنیا، اخبار نو، اخبار مشرق، دعوت، ہم لوگ، ان دنوں، چوتھی دنیا، تیج، بیسویں صدی،

ہدیٰ، ہما، اردو دنیا، فکر و تحقیق، بچوں کی دنیا، امنگ، ایوان اردو، آج کل، پیام تعلیم، ادب ساز، جدید خبر، سیکولر قیادت، برہان، کتاب نما، خاتون مشرق، پاکیزہ آنچل، مُنادی، دین دنیا، ہماری زبان، اردو بک ریویو، باجی، فلمی ستارے، ادبی دنیا، یوجنا، سنت نرنکاری، بچوں کی نرالی دنیا، حیات، جام نور، ماہ نور، مستقبل، جہان کتب، پیش رفت، الرسالہ، سائبان، مسرت وغیرہ کی اپنی شناخت ہے۔ اپیبن، برٹش جائزہ، ارمغان، استعارہ، حدیث دل، قصے، رہنمائے تعلیم جدید، ملی اتحاد، نئی کتاب کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

پنجاب ریاست بھی اردو صحافت کا مرکز رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں بھی چند اخبار ورسائل اپنا وجود منوار ہے ہیں۔ ہند سماچار، پرتاپ، ملاپ، لدھیانہ ایکسپریس، پرواز ادب، پاسبان، ادیب وغیرہ کثیر الاشاعت اخبار ورسائل ہیں۔ ہریانہ اردو اکاڈمی کا رسالہ ''جمنا تٹ'' ہے۔

جموں وکشمیر سے بھی کثیر تعداد میں اخبار ورسائل شائع ہو رہے ہیں۔ کشمیر عظمیٰ، روشنی، وادی کی آواز، اجالا، آفتاب، نوائے کشمیر، نوائے ڈگر، نیا کشمیر، صدا، نگینہ، آئینہ، شیرازہ، صدائے کشمیر، حریت، سری نگر ٹائمز، کارواں، فرنٹ، پرواز، انقلاب، خبر و نظر، صبح کشمیر، بزم ادب، لفظ لفظ، اکیڈمی، ترسیل، جہات وغیرہ اہم ہیں۔

راجستھان سے آزادی کے بعد اردو میں اخبار ورسائل کم شائع ہوئے۔ اکیسویں صدی میں اور بھی کم نکل رہے ہیں۔ نخلستان، ہدایت، اردو دنیا، ترسیل وغیرہ اپنا وجود منوار ہے ہیں۔

گجرات سے چند ہی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ گلبن، لکھنو آ گیا، سابر نامہ، صوت القرآن اور ندائے حرم میں آخر الذکر دونوں رسائل پابندی سے منظر عام پر آتے ہیں۔

مہاراشٹر میں اردو صحافت کی طویل تاریخ رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں انقلاب، اردو ٹائمز، ہندوستان، مسلم، شاعر، اسباق، توازن، روپ رنگ، تکمیل، نیا ورق، ترسیل، قرطاس، بے باک، اردو میلہ، احساس، اردو چینل، تریاق، آموزگار، نوائے ادب، نقش کوکن، جل پری، اوصاف، دل رس، فنون، خیر اندیش، ادبی کارواں، گل بوٹے، تحریر نو، تکلم، ہمعصر، آج، جمہوریت، اردو رپورٹر، راشٹریہ سہارا، اثبات، فلم سنسار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعض مالک و ایڈیٹر کے انتقال کے بعد دم توڑ چکے ہیں۔

مدھیہ پردیش بھی اردو کا گڑھ رہا ہے۔ آج بھی یہاں سے ندیم، آفتاب جدید، بھوپال ٹائمز، انتساب، کاروان ادب، صدائے اردو، صدائے ہلچل، شاخیں، معیار ادب، شب مالوہ، سفیر مالوہ، ہمارا ادب، بزم اقبال، محفل فنکار وغیرہ اردو صحافت کو مالا مال کر رہے ہیں۔

کرناٹک سے اردو کے چند اخبار ورسائل شائع ہو رہے ہیں۔ سالار، پاسبان، رہنمائے کرناٹک، اذکار، ادیب، زرّیں شعاعیں، میڈیکل زون، ظرافت، طنز و مزاح، نقوش عالم، تعمیر نو، صدائے اطفال وغیرہ کی اپنی پہچان ہے۔

آندھرا پردیش سے درجنوں اخبار ورسائل نکل رہے ہیں۔ ان میں رہنمائے دکن، سیاست، منصف، اعتماد، رہبر دکن، جمہوری قدم، آندھرا پنچ، عوام، اصنام، اصنام شکن، دکن ریویو، راشٹریہ سہارا، خوشبو کا سفر، رنگ و بو، پروانۂ دکن، شگوفہ، شاداب، شعر و حکمت، سب رس، فنکار نو، بزم آئینہ، حسن ملت، اقبال ریویو، لمس کی خوشبو، بساط ذکر و فکر،

پیام اردو، گواہ، گونج، تمہید، شمع اردو وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ بیشتر کی اشاعت جاری ہے۔

اڑیسہ سے ترویج، ادبی محاذ، فروغ ادب، اخبار اڑیسہ، دورجدید سلسلہ وغیرہ نے اکیسویں صدی میں اردو کی ادبی صحافت کو زندہ رکھا ہے۔

مغربی بنگال ابتدا سے اردو صحافت کا مرکز رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں اخبار مشرق، آبشار، آزاد ہند، عکاس، اجالا، عوامی نیوز، نوائے بنگال، انشاء، ترکش، سہیل، دستخط، کائنات، جنگ نامہ، روح ادب، مژگاں، صورت، مقتل، راشٹریہ سہارا، اثبات ونفی، تسلسل، جام جہاں نما، شہرنو، عاقبت، کاف نون، مغربی بنگال، نئی صدی، ہند ایکسپریس، محرک، اسپورٹس اور فلم، محفل خوش رنگ، رنگ رس، فکروتحریر، شہر نشاط، استقلال وغیرہ شائع ہوکر سیکولرزم کا خوشگوار ماحول بنانے میں کامیاب ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بعض کی اشاعت کچھ عرصہ سے بند ہے۔

ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے بھی آج اکیسویں صدی میں اردو اخبارات ورسائل نکل رہے ہیں۔ ہماچل پردیش سے ''سرسبز'' اور ''فکروفن'' جب کہ اترانچل سے ''گوشوارہ'' پابندی سے شائع ہورہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اردو صحافت اکیسویں صدی میں ایک مشن کے تحت اور کئی مقاصد کے ساتھ ترقی کے منازل طے کرتی رہی ہے۔ آج اردو صحافت ہندوستان میں تیسرے نمبر پر ہے۔ سرکاری سروے کے مطابق تعداد کے اعتبار سے ہندی اور انگریزی کے بعد اردو کا نمبر ہے۔ یہ خوش کن جانکاری ہے کہ اکیسویں صدی میں اٹھارہ ریاستوں سے اردو اخبار ورسائل نکل رہے ہیں۔ حالانکہ اردو کے خلاف سازش اور عدم توجہی جاری ہے۔

ہندوستان سے باہر نظر دوڑاتے ہیں تو کئی ممالک میں اردو صحافت اپنا جلوہ دکھاتی نظر آرہی ہے۔ میں اپنی ذاتی لائبریری سے استفادہ کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے بعض رسائل کا جائزہ لیتا ہوں۔ یہ سبھی ادبی ہیں۔ ان میں سے بعض گذشتہ کئی سال سے اشاعت موقوف کئے ہوئے ہیں لیکن یہ سبھی ۲۰۰۰ء کے بعد کے رسائل ہیں۔

بنگلہ دیش میں اردو کا ماحول نہیں ہے۔ پھر بھی گاہے گاہے اردو کے عاشق صادق پیدا ہوجاتے ہیں۔ ایوب جوہر اب زندہ نہیں ہیں لیکن انہوں نے ''انکشاف'' کئی سال تک نکالا۔ ۷۲ ر صفحے کا پہلا شمارہ جنوری ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ جس میں وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، جگن ناتھ آزاد، شہزاد منظر، شفق، سلطانہ مہر، مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ کی تخلیقات شامل ہیں۔ ''ادب'' جلال عظیم ۶۴ ر صفحے میں نکالتے تھے۔ جنوری ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں اداریہ، حمد، سلام کے ساتھ سات مضامین، نو شاعروں کی نظمیں، سات افسانے، رباعیات اور غزلیں شامل ہیں۔ یہ دونوں رسالے ڈھاکہ سے نکلتے تھے۔

امریکہ سے ''آواز''، ''روشنی'' اور ''قلم قافلہ'' میرے مطالعہ میں رہے ہیں۔ ''آواز'' کا پانچواں شمارہ ۱۲۰ ر صفحے میں ۲۰۰۰ء کا ہے جس میں تاریخی اور ادبی مضامین لکھنے والے بیشتر اہم نام ہیں۔ ایس ایم داؤد، خانم تسنیم، حسن علی اور ملکہ جعفری اسے نیویارک سے نکالتے رہے ہیں۔ ''روشنی'' کے مالک و مدیر قمر نقوی نقشبندی ہیں۔ جہازی سائز کے ۳۶ ر صفحے میں رنگین شائع کرتے ہیں۔ دوسرا شمارہ دسمبر ۲۰۰۰ء کا ہے جس میں علم ودانش، تہذیب وتمدن،

شعروادب،طنزومزاح اورتاریخ وجغرافیہ بھی کچھ شامل ہوتا ہے۔یہ Tulsa سے نکلتا ہے۔''قلم قافلہ'' گل بخشالوی نکالتے تھے۔۲۰۰۹ء اور ۲۰۱۰ء کے شمارے میرے پیش نظر ہیں۔ جہازی سائز کے ۵۴رصفحے کا یہ رسالہ رنگین اور باتصویر چھپتا تھا۔نومبر ۲۰۱۰ء کا شمارہ، احمد فراز نمبر ہے۔ کسی بھی شمارہ میں قیمت درج نہیں ہے۔بعد میں مجھے پتہ چلا کہ گل بخشالوی امریکہ سے افریقہ چلے گئے اور وہاں سے گجرانوالہ (پاکستان) شفٹ کر گئے۔

ترکی (استنبول) سے ڈاکٹر خلیل طوق آر ''ارتباط'' بڑے سائز کے ۶۴ صفحے میں شائع کرتے ہیں۔اس رسالہ کے ذریعہ ترکی اور برصغیر کو قریب لانے کی وہ کوشش کرتے ہیں۔اس میں مضامین، افسانے، سفرنامہ اور شاعری کے معیاری نمونے ملتے ہیں۔

جرمنی سے اردو دنیا، جدید ادب، اور سمندر نے اکیسویں صدی میں اردو کی خدمت کی ہے۔اردو دنیا کے مدیر ارشاد ہاشمی اور جاوید خاں ہیں۔ لکھنے والوں میں اردو کے بھی دستخط موجود ہیں۔حیدر قریشی کے ''جدید ادب'' میں بھی اردو دنیا کے بھی لکھنے والے موجود رہتے ہیں۔۲۰۰۶ء میں سجاد ظہیر نمبر دو سو صفحے میں، دسمبر ۲۰۰۷ء کا نواں شمارہ ۲۱۶ صفحے میں جون ۲۰۰۹ء کا بارہواں شمارہ ۲۸۰ صفحے میں، دسمبر ۲۰۰۹ء کا شمارہ ۳۵۲ صفحے میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ''میرا جی نمبر'' ۲۰۱۳ء میں بیحد ضخیم شائع ہوا تھا۔یہ رسالہ انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔جرمنی سے ہی جون ۲۰۰۵ء میں ''سمندر'' اسحاق ساجد (ایم آئی ساجد) نے نکالا تھا۔پوری اردو دنیا کے لکھنے والے اس باتصویر ۶۴ صفحے کے رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔دو سال کے بعد یہ بند ہو گیا۔

اوسلو سے جمشید مسرور ''بازگشت'' باتصویر نکالتے ہیں۔اس میں ادبی اور سیاسی مضامین ہوتے ہیں۔شاعری کا بھی حصہ ہوتا ہے۔جمشید مسرور کا یہ رسالہ اتنا مقبول ہے کہ اوسلو حکومت کی طرف سے ان کی اردو میں ادبی وصحافتی خدمات پر پرائڈ آف پرفارمینس ایوارڈ دیا گیا تھا جس میں تین لاکھ روپے نقد اور طلائی تمغہ شامل ہے۔

دوحہ (قطر) سے ''خیال وفن''، ''دستاویز'' اور ''فروغ ادب'' شائع ہوتے ہیں۔''خیال وفن'' کے مدیر محمد اکرم نعیم اور ممتاز راشد ہیں۔۲۰۰۵ء کا سولہواں شمارہ، اقبال نمبر تھا۔اس رسالہ کا کویت نمبر بھی بیحد اہمیت کا حامل شائع ہوا ہے۔۱۹۲ رصفحے کے اس نمبر میں معلومات کا خزانہ پوشیدہ ہے۔''دستاویز'' عزیز نبیل سال میں ایک بار نکالتے ہیں۔مدیر اعزازی ڈاکٹر عطا خورشید ہیں۔۲۰۱۲ء کا شمارہ ۲۸۷ رصفحے میں ہے۔ ورق گردانی کے بعد کتنے ہی اہم گوشے ذہن میں جھلملا اٹھتے ہیں۔فروغ اردو ادب، اردو زبان کے فروغ اور اردو قلم کاروں کی معاونت کے لئے قائم ادارہ عالمی فروغ اردو ادب کا مجلّہ ہے جو ایوارڈ کے موقع پر سال میں ایک بار ۱۵۰ رصفحے میں بیحد خوبصورت شائع ہوتا ہے جسے رکھنے اور پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ابھی تک ۱۹ شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں جن سے شخصیت شناسی میں مدد ملتی ہے۔

اسپین سے نذیر اے قمر اور اسد اعوان ''دریچہ'' نکالتے ہیں۔۲۰۰۸ء کا شمارہ گیارہ بارہ ''معرفت ہمدانی نمبر'' ہے۔شمارہ ۱۳ اور ۱۴ میں پانچ مضامین تین افسانے، ۴۸ رشاعروں کی غزلیں، ۱۶ رشاعروں کی نظمیں، ۳ رشاعروں کے قطعات، گوشۂ اسحٰق ساجد، جرمنی، اسپین اور پاکستان میں منعقدہ تقاریب کی سات تفصیلی رپورٹیں، احباب نامے

وغیرہ شامل ہیں۔ مارچ ۲۰۰۹ء کا شمارہ سالنامہ ہے۔ ۲۰۱۰ء میں بھی سالنامہ شائع ہوا تھا۔ شمارہ اکیس بائیس بھی بیحد معیاری ہے کہ اردو دنیا کے بیشتر اہم لکھنے والوں کا تعاون ملتا رہتا ہے۔

ڈنمارک (کوپن ہیگن) سے ترغیب بلند مزاحیہ رسالہ ''ظریف پنچ'' نکالتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے کئی شمارے کی ضخامت ایک سو سے زیادہ ہے جس کے مطالعہ سے مسرت کشید ہوتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ قیمت درج نہیں ہوتی ہے۔

برطانیہ سے پرواز، سفیر اردو، شہزاد، صدا، مخزن، جنگ، نوائے وقت، اردو تحریک، راوی وغیرہ اخبار و رسائل اکیسویں صدی کی اردو صحافت کو استحکام بخش رہے ہیں۔ ساحر شیوی ''پرواز'' ہر ماہ پابندی سے نکالتے ہیں۔ دو سال قبل تک مدیر کی حیثیت سے صابر ارشاد عثمانی اور معاون کے طور پر سیّد معراج جامی کا نام رہتا تھا لیکن عثمانی صاحب اب اس سے الگ ہو چکے ہیں۔ جامی صاحب کی دیکھ ریکھ جاری ہے۔ اس کے کئی خصوصی شمارے نکلے ہیں اور ہر شمارہ میں کسی شاعر و ادیب پر گوشہ رہتا ہے۔ اس کے مشمولات مطالعہ اور استفادہ کی دعوت دیتے ہیں۔ پندرہ سال سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہونے والا برطانیہ کا یہ واحد ادبی رسالہ ہے۔ ''سفیر اردو'' بھی ساحر شیوی پابندی سے نکالتے ہیں۔ اکیسویں صدی کا پہلا شمارہ یعنی جنوری ۲۰۰۰ء کا گیارہواں شمارہ ''غالب نمبر'' ۱۴۴ رصفحے میں تھا۔ اس کا ہر شمارہ اسی ضخامت میں کسی نہ کسی شخصیت پر ہوتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نمبر، قرۃ العین حیدر نمبر، صفیہ صدیقی نمبر، تسلیم الٰہی زلفی نمبر، تالیفات نمبر، فراز حامدی نمبر، مناظر عاشق ہرگانوی نمبر وغیرہ کی گونج سنی جاتی رہی ہے۔ اس کا ہر شمارہ دستاویزی ہوتا ہے۔ شہزاد حیدر طباطبائی جہازی سائز میں ۱۰۴ رصفحے میں نکالتے ہیں۔ اس میں مضامین کا حصہ اہم ہوتا ہے۔ گوشہ اور تعارف کا کالم بھی ہے۔ لیکن یہ پابندی سے نہیں نکلتا ہے۔ ''صدا'' اقبال مرزا نکالتے تھے۔ گذشتہ سال ان کا انتقال ہو گیا۔ اکیسویں صدی یعنی ۲۰۰۰ء میں اس کا گیارہواں شمارہ منظر عام پر آیا تھا۔ جہازی سائز کے ۸۲ رصفحات میں خالص ادبی اور بحث طلب مواد شامل ہوتا تھا، لیکن یہ وقفے وقفے سے شائع ہوتا تھا۔ ''راوی'' اور ''مخزن'' مقصود الٰہی شیخ نکالتے رہے ہیں۔ ''راوی'' برسہا برس نکلتا رہا۔ پھر انہوں نے اسے دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اکیسویں صدی میں ہی انہوں نے ضخیم رسالہ مخزن نکالا۔ نواں شمارہ آتے آتے ۲۰۱۰ء میں اس کی جاذبیت اور معیار میں اضافہ ہوا اور یہ ۳۴۴ صفحے میں شائع ہونے لگا۔ لیکن پھر اس کی ضخامت ۳۸۸ رصفحات ہو گئی۔ ۲۰۱۱ء میں مقصود الٰہی شیخ نے اعلان کر کے اس کا آخری شمارہ شائع کیا۔ ''اردو تحریک'' عبد الغفار عزمؔ نے نکالا تھا۔ اکیسویں صدی میں کئی شمارے چھپے۔ عزم صاحب عمر کے اس پڑاؤ میں ہیں کہ ان سے اکیلے یہ رسالہ نکالنا ممکن نہیں ہو سکا۔ ہندوستان کے کئی لوگوں سے انہوں نے رجوع کیا کہ کمپوزنگ اور طباعت کی ذمہ داری وہ لیں تو جاری رکھ سکیں۔ مجھ سے بھی انہوں نے گذارش کی تھی لیکن میں نے مصروفیت کی وجہ سے معذرت کر لی۔ ناگپور کے ایک صاحب رضامند ہوئے تھے۔ لیکن وہ غالباً وعدہ نہیں نبھا سکے۔

جہاں تک پاکستان کی بات ہے وہاں سے اتنے سارے اخبار و رسائل نکلتے ہیں کہ شمار آسان نہیں ہے۔ ویسے چند ادبی رسائل کی جانکاری ضروری ہے کہ اکیسویں صدی کی پیش رفت سے آگہی ہو سکے:

''آئندہ'' کراچی محمود واجد، اکیسویں صدی کا پہلا شمارہ ۳۲۰ صفحے میں بیسویں صدی نمبر، ''اخبار اردو''، اسلام آباد (سید سردار احمد پیرزادہ)، ''ادب لطیف'' لاہور (صدیقہ بیگم)، ''ادبیکا'' میرپور، آزاد کشمیر (سید ظفر کاظمی، محمد فاروق اسیر)، ''الحمرا'' لاہور (شاہد علی خاں)، ''اوراق'' لاہور (وزیر آغا)، ''بادبان'' کراچی (ناصر بغدادی) ''منشور'' (کراچی) ''تحقیقی زاویے''، اسلام آباد (رشید امجد)، ''تخلیق'' (اظہر جاوید)، ''تخلیقی ادب'' اسلام آباد، (رشید امجد)، ''ترسیل'' کراچی (شفیق احمد شفیق)، ''تسطیر'' میرپور (نصیر احمد ناصر)، ''چہارسو'' راولپنڈی (گلزار جاوید)، ''حریم ادب''، بورے والا (جاوید احمد جوئیہ) ''حکیم حاذق'' گجرات (حکیم وحید اختر ثنائی) ''خیال'' کراچی (حبیب احسن)، ''دریافت'' اسلام آباد (رشید امجد)، ''ڈائری'' گجرانوالہ (معظم بدرالاسلام، حافظ انجم سعید)، ''رنگ ادب'' کراچی (شاعر علی شاعر)، ''روشنائی'' کراچی (احمد زین الدین)، ''سخن زار'' کراچی (احسن سلیم، فراست رضوی)، ''سورج'' لاہور (تسلیم احمد تصور)، ''شاداب'' لاہور (کنول فیروز)، ''شاعری'' کراچی (سہیل غازی پوری)، صحب بلوچستان (اکمل شاکر)، ''صریر'' کراچی (فہیم اعظمی)، ''ضرب قلم'' کراچی (مصطفےٰ کمال، جمال اختر)، ''عالمی رنگ ادب'' کراچی (شاعر علی شاعر)، ''عفت'' راولپنڈی (سلمیٰ یاسمین نجمی)، ''علم و فن'' گجرانوالہ (عرفان احمد قریشی)، ''کاغذی پیرہن'' لاہور (شاہد شیدائی)، ''ماہیا روپ'' کراچی (سید معراج جامی)، ''مخزن'' لاہور (عنایت اللہ، ذکیہ مراد)، ''مسکراہٹ'' لاہور (طفیل اختر)، ''معیار''، اسلام آباد (معین الدین عقیل، نجیب عارف)، ''مونتاج''، لاہور (منصورہ احمد)، ''نعت رنگ'' کراچی (صبیح رحمانی)، ''نوادر'' لاہور (بیگم شاہین زیدی)، ''ہائیکو انٹرنیشنل''، کراچی (سہیل احمد صدیقی)، ''ہائیکو ورلڈ''، کراچی (ساحر شیوی، سید معراج جامی)، ''ہمدرد صحت''، کراچی (مسعود احمد برکاتی)، ''ہمدرد نونہال''، کراچی (مسعود احمد برکاتی)، ''ہم سخن'' کراچی (انیق احمد)، ''طلوع افکار'' (مسلم شمیم) وغیرہ الگ الگ مزاج کے رسائل ہیں لیکن یہ بھی اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ گذشتہ پندرہ سال میں بعض رسائل معرض التوا میں چلے گئے ہیں لیکن ان کے علاوہ بیشتر ایسے رسائل پابندی سے شائع ہو رہے ہیں اور اردو صحافت کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں۔

....

کوہسار، بھیکن پور-۳، بھاگلپور-۸۱۲۰۰۱ (بہار)

شمس جلیلی (ایڈووکیٹ)

اکیسویں صدی میں اردو صحافت بہار کے ادبی مراکز میں!

۲۰۱۲ء میں ''تمثیل نو'' کا ایک موضوعاتی شمارہ ''اکیسویں صدی میں اردو: نشیب وفراز'' کے زیرعنوان شائع ہوا تھا۔ اس موضوع پر مضمون نگار عموماً اوسط درجے کے تھے۔ اس کے باوجود بہت حد تک یہ اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ خود اردو کے حصے میں وقت کے ساتھ ساتھ کس قدر نشیب اور کس قدر فراز آیا تھا۔ غیروں کے علاوہ اردو والے اس نشیب وفراز کے کس قدر ذمہ دار ہیں۔

زبان وادب کے سلسلے میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ موجودہ صارفی معاشرہ کے اس دور میں کسی زبان کا روزی روٹی سے منسلک ہونا یا نہ ہونا اس کے نشیب وفراز کا ذمہ دار ہے۔ فی زمانہ اگر سچ پوچھئے تو دینیات میں بھی معاشیات کا دخل ہو چکا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یا ملازمت کے لئے انگلش اور ہندی لازمی ہے۔ باقی تیسری زبان کی حیثیت اختیاری ہے۔ اس کے لئے الگ استاد اور الگ وقت درکار ہیں۔ فی زمانہ تو اسکولوں میں کتابوں کا بوجھ بچوں کے جسم کے وزن سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ ایسے میں تو اختیاری کتابوں کا بوجھ تو اختیاری ہی ہو جاتا ہے۔ بچوں کا مقابلہ کلاس کے اندر دو ہی زبان کے پڑھنے والوں سے ہوتا ہے۔ عام مسلمان بچوں کی مالی حالت غیر مسلم بچوں کی مالی حالت سے بہتر نہیں ہوتی۔ ذاتی اور ذہنی صلاحیت کا بھی فرق ہو جاتا ہے۔

حقیقت حال تو کچھ ایسا ہے کہ بہت سے اردو کے پروفیسر اور لیکچروں کے بچے بھی اردو سے دور ہی ہوتے جارہے ہیں۔ اردو رسالے اور اخبارات کے مدیران اپنے اپنے اداریوں میں اردو قارئین کی کمی کا رونا برابر ہی روتے ہیں۔ یہ ایک اس قدر سنگین لمحۂ فکریہ ہے کہ جس کے لئے اردو کے تمام بہی خواہ ہمدرد پریشان اور فکرمند ہیں۔ اردو کی طرف سے اردو والوں کی توجہ کم ہو جانے کی وجہ سے بہت سے معیاری اخبار ورسالہ بک اسٹالوں سے روپوش ہو گئے اور ہوتے جارہے ہیں۔ تہذیبی اور مذہبی مقاصد کے لئے اردو کو کس طرح باقی اور پائندہ رکھا جائے اس کے لئے کون سی عیسیٰ نفسی کارگر ہوتی ہے یہ سوچنے کی ضرورت ہے۔ اردو رسم الخط اور ادب اطفال کی طرف ذمہ دار والدین کو توجہ کی ضرورت ہے۔ گراس روٹ میں کچھ کام کرنے کے لئے اردو اکیڈمیوں کو بھی سوچنا چاہئے۔ اگر گراس روٹ پر کام نہیں کیا گیا تو بیسویں صدی کے بعد اکیسویں صدی میں اردو کی صورت حال بہتر نہیں ہوسکتی۔ نصف اکیسویں صدی اور اس کے بعد تو پھر صورت یہ ہیں حالت میرس ہی کی نوبت آجا سکتی ہے۔ حضرت سعدیؒ نے تو اس قانون فطرت کی طرف آج سے سات آٹھ سو سال قبل ہی اشارہ کر دیا تھا:

اگر بر کوہساراں باراں نہ بارد — بروزے خشک گردد دجلہ رودے

تھوڑا سا تصرف کے ساتھ کہا جاسکتا ہے:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے اردو زباں والو — نہیں ہوگی زباں یہ بھی اگر زندہ زبانوں میں

اس تمہید کے بعد اکیسویں صدی میں اردو صحافت سے متعلق کچھ عرض ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ملک کا پہلا اخبار انگریزی میں ہفتہ روزہ ''بنگال گزٹ''

کی شکل میں ۱۸۰۷ء میں کلکتہ ہی سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد بنگلہ زبان میں ہفت روزہ ''رگ درشن'' ۱۸۲۰ء میں شائع ہوا۔ اردو کا پہلا ہفتہ وار ''جام جہاں نما'' ۸؍مئی ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ کچھ دنوں کیلئے اس کی زبان فارسی بھی ہوگئی تھی۔ یہ اخبار قدر اس کثیر الاشاعت تھا کہ اس کی کچھ کاپیاں آج بھی پورنیہ جیسے دور افتادہ علاقے کی بعض لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔ اس طرح ملک کے اندر اردو صحافت کی ابتدا آج سے ۱۹۳ سال پہلے ہوگئی تھی۔ انگریزوں کے زمانے میں بہت برسوں تک ملک کا دار السلطنت کلکتہ ہی میں تھا۔ بہار تو ۱۹۱۱ء میں بنگال سے علیحدہ ہوا تھا۔ اس طرح بہار کا بھی پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ہی کو کہا جا سکتا ہے۔

موجودہ بہار کی سرزمین میں پٹنہ کے محلہ خولجہ کلاں سٹی سے ۱۴؍اپریل ۱۹۵۶ء میں ''پٹنہ ہرکارہ'' کے نام سے ایک اخبار شائع ہوا، جو مہینے میں تین چار بار شائع ہوا کرتا تھا۔ بہار کی سرزمین سے اردو میں نکلنے والا یہ پہلا اخبار تھا۔ یہ اخبار ۱۴؍اپریل ۱۸۵۵ء سے یکم مارچ ۱۸۵۶ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس طرح بہار میں اردو صحافت کی عمر ۱۶۲ رہوتی ہے۔ اس کے بعد پٹنہ ہی سے ''اخبار بہار'' اور ''عظیم الاخبار'' بھی شائع ہوئے۔ مظفر پور سے ''اخبار الاخبار''، مونگیر سے ''نادر الاخبار''، شاہ آباد (آرہ) سے ''ضیاء الاخبار'' اور گیا، در بھنگہ سے ''مورچہ'' اور ''آہنگ'' اور کشن گنج سے بھی کچھ رسالے اور اخبار شائع ہونے لگے۔ بیسویں صدی آتے آتے بہار میں اخباروں اور رسالوں کا سیلاب سا آ گیا۔ ان تمام اخباروں اور رسالوں کے نام یہاں درج کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔

۱۹۴۲ء میں سید نظیر حیدر نے ''صدائے عام'' جاری کیا، جو بہار کا سب سے قدیم اور ۱۹۴۵ء میں غلام سرور نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں پندرہ روزہ ''نوجوان'' کا اجرا کیا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد روزنامہ ''ساتھی'' اور اس کے بعد کافی زور شور سے روزانہ ''سنگم'' کا اجرا کیا۔ ''سنگم'' اپنی ہنگامہ آرائی اور بیباکی کیلئے ہمیشہ مشہور رہا۔ اردو اخبارات میں سے ''سنگم'' ہی کے خلاف سب سے زیادہ مقدمات دائر ہوئے تھے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں سہیل عظیم آبادی کا ''تہذیب''، رضوان احمد کا ''عظیم آباد ایکسپریس''، کلام حیدری صاحب کا ماہنامہ ''مورچہ'' اور ''آہنگ'' اور گیا سے شائع ہونے والے رسالوں میں ''سہیل'' اور ''ندیم'' نے کافی شہرت حاصل کی۔ ایک اندازے کے مطابق بہار سے تقریباً دو سو اخبار اور رسالے اب تک شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے اپنی عمر طبعی کم کم پائی تھی۔ بعض اخبار یا رسالہ اپنے بانی کی وفات کے فوراً بعد بند ہوگیا اور کچھ جریدے تو سال دو سال سے بھی کم ہی دنوں تک جاری رہ سکے۔ اردو کے اکثر جریدوں کے اجراء اور اختتام کے متعلق جان کر یہ شعر یاد آتا ہے:

تمہاری بزم وفا سلامت بجھے چراغوں کا غم نہ کھاؤ　　چراغ کی زندگی یہی ہے جلا کریں گے بجھا کریں گے

کافی عرصہ پہلے پٹنہ سے ایک خالص ادبی رسالہ ''معاصر'' بہت دنوں تک شائع ہوتا رہا جس کی چھاپ اب بھی ادبی دنیا پر ملتی ہے۔ ڈاکٹر قاضی عبدالودود، ڈاکٹر اختر اورینوی، علامہ جمیل مظہری، ڈاکٹر صدر الدین فضا کے رشحات قلم اس رسالے میں دیکھے جاتے تھے۔

ابھی پٹنہ سے شائع ہونے والا سب سے پرانا روزنامہ ''قومی تنظیم'' ہے جو ۱۹۶۳ء سے جاری و ساری ہے۔ اس کے علاوہ ''راشٹریہ سہارا''، ''انقلاب''، ''فاروقی تنظیم''، ''پندار'' اور ''عوامی نیوز'' بھی پٹنہ سے شائع ہو رہے ہیں۔ ایک اچھا ادبی رسالہ ''مباحثہ'' پروفیسر وہاب اشرفی کی زندگی بھر نکلتا رہا۔ انہوں نے چند سال تک ماہنامہ ''صنم''

بھی شائع کیا تھا۔ ایک سہ ماہی مجلہ ''انتخاب'' پروفیسر علیم اللہ حالی کی زیرادارت نکل رہا ہے۔ بہار اردو اکیڈمی کا آرگن ''زبان وادب'' کافی پابندی سے ادبی خدمات کو انجام دے رہا ہے۔

دربھنگہ میں علم وادب کا چرچا زمانہ قدیم سے ہے۔ دور حاضر میں بھی یہاں کے ادباء اور شعراء نے ایک ادبی کہکشاں قائم کر رکھی ہے جس میں پروفیسر عبدالمنان طرزی کی حیثیت ایک پیر مغاں کی ہے۔ یہاں سے بین الاقوامی پیمانے پر اردو کے دو مجلے ''تمثیل نو'' اور ''جہانِ اردو'' کسی تعارف کے محتاج اس لئے بھی نہیں ہیں کہ ان کے ذریعے کافی ادیب وشاعر ادبی دنیا میں اپنا نام پیدا کر رہے ہیں۔ یہ دونوں رسالے ڈاکٹر امام اعظم اور ڈاکٹر مشتاق احمد کی تحت محنتوں کے ثمرہ ہیں۔ یہاں سے نکلنے والا ایک رسالہ ''دربھنگہ ٹائمز'' بھی اپنی زندگی کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے۔

پورنیہ کمشنری جواب سیمانچل بھی کہلاتی ہے۔ یہاں کی پہلی تصنیف ''بدیادھر'' ۱۷۴۸ء میں لکھی گئی تھی۔ اسکے مصنف شاہ کفایت اللہ ہیں۔ پورنیہ میں اخبار ورسائل کی تاریخ سو برس سے زیادہ کی ہے۔ ۱۹۰۶ء میں یہاں سے ''رشک مشر'' ماہنامہ پہلے پہل شائع ہوا تھا۔ پورنیہ میں اخبارات ورسائل کے مطالعہ کا سلسلہ اس قدر پرانا ہے کہ ہندوستان کا سب سے پہلا اردو اخبار ''جام جہاں نما'' جو ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا اس کی کچھ کاپیاں آج بھی یہاں کے بعض حضرات کی ذاتی لائبریری میں پائی جاتی ہیں۔ رسالہ ''مخزن''، ''زمیندار''، ''پیسہ''، ''عمر خیام'' وغیرہ لاہور سے چھپ کر یہاں آتے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں ماہنامہ ''طلبہ'' بارہ عیدگاہ سے ''آفتاب'' پورنیہ سے اور ہفتہ وار ''آئینہ'' کشن گنج سے شائع ہونے لگے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر راقم الحروف چچا جان محترم الحاج عبدالغفار شیشہ باری تھے۔ انکے بعد براہیم صدیقی بارہ عیدگاہ ایڈیٹر ہوئے۔ مولانا رکن الدین دانا کے بعد بہار کے پختہ کار جرنلسٹ اسماعیل ناصح نے اس کے معیار کو اس قدر بلند کر دیا کہ اس کی اشاعت بہار کے تقریباً ہر ضلع میں ہونے لگی تھی۔ بنگال اور آسام میں بھی اسکے خریدار تھے۔ ۱۹۴۶ء میں غیر منقسم ہندوستان میں جب ملک کے مشہور جرنلسٹ ایڈیٹر ''زمیندار'' لاہور مسلم لیگ کے ایک جلسے کی صدارت کرنے کشن گنج تشریف لائے تھے تو انہوں نے تحریری طور پر اس اخبار کی پرزور تعریف کی تھی۔

ہفتہ وار ''انسان'' کا اجراء ۱۹۴۸ء میں ہوا۔ جو کافی بعد تک جناب اکمل یزدانی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اس کا ایک شمارہ ''پورنیہ نمبر'' پورنیہ کی تاریخی، ادبی، سماجی، صحافتی اور سماجی زندگی کا مکمل آئینہ دار دستاویز ہے۔ پورنیہ سے نکلنے والا ہندوستان گیر شہرت کا مالک ماہنامہ ''صبح نو'' بھی تھا جس نے پورنیہ سے نکل کر قطب الدین لین پٹنہ میں اپنی زندگی کی دو دہائی پوری کی۔ وفا ملک پوری اس کے ایڈیٹر تھے۔ پورنیہ اور کشن گنج کے علاوہ ارریہ بھی ایک اچھا ادبی مرکز رہا ہے۔ اردو میں بین الاقوامی شہرت یافتہ ناول نگار بھونیشور ناتھ رینو کی جائے پیدائش ہے۔ ''تیسری قسم'' فلم میں ان ہی کی کہانی ہے۔ یہاں سے کئی رسالوں کا اجراء ہوا۔ ابھی رسالہ ''ابجد'' یہاں سے آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ ہندوستان کے کسی بھی معیاری رسالے کا ہم رکاب ہے، جناب رضی احمد تنہا اس کے بانی ہیں۔ اس کی مدیرہ میمونہ خاتون ہیں اور مدیر اعزازی محمد نسیم اختر ہیں۔ اس کے قطب نما حقانی القاسمی اور عبدالقادر شمس ہیں۔ رضی احمد تنہا کے رفقائے خاص رہے ہیں اور اس کا مستقبل تابناک ہے۔ خدا کرے کہ ہماری آئندہ نسل بھی اس جذبہ خلوص کی قدر کر سکے۔

☆☆☆

موبائل : 09570946539

ڈاکٹر سید احمد قادری

اکیسویں صدی میں اردو صحافت

صحافت اگر حق گوئی، بے باکی، بے خوفی، جرأت مندی اور حوصلہ مندی کا نام ہے تو اکیسویں صدی میں صحافت مشکل دور سے دو چار ہے۔ جب سے صحافت ریاضت اور عبادت سے دور ہو کر صارفیت اور تجارت کی نذر ہو گئی ہے۔ اس میں ہر طرح کی خامیاں نہ صرف یہ کہ در آئی ہیں، بلکہ اپنی شاندار روایت سے بہت دور کھڑی نظر آ رہی ہے۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں داخل ہوتے ہی صحافت نے عوام کے درمیان سے اپنا اعتماد اور اعتبار کھو دیا ہے۔ یوں تو ہر دور میں صحافت کو سیاست دانوں نے اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہوئے اس کی حرمت اور عظمت کا پامال کیا ہے۔ لیکن ایسے واقعات پہلے نسبتاً کم ہوا کرتے تھے۔ ادھر گزشتہ ڈیڑھ دو برسوں میں صحافت نے جس طرح عوام کے درمیان سے اپنا وقار اور بھروسہ کھویا ہے، وہ تشویشناک تو ہے ہی ہے، بلکہ ملک کی سیاہ تاریخ کا بن رہا ہے۔ صحافت کی عظمت، حرمت اور جرأت پر بھی گھن لگ رہا ہے۔ سوشل میڈیا پر جو لوگ متحرک ہیں، وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اس دور کو سیاہ صحافتی دور کہا جا رہا ہے۔ لیکن خوشی اس بات کی ضرور ہے کہ صحافت کی عظمت اور حرمت کو داغدار کرنے والے "پرنٹ میڈیا" کے مقابلے "الیکٹرانک میڈیا" زیادہ بدنام ہے۔ "پرنٹ میڈیا" نے تو کچھ بھرم بھی رکھا ہے۔

اس سیاق و سباق میں اگر ہم اپنے ملک کی موجودہ اردو صحافت پر ایک نگاہ ڈالیں تو مزید خوشی ہوتی ہے کہ چند اخبارات و رسائل کو چھوڑ کر بیشتر اردو اخبار و رسائل نے اپنے ملک و قوم کے مسائل کو فوقیت دی ہے اور خصوصیت کے ساتھ جہاں کہیں جانبدارانہ، عامرانہ، متعصبانہ، جاگیردارانہ اور غیر منصفانہ رویہ نظر آیا۔ اس کے خلاف سینہ سپر ہوتے ہوئے محاذ آرائی کی ہے۔ گرچہ ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہی رہی۔ پھر بھی اردو صحافت نے اپنے صحافتی فرائض اور ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کیا۔ ہم اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ موجودہ صارفیت کے اس دور میں اردو صحافت بھی عبادت اور ریاضت سے بھٹک کر تجارت کی دوڑ میں شامل ہو گئی ہے۔ جس کا منفی اثر یہ ہو رہا ہے کہ سرکاری اشتہارات کے لئے بیشتر اخبارات حکومت وقت کی ٹیونگ پر ڈانس کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسری منفی بات اردو صحافت کی یہ نظر آ رہی ہے کہ بڑے بڑے تاجرانہ ذہنیت کے غیر اردو داں صنعت کار اردو صحافت کی دنیا داخل ہو کر اردو صحافت کو منافع کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔

ایسے ناگفتہ بہ حالات میں جو لوگ بڑے حوصلہ اور عزم کے ساتھ اردو صحافت کی خدمات انجام دے رہے ہیں اور حق و انصاف کے لئے نبرد آزما ہیں۔ وہ قابل مبارکباد ہیں۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہندو پاک میں صحافت کی ابتدا جبر، ظلم اور استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے، حق گوئی، صداقت اور آزادئ تحریر کی جنگ کے ساتھ ہوئی، جس کا سہرا یقیناً جیمس آگسٹس ہکی James Augustus Hicky کے سر جاتا ہے، جس نے نہ صرف غیر منقسم بھارت میں صحافت کی باقاعدہ ابتدا کی، بلکہ ظلم و ستم، استحصال

اور بربریت کے خلاف بے باک، بے لاگ اور بے خوف صحافت کی نیوڈالی۔ 29 جنوری 1780ء کو اجرا کئے جانے والے چار صفحات پر مشتمل اور 12x8 انچ سائز پر ایک ہفتہ وار اخبار Hicky's Gazette or Calcutta General Adviser کے نام سے، جسے لوگ ''ہکی گزٹ'' کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ اس میں جیمس آگسٹس ہکی نے لکھا تھا:

''اخبار چھاپنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے اور نہ میری طبیعت کو اس کام سے لگاؤ ہی ہے، میری پرورش بھی اس طرح کی نہیں ہوئی ہے کہ میں محنت ومشقت کی غلامانہ زندگی کا عادی بن سکوں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود روح ودماغ کی آزادی خریدنے کیلئے میں اپنے جسم کو بخوشی غلام بنا رہا ہوں۔''

(ہندوستانی اخبارنویسی از :عتیق صدیقی ،صفحہ-۶۴)

اس ہکی گزٹ کی ایک فائل آج بھی برٹش میوزیم میں اور ایک فائل کلکتہ کی نیشنل لائبریری میں محفوظ ہے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ صحافت ترسیل وابلاغ کا اتنا موثر اور طاقتور ذریعہ ہے، اور واقعات حاضرہ کی معلومات بہم پہنچانے کا اتنا بہتر وسیلہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سماجی پیشوا، سیاسی رہنما اور مشاہیر ادب نے نہ صرف اس کی بھرپور طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کیا بلکہ اپنے افکار واظہار کی تشہیر کے لیے صحافت سے منسلک بھی رہے، تو اریخ شاہد ہے کہ صحافت نے کتنے ہی ملکوں کے تختے پلٹ دیے، بڑے بڑے انقلابات کو جنم دیا، اور ظالم حکمرانوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ عالمی پیمانہ پر ایسے کئی مقام آئے، جب صحافت کی بے پناہ طاقت، اس کی عوامی مقبولیت اور اس کی تنقید سے خوف زدہ ہو کر اس پر پابندیاں عاید کی گئیں۔ صحافت نے جیسے جیسے ترقی کی، ویسے ویسے اس کی مقبولیت، اہمیت اور افادیت بڑھتی گئی اور لوگوں کو متوجہ کرانے میں کامیاب ہوتی گئی اور ایک وقت ایسا آیا، جب لوگ صبح آنکھ کھلتے ہی اخبار تلاش کرتے۔ اس طرح صحافت انسانی زندگی کا ایک حصہ بن گئی۔ جس پر مشہور شاعر اکبرالہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں طنز کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت وضو کی اور مناجات سحر کی
مگر ہاں چائے پی کر حسب دستور تلاوت کرتے وہ پائنیر کی

اکبرالہ آبادی نے طنز کرنے کو تو کر دیا، لیکن صحافت کا جادو جب ان کے سر چڑھ کر بولنے لگا اور اس کی انقلابی طاقت کا انہیں اندازہ ہوا، تو پھر وہ یہ بھی کہنے پر مجبور ہوئے:

کھینچو نہ کمانوں کو ، نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحافت اتنی موثر اور طاقتور ہے کہ اس کے سامنے تیر، کمان، بندوق اور توپ بھی بے کار ہیں۔ مندرجہ بالا شعر کہتے وقت اکبرالہ آبادی کے ذہن میں یقیناً تاریخ کے جانے مانے جرنیل اور اپنے عہد کے عظیم ڈکٹیٹر، نیپولین بوناپاٹ کا وہ مشہور مقولہ ہوگا، جس میں اس نے صحافت کی طاقت کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے کہا تھا :

" I fear three newspapers more than a hundred thousand bayonets"
یعنی 'لاکھوں سنگینوں سے زیادہ میں تین اخبار سے خوف زدہ رہتا ہوں'۔

نپولین بوناپاٹ کا مندرجہ بالا خوف یقینی طور پر صحافت کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس نے ضرور اس بات کو محسوس کیا ہوگا کہ دشمن کی صفوں میں انتشار برپا کرنے میں توپ، تفنگ، لاؤلشکر، تیر، تلوار کے ساتھ ساتھ ہاتھیوں، گھوڑوں اور فوجیوں کی بے پناہ طاقت، صحافت (اخبار) کے سامنے کند ہے۔ جو کام صحافت سے لیا جاسکتا ہے، وہ توپ اور بندوقوں سے بھی نہیں لیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکر، دانشور، سربراہ، مصلح، سیاستداں اور رہنما اس کی اہمیت کے معترف اور قائل رہے ہیں۔ اس کی سیکڑوں مثالیں عالمی طور پر ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ صحافت اپنے اندر اتنی طاقت وسعت اور ہمہ گیری رکھتی ہے کہ جیسے جیسے سائنس اور ٹکنالوجی ترقی کے منازل طئے کر رہی ہے، ویسے ویسے صحافت بھی اپنے لیے راستہ ہموار کرتے ہوئے کامیابی کی طرف گامزن ہے۔ لیکن جب صحافت پر سیاست حاوی ہونے لگی اور دنیا کے بڑے بڑے صنعت کار، سیاست داں اور بعض ممالک کی حکومتیں، صحافت کی بے پناہ طاقت کا اپنے مفاد میں استعمال کرنے لگیں تب ایسے حالات سے متاثر ہوکر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 1991ء کی اپنی 26 ویں اجلاس میں منظور قرارداد کو نافذ کرتے ہوئے 1993ء سے ہر سال 3 مئی کو عالمی سطح پر یوم آزادئ صحافت کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ جس کے تحت صحافتی تحریروں، پر پابندی لگانے، انھیں سنسر کرنے، جرمانہ عائد کرنے نیز صحافیوں کو زدوکوب کئے جانے، ان پر جان لیوا حملہ کئے جانے، انھیں اغوا کئے جانے اور انھیں بے دردی سے قتل کئے جانے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے، غوروفکر کے بعد، ان کے سدّباب کی کوششوں کے ساتھ ساتھ ایسے حالات سے نپٹنے، حکمت عملی تیار کئے جانے اور حکومت وقت کو انتباہ کئے جانے پر زور دیا گیا ہے۔

اس کے لئے 3-1 مئی تک 2011ء میں امریکہ کے واشنگٹن شہر میں عالمی یوم آزادئ صحافت کا جلسہ بڑے پیانہ پر انعقاد کیا گیا تھا اور اس موقع پر اکیسویں صدی کے میڈیا اور اس کی بنیادی آزادی پر کئی ممالک کے مندوبین نے بحث ومباحثہ میں حصہ لیا تھا۔

یونیسکو نے ایسے مقامی اور عالمی سطح کے اداروں، شعبوں، این جی اوز وغیرہ کو صحافتی حفاظت، آزادئ صحافت اور ترقی صحافت کے لئے مثبت اقدام اور اس ضمن میں غیر معمولی خدمات کے لئے 1997ء سے چودہ آزاد صحافیوں کی جیوری سمیت یونیسکو کے اسٹیٹ ممبران کی سفارش پر کولمبیا کے ایک اخبار El Espectador کے مقتول صحافی Guillermo cano isaza جو کہ 17 دسمبر 1986ء کو کولمبیا کے ایک بہت بڑے دوا کے صنعت کار کے خلاف لکھنے کی پاداش میں ہلاک کر دیا گیا تھا کے نام پر ایک باوقار ایوارڈ کا فیصلہ کیا تھا، تاکہ نہ صرف جمہوریت کا استحکام اور اس کا افادی پہلو کا دائرہ وسیع ہو بلکہ مفاد عامہ کے لئے صحافت اور صحافتی خدمات پر معمور صحافیوں کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کیا جائے کہ کس طرح نامساعد حالات میں عوامی مفاد کے لئے رائے عامہ تیار کرتے ہیں۔

لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان تمام کوششوں کے باوجود دنیا کے بیشتر ممالک بشمول بھارت میں آزادئ صحافت پر پہرے بٹھائے جانے، صحافیوں پر پرتشدد حملے اور قتل کئے جانے کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔

امریکی فریڈم ہاؤس کی جانب سے جاری ایک جائزہ کے مطابق گزشتہ سال 70 ممالک صحافتی آزادی، 61 ممالک میں جزوی طور پر اور 64 ممالک میں آزادئ صحافت پر مکمل پابندی رہی۔ سوویت یونین، مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں صحافت کی آزادی سلب رہی، جبکہ اسرائیل، اٹلی اور ہانگ کانگ میں ایران، لیبیا، شمالی کوریا، میانمار، روانڈا اور ترکمانستان وغیرہ میں صحافت آزادی کیلئے کراہتی رہی۔ آزادئ صحافت کے ضمن میں ایک فرنچ این جی او کی رپورٹ کے مطابق 12-2011 میں 179 ممالک میں ہمارا ملک بھارت 131 ویں پائدان پر تھا۔

اس امر سے ہم انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ اظہار رائے کی آزادی اور انسانی حقوق کے الفاظ معاصر منظر نامے میں بے معنی اور بے وقعت بھی ہو رہے ہیں۔ اختلاف رائے جمہوریت کا حسن ہے، لیکن قلم اور کیمرے کو جس طرح جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور آزادئ صحافت اور اس کی آواز کو دبانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ وہ بہت ہی تشویشناک ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ میڈیا پر ہی یہ الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ میڈیا، حکومت پر مثبت تنقید کے بجائے الزام تراشیاں کر رہا ہے، جس کے باعث جمہوریت کمزور پڑ رہی ہے اور حکومت غلط راہوں پر جانے پر مجبور ہو رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت اور اس کے استحکام، سیکولرزم کے فروغ اور سماج کا رخ موڑنے میں صحافت نے جو رول ادا کیا ہے اور کر رہے ہیں، انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن الزام تراشی کے گرم بازار کا ذکر کرنے والے خود صحافت پر کس قدر اوچھی اور نازیبا الزامات لگا رہے ہیں، وہ اسے بھول جاتے ہیں۔

آج بھی جب کہ پوری دنیا صارفیت کے چنگل میں ہے پھر بھی صحافی اپنی پوری ذمہ داری، غیر جانب داری، بے باکی، بلند حوصلہ اور جرأت مندی کے ساتھ جمہوریت اور اس کے استحکام کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار و افکار کیلئے عمل پیرا ہیں۔ ایسے صحافیوں کی موجودگی سے صحافت کی جو اعلیٰ قدریں ہیں، وہ پامال نہیں ہوں گی اور ایسے کچھ صحافی جو وقتی منفعت کیلئے بھٹک جاتے ہیں، وہ بھی صحافت کو تجارت تصور کرنے کے بجائے مشن کے طور پر قبول کرتے ہوئے صحافت کو عبادت کا درجہ دیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ حالات کا رخ یہ اشارہ دے رہے ہیں کہ اکیسویں صدی میں پرنٹ اور الیکٹرانک صحافت بہت مؤثر، مثبت اور تاریخی رول ادا کرتے ہوئے شاندار تاریخ مرتب کرے گی۔ اس میں اردو صحافت بھی اپنے شاندار ماضی اور روایت کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے کامیابی اور کامرانی سے ہم کنار ہوگی۔ بشرطیکہ ہمارے ملک میں اردو زبان کے ساتھ سوتیلا پن کا سلوک نہ کیا جائے اور اس اہمیت اور ایثار کو یاد رکھا جائے۔

....

۷ر نیو کریم گنج، گیا (بہار) email: squadri806@gmail.com ; Mob: 09934839110

- کولکاتا کے خوش گلو شاعر محب شادانی کا انتقال ۱۰ر اپریل ۲۰۱۵ء کو چترنجن اسپتال میں ہوگیا۔ ۱۱ر اپریل کو بعد نماز ظہر ۳ر نمبر گوبرا قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ وہ مہینوں سے ڈائیلاسس پر تھے۔ ان کی عمر تقریباً ۷۰ر سال تھی۔ مرحوم کا قیام آچاریہ جگدیش چندر بوس روڈ میں مدر ٹریسا ہوم کے نزدیک تھا اور وہ مجردانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہایت ملنسار اور خلیق تھے۔ ان کی آواز کافی پاٹ دار تھی۔

حقانی القاسمی

ادبی صحافت کا عصری منظر نامہ

گو کہ اردو کے کچھ رسائل پرانی ڈگر پر چلنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں لیکن کچھ ایسے رسالے ضرور ہیں جو فکر و نظر کی نئی دنیا ئیں تلاش کرتے ہیں، حساس دلوں میں طوفان بپا کرتے ہیں اور احساس کی سطح پر ہمیں مرتعش بھی کرتے ہیں۔ بہت سارے معاصر ادبی رسائل ہیں جنھوں نے ادبی معاشرے کو متحرک اور فعال بنائے رکھا اور ادب کے جمود و حجر کو توڑا ہے۔

ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے اردو رسائل پر نگاہ مرکوز کی جائے تو نتائج نہایت اطمینان بخش نظر آتے ہیں اور اردو زبان کی زندگی کے وافر ثبوت اور شواہد بھی مل جاتے ہیں۔ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی ہی سے نکلنے والے اردو رسائل کی تعداد خاصی ہے اور ہر رسالہ اپنے مختلف مزاج و منہاج کے اعتبار سے معتبر اور معنی خیز متصور ہوتا ہے۔

صلاح الدین پرویز کی ادارت میں نکلنے والا آواں گارد مجلّہ 'استعارہ' ''نئی فکریات کا نقیب تھا۔ اس رسالے کا اپنا مزاج و معیار تھا۔ جہاں استعارہ نے نئے تحقیقی اذہان کی تشکیل اور تحرک میں نمایاں کردار ادا کیا ہے وہیں زبیر رضوی کے ''ذہن جدید'' نے ادبیات اور فنون لطیفہ کے ارتباط سے ایک ایسا خوب صورت کولاژ تیار کیا ہے کہ ادب کے سنجیدہ قاری کے لیے ذہن جدید ایک ضرورت بن گیا ہے۔ انیس امروہوی کا سہ ماہی ''قصے''، جہاں مثبت تخلیقی قدروں کا عکاس تھا، وہیں انجمن ترقی اردو ہند کا رسالہ ''اردو ادب'' (مدیر: ڈاکٹر اسلم پرویز) قدیم (متون) کی بازیافت، کلاسیکی تحریروں اور مضامین کی بازدید اور نئے مباحث کی شمولیت کی وجہ سے ممتاز ہے۔

مکتبہ جامعہ کا مجلّہ ''کتاب نما'' صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری اردو دنیا میں اس کے شیدائی موجود ہیں۔ جو کتاب نما کا نہایت بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ تقریباً ۴۴ سال سے تواتر کے ساتھ شائع ہونے والے کتاب نما کی ایک امتیازی شناخت، اس کا مہمان اداریہ ہوا کرتا تھا مگر اب نصابی نوٹس کی شمولیت کی وجہ سے اس کی پرانی امیج مجروح ہوگئی ہے۔

دلی اردو اکیڈمی کا آرگن ''ایوان اردو'' ہر ماہ پابندی وقت کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ سرود رفتہ اور نوائے امروز جیسے دو سلسلے نہایت مفید اور معلومات آگیں ہیں۔ اس رسالے سے زبیر رضوی اور مخمور سعیدی جیسی بڑی ادبی شخصیتیں وابستہ رہی ہیں۔ اس کے بعض خصوصی شمارے مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، جواہر لال نہرو نمبر، جدید ہندی ادب نمبر، تھیٹر نمبر بھی دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔

حکومت ہند کی پبلی کیشن ڈویژن کے رسالہ ''آج کل'' کی ایک زریں تاریخ رہی ہے۔ 25 نومبر 1942 سے نکلنے والا رسالہ آجکل اپنے بعض امتیازات کی وجہ سے خصوصی حیثیت کا حامل ہے۔ پہلے یہ پشتو کے ٹن پرون کا اردو عکس تھا۔ اس کی ادارت سے جوش ملیح آبادی جیسی ہستی بھی وابستہ رہی ہے اور عرش ملسیانی، مہدی عباس حسینی، شہباز حسین، راج نرائن راز، محبوب الرحمٰن فاروقی جیسے اہم ادباء بھی۔ ادب کے ماسوا سائنس، صحت، سیاحت

،کھیل کود اور دیگر علوم وفنون، تراجم اور دیگر سلسلے بھی اس کا اختصاص ہیں۔ آجکل نے بہت سے خصوصی شمارے بھی شائع کیے۔ ڈرامہ، رقص، مصوری، خواتین، سیاحت، صحافت، جنگلی جانور، غالب، کشمیر، تمل ناڈ جیسے خصوصی شمارے قابل ذکر ہیں۔ گویا سماج، سیاست اور ادب کے تمام گوشوں پر یہ رسالہ محیط تھا۔ اس رسالے کو جو مقبولیت ملی، وہ دوسرے کسی سرکاری رسالے کو ہنوز نہیں مل سکی ہے۔ سرکاری ادبی رسائل میں اسے نمایاں حیثیت حاصل ہے کہ اس رسالہ کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے اور باشعور، بیدار مدیران کے نئے زاویوں کی تلاش کے عمل اور ہندوستانی ثقافت، سماج اور عالمی رجحانات کی بوقلموں تصویروں کی وجہ سے اسے خاطر خواہ پذیرائی بھی حاصل ہوئی ہے

ممتاز مزاح نگار نصرت ظہیر کی ادارت میں 'ادب ساز' ایک نئی لہر کے طور پر سامنے آیا ہے اس کی جولانی و طغیانی کا احساس اہل دانش وبینش کو پہلے ہی شمارے سے ہو گیا تھا۔ رسالے کی ضخامت، مضامین کے تنوع، مباحث کے تلون سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ اس کا ارتکاز صرف ادبیات پر نہیں ہے بلکہ فنون لطیفہ کی بھی شمولیت ہے۔ یہ ایک طرح سے ثقافتی نگارخانہ ہے جس میں ادب اور آرٹ کے متعلقات ولوازمات موجود ہیں۔ اس کا مقصد صرف ادبی شہ پاروں کا اجتماع نہیں بلکہ تمام شعبہ حیات سے قاری کو روشناس کرانا ہے۔۔ سماج، سیاست اور ثقافت کے جملہ امور اس کے دائرے میں شامل ہیں۔ مقتدر فنکاروں پر خصوصی گوشوں کے علاوہ ساحر لدھیانوی پر اس کا ضخیم شمارہ دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ساحر شناسی کو نئی سمت ملی ہے۔ 'نئی کتاب' میں شاہد علی خان نے کتاب نما کے ادارتی تجربوں کا بھرپور استعمال کیا اور مختصر عرصے میں اسے غیر معمولی شہرت بھی نصیب ہوئی لیکن جامعات کے نصابی نوعیت کی تحریروں کی کثرت کی وجہ سے یہ رسالہ اپنا مخصوص مزاج ومعیار قائم کرنے میں ناکام رہا۔

نند کشور وکرم کا 'عالمی اردو ادب' ایک حوالہ جاتی مجلہ ہے اس میں برصغیر اور دیگر ممالک کے ادبی رسائل میں شائع شدہ اہم تحریروں کا انتخاب شائع کیا جاتا ہے۔ عالمی اردو ادب کے بعض خصوصی شمارے بہت مقبول ہوئے ،ان میں احمد ندیم قاسمی، گوپی چند نارنگ، دیوندر اسر، کشمیری لال ذاکر، محمد حسن نمبر قابل ذکر ہیں ماہنامہ بزم سہارا نئی دہلی (مدیر: عزیز برنی) معاصر ادبی رسائل سے اس طور پر منفرد ہے کہ یہ واحد مصور مجلہ ہے جس کی پیش کش سب سے الگ ہے اور اس میں بعض ایسے سلسلے ہیں جن سے دوسرے رسالے محروم ہیں شہر سخن کے ذریعہ جہاں اس نے ہندوستان کے شہروں کی تاریخی ثقافتی وراثت اور تخلیقی حسیت سے قارئین کو متعارف کرایا اور شہروں کو نئی شناخت عطا کی وہیں جہان دانش میں ہندوستان کے اہم کتب خانوں کے احوال سے روشناس کرایا۔ گہوارہ دانش کے ذریعہ ہندوستانی جامعات کے منظرنامہ کو پیش کیا اور مباحثہ کے ذریعہ نئے ادبی مباحث اور موضوعات پر قارئین کی آراء سے ادب کے جمود کو توڑا باده کہن اور خراج عقیدت کے سلسلوں سے کلاسیکی روایات سے قاری کا رشتہ جوڑا۔ یہ اپنے منفرد طور و طرز کی وجہ سے ایک ایسا رسالہ بن گیا ہے جسے انگریزی اور دیگر زبانوں کے معیاری مجلوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ دلی کے دیگر رسائل اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے بساط بھر کوششیں کر رہے ہیں۔

ریاست مہاراشٹر جہاں مراٹھی بولنے والوں کی کثیر آبادی ہے، وہاں سے بھی اردو کے وقیع معتبر، معیاری ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ افتخار امام صدیقی کی ادارت میں مسلسل ومتواتر نکلنے والا رسالہ ''شاعر'' ممبئی 80

پورے کر چکا ہے۔ یہ عالمی سطح پر پڑھا جاتا ہے اور اس میں نہایت فکر انگیز مضامین ہوتے ہیں۔ اس کے بعض خصوصی شمارے یقیناً دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاعر کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اردو کی نئی بستیوں سے اس نے اپنا رشتہ استوار کیا ہے۔ اور نئے نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہ ایک طرح سے بہت ہی اعلیٰ ادبی اطلاعاتی رسالہ ہے۔ اس میں شامل ہونے والی تخلیقات اعلیٰ بھی ہوتی ہیں اور کچھ کم تر درجے کی بھی مگر ان کی شمولیت کا جواز یہ ہے کہ عام قاری تک یہ رسالہ پہنچے اور اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہو۔

عتیق احمد عتیق کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ''توازن'' مالیگاؤں، کسی زمانے میں اس طمطراق کے ساتھ نکلتا تھا کہ لوگ بے چینی کے ساتھ رسالے کا انتظار کرتے تھے۔ اس رسالہ میں انتہائی فکر انگیز ادبی مباحث شامل ہوتے تھے۔ وہ مضامین بھی توازن کی دین ہیں جن کی وجہ سے ادبی تنقید اور افکار کو نئی جہتیں اور نئی طرفیں ملی ہیں۔ اس کے خصوصی شماروں میں فضا ابن فیضی نمبر قابل ذکر ہے۔

ممبئی سے نکلنے والا رسالہ ''اردو چینل'' ادبی اور عصری عالمی سیاست کا حسین امتزاج ہے۔ یہ ادب اور سیاست کو ایک دوسرے کے آئینے میں دیکھنے اور دکھانے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ عصری عالمی سیاسی حالات پر تخلیق کاروں کے احساسات اور خیالات کو پیش کرنا بذات خود بہت اچھی بات ہے۔ عبید اعظم اعظمی اور قمر صدیقی بہت سے فکر انگیز ادبی اور سیاسی مباحث کو اپنے رسالے میں جگہ دیتے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کے ذہنی دریچے کھلتے ہیں جنھیں سیاست سے کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی نمبر کے علاوہ اردو چینل کا انٹرویو نمبر خاصا وقیع تھا اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی بھی خوب ہوئی۔

فکر انگیز مباحث کی شمولیت کی وجہ سے ظہیر انصاری کے 'تحریر نو' نے بہت جلد ادبی حلقہ میں اپنی الگ پہچان بنالی ہے ظہیر انصاری ہر شمارے میں کچھ نئے تجربے کرتے رہتے ہیں ان کا تازہ تجربہ 'افکار مدیران ہند' کی صورت میں سامنے آیا ہے جو اس لحاظ سے نہایت مفید ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مدیران کے افکار سے شناسائی ہوجاتی ہے۔ پہلی بار کسی مدیر نے اس نوع کا تجربہ کیا ہے۔۔

قلم کار اور قاری کے درمیان پل کا کام کرنے والے رسالہ ''نیا ورق'' کے مدیر ساجد رشید اہم افسانہ نگار اور نڈر صحافی تھے۔ ان کی صحافتی سوچ کی جھلکیاں ان کے ادبی رسالے میں بھی نظر آتی ہیں۔ حساس عصری موضوعات پر اس رسالے کے مباحث فکر انگیز اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ مراٹھی ادبیات کے اردو تراجم کی اشاعت نے بھی نیا و.ق کے دائرۂ قراءت کو وسعت عطا کی ہے۔

کوکن اردو رائٹرز گلڈ کا ادبی مجلہ سہ ماہی ''ترسیل'' ممبئی شائع ہوتا ہے۔ اردو مراٹھی کے تہذیبی لسانی رشتوں کی تلاش نے ترسیل کو اردو رسائل میں امتیازی شناخت عطا کی ہے۔ مراٹھی افسانوں کے تراجم کی وجہ سے بھی ترسیل کی الگ اہمیت ہے۔ اردو مراٹھی جیسی زبانوں کے ترابط اور تعامل کی ترسیلی کوشش کا اثر اب صاف صاف نظر آنے لگا ہے۔ اردو میں مراٹھی لوک گیتوں کی اشاعت بھی ''ترسیل'' کا ہی کارنامہ ہے جس سے لسانیات کے ماہرین کو اردو اور مراٹھی کے لسانی اور تہذیبی ارتباط سے آگہی ہوئی۔ ترسیل نے علاقائی ادب، ثقافت اور مراٹھی لفظیات، علائم،

رموز و تلمیحات سے بھی اردو حلقہ کو متعارف کرایا۔ یہ ثقافتی لسانی تعصبات اور فکری نظری تحفظات سے پاک صاف، منافقت کا مخالف مجلّہ ہے۔ ترسیل کی ترتیب بھی انوکھی ہے۔ یادِ رفتگاں، یاران میکدہ، خصوصی مطالعہ، غزلیات بازخوانی، جمالِ ہمنشیں، نظمیں، غزل دستہ، افسانہ، نقد و نظر۔ ترسیل کی کوشش ہوتی ہے کہ ۔۔ ادب اور ثقافت کے تمام رنگوں کی شمولیت ہو اور مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے مابین اشتراک کی صورت نکلے۔

نذیر فتح پوری کی ادارت میں شائع ہونے والے ''اسباق'' پونہ کا شمار بھی اردو کے ان رسائل میں ہوتا ہے جو فکر انگیز مضامین اور مباحث کی وجہ سے اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ تیس سال سے شائع ہونے والے اسباق نے ادب کے کئی نئے گوشوں پر جو روشنی ڈالی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔ اظہر جاوید، مومن راہی، مرزا رفیق شاکر، قاضی حسن رضا، دیپک بدکی، محبوب راہی، خلیل تنویر، مظفر صدیقی، شاہد پٹھان، غلام مرتضیٰ راہی، ضیا خان، سید جعفر امیر، منصور اعجاز اور دیگر تخلیق کاروں پر خصوصی شماروں اور گوشوں کے علاوہ اسباق کا ایک بڑا کارنامہ 'ماں نمبر' کی اشاعت ہے۔ اپریل۔ دسمبر 2009 کے اس خصوصی شمارے کی خاص بات یہ ہے کہ اردو میں ابھی تک ماں سے متعلق اتنا مربوط، متنوع اور معلوماتی رسالہ شائع نہیں ہوا تھا۔ مختلف موضوعاتی زاویوں کی وجہ سے اس شمارے کی معنویت بڑھ گئی ہے۔

مہاراشٹر کے شہر بھیونڈی ممبئی سے ''تکمیل'' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ شائع ہوتا ہے جس کے مدیران اصغر حسین قریشی اور مظہر سلیم نہایت فعال، متحرک اور متوازن فکر و نظر کے حامل ہیں۔ یہ رسالہ نئی ادبی ذہانتوں کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیتا اور ہمیشہ ادبیات کے نورتنوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ ''تکمیل'' کے بعض خصوصی شمارے قابل قدر ہیں۔ بالخصوص فکشن نمبر، پریم چند اور منٹو نمبر، باقر مہدی، سریندر پرکاش، محمود ایوبی، نشتر خانقاہی، ابراہیم اشک اور جاوید ندیم پر خصوصی اشاعتوں اور مہا شویتا دیوی، کملیشور پر گوشوں نے 'تکمیل' کو عروج و اعتبار عطا کیا ہے۔

سرزمین ولی و سراج سے وجد میموریل ٹرسٹ اورنگ آباد کا سہ ماہی ''دل رس'' دل رس بانو بیگم کی طرح ہی حسین و جمیل ہے۔ اورنگزیب عالم گیر کی بیگم اور شاہنواز خان صفوی کی دختر نیک اختر دلرس بانو بیگم تاریخ میں زندہ رہنے والی خاتون ہیں۔ اورنگ آباد میں ان کا مقبرہ ''بی بی کا مقبرہ'' کے نام سے مرجع خاص و عام ہے۔ سہ ماہی ''دلرس'' کے نین نقش نہایت خوبصورت ہیں اور ترتیب و انتخاب میں خوش سلیقگی اور نفاست بھی نمایاں ہے۔ تاریخ، ثقافت اور ادب کے حسین امتزاج کا نمونہ ہے ''دل رس'' کے مدیر اعلیٰ ممتاز ناعر قاضی سلیم مرحوم تھے اور مدیر کارگزار معروف افسانہ نگار نورالحسنین ہیں۔ ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کی حسین ادبی روایت اور ان کے جمال افکار و اظہار کا عکس ''دل رس'' میں نظر آتا ہے۔ اورنگ آباد مہاراشٹر کی تخلیقی اور تہذیبی روح سے روشناس کرانے والے دلرس نے اپنی متنوع تخلیقات کے باعث ادبی حلقہ میں بہت جلد اپنی شناخت بنالی ہے اور سرزمین ولی اورنگ آباد کو ایک نیا تحقیقی رنگ بھی عطا کیا ہے۔

محمد امین الدین کی ادارت میں 24 سال سے شائع ہونے والے ''قرطاس'' ناگپور میں زندہ ادیبوں پر لکھے

گئے تجزیاتی مضامین بھی شامل ہوتے ہیں۔اس رسالے میں ادب کے جملہ اصناف کی نمائندگی کی کوشش نمایاں ہے۔
اس رسالہ میں ادب کے جملہ اصناف کی نمائندگی کی کوشش نمایاں ہے۔''قرطاس'' نے ''نعت نبی نمبر'' کے ذریعے علمی، مذہبی اور ادبی حلقے میں اپنی معتبر شناخت قائم کرلی ہے اور اسے ہند سے باہر کے تخلیق کاروں کا تعاون بھی حاصل ہے۔ یہ کسی نظریے سے وابستہ رسالہ نہیں ہے اور نہ کوئی خاص گروپ ہی اس رسالے کے مزاج کی تشکیل میں شامل ہے۔ محمد امین الدین کے انتقال کے بعد اب ان کے صاحب زادے اسے نکال رہے ہیں۔منفرد لفظی نظام کے شاعر اور کاغذ پہ صحرا اور منجمد افلاک کے سائے تلے کے خالق سہیل اختر پر اس کی خصوصی پیش کش کی ادبی حلقوں میں خاصی گونج رہی مہاراشٹر کے 'ادبی کارواں' ناگپور (مدیر: فرید تنویر)۔اور فنون اورنگ آباد (مدیر: عبدالنعیم عظمی، یاسمین ترنم نعیم) بھی زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ان دونوں رسالوں کی اٹھان اچھی ہے۔

ریاست بہار اردو زبان وادب کے فروغ کے معاملے میں دوسری ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ متحرک اور بیدار ہے۔

''مباحثہ'' پٹنہ کے مدیر پروفیسر وہاب اشرفی کا تعلق مابعد جدید رجحان سے ہے مگر رسالہ نظریاتی اسیری سے آزاد ہے اور رسالے کے محتویات اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ ''مباحثہ'' میں کھلی ڈلی آزاد فضا ہے اور ہر تخلیق کار کیلئے مباحثہ کے در وا ہیں۔مباحثہ کے مشمولات فکر انگیز، معتبر، معنی خیز اور ادبی مباحث سے بھرپور ہوتے ہیں۔فکر و نظر کو نئی روشنی اور ادب کو نئے موسموں سے روشناس کرانے والا مباحثہ اپنے ممیزات کی وجہ سے ادبی رسائل میں ممتاز ہے۔

ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں نکلنے والا 'تمثیل نو' دربھنگہ، تکثیری اور متنوع مجلہ ہے جس میں سماجی، تاریخی، ثقافتی، مذہبی ڈسکورس کے علاوہ علاقائی ادبیات کی بھی شمولیت ہوتی ہے۔ یہ کلیت پسندی اور نظری جبریت سے آزاد رسالہ ہے اور مدیر کے تدویری تفاعل کی وجہ سے مجلہ میں آزاد تخلیقی فضا بھی بحال ہے۔تمثیل نو کے کچھ خصوصی شمارے ادبی تاریخ میں زندہ رہیں گے، ان میں 'اردو کا ہم عصر ادب: 1985 کے بعد'' مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، ہندوستانی فلمیں اور اردو، سات سمندر پار کا ہم عصر اردو ادب، مثلاً: اردو زبان اور تہذیب وثقافت کا ایک قدیم مرکز، اردو ادب کے رجحان ساز فاروقی، نارنگ اور مظہر امام، تاریخ ادبیات عالم، کیا ترقی پسندی زوال پذیر ہو چکی ہے، پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار، سہرے کی روایت اور ادبی معنویت اہم ہیں۔محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت بہار کی سرپرستی میں شائع ہونے والا رسالہ ''بہار' پٹنہ جو مشتاق احمد نوری جیسے افسانہ نگار کی ادارت میں اپنے نئے نقش ونگار کی بدولت جاذب نظر بن گیا تھا یہ اب قدرے کمزور ہو گیا ہے پھر بھی۔''بہار'' کے ذریعے ریاست بہار کے تاریخی ثقافتی ادبی تناظرات سے آگہی ہوتی ہے اور سرزمین بہار کی تخلیقی زرخیزی کا پتہ چلتا ہے۔پروفیسر جابر حسین کے ''اردونامہ'' پٹنہ سے اردو ہندی ادبیات کے متوازی فکری دھاروں سے آشنائی ہوتی تھی اور زبان، سماج، سیاست کے سروکاروں سے ذہن ودل کے دریچے کھلتے تھے۔ اردو نامہ کی وجہ سے وہ کھڑکی کھل گئی تھی جو برسوں سے بند تھی اور جس کی وجہ سے فضا کافی گھٹن زدہ تھی۔''اردونامہ'' نے زنگ آلودہ منجمد ذہن کی تطہیر اور تزکیے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا مگر حیف صد حیف 'اردونامہ' بھی داغ مفارقت دے گیا اور اس

طرح ایک مثبت اور توانا اردو آواز سے اہل اردو محروم ہو گئے۔

بھاگلپور سے مناظر عاشق ہرگانوی کی ادارت میں ''کوہسار'' شائع ہوتا ہے۔ کوہسار وہ رسالہ ہے جس نے کئی نئی صنفوں کی شناخت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس نے مدیر غزل گو نمبر شائع کیا اور مدیران کی تخلیقی جولانیوں اور عنائیوں سے ادبی دنیا کو روشناس کیا۔ کوہسار اپنی بعض انوکھی اشاعتوں کے لیے بھی شہرت رکھتا ہے۔ ''عکس'' ارریا اس سرزمین کے فنکاروں کے تخلیقی تفاعلات اور تحرکات کا عکاس تھا جس سرزمین میں مرزا اسد اللہ خان غالب کے جد امجد مرزا قوقان بیگ کی ولادت سے بھی دو سال قبل ایک اہم کتاب ودیادھر لکھی گئی تھی جس کے مصنف فقیر منش شاہ کفایت اللہ تھے۔ ''عکس'' اسی سرزمین ارریا کے ادبی وجود کا شناخت نامہ ہے۔ اس رسالے میں مرکزی اور دبستانی جبریت کے خلاف ایک طرح کا تخلیقی ردعمل بھی تھا اور مقامی فنکاروں کی تخلیقی توانائیوں اور وسعتوں کا صحت منداشاریہ بھی۔ تخلیق کاروں کے مقابل ''عکس'' ایک ایسا آئینہ تھا جس میں تخلیق کے فطری اور مصنوعی چہرے کے درمیان آسانی سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ فطری سادگی اور حسن سے معمور تخلیقی تموجات کا عکس تھا یہ رسالہ، جس کے مدیران میں احسان قاسمی اور رفیع حیدر انجم جیسے اہم تخلیق کار شامل تھے مگر پہلی ہی اشاعت کے بعد اس نے دم توڑ دیا۔ عکس کے بعد ارریا سے ہی 'ابجد' کا آغاز ہوا۔ گلوبلائزیشن کے عہد میں یہ گلوکلائزیشن کے صحت منداور مثبت نعرہ کے ساتھ یہ منظر عام پر آیا۔ گلوبلائزیشن کے فیوض و برکات سے محروم تخلیقی قافلہ نے گلوبل ادبی معاشرہ کے سامنے ابجد کے وسیلے سے کئی اہم سوالات رکھے کہ سماج اور سیاست کی طرح ادب میں حاشیائی کردار ہیں، حاشیائی بستیوں سے تعلق رکھنے والے فن کاروں کو تخلیقی تاب و توانائی کے باوجود اہمیت کیوں نہیں دی جاتی۔ وہ معاصر تنقیدی متن کا حصہ کیوں نہیں ہیں یا مرکز مرکوز ادبی حوالوں سے خارج کیوں رکھے جاتے ہیں۔ ابجد نے ان ہی سوالات کے تناظر میں اپنا ادبی لائحہ عمل طے کیا اور ایسے حاشیائی تخلیق کاروں کی تعیین قدر کی کوشش کی۔ اس نے اپنے چھ شماروں میں ہی اپنے امتیازات واضح کر دیے ہیں۔ رسالے کے بانی مدیر رضی احمد تنہا نے مختصر عرصے میں ابجد کو واضح شناخت عطا کی ہے

جہانِ اردو در بھنگہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس رسالے نے بھی اردو ادب کے کچھ اہم گوشوں کی تلاش میں اہم رول ادا کیا ہے۔ علامہ اقبال پر 432 صفحات پر محیط شمارہ سے اسے مقبولیت کی معراج نصیب ہوئی، پریم چند نمبر، بہار کا عصری ادب نمبر نے جہان اردو کو نئی شناخت عطا کی۔ سہ ماہی جہان اردو کے مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد نے عصری اردو ادب کے منظر نامہ سے اہل اردو کو روشناس کرانے کی اچھی کوشش کی ہے۔

اتر پردیش کی ریاست گوکہ اردو کے معاملے میں کبھی نہایت زرخیز تھی مگر حالیہ دنوں میں یہاں اردو زبان کی زبونی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اردو کا گراف اس ریاست میں حالیہ برسوں میں انحطاط پذیر رہا ہے۔

''شب خون'' الہ آباد کی مستحکم شناخت اور شہرت مسلم ہے۔ اس رسالے نے نہ صرف نئے ادبی رویے اور رجحانات سے نئی تخلیقی ذہانتوں کو متحرک کیا بلکہ ایک ایسی پیڑھی تیار کی جس نے آگے چل کر بے پناہ شہرتیں حاصل کیں اور اپنے مضبوط تخلیقی وجود کا احساس بھی دلایا۔ نئے ادیبوں کی ذہنی فکری تشکیل میں شب خون کا کردار اہم ہے۔

نئے ادبی اقدار اور نظام افکار کی ترویج میں بھی شب خون کی ایک ذہن ساز سمت نما رسالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1966 میں شب خون نے پہلی سانس لی تھی اور ۲۰۰۵ء میں اس نے آخری سانسیں لی مگر ادب کے وجود میں زندگی کی ایسی لہر دوڑادی کہ اس کی رگوں میں تازہ لہو کی گردش مدام جاری و ساری رہے گی۔ شب خون کے مدیر ممتاز نقاد، ناول نگار شمس الرحمٰن فاروقی ہیں۔ جو جدیدیت کے رائد کی حیثیت سے مشہور ہیں اور جن کی علمیت کا اعتراف پوری ادبی دنیا کو ہے۔ شب خون کا ایک ایک جامع انتخاب بھی شائع کیا گیا ہے جس میں بیشتر اہم تحریریں شامل کی گئی ہیں۔

نصف صدی سے زائد عرصے پہ محیط حکومت اتر پردیش کا رسالہ ''نیا دور'' لکھنؤ اپنے خصوصی شماروں کی وجہ سے خاص طور پر جانا جاتا ہے۔ اس رسالہ سے بہت سے فعال اور متحرک مدیران وابستہ رہے ہیں اور مدیران کی ذکاوت اور ذہانت نے اس رسالہ کو ناقت عطا کی ہے اور نیا تناظر دیا ہے۔ گوکہ نیا دور کے بیشتر نمبر شخصیات (محمد علی جوہر، علی جواد زیدی، رشید حسن خاں، عرفان صدیقی وغیرہم) پر مشتمل رہے ہیں مگر بعض خصوصی شمارے مثلاً جمہوریت، آزادی، افسانہ، قومی یک جہتی، اودھ، انقلاب 1857 پر بھی شائع ہوئے ہیں۔ نیا دور کے یہ خصوصی شمارے دستاویزی اہمیت کے حامل ہیں اور محققین اور ناقدین کے لیے ریفرنس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ملک زادہ منظور احمد کی ادارت میں اردو زبان و ادب کے تہذیبی و فکری مباحث پر محیط رسالہ ''امکان'' لکھنؤ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ملک زادہ منظور احمد اردو زبان کے فروغ کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ ملک زادہ منظور کی کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی نثر کا لطف لینا ہو تو یہ رسالہ ضرور پڑھئے۔ ان کی زبان سے گل افشانی گفتار تو بہتوں نے سنی ہو گی مگران کے صریر خامہ سے اب جو شگفتن گلہائے ناز کا سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

لکھنؤ سے نکلنے والا ''لاریب'' رشید قریشی کے ادبی جنون کا غماز ہے۔ نامساعد حالات کے باوجود لاریب کا چراغ روشن ہے۔ اس رسالے سے لکھنؤ کی ادبی فعالیت اور اہل لکھنؤ کی ادب پروری کا پتہ چلتا ہے۔ لاریب نے شعرائے گجرات کے حوالے سے عمدہ شمارہ شائع کیا ہے۔

اتر پردیش کے ضلع بھدوہی سے ''سبق اردو'' کے نام سے شائع ہونے والے رسالے کے مدیر دانش الہ آبادی ہیں جو اردو کی خدمت کا نہایت نیک جذبہ رکھتے ہیں اور اسی لیے تمام تر خسارے کے باوجود ''سبق اردو'' کے ذریعے اردو کی شمع روشن کرنے میں لگے ہیں۔ نصابی اور تدریسی نوعیت کی تحریروں سے اس نے اپنا الگ مزاج قائم کرلیا ہے۔ اس کے کئی کالم پرانے رسائل کے افادی اور مقصدیت آگیں کالموں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ ''سبق اردو'' میں ترغیبی مواد کی شمولیت کی وجہ سے ایک اچھا حلقہ اسے بھی میسر آ گیا ہے۔ اس نے کئی اہم گوشے شائع کئے ہیں جن میں فہیم جاوید، سوہن راہی، ضررو صفی، عادل منصوری اور عبدالاحد ساز کے نام اہم ہیں۔

حسیب سوز کی ادارت میں 'لمحے لمحے' بدایوں کا اختصاص خصوصی اشاعتوں کا سلسلہ ہے۔

آندھرا پردیش، اردو کے معاملے میں نہایت فعال اور متحرک واقع ہوا ہے۔ اردو تہذیب حیدر آباد کے لہو میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آندھرا پردیش میں اردو سب سے زیادہ زندہ نظر آتی ہے اور وہاں کے محبان اردو، اردو کی زندگی کے لیے عملی طور پر کوشاں بھی ہیں۔ آندھرا پردیش سے مختلف نوعیت اور سطح کے ادبی رسائل شائع ہوتے ہیں۔

حیدر آباد کا سب سے وقیع رسالہ ''شعر و حکمت'' ہے جس کا پہلا شمارہ جنوری۔ مارچ 1970 میں شائع ہوا تھا اور اس کی ایڈیٹر اختر جہاں تھیں اور سالانہ خریداری تیرہ روپے تھی۔ پہلے شمارے کے مافیہ میں انتقاد، مطالعے اور تجزیے، مسائل، نظمیں، غزلیں کے تحت اہم تخلیقات شامل تھیں۔ ڈیمائی سائز میں یہ رسالہ 320 صفحات پر محیط تھا اور قیمت تین روپے پچاس پیسے تھی۔ بعد میں شعر و حکمت کا رنگ و روپ بھی بدلا اور اب یہ خاصا ضخیم نکلتا ہے۔ اس کے خصوصی گوشے بہت وقیع ہوتے ہیں۔ مغنی تبسم اور شہر یار کی ادارت میں شعر و حکمت نے نئے مباحث اور موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔

حیدر آباد سے اردو کے اسلوبیاتی نقاد مغنی تبسم اور اب بیگ احساس کی ادارت میں نکلنے والا ''سب رس'' اعلیٰ علمی، ادبی مضامین کی اشاعت کے لیے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ چونسٹھ سال سے شائع ہونے والا یہ رسالہ نئے مباحث پر بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس رسالے کی خاص بات یہ ہے کہ دکنی ادب سے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور حیدر آباد کا ادبی تہذیبی، ثقافتی منظر نامہ روشن ہو جاتا ہے۔ سب رس نے بعض بہت سے اہم مضامین ماضی میں بھی شائع کیے ہیں۔ جو اب کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ ان مضامین کی وجہ سے بھی سب رس کو یاد رکھا جائے گا۔ محی الدین قادری زور، شہریار پر خصوصی گوشے ادب کی تاریخ میں زندہ رہیں گے۔

حیدر آباد سے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر صلاح الدین نیر کی ادارت میں نکلنے والے مجلہ خوشبو کا سفر میں حیدر آباد کے اطراف و اکناف کے بعض تخلیق کاروں کی تحریریں بھی شامل ہوتی ہیں جو دوسری جگہ کے رسالوں میں نہیں مل پاتیں۔ اس لحاظ سے خوشبو کا سفر ایک ایسا رسالہ ہے جس سے حیدر آباد کی مٹی کی خوشبو ہم لوگوں تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ صلاح الدین نیر نے ادبی صحافت میں منصوری روایت کو زندہ رکھا ہے اس لیے ان کے رسالے میں سیاست سماج اور ادب کے تعلق سے نہایت بے باکانہ تحریریں شائع ہوتی ہیں اور بعض تو انتہائی متنازعہ فیہ بھی ہوتی ہیں زندہ دلان حیدر آباد کا ترجمان ماہنامہ شگوفہ طنز و مزاح کے لیے مختص ہے۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی ادارت میں شگوفہ نے بلندیوں کا سفر طے کیا ہے مختلف گوشوں کے علاوہ اس کا خلیج نمبر خاصا وقیع ہے۔

مغربی بنگال میں اردو کی صورت حال اطمینان بخش ہے۔ کبھی یہ علاقہ فورٹ ولیم کالج کی وجہ سے اردو زبان و ادب کا منبع اور مرکز کہلاتا تھا۔ اب گو کہ مغربی بنگال کی مرکزیت معدوم ہو گئی ہے مگر اردو زبان کے تئیں وہاں کے لوگوں کی دلچسپیاں اب بھی برقرار ہیں اور اردو کے رسائل و جرائد کے ماسوا وہاں بیدار قارئین اور متحرک تخلیق کاروں کی وجہ سے اردو زبان کی سانسیں مستحکم ہیں اور ان سانسوں کو نئی زندگی بھی نصیب ہو رہی ہے۔

کولکاتا سے ف۔س۔ اعجاز کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ''انشاء'' اپنے وقیع گوشوں اور خصوصی شماروں (رومی، گلزار، نیاز فتح پوری، نثار احمد فاروقی، انور شیخ، دلیپ سنگھ، بخش لائلپوری، کنور مہندر سنگھ بیدی، احمد سعید ملیح آبادی، قمر رئیس، ادیبوں کی حیات معاشقہ، اسکنڈے نیویائی ادب، کلکتے کا عصری ادب، بابری مسجد، صدی شمارہ گفتنی، ٹیگور نمبر) کی وجہ سے پوری دنیا میں امتیازی شناخت کا حامل بن گیا ہے۔ خاص طور پر انشاء کے گوپی چند نارنگ نمبر کو جو مقبولیت اور محبوبیت نصیب ہوئی، وہ قابل رشک ہے، انشاء میں اردو کی نئی بستیوں کے قلم کاروں سے

بھی ملاقات ہوتی ہے اور اپنے اطراف کے ادبی احوال سے آگہی بھی۔ یہ رسالہ تواتر کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور اپنے موضوعاتی تنوع کی وجہ سے مقبول و معروف ہے۔

اردو رسائل کی بھیڑ میں جو رسالے اپنی شناخت کے استحکام کے لیے کوشاں ہیں اور اپنی جدت طرازیوں کے ذریعے قارئین کے دل و دماغ میں اپنا مقام بناتے رہے ہیں ان میں ایک ''مژگان'' بھی ہے۔ کولکاتا سے شائع ہونے والا یہ مجلہ مختلف طور و طرز کا ہے۔ یہ صرف کولکاتا کا ادبی اسمبلاژ ہی نہیں بلکہ اردو کی نئی پرانی بستیوں کا تخلیقی مونتاژ بھی ہے۔ مجلے کے مرتب نوشاد مومن تازہ کار ذہن کے حامل ہیں cleanliness ان کا شخصی وصف ہے یعنی clean from inside اور اس کا عکس ''مژگان'' میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ اپنی تازہ دماغی اور شگفتہ خاطری کا ثبوت ہر شمارے میں دیتے رہے ہیں۔ ان کی مقدور بھر کوشش ہوتی ہے کہ مژگان میں جملہ تحقیقی جہات اور تنقیدی زاویوں کا احاطہ ہو جائے۔ 1840 صفحات پر محیط مژگاں کا نئی نسل نیا ادب نمبر دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ سہ ماہی ترکش شگفتہ فراغ روہوی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ ہر شمارہ کسی نہ کسی اہم ادبی شخصیت یا تخلیق کار کے نام منسوب ہوتا ہے اور درون ترکش اس تخلیق کار پر تاثراتی، تجزیاتی مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر قابل قدر تخلیقات بھی ہوتی ہیں۔ ترکش نے جاوید دانش جیسی ہمہ جہت شخصیت پر خاصا ضخیم شمارہ شائع کیا ہے جس کی پوری ادبی دنیا میں خوب پذیرائی ہوئی۔ ممتاز ڈرامہ نگار اور سفرنامہ نویس جاوید دانش پر کسی ہندوستانی رسالے کی یہ پہلی پیش کش ہے۔ یہیں سے شائع ہونے والا 'رنگ رس' تھیٹر آرٹ پر اردو کا واحد رسالہ ہے۔ اس کے مدیر ایس ایم اظہر عالم ہیں۔

مدھیہ پردیش بھی اردو زبان کی زرخیزی اور عملی احیاء کے معاملے میں ایک قابل ذکر ریاست ہے۔ وہاں اردو زبان کے احیاء اور فروغ کی کوششیں قدیم زمانے سے جاری ہیں۔ دور جدید میں بھی مدھیہ پردیش نے اردو کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔ باوجودیکہ وہاں اردو مخالف ہوائیں چلتی رہی ہیں مگر باد مخالف میں بھی وہاں اردو کا چراغ روشن ہے اور اس کی روشنی انگلینڈ اور امریکہ تک پہونچ رہی ہے۔

سیفی سرونجی کی ادارت میں نکلنے والے ''انتساب'' نے اپنی اشاعت کے 22 برس پورے کر لئے ہیں۔ یہ رسالہ خصوصی اشاعتوں کی وجہ سے بیرونی ممالک میں بھی مقبول ہے۔ گو کہ اس کے زیادہ تر گوشے شخصی نوعیت کے ہوتے ہیں مگر اس میں بعض ایسے فکر انگیز مضامین اور اردو کی نئی بستیوں کے قلمکار شامل ہوتے ہیں جن کی بنا پر انتساب کو اعتبار حاصل ہے۔ بشیر بدر، ندا فاضلی، ظفر گورکھپوری، مظفر حنفی، پروین شیر، صوفیہ انجم تاج، شاہد میر، ابراہیم اشک، ممتاز راشد، وقار فاطمی، خالد محمود، قاضی مشتاق احمد، ایوب واقف پر خصوصی شماروں کے علاوہ شکیلہ رفیق اور فریاد آزر کے گوشوں سے بھی انتساب کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

تمثیل بھوپال مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کا ترجمان ہے۔ بھوپال کے آثار و باقیات پر اس کے مضامین خاصے وقیع ہوتے ہیں۔

کاروان ادب کوثر صدیقی اور جاوید یزدانی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمس الرحمٰن فاروقی نمبر کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔

ریگستانی علاقہ راجستھان کی ریاست میں اردو زبان کی زمین سرسبز و شاداب ہے۔ یہاں کے صدر مقام گلابی شہر جے پور سے ''نخلستان'' شائع ہوتا ہے۔ راجستھان اردو اکیڈمی کا یہ رسالہ اپنے مافیہ اور محتویات کے اعتبار سے اہم اور قابل ذکر ہے بالخصوص راجستھان کی ادبی، ثقافتی صورت حال اور وہاں کے علاقائی اور لوک ادب کی تفہیم میں اس رسالے سے کافی مدد ملتی ہے۔ راجستھان کے فراموش کردہ تخلیق کاروں کی بازیافت ''نخلستان'' کا خاص کارنامہ ہے اس کے خصوصی شماروں میں راسخ بیکانیری نمبر قابل ذکر ہے۔ یہیں کے شہر جودھ پور سے شیش شائع ہوتا ہے۔ ہندی رسم الخط میں یہ اردو کا ہی مجلہ ہے کہ اس کا سارا ارتکاز اردو ادبیات کے تراجم اور ترسیل پر ہے۔ حسن جمال کی ادارت میں شیش لسانی اجنبیت اور ثقافتی بیگانگی کو دور کرنے کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہوا ہے۔ ہندی کے ذریعہ یہ اردو کی اہم خدمت ہے۔ اردو افکار و اظہار کی کائنات سے ہندی کا رشتہ جوڑنے کی یہ ایک اچھی کوشش ہے۔

جھارکھنڈ سے عہد نامہ رانچی (مرتب: سرور ساجد) 'وقت' رنگ اور شہپر (مدیر: احمد فرمان) شائع ہوتے رہے ہیں۔ 'وقت' دھنباد صوری اور معنوی اعتبار سے بہت خوب ہے اور اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے کچھ ایسے فنکاروں کے گوشوں کا اہتمام کیا ہے جن کے اندر بے پناہ تخلیقی جوہر ہے مگر وہ گوشہ خفا میں ہیں۔ سید احمد شمیم، محمد سالم پر گوشے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

دھنباد سے سہ ماہی رنگ شان بھارتی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ غیاث احمد گدی مرحوم کی یاد تازہ کرنے والا یہ رسالہ جہاں متحارب نظریات کے مابین توازن قائم کئے ہوئے ہے وہیں نئی تخلیقی نسل کی حوصلہ افزائی بھی اس کے مشن میں شامل ہے۔ یہ جمود سے انحراف اور انکار کی ایک بہترین مثال بھی ہے اور نئی تخلیقی ذہانتوں کی تلاش میں بھی سرگرم ہے۔ رنگ نے علقمہ شبلی، مجاز جے پوری، عبدالاحد ساز، حنیف ترین، غلام مرتضی راہی، اور انور شیخ، ارشد صدیقی وغیرہ پر اہم گوشے، شمارے شائع کئے ہیں۔ حال میں اس کا تازہ کارنامہ گوپی چند نارنگ نمبر کی اشاعت ہے۔

اتکل کلنگا، اڑیسہ کی وہ سرزمین ہے جہاں سے عبدالقادر بیدل جیسے شاعر اور دیگر بڑی شخصیات کا گہرا تعلق رہا ہے۔ ہردے رام جودت جیسے شاعر کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے اور امجد نجمی بھی اسی سرزمین کے فرزند ارجمند تھے جن کی شاعری کو سراہنے والوں میں بہت سے بڑے نام آتے ہیں۔ نیولپوری کی ''کتاب اڑیسہ میں اردو'' سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اڑیسہ اردو کے معاملے میں متحرک اور فعال رہا ہے کہ یہیں سے امجد نجمی کی ادارت میں شاخسار کٹک نکلتا تھا جس کی مشاورت میں سید حرمت الاکرام، مظہر امام، کرامت علی کرامت اور حفیظ اللہ نیولپوری جیسی شخصیتیں تھیں۔ اس کی تخلیقی اور تنقیدی فعالیت کا ثبوت فروغ ادب، ادبی محاذ (مدیر: سعید رحمانی) اور ترویج جیسے رسائل ہیں جو گو کہ تواتر کے ساتھ شائع نہیں ہوتے مگر جب بھی ان کی اشاعت عمل میں آتی ہے تو ادب میں کچھ دنوں تک ہلچل رہتی ہے۔

خاور نقیب کی ادارت میں کٹک اڑیسہ سے 'ترویج' کا اشاعتی سلسلہ ۱۹۹۵ء سے شروع ہوا اور اس رسالے نے اڑیسہ کے ادبی آنگن میں مہکتے پھولوں اور اردو ادبیات کے شگفتہ غنچوں سے مشام جاں کو معطر کیا اور بعض ایسی تحریریں شامل کیں جو اردو ادب و تنقید میں تحرک و طغیانی کا باعث بنیں۔ اڑیسہ کے ادبی منظر نامے سے آگہی اور

اڑیسہ کے تخلیقی تموجات سے روشناس کرانے میں 'ترویج' کا کودار ناقابل فراموش ہے۔ ''ترویج'' کی اشاعت ہی سے اڑیسہ کے بہت سے ایسے ادیبوں سے آشنائیاں ہوئیں جن سے دوسرے رسائل میں ملاقاتیں ممکن نہ تھیں۔ اس طور پر 'ترویج' نے پوری ریاست اڑیسہ کی ادبی نمائندگی کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ اب سعید رحمانی نے اپنے رسالے کے ذریعہ اڑیسہ کو ادب کے مرکزی دھارے سے جوڑ دیا ہے۔

تامل ناڈو میں اردو کے لیے فضا کافی سازگار ہے، وہاں اردو کے تخلیق کاروں کی ایک بڑی آبادی ہے۔ تامل ناڈو کے شہر چنئی سے ایک رسالہ ''نور جنوب'' کے نام سے علیم صبا نویدی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ رسالہ حجم کے اعتبار سے مختصر ہے مگر معنوی اعتبار سے اسے معتبریت حاصل ہے۔

ہندوستان کی ریاست کشمیر واحد ایسی ریاست ہے جہاں کی سرکاری زبان اردو ہے اور جہاں اردو زبان کے ممتاز تخلیق کار اور نقاد بھی ہیں۔ وہاں کی کلچرل اکیڈمی کا رسالہ ''شیرازہ'' بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں اردو ادبیات پر اہم مضامین کی شمولیت کے ساتھ اردو میں کشمیری ادب کی جھلکیاں بھی ہوتی ہیں۔ کشمیری لفظیات، علائم اور موز سے آگہی ''شیرازہ'' کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری کے 'جہات' اور سیدہ نسرین نقاش کے 'صدا' اور 'عالمی کارواں' اور ابن اسماعیل کے 'التعاون اور بزم ادب'، زاہد مختار کے لفظ لفظ کے بغیر بات نامکمل رہے گی۔ ابن اسماعیل کا 'بزم ادب' فکر انگیز اور دانش افروز تحریروں پر محیط ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان مضامین کی شمولیت سے رسالے کی معنویت بڑھ گئی ہے جو مغربی مفکرین اور دانشوروں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ کرکے گارڈ اور ایڈورڈ سعید، کامیو، میلان کنڈیرا، کافکا کے افکار اور عالمی ادبیات کے تراجم نے بزم ادب کی افادیت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ اس کا ہر شمارہ بہت معنی خیز ہوتا ہے۔ بزم ادب کا مزاح نمبر بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اردو کے ممتاز مزاح نگاروں رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی، ضمیر جعفری، ابن انشا، کرنل محمد خان، شفیق الرحمن، کنھیا لال کپور، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، فکر تونسوی، فرقت کاکوروی، ابراہیم جلیس، احمد جمال پاشا، مجتبی حسین اور یوسف ناظم کی تحریریں ہی نہیں بلکہ مشرق ومغرب کے مزاح کا عمدہ انتخاب بھی ہے۔

نانک اور کیرالہ جیسی جنوبی ہند کی ریاستوں میں بھی اردو زبان کے فروغ کے عملی اقدامات کیے جاتے رہے ہیں۔

کرناٹک سے ''سوغات'' اور ''ادب'' جیسے رسائل شائع ہوتے تھے جن کی اہمیت کا اعتراف پوری ادبی دنیا نے کیا اور 'سوغات' کو تو ادبی سمت نما کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ محمود ایاز کا ''سوغات'' آج بھی ایک حوالے اور ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے گو کہ وہ صرف اردو کی محدود اقلیت کے لئے تھا، عام قارئین سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ موجودہ مجلاتی صحافت کے ضمن میں کرناٹک اردو اکیڈمی کا سہ ماہی ادبی وتہذیبی مجلہ 'اذکار'، اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے کہ مضامین کے حسن انتخاب، ترتیب اور خوش سلیقگی نے جہاں اسے منفرد پہچان عطا کی ہے وہیں خلیل مامون کے جادوئی لمس نے آب وتاب بخشا ہے۔ اذکار کا انفراد یہ ہے کہ اس میں فکر انگیز اور دانشورانہ نوعیت کے مضامین کے علاوہ کنٹرزبان کی تخلیقات کے تراجم بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ رسالہ تخلیقی کلچر کی جملہ جہتوں سے روشناس

کراتا ہے۔ ڈاکٹر انیس صدیقی کی ریاضت بھی ہر شمارے سے عیاں ہوتی ہے۔ 'زریں شعاعیں' (مدیرہ: فریدہ) دوماہی ظرافت بنگلور (مدیر: عظیم الدین عظیم) دوماہی غبار بنگلور (مدیرہ: قدسیہ واجد) قابل ذکر ہیں کہ اپنے وسائل اور ذرائع کے اعتبار سے یہ رسالے بھی اردو کے ایک بڑے حلقے کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں۔

ہندوستان کی ریاست گجرات بھی اردو کے باب میں کافی فعال ہے۔ وارث علوی جیسے ناقد اور محمد علوی اور عادل منصوری جیسے شاعروں کی زادگاہ گجرات میں اردو ساہتیہ اکیڈمی قائم ہے جس کا مجلہ سابرنامہ اپنے امتیازات کی وجہ سے ادبی حلقہ میں اعتبار قائم کیے ہوئے ہے پروفیسر محی الدین بمبئی والا کی ادارت میں سابرنامہ کی قدر و قیمت میں کافی اضافہ ہوا ہے اس کے بعض خصوصی شماروں کو بے حد مقبولیت نصیب ہوئی ان میں جدید شاعری نمبر جدید افسانہ نمبر کے علاوہ عصمت چغتائی، ولی گجراتی، قرۃ العین حیدر، علی سردار جعفری، مولانا حالی اور مولانا رومی پر خاص شمارے دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔

کیرالہ بھی اردو کے معاملے میں پیش قدمی کر رہا ہے۔ وہاں ادبا شعرا کی ایک بڑی تعداد آباد ہے اور وہاں بھی اردو کے شعبہ جات اور ادارے ہیں مگر ان کی سرگرمیوں سے ہندوستان کی ریاستوں کے لوگ زیادہ آگاہ نہیں ہیں۔

پنجاب جو کبھی اردو کا گہوارہ تھا اور اردو کے بیشتر بڑے ناموں (منٹو، بیدی، کرشن چندر، ساحر، گلزار) کا تعلق اسی ریاست سے تھا مگر تقسیم ہند کے بعد صورت حال یوں بدلی کہ ادبی رسالے بند ہو گئے۔ مدتوں بعد ڈاکٹر کیول دھیر کی کوششوں سے 'ادیب انٹرنیشنل' کا آغاز ہوا ہے۔ جس کا اختصاص سوال نامہ کے جواب میں اور خود کلامی جیسے دوگراں قدر سلسلے ہیں۔ منٹو، بیدی، ساحر اور کرشن چندر کی سرزمین کا یہ رسالہ پنجاب کی دھرتی کا حسین خواب نامہ ہے اور اس خواب میں پوری اردو دنیا شریک ہے۔ پنجاب سے ہی 'پرواز ادب' نکلتا ہے۔ یہ ایک زمانے میں بہت مقبول رسالہ تھا۔ اس نے بعض معلوماتی خصوصی شمارے بھی شائع کیے تھے۔

ہندوستان کی ایک اور ریاست ہریانہ سے "تعمیر" کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوتا ہے جس کے قارئین کا حلقہ ریاست بہار تک پھیلا ہوا ہے اور ہریانہ اردو اکیڈمی کی طرف سے جمناتٹ کی اشاعت ہوتی ہے۔ یہ ہریانہ کی ادبی سرگرمیوں کے علاوہ عمدہ تخلیقات پر محیط مجلہ ہے۔

ہماچل پردیش کی ریاست سے ممتاز شاعر کرشن کمار طور کے منفرد طرز کے رسالہ سر سبز کے علاوہ جدید فکر و فن کے نام سے ادبی رسالہ شائع ہوتا ہے۔ سر سبز دھرم شالہ شاید اردو کا واحد رسالہ ہے جو صرف شاعری کے لئے مختص ہے اور اس کی نثر کا علاقہ بھی غزل کی شعریات اور جمالیات تک محدود ہے۔ سر سبز کے وسیلے سے بہت سے سخن ستارے ذہنوں کو تابانی عطا کر رہے ہیں۔

چھتیس گڑھ جو حبیب تنویر جیسے عالمی شہرت یافتہ ڈرامہ نگار اور اختر حسین رائے پوری جیسے ناقد کی جنم بھومی ہے۔ وہاں بھی اردو اکیڈمی کے تحت رسالہ شائع ہوتا ہے۔

ان ریاستوں کے علاوہ آسام، ناگالینڈ، تری پورہ، جزائرہ نڈمان نکوبار، اترانچل، میگھالیہ، اروناچل پردیش میں بھی اردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والے موجود ہیں مگر ان ریاستوں سے کسی ادبی رسالے کی موجودگی کی

خبر یا اطلاع مجھے نہیں ہے۔ ممکن ہے علاقائی سطح پر یہاں سے کچھ اردو رسالے شائع ہوتے ہوں۔ مگر ان رسالوں تک عام لوگوں کی رسائی نہیں ہے۔

بہر طور ہندوستان کی بیشتر ریاستوں سے چھوٹے بڑے پیمانے پر اردو میں ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں مگر اردو میں ایک ایسے ادبی مجلّہ کی کی شدید ضرورت ہے جس میں سائنسی علوم، عمرانیات، لسانیات، نفسیات، سماجیات، معاشیات کی بھی شمولیت ہو۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ ایک ایسا رسالہ شائع کیا جائے جس میں پرانے زمانے کے اہم ادبی رسائل مثلاً زمانہ کانپور، دلگداز لکھنؤ، معارف علی گڑھ، تحریک دہلی کی اہم تحریروں کا انتخاب ہو۔ آموختہ یا بازدید کے نام سے رسالہ شائع ہو کیونکہ آج کی تحریروں میں محنت اور ریاضت نظر نہیں آتی جتنی کہ قدیم زمانے کے رسائل میں چھپنے والی تحریروں میں ہوتی تھی۔ آج تو صرف سرقہ تو ارد اور نقل کا دور ہے۔ خاص طور پر جامعات کی نئی نسل کا سارا دارومدار نقل پر ہی ہے اسی لئے ایسی تحریروں سے معاشرے کو بچانے کے لئے ضروری ہے۔ پرانے اوراق سے ہی قارئین کو روشناس کرایا جائے۔ کم از کم ان مضامین سے آگہی میں تخفیف کا خدشہ تو نہیں رہے گا۔

ہندوستان میں اردو کے ادبی رسائل کے ساتھ مسائل و مشکلات جڑے ہوئے تو ہیں ہی مگر یہ اچھی بات ہے کہ یہاں کے مدیران اور تخلیق کار، ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کی ہمت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں زیادہ تر اردو کے مدیران، دریا کا حریف بننے میں ناز محسوس کرتے ہیں وہ ساحل میں عافیت تلاش نہیں کرتے بلکہ موج حوادث میں بھی ادب اور تخلیق کے سفینے کو پار لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور موجوں سے ٹکراتے ہوئے سفینے کو ساحل تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔

ہندوستان میں اردو رسائل میں لکھنے والے crisis of vision کے شکار ہیں اس لئے انہیں مروجہ لفظیات، اصطلاحات اور فرسودہ خیالات کے خول سے باہر نکل کر علوم وفنون اور ادبیات کی نئی شاخوں میں پناہ تلاش کرنی ہوگی کیونکہ cybernetic communication کے اس عہد میں ہر سطح پر تبدیلی اور تغیر نمایاں ہے۔ نئی فکریات اور لفظیات کے بغیر ادب میں دوام یا ماورائے زمان و مکان بننے کی خواہش سعی لاحاصل قرار پائے گی۔ ایسے تخلیق کاروں کی مدت حیات نہایت مختصر ہوتی ہے جو لکیر کے فقیر ہوتے ہیں یا جن کے پاس کہنے کو کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔ فکر و احساس کے نئے منطقوں کی جستجو کے بغیر ادب لکھنے والوں کا مستقبل تاریک ہی رہے گا۔ تابندگی کے لئے پیہم جستجو مسلسل محنت، متواتر ریاضت اور نئے سمندروں کی تلاش شرط ہے۔

سند باد بنے بغیر ادب میں بلند مقام حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ رومی و حافظ، غالب، میر تقی میر ایسے ہی سند باد تھے جنہوں نے اپنی تخلیقی قوتوں اور فکری توانائیوں کی اساس پر عظمتیں اور رفعتیں حاصل کیں اور ان کے نام ادبی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔

....

D-64, Flat No. 10, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-25
Email: haqqanialqasmi@gmail.com ; Cell: 9891726444

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز

اردو صحافت' اندیشے اور نئے امکانات

(اکیسویں صدی کے حوالے سے)

اکیسویں صدی کا آغاز یوں تو 2000ء سے ہوا ہے مگر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اکیسویں صدی کی شروعات 1970ء کی دہائی سے ہی ہوگئی۔ سائنس و ٹکنالوجی بالخصوص انفارمیشن ٹکنالوجی کے عروج کا دور تب ہی سے شروع ہوا۔ جیسے جیسے مغربی دنیا نے انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی کو مختلف شعبہ حیات میں استعمال کیا بالخصوص ذرائع ابلاغ میں اس کا خوب استعمال ہوا اس کے اثرات دیر سے ہی سہی ہندوستانی میڈیا نے اور پھر اردو صحافت نے قبول کئے۔ اور آج اکیسویں صدی کے آغاز کے 13 برس بعد اردو صحافت ترقیاتی اور مسابقتی دوڑ میں کسی بھی زبان کے ذرائع ابلاغ سے پیچھے نہیں ہے کیوں کہ انفارمیشن ٹکنالوجی نے دنیا کو جیسے جیسے عالمی گاؤں میں تبدیل کیا ویسے ویسے ٹکنالوجی کا استعمال سب کے لئے عام ہوا۔ 2000ء تک بھی یہ قیاس نہیں کیا گیا تھا کہ اخبارات موبائل فون میں سما جائیں گے۔ کاغذ اور قلم کے بغیر صحافت کا تصور نہیں تھا۔ مگر اب صحافت میں کاغذ کا استعمال پتھر کے دور کی علامت سمجھا جانے لگا ہے۔ اگرچہ کہ اب بھی اکثریت پرنٹ میڈیا یعنی کاغذ پر مطبوعہ مواد سے ہی مطمئن ہوتی ہے۔ اس کے باوجود یہ دور مشینی دور ہے جہاں وقت پنکھ لگا کر اڑنے لگا ہے۔ تفصیلات کے لئے وقت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جھلکیوں یا سرخیوں سے کام چل جاتا ہے۔ 24/7 ٹی وی چیانلس، سوشیل میڈیا، نے پرنٹ میڈیا کی قدر و قیمت کو کم ضرور کیا ہے مگر اب بھی اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار ترقی کے باوجود کم از کم ہندوستان میں پرنٹ میڈیا کو نقصان کے بجائے فائدہ ہوا ہے۔ رجسٹرار نیوز پیپر آف انڈیا کے رپورٹ 11-2010 کے مطابق مختلف زبانوں کے 82,237 اخبارات شائع ہوتے ہیں اور 2013 میں 4853 نئے اخبارات کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ تمام اخبارات کی مجموعی تعداد اشاعت 32 کروڑ 92 لاکھ 4 ہزار 841 ہے جس میں 983 اردو اخبارات ہیں جن کی مجموعی اشاعت 2 کروڑ 16 لاکھ 39 ہزار 230 ہے۔

اخبارات کی اشاعت میں گذشتہ 15 برس میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ کیوں کہ آر این آئی کی رپورٹ 1999ء کے مطابق ایک سو زبانوں، بولیوں اور 18 قومی زبانوں کے علاوہ انگریزی میں 43 ہزار 828 اخبارات شائع ہوئے جن کی مجموعی تعداد اشاعت 12 کروڑ 68 لاکھ 49 ہزار 500 تھی۔ 1997ء میں یہ اشاعت 10 کروڑ 57 لاکھ 8 ہزار 191 تھی۔ اس طرح 15 برس کے دوران تمام زبانوں کے اخبارات کی مجموعی تعداد اشاعت میں 20 کروڑ کا اضافہ ہوا ہے جو حوصلہ افزا ہی کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح 15 برس میں 40 ہزار سے زائد نئے اخبارات کا اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے' اردو اخبارات کی تعداد اشاعت کو مایوس کن نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ 15 برس پہلے تک 20، 25 ہزار تعداد اشاعت والے اردو اخبارات کو کثیر الاشاعت اخبار کہا جاتا تھا۔ آج حیدرآباد سے شائع ہونے والا روزنامہ ''منصف'' گذشتہ 20 برس سے تعداد اشاعت کے لحاظ سے سرفہرست ہے جس کی

تعداد اشاعت آڈٹ بیورو سرکولیشن کے مطابق 60 ہزار ہے۔ بعض اخبارات نے سرکولیشن کے بجائے ریڈرشپ سروے کے ریکارڈ کو ترجیح دی ہے۔ منصف، رہنمائے دکن اور اعتماد جیسے اخبارات سنگل ایڈیشن ہیں، جبکہ روزنامہ راشٹریہ سہارا، انقلاب جنہیں کارپوریٹ سیکٹر نے اپنا لیا ہے، ملٹی ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔ سیاست حیدرآباد اور بنگلور سے شائع ہوتا ہے۔ کئی اور اخبارات ہیں جو ملٹی ایڈیشن ہیں۔ بہرحال مغربی ممالک میں پرنٹ میڈیا گراوٹ کا شکار ہے۔ ان کی تعداد اشاعت گھٹ رہی ہے اور کئی اخبارات بند ہو رہے ہیں یا بعض نے صفحات میں کمی کر دی ہے۔ ہندوستانی اخبارات کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہندوستان میں نہ صرف نئے اخبارات کا اضافہ ہو رہا ہے بلکہ ان میں خوب سے خوب تر کی مسابقت جاری ہے اور اردو صحافت بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

گذشتہ 10 برس کے دوران اردو صحافت میں ایک انقلابی دور کا آغاز ہوا جب سہارا گروپ نے اردو روزنامہ شروع کیا۔ اگرچہ کہ اس کا ہفتہ وار پہلے ہی سے تھا۔ تاہم اردو روزناموں کی مختلف شہروں سے معیاری اشاعت صحافیوں کو معقول معاوضہ کی ادائیگی سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سے دوسرے اردو اخبارات میں بھی مسابقت کا جذبہ پیدا ہوا اور صحافتی برادری کی خوشحالی کے دور کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ بعد جاگرن گروپ نے ممبئی سے شائع ہونے والے روزنامہ انقلاب کو خرید لیا اور نئے انتظامیہ کے ساتھ کئی شہروں سے اشاعت کا آغاز کیا تو یہ بھی اردو صحافت اور اردو صحافیوں کے لئے ایک اور نئے دور کا آغاز تھا۔ انقلاب اور روزنامہ راشٹریہ سہارا نے صحافت کے معیار اور اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے اردو صحافت کو نئی زندگی عطا کی۔ عام طور پر کارپوریٹ سیکٹر خسارے کی تجارت نہیں کرتے۔ ایک دور وہ بھی تھا جب اردو اخبارات کے لئے کارپوریٹ سیکٹر کے اشتہارات تک نہیں جاری کئے جاتے تھے۔ اور اب ایک ایسا دور بھی آگیا کہ خود کارپوریٹ سیکٹر نے اردو صحافت کو گود لے لیا ہے۔ اس کے پس پردہ مقاصد چاہے کچھ بھی ہوں، وقتی طور پر ہی سہی اردو صحافت کو نئی زندگی ملی ہے۔ پہلے سے موجود روایتی اردو اخبارات کے مالکین کی آہ و بکا کس حد تک واجبی ہے اور ان پر الزامات کس حد تک درست ہیں کہ کارپوریٹ سیکٹر کی جانب سے اردو اخبارات کی سرپرستی کا مقصد مسلمانوں کی ذہنیت کو بدلنا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت اردو اخبارات کی عادی ہے اور اردو اخبارات ہی ان کے ترجمان بھی ہوتے ہیں اور رائے عامہ ہموار کرتے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کی ذہنیت کو بدلنے کیلئے کارپوریٹ سیکٹر نے اردو صحافت کی بھی پشت پناہی شروع کی ہے۔ انہیں مسلمانوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کیونکہ ان ہی گروپس کے تحت دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے ہیں۔

اور تو اور اب راشٹریہ سیوک سنگھ (RSS) جو اپنی مسلم اور اردو دشمنی کے لئے مشہور رہی ہے۔ اب اس نے بھی مسلمانوں کو قریب کرنے کے لئے ذرائع ابلاغ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ اس نے زی سلام کے طرز کا اردو ٹی وی چیانل اور اردو اخبار ''پیغام مادر وطن'' شروع کیا ہے جس کے لئے مستند تجربہ کار صحافیوں کی خدمات حاصل کی جارہی ہے۔ آر ایس ایس نے گریش جویال کو مسلم راشٹریہ منچ (MRM) کا نیشنل آرگنائزنگ کنوینر بنایا ہے۔ گریش جویال ایک اردو نیوز سرویس کے بھی چیف ایڈیٹر ہیں جس کے خریدار 772 اردو اخبارات ہیں۔ اس اخبار اور اردو ٹی وی چیانل سے مسلمانوں کی ذہنی تربیت کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ گریش جویال ہمالیہ

پریوار نامی تنظیم کے بانی آرگنائزنگ کنوینر بھی ہیں جس سے 1750 این جی اوز کا الحاق ہے۔ ان میں سے ایک تنظیم ''انجمن فرزندان ہند'' بھی ہے۔ ہمالیہ پریوار کا مقصد مسلم نوجوانوں کو ملک کا متمدن، تعلیم یافتہ، مہذب اور وفادار شہری بنانا ہے۔ مسلم راشٹریہ منچ 25 ریاستوں اور 318 اضلاع میں اپنی برانچس کی حامل ہے۔

کارپوریٹ سیکٹر کے تحت دو بڑے اردو اخبارات، ٹی وی چیانلس کے بعد آر ایس ایس کے عزائم اس پس منظر میں حال ہی میں اسرائیلی سفارتکاروں کی ہندوستان کے مختلف شہروں میں اردو صحافیوں سے ملاقات آنے والے اندیشوں سے خبردار کررہی ہے۔ جو عناصر اور طاقتیں ہمیشہ سے مسلمانوں کو اور ان کی زبان اردو کو نفرت، حقارت، تعصب کی نظر سے دیکھتے رہے اب انہوں نے اس کی سرپرستی کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ اگر مسلم انتظامیہ کے تحت اخبارات اس نازک ترین مرحلہ پر اپنے آپ کو نہ سنبھالیں، اپنے رویے کو تبدیل نہ کریں' ملازمین کی حالات کو بہتر بنانے کے لئے اقدامات نہ کریں تو اردو صحافیوں کی ان مسلم اور اردو دشمن اداروں سے وابستگی کے لئے وہی ذمہ دار ہوں گے۔ کیوں کہ بچہ بھی بھٹکتا ہے جب اُسے اپنے گھر میں محبت نہ ملے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو صحافت کا مسلمانوں سے گہرا رشتہ ہے اور مسلمانوں کی اکثریت اردو اخبارات کا مطالعہ کرتی ہے۔ آندھرا پردیش، مہاراشٹرا، کرناٹک، بہار اور اتر پردیش کے علاوہ جن ریاستوں میں اردو کا چلن عام نہیں ہے وہاں بھی اردو اخبارات کی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر تاملناڈو میں اردو کا چلن عام نہیں ہے مگر اردو کے لئے اب بھی بہت زیادہ کام یہاں پر ہورہا ہے۔ تحقیق کے میدان میں تاملناڈو کے محبان اردو نے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر علیم صبا نویدی، ڈاکٹر حبیبہ جاوید، پروفیسر سجاد حسین، مختار بدری، کاوش بدری، ڈاکٹر اعجاز حسین، کمال مدراسی جیسی ہستیوں نے اردو، ادب وصحافت کے لئے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ پرنس آف آرکاٹ نواب عبدالعلی اپنے طور پر اردو محفلوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ یہاں مشاعرے بھی ہوتے ہیں اور سمپوزیم وسمینار بھی۔ روزنامہ ''مسلمان'' تاملناڈو سے شائع ہونے والا واحد اردو روزنامہ ہے مگر میقاتی جرائد معیاری انداز میں شائع ہورہے ہیں۔ اُسی طرح کیرالا میں اردو کا چلن برائے نام ہے مگر اردو اب بھی یہاں کی زبان ہے۔ اردو پڑھنے والوں کی قابل لحاظ آبادی یہاں موجود ہے۔ دینی مدارس کے فارغین تحصیل ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں جو دینی مدارس کے قیام کے ذریعہ اردو کے شمعیں جلائے ہوئے ہیں۔ انٹرنیٹ سوشیل میڈیا کی بدولت ان علاقوں کے عوام اردو دنیا سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ اور سوشیل میڈیا اخبارات کے آن لائن ایڈیشن کی بدولت ان علاقوں میں اردو زندہ ہونے لگی ہے۔ مشاعرے، ادبی مذاکرے منعقد ہوتے ہیں۔ سرکاری سرپرستی میں اردو اکیڈیمیاں قائم ہیں جو کچھ نہ کچھ خدمات انجام دیتی ہیں۔ لاکھ دعوؤں کے باوجود کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے' ہندوستانی مسلمانوں نے بار بار یہ ثابت کیا ہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی اکثریت کی زبان ہے۔ یہ سچ ہے کہ دوسری اقوام نے بھی اس زبان کو اپنایا اور اس کے فروغ میں اہم رول ادا کیا مگر ان کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جاسکتی ہے۔ جبکہ جن مسلمانوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے وہ بھی ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں چونکہ اس کا رسم الخط عربی سے ملتا جلتا ہے اور بیشتر الفاظ عربی سے ہی ماخوذ

ہیں۔اس لئے قرآن پڑھنے والا ہر مسلمان اردو پڑھ سکتا ہے یہ اور بات ہے کہ بعض الفاظ کے مفہوم سے وہ آشنا نہ ہو۔اردو صحافت نے ہر دور میں مسلمانوں کا رشتہ مذہب سے جوڑے رکھا ہے۔ان کے مسائل کی ترجمانی کی، ان کے حقوق کے لئے آواز اٹھائی اور رائے عامہ ہموار کی اور اردو اخبارات ہی کی بدولت ہندوستان میں اکثر و بیشتر مخالف اسلام تحریکات ناکام ہوئیں۔کارپوریٹ سیکٹر کا اردو صحافت میں داخلہ اردو صحافت اور صحافیوں کے لئے وقتی طور پر فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے مگر مستقبل میں اس کے نقصانات بھی ہوں گے۔کیوں کہ کارپوریٹ سیکٹر کے تحت شائع ہونے والے اخبارات مبینہ طور پر مسلمانوں کی برین واشنگ کرنے کے لئے شروع کئے گئے ہیں۔حال ہی میں کارپوریٹ سیکٹر کے تحت شائع ہونے والے ایک اردو اخبار نے اتر پردیش کے مسلمانوں میں مسلکی انتشار پیدا کیا اور یہ اندیشہ بڑی حد تک درست لگتا ہے کہ مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی غرض سے ہی کارپوریٹ سیکٹر نے اردو صحافت میں قدم رکھا۔فی الحال ان الزامات کا تصدیق ممکن نہیں کہ آیا کارپوریٹ سیکٹر کے اخبارات اسرائیل اور اسرائیل نواز طاقتوں کے اسپانسرڈ ہیں۔البتہ اس شعبہ کو تقویت اس لئے ملتی ہے کہ ان اخبارات سے وابستہ بعض نامور صحافیوں کا تعلق اردو سے ضرور ہے مگر مسلم نام ہوتے ہوئے بھی اسلام سے کوئی گہرا رشتہ نہیں ہے۔اگر کارپوریٹ سیکٹر کے تحت آنے والے دنوں میں کچھ اور اخبارات شائع ہونے لگتے ہیں تو پہلے سے موجود ان اخبارات کے لئے مستقبل کے لئے خطرہ ہے جنہیں اردو اخبارات کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی ترجمانی کا دعویٰ ہے۔اردو اخبارات کے قارئین کی اکثریت عام مسلمانوں پر مشتمل ہے جنہیں شاطر صحافی اپنے قلمی، جال میں پھانس کر ان کی رائے کو اپنے موافق بنا سکتے ہیں۔ان اخبارات کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے روایتی اردو اخبارات جن کا مسلم انتظامیہ ہوتا ہے اپنا دیانتداری کے ساتھ جائزہ لیں اور اس خوش فہمی کے جال سے اپنے آپ کو نکالیں کہ اردو قارئین ہمیشہ ان کے اخبارات کے وفادار رہیں گے۔قارئین کو جو بہتر ملے گا اسے ترجیح دیں گے۔روایتی اخبارات کے مالکین اپنی پالیسیوں، معیار، ملازمین کی تنخواہوں پر نظر ثانی کریں۔اس سے نہ صرف ان کا اپنا مستقبل تاریک ہونے سے محفوظ رہے گا بلکہ وہ اردو صحافت اور مسلمانوں کے دیرینہ رشتہ کو قائم ودائم رکھنے کے لئے اہم رول ادا کریں گے۔خدانخواستہ رشتہ ختم ہوجائے تو مسلمانوں اور اردو صحافت دونوں کا نقصان عظیم ہوگا۔

اردو صحافیوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں اپنے اقدار اور اصول زیادہ عزیز ہیں اور خدمت کے جذبہ کے ساتھ کم اجرتوں پر اردو اخبارات سے وابستہ ہیں۔مگر کارپوریٹ سیکٹر کے تحت اگر دو اخبارات کی اشاعت، معقول معاوضہ کی ادائیگی، اعلیٰ معیار کی برقراری نے اردو صحافیوں کی اکثریت کو اپنے مستقبل اور معاشی خوشحالی کے لئے کارپوریٹ سیکٹر کے اردو اخبارات کی طرف مائل ہونے کے لئے مجبور کیا۔کیوں کہ بقول سلیم جاوید کے "اصول اور آدرش کو گوندھ کر دو وقت کی روٹی نہیں بنائی جاسکتی"۔(فلم: دیوار کا مکالمہ)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بیشتر اردو اخبارات سے وابستہ صحافیوں کی معاشی حالت بہت کمزور ہے کیوں کہ ان کی تنخواہیں ان کی ضروریات کی تکمیل نہیں کرسکتیں۔بعض بڑے اخبارات نے دکھاوے کے لئے اپنے چند ملازمین کو معقول تنخواہیں ضرور مقرر کی ہیں مگر ملازمین کی اکثریت کو دوسرے اخبارات کے مقابلہ میں کم معاوضہ ادا کیا جاتا

ہے۔ اس کے لئے اخبارات کا انتظامیہ سرکاری اشتہارات نہ ملنے کا رونا روتا ہے' حالانکہ پرائیویٹ سیکٹر کے جتنے اشتہارات انہیں ملتے ہیں اس سے اخبارات کے ملازمین کی حالت کو بہتر بنانے کے اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جتنے مشہور اخبارات ہیں جن کی اشاعت اچھی خاصی ہے' ان کے مالکین کی مالی حالت انگریزی اخبارات کے مالکین سے کم نہیں ہے' افسوس اس بات کا ہے کہ بیشتر اخبارات کے مالکین یہ پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں کہ ملازمین کو مسائل میں الجھا کر رکھا جائے اور ان کا حق بھی احسان جتا کر ادا کیا جائے۔ معاشی کمزوری، بے ایمانی، بدعنوانی، رشوت ستانی کو جنم دیتی ہے۔ صحافی بھی انسان ہیں' وہ لاکھ ایماندار، دیانتدار اصول پسند کیوں نہ ہوں' اس کا اپنا گھر ہوتا ہے، جس میں چولھا بھی جلنا ہوتا ہے۔ اس کی بیوی کی خواہشات بھی پوری کرنی ہے، بچوں کو اچھے اسکول میں تعلیم دلانا ہے اور ان کے مستقبل کو سنوارنا ہے۔ اس کے لئے اخبار کے دفتر سے ملنے والی تنخواہ پر گذارہ ممکن نہیں' مجبوراً انہیں دوسرے راستے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اگر اخبارات کے ملازمین بدعنوانی کے لئے مجبور ہوتے ہیں تو اس کے ذمہ دار خود ارباب انتظامیہ ہوتے ہیں۔ ایک اخبار سے نکل کر دوسرے اخبار سے وابستہ ہونے کو بے وفائی، فریب اور کئی نام دیئے جاتے ہیں۔ اس کے ذمہ دار کون ہوتے ہیں۔ اگر ایک ہی چھت کے نیچے ایک صحافی کو یا غیر صحافتی عملے کو اس کی ضروریات کی تکمیل کا سامان مل جائے تو کوئی بھی ادارہ بدلنا نہیں چاہے گا۔

اردو صحافیوں کی اکثریت انگریزی، مقامی زبانوں کے علاوہ معاشی کمزوری کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار رہتی ہے۔ عام طور پر صحافت کا پیشہ اختیار کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو عزت، شہرت، سماجی موقف اور مرفع حالی چاہتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اردو صحافی کو عزت، شہرت اور سماجی موقف تو مل جاتا ہے مگر دولت ان کے حصہ میں نہیں آتی۔ اور بغیر دولت کے زندگی کے سفر میں قدم بڑھانا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اپنے ضمیر کو کچل کر کچھ ایسے کام بھی انجام دینے کیلئے اردو صحافی مجبور ہوجاتا ہے۔ یوں تو یہ روایت دوسری زبانوں سے وابستہ صحافیوں میں بھی عام ہے مگر اردو صحافی کا ضمیر اس لئے زیادہ زندہ رہتا ہے کہ اردو کا تعلق اس کے مذہب سے ہے اور اردو صحافیوں کی اکثریت مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتی ہے۔ دوسری زبان سے وابستہ صحافیوں کو مالی وسائل پیدا کرنے کیلئے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ اردو صحافی کو اس کیلئے کبھی کبھی لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔

ہندوستان کے چند اردو صحافتی اداروں کو چھوڑ کر باقی تمام اردو صحافتی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اتنی کم ہیں کہ دنیا کی زندگی کی تکمیل ممکن نہیں۔ گھر کا کرایہ دیتے ہیں تو راشن نہیں آتا۔ راشن آجائے تو بچوں کی فیس کیلئے پیسے کم پڑ جاتے ہیں۔ بہت سی ضروریات پر نہ چاہتے ہوئے بھی قابو پانا پڑتا ہے۔ بہت ساری خواہشات کو کچل دینا پڑتا ہے۔ اردو صحافتی ادارے اور ان کے مالکین تو بہر حال مرفع حال ہیں' اور رہیں گے مگر ان کے ملازمین کی حالت ناقابل بیان ہوتی ہے۔ اردو صحافی کو ایک دوہری زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ گھر سے نکلتے ہی ہر سطح پر اسے عزت ملتی ہے۔ معمولی لیڈر سے چیف منسٹر اور وزیر اعظم تک انہیں سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں۔ باہر کی دنیا میں وہ خوش فہمیوں اور جھوٹی تسلیوں کے رتھ پر سوار رہتا ہے۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی بچوں کی سوالیہ نگاہیں اس کی خوشیوں کو کافور کر دیتی ہیں۔ اردو صحافی بھی یہ چاہتا ہے کہ اس کے سر پر اس کی اپنی چھت اور قدم تلے اس کی اپنی زمین ہو۔

اس کے بچے بھی اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کریں' عید و تہوار خوشیوں کا دن ثابت ہوں۔ ان کی تیاری کیلئے انہیں دوسروں سے قرض مانگنے کی نوبت نہ آئے۔ یہ سب ممکن ہے بشرطیکہ صحافتی اداروں کے مالکین اس کا تہیہ کرلیں۔

اگر معاشی طور پر مستحکم صحافتی ادارے کے مالکین یا انتظامیہ اپنے ملازمین کو اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھیں ان کے مسائل کو جاننے اور حل کرنے میں دلچسپی لیں، ان کی تکلیف کو دور کرنے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کریں تو بڑی آسانی کے ساتھ اردو صحافیوں کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ اردو اخبارات اور جرائد کے ملازمین کو ان کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان کی ضروریات کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ اس کے لئے انتظامیہ کو فراخ دلی کی ضرورت ہے ساتھ ہی اپنے ملازمین کی خوشحالی اور معاشی آسودگی کے لئے کسی قدر قربانی دینے کی ضرورت ہے۔ منافع کا ایک حصہ اگر ملازمین کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردیا جائے تو اس رقم سے ملازمین کے بچوں کی تعلیمی کفالت ممکن ہے۔ بعض اخبارات سال میں ایک مرتبہ ایک مہینہ یا پندرہ دن کی تنخواہ بطور بونس بھی دیتے ہیں جو عموماً عید بقرعید کے موقع پر کام آتی ہے۔ انتظامیہ چاہے تو اپنے ہر ملازم کے سر پر چھت فراہم کرسکتا ہے۔ وہ مکانات یا فلاٹس تعمیر کرکے آسان اقساط پر اپنے ملازمین کو اس شرط پر فراہم کرسکتا ہے کہ اگر ادارہ سے ان کی وابستگی باقی نہ رہے تو وہ اس سے دستبردار ہوجائیں گے۔ اس سے نہ صرف انہیں طویل مدت کے لئے وفادار ملازمین مل جائیں گے بلکہ ذہنی تناؤ سے آزاد ہونے کی وجہ سے یہ صحافی اور ملازمین بہتر خدمات انجام دینے کے اہل ہوں گے۔ بہت سارے صحافیوں کو حکومت کی جانب سے اراضی الاٹ کی جاتی ہے مگر اس کے لئے ایکریڈیشن کا لزوم ہے۔ ایک صحافتی ادارے میں چند ایک صحافیوں کو ایکریڈیشن کارڈ جاری ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس ادارے کے بیشتر ملازمین سرکاری سہولت سے محروم رہتے ہیں۔ اگر ادارے خود یہ سہولت فراہم کردیں تو ملازمین اور ان کے ارکان خاندان تا حیات ان کے حق میں دعا گو رہیں گے۔ معاشی مرفع حالی اور تفکرات سے بے نیازی ایک صحافی کو دیانتداری کے ساتھ خدمات انجام دینے کیلئے ضروری ہے۔ معاشی تنگی اور گھریلو ضروریات، اچھے سے اچھے انسان کی ضمیر کو مردہ کردیتی ہے اور اسے آنکھ بند کرکے حرام کو بھی حلال سمجھ کر نگل جانے کے لئے مجبور کردیتی ہے۔ اردو صحافی کے سب سے زیادہ مسائل معاشی ہیں۔ اس کا اثر اردو صحافت پر پڑ رہا ہے۔ رشوت خوری کا چلن عام ہو چکا ہے۔ خبریں' تحائف یا انعام کی آڑ میں رشوت کے بغیر شائع نہیں ہوتیں۔ جانبداری اور صحافتی اقدار کی پامالی، معیار میں گراوٹ اس کا نتیجہ ہے۔ اردو صحافی اگر اپنے پیشہ میں منجھا ہوا ہے مگر معاشی طور پر بدحال ہے تو اس کی بدحالی اسے احساس کمتری کا شکار بنادیتی ہے۔ اور اردو صحافت کا معیار بھی متاثر ہوتا ہے۔ اردو صحافت ہر دور میں معاشی کسم پرسی کا شکار رہی۔ حتیٰ کہ قومی آواز جیسے اخبار کو بھی بند کرنا پڑا جسے پنڈت نہرو نے شروع کیا تھا جسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی کہ اردو اخبار کے معیار اور وسائل پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی دوسری زبان کے اخبارات پر دی جاتی رہی۔ وہ تمام اردو اخبارات ہمیشہ سے مسائل کا شکار رہے ہیں جن کے مالکین خود ایڈیٹر رہے اور جن کے وسائل بھی اخبار ہی تک محدود رہے۔

پروفیسر مصطفےٰ علی سروری نے" اردو صحافت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (اکیسویں صدی میں)" اردو اخبارات کے عملے کی کم تنخواہوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے وہ لکھتے ہیں" اردو اخبارات کے ذمہ دار اکثر اس بات کی شکایت

کرتے ہیں کہ انہیں تربیت یافتہ عملہ نہیں ملتا ہے۔ لیکن اردو اخبارات کے ملازمین کا مشاہرہ تو اس قدر پرکشش نہیں ہوتا کہ نوجوان نسل اور طلباء اردو اخبارات میں ملازمت اختیار کرنے تربیت حاصل کریں اور اب اردو یونیورسٹی کی جانب سے صحافیوں کے تربیتی دو سالہ ایم سی جے کورس کی تکمیل کے بعد بھی طلباء کو 3 ہزار سے بڑھ کر تنخواہ نہیں آفر کی جاتی ہے۔ اردو اخبارات کے ایک سینئر صحافی کی تنخواہ کا اگر ہم کسی سرکاری دفتر کے ملازم سے تقابل کریں تو 18 تا 20 ہزار کی تنخواہ جہاں اردو اخبارات میں سینئر ترین سب ایڈیٹر یا رپورٹر کو دی جاتی ہے اتنی تنخواہ تو ایک سرکاری دفتر کا کلرک کماتا ہے۔ اردو اخبارات کے ملازمین کی تنخواہیں تو کم ہوتی ہیں مگر ضروریات کے لحاظ سے وہ کسی بھی دوسرے فرد سے الگ نہیں ہوتے۔ اردو کے معیاری اخبارات سمجھے جانے والے روزناموں میں بھی سب ایڈیٹرس اور رپورٹرس کی ابتدائی تنخواہیں اتنی کم رہتی ہیں کہ ان کا تصور محال ہے۔

اردو اخبارات میں کام کرنے والے افراد کی اکثریت اپنی ضروریات کی تکمیل زائد آمدنی کے حصول کیلئے کہیں نہ کہیں دوسرا ذریعہ معاش ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ کوئی سینئر سب ایڈیٹر آل انڈیا ریڈیو کے حالات حاضرہ کے پروگرام کیلئے اسکرپٹ لکھتا ہے تو کوئی دوردرشن کی اردو خبروں کیلئے ترجمہ کا کام کرتا ہے' کوئی سب ایڈیٹر پی آئی بی (PIB) میں اردو ترجمہ کا کام کرلیتا ہے۔ اسکے علاوہ بعض اردو اخبارات کے ملازمین خانگی ترجمے کا کام بھی کررہے کچھ نہ کچھ آمدنی کے ذرائع پیدا کرلیتے ہیں۔ بعض سب ایڈیٹرس کسی مسلم تنظیم جماعت یا ادارے میں پبلسٹی آفیسر یا پبلک ریلیشن آفیسر کا کام کرلیتے ہیں۔ یقیناً اردو اخبارات سے وابستہ افراد کی دیگر اداروں سے کسی نہ کسی طرح کی وابستگیاں ان کی غیر جانبداری اور انداز کار کو متاثر کرتی ہیں۔ اردو اخبارات کے ملازمین کی قابلیت کا تجزیہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ عام طور پر اردو زبان سے واقفیت یا ترجمہ کرنے کی صلاحیت کو ہی بنیاد بنا کر انہیں اردو اخبارات میں ملازمت مل جاتی ہے۔"

اردو صحافت اور حکومت کا رویہ:

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرسکے کہ کوئی بھی اخبار بالخصوص اردو اخبار یا ٹی وی چیانلس صد فیصد غیر جانبدار ہیں۔ ہر اخبار کا کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے خفیہ یا علی الاعلان تعلق رہتا ہے۔ بعض اخبارات تو کسی سیاسی جماعت کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ اور قارئین کے اعتماد سے محروم رہتے ہیں۔ بعض اخبارات حق و صداقت کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ سچائی بیان بھی کرتے ہیں مگر جب ان کے اپنے مفادات متاثر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے تب برائیوں اور سماجی بگاڑ کے ذمہ داروں کو بے نقاب کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کرلیتے ہیں۔ حکومت کے لئے چاہے وہ کسی بھی جماعت کی کیوں نہ ہو اردو اخبارات اور اردو ٹی وی چیانلس کو محدود طور پر ہی سہی اشتہارات کے نام پر امداد دینا ضروری ہے۔ سرکاری اشتہارات اخبارات کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کسی اخبار کو کمزور کرنا ہوتا ہے تو حکومت کسی نہ کسی الزام کے تحت اس اخبار کو جاری کئے جانے والے اشتہارات مسدود کردیتی ہے۔ اور اسے اپنے حق میں کرنے کے لئے بلیک میلنگ کا رویہ بھی اختیار کرلیا جاتا ہے۔ بعض اخبارات کو سرکولیشن کم ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔ یہ دراصل ان کی

زباں بندی کا معاوضہ ہوتا ہے۔اشتہارات کی اجرائی مرکزی حکومت کے زیرانتظام ادارے DAVP کے توسط سے اور ریاستی حکومت اطلاعات وتعلقات عامہ کے محکمہ کے توسط سے جاری کرتی ہے۔جن اخبارات کا سرکولیشن مستند طور پر سب سے زیادہ ہوتا ہے ان اخبارات کے مقابلہ میں بعض ایسے اخبارات کو زیادہ اشتہارات جاری کردیئے جاتے ہیں جو چھپتے ضرور ہیں مگر صرف سرکاری محکموں تک ان کی اشاعت محدود رہتی ہے۔بارہا اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی مگر بیوروکریسی اس قدر راشی ہے کہ اثر کم ہی ہوتا ہے۔جہاں تک DAVP کی جانب سے جاری کئے جانے والے اشتہارات کا تعلق ہے 04-2003ء میں 181 اخبارات کو 4.82 کروڑ روپے کے اشتہارات جاری ہوئے تھے جبکہ 12-2011ء میں 458 اخبارات میں 16.89 کروڑ روپئے کے اشتہارات جاری کئے گئے۔10 برس پہلے فی اخبار دو لاکھ 66 ہزار 298 روپے کے اشتہارات مرکزی حکومت نے جاری کئے تھے۔10 برس بعد فی اخبار 3 لاکھ 68 ہزار 777 روپئے کے اشتہارات جاری ہوئے اس طرح سے 10 برس کے عرصہ میں اوسطاً فی اخبار ایک لاکھ دو ہزار روپئے کا اضافہ ہوا ہے جسے اس لئے اضافہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ 2003 اور 2004ء میں روپئے کی قدر و قیمت 12-2011 کے روپئے کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں 5 گنا زیادہ تھی۔مثال کے طور پر 2003ء میں دس گرام سونے کی قیمت 5,430 روپے تھی اور 2011ء میں 10 گرام سونے کی قیمت 30,050 روپئے تھی۔

ریاستی حکومتوں کی جانب سے بھی اشتہارات کی اجرائی کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ریلویز،ملٹری اور کئی اداروں سے اخبارات کو ان کی اشاعت اور بعض اوقات عوامی مقبولیت کے لحاظ سے اشتہارات جاری ہوتے ہیں۔

اشتہارات حاصل کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ان دنوں Advertorial کا رواج عام ہے۔اسے پیڈ نیوز کا نام بھی دیا جارہا ہے۔مختلف موضوعات پر خصوصی ضمیمے نکالے جاتے ہیں جس میں مشتہرین کو ترغیب دی جاتی ہے کہ اشتہار کی اجرائی پر ان کے ادارے پر ادارتی فیچر بھی شائع کیا جائے گا۔عیدین بالخصوص رمضان المبارک کے موقع پر چاندرات سے پہلے ہی سے اخبارات میں حلیم،ہریس سے لے کر کپڑے کی دوکانوں،فٹ ویرس،ہوزریز کے اشتہارات کی بھرمار ہوجاتی ہے۔یہ ایک مہینہ اردو اخبارات کے لئے برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ ہوتا ہے جس میں کمرشیل کے ساتھ ساتھ مختلف خیراتی اداروں،تعلیمی اداروں،مساجد کی امداد وعطیات کے لئے بھی اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں۔بقرعید سے پہلے بھی مختلف شورومس کے علاوہ چرم قربانی کی اپیلیں شائع ہوتی ہیں۔اگرچہ کہ یہ رعایتی شرح پر شائع کی جاتی ہیں۔میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر اظہار عقیدت کے ساتھ ساتھ تجارتی مقاصد کے لئے اچھے خاصے اشتہارات شائع ہوتے ہیں۔ماہ محرم میں مجالس عزا کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں جن سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ایک دور تھا جب فلمی اشتہارات اردو اخبارات کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھے۔یہ اشتہارات گذشتہ دہائی سے تقریباً ختم ہوچکے ہیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جارہا ہے کہ آن لائن ایڈیشنس کی وجہ سے اردو صحافت کو نقصان پہنچ رہا ہے جو خام خیالی ہے۔ آج وہ اخبارات جن کے آن لائن ایڈیشن ہیں یا جن کی اپنی ویب سائٹس ہیں انہیں آن لائن ایڈیشن کے اشتہارات مل رہے ہیں۔تعداد اشاعت میں کمی ہوسکتی ہے مگر اخبارات کی رسائی دنیا کے ہر گوشہ تک ممکن ہوگئی ہے جس کی وجہ

سے غیر مقیم ہندوستانی آن لائن ایڈیشن کو ترجیح دیتے ہیں اور کئی اخبارات نے آن لائن ایڈیشن کی بھی خریداری مقرر کر دی ہے۔ سیاست کے آن لائن ایڈیشن پر کافی اشتہارات نظر آتے ہیں جس کی شرح بھی اچھی خاصی ہے۔ اس طرح کل تک اردو اخبارات مخصوص علاقوں تک محدود تھے' آج دنیا کے کسی بھی حصہ میں رہنے اور بسنے والے اردو داں افراد آن لائن ایڈیشن کے ذریعہ خبروں تک رسائی بھی حاصل کرتے ہیں اور ان اخبارات کو مالیہ فراہم کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔

بیشتر اردو اخبارات نے ویب سائٹ پر اپنے انگریزی ایڈیشن بھی جاری کئے ہیں جس کی بدولت غیر اردو داں افراد بھی ان اخبارات سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک مثبت پہلو ہے۔ جہاں تک کچھ اور مسائل کا تعلق ہے ان میں قابل اردو داں صحافیوں کی گھٹتی ہوئی تعداد لمحہ فکر ہے۔ اگرچہ کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ جرنلزم سے کافی طلبہ فارغ التحصیل ہو رہے ہیں تاہم اردو صحافت سے وابستہ ہونے والوں کی تعداد کم ہے۔ اردو صحافی کا سب سے بڑا المیہ یا کمزوری یہی ہے کہ انگریزی اور مقامی زبانوں میں اسے عبور حاصل نہیں رہتا۔ وہ صحافی جو اردو کے علاوہ انگریزی اور مقامی زبانوں میں عبور رکھتے ہیں وہ کامیاب ہیں۔ صرف اردو کی بناء پر صحافتی میدان میں کامیابی ممکن نہیں۔ بیشتر دینی مدارس کے طلبہ صحافت سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ، سوشیل میڈیا کا استعمال کرنے لگے ہیں اگر انہیں اچھی انگریزی اور مقامی زبانیں سکھائی جائیں صحافتی تقاضوں کی تکمیل کرنے کے لئے تربیت دی جائے تو یہ اردو صحافت کے علمبردار ثابت ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ اردو صحافت آج ہر عصری وسیلے کے استعمال کی اہل ہے مگر یہ بدبختی ہے کہ اردو اخبارات کے بیشتر صحافی ان وسائل کا استعمال نہیں کر پاتے۔ اصولی طور پر انگریزی یا دیگر زبان کے صحافیوں کی طرح اردو اخبارات کے ہر سب ایڈیٹر، نیوز ایڈیٹر کو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال کی ٹریننگ دی جانی چاہئے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ بیشتر اہم اخبارات کے سب ایڈیٹر اور ایڈیٹرس کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کا استعمال کرنا معیوب سمجھتے ہیں اور یہ ذمہ داری شعبہ کمپیوٹر کے حوالے کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سارا مواد جو صحافتی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہوتا ہے وہ ان کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے جس کی وجہ سے اردو اخبارات میں وہ خبریں مضامین یا تبصرے شائع ہونے سے رہ جاتے ہیں جو دوسری زبان کے اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔

بیشتر اردو اخبارات کا سب سے بڑا مسئلہ اسٹاف کی کمی ہے۔ چند بڑے اخبارات کے سوا اکثر و بیشتر اخبارات میں ایک صحافی کو سب ایڈیٹر کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں اور رپورٹر کے بھی۔ وہ بیک وقت اسپورٹس رپورٹر بھی ہے اور کرائم رپورٹر بھی۔ سیاسی جلسوں کی رپورٹنگ بھی وہی کرتا ہے۔ مذہبی جلسوں میں بھی اسے ہی شریک ہونا پڑتا ہے۔ خود ہی خبریں تیار کر کے دینی پڑتی ہیں۔ انگریزی اور دوسرے اخبارات کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہر شعبہ کے لئے علیحدہ رپورٹر اور نیوز ایڈیٹر ہوتے ہیں۔ کام کا بوجھ معیار کو گھٹا دیتا ہے۔ جس کا اثر اخبار اور مجموعی طور پر اردو صحافت پر پڑتا ہے۔

....

چیف ایڈیٹر گواہ اردو ویکلی، حیدرآباد موبائل:09395381226

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

دربھنگہ میں ادبی صحافت

(''تمثیل نو'' کے حوالے سے)

زبان وادب کے ارتقاء میں ادبی جریدے کی اہمیت وافادیت ناگزیر حقیقت ہے۔ اس کے ذریعہ نہ صرف ادب کی توسیع واشاعت کا معرکۃ الآرا شغل انجام پذیر ہوتا ہے بلکہ عصری ادب کا سرمایہ قاری کے اذہان تک بہ آسانی منتقل ہو کر زمانہ مستقبل میں محفوظ ہونے کی ضمانت بن جاتا ہے۔ یہ آرگن کی شکل میں ادیب وفنکار کو قاری کے روبرو کرتا ہے اور اس کی آبیاری کے مواقع مرحمت فرماتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ادب نوازوں کی مختصر سے مختصر اشارات کی اساس پر تخلیق کار کی سمتیں متعین کرتا ہے۔ اس طرح رسائل وجرائد تخلیقی اور تنقیدی صلاحیت سے آراستہ ذہنوں کے افکار وخیالات کی آماج گاہ ہوتے ہیں۔ مبتدیان کی ادبی پرورش کا مقدس کام رسائل وجرائد کے ذریعہ ہی ہوتا رہا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ادبی صحافت کے ذریعہ شہرہ آفاق منازل پر کمندیں ڈالی جاسکتی ہیں۔ ''جام جہاں نما'' سے آج تک نکلنے والے تمام جرائد اپنی پوشیدہ اور واضح مقاصد کے حصول کی خاطر وجود میں آتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو دوام حاصل ہے اور بہت سے گمنامی کا حصہ بن گئے ہیں۔ جن رسائل کو بقا حاصل ہے اس کے طریقہ کار میں نئے تخلیق کار کی تلاش وجستجو اور ان کے افکار وخیالات کو مناسب نمائندگی کا جذبہ موجود ہے۔ مذکورہ حوالے سے رسائل وجرائد کی گفتگو میں ''تمثیل نو'' کو معیار ومقام حاصل ہے۔

رسائل وجرائد کے ذریعہ دربھنگہ میں ادبی صحافت کی تاریخ قدیم ہے۔ یہاں سے کئی رسالے شائع ہوئے اور ان میں سے چند کو ملک گیر پیمانے پر مقبولیت بھی ملی۔ لیکن ان رسائل کو بہت دور تک جانے کا موقع نہیں ملا۔ اکیسویں صدی آتے آتے دربھنگہ اردو شعر وادب کا گہوارہ بن چکا ہے۔ فی الوقت یہاں سے ''تمثیل نو'' (مدیر: ڈاکٹر امام اعظم)، ''جہان اردو'' (مدیر: مشتاق احمد)، ''الہدیٰ'' (مدیر: شکیل سلفی) اور ''دربھنگہ ٹائمس'' (مدیر: منصور خوشتر) رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ رسالے اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرداں ہیں۔ یہاں ''تمثیل نو'' کی کارکردگی اور اس کے اقرار واعتراف کا جائزہ اس تحریر کا مدعا ہے جس سے دربھنگہ میں موجود ادبی صحافت کا ایک گوشہ روشن ہو سکے گا۔

''تمثیل نو'' کے اولین شمارہ کا اداریہ اس کے عزائم کا پتہ دیتا ہے۔ اداریے کا یہ جملہ دیکھئے کہ ''ادبی سطح پر ایک ادیب یا شاعر کی یہی ذمہ داری ہے کہ وہ اچھا لکھے، لیکن کیا اس حقیقت سے انکار کی گنجائش ہے کہ فن پارہ کو منظر عام پر لانے کے لئے ادبی جریدہ کا زندہ ہونا لازمی ہے۔'' اس اولین شمارے میں مظہر امام، پروفیسر شاکر خلیق، مانی فاروقی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، اقبال انصاری، نظیر صدیقی، رؤف خیر کی تحریروں سے اس کے نقش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اب تک اس کے ۲۸# شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جدید تر شعری وادبی رجحانات یا ترجمان ''تمثیل نو'' نے تمام شماروں میں نت نیا کر دکھانے کا جو جذبہ پیش کیا ہے وہ قدر ومرتبہ کا حقدار ہے۔ اس ادبی رسالہ کا اختصاص

پہلوؤں کا ذکر یہاں نامناسب نہیں ہونا چاہئے۔

''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے اس کے اداریے اختصار اور جامعیت کی مثال ہیں۔ ان میں متفرق موضوعات کی پیش کش نے خوب متاثر کیا ہے۔ ان کے اداریوں نے چونکایا بھی ہے اور سوچنے کو مجبور بھی کیا ہے۔ تلفظ کے بگاڑ کا مسئلہ ہو یا اردو اخبار و جرائد خرید کر نہیں پڑھنے کا معاملہ، اردو کی زبوں حالی کا مسئلہ ہو یا اس زبان کی دوسری زبانوں کے ادباء کے درمیان پسندیدگی، سفر کی روداد ہو یا پھر ثقافتی موضوعات، ان کے اداریے جدت سے بھرے ہوتے ہیں۔ ادبی و ثقافتی پروگرام کی خبریں منفرد انداز میں اس رسالے میں ترتیب پاتی ہیں۔ ''وفیات'' کے تحت اردو آبادی سے رخصت ہوئے اہل قلم کا ذکر اس سلیقے سے کیا جاتا ہے کہ مرحومین کے تعلق سے اہم اطلاع بہم ہو جاتی ہے اور سوگواری کا احساس دعا کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اداریہ کی نمایاں خوبی مدیر کا صاف ستھرا ادبی ذوق اور استفسار ہے۔

اس رسالہ کی مستحکم شناخت اس کے خاص نمبر اور گوشے ہیں۔ ''مغربی بنگال میں ادبی پیش رفت اکیسوی صدی کے تناظر میں''، ''ہندوستانی فلمیں اور اردو''، ''اردو کا ہم عصر ادیب، ۱۹۸۰ء کے بعد''، ''سہرا۔ خصوصی مطالعہ''، ''اکیسویں صدی میں اردو: نشیب و فراز''، ''اردو ادب اور رجحان ساز (شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، مظہر امام)''، ''تاریخ ادبیات عالم: عہد ساز پیشکش''، ''ترقی پسندی کیا زوال پذیر ہو چکی ہے''، ''پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار''، ''اردو ناول کا پس منظر اور پیش منظر'' اور ''شہر کولکاتا کا خصوصی مطالعہ'' اس جریدہ کے وہ اختصاص ہیں جس پر ادبی دنیا میں ان کو پذیرائی ملی ہے۔ اس کے علاوہ گوشہ وہاب قیصر، خورشید اکبر، سید منظر امام، سید تقی عابدی، منصور عمر، مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، وسیم بریلوی، یٰسین احمد وغیرہ کے حوالے سے شخصیات کی کارکردگی اور نمایاں خدمات کو اجاگر کیا ہے۔ یہ کاوشیں بھی قابل قدر ہیں۔

''تمثیل نو'' میں کئی مضامین / تحریریں قسط وار شائع ہوئی ہیں۔ طویل مضامین کی اشاعت سے یہ عقدہ کھلا ہے کہ یہ رسالہ اپنے قارئین کے ذوق کی تسکین میں تسلسل بنائے رکھنے میں کامیاب ہے۔ ''ایک لہر نئی نئی'' (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا طویل مضمون)، ''یہ سرگذشت ہی ہے'' (سید منظر امام کی خودنوشت)، وغیرہ ایسی تحریریں ہیں جن کی بنت میں تمثیل نو کی محنت اور قاری سے جڑے رہنے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اس جریدے میں تاریخی اور ثقافتی مضامین بھی اچھی تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین کے ذریعہ ماضی کو جاننے میں فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ مقامی تاریخ و ادب کے حوالے سے بھی یہاں مضامین ملتے ہیں جن سے مدیر کی اپنے وطن سے وابستگی کا جذبہ عیاں ہے۔

اس رسالے نے بحث و مباحثہ کے دریچے کھولے ہیں۔ فکر اقبال پر تنقیدی نظر (حاجی مشرف عالم) کا مضمون شائع ہوا تو ایک زبردست بحث چھڑی۔ قارئین و ادباء نے اس میں جم کر حصہ لیا۔ افسانہ ''بیل'' (نگار عظیم) شائع ہوا تو یہ بھی اپنے پیچھے بحث کا کارواں لے آیا۔ اس رسالہ میں افسانوی انتخاب عمدہ ہوا کرتا ہے۔ نئے پرانے افسانہ نویس اس بزم میں شامل ہوتے ہیں۔ اقبال انصاری، عفت موہانی، جوگندر پال، مشتاق احمد نوری، نفیس بانو شمع، مقصود الٰہی شیخ، ابواللیث جاوید، نگار عظیم، اقبال حسن آزاد، مظفر شعیب ہاشمی، کلیم ضیاء، مجیر احمد آزاد، نقش بند قمر نقوی،

سید ظفر ہاشمی، نعیمہ ضیاء الدین، وصیہ عرفانہ وغیرہ افسانہ نگار تمثیل نو کی کہانی دنیا میں شامل رہے ہیں۔ یہاں یہ بات مجھے بہت اچھی لگی کہ مذکورا اسمائے گرامی کے افسانے پر قائین کے خیال پارے اس رسالے کی زینت بنے ہیں۔ یہ بھی اس رسالے کی اہمیت وافادیت کو ظاہر کرتا ہے۔

''تمثیل نو'' کا شعری حصہ کافی گھٹا ہوا اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ مدیر موصوف کا شعری ادب سے حد درجہ وابستگی ہے۔ امام اعظم اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''قربتوں کی دھوپ'' اور ''نیلم کی آواز'' میں زندگی کی سچائیاں ایسے کروٹ لے رہی ہیں کہ اس سے

قربتوں میں بھی تمازت پیدا ہوگئی ہے۔ صوت واحساس کی سرزمین، سرسبز وشاداب ہے ان کی شاعری میں۔ ان کے یہاں جدید تر شاعری کرنے کی خصلتیں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ شاعری سے شغف کی وجہ سے اس رسالے کا شعری حصہ وقیع اور متاثر کرنے والا ہوتا ہے۔ ہر شمارے میں مخصوص شاعر کو جگہ دینے کا سلسلہ بھی عمدہ ہے۔ شاعر کے مختصر کوائف، شعری محاسن کے بیان کے ساتھ ساتھ شعری انتخاب شامل ہوا کرتا ہے۔ یہاں بھی ان کی نگاہ نئے چہرے کی تلاش پر لگی رہتی ہے۔ غزلیں یہاں وافر تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔ غزلوں کی وسیع دنیا میں سبک، متاثر کن عصری، کلاسیکی بھی طرح کے رنگ موجود رہتے ہیں۔ نظمیں بھی اس جریدے میں شامل ہوتی ہیں مگر اس کی تعداد تھوڑی کم ہوتی ہے۔ شعری حصہ کے مطالعہ سے یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ اردو کے معروف شعراء کے کلام یہاں شائع ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز قائم ہے۔

''نظر اپنی اپنی'' کے تحت کتابوں پر تبصرے کو جگہ دی جاتی ہے۔ تبصرے کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ ان میں زیادہ تر نئی کتابیں ہوتی ہیں جن کے محتویات سے مبصرین قارئین کو آگاہ کرتے ہیں۔ تمثیل نو کے مبصرین علم و ادب کے شناسا اسمائے گرامی ہیں۔ ''راہ ورسم'' کے تحت قارئین کے خطوط میں ان کے جذبات آئینہ ہوا کرتے ہیں۔ یہ وہی حصہ ہے جو قاری کے لئے پوری طرح وقف ہوا کرتا ہے۔ یہیں مباحث ہوتے ہیں اور نظر ونظریہ پر کھل کر رائے بنتی ہے۔ یہ حصہ بے حد سودمند ہوتا ہے کہ قاری کی پسند وناپسند کا اظہار یہ سامنے آتا ہے۔ تمثیل نو میں طویل ترین مراسلے شائع ہوئے ہیں اور اس کے ذریعہ عالمی اردو آبادی کے قارئین نے اپنی بے باک رائے بھی رکھتے ہیں۔

اس جریدے نے جس انداز اور جوش وولولے کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا ہوا ہے وہ اس کی ضمانت ہے کہ اس رسالے میں زندہ رہنے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ انہوں نے ادبی دنیا میں اپنا وجود منوالیا ہے۔ نت نئے تجربے اور نئے سے نئے کی تلاش میں سرگرداں یہ رسالہ دربھنگہ کی سرزمین سے نکلنے والا عالمی اردو آبادی تک رسائی حاصل کرکے اپنی بھرپور موجودگی کا احساس دلا رہا ہے۔ جب بھی رسائل وجرائد کے حوالے سے ادبی صحافت کی تاریخ رقم کی جائے گی ''تمثیل نو'' کی خدمات کو نظر انداز ہرگز نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆

خاں صاحب کی دیوڑھی محلہ: فیض اللہ خاں، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴ (بہار) موبائل: 9430898766

ڈاکٹر فیاض احمد وجیہہ

ادبی صحافت: آنچلک ڈسکورس اور اداریہ نویسی

(بہار کے عصری رسائل کا خصوصی مطالعہ)

صحافت اور ادبی صحافت کے معنی کیا ہیں؟

ادبی صحافت کی شعریات/ جمالیات کیا ہے؟

ان سوالات کے دروبست میں ہی ادبی صحافت کی شعریات/ جمالیات کی تحدید کا تصور اور معنی و مفہوم کہیں نہ کہیں پوشیدہ ہے۔ لفظ اور لفظ کی تخلیقی خواہش کے بعد میں ادبی صحافت کا بنیادی فلسفہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ حالاں کہ صحافت اپنی عین فطرت میں تخلیقی/ غیر تخلیقی فن نہیں بلکہ Given Reality اور Interpreted Reality کی انفرادی تخلیقی خواہش ہے۔ صحافت اور ادبی صحافت کے ظاہری اصول و آداب یکساں ہیں۔ لیکن ادبی صحافت کی شعریات کی تحدید یوں لازم ہے کہ اس کے بغیر ہم اس کے تخلیقی تحرک کو پیش نہیں کر سکتے۔ دراصل ادبی صحافت میں تخلیقی تحرک/ تخلیقی صیغہ کی شناخت کا عمل ادب اور نقد ادب کی اساس/ جمالیات ہے۔ ادبی صحافت ایک ہمہ گیر اور بین علومی متن کی تشکیل و تعبیر کا نام ہے کہ اس عمل میں وہ اپنے معاشرہ کی سائکی اور اس کے ردعمل کو شامل کرتا ہے۔ اس طرح دیکھیں تو ادبی صحافت کی شعریات کی تشکیل میں فوری طور پر ہمارے ذہن میں یہ نکات روشن ہوتے ہیں:

- کوئی بھی ادبی جریدہ/ رسالہ عصری ادب کے تخلیقی تحرک کو کن معنوں میں قائم کرتا ہے؟
- کلاسکی متون کے تخلیقی تحرک/ معنوی افق کو اس کے عصری سیاق میں کس طرح پیش کرتا ہے؟
- کیا وہ اپنے لکھنے والوں کو تخلیقی/ ادبی آزادی فراہم کرتا ہے؟
- کیا وہ اپنے قارئین کو ادب کے نئے تخلیقی جزیروں میں لے جاتا ہے۔ یعنی ہمارے فکر و خیال میں ارتعاش پیدا کرتا ہے؟
- کیا اس کے مشمولات/ مندرجات ادبی معنوں میں Erotic ہیں؟
- کیا وہ علوم و فنون کے جدید علاقوں کی سیاحت میں 'اوڈیسی' کا استعارہ خلق کرتا ہے (؟) یا فقط شعر و ادب کی پیشکش/ فہرست سازی کو ادبی صحافت کا جوہر تصور کرتا ہے (؟) جبکہ ادب کی شعریات/ مبادیات بین علومی اکتشاف کی رہین ہے اور یہی اس کا تخلیقی/ ادبی مشاہدہ ہے۔
- حمد اور نعتیہ شاعری کے متوازی بھارت کے اور دوسرے مذہبی عقائد کی ترجمانی کا خیال رکھا جاتا ہے؟
- کسی مخصوص خطہ/ جغرافیہ کی تحدید میں ادبی صحافت کی شناخت کے وسائل کیا ہو سکتے ہیں؟

—— کیا اس کے لیے کسی نوع کے لسانی تشکیلات کی پہچان کی جانی چاہیے؟

—— کسی مخصوص تہذیب و معاشرت کے نقوش کی شناخت کی جانی چاہیے؟

—— ادب کے علاقائی جزیروں/ مخصوص ثقافت کی تلاش کا عمل کوئی تخلیقی/ ادبی جواز رکھتا ہے؟

ہم ان نکات میں اپنے طور پر اضافہ بھی کر سکتے ہیں مثلاً:

- کیا اب تک کسی عصری رسالہ نے جدید علمیات اور تنقیدات کے باب میں مستعمل اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ کا کوئی سلسلہ اپنے قارئین اور طلباء کے لیے شروع کیا ہے؟ کہیں یہ تو نہیں مان لیا گیا کہ ادب کے قارئین تربیت یافتہ ہیں۔

—— کیا رسائل/ادبی جرائد اپنے مشتملات/مندرجات کے حواشی میں اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ قارئین کی فہم و تعبیر کی ادبی تربیت بھی ہو۔

—— اگر ترتیب کاری کوئی ادبی وظیفہ ہے تو ناصر عباس نیر کی مرتبہ کتاب 'ساختیات: ایک تعارف' کا حوالہ ناگزیر ہے کہ اس میں ساختیات کی اصطلاحات کو الگ سے ایک وضاحتی فرہنگ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

- ادب کے بنیادی اصول و نظریات کے تعارف کا کوئی باقاعدہ سلسلہ ہمارے ہاں ہے کہ اس سے کلاسکی متون کی بازخوانی کو ممکن بنایا جا سکے؟ کیا دو چار صفحات اس کے لیے مختص نہیں کیے جا سکتے؟
- کیا تخلیقی ادب کا تجزیہ کسی رسالے کا داعیہ ہے؟
- ہمارے مطالعہ کی میز پر جو ادبی جریدہ/رسالہ ہے اس کا کوئی Suggestive End ہے؟
- مدیر/مجلس ادارت کی ادبی اور تخلیقی شخصیت کی وجہ سے رسالہ Centripetal بن پایا ہے؟

—— کیا Centripetal Tendency آنچلک ڈسکورس کی عین فطرت نہیں ہے؟

—— کیا Group Centrism کے تصور میں علاقائی ادبی صحافت ایک بڑے لسانی/ادبی ثقافت کی تشکیل کا عمل نہیں ہے؟

ادبی صحافت بعض ایسی باتوں کے بغیر کتنا ہی معیاری ادب پیش کرے وہ صحافت کی تخلیقی ذمہ داری سے آزاد تصور کیا جائے گا۔ ان باتوں پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی صحافت بالخصوص عصری اردو صحافت میں اس کی شعریات کا کوئی واضح فلسفہ موجود نہیں ہے۔ یہاں جن متعلقات/استفہام کو اس کی شعریات کا حوالہ بنایا گیا ان میں سے کئی عصری اردو صحافت کے متعلقات ہو سکتے ہیں۔ لیکن شعر و ادب کی خانہ بندی میں رسائل بالعموم ایک آرگن کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس لیے رسائل و جرائد کی ترتیب کاری ادبی صحافت کی جمالیات سے زیادہ 'ادبی نظریات' کی شدت پسندی کو قائم کرتے ہیں۔

جہاں تک کسی علاقائی/آنچلک ادبی صحافت کا سوال ہے تو اس باب میں بھی ہمارے پاس کوئی ادبی اصول و نظریہ نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم مقام اشاعت کی بنیاد پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی صحافت کی تاریخ میں اس جگہ کی خاص اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ لسانی تشکیلات کی بات کی جا سکتی ہے لیکن یہ تو کسی مخصوص تخلیق کار کی اپنی تخلیقی خواہش بھی ہے۔ میتھلی، بھوجپوری، اودھی اور بعض ایسی ہی لسانی ثقافت کے علاوہ مقامی بولیاں ہیں۔ کیا ان کی موجودگی میں واضح طور پر اردو کی ادبی صحافت کو مقامیت/علاقائیت کے سندربھ میں قائم کیا جا سکتا ہے؟ اردو ایسی زبان/لسانی ثقافت کی تخصیص/تحدید بالخصوص صحافت کے شعبہ میں درست ہے؟ یہ سوال بھی اہم ہے۔ عام طور پر

کسی ادبی جریدہ کی فہرست سازی بھی اس نوع کی نہیں ہوتی کہ ایک خاص علاقہ کی پہچان کو بنیاد بنایا جائے۔ گویا مقام اشاعت کو ایک ادبی مرکز کے طور پر دیکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور اس تعلق سے اس کی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہی جانا چاہیے۔ مظہر امام نے 1959ء میں 'صنم' کے بہار نمبر (مئی 1959ء) کی اشاعت پر ادب اور علاقائیت کے سوال کو اُٹھایا تھا۔ اس باب میں ان کا بنیادی نکتہ یہ تھا:

''جہاں اردو کی ترقی اور ترویج واشاعت میں دکن، دہلی اتر پردیش اور پنجاب کی خدمات بیش از بیش ہیں، وہیں اردو کی ترقی میں بہار کا حصہ بھی کم نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اردو زبان وادب کی ترقی مختلف علاقے کے ادیبوں اور شاعروں کی مرہون منت ہے۔ اس لیے اس ضمن میں اپنے صوبے کی عظمت اور برتری تسلیم کرانے کی کوشش آج کے دور میں مستحسن نہیں سمجھی جائے گی۔ اس زمانے میں کسی زبان یا ادب سے متعلق صوبائی پیمانے پر کوئی خاص نمبر شائع کرنا، میری رائے میں مناسب نہیں۔ میں نے اب تک کسی ادبی رسالے کا 'یوپی نمبر' 'پنجاب نمبر' 'حیدرآباد نمبر' نہیں دیکھا۔ پھر بہار نمبر کیوں؟'' (آتی جاتی لہریں، ایم آر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی، 2000ء، ص: 46-245)

اس سوال کو ردو بدل کے ساتھ یہاں بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نوع کے سوال کو قائم کرتے ہوئے مقامی اور علاقائی تشخص کے تصور کی توسیع بھی کی جانی چاہیے کہ آنچلک ڈسکورس میں یہ رویہ احساس برتری/کمتری سے زیادہ اردو کی ادبی کائنات میں اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش سے عبارت ہے اور اس سے کہیں زیادہ یہ ایک نوع کی تاریخ نویسی ہے۔ مظہر امام نے تاریخ نویسی کے اس ادبی رجحان کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ عمل مستحسن نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے سوال کا جواب بھی دینے کی کوشش کی:

''انجم مان پوری مرحوم نے جن دنوں 'ندیم' گیا کے 'بہار نمبر' شائع کیے، اس زمانے میں اہل بہار کے احساس کمتری کا ایک جواز ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جو حضرات 'اہل زبان' ہونے کے مدعی تھے، وہ صوبہ بہار کے لکھنے والوں کو عام طور پر آنکھ نہیں لگاتے تھے۔ پھر بہار میں ادبی جرائد کی کمی بلکہ 'عدم موجودگی' نے یہاں کے قلم کاروں کو آگے بڑھنے اور اپنے جوہر دکھانے کے اسباب مہیا نہیں کیے تھے۔'' (ایضاً، ص: 146)

ان کے معروضات سے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کسی مخصوص علاقہ کی ادبی صحافت یعنی ادبی جرائد کی ترتیب کاری کے طفیل وہاں کے قلمکاروں کو اپنا تخلیقی جوہر دکھانے کا وسیلہ میسر آتا ہے اور اسی تسلسل میں وہ مین اسٹریم ادب کا ادیب تصور کیا جاتا ہے۔ ہاں یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں لیکن اس میں سچائی ضرور ہے۔ اس لیے اردو کی ادبی صحافت میں علاقائی شناخت کو جزوی طور پر نشان زد کرنے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ مظہر امام اس جزوی صداقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے اس کی وجہ شاید ان کی اپنی تخلیقی شخصیت ہے۔ انہی کے لفظوں میں:

''ندیم کا آخری 'بہار نمبر' 1940ء میں شائع ہوا تھا۔ گذشتہ بیس سال کے عرصے میں حالات بدل گئے ہیں۔ اب بہار دوسرے صوبوں سے الگ کسی 'جزیرہ' کی حیثیت نہیں رکھتا۔'' (ایضاً، ص: 246)

ان کی یہ بات شاید صداقت پر مبنی ہے لیکن کیا یہ وہی زمانہ نہیں ہے جب خود مظہر امام اردو کے ادبی افق پر پہچانے

گئے/تسلیم کیے گئے؟ یہاں اختلاف برائے اختلاف نہیں۔ مدعا بس اتنا ہے کہ علاقائی شناخت سے احساس کمتری/ برتری کو کوئی نسبت نہیں ہونی چاہیے۔ دراصل کسی لسانی ثقافت/ادبی مرکز اور مرکزیت کے استحکام کے لیے علاقائی صداقتیں اور چھوٹی چھوٹی ثقافتیں اپنا رول ادا کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:

''کیا مدیران 'صنم' کو خوشی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ 'صنم' سے بہتر کوئی اردو ماہنامہ پٹنہ کے محلّہ 'سبزی باغ' سے شائع نہیں ہوا؟'' (ایضاً،ص:247)

یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ 'صنم' کہاں سے شائع ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ کیا وہ سبزی باغ سے شائع ہو کر ادبی دنیا میں اپنی شناخت کا تخلیقی/ادبی جواز تلاش کر پایا؟ اس بات کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی ادبی افق کی توسیع پسندی میں ہماری شدت پسندی کو دخل نہیں ہونا چاہیے۔ شدت پسندی کے باعث ہی ان کا نقطۂ نظر اپنے ادبی سیاق کو بامعنی بنانے سے زیادہ اس کی مجہولیت پر دلیل فراہم کرتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں:

''صنم' کے 'بہار نمبر' کا شروع سے آخر تک مطالعہ کرنا جمالیاتی ذوق رکھنے والے کسی شخص کے لیے جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، اور جوئے شیر لانے کے بعد بھی 'شیریں' کا وصل نصیب نہیں ہوتا۔''

(ایضاً،ص:249)

''کہیں کہیں 'بہاری احساس کمتری' کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب کے تعارف میں لکھا گیا ہے کہ 'ان کا کلام دہلی کے رسالوں میں شائع ہوتا ہے۔'' (ایضاً،ص:250)

یہ تمام باتیں درست ہونے کے باوجود اپنے ادبی سیاق کے معنوی افق کو روشن نہیں کرتی ہیں۔ ہاں جب وہ اپنے نقطۂ نظر کی تلاش میں ادبی سیاق کو اہمیت دیتے ہیں تو اس طرح لکھتے ہیں:

''صنم' کا 'بہار نمبر' مستقبل کے ادبی مورخ کے لیے بہت سی آسانیاں فراہم کردے گا۔''

(ایضاً،ص:255)

علاقائی تشخص/آنچلک ڈسکورس کے ضمن میں بات ذرا طویل ہوگئی۔ لیکن ان باتوں کا مقصود یہی تھا کہ ادبی صحافت کی تحدید کا ادبی جواز نہ بھی ہو تو تاریخ نویسی (Hisitoriography) کو ہم جواز کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

اردو میں زبان کی سطح پر بھی ادبی صحافت کا آغاز پہلے ہوا— اور اسی تسلسل میں صحافت اور ادبی صحافت کے زبان و اسلوب میں فرق کیا گیا۔ صحافت اور ادبی صحافت کی قواعد میں اس فرق کو آج بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ 1857ء کے بعد پہلا اردو اخبار 'اودھ اخبار' ہے۔ منشی نول کشور نے اس اخبار کو لکھنؤ سے 1859ء میں جاری کیا تھا۔ اس تسلسل میں 'اودھ پنچ' (1877ء)، 'محشر' (1881ء)، 'دلگداز' (1888ء)، 'مخزن' (1901ء) وغیرہ سامنے کے نام ہیں۔ 'مخزن' کے بعد کئی رسائل منصۂ شہود پر آئے۔ اس زمانے میں بہار کی نمائندگی میں ہم 'ندیم' (1924ء) کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کے مدیر عبدالباری محمد ساقی تھے۔ یہ علمی و ادبی رسالہ تھا جو انجمن ترقی اردو پٹنہ کے آرگن کے طور پر نکلا گیا۔ (تفصیل کے لیے امداد صابری کی کتاب 'تاریخ صحافت اردو' جلد پنجم، ص:962، دہلی، 1983ء کو ملاحظہ کیا جا سکتا

ہے۔) ہم یہاں ہرگز یہ نہیں کہنا چاہتے کہ بہار کی ادبی صحافت میں 'نوید' کو اولیت حاصل ہے۔ اس بات کا مقصود فقط یہ ہے کہ ریاست بہار میں بھی ادبی صحافت کی ایک توانا روایت ہے۔

اس باب میں ایک اہم رسالہ ماہنامہ 'معاصر' بھی ہے جو سید حسن عسکری کے مشورے پر کلیم الدین احمد نے جاری کیا تھا۔ مجلس ادارت میں عبدالمنان بیدل، سید حسن عسکری، سید اختر احمد اورینوی، اور کلم الدین احمد تھے۔ اس کے پہلے مدیر ڈاکٹر عظیم الدین احمد ہیں۔ معاصر کا پہلا شمارہ 1940ء میں شائع ہوا۔ اس کے تنقیدی و تحقیقی مضامین، افسانے اور علمی مضامین آج بھی ہمارے لیے ریفرنس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی ادارتی پالیسی علمی اور ادبی تھی۔ جس کے تحت یہ طے کیا گیا تھا کہ اس میں غزلیں شائع نہیں ہوں گی۔ نظمیں شائع ہوں گی۔ اردو تنقید پر ایک نظر بھی بالاقساط اس میں شائع ہوا۔ ایک طرح سے کلیم الدین احمد کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں بھی اس رسالے کا اہم رول ہے۔ معاصر کے ہی شمارے میں (1949ء) میں الیاس رحمانی کا وقیع مضمون عہد اسلامیہ میں دربھنگہ ایک خصوصی نظر، دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ جس کو ڈاکٹر امام اعظم نے مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا۔

آل احمد سرور نے اپنے ایک خط (معاصر، جلد 2، نمبر 3) میں لکھا کہ حصہ نظم میں شعریت کم ہے۔ اس کے بعد کلیم الدین احمد نے سوال قائم کیا کہ شعریت کیا ہے اور اس کو Define کرنے کی قابل قدر سعی کی۔ یہ رسالہ کئی معنوں میں ادبی صحافت کا قابل تقلید نمونہ ہے۔ خود کلیم الدین احمد کا بیان ہے کہ:

> "سب سے بڑا کام جو معاصر نے کیا وہ یہ کہ طالب علموں میں ذوق ادب پیدا کیا۔ انہیں ترغیب دی گئی کہ وہ بھی کچھ لکھیں۔ ابتدا ترجمے سے ہوئی۔ میں انہیں انگریزی کے افسانے چن کر دے دیتا اور وہ ترجمہ کرتے۔ پھر وہ مقالے بھی لکھنے لگے۔ وہ کسی شعبے کے طالب علم کیوں نہ ہوں انگریزی، اکانومکس، عربی، فارسی، اردو، سبھوں کو ذوق ادب تھا اور 'معاصر' نے اس ذوق کی تربیت کی۔"
>
> (اپنی تلاش میں، حصہ اول، کلچرل اکیڈمی، گیا 1975ء)

'معاصر' کی طرح شاید ہم عصری اردو صحافت میں کسی رسالہ کو مثال بنا کر پیش نہیں کر سکتے۔ دراصل ترتیب کاری کے مشغلہ میں قارئین اور طلبا کی ذہنی تربیت کا خیال کسی مدیر کو نہیں۔ اردو ادب کی تدریس تک لیے ہمارے پاس کوئی خاکہ نہیں ہے تو پھر کلیم الدین احمد کی طرح انگریزی اور کسی دوسری زبان کی تدریس و تربیت کا اہتمام کہاں سے ہو۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ کام جامعات کے سپرد ہے لیکن ہمیں یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بین علومی تدریس اور ادبی ذوق کی تربیت کا کام ادبی جرائد سے بہتر کوئی اور ادارہ انجام نہیں دے سکتا۔

'معاصر' میں جغرافیہ وجود چین (1958ء) جغرافیہ وجود جاپان (1959ء) وغیرہ کے تحت یہاں کے ادب کا تعارف بھی پیش کیا جاتا تھا۔ اس کی نوع کی مثالیں کم و بیش عصری اردو صحافت میں بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن یہ کام بھی ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اس باب میں اجمل کمال کا رسالہ 'آج' اور ناصر بغدادی کا رسالہ 'بادبان' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

بہار کے دیگر ادبی جرائد و رسائل میں آہنگ (کلام حیدری) کی ترتیب کاری اور ادبی جمالیات کے پیش نظر

ہم ادبی صحافت کی شعریات اور اس کی آنچلکتا کے بعض نشانات کو یہاں پیش کر سکتے ہیں لیکن اپنے موضوع کی مرکزیت میں اس سے گریز شاید لازمی ہے۔ یہاں ہمیں عصری رسائل و جرائد کی روشنی میں بات کرنی ہے اور اس کے لیے بعض رسائل کی تخصیص بھی کی گئی ہے۔ اس طور پر 'مباحثہ' 'آمد' اور 'تمثیل نو' کو مرکز میں رکھا گیا ہے اور بعض دوسرے رسائل کو آنچلکتا کے سندربھ میں اہمیت دی گئی ہے۔ 'مباحثہ' کا اجراء اگست 2001ء میں ہوا۔ وہاب اشرفی نے رسالہ کے اشاعتی جواز اور ادبی صورت حال کے پیش نظر اپنا پہلا اداریہ لکھا کہ:

> ''رسالہ 'مباحثہ' کی اشاعت کا جواز کیا ہے؟ پہلے ہی اردو میں چھوٹے بڑے رسالے ہندستان کے مختلف گوشوں سے نکل رہے ہیں ان کی نوعیت ضخامت کے اعتبار سے متنوع ہے۔ بعض تو اتنے ضخیم ہیں کہ انھیں پڑھنے کے لیے خاصا وقت چاہیے اور بعض چار چھ صفحات پر مشتمل۔ مواد اور ترتیب کے اعتبار سے بھی یہ ایک جیسے نہیں ہیں، تو پھر ایک اور رسالہ کیوں؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کا جواب جو بھی دیا جائے اس کی حیثیت عذر لنگ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بہر طور میرا جی چاہا کہ میں بھی ایک رسالہ نکالوں۔''
>
> (مباحثہ، اگست، 2001ء، ص:3)

منقولہ باتوں میں وہاب اشرفی نے عصری رسائل کی صورت حال کو خاص معنوں میں نشان زد کیا ہے اور اپنے رسالہ کے ادبی جواز کو واضح لفظوں میں بیان نہیں کیا۔ اسی تسلسل میں انہوں نے ادبی فضا کی وسعت اور نئے امکانات کی بازیابی کی ہے۔ ان سب کو معنی آفرینی کے عمل میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ وہاب اشرفی نے مابعد جدیدیت کی علمبرداری میں یہ رسالہ نکالا تھا۔ رسالہ کے نام میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے کہ وہ اس سے کون سا کام لینا چاہ رہے ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی اداریہ نویسی متن کی پڑھت کو بنیاد بناتی ہے اور ایک قدم آگے بڑھ کر یہ رسالہ نو لکھاریوں کا مرجع خلائق بن جاتا ہے۔ وہاب اشرفی کی تنقیدی فہم و فراست کے کئی حوالے ہیں اور ان میں ایک اہم حوالہ ان کا رسالہ 'مباحثہ' بھی ہے کہ اس میں ان کا ادارتی نوٹ کئی معنوں میں Suggestive اور متعلقہ متن/مشمولات کے سیاق و سباق کو پیش کرتا ہے۔ دراصل وہاب اشرفی مشمولات پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے اداریہ میں بعض اشارے فراہم کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی اداریہ نویسی کا یہ ایک خاص انداز تھا۔ وہ وزیر آغا اور کئی دوسرے مدیر کی طرح کسی خاص موضوع پر الگ سے اداریہ نہیں لکھتے تھے۔ 80ء کے بعد کی شعریات کا مسلسل مطالعہ اس رسالہ کا انفرادی رویہ تھا جو خصوصی مطالعہ کے تحت پیش کیا جاتا تھا۔ بعض متون کو شامل کرتے ہوئے انہوں نے اس پر قبل میں لکھی گئی تنقید کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کے رسالہ میں حمد و نعت کو شائع کرتے ہوئے اس کی انفرادیت پر بھی اکثر اصرار کیا گیا ہے۔ خواہ وہ مظہر امام کی حمدیہ غزل ہو یا کسی نئے لکھنے والے کی نعتیہ شاعری۔ بعض دفعہ وہ کتابوں کی نشاندہی بھی کرتے تھے کہ اس مضمون پر لکھتے ہوئے یہ کتاب دیکھ لینی چاہیے تھی (شمارہ، 32، ص:10-9)۔ انہوں نے قارئین کو ہمیشہ ردعمل کے لیے اکسایا بالخصوص مابعد شعریات کی تفہیم و تعبیر کے لیے۔ کبھی کبھی وہ اس طرح کی رائے بھی دیتے تھے کہ موصوف بہار کے اہم شعراء میں شمار ہو سکتے ہیں۔ (شمارہ، 35، ص:10)۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری یا ادب کی شناخت میں تفریق کا کوئی جواز اپنے ذہن میں ضرور رکھتے تھے اور علاقائی تشخص کو عیب

نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اداریہ میں نئی نسل سے اپنی محبت اور بعض اوقات عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کے یہاں ایسی باتیں بھی مل جاتی ہیں کہ 'جمال اویسی کا حال بھی روشن ہے اور مستقبل بھی، میں اس کی پیشین گوئی کر سکتا ہوں۔ (شمارہ، 35، ص: 10)۔ وہ اپنے اداریہ میں ادبی شخصیات کی Activity سے بھی قارئین کو واقف کراتے تھے۔ وفیات اور ایوارڈ کا سلسلہ مستقل تھا۔ ان کی اداریہ نویسی کے وسائل کی شناخت میں ہم نے یہاں کئی باتیں کہی ہیں اسی ضمن میں ان کا اپنا بیان بھی ملاحظہ کریں:

> ''میں نے ادھر نئے ادباء و شعراء پر بطور خاص توجہ کی ہے اور اپنے رسالہ 'مباحثہ' میں کسی نہ کسی نئے لیکن قابل لحاظ شاعر کی طرف توجہ کرتے ہوئے انہیں اپنے مطالعہ کا موضوع بنا کر اشاعت کے مرحلے سے گذارنے میں ایک طرح کی سرشاری محسوس کی ہے۔ مجھے ہمیشہ تخلیقی جوت اور قوت رکھنے والے فن کاروں سے محبت اور ہمدردی رہی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ بعض ۸۰ء کے بعد لکھنے والے اپنی فکر، تخلیقی قوت اور اظہار و بیان کے لحاظ سے محترم ٹھہر سکتے ہیں۔ ان کے جوہر کی شناخت اور ان کی پذیرائی اہم نقادوں کا بھی رویہ ہونا چاہیے لیکن زیادہ تر نقادوں کی روش یہ رہی ہے کہ وہ مشاہیر پر لکھنے میں خاصی رغبت محسوس کرتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے ملک سے زیادہ غیر ممالک کے ادیبوں اور فنکاروں کو تاکتے رہنے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ مشاہیر پر لکھنا کچھ مشکل بھی نہیں ہوتا لیکن نئے ادیب و شاعر کے اختصاص کی پہچان کڑے کوس طے کرواتی ہے۔ میں ایسی محنت اور کاوش سے بھاگنا نہیں چاہتا اور میرا شعور مجھے مسلسل اکساتا رہتا ہے کہ میں Talent کی شناخت کروں۔ میں یہ کام اپنے رسالے سے بھی انجام دے رہا ہوں اور تحریر و تقریر سے بھی۔''
>
> (معنی کی جہات، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008ء، ص: 8)

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ انہوں نے نئے لکھنے والوں بالخصوص بہار کے لکھنے والوں کی پذیرائی اپنے رسالہ میں کی اور ان کی شعری/ادبی شناخت کے پیش نظر مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان کے اس رویہ میں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی مابعد جدید تنقیدی نقطہ نظر سے الگ کسی بھی لکھنے والے کی شناخت نہیں کی۔ ان کے رسالہ میں آنجلکتا کے ڈسکورس کی معنی خیزی کو یوں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ مابعد جدید صورت حال علاقائی تشخص/لسانی ثقافت کو تسلیم کرنا چاہتی ہے۔

ادب کے زندہ لہو کی گردش اور نظریاتی ادعائیت کے خلاف ذہنی رویوں کی دستاویز کے طور پر ممتاز شاعر خورشید اکبر کے رسالہ آمد نے اپنے تفریدی تحادث کو قائم کیا ہے۔ یہ رسالہ کئی معنوں میں اپنی سوچ و فکر کی ارضیت کے ساتھ متوجہ کرتا ہے۔ کئی بار اس رسالے کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ خورشید اکبر نے اپنی شاعری کی طرح ہی اس کی ترتیب و تہذیب میں بھی فکر کی توانائی کو متشکل کیا ہے اور ایک بڑا مکالمہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے رسالہ میں بعض بالکل نئے لکھنے والوں کو بھی ان کی تخلیقی آزادی کے ساتھ شائع کیا اور ادب کی نئی زمینوں کو سیراب کیا ہے۔ اس نوع کے رسالے کا تسلسل کے ساتھ نکلنا بہت ضروری ہے کہ واقعی، یہ ادب کے زندہ لہو

کی گردش کا تشکیلی استعارہ ہے۔

اس رسالہ میں بھی علاقائی تشخص کی توسیع کا ادبی رجحان نظر آتا ہے کہ سوغات غزلیں/نظمیں کی ابواب بندی میں شہر تخلیق کے باشندگان کو ایک بڑے لسانی ثقافت کی منطق میں نمایاں کیا گیا ہے۔ مدیر نے اپنے ادارتی نوٹ میں غضنفر ایسے ناول نگار کی تخلیقی خواہش کو پیش کرتے ہوئے بھی ایک نوع کے لسانی ثقافت کی معنویت کو روشن کیا ہے۔ ان کے بعض اداریے منظوم ہیں۔ شمارہ سات نجات پسندی پر خصوصی گوشہ ہے۔ ان کے رسالہ میں نجات پسندی پر ایک مکالمہ الگ سے موجود ہے جس کا تحرک ان کا داریہ ہی ہے۔ اس سلسلہ مکالمات میں عام قارئین کے ساتھ ساتھ کئی اہم نئے پرانے لکھنے والوں نے حصہ لیا ہے اور یہ سلسلہ ابھی شمارہ دس تک میں قائم ہے۔ شمارہ سات میں مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں کہ:

''فلسفہ نجات اور نجات پسندی پر آپ کا اداریہ چونکانے والا ہے۔ اس طرح پہلے کس نے سوچا ہے؟ اور اگر سوچا ہے تو اتنی تفصیل اردو میں کہاں ہے؟ آپ کے اداریہ سے بہت سی نئی جانکاری ملی۔ آپ نے بہت بڑے کینوس کا احاطہ کیا ہے اور بہت ہی تفصیل سے حقایق کی بازیافت کی ہے اور نئی تعبیر کی طرف ڈھیروں اشارے کیے ہیں اس مواد کو پھیلا کر کتاب بنا دیجیے۔ لکھنے اور سوچنے والوں کے لیے یہ آپ کا زبردست تحفہ ہوگا۔ آپ نے اپنے داریہ پر بحث کی دعوت دی ہے۔ تنقیدی نئی تھیوری کے حوالے سے اور اردو نقادوں کے خیالات کو سامنے رکھ کر میں نے اپنا ذہن بنایا ہے۔ پہلی قسط وزیر آغا کے حوالے سے بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو گوپی چند نارنگ، نظام صدیقی، نعیم اعظمی، قمر جمیل، وہاب اشرفی اور ناصر عباس نیر کے حوالے سے یہ گفتگو آگے بڑھاؤں۔'' (ص:36)

اس پر ادارتی نوٹ لگاتے ہوئے خورشید اکبر لکھتے ہیں:

''آپ نے بڑی خوبصورتی سے 'نجات پسندی' کو 'مابعد جدیدیت' کے فکری سلسلے میں ختم کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے، جو غیر متوقع نہیں تھا۔ خیال رہے کہ 'نجات پسندی' مابعد جدیدیت سے آگے کی فکر ہے [اور پہلے کی بھی] جو ہمارے مشرقی ادب میں روز اول سے جاری و ساری ہے۔ کیا اس نقطہ نظر بھی مباحث قائم نہیں جا سکتے ہیں؟'' (ص:42)

یہاں بھی ادب کے علاقائی تشخص کی توسیعی روایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عوامی ادب کی جمالیات بھی اس میں جاری و ساری ہے۔ لیکن اس کو کسی تعصب میں علاقائیت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جانا چاہیے کہ اس رسالہ نے تقریباً ہر شمارے میں ایک بڑے ادبی کلامیہ کو پیش کیا ہے۔ خورشید اکبر شمارہ تین میں لکھتے ہیں:

''نجات پسندی ادب کا افادی پہلو نہیں ہے بلکہ اس کی عین فطرت ہے، محض اظہار اور اسلوب کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔'' (ص:306)

اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو آمد کو عصری صحافت کے خالی پن سے الگ کرتی ہیں۔ اس طرح ہم اس کے تخلیقی اور ادبی فلسفہ کو نمایاں کرتے ہوئے اس کو صف اول کا ادبی رسالہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا اداریہ یک موضوعی

اور عنوان کے ساتھ ہوتا ہے اور انسلاک کے طور پر بعض دفعہ مشمولات پر رائے زنی بھی کی جاتی ہے۔ شمارہ 2 کا عنوان ہے ادب کا مقصد: نجات؟ اس میں خورشید اکبر نے موضوع سے متعلق کئی سوال قائم کیے ہیں:

"ادب کا مقصد کیا ہے؟ کیا ادب بے مقصد ہوتا ہے؟ کیا ادب غیر مشروط رہ سکتا ہے؟ ادب کی غرض و غایت سے متعلق یہ ایسے بنیادی سوالات ہیں جن کا جواب آسان بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ آسان اس طرح کہ: (۱) ادب کا مقصد ہے: نجات (۲) ادب با مقصد بھی ہو سکتا ہے اور بے مقصد بھی (۳) ادب اپنی شرطوں تک غیر مشروط ہے اور غیر کی شرطوں پر مشروط! لیکن پیچیدگیاں ان کے مباحث کو لے کر پیدا ہوتی رہی ہیں جن کے سبب ادب میں کئی طرح کے متضاد و مخالف نظریات اور مکاتب افکار اپنے وجود پر اصرار کرتے چلے آرہے ہیں اور اپنے مخصوص وظیفے کو ادب کا بنیادی وظیفہ تصور کرتے ہوئے حسب منشا ادب کی تعبیریں پیش کرتے رہے ہیں۔ ایسا ہر زبان میں اور ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے، اس لیے موجودہ عہد کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔" (شمارہ 2، ص: 7)

اس کے بعد خورشید اکبر نے بعض سوالات کی پیچیدگیوں میں اتر کر ادب، مذہب، تخلیقی عمل کے منصب اور نفسی اور غیر نفسی مباحث اور اس کی شعریات کے متعدد احوال کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ اداریہ دانشوری اور فکری تعمق کے در وا کرتا ہے۔ یہ اداریہ کئی معنوں میں قارئین آمد کو اپنے مباحث میں شریک کرتا ہے اور خود مدیر کی منشا بھی یہی ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے اپنے اداریہ کے آخری حصہ میں لکھا ہے:

مذکورہ مباحث کی روشنی میں اور بھی کئی طرح کے سوالات ذہن کے پردے پر ابھر آئے ہیں جن پر ادب کے سنجیدہ قارئین، نقادان ادب اور تخلیق کاران شعر و ادب کا ردعمل مطلوب ہے:

(۱) کیا موجودہ اردو ادب اپنے عین فطری تقاضوں کو پورا کر رہا ہے؟

(۲) کیا آج کا ادب ہمارے ذہن و شعور اور فکر و احساس کو نجات (Liberation) کی کیفیتوں سے سرشار اور ہمکنار کرنے میں کامیاب ہے؟

(۳) کیا ادب کو سکہ بند نظریاتی ادعائیت کے جبر سے آزاد نہیں ہونا چاہیے؟

(۴) کیا زمانہ حال کا اردو ادب واقعی 'زندہ لہو کی گردش' کا استعارہ ہے یا مردہ لہو کی انفعالیت کا مرثیہ؟

اس نوع کے سوالات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آمد ادب کے انجماد اور تعطل کو سوال بنا کر کیوں پیش کر رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں قارئین کو اس طرح سے شریک کرنے کی خواہش ہمیں نظر نہیں آتی۔ ادب کی آفاقی قدروں کی تشکیل میں یہ اردو دنیا کا واحد رسالہ ہے جس کو خاموشی اور بے ضمیری کا شدید احساس ہے۔ اپنے پہلے شمارہ میں ہی اس رسالہ نے بعض متون کی تخلیقی خواہش پر شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ان رجحانات کا تجزیہ بھی کیا ہے جو ادب بالخصوص فکشن کے باب میں عبرت آموز ہے۔ یہاں شاید یہ بات بے محل نہ ہو کہ 'شب خون' ایسے رسالہ نے فکشن کی تاریک راہوں کو کیسے تشکیل دیا تھا۔ اس کے بعض ادارتی متن کو قارئین کا ایک طبقہ تعصبات کے خانے میں بھی رکھ سکتا ہے اس کے باوجود اس کی اہمیت رہ جاتی ہے کہ اس میں ادیب کی تخلیقی ذمہ داری سے متعلق کئی سوال

اٹھائے گئے ہیں۔ کئی معنوں میں یہ بیباک لحن کا رسالہ ہے۔ حالاں کہ بعض شماروں میں ایسی چیزیں بھی شامل ہیں جن کو ہم ادبی معیار کی کسوٹی پر رکھ سکتے ہیں؟ مخصوص ابواب کی ابتدا میں عنوان کی مناسبت سے اہم اقتباس درج ہیں جو یقینی طور پر اس کے معنوی حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے بیباک اداریہ اور ادبی متون کی پیشکش کے باعث قارئین کا ردعمل بھی زندہ لہو کی گردش کا استعارہ بن گیا ہے۔ تعریف وتوصیف کی سائگی کم وبیش ہر رسالہ میں دیکھ سکتے ہیں اس کی مثالیں آمد میں بھی مل جاتی ہیں لیکن اس کے اکثر خطوط میں کوئی نہ کوئی نکتہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر سلام بن رزاق نے اپنے طویل خط میں کئی اہم باتیں لکھی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ 'اگر چہ پرچے پر علاقائیت کا سایہ گہرا ہے مگر آپ کی مدیرانہ سوجھ بوجھ سے توقع ہے کہ آئندہ 'ادبی میزان' کا پورا خیال رکھا جائے گا (ص:293)

سید احمد قادری لکھتے ہیں: بہار کی ادبی صحافت میں ایک اضافہ ہے آپ کا رسالہ۔ (ص:304)۔ ان باتوں سے اس کے علاقائی تشخص کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ رسالہ کے ادارتی حسن کا کمال یہ ہے کہ نقادان ادب بھی عام قاری کی شرکت اور مباحث کی اہمیت کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔ اسرار گاندھی کا مشورہ ہے: اداریے میں رسالہ کے مشمولات کو لے کر کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسے قاری پر چھوڑیے۔ اسے خود پڑھ کر تخلیق تک پہنچنے دیجیے۔ (ص:294)

شائستہ فاخری لکھتی ہیں: ایک مدیر کو اپنا حق رائے دہی یقیناً اختیار کرنا چاہیے۔ (ص:305)

عصری ادبی صحافت میں یہ طریقہ وہاب اشرفی نے اپنایا تھا۔ تخلیقی آزادی اور قاری کی آزادی کا ایک سوال اس سے متعلق ضرور ہے لیکن یہ اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ مدیر مشمولات کے معنوی سیاق پر کیا لکھ رہا اور کس طرح لکھ رہا ہے۔ انگریزی رسائل کے میں اس کے لیے دو باتوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

Identifying the Relevant Literature

Prospective Authors and Topics

ان نکات کو اگر ادارت کے خصائص میں شمار کیا جائے تو 'آمد' اپنی اداریہ نویسی کی جمالیات کی طلب میں کامیاب ہے اور لکیر کو پیٹنے کا قائل نہیں بلکہ نئے آئیڈیاز کا مخزن اور ادب کی جمہوریت کا تخلیقی منشور ہے۔

''کسوٹی جدید'' بھی ایک قابل قدر رسالہ ہے۔ یہ رسالہ ہمعصر ادب کی چھان پھٹک کا متمنی ہے۔ اس کا ٹیگ لائن ہے آج کا ادب آج کی نگاہ' اس کی ادارت میں ذمہ داری کا بھرپور احساس نظر آتا ہے۔ اس کے بعض اداریے ادبی صحافت کی شعریات کو روشن کرتے ہیں کہ اس میں قارئین کی شرکت کو بامعنی بنانے کی شعوری کوشش بھی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر انور شیمم نے باب اول کے عنوان سے اپنے ایک اداریہ میں مکتوب نگاری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کیا آپ نے سوچا ہے کہ آپ کے مکتوبات کتنے اہم ہوتے ہیں!
آپ کی آراء ادب کی سمت وراہ متعین کرنے میں اور رسائل وجرائد کے معیارات طے کرنے میں کس اہمیت کی حامل ہوتی ہیں؟؟
اور آپ کے خطوط ہمعصر ادب کی افہام وتفہیم میں کس قدر معاون ہو سکتے ہیں؟

آپ کے مکتوبات رجحان ساز ہو سکتے ہیں، آپ کے خطوط نظریہ ساز ہو سکتے ہیں، آپ کے خطوط نئے روزن و در کھول سکتے ہیں!! کیا ہمیں اس کا احساس ہے؟''

(کسوٹی جدید، جولائی تا ستمبر، 2011، ص: 3)

اسی طرح سیمانچل کا تخلیقی سائبان سہ ماہی ''ابجد'' اررپہ ادب کی ان لسانی ثقافتوں کا ترجمان ہے جن کو ادب میں نظرانداز کرنے کا رجحان عام ہے حالاں کہ اس کے اداریہ میں رضی احمد تنہا بہ انداز ے دگر لکھتے ہیں کہ:

''ابجد سیمانچل سے ہے، صرف سیمانچل کے لیے نہیں ہے۔'' (ابجد، 5، ص: 3)

''ابجد اردو زبان کا ایک رسالہ ہے مگر یہ صرف ادبی رسالہ نہیں ہے۔ صرف ادبی رسالہ کی صورت میں اس کی اشاعت مقصود نہیں ہے۔'' (ابجد، 5، ص: 3)

یہ وہ رسالہ ہے جس کو حقانی القاسمی جیسے نابغہ روزگار کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس لیے اس میں ادب کا حاصل جمع نہیں بلکہ اس کے تجشیہ کو پیش کرنے کا فخریہ انداز متوجہ کرتا ہے۔ اسی طرح جہان اردو (مدیر، ڈاکٹر مشتاق احمد) ایک اہم سہ ماہی ادبی رسالہ ہے۔ اس کا ٹیگ لائن ہے 'اردو ادب کے گمشدہ قاری کا متلاشی اور تعمیری ادب کا ترجمان'۔ ہمارے ہاں اکثر رسائل اس نوع کے ٹیگ لائن کے ساتھ شائع ہوتے ہیں لیکن اس کی تعبیر و تصریح میں ان کے مشمولات کو یقینی طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس رسالے نے کئی معنوں میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کیا ہے۔ اردو ادبی دنیا میں اس کے قارئین کا خاص حلقہ ہے۔ جہاں تک اس کی آنچلکتا کا سوال ہے تو اس کے مشمولات میں کم و بیش دو باب ایسے ہیں جن کی نشاندہی ہم واضح طور پر کر سکتے ہیں۔ دراصل اس میں کبھی کبھار 'دربھنگہ کی غزلیں' کے عنوان سے شاعری کو پیش کیا گیا ہے تو اس کے لکھنے والوں میں بھی زیادہ تر گرد و نواح کے فنکار ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں اردو دنیا کے دوسرے قلم کار شامل نہیں ہوتے۔ اس میں مدیر کے قلم سے 'جہان فکر' اور ڈاکٹر مشتاق احمد کے تبصرے کو بہ انداز ے دگر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اداریہ عام طور سے ادبی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ مشتاق احمد اردو زبان اور اس کے مسائل کو مختلف جہات سے اپنے اداریہ میں پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں ریاستی حکومت، آئین میں اردو زبان کی لسانی حیثیت، مدارس کے رول، بہار میں اردو کے لسانی مسائل اردو کی تعلیم اور تدریس کے مسائل وغیرہ کو انہوں نے خاص حوالہ بنایا ہے (شمارہ 10، شمارہ 13، شمارہ 18)۔ اردو زبان اور آر ایس ایس کی سیاست کی مرکزیت میں بھی انہوں نے اداریہ لکھا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مشتاق احمد باقاعدہ صحافت سے وابستہ (بطور صحافی، قومی تنظیم) رہے ہیں اور ملک کے مختلف ادبی اور نیم ادبی رسائل و جرائد میں ان کے سیاسی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ادب پر ان کی تنقیدی نگاہ اور فہم و فراست کو الگ سے ان کے ادبی مضامین اور کتابوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ادبی صحافت میں ان کا ںنداز اردو زبان کے مسائل کی مرکزیت میں اپنے معنوی افق کو روشن کرتا ہے۔

''دربھنگا ٹائمز'' (سہ ماہی) تواتر کے ساتھ شائع نہیں ہو رہا تھا' لیکن ان دنوں پوری توانائی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا اجرا 2005ء میں ہوا تھا۔ اس رسالہ کے مجموعی مزاج و آہنگ کے بارے میں کچھ بھی کہنا آسان

نہیں ہے۔ اس کے علاقائی تشخص میں بھی کم و بیش وہی باتیں کہی جاسکتی ہیں جو جہان اردو کے باب میں ابھی کہی گئی ہیں۔ اس کے بعض شمارے اپنے تخلیقی تحرک/آئیڈیاز کو ضرور پیش کرتے ہیں۔

ان رسائل کا اشاعتی جواز ابھی واضح نہیں ہے لیکن ان کو ہم بہ آسانی آنجکلتا کے ڈسکورس میں شامل کرتے ہوئے یہ امید کر سکتے ہیں کہ آنے والے وقتوں میں یہ رسائل اپنے ادبی/تخلیقی جواز کو تلاش کرنے میں کامیابی ضرور حاصل کریں گے۔ اسی نوع کا ایک رسالہ ''ثالث'' ہے جس کے مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد ہیں۔ چوں کہ آزاد خود افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کے ہاں کئی شماروں میں فکشن کو خصوصی توجہ حاصل رہی ہے۔ اس میں اداریہ اور مہمان اداریہ کی صورت نظر آتی ہے جو کئی معنوں میں اردو ادبی صحافت کے ایک بڑے تجربے کا دلکش امتزاج ہے۔ اس میں مذاکرے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے اشاعتی جواز کی بات ہے تو اس باب میں الگ سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

اسی طرح جب ہم علاقائی شناخت میں کسی ادبی رسالہ کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہماری نظر ''تمثیل نو'' پر بھی ٹھہرتی ہے۔ یہ مارچ 2001ء سے شائع ہو رہا ہے۔ اس نوع کے رسالوں کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے کہ ان میں ادب کی تخلیقی خواہش اور تجارتی ادب کے درمیان قاری کو اپنی پسند کا ادب تلاش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہم شدت پسندی کے زعم میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ادب کی تخلیقی خواہش اور اس کی معیار بندی کے لیے خالص ادبی رسالہ ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ''تمثیل نو'' نے اس تصور پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اس کے کئی گوشے یادگار ہیں جن میں تاریخ ادبیات عالم اور عہد ساز شخصیت وہاب اشرفی (اکتوبر۔دسمبر 2005ء)، متھلا اردو زبان اور تہذیب وثقافت کا ایک قدیم مرکز (جولائی۔دسمبر 2006ء)، پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار (جنوری۔ستمبر 2007ء) اور سہرے کی ادبی معنویت (اکتوبر 2007ء جون 2008) اس کے بعض شمارے ایسے ہیں جو شاید ادبی صحافت کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ دراصل اس میں کئی دفعہ تعداد کے اعتبار سے اتنے تبصرے شائع ہوئے ہیں کہ کوئی بھی حیران رہ جائے۔ اس رسالے کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں ادبی سرگرمیوں اور وفیات کو اداریہ نویسی کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ مرتب کیا جاتا ہے۔

اس رسالہ کے بنیادی فکر و فلسفہ کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے کہ اس کے اداریہ میں بھی کوئی حوالہ نظر نہیں آتا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر امام اعظم ادب میں کسی نوع کی شدت پسندی کے قائل نہیں۔ ان دنوں یہ رسالہ کولکاتا سے شائع ہو رہا ہے اس کے باوجود یہ اپنی زمینیت کے ساتھ اپنے تفردات کو پیش کرتا ہے۔ اس کے ابتدائی دو تین شماروں کے اداریہ میں اردو زبان کے مسائل اور رسائل کی مجبوریاں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اولین اداریہ کا عنوان ہی ہے' سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے' یہاں عنوان کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ دوسرے شمارے سے اس کا عنوان بدل دیا گیا اور اب 'مجھے کچھ کہنا ہے' کے سرنامہ میں اداریہ لکھا جاتا ہے۔ اس کے تحت امام اعظم لکھتے ہیں:

> ''تمثیل نو' کی پہلی پیشکش آپ کے سامنے ہے۔ اس کے مندرجات سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ نئے ادبی رجحانات کے پیش نظر تخلیقی رفتار کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔ ویسے ہماری خواہش یہ ہے کہ نئے ادبی تقاضے کے پیش نظر کچھ دیگر اہم ادبی موضوعات اور مسائل پر بھی مختلف مکتبۂ فکر کے قلمکاروں کی

تحریریں آپ کے سامنے پیش کریں۔" (ص:3)

اس ادارتی تحریر کے ساتھ باکس میں مابعد جدیدیت کے تعلق سے گوپی چند نارنگ کا ایک بیان موجود ہے۔ اگر اس کو اداریہ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ رسالہ مابعد جدیدیت کی ترجمانی میں کوئی رول ادا کرنے کا متمنی ہے۔ اس رسالہ کو آنچلکتا کے ڈسکورس میں شامل کرتے ہوئے اس کے اولین شماروں کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے کہ اس میں مظہر امام کا مضمون 'دربھنگے میں ادبی صحافت' شامل ہے۔ اسی طرح دوسرے شماروں میں پروفیسر عبدالمنان طرزی کا 'دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ' اور پروفیسر شاکر خلیق کا مضمون 'متھلا انچل میں قومی یکجہتی' ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ تیسرے شمارہ کے اداریہ میں لکھتے ہیں:

> قارئین کو چونکانے کے لیے میں نے اپنے رسالہ کو کسی سنسنی خیز واقعہ سے مزین کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ سنجیدگی سے سسکتی ہوئی زبان اردو کی آبیاری کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ اردو کے سلسلہ میں ہماری جذباتیت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں صدیوں سے یہ سازش چل رہی تھی کہ عوامی زبان کو ادبی اور فنی زبان نہ بننے دیا جائے...... (ص:3)

اسی اداریہ میں آگے لکھتے ہیں:

> "دربھنگا کی منظوم ادبی تاریخ' پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ یہاں کی ادبی تاریخ نثر میں بھی یکجا نہیں ملتی۔" (ص:3)

"تمثیل نو" کی اپنی ایک بڑی خوبی ہے کہ اس کو ہمیشہ بڑے لکھنے والوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور اس کے مداحوں میں دنیائے ادب کے معتبر ناقدین/ادبا کے علاوہ خشونت سنگھ جیسے اہم لکھنے والے بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی فعالیت سے جو لوگ واقف ہیں ان کو اندازہ ہے کہ وہ کس طرح اپنے رسالہ کے لیے فکرمند رہتے ہیں اور ہمیشہ کسی نہ کسی موضوع پر مخصوص شمارہ شائع کرتے ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی رسائل کو شدت پسندی کے ساتھ خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ حالاں کہ لامرکزیت ایک اضافی تصور ہے کہ اس کا بھی ایک سینٹرل آئیڈیا ہوتا ہے تخلیقی شعریات ہوتی ہے اور یہ لامرکزیت کے فریب میں ایک بڑے مرکز کی تعمیر کرتے ہیں۔ گویا کسی مخصوص خطے کا رسالہ علاقائی تحدید میں بھی ادب کی جمالیات کو پیش کرتا ہے۔ اس کے باوجود بہت سارے رسائل اضافہ محض ہیں ان کے ادبی جواز کو تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ آج بہت کم رسالے ایسے ہیں جن میں ادب مقدم ہے دراصل نظریات کی شدت پسندی نے ادبی صحافت کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہمیں بہت سارے مدیران کی ادبی ترجیحات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مشمولات کو کیوں ضائع کررہے ہیں۔ بعض رسائل میں مدیر کٹھ پتلی محض ہوتا ہے۔ ان کے لیے اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ بھالو ناچ میں بھالو نہیں ناچتا مداری کی آنکھیں ناچتی ہیں۔

....

موبائل : 09891829482

ڈاکٹرامام اعظم

کولکاتا میں اردو صحافت

صحافت کے تعلق سے دانشوروں کی رائے کا اجمال یہ ہے کہ یہ قابلِ اعتماد، پرقوت، عوام کی رہنمائی کا ذریعہ اور رائے عامہ ہموار کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اسے جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے لیے اہم کام لئے گئے ہیں۔ ملک کے مختلف خطوں میں صحافت کے ذریعہ عوام کی رہنمائی اور دوسرے کارناموں کی تاریخ موجود ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں بنگال کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔

بنگال انقلاب کی سرزمین رہی ہے۔ ہر عہد میں یہاں انقلابی کارنامے انجام دئے گئے۔ اردو نثر کے فروغ کی کہانی بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یورپی تاجر جن میں ڈچ، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز شامل تھے، کی آماجگاہ بنگال کے ہی مختلف علاقے رہے۔ یہاں ان لوگوں نے تجارتی مقاصد کیلئے کمپنیاں اور نوآبادیاں بھی قائم کیں۔ کلکتہ انگریزوں کا مرکز بنا تو کچھ ہی دور واقع چندن نگر فرانسیسی کالونی کی شکل اختیار کر گیا۔ اس وقت تک ملک میں اردو عوامی زبان کے طور پر ابھر چکی تھی اور تبادلۂ خیال کا واحد ذریعہ تھی۔ ایسی حالت میں انگریزوں کے لئے اردو زبان کی آشنائی اشد ضرورت بن گئی۔ اس سے قبل اردو نثر کے جو بھی ذخائر تھے وہ سب مقفّٰی و مسجع شکل میں تھے۔ سہل نگاری کی طرف اہلِ اردو کی توجہ مبذول نہیں ہوئی تھی۔ انگریزوں نے اردو نثر کے فروغ کی جانب توجہ کی اور اس کے لیے ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا، جس میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو ہندوستانی زبانوں کے شعبے کا سربراہ بنایا گیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو اردو سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے اردو زبان اور اس کے کلچر سے واقف ہونے کے لئے اردو آبادی میں جا کر کافی مواد جمع کیا۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے اردو کے ادیب اور مترجم بلائے گئے جنھوں نے نہایت عرق ریزی اور دقت نظری سے سہل زبان میں مختلف زبانوں کی داستانوں کو اردو میں ترجمہ کیا۔ گلکرسٹ کا یہ مشن کامیاب رہا اور ان کی کاوش نے اردو میں سلیس، سادہ اور عام فہم نثر نگاری کی بنیاد ڈالی۔ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں میر امن، مرزا علی لطف، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، کاظم علی جواں، بنی نرائن جہاں، بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولا، نہال چند لاہوری اور للو لال جی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ۱۸۳۰ء میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان بن گئی۔ اس طرح اردو کے فروغ کا راستہ صاف ہو گیا۔ ہندوستان میں صحافت کا آغاز اٹھارہویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہو چکا تھا۔ اس عہد میں اخبارات انگریزوں نے شائع کئے تھے اور ہندوستانیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی ابتدا بنگلہ زبان سے ہوئی مگر پہلے بنگلہ اخبار اور اس کے مدیر کے متعلق جانکاری نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس اخبار کے متعلق محققین کی رائے میں اختلاف ہے۔ عتیق احمد صدیقی نے اپنی تصنیف ''ہندوستانی اخبار نویسی'' میں لکھا ہے کہ:

> ''پہلا دیسی اخبار گنگا دھر بھٹا چاریہ نے ۱۸۱۶ء میں ''بنگال گزٹ'' کے نام سے جاری کیا۔ عبداللہ یوسف مرحوم نے اس اخبار کا نام ''بنگال سماچار'' بتلایا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ بنگلہ زبان میں اس کا نام ''بنگال سماچار'' ہی رہا ہو اور انگریزی میں ''بنگال گزٹ'' لکھا جاتا رہا ہوگا۔'' (ص:۱۱۲)

۱۸۱۸ء میں بنگلہ کا پہلا اہم ہفتہ وار اخبار ''بنگلہ درپن'' شائع ہوا۔ ۱۸۲۱ء میں راجہ رام موہن رائے نے کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''سمباد کھودی'' جاری کیا۔ اس عہد میں کئی زبانوں کے اخبار کلکتہ اور دوسری جگہوں سے شائع ہونے لگے جن میں فارسی کے کئی اخبار شامل تھے۔ ''جام جہاں نما'' (۱۸۲۲ء) اردو کا اولین اخبار تھا جو بعد میں فارسی زبان میں نکلنے لگا۔ فارسی کے دوسرے اخباروں میں ''شمس الاخبار'' (۱۸۲۳ء)، ''آئینۂ سکندری'' (۱۸۳۱ء)، ''ماہ عالم افروز'' (۱۸۳۳ء)، ''سلطان الاخبار'' (۱۸۳۵ء)، ''مہر منیر'' (۱۸۴۱ء)، ''گلشن نو بہار'' (۱۸۵۴ء) اور ''دوربین'' (۱۸۵۳ء) شامل تھے۔ جہاں تک ہندوستان میں صحافت کی ابتداء کا تعلق ہے تو تقریباً چالیس سال گزر جانے کے بعد بنگال سے پہلا اردو اخبار ''جامِ جہاں نما'' کی شکل میں ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس اخبار کے درخواست دہندہ ہری ہردت (ایسٹ انڈیا کمپنی کے شعبۂ مالیات کا ایک بنگالی کلرک)، ایڈیٹر منشی لالہ سداسکھ تھے۔ اس کے بعد دہلی، لاہور اور دوسرے شہروں سے کئی اخبار اردو میں شائع ہونے لگے۔ بنگال کی صحافت کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۰ رفیصد سے زائد اخبارات ورسائل کلکتہ سے شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ہوڑہ، آسنسول اور ڈھاکا (فی الحال بنگلہ دیش کی راجدھانی) وغیرہ سے بھی اخبارات ورسائل کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس طرح ''جامِ جہاں نما'' کو اردو صحافتی عمارت کی پہلی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ انگریزوں کے ذریعہ ۱۸۲۳ء میں پریس آرڈیننس نافذ کردینے کے بعد اخبارات ورسائل نکالنے کے لیے انگریزی سرکار سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہوگیا۔ اس کے لیے اخبار کے مالکان کو مختلف طرح کے قیود کا پابند رہنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے اخبار کا اجرا ایک مشکل عمل ثابت ہونے لگا اور جو اخبارات ورسائل شائع ہورہے تھے، انھیں کئی پابندیوں سے گزرنا پڑرہا تھا جس کی وجہ سے اس عمل میں سستی آئی۔ چند کو تو انگریزوں نے بند ہی کردیا جب کہ کچھ مدیروں اور مالکان پر مقدمے بھی درج ہوئے اور انھیں حراست میں لے لیا گیا۔ ''جام جہاں نما'' کے بعد فارسی کے کئی اخبارات نے اردو میں ضمیمے شائع کیے مگر باضابطہ اردو رسالہ یا اخبار کا اجرا عمل میں نہیں آیا۔

۱۸۴۲ء میں اردو اخبار ''تعلیمی'' کلکتہ سے شائع ہوا۔ اس طرح ۱۸۴۵ء میں ''طبّی'' کا اجراء عمل میں آیا۔ اس اخبار کے مالک مولوی محمد محسن، سیّد بلال الدین اور پرنٹر عبداللہ تھے۔ یہ اخبار مکمل طور پر خبریں شائع کرتا تھا۔ اسی سال ایک دوسرا اخبار ''آئینۂ گیتی نما'' شائع ہوا۔ ۱۸۵۱ء میں اردو کے دو اخبار مزید منظرِ عام پر آئے۔ ایک ''مراۃ الخیال'' دوسرا ''انجمن آرا'' جاری ہوا۔ اس طرح دو اخبار ''احمدی'' ۱۸۴۶ء اور ''جام جمشید'' ۱۸۴۸ء کا بھی ذکر ملتا ہے۔ عتیق احمد صدیقی نے اپنی تصنیف 'ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)' کے آخری حصے میں اردو اخبارات و مطبوعات کے عنوان سے ایک فہرست تیار کی ہے جس میں ان دونوں اخبارات کا ذکر بھی شامل ہے مگر ان بھی اخباروں کی اشاعتیں محدود تھیں۔ محدود ہونے کے کئی وجوہات تھے۔ ان اخبارات ورسائل کی قیمت زیادہ ہوتی تھی جو عام قارئین کی قوت خرید سے باہر تھی۔ دوسرے، لوگوں میں اخبار بینی کا فقدان تھا۔ ان وجوہات سے ان اخبارات ورسائل کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور یہ وقفے وقفے سے بند ہوتے گئے۔ میٹکاف کے عہد حکومت میں صحافت پر لگائی گئی پابندیاں اٹھا لی گئیں جس کے بعد اردو صحافت تیزی کے ساتھ ترقی کے منازل طے کرنے لگی۔ اردو اخبارات نے حب الوطنی کے جذبات کو ابھارا اور انگریزوں کے خلاف محاذ کھول دیا جس کی پاداش میں کئی اخبار بند کردیے گئے اور کئی مدیروں پر

مقدمے بھی چلائے گئے۔ انگریزوں کے ظلم کے شکار سب سے زیادہ اردو اخبار ہی ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں میٹکاف کے ذریعہ اٹھائی گئی پابندی دوبارہ جاری کردی گئی۔ اس طرح اخباروں کی آزادی سلب کرلی گئی جسے زبان بندی قانون سے منسوب کیا گیا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوگیا کہ وہ جب چاہے کسی بھی اخبار کو بند کردے، اس کے لائسنس کو منسوخ کردے نیز مدیروں اور مالکوں پر مقدمہ چلائے۔ اس قانون کے نفاذ اور اس کی سختیوں کے باوجود اخبارات ورسائل کا اجراءعمل میں آتا رہا۔ شہر کلکتہ اس میں سب سے آگے رہا۔ انور علی دہلوی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں ہندوستان میں اردو صحافت کے ان دنوں کو اس طرح یاد کیا ہے :

> ''۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لئے جدوجہد کا سہرا اردو صحافت ہی کے سر ہے۔ اردو کے اخبارات ہی نے جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی کا صحافی اور مدیر مولوی محمد باقر جنگِ آزادی میں شہید ہوا۔ اردو اخبارات ہی کے مالکان اور مدیران سب سے زیادہ سامراج کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔...... اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت ہندی کے اخبار برائے نام شائع ہوتے تھے۔ انگریزی کے اکثر اخبار انگریزوں کے حامی اور ہم نوا تھے۔ دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے اخبار اتنے باا ثر نہیں تھے لہٰذا اردو اخبارات اور اردو صحافیوں ہی نے برطانوی سامراج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انھوں نے سیاسی بیداری اور تحریکِ آزادی کے ہراول دستے کا کام کیا۔''
> (''اردو صحافت'' ص:۲۰)

بنگال میں اردو روزنامہ اخبار کہلانے کا شرف کلکتہ کے ''اردو گائیڈ'' کو حاصل ہے۔ یہ ۱۸۵۸ء میں چار بڑے صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کے مالک کبیر الدین احمد خان بہادر عزیز الباری تھے۔ ۱۸۶۰ء میں ہفت روزہ ''رفیق الہند'' جاری ہوا۔ اسی سال اخبار ''محسنی'' کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۸۶۳ء میں بنگال کا پہلا اردو رسالہ ماہنامہ ''انجمن'' کلکتہ سے جاری ہوا۔ یہ ''مجلسِ مذاکرہ اسلامیہ'' کا ترجمان تھا جس کی ضخامت ۱۰ رصفحہ میں تھی جو بعد میں تجاوز کرگئی۔ اخبار ''سلطانی'' مٹیا برج سے ۱۸۶۵ء میں جاری ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں ''دوربینی'' منظرِ عام پر آیا۔ سیالدہ سے اخبار ''محمدی'' کا اجراءعمل میں آیا۔ اس عہد میں ''سراجیہ''، ''کوکب ہند'' جاری ہوئے۔ اس طرح مختلف اردو کے اخبارات و رسائل شائع ہوتے رہے۔ بہت سے روزنامے اور رسالے جلد ہی بند ہوگئے مگر بعض نے اپنے مشن جاری رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے بعد مغربی بنگال کی راجدھانی کلکتہ ٹھہری۔ اس سے قبل بھی بنگال میں اردو صحافت کی سرگرمیاں زیادہ تر کلکتے میں تھیں اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں ''المشرق'' اور ''جادو'' دو اخبار خاص طور پر مقبول تھے۔ ماہنامہ ''شمس'' اور ''شمسِ بنگالہ'' بھی اسی عہد میں جاری ہوئے، جنھیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ''حسن وصحت'' بھی اسی دور میں شائع ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں پریس ایکٹ کے تحت اخبارات ورسائل پر انگریزی حکومت کا عتاب نازل ہوا جس کی وجہ سے کئی اخبارات ورسائل بند ہوگئے۔ ۱۹۱۳ء میں اس ایکٹ کے خلاف محمد علی جوہر، ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے زبردست تحریک چلائی۔ مولانا آزاد کے زیرِ ادارت ہفتہ وار ''الہلال'' (۱۹۱۲ء) کا اجراءعمل میں آیا۔ اس اخبار نے زبردست پذیرائی حاصل کی۔ خوابیدہ دلوں کو اس اخبار نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ پہلا اخبار تھا جس نے اردو صحافت کو انقلابی آہنگ عطا کیا۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کی اشاعت ۲۵ ر ہزار تک پہنچ گئی۔ چوں کہ اس اخبار کے ذریعہ پریس ایکٹ کے خلاف آواز بلند کی گئی تھی اس لیے انگریزوں کا قہر اس پر ٹوٹ پڑا اور ۱۹۱۴ء میں یہ بند ہوگیا۔ اس کے باوجود اردو اخبارات ورسائل کا سلسلہ چلتا رہا۔ کلکتہ ہی سے ۱۹۱۴ء میں "رفعت" (مدیر: محمد نظام الدین)، "رفاقت" (مدیر: منشی محمد ناظم الدین)، روزنامہ "سفیر" (مدیر: علی حسین) بڑی جسارت سے صحافتی ذمہ داری نبھاتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں ماہنامہ "الاسلام" (انجمن علمائے بنگالہ کی طرف سے) جاری ہوا۔ اسی سال میں مولانا آزاد نے "البلاغ" کے نام سے رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے نے پھر اسی شان سے ہندوستانیوں کے جذبہ حب الوطنی کو ابھارا اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا حوصلہ بخشا۔ اس درمیان مولانا آزاد گرفتار کر لئے گئے اور ۱۹۱۶ء میں "البلاغ" بھی بند ہوگیا لیکن اس کے بعد رسائل کے اجراء کا سلسلہ چلتا رہا اور "صداقت"، "جمہور"، "نقاش"، "ترمذی" اور روزنامہ "عصر جدید" کی شکل میں جاری رہا۔ ۱۹۲۰ء میں روزنامہ "زمانہ" جاری ہوا۔ اس کے بارے میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ اپنے ایک مضمون بعنوان "بنگال میں اردو کے چند صحافی" میں لکھتے ہیں:

> "مولانا محمد اکرام خان روزنامہ 'زمانہ' کے مالک و مدیر تھے۔ آپ کا شمار بیسویں صدی کے نامور صحافیوں میں ہوتا ہے۔ روزنامہ 'زمانہ' کا پہلا شمارہ ۱۴ رمئی ۱۹۲۰ء کو شائع ہوا۔ اور یہ اخبار چار سال تک نکلتا رہا۔ اس اخبار میں وقت کے نامور اہلِ قلم کی شعری ونثری تخلیقات شائع ہوتی تھیں، جن میں مولانا تمنا عمادی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں۔"
>
> (روزنامہ "آگ" لکھنؤ ۲۴ ر ستمبر ۲۰۱۳ء)

۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد نے ہفت روزہ "پیغام" جاری کیا جس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مقرر ہوئے۔ اس رسالے نے پھر وہی کام کیا جو اس سے قبل "الہلال" اور "البلاغ" نے کیا تھا۔ نتیجتاً مولانا آزاد اور مولانا ملیح آبادی دونوں گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے باوجود یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دار ورسن، قید و بند اور ہر طرح کے مظالم کا سامنا کرتے ہوئے مالکان اور مدیران قوم کو غفلت سے بیدار کرتے رہے۔ ان کے اندر جذبہ حب الوطنی پیدا کرتے رہے۔ انگریزوں سے نجات کے راستے بتاتے رہے اور ہر طرح کی معلومات سے ان کو واقف کراتے رہے۔ یہ سلسلہ ملک کی آزادی تک قائم رہا۔ اہلِ کلکتہ نے جو مشن شروع کیا تھا وہ ملک کے طول وعرض میں پھیل گیا۔ ممتاز صحافی احمد سعید ملیح آبادی نے "مغربی بنگال میں اردو صحافت" (مصنفہ: ڈاکٹر فریدہ انور) کے بیک کور پر بجا طور پر لکھا ہے:

> "اردو صحافت کا آغاز کلکتے سے ۱۸۲۲ء میں 'جامِ جہاں نما' سے ہوا تھا اور یہ سلسلہ کسی دور میں بھی رکا نہیں۔ اخبارات ورسالے برابر نکلتے رہے۔ بڑے بڑے نامور صحافی اور اہلِ قلم پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں قارئین کی ذہنی رہنمائی اور رائے سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح مغربی بنگال کی اردو صحافت، جہدِ مسلسل کا نام اور ایک تابناک تاریخ ہے۔ وطن کی آزادی کے لئے اردو کے صحافی سینہ سپر رہے اور قید و بند سے لے کر ہر طرح کی قربانیاں دیتے رہے۔ آزادی کی لڑائی کو آگے بڑھانے میں جہاں جوشِ آزادی کی ضرورت تھی، وہیں قومی اتحاد کی ضرورت اس سے بھی زیادہ تھی۔ ہر قسم کی فرقہ واریت اور علاحدگی پسندی

سے اردو صحافی نبرد آزما رہے۔ آزادی کے بعد اردو صحافت کی راہ اور زیادہ کٹھن ہوگئی۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں خوف ناک فرقہ پرستی کا طوفان بلاخیز کا مقابلہ ناتواں اردو صحافت نے پامردی سے کر کے قوم و ملک کی ایک ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی ہے۔''

آزادی سے قبل کلکتہ اور اس کے مضافات سے شائع ہونے والے دیگر اردو روزناموں میں ''پیکِ صبا''، سیاست''، ''مسلم گزٹ''، ''حریت''، ''نئی دنیا'' احرار''، ''اقدام''، ''رفعت''، ''زمانہ''، ''صداقت''، ''ترجمان''، ''رسالت''، ''شانِ ملت''، ''ہوڑہ ٹائمز'' (۱۹۷۰ء)، ''اتحاد''، ''آئینۂ نمائش''، ''خادم''، ''جھنجھٹ''، ''مزدور بلیٹن''، ''داتا کی شہنائی''، ''استقلال''، ''العصر''، ''الکمال''، ''انوار الاخبار''، ''نقاش''، ''رہبر''، ''رفاقت''، ''پیام''، ''صدائے عالم'' (۱۹۷۱ء)، ''انگارہ''، ''الحق'' وغیرہ شامل ہیں۔ آزادی کے بعد بھی اخبارات و رسائل نے اپنی ذمہ داریوں سے منہ نہیں موڑا بلکہ آج بھی وہ سچائی کو پیش کرنے کے لئے اپنی جانوں کی قربانی دیتے رہتے ہیں۔ کلکتہ کی انقلابی سرزمین سے آزادی کے بعد ''رہبر'' (۱۹۵۰ء)، ''انصاف'' (مدیر: سید عزیز الدین ۱۹۵۱ء)، ''پیغام'' (مدیر: ابو محمد ادریس ۱۹۵۱ء)، ''جمہور'' (۲۹ر جولائی ۱۹۶۱ء مدیران: محمد واسم اور وسیم الحق)، ''رہنما'' (۱۹۵۳ء مدیر: حامد محمود نیازی)، ''ستارہ'' (۱۹۵۴ء مدیر: رفیع احمد فدائی)، ''محاذ'' (۱۹۷۲ء مدیر: محمد مصطفےٰ)، ''کارواں'' (مدیر: یونس نظری)، ''نقاش'' (مدیر: یونس نظری ۱۹۵۱ء)، ''نیو مجاہد'' (۱۹۵۱ء مدیر: عابد فیض آبادی)، ''روزانہ ہند'' (مدیر: رئیس الدین فریدی)، ''عصرِ جدید''، ''رہبرِ عالم'' (۱۹۷۰ء مدیر: ولی الاصغر ملک) ''امروز'' ''غازی'' (مدیر: وقار مشرقی) اور ''اقراء'' (اجراء: ۱۹۸۳ء) جیسے روزنامے شائع ہوئے۔ واضح ہو کہ ستمبر ۱۹۵۱ء کے اواخر میں یونس نظری کے بلاوے پر دربھنگہ سے مظہر امام کلکتے آئے اور ''کارواں'' سے منسلک ہوئے۔ چند ہفتوں کے بعد یہ اخبار بند ہوگیا۔ آج بھی کلکتہ سے اردو کے کئی روزنامے ''اخبارِ مشرق''، ''آزاد ہند''، ''آبشار''، ''عکاس''، ''راشٹریہ سہارا'' اور ''عوامی نیوز'' وغیرہ اپنی ذمہ داریوں کو پوری ایمانداری سے نبھا رہے ہیں۔ ''نوائے بنگال'' کی اشاعت کا سلسلہ ۲۰۱۴ء میں شروع ہوا مگر گذشتہ چند مہینوں سے اس کی اشاعت موقوف ہے۔ ان کے علاوہ ماہنامے، سہ ماہی جریدے، سالنامے اور ادبی و نیم ادبی دوسرے رسالے بڑی تعداد میں کلکتے سے شائع ہو رہے ہیں۔

ہفت روزہ اخباروں میں ''نئی صدی'' (مدیرہ: خورشید جہاں)، ''نئی بستی''، ''مسلم یوتھ'' (مدیر: عشرت نظیر آزاد)، ''ہند ایکسپریس'' (مدیر: نسیم فائق) اور ''سیکولر آواز'' شائع ہوئے تاہم ابھی ان تمام کی اشاعت موقوف ہے۔ احمد سعید ملیح آبادی کی ادارت میں روزنامہ ''آزاد ہند'' کا ہفتہ وار ایڈیشن ''اجالا'' کے نام سے ہر اتوار کے دن شائع ہوتا تھا۔ دیگر ہفتہ روزہ اخباروں میں ''آثار'' (مدیر: ابراہیم ہوش)، ''گوہرِ آصفی''، ''رفیق الہند''، ''ابوالپنچ''، ''احسن الاخبار''، ''ٹھوکر''، ''جہازی''، ''المصباح''، ''خادم''، ''دارالحکومت''، ''راستی''، ''رفیق جدید''، رہنما''، سولہ آنہ''، ''شمشیرِ ہند''، ''صحافت''، ''عبرت''، ''ماہِ تمام''، ''مخدوم''، ''مزدور گزٹ''، ''نظام''، ''نورتن''، ''نئی منزل''، ''ہنر پنچ''، ''آرزو''، ''ارمغان''، ''اسپورٹس اسکرین''، ''اسپورٹس ٹوڈے''، ''تحریکِ ملت''، ''اخبار انقلاب'' (مدیر: عبدالعزیز)، ''چیت''، ''کسان مزدور'' (مدیر: کامریڈ محمد امین)، ''کندن''، ''لبیک''، ''واسطہ''، ''بلال''، ''تسکینِ روح'' (مدیرہ: ڈاکٹر روحی قاضی)، ''میر الملک'' (مدیر: معین الدین شمس)، ''اخبارِ مغرب'' (مدیر: ڈاکٹر اقبال جاوید)، ''غازیٔ ملت''

(مدیر: غوث سیوانی) وغیرہ شامل ہیں۔

حکومت مغربی بنگال کا پندرہ روزہ جریدہ ''مغربی بنگال'' مصطفےٰ اکبر کی ادارت میں پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی اشاعت کے ۴۲ رسال مکمل کر لئے ہیں۔ اس نے کئی خاص نمبر شائع کئے جن میں ''وحشت نمبر''، ''پریم چند نمبر''، ''امیر خسرو نمبر''، ''فیض نمبر''، ''ٹیگور نمبر'' وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔ دیگر پندرہ روزہ اخباروں میں ''بخشیات'' (مدیر: حکیم یوسف بخشی)، ''سرپرست'' (مدیر: محمد محبوب رضا)، ''برحق'' (مدیر: منیر اقبال ہاشمی)، ''استقلال'' (مدیر: سلمان اختر اجراء: ۲۰۱۴ء)، ''امیدِ نو'' (مدیر: محمد علی) اور ''عالمی رفتار'' (مدیر: فضیل احمد) پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ''دیارِ حبیب'' (مدیر: ڈاکٹر نسیم احمد) کی اشاعت فی الحال بند ہے۔ علاوہ ازیں ''فلم ویکلی'' (مدیر: محمد وسیم الحق)، ''اسپورٹس اور تفریح''، (مدیر: جاوید نہال)، ''اسپورٹس اور فلم'' (مدیر: بدرالحسن)، ''پول کھول'' (مدیر: محمد فیروز عالم) ''آزاد قلم (مدیر: ابرار احمد) ''جامِ کوثر''، ''معمار'' وغیرہ بھی یہاں سے شائع ہوئے۔ پندرہ روزہ ''نقاد'' (اجراء: ۱۹۸۲ء) کے چھ شمارے شائع ہوئے۔ یہ کمرہٹی سے ممتاز انور کی ادارت میں چار صفحات پر مشتمل سائیکلو اسٹائل چھپا کرتا تھا۔

ف.س.اعجاز کی ادارت میں ''انشاء'' (اجراء: ۱۹۸۶ء) کولکاتا سے شائع ہونے والا اردو ماہنامہ ہے جو اپنی اشاعت کے ۳۰ رسال مکمل کر چکا ہے۔ جس کے کئی خاص نمبر ''احمد سعید ملیح آبادی نمبر''، ''کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نمبر''، ''ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر''، ''قمر رئیس نمبر''، ''عالمی اردو افسانہ نمبر''، ''اسکینڈ نیویائی ادب نمبر''، ''نیاز فتح پوری نمبر''، ''انور شیخ: ادب و متنازعہ افکار نمبر''، ''کلکتے کا عصری ادب نمبر''، ''کلکتہ کے ۹ رہم عصر افسانہ نگار نمبر''، ''گوپی چند نارنگ نمبر''، ''گلزار نمبر''، ''رومی نمبر''، ''گفتنی نمبر''، ''نثار احمد فاروقی نمبر''، ''بابری مسجد نمبر''، ''دلیپ سنگھ نمبر''، ''شکیل الرحمن نمبر''، ''ایک شمارہ مکتوبات نمبر''، ''مختصر تخلیقات نمبر'' وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ ماہنامہ ''انشاء'' مشرقی ہندوستان کا اولین رسالہ یا اخبار ہے جس نے کتابت اور ڈیزائننگ کو کمپیوٹر پر متعارف کیا۔ اولاً کمپیوٹر کتابت سویڈن، لندن پھر حیدرآباد اور دہلی سے ہوا کرتی تھی۔ جناب جمیل منظر کی ادارت میں ''سہیل'' کلکتہ سے ۲۰۱۲ء سے باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ جس کے ''پرویز شاہدی نمبر''، ''سردار جعفری نمبر''، ''لطف الرحمن نمبر''، ''سالک لکھنوی نمبر''، ''کرشن چندر نمبر''، ''عصمت چغتائی نمبر'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ شہود عالم آفاقی اپنی زندگی کے آخری ایام تک ماہنامہ ''شہود'' نکالتے رہے۔ ان کے علاوہ مغربی بنگال سے شائع ہونے والے اردو ماہناموں کی بڑی تعداد ہے جن میں رسالہ ''جدید اردو'' (مدیر: پرویز شاہدی)، ''اقدار'' (مدیر: ظفر اوگانوی ۱۹۷۱ء)، ''ہنگامہ'' مٹیا برج (مدیر: جمال احمد محشر) ''پیش رو'' (مدیران: خواجہ نسیم اختر اور اکبر حسین اکبر)، ''آیات'' (مدیر: کامل اختر ۱۹۷۱ء)، ''سبد گل'' (مدیر: ولی صدیقی سلطان پوری)، ''عالمی لب ولہجہ'' کاشی پور کولکاتا (مدیر: ڈاکٹر یونس آرزو) جس کا ''ابراہیم ہوش نمبر'' اہمیت کا حامل ہے، ''صنعت و حرفت'' (مدیر: خرم خلیل اور بعد میں اس کے مالک محمد حنیف نے ادارت سنبھال لی)، ''تطہیر'' مٹیا برج (مدیر: سیّد محمد علی شہید)، ''سبطین آباد گزٹ'' (پرنٹر و پبلشر: پرنس انجم قدر مدیران: مشتاق جاوید و ڈاکٹر الف انصاری)، ''نشیمن''، ''نقشِ حیات''، ''محفل''، ''ادب اور اسپورٹس'' مٹیا برج (مدیران: مشتاق جاوید و ڈاکٹر الف انصاری)، ''کاف نون'' مٹیا برج (۱۹۸۰ مدیر: انور حسین انجم)، ''شرارت'' مٹیا برج (مدیر: اصغر رضوی)

،''آئینہ'' (مدیر: محی الدین شہزادہ)، ''نوری مجاہد''، ''سرکارِ ملت''، ''نوائے حبیب'' (مدیر: حبیبی)، ''شگوفہ''، ''ہمارا چمن'' ضیا برج (مدیر: محمد زاہد)، بچوں کا ماہنامہ ''نوخیز'' (مدیر: کامل حمیدی)، ''مدبرِ ہند''، ''تصوف ملی'' (مدیر: محمد یحییٰ ذکی اللٰہی افتخاری)، ''صارفین دوست'' (کلکتہ)، ''حضرت بلال'' (مدیر: محمد علی اعظم خان قادری)، ''صورت'' (مدیر: عمران راقم)، ''مقتل'' ضیا برج (مدیر: محمد افروز عالم)، ''شہرِ نشاط'' ضیا برج (مدیر: محمد خالد التمش)، ''نیا کھلونا'' (برائے اطفال، مدیرہ: خورشید جہاں)، بچوں کا ماہنامہ ''پھول''، ''طالب علم'' (ہوڑہ سے دو شمارے شائع ہوئے) وغیرہ اہم ہیں۔ ان میں سے چند کی اشاعت برسوں سے موقوف ہے۔ مغربی بنگال اردو اکادمی نے دسمبر ۲۰۱۳ء میں بچوں کے لئے ماہنامہ ''ستارے'' جاری کیا اور ہنوز اس کا دوسرا شمارہ شائع نہیں ہوا ہے۔ ہوڑہ سے دو ماہنامے ''محفلِ خوش رنگ'' (مدیر: محمد افضل خان) اور ''وقارِ عالم'' (مدیر: وفا عباس) شائع ہو رہے ہیں۔ کلکتہ سے کمال احمد ایک لٹل میگزین ''انکور'' کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ دیگر ماہناموں میں ''خورشید عالم''، ''نیرنگ عالم''، ''گلزار جہاں''، ''لختِ جگر''، ''مہر انتخاب''، العلماء''، ''آفتاب''، ''الرفیق''، ''المومن''، ''آئینہ''، ''تندرستی''، ''حور''، ''خادمِ کعبہ''، ''شفاء''، تحفۂ احمدیہ''، ''صہبا''، ''لسان الصدق''، ''قلم اسٹیج''، ''قلم ریویو''، ''نغمہ و نور''، ''نگارِ بزم''، آوازِ مشرق''، ''سمط'' (مدیر: مشتاق احمد) جس کے خاص شمارے ''ڈاکٹر جاوید نہال نمبر''، ''صغریٰ سبزواری نمبر''، ''شاہ مقبول احمد نمبر'' ہیں، ''معاون'' (مدیر: یونس نظری)، ''کہانی''، ''شفاء الملک''، ''انکشاف''، ''جدید لب و لہجہ''، ''آج کا سکندر'' برائے اطفال (مدیر: سید محفوظ عالم) وغیرہ کی اشاعت بھی کلکتہ اور اس کے مضافات سے ہوئی۔

''فانوس'' نام کا ایک ڈائجسٹ عطاء الرحمٰن اور ف.س. اعجاز (دو بھائیوں) کی ادارت میں ۱۹۶۵ء میں جاری ہوا جس کے ۱۳ شمارے باقاعدگی سے شائع ہوئے۔ یہ ہندوستان کا اولین اردو ڈائجسٹ اور بنگال کے اولین فوٹو آفسیٹ رسالے کے طور پر شروع ہوا۔ بعد میں بلاک، آفسیٹ اور لیتھو سے ملا جلا کر شائع ہوتا رہا۔ سید ایاز احمد روہوی نے طلباء کے لئے ماہنامہ ''منفرد'' جاری کیا جس کے ۶-۷ شمارے شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ''قلمی ہنر'' کے نام سے بھی ایک پرچہ نکالا۔ ''ارمغان'' (۱۹۵۴ء)، ''اخوت'' (مدیر: ''وقارِ مشرقی'' ۱۹۶۳ء)، ''اسپورٹس ٹوڈے'' (۱۹۷۲ء، مدیران: ولی صدیقی وغیرہ)، ''اعلانِ نو'' (۱۹۵۹ء، مدیر: جلال الدین قادری)، ''آفاق'' (۱۹۵۸ء، مدیر: شفیع نشاط)، ''پیغام'' (ضیا برج مدیر: عاشق حسین فہمی ۱۹۵۲ء)، ''تاج الفرمان'' (۱۹۶۷ء، مدیر: احسن لطیف)، ''جامِ کوثر جدید'' (۱۹۶۶ء، مدیر: ارشد القادری)، ''جامِ نو'' (۱۹۶۷ء، مدیر: ارشد القادری)، ''جہاں آرا'' (۱۹۶۴ء، مدیر: ناظر الحسینی اور انور حسین)، ''خوشبوئے ادب'' (۱۹۷۷ء، مدیر: جمیل اختر صدیقی)، ''دردِ دل'' (۱۹۶۶ء، مدیران: ولی صدیقی سلطان پوری، عالم باروی وغیرہ)، ''دلچسپ'' (۱۹۵۳ء)، ''دلہن'' (۱۹۵۳ء)، ''روپ چھایا'' (۱۹۷۴ء)، ''ساقی'' (۱۹۶۳ء، مدیران: شہزاد منظر اور اصغر حسین)، ''سیلاب'' (۱۹۴۷ء، مدیران: لطیف الرحمٰن اور ادریس الحق)، ''شہریں'' (بچوں کا رسالہ مدیر: خضر دانش ۱۹۷۲ء)، ''صدائے حریت'' (مدیر: ناظر الحسینی ۱۹۶۶ء)، ''ضربِ کلیم'' (۱۹۴۸ء ادارہ تحریر: شمیم پھلواری، پرویز شاہدی، ابراہیم ہوش)، ''علمی ڈائجسٹ'' (۱۹۷۶ء، مدیر: مفیض خان)، ''فلم ریویو'' (مدیر: انیس ساز ۱۹۶۳ء)، ''مجسمہ'' (مدیر: انیس رفیع ۱۹۶۶ء)، ''ندائے وطن'' (۱۹۶۵ء، ایم ابوالحسن خاں)، ''نگارِ عالم'' (مدیر: جمال احمد صدیقی)، ''نیا قدم'' (۱۹۷۲ء، مدیرہ: سیدہ جہاں آرا بیگم)،

"تبصرہ" (۱۹۸۲ء، مدیر: محمد علی صدیقی [فراغ روہوی] کل ۱۶ر شمارے شائع ہوئے)، "سنگِ میل" (صندل اسٹریٹ ۵ر شمارے شائع ہوئے)۔

کولکاتا کے مضافات جگتدل سے شائع ہونے والا ایک آن لائن میگزین "کائنات" (۲۰۰۰ء، مدیر: خورشید اقبال) عرصۂ دراز تک ویب سائٹ urdudost.com پر جاری رہا مگر فی الحال اس کی اشاعت موقوف ہے۔

ابونواب خاں روہوی کی ادارت میں "کلیدِ خزانہ" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کی ادارت سمیع احمد نے سنبھالی۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۴ء تک فراغ روہوی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ یہ شمع ادبی معمہ سے متعلق ایک تشریحی جریدہ تھا جو صرف ۸ر صفحے کو محیط ہوتا تھا۔

اختر بارکپوری نے فراغ روہوی کے تعاون سے دو ماہی "دستخط" ۱۹۹۹ء میں نکالا۔ اس کے دو خصوصی شمارے "رباعی نمبر" اور "قیصر شمیم نمبر" شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ "غنچہ"، "گلدستہ" اور "تخلیق" (ہوڑہ، مدیر: منصف علی) دو ماہی رسالے بھی یہاں سے شائع ہوئے۔

سہ ماہی رسالوں میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا رسالہ "روحِ ادب" پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر"، "مغربی بنگال کا اردو صحافت نمبر"، "عین رشید نمبر"، "سجاد ظہیر نمبر"، "بنگال میں اردو شاعری نمبر"، "بنگال میں اردو ادب" وغیرہ کے علاوہ خصوصی گوشے شائع ہوئے۔ نوشاد مومن نے ۱۹۹۹ء میں "مژگاں" جاری کیا اور اس کے شمارے وقفے وقفے سے منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔ اس کے ایک ضخیم نمبر بنام "نئی نسل نیا ادب نمبر" کے علاوہ بھی کئی ایک نمبروں کی اشاعت ہو چکی ہے۔ "شہرِ نو" مٹیا برج (مدیر: صابر رضا شمسی) کا ایک ہی شمارہ ۲۰۰۱ء میں نکلا۔ فراغ روہوی کے سہ ماہی رسالے "ترکش" (اجراء ۲۰۰۱ء) کا اشاعتی سلسلہ ۲۰۱۱ء تک جاری تھا۔ اس کا ایک خاص شمارہ "جاوید دانش نمبر" ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے صرف ۱۲ر شمارے منظرِ عام پر آئے۔ "دستک" (مدیر: عنبر شمیم) کے ۵ر شمارے ہی شائع ہو سکے۔ "اثبات و نفی" (مدیر: عاصم شہنواز شبلی) کی اشاعت کا سلسلہ بھی بند ہے۔ اس کے چھ شمارے ہی اشاعت پذیر ہوئے تھے۔ "عبرت"، "۱۶ر آنہ" (ہوڑہ، ڈاکٹر جوہر غازی پوری)، "ہوڑہ ٹائمز" (ہوڑہ، قیصر شمیم و نور قریشی)، "ورق ورق"، "مساواتِ ہند"، "اخترِ ہند"، "انکشاف" (ہوڑہ، مدیر: کلیم حاذق) وغیرہ کی اشاعت بھی یہاں سے ہوئی۔ کولکاتا میونسپل کارپوریشن سے "کولکاتا پُر وشری" (مدیرِ اعلیٰ: شہید الاسلام) کا ایک ہی شمارہ مارچ ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اس کی اشاعت نہیں ہوئی۔ ۲۰۱۴ء سے "بزمِ افضل" کے تحت "فکر و تحریر" (مدیر: ڈاکٹر نعیم انیس) کی اشاعت ہو رہی ہے۔

مغربی بنگال میں سالنامے زیادہ تر مختلف تنظیموں اور اداروں کے مجلّوں کی صورت میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا مجلّہ "دستاویز" سب سے اہم ہے۔ اس کے تین شمارے ۸۶-۱۹۸۳ء کے درمیان شائع ہوئے مگر تسلسل قائم نہیں رہا۔ سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہناز نبی نے ۲۰۰۳ء میں اس کی ازسرِ نو تجدید کی اور اس کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ "بزمِ احباب" کے دو مجلّوں "جشنِ زریں" (۱۹۷۱ء) اور "لالۂ صحرا" (۲۰۰۴ء)، مسلم انسٹی ٹیوٹ کے دو مجلّے "گنجینۂ معنی" (غالب صدی اور اقبال صدی کے موقع پر)، "قرطاس و قلم" کانکی نارہ (مدیر: احمد کمال حشمی)، "صدف" (مدیر: قیوم بدر جگتدل)، سالانہ مجلّہ "امانت" (۲۰۱۵ء، مدیر: ڈاکٹر

محمد علی حسین شائق)، ''پرواز'' کلکتہ مانو مسلم انسٹی ٹیوٹ اسٹڈی سینٹر (مدیر اعزازی: ڈاکٹر نعیم انیس)، سالانہ مجلّہ ''کہکشاں'' (مانو مٹیا گرزھ اسٹڈی سینٹر مدیر: محمد ابراہیم ۲۰۱۴ء)، ''آئینۂ خیال'' (کلکتہ)، ''تحفہ''، ''سوغات''، ''شاہکار''، ''تعارف''، ''شفق''، ''ستارے مغربی بنگال کے'' (مدیر: کلیم آذر، رابعہ بازار، کولکاتا) ''موجِ قلم'' (بزم شار، کلکتہ کا مجلّہ)، ''لختِ جگر'' (کلکتہ)، الحمد ایجوکیشنل آرگنائزیشن، فیرس لین کا مجلّہ ''آگہی''، تانتی باغ پروگریسیو سوسائٹی کا مجلّہ ''اقراء'' (مدیر: علی اصغر) ''مینارِ عظمت'' (مدرسہ عظمتیہ کا دو سالہ مجلّہ)، محمد جان ہائر سیکنڈری اسکول میگزین، ''لمعات'' (سی ایم او گرلس ہائی اسکول کا مجلّہ) آل انڈیا قومی ایکتا منچ کا سالانہ مجلّہ (سکریٹری: آفتاب احمد خان)، ''صبحِ نو'' (کلکتہ مدرسہ، اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ کا مجلّہ)، ''عکسِ حیات'' (مدیر: علی شیر خاں)، محمد علی لائبریری کا مجلّہ، کے ایل ایچ کل ہند مشاعرہ کا مجلّہ (زیر اہتمام مولانا شوکت علی فاؤنڈیشن)، ''کہکشاں'' (ہندوستانی لائبریری مٹیابرج کا مجلّہ)، ''کرنیں'' (بنگالی بازار ہائی اسکول، مٹیابرج کا سہ سالہ میگزین)، مٹیابرج ہائی اسکول میگزین (سہ سالہ)، اسلامیہ ہائی اسکول کا مجلّہ گولڈن جبلی، مولانا آزاد کالج کا مجلّہ، ایجوکیشنل کوآرڈی نیشن کمیٹی کا سالانہ مجلّہ، ''تعبیر'' (اے ایم او غنی میموریل پرائمری اسکول کا مجلّہ-۲۰۰۹ء)، مسلم پرسنل لا بورڈ کا مجلّہ، ''بازگشت'' (شیب پور، ہوڑہ سے بزمِ غواص کا مجلّہ)، ''مشرق ایجوکیشنل ٹرسٹ'' کا مجلّہ، ''مجلّہ یادگار وحشت'' (مرتب: اسحٰق راشد)، سریندر ناتھ ایوننگ کالج کا چہار لسانی (اردو، انگریزی، بنگلہ، ہندی) مجلّہ ''مسرت'' (۲۰۰۷ء)، ڈاکٹر صباح اسماعیل ندوی کی ادارت میں ''لاریب'' (مدرسہ باب العلوم مولا علی) کا ''حمد نمبر'' (۱۹۸۵ء)، انجمن ترقی اردو ہند کے ریاستی کنونشن منعقدہ مٹیابرج کے مجلّے ''دستاویز'' (۲۰۰۵ء) اور ''انجمن'' (۲۰۰۹ء)، مجلّہ آئینہ (۱۹۸۵ء) اور ''دریچہ'' دو شمارے ۱۰-۲۰۱۱ء میں کمرہٹی سے (مدیر: ممتاز انور)، مولانا آزاد اردو لائبریری، گارولیا، شیام نگر کا مجلّہ ''الہلال'' (چند شمارے) وغیرہ کی اشاعت ہوئی۔

مغربی بنگال اور کولکاتا میں اردو صحافت پر چند مضامین پہلے بھی قلم بند کیے جا چکے ہیں مگر جہاں تک مکمل کتاب کا سوال ہے، اس سلسلے میں اب تک چار اہم کتابیں ''بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ'' (مصنف: شانتی رنجن بھٹاچاریہ، نظر ثانی اور اضافہ: رئیس احمد جعفری ناشر مغربی بنگال اردو اکاڈمی اشاعت: ۲۰۰۳ء)، ''کلکتہ کی اردو صحافت اور میں'' (مصنف: رضوان اللہ اشاعت: ۲۰۰۶ء)، ''مغربی بنگال میں اردو صحافت'' (مصنفہ: ڈاکٹر فریدہ انور اشاعت: ۲۰۰۹ء) اور ''میں اور میری صحافتی زندگی'' (مصنف: سلطان شاہد اشاعت: ۲۰۱۴ء) منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کتابوں سے مغربی بنگال میں اردو صحافت کی تقریباً ۲۰۰ سالہ تاریخ اور نشیب و فراز کا مبسوط علم ہوتا ہے۔

راقم الحروف (ڈاکٹر امام اعظم) کی ادارت میں دربھنگہ سے شائع ہونے والے ادبی جریدے ''تمثیلِ نو'' کے اب تک چار موضوعاتی شمارے کولکاتا سے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا شمارہ ''اردو ناول کا پس منظر اور پیش منظر''، دوسرا شمارہ ''مغربی بنگال میں ادبی پیش رفت: اکیسویں صدی کے تناظر میں''، تیسرا شمارہ ''شہر کولکاتا کی منظوم مختصر تاریخ'' ہے اور چوتھا شمارہ ''اکیسویں صدی میں اردو صحافت'' (زیر نظر شمارہ) ہے۔ مذکورہ موضوعاتی شماروں میں دو شمارے کولکاتا کے ادبی و ثقافتی پس منظر اور عصری میلانات پر مختص ہیں۔ اس سے ''تمثیلِ نو'' کی کولکاتا میں پیش رفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کاوشوں کو اس شہر کی ادبی و ثقافتی تاریخ سے جوڑ کر دیکھنا سودمند ہوگا۔

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو صحافت کی ابتداء بنگال سے ہوئی ہے جسے بعد میں پیشے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس میں لکھنے والوں نے استدلالی اور معروضی دونوں طریقہ ہائے کار استعمال کئے اور مختلف النوع معلومات کثیر تعداد میں پڑھنے والوں کو مہیا کرائیں۔ عرق ریزی اور دقتِ نظری کے ساتھ مواد کی فراہمی کی گئی خواہ موضوع سیاسی ہو، سماجی ہو، مذہبی ہو یا ادبی ہو۔ صحت مند معاشرے اور سماج کے ہر طبقے کیلئے مواد پیش کیا گیا جس کی وجہ سے عوام کی وابستگی اخبار سے بڑھی۔ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ صحافت کا مقصد کبھی نہایت پاکیزہ اور نصب العین مقدس ہوا کرتا تھا۔ جدوجہد آزادی اور ملک کی تمام تحریکوں کیلئے صحافت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ جیسا کہ اکبر الہ آبادی کا ایک مشہور شعر ہے :

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو　　　جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

لیکن کیا آج کی صحافت ان مقاصد کو پورا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے؟ صالح معاشرے کی تشکیل میں جو کردار صحافت کا ہونا چاہئے تھا کیا ایسا ہو رہا ہے؟ اب تو اخبارات و رسائل سود مند تجارت کے زمرے میں آچکے ہیں اور یہیں سے زرد صحافت کا تصور ابھرا ہے۔ تبھی تو شاعر کہتا ہے :

مرغ لڑائے جائیں گے بوٹی کے واسطے　　　اخبار نکالے جائیں گے روٹی کے واسطے

اکیسویں صدی میں دوسری زبانوں نے جس طرح خود کو سائنس سے جوڑ کر ترقی کی ہے، اردو نے بھی کروٹ بدلی ہے۔ آج اردو صحافت پرنٹ اور لیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے جانی جاتی ہے جس کے مشمولات اور طریقۂ کار عوام تک پہنچانے کی بہتر سے بہتر کوشش کی جاتی ہے۔ طریقۂ کار کے ساتھ موضوعات اور قارئین کے حلقوں کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ صحافت کا کینوس بہت بڑا ہے اور لوگ ملکی و بین الاقوامی امور سے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اسے جزوِ لاینفک بنا کر وسیع دائرے میں کم وقت میں تمام معمولات حاصل کرنا چاہتے ہیں ہفت وار ''گواہ'' حیدر آباد کے مدیر اور معروف صحافی ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کا ماننا ہے کہ :

> ''......موجودہ صورت حال میں اردو ادب اور صحافت، انٹرنیٹ ہی کی مرہونِ منت نظر آتی ہے۔ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ آج کے دور میں کتاب اِن پیج پر کمپوز کی جاتی ہے، پروف ریڈنگ یا دیدہ ریزی کا عمل بھی اسی کے ذریعہ انجام پاتا ہے، ترسیل کے لیے بھی انٹرنیٹ (ای-میل) پر انحصار کیا جاتا ہے جب کہ طباعت کے مراحل میں بھی وہی ان پیج فائل ہی استعمال کی جاتی ہے۔ ان تمام مسائل و وسائل کی کمی کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو اور اردو صحافت کے مستقبل کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''　　(کتاب ''اردو میڈیا: کل آج کل'' ص: ۳۹۲)

ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بہر حال پرنٹ میڈیا کو متاثر کیا ہے لیکن صحافت اپنا راستہ ہموار کرتی ہی رہی ہے۔ اخباروں سے ہر ذوق کی آبیاری ہوتی رہی ہے جس میں سائنس، ثقافت اور تاریخ کے ساتھ کھیل کود، کارٹون اور دیگر تفریحات سے متعلق مواد پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کولکاتا سے شائع ہو رہے اخبارات و رسائل کی سمت و رفتار سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو صحافت میں بنگال کا اہم رول ہے۔

☆☆☆

موبائل : 08902496545

سلمان عبدالصمد

اردو صحافت: چند بکھری بکھری دلچسپ باتیں

اردو صحافیوں کی نوک قلم سے انگریز کس طرح خائف سے تھے، اس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلاتفریق مذہب وملت جدوجہد آزادی کے زمانہ میں سب سے زیادہ نشانہ پر انگریزوں نے اردو صحافیوں کو لیا۔ جس نازک دور میں باضابطہ اردو صحافت کا آغاز ہوا، اس دور میں ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی جانبداری کو ہوا دی جائے۔ چنانچہ اردو صحافت نے اس ماحول میں یعنی اپنے ابتدائی دور میں جو کچھ کیا اسے سیکولرزم کے فروغ کے تناظر میں انتہائی کامیاب کردار کہا جاسکتا ہے۔ خاص طور سے صحافت کی آڑ میں اردو صحافیوں نے اسلامی حمیت کو جگا کر آزادی کی شمع فروزاں کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس کی مثال کسی بھی زبان کی صحافت میں نہیں ملے گی اردو صحافت کے علاوہ کسی زبان کی صحافت کو یہ فخر بھی حاصل نہیں ہے کہ اس نے اول دن سے توپوں کا مقابلہ کیا ہو۔ اردو صحافت کو یہ بھی ناز ہے کہ اس نے حب الوطنی کے محاذ کی قربان گاہ پر اپنی تاریخ کے اولین صحافی مولانا باقر کی قربانی دی۔ آزادی کی لڑائی فقط کسی طبقہ کی نہیں تھی، کسی ایک گروہ کی نہیں تھی، پورے ملک کی تھی، پورے قوم کی تھی، اس میں اردو صحافیوں کے ذریعے انجام دیے گئے کارناموں کو کیسے سیکولرزم سے الگ کر کے دیکھا جاسکتا ہے، بلکہ انہوں نے سیکولرزم کے فروغ میں مذہبی حمیت کو بیدار کیا ہے۔

مولانا آزاد نے کہا:

''یاد رکھیے ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے'': [1]

زبان کی تفریق کے بغیر عصر حاضر میں یہ غور وفکر کا موضوع ہے کہ آج صحافت سیکولرزم کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہی ہے؟ لوگوں کے دلوں کو جوڑنے میں کس حد تک کامیاب ہے؟ یا پھر صحافت اور صحافتی اداروں پر جانبداری کے جو الزامات لگ رہے ہیں، اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ دور نہ جا کر الیکشن 2014 کے درمیان صحافت نے کیا گل کھلائے، اس سے تقریباً ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔

موجودہ دور میں اردو صحافت افراط کی شکار ہے تو دوسری زبان کی صحافت تفریط کی۔ جہاں اردو صحافت مواد اور زبان وبیان کے لحاظ سے تنزلی کی شکار ہے تو وہیں دوسری بڑی زبان کی صحافت جانبداری کے کھیل میں مصروف۔ جدید تقاضوں کو پورا کرنے سے جہاں اردو صحافت قاصر ہیں، وہیں دیگر زبانوں کی صحافت حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں بازی لے جانے کی ڈور میں شامل ہیں۔ پوری دنیا سے قطع نظر فقط ہندوستانی تناظر میں دیکھیں کہ ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے متنفر کرنے میں صحافت کس طرح مستعدی دکھا رہی ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ آج صحافت کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ کیسے لوگوں کو جوڑے، کیسے ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے قریب کرے۔ بقول شخصے:

"مذہب کو مذہب سے دور کرنے میں آج صحافت بڑی بھومیکا ادا کر رہی ہے، مگر پھر بھی صحافت مذہب سے دور؟ سیاسی دنیا میں گند پھیلانے میں میڈیا آگے، پھر بھی میڈیا سیاست سے الگ ؟ جانبداری اور عصبیت کے فروغ میں صحافت پیش پیش، پھر بھی غیر جانبداری اور رواداری کا سب سے بڑا علمبردار؟ واہ میڈیا تیری بھی کیا قسمت، کیا نرالی ہے تیری شان، تیری کرامت پر کون نہ ہو جائے قربان، قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔" [۲]

جمہوریت کی خاص طور سے اردو میڈیا کو سوچنا پڑے گا کہ اردو صحافت نے بے سروسامانی کے باوجود اپنے ابتدائی زمانہ میں جتنے اہم کام کیے، اتنے کام ہم اس دور میں کر رہے ہیں؟ اردو صحافت نے آزادی کے زمانہ میں جس طرح پورے ملک کی نمائندگی کی، کیا آج بھی ہم پورے ملک کی نمائندگی کر رہے ہیں یا پھر ہمارا دائرہ محدود ہو گیا ہے اور دن بدن محدود ہوتا بھی جارہا ہے؟ بلکہ جس طبقے کی نمائندگی کے لیے اردو صحافت مشہور ہے، اس کی بھی نمائندگی صحیح معنوں میں نہیں ہو پارہی ہے۔ یہ انتہائی خوشی کی بات ہے کہ ناموافق حالات میں ہندوستانیوں کو اردو صحافت نے سب سے زیادہ سہارا دیا، مگر موافق اور معمول حالات میں اولوالعزمی کی روح پھونکنے والی اردو صحافت دگر زبان کی صحافت کی طرح بے راہ روی کی شکار ہوتی جارہی ہے۔ ہندوستانی تناظر میں سچی بات یہ ہے کہ دگر زبان کی صحافت سے کہیں زیادہ اردو صحافت پر سیاست حاوی ہے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اردو صحافت سیاست کی جولان گاہ بن کر رہ گئی ہے، وجہ اس کی کیا ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ صحافت پر کسی دباؤ یا غلبہ کے تناظر میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے اور چاندی وسونے کا سایہ بھی اس کے لیے سم قاتل ہے جو اخبار نویس رئیسوں کی ضیافتوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی عطیوں، قومی امانت اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں، وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں بہتر ہے۔" [۳]

جس طرح آج سیاست سے شفافیت غائب ہوگئی ہے، اسی طرح صحافت سے شفافیت دور ہوتی جارہی ہے۔ سیاست کا آج صحافت پر غلبہ اور دبدبہ ہے۔ اسی غلبے کی وجہ سے صحافت کا اہم عنصر غائب ہوتا نظر آرہا ہے۔ آج شاید 'میڈیا' تو آزاد ہے پر 'جرنلسٹ' نہیں، 'میڈیا کارخانہ' چلانے آزاد ہیں، پر 'قلم' چلانے والے نہیں۔ 1980 سے عالمی میڈیا کی صورتحال پر رپورٹ پیش کرنے والے امریکی فریڈم ہاؤس کی رپورٹ کے مطابق کارپوریٹ میڈیا گھرانے میں جرنلسٹوں کے الجھنے کے معاملے میں انڈیا 78ویں نمبر پر ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ جب بھی میڈیا کے تعلق سے کوئی رپورٹ پیش ہوتی ہے، تو اس کی مخالفت میڈیا گھرانے کرتے ہیں اور فی الفور ایوان میں بیٹھے افراد بھی ان کے ہی سر میں سر ملاتے نظر آتے ہیں، کیوں انھیں یہ خوف ہوتا ہے کہ رپورٹ کی سفارشوں کی عمل درآمدی کے بعد میڈیا کو کھلونا بنانا آسان نہیں رہ جائے گا، جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید میڈیا کی آزادی سیاستدانوں کی آزادی پر قدغن ہے۔ عمومی تناظر میں دیکھیں تو میڈیا 'آزاد' ہے، اگر نہیں ہے تو جوابدہ نہیں۔ اس

لیے میڈیا اسی وقت مثبت تنقید کر سکتا ہے، جب وہ جوابدہ ہو۔ یہ عجب بات ہے کہ میڈیا کو جمہوریت کا چوتھا ستون تو تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر جمہوریت کے استحکام کے لیے کچھ کام نہیں لیا جاتا (مگر ذاتی مفاد کے لیے تو خوب)۔ ہندوستان میں میڈیا کے ذریعہ جمہوریت کو مفید بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ماضی میں پیش کی گئیں رپورٹس پر عملدرآمد کیا جائے۔ ورنہ مسلسل میڈیا کے غلط استعمال کی صورت میں ملک کے عوام کو انگریزوں کی ''ورنا کولر ایکٹ'' کا احساس ہوگا، یعنی لوگ یہ محسوس کریں گے کہ پریس کی آزادی بالکل ختم ہوگئی ہے، میڈیا ملک کی بھلائی کے لیے کچھ نہیں کر پا رہا ہے، بلکہ وہی چیزیں فروغ دے رہا ہے جو موجودہ حکومت کے مفاد میں ہے، ان کی ذہنیت کو فروغ دینے میں معاون ہے، حالانکہ انگریزوں نے ورنا کولر ایکٹ لا کر عوام کے ساتھ ساتھ صحافیوں اور صحافت سے جڑے گھرانے کو قید کرنے کی کوشش کی، مگر میڈیا آج جس راہ پر گامزن ہے، اس میں عوام کا نقصان ہے اور جمہوریت کا بھی، کیوں کہ میڈیا کو جس طرح پالیسی میکروں سے جوڑنا چاہئے، اس میں کامیابی نہیں مل پا رہی ہے اور نہ ہی صحافی مثبت تنقید کر پا رہے ہیں، چنانچہ آج صرف فائدہ میں ہیں تو میڈیا گھرانے اور میڈیا کے سہارے عیش پرست سیاسی لیڈران۔ اس لیے صحافیوں کی تنقید سے جمہوریت کو مفید بنانے کے لیے ضروری ہے کہ میڈیا گھرانے سے میڈیا کو آزاد کرانے کی کامیاب کوشش کی جائے۔ صحافت اور صحافیوں کا خمیر دراصل جواں مردی، بلندی حوصلگی اور بے باکی سے تیار ہونا چاہیے، مگر اخبار کے مالکان کی مفاد پرستی سے صحافیوں کا جوش وجذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ اگر گہرائی سے دیکھیں تو مفاد پرستی اور مصلحت پسندی کے بوجھ تلے صحافت کراہ رہی ہے اور صحافت کے لئے سب سے بڑا المیہ سیاست بن کر رہ گئی ہے۔ فی الوقت میرے نظریہ سے صحافت کو صحافت سے ہی جنگ درپیش ہے، یعنی اس دور میں صحافت کو صحافت کی آزادی کے لئے صحافیوں سے ہی جنگ کرنی ہوگی۔ صحافت نے آزادی کی جنگ جیتی ہے۔ صحافت نے غریبوں کی جنگ جیتی ہے۔ کیا اب صحافت صحافیوں سے صحافت کی آزادی کی جنگ جیت پائے گی؟ اگر اس جنگ میں صحافت کو کامیابی نہیں ملتی ہے تو سیکولرزم اور جمہوریت کمزور ہو جائے گی۔

صحافت کی آزادی کے پس منظر میں صحافیوں کو میرا پیغام ہے بسمل عظیم آبادی کا یہ شعر:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

'آج' صحافت بالخصوص اردو صحافت کے تذکرے کے وقت اہل مدارس کے فارغین کا تذکرہ نہ ہو تو صحافت کا باب پورا نہیں ہوتا ہے۔ 'آج' کا اضافہ بھی ضرور نہیں ہے۔ مدارس کے طلبا اور پروفیشنل تعلیم کی بات جب بھی کبھی ہوتی ہے تو صحافت کا صرف ذکر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس سے وابستگی پر انھیں ابھارا بھی جاتا ہے۔ انھیں یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اگر صحافت سے منسلک ہوں گے تو اغیار کی طرف سے اسلام پر ہونے والے حملوں کا جواب دینا آسان ہوگا۔ اسلام کی شبیہ مسخ کرنے والوں کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنا ممکن ہو سکے گا، ساتھ ہی ساتھ ان کے معاش کا معاملہ بھی کسی حد تک حل ہوگا۔ تاہم سوال یہ ہے کہ علاوہ اردو کے جو دیگر زبانوں سے ناواقف ہوں، وہ کیسے صحافتی میدان میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

ظاہر ہے جب وہ صرف اردو سے آگاہ ہوں گے تو فقط اردو صحافت تک ہی ان کی رسائی ہوگی؟ اردو صحافت سے اہل مدارس کی وابستگی پر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ صحافت سے انسلاک کے بعد مزید پستی میں چلے جاتے ہیں۔ نہ وہ دین کے رہ پاتے ہیں اور نہ ہی اسلام کے دفاع کا فریضہ انجام دینے کے لائق۔ سب سے مایوس کن بات یہ ہوتی ہے کہ معاشی معاملے کے پیش نظر اس میدان میں آنے کے باوجود بھی معاش کا معاملہ قطعاً بھی حل نہیں ہو پاتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آج اردو صحافت یعنی اردو اخبارات کے مالکان کو معیاری صحافت سے کوئی سروکار ہی نہیں، اسی لیے اگر باحوصلہ نوجوان اس میدان میں آکر کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں تو ہمت افزائی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے لیے حالات سازگار کیے جاتے ہیں۔ ہمت افزائی یا پھر حالات کی سازگاری کی توقع تو اس وقت ہی کی جاسکتی ہے نا، جب کہ معیار کا کوئی مسئلہ ہو۔ اس لیے روبہ زوال اردو صحافت (جی ہاں! میں ہوش وحواس میں روبہ زوال کہہ رہا ہوں) سے انسلاک کے بعد نہ صلاحیت بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کچھ سیکھنے کی، اگر کچھ سیکھنا ضروری ہے تو وہ پیج میکنگ، کیوں کہ آج کامیاب صحافی کا معیار دراصل پیج میکنگ ہی رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو اخبارات کے مالکان ننانوے فیصد پیج میکر ہی ہیں۔ اس صورتحال میں صحافت سے اہل مدارس کی وابستگی ان کے لیے کتنا مفید ہے، مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

اردو صحافت سے وابستگی کے بعد ان کی صلاحیت اور دینی حمیت کہاں چلی جاتی ہے، وہ اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، تاہم معاشی مسئلہ نہ حل ہونے کے بعد میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اردو صحافت کے ذریعہ اسلام کے دفاع اور اس کے فروغ کے بارے میں قطعاً غور وفکر نہ کریں۔ کیوں کہ نہ وہ علمی لحاظ سے موجودہ اردو صحافت کے لیے موزوں ہیں اور نہ معاشی نقطہ نظر سے! کیوں کہ اخبارات میں عمومی سیلری ''دہلی'' جیسے شہر میں چھ ہزار سے لے کر 9 ہزار تک ہوتی ہے، جس سے وہ نہ خود کفیل ہو پاتے ہیں اور نہ ہی گھر والوں کی کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ پروفیشنل میدان اور معاشی حل کا ڈھنڈورہ پیٹ کر صحافت میں داخل ہونے والے فضلاء: مدارس کے مدرسین سے پیچھے رہ جاتے ہیں، کیوں کہ آج بھی عمومی سیلری مدارس میں 5 سے 8 ہزار تک ہوتی ہے۔ اردو صحافت سے وابستگی کے بعد اہل مدارس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہو پاتا ہے، سوائے ''بلاعوض'' ضمیر فروشی کے۔ جی ہاں! مدارس کے فارغ التحصیل کو (جو صحافت سے وابستہ ہوتے ہیں عموماً ان پر ہی اخبارات کے ستون کھڑے ہوتے ہیں) کچھ بھی نہیں ملتا۔ البتہ ضمیر فروشی کرنی پڑتی ہے، وہ بھی بلاعوض۔ رہی بات اخبارات کے مالکان کی تو وہ بھی ضمیر فروشی میں بازی لے جانے کی ڈور میں تمام تر اخلاقی پہلوؤں کو روند ڈالتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ انھیں ضمیر فروشی کے عوض بہت کچھ مل جاتا ہے۔

جب ضمیر فروشی اور دین بیزاری کی نوبت یہاں آہی جاتی ہے تو دیگر ذرائع کو کیوں نہ اپنائیں، صحافت ہی کیوں؟۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق. جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ، تیرا ہی سنگ آستاں، کیوں ہو

میں وضاحت یہ بھی کرتا چلوں کہ اہل مدارس سے قطعاً یہ درخواست نہیں کہ وہ ضمیر فروشی کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھیں۔ صحافت نہ سہی، دیگر میدان میں ضمیر کی قیمت لگائیے۔ میرا مقصد اردو صحافت کے حالات سے بھی باخبر کرنا

ہے۔ یہ باخبری ان کے لیے بھی ضروری سمجھتا ہوں، جو اہل مدارس کو صحافت میں آنے کی تلقین کرتے ہیں یا پھر ان مدارس پر بھی یہ حقیقت واشگاف کردینا لازم ہے، جو صحافتی کورس شروع کرنے کے تعلق سے متفکر نظر آتے ہیں۔

گلوبلائزیشن کے اس دور میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ بڑے مدارس میں مختلف زبانیں سکھانے کا انتظام ہو، یعنی تخصص فی الادب، تخصص فی التفسیر، تخصص فی الحدیث کی طرح تخصص فی اللسان کا التزام ہونا ضروری ہے۔ دیگر تخصص تو فراغت کے بعد ہی تاہم ابتدائی درجات کی سرحد عبور کرتے ہی تخصص فی اللسان کا سلسلہ شروع کیا جائے، ملکی زبان کے ساتھ ساتھ غیر ملکی کم از کم دو زبانوں سے خاطر خواہ واقفیت کرادی جائے۔ اس طرح اسلام کا دائرہ تو وسیع ہوگا ہی، ساتھ ہی ساتھ روزگار کے مواقع بھی دستیاب ہوں گے۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے صحافتی میدان میں ان کی شمولیت ہوگی اور اردو صحافت میں بھی خاطر خواہ سیلری بھی بڑھے گی، کیوں کہ اخبار کے مالکان آج یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ مدارس کے فارغین جائیں گے تو جائیں گے کہاں، جھک مار کر ہمارے آفس میں منڈلائیں گے ضرور۔ پھر میں یہ کہتا ہوں کہ اردو اخبارات کے مالکان کے پاس آج اتنا سرمایہ ضرور ہے کہ وہ اپنے ''ملازمین'' کو اچھی سیلری دے سکتے ہیں، مگر بدقسمتی کی بات ہے...... اس لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ اگر اہل مدارس اردو کے علاوہ دیگر زبانوں سے واقف ہوں گے اردو صحافت کا معیار عمدہ ہوگا، زندگی کے دیگر میدان میں ان کی شمولیت بڑھے گی، صحافت اہل اسلام کے لیے مفید ہوگی، ساتھ ہی ساتھ ان کے معاش کا معاملہ بھی حل ہوگا۔

....

روم 29، ماہی ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی 67

موبائل : 9891233492 ای میل :salmansamadsalman@gmial.com

حوالہ جات وحواشی:

۱۔ الہلال 08 دسمبر 1912۔ مطبوعہ اتر پردیش، اردو اکادمی لکھنو۔

۲۔ جمہوریت کی نرالی شان: مضمون نگار احمد جمالی، انقلاب دکن۔ 17 نومبر 2011۔

۳۔ الہلال 27 جولائی، 1912، مطبوعہ اتر پردیش، اردو اکادمی لکھنو۔

● شہر کولکاتا کے خوش گلو شاعر شاہجہاں محیط کا ۱۵ راگست ۲۰۱۵ء کی شام کو انتقال ہوگیا۔ وہ عرصہ سے صاحب فراش تھے۔ موصوف خلیق انسان تھے۔ ان کی رحلت پر بزم شاکری کے اعزازی سکریٹری مصطفےٰ اکبر نے ۲۸ راگست ۲۰۱۵ء کو دفتر بزم شاکری میں ۳۰-۶ ربجے شام ایک تعزیتی نشست کا اہتمام کیا تھا۔ مرحوم بزم شاکری کے رکن بھی تھے اور راقم الحروف سے ان کی ملاقات بزم شاکری کے دفتر میں کئی بار ہوچکی تھی۔ ان کی شاعری سننے کا اتفاق بھی ہوا تھا۔ گذشتہ برس مصطفےٰ اکبر کی کوششوں سے مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے مرحوم کو یک مشت وظیفہ سے بھی نوازا تھا۔

شاہد الرحمٰن (نئی دہلی)

وہاب اشرفی کی صحافتی خدمات

(مباحثہ کی اداریہ نویسی کے تناظر میں)

سید عبدالوہاب اشرفی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا شمار نہ صرف بہار کی حد تک بلکہ ہند و پاک نیز دنیائے ادب وتنقید کے چند معروف اور معتبر نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہاب اشرفی تنقید نگار کے علاوہ افسانہ نگار، صحافی، مقرر، دانشور ادیب، محقق، مبصر، استاد اور منتظم کے طور پر مشہور ہوئے۔ ادب میں عام طور پر کسی نہ کسی مسلک سے جڑے رہنے کا فیشن رہا ہے لیکن ان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انہوں نے کسی دبستان کی بندھوا مزدوری قبول نہیں کی۔ ذہن ارتقا پذیر رہا اور نقطہ نظر عالمی ادب سے مرتب ہوتا رہا۔ اس لیے ان کی نگارشات ایک وسیع اور عالمی منظرنامہ پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے کسی تھیوری یا ادبی نظریہ کو حرف آخر نہیں مانا اور ہر ادبی تھیوری کو علم وفہم کا ایک نیا سراغ، ایک نیا سرچشمہ قرار دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا ذہن ہمیشہ کسی نہ کسی نئی کرید کی طرف مائل رہا۔ کچھ نیا جاننے، کچھ نیا کرنے، باخبر اور اپ ڈیٹیڈ رہنے کی جستجو ہی ان کے متحرک ذہن ومزاج کا اہم ترین سرمایہ تھیں۔ انہوں نے جہاں کلاسک کو بہ نظر وقیع دیکھا، وہیں جدید اردو کے شعری اور افسانوی ادب سے بھی کبھی پہلو نہیں بچایا۔ انہیں ہمیشہ زیادہ کام کرنے کی لت لگی رہی۔ برق رفتاری سے لکھتے رہے۔ جس طرح ان کی زندگی مختلف کاموں سے Occupied رہی، اس میں ایسا کر پانا ان کی بصیرت پر دال ہے۔

وہاب اشرفی ادب میں آفاقیت کے قائل ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب اور تنقید کا وسیع مطالعہ ہی کسی نقاد کی نگارشات کو وسیع اور وقیع بنا سکتا ہے۔ وہ ادب کو پروپیگنڈہ باور نہیں کرتے۔ وہ فن کار کے احساس جمال کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور بار بار اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ Art lies in concealing Art لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی حرف آخر اور کل ہے بلکہ شعر وادب کا مطالعہ پوری تہذیب کا مطالعہ ہے۔ جہاں تک سوال ان کے اسلوب تنقید کا ہے تو عام رائے یہ ہے کہ ان کی نثر صاف شفاف، ابہام سے عاری، پرمفہوم، رواں اور واضح ہے۔ اس میں پیچیدگی نہیں ہے۔

ان کی پیدائش تو بہار میں ہوئی لیکن ان کی صحافتی زندگی کی کرم بھومی کلکتہ بنا۔ دراصل جنگ آزادی کے خوف ویاس کے ماحول میں جب رقص ابلیس نے بہار میں زور پکڑا تو انہوں نے پہلے بنگال پھر بنگلہ دیش ہجرت کیا۔ بنگلہ دیش میں سیاسی خلفشار تو تھا ہی، اردو کے خلاف نفرت انگیز تحریک بھی زور پکڑنے لگی تھی۔ بددل ہو کر وہ دوبارہ 1952ء میں کلکتہ آئے۔ کلکتہ قیام کے دوران مختلف اخبارات ورسائل میں کام کیا۔ جن میں ''عصر جدید'' اور ''الحق'' اہم ہیں۔ انہوں نے کلکتہ سے ہی ایک روزنامہ اخبار ''اخوت'' بھی نکالا جو کچھ عرصہ تک خاصا ہنگامہ خیز ثابت ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ اس اخبار میں ش مظفر پوری اور نورالدین صاحبان بھی ایک عرصے تک کام کرتے رہے۔ وہاب اشرفی ''روزانہ ہند'' سے بھی جڑے۔ ان اخبارات میں ان کی حیثیت صحافی اور مترجم کی رہی۔

ادبی صحافت سے ان کی باضابطہ وابستگی اس طرح ہوئی کہ بعد میں انہوں نے رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ایک مجلّہ ''نئی قدریں'' نکالا جو جدید ادب کی تفہیم میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجلّہ میں شعبہ کے اساتذہ و طلبا کے کارآمد مضامین شائع ہوئے۔ یہ مجلّہ درحقیقت اردو میں عالمی ادب کی سمت و رفتار کی تفہیم کی ایک واضح اور کامیاب کوشش تھی۔ 59/1958ء میں قیامِ پٹنہ کے دوران ایک ماہنامہ ''صنم'' جاری کیا جو تقریباً پانچ برسوں تک نکلتا رہا۔ اس رسالہ کی عمر جتنی مختصر ہے مقبولیت اتنی ہی زیادہ۔ مجلس ادارت میں وہاب اشرفی کے علاوہ رفیع الدین احمد کا نام بھی چھپتا تھا۔ اس رسالے کے دو شماروں کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے کیونکہ یہ شمارے یعنی بہار نمبر اور افسانہ نمبر، خاصے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے۔ یہ وہاب اشرفی کی ذاتی لگن، محنت اور دلسوزی کا ہی ثمرہ تھا کہ انہوں نے کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی اور بہار کے دوسرے تمام شعراء اور ادبا کو پہلی بار یکجا کر دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ''صنم'' نے بہار کی ادبی خدمات کو منظر عام پر لانے میں اہم رول ادا کیا۔ ''صنم'' میں ہی جمیل مظہری اور اختر قادری کے درمیان وہ نا فراموش ادبی معرکہ سامنے آیا جس کی آواز بہار کی ادبی فضا میں دیر تک سنائی دیتی رہی۔ انہوں نے اپنے بعض صحافتی تجربات کو اپنی خود نوشت میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس اخبار کے ایڈیٹر سنجر عظیم آبادی تھے۔ سنجر کا کمال یہ تھا کہ وہ معمولی اجرت سے بہت سا کام کروا لیتے تھے۔ مہینے کے آخر میں کچھ دینے کی نوبت آتی وہ سبز باغ دکھاتے کہ کچھ طلب کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ اپنے اس فن میں ایسے ماہر تھے کہ مجھ جیسے لوگ جوراتوں کو جاگ جاگ کر نیوز بناتے، وہ بھی پورے معاوضے کے لیے اصرار نہیں کرتے۔'' (''قصہ بے سمت زندگی کا'' ص:68 2008ء)

کلام حیدری جیسے بالغ نظر صحافی اور ادیب کی قربت سے ان کے ذہن و شعور کو پختگی حاصل ہوئی۔ دراصل ان کے صحافیانہ مزاج کی بنیادی خمیر حیدری کی تربیت کا نتیجہ ہیں۔ کلام حیدری گیا سے ایک ہفتہ وار مورچہ نکالا کرتے تھے۔ وہاب اشرفی نے اس میں اپنا صفحہ کے نام سے بہت دنوں تک ایک ادبی کالم لکھا۔ محمود ہاشمی اور شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کا مشہور ادبی معرکہ اسی مورچہ میں پیش آیا۔ جس وقت یہ قلمی جنگ جاری تھی، اس وقت مورچہ کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس بحث سے وہ اہم نکات ضرور نکل کر سامنے آئے جن سے جدیدیت کی بحث کی باریکیاں عام تفہیم کا حصہ بن سکیں۔ اس بحث میں یورپی اور عالمی ادب اور اساطیر کے کتنے ہی گوشوارے منور بھی ہوئے۔

وہاب اشرفی نے باقاعدہ اپنا رسالہ مباحثہ سن 2001ء (اگست) میں جاری کیا۔ اس کے چھتیس سے زیادہ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ شہاب ظفر اعظمی ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''مباحثہ'' بھی پابندی سے شائع ہو رہا ہے جس نے نہ صرف ایک خاص پہچان بنالی ہے بلکہ بزرگوں اور معاصرین کے ساتھ نئی نسل کے قلمکاروں کے اندر بھی نیا جوش بھر دیا ہے۔ یہ وہ واحد رسالہ ہے جس نے نئی نسل سے نئے سرے سے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے مدیر وہاب اشرفی وہ واحد نقاد ہیں جنہوں نے نئی نسل سے دوستی کی، ان کی تحریروں کو پڑھا اور اداریے، مضامین اور تبصرے کی شکل میں ان کی تحریروں پر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کام جدیدیت پسندوں کی تخلیقات کا محاکمہ کرنے سے

زیادہ مشکل ہے۔ مگر وہاب اشرفی یہ کام لگاتار کررہے ہیں اور نئی نسل پوری طرح ان کا ساتھ دے رہی ہے۔'' (تحریک ادب، مدیر جاوید انور، شمارہ 9/10/11، ص:147، وارانسی، 2011ء)

شہاب ظفر اعظمی کی باتوں میں صداقت ہے اور ان کی گواہی اس لیے بھی قابل قبول ہے کہ وہ خود نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنی ادبی تربیت کو وہاب اشرفی اور ان کے رسالہ سے وابستہ کر کے دیکھتے ہیں۔ ان باتوں سے قطع نظر یہاں ان کے رسالہ مباحثہ کی اداریہ نویسی اور اداراتی نوٹ کا تجزیہ مقصود ہے کہ کسی بھی رسالے کا اداریہ کئی معنوں میں معاصر ادب کے مزاج کی پہچان میں معاون ہوتا ہے۔ اپنے رسالے کے ادبی جواز کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے اپنا اداریہ لکھا کہ:

''رسالہ 'مباحثہ' کی اشاعت کا جواز کیا ہے؟ پہلے ہی اردو میں چھوٹے بڑے رسالے ہندستان کے مختلف گوشوں سے نکل رہے ہیں ان کی نوعیت ضخامت کے اعتبار سے متنوع ہے۔ بعض تو اتنے ضخیم ہیں کہ انہیں پڑھنے کے لیے خاصا وقت چاہیے اور بعض چار چھ صفحات پر مشتمل۔ مواد اور ترتیب کے اعتبار سے بھی یہ ایک جیسے نہیں ہیں، تو پھر ایک اور رسالہ کیوں؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کا جواب جو بھی دیا جائے اس کی حیثیت عذر لنگ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بہر طور میرا جی چاہا کہ میں بھی ایک رسالہ نکالوں۔ یاد آتا ہے کہ آج سے تینتالیس سال پہلے دل مچلا تھا کہ عظیم آباد سے ایک ادبی رسالہ نکالوں۔ اس وقت ''صبح نو'' (ایڈیٹر وفا ملک پوری) اور ''اشارہ'' (ایڈیٹر قیوم خضر) اس سرزمین سے شائع ہورہے تھے۔ میں نوجوان تھا، ناتجربہ کار بھی۔ ایسے میں میرے دوست سید رفیع احمد کے مالی تعاون سے (جو چیف ایڈیٹر بھی رہے) ''صنم'' کا اجرا ہوا اور یہ رسالہ پورے پانچ برس تک ماہانہ بغیر کسی تعطل اور خلل کے شائع ہوتا رہا۔..... آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آج کی ادبی فضا بڑی وسعت کی حامل ہوگئی ہے۔ ایک طرف ادب کے نئے امکانات تلاش کیے جارہے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ایسے امکانات پر سوالیہ نشانات قائم کیے جارہے ہیں۔ میرے خیال میں دونوں رویے اپنی جگہ پر اہم ہیں اور ہوسکتے ہیں۔ اگر طرفین میں مجادلے کا انداز پیدا ہوتا جارہا ہے تو یہ بھی امکان کے اندر کا عمل ہے، تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ دلوں کا بخار نکل جاتا ہے تو سکون لازمی نتیجے کے طور پر ابھرتا ہے اور ساتھ ساتھ نئی توانائی اور نئی صحت بھی۔ ہاں کردار کشی نہ کی جائے یہ بڑا اچھا حربہ ہے۔ (''مباحثہ'' اگست 2001ء، ص:4-3)

ان باتوں میں وہاب اشرفی واضح طور پر یا براہ راست اپنے رسالے کے ادبی جواز کو Justify نہیں کررہے ہیں لیکن یہ تو سمجھ میں آہی جاتا ہے کہ رسالوں کی ضخامت سے نالاں ہوں نہ ہوں ادب کے معیار کو لے کر فکر مند ضرور ہیں اور شاید یہی ان کے رسالہ مباحثہ کے اجرا کا سبب بھی ہے۔

وہاب اشرفی نے اپنے پہلے اداریہ میں جو باتیں گوش گزار کی ہیں ان کو ہم نے مباحثہ کے کم و بیش ہر شمارے میں ملاحظہ کیا اور اس کے قارئین جانتے ہی ہیں کہ یہ رسالہ نئی نسل کا سب سے بڑا ترجمان رہا اور اس میں اکابرین ادب کی کارگزاریاں اور نگارشات بھی ساتھ ساتھ شائع ہوئیں۔ گویا یہ رسالہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب و

کامران رہا۔ اپنے پہلے ہی شمارہ سے مباحثہ میں وہاب اشرفی نے مشمولات کے سیاق وسباق اور مصنف کے مکتبہ فکر کی وضاحت اور کسی قدر تنقیدی نوٹ لکھنے کا جو رویہ اپنایا وہ بعد کے تمام شماروں میں نظر آتا ہے۔ یعنی انہوں نے ادارتی پالیسی کو قائم کرنے میں مدیرانہ تدبیر سے زیادہ ایک پڑھے لکھے مدیر کا رول ادا کیا۔ انہوں نے اپنے اس شمارہ میں بعض کالم کے اضافے کی جو بات کہی اس کو بھی انہوں نے نئی شعریات کی تفہیم کے عنوانات میں پیش کیا اور نئے ذہنوں کو جی کھول کر داد دی۔ مباحثہ کے پہلے شمارے پر کس نوع کا ردعمل ہوا اس کو ہم خطوط کے کالم 'نکتہ اور نکتہ داں' میں دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کا ایک اہم حوالہ خود دوسرے شمارے کا داریہ ہے۔ جس میں وہاب اشرفی رقمطراز ہیں:

''حیرت انگیز طریقے پر مختلف اذہان کے لوگوں نے اس کی تعریف وتوصیف کی۔ رسالے کے مشتملات پر خصوصی توجہ کی گئی۔ اس کا بھی اظہار کیا گیا کہ مختلف افکار کے لکھنے والے شاعر اور ادیب یکجا کر دیے گئے۔ اس لیے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ کسی ایک مکتبہ خیال کی توسیع واشاعت کا کوئی واضح منصوبہ نہیں رکھتا ہے۔'' (مباحثہ، اکتوبر۔نومبر، 2001ء، ص:3)

یہاں جو باتیں کہی گئی ہیں ان پر الگ سے تبصرے کی ضرورت نہیں لیکن ہمیں وہاب اشرفی کو اس بات کی داد دینی چاہیے کہ وہ خود ادب میں نئے فکر وخیال کی پذیرائی میں شدت پسند نہیں رہے اس لیے مابعد جدیدیت کے علمبرداروں میں شمار کیے جانے کے باوجود انہوں نے اپنے رسالے میں ادب کی مسلک بندی نہیں کی۔ رسالے کے اس مزاج کی نشاندہی کرتے ہوئے ان سے سوال بھی پوچھا گیا جس کے جواب میں انہوں نے لکھا:

''ایک بہت اہم سوال اٹھایا گیا کہ اب رسالے کی اشاعت اور اس کے مشتملات سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آخر مرتبین خصوصاً راقم الحروف کا ذاتی ادبی رویہ کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ جملے نقل کرتا ہوں جو میں نے ایک عرصہ پہلے اپنی کتاب 'آگہی کا منظر نامہ' کی پہلی اشاعت میں قلمبند کیا تھا۔ ''میری نگاہ میں ادبی روایات ہمیشہ محترم رہی ہیں چاہے ان کا تعلق کسی بھی دبستان سے ہو لیکن افکار وآرا کے ارتقا میں ادب کی نئی روش ہی کا رول سب سے زیادہ اہم ہے۔ تغیر وتبدل سے گھبرانے والے حقیقتاً ادبی رویوں کو جامد وساکت باور کرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ زمانی تبدیلیاں غور وفکر کی نئی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ ادب کو سڑنا گلنا نہیں ہے تو اس کی تازگی برقرار رکھنا پڑے گی اور اس کے لیے عالمی سطح پر ادبی رویوں کے تبدل وتغیر پر نگاہ رکھنی پڑے گی اور اس کے لیے وسیع اور گہرے تقابلی مطالعے کا چیلنج قبول کرنا پڑے گا، ورنہ ادبی تفہیم کا لامتناہی پس منظر آنکھوں سے اوجھل رہے گا اور اگر ایسا ہوا تو پسماندگی مقدر بن جائے گی ——— میرا موقف یہ ہے کہ جہاں ادب کے کچھ مقامی مطالبات ہیں وہاں آفاقی تناظر بھی اس کا نصب العین ہے۔ کوئی نقاد اس احساس کے ساتھ کچھ لکھتا ہے تو گویا اس کی کاوش ہے کہ وہ اپنے ادب کو نئے رنگ وروغن دے کر اسے عالمی سطح پر لا کھڑا کرے۔ وہ اپنی کوشش میں ناکامیاب ہو سکتا ہے، لیکن اس کی سعی غیر مستحسن سمجھی جائے گی۔'' (ایضاً ص:5-4)

ان کی ان باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاب اشرفی ایک مدیر کے طور پر بھی ایک ادبی نقاد کا فریضہ

انجام دے رہے تھے اور نقاد ان معنوں میں نہیں تھے جن معنوں میں کوئی نقاد ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید ہوتا ہے۔
ہم ان دو شماروں کے اداریہ سے جان چکے ہیں کہ وہاب صاحب کا ادبی رویہ اور صحافتی رویہ کوئی دو بات نہیں بلکہ یہ اپنے ادبی آہنگ میں ایک ہی ہیں۔ ہم ان کے تنقیدی وسائل کو بھی پہلے سے ایک طالب علم کے بہ طور جانتے ہیں لیکن یہاں ان کے اداریہ کے بعض ان پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہے جن میں انہوں نے تخلیق اور تخلیق کار کے بارے میں لکھا ہے۔ مثال کے طور پر شمارہ 10 / فروری مارچ، 2003 میں وہ لکھتے ہیں:

''ابوالکلام قاسمی مابعد جدیدیت کی بعض شقوں پر مسلسل توجہ کر رہے ہیں۔ اس باب میں بھی ان کے مضامین توجہ سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ نوآبادیاتی فکر اور اردو کی ادبی وشعری نظریہ سازی، ایک معیاری مضمون ہے جس میں نوآبادیات کی فکری جہتوں پر روشنی پڑتی ہے...... ان کی فکر سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا''۔ (مباحثہ، ص:4)

اسی طرح اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا ذاتی خیال ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا یہ انتخاب خود اردو کی عظمت پر دال ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ اس زبان کے لیے ہزار کاوشیں سہی لیکن اس کا کوئی ادیب اگر بہت ممتاز ہے، دانشور ہے اور دلوں کو جیتنے کا گر جانتا ہے تو آج بھی کسی سخت مرحلے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ پروفیسر نارنگ کی کامیابی ایک کھلے ذہن کے مصنف، انسان دوست، دوسری زبانوں سے یکساں محبت کرنے والے، غیر متعصب دماغ اور ذی ہوش فرد کی کامیابی ہے، جس کا جشن اردو والوں کو تو منانا ہی چاہیے۔'' (ایضاً، ص:9)

رسالے شائع ہوتے ہیں تو اداریے بھی لکھے جائیں گے۔ لیکن مباحثہ کے اداریے میں جو منشور وہاب اشرفی نے طے کیا، وہی اس کی کامیابی اور شہرت کی وجہ بن سکا۔ جلد 8، شمارہ 29، 2008 میں اداریے کی ہیئت وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''رسالے کی ادارت کل وقتی چیز ہے، محتویات کے انتخاب میں خاصی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ متون کا براہ راست مطالعہ کیجیے پھر ان پر رائے زنی، دونوں ہی وقت طلب اور دقت طلب ہیں۔''

(مباحثہ، وہاب اشرفی، ص:6)

کتابیں چھپتی ہیں پھر ان پر تبصرہ آتا ہے۔ لیکن تبصرے عام طور پر ایسے ہوتے ہیں کہ کتاب میں کیا ہے، وہ ان کا پتہ نہیں دے پاتے ہیں۔ ہاں خدوخال کا تھوڑا بہت علم ضرور ہوجاتا ہے۔ وہاب اشرفی تبصروں سے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ تبصرے دراصل نگارشات اور مصنف یا شاعر کی شناخت کا شاید کام سرانجام دیں۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ متعلقہ کتابوں کے نقوش واضح طور پر ابھر جائیں اور انکی ادبی قدر متعین ہو۔'' (ایضاً، ص:9)

کاش ہر مبصر اس اصول کا پابند ہوجائے تو نہ صرف یہ کہ تنقیدی ذہن وشعور عام ہوجائے گا بلکہ ادب میں قدر تعین بھی ابہام سے عاری ہوجائے گا۔ اردو میں ایک بدعت عام ہے کہ جن پر لکھا گیا خوب لکھا گیا اور جن کو نظر انداز کیا گیا تو ایسا کہ مانو ادب میں ان کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں۔ لیکن وہاب اشرفی نے نئے پرانے، کم زیادہ، مشہور

غیر شہرت یافتہ، ادیب شاعر، تنقید نگار مبصر، ہر انواع و اقسام کے اصحاب کے لیے مباحثہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا۔ نئے لکھنے والوں کو تو خاص طور پر بڑھ کر گلے لگایا، ان کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کی سرپرستی بھی کی۔ ان کو خوب سے خوب تر لکھنے کے لیے Inspire بھی کیا۔ حالاں کہ عام روش یہی رہی ہے کہ بڑے اور Established لکھنے والے نو واردین کو منہ بھی نہیں لگاتے۔ لیکن وہاب اشرفی کا شیوہ ہمیشہ بہ انداز ے دگر سامنے آیا۔

وہاب صاحب کا رسالہ ہر طرح سے عصری ادبی صحافت میں اپنی مثال آپ تھا۔ سید عبدالوہاب اشرفی کی مختلف ادبی صنفوں سے وابستگی رہی اور خوب رہی۔ مقام افسوس ہے وہ ہمارے بیچ نہیں رہے۔ لیکن انسان سانسوں کی ڈور کے تحت موت و حیات کا غلام اور قیدی بن جائے تو پھر وہ وہاب اشرفی کیوں کر ہو؟ وہاب اشرفی تو وہ ہیں جو ادب کے مختلف پیرایوں میں پنہاں ہو کر ہماری زندگیوں میں، شعور لاشعور میں، ذہن و دماغ میں شامل ہیں۔

....

ترنم جمال (کولکاتا) کی بحث طلب کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی سے انٹرویوز'' شائع ہوگئی۔ اس میں فہیم اعظمی، کیول دھیر، افتخار امام صدیقی، خوشتر نورانی، کوثر صدیقی، ایوب جوہر، سیّد احمد قادری، نعیم اشفاق، امام اعظم، محسن جلگانوی، نقوش نقوی، قمر جہاں، اکمل شاکر، محمد افضل خاں، خلیل انجم، عالم گیر ساحل، قیصر زاہدی، اظہر نیر، ایم زیڈ خان، سرفراز تبسم، نوشاد عالم آزاد، خالد بصری، آفرین حق، محمد قسیم اختر، شیران اسماعیلی، طاہر گلشن آبادی، احمد معراج، عبدالرحمٰن عبد، طارق انور اور حسن فیضی وغیرہ کے انٹرویو شامل ہیں۔

صفحات : ۲۱۲ قیمت : ۲۲۵ روپے

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

۳۱۹۱ روکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۱۱۰۰۰۶

حلیم صابر کا قطعہ مطبوعہ روزنامہ ''اخبارِ مشرق'' کولکاتا ۱۹ر فروری ۲۰۱۶ء

ترنم جمال کی کتاب

ہے یہ کتاب سوال و جواب پر مبنی — ادیب و شاعر و ناقد کی ذات سے منسوب
مناظر عاشق ہرگانوی کا انٹرویو — کیا ہے پیش ترنم جمال نے کیا خوب

ڈاکٹر نصرت جہاں

مغربی بنگال کی اردو صحافت میری نظر میں

اردو غزل نے جہاں لفظوں کی بندشوں سے آہنگ پیدا کیا وہیں اردو صحافت نے غلامی کی سنگلاخ زمین پر آزادی کے نقش بنائے۔ عموماً 'دہلی اردو اخبار' کو اردو کا پہلا اخبار قرار دیا جاتا ہے جس کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر تھے لیکن اس کی اشاعت ۱۸۳۵ء ہے اس لحاظ سے بنگال کا نام اردو صحافت کی دنیا میں سر فہرست ہے۔ اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ۲۷ر مارچ ۱۸۲۲ء میں بنگال کی سرزمین سے شائع ہوا۔ جس کے ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال تھے آزادی کی لڑائی میں کتنے صحافیوں نے جام شہادت نوش کیا۔ کتنے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیئے گئے۔ کتنے اخباروں کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ کتنے سنسر کا شکار ہوئے۔ مولوی محمد باقر پہلے صحافی تھے جنہیں سرعام توپ سے اڑا دیا گیا۔ ۱۸۴۱ء میں مدراس سے پہلا اردو اخبار ''جامع الاخبار'' نکلا۔ ۱۸۴۸ء میں کیرالا سے ''اعظم الاخبار''، ۱۸۵۳ء میں بہار سے ''نور الانوار''، ۱۸۷۸ء میں حیدرآباد سے ''آصف الاخبار'' کی اشاعت ہوئی۔

۱۸۵۷ء تک اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں اخبارات کی کل تعداد ۲۶ر تھی جس میں صرف ۱۹ر اردو کے اخبارات تھے۔ ۱۸۵۷ء تک اخبارات کی تعداد بڑھ کر ۴۱۵ ہوگئی تھی جن میں صرف اردو ہی میں ۳۱۵ر اخبارات نکلتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ۱۸۵۷ء تک اردو میں نکلنے والے اخبارات میں سیاسی شعور کا فقدان تھا لیکن ''دہلی اردو اخبار'' وہ واحد اخبار تھا جس نے اس عہد کی سیاسی، علمی اور ادبی سرگرمیوں سے قارئین کو واقف کرایا وہیں ۱۹۱۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''الہلال'' اور پھر بعد میں ''البلاغ'' نے حکومت کو للکارا۔

بنگال کی اردو صحافت کو میں نے جہاں تک اپنی نگاہوں سے دیکھا یا سمجھا ہے اس پر چند باتیں میں آپ سے شیئر کرنا چاہوں گی۔ میں نے جب سے آنکھیں کھولیں اور اپنی نانی جان اور والدہ محترمہ سے جو باتیں سنیں وہ اس طرح ہیں کہ میرے نانا صدیر احمد خان ملیح آبادی سے کلکتہ تشریف لائے تھے اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ان کے اچھے دوست اور دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ دونوں نے مل کر ایک اخبار ''اجالا'' کے نام سے نکالا۔ اور پھر وہی ہوا جو اکثر ہوتا ہے۔ نانا کسی بات پر پریس سے ناراض ہو کر گھر چلے آئے اور پھر کبھی پلٹ کر نہیں گئے۔ دل پر کسی بات کا گہرا اثر تھا۔ لہٰذا یہ صدمہ جان لیوا ثابت ہوا اور وہ جلد ہی داغ مفارقت دے گئے۔ میری والدہ کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔

میری امی جان کی شادی میرے ابا جان محمد سمیع اللہ مرحوم سے ہوئی جو ان دنوں آزاد ہند میں ملازم تھے اور اپنی زندگی کی آخری دنوں تک ''آزاد ہند'' کے منیجر کی ذمہ داری سنبھالتے رہے۔ اس طرح جب سے ہم بہنوں نے ہوش سنبھالا گھر میں اخبار اور کالک کی ملی جلی سوندھی بو محسوس کی اور اپنے والد کو اخبار کی ذمہ داریوں میں مصروف پایا۔ ابا کا زیادہ تر وقت ''آزاد ہند'' کے دفتر میں گذرتا۔ آدھی آدھی رات کو بھی اکثر آفس سے کوئی نہ کوئی شخص آکر ہمارے ابا جان سے اخبار سے کسی نہ کسی پریشانی کا ذکر کرتا۔ کبھی مشین خراب ہو جاتی تو کبھی بجلی چلی جاتی اور کبھی برسات کے دنوں میں پریس کے اندر تک پانی آجاتا اور ابا آدھی رات کو اٹھ کر پریس چلے جاتے اور کسی دوسرے پریس سے اخبار کو چھپوانے کا انتظام کرتے۔ اکثر رات کو ہم بہنیں ابا سے حالات حاضرہ پر سیر حاصل گفتگو کیا کرتی تھیں۔ کسی بھی اہم بات یا کسی اہم موقع پر شام کو خاص دو صفحے کا اخبار نکلتا جسے ضمیمہ کہا جاتا ہے جو دراصل Breaking News کی ایک شکل تھی۔ ہمیں اس بات کا علم رہتا تھا کہ آج شام کو جو اخبار نکلے گا وہ ضمیمہ ہوگا اس ضمیمے کی ایک یاد آج بھی میرے ساتھ ہے۔ جب ذرا

لفقار علی بھٹو کو پھانسی ہوئی صبح سے ہی ہم سب ضمیمے کا انتظار کر رہے تھے تا کہ پوری خبر معلوم ہو سکے۔ شام کو ضمیمہ نکلا، ضمیمے کی پہلی سرخی میرے ذہن میں آج بھی محفوظ ہے جس میں جلی حروف میں لکھا تھا'' اور بھٹو کو پھانسی ہوگئی۔'' ہمارا گھر بھی ایک طرح سے آزاد ہند کا Unofficial دفتر تھا جہاں ہر وقت ابّا کے ہاتھوں لکھی چھوٹی سی پرچی کے ہم منتظر رہا کرتے تھے۔ کبھی یہ لکھا ہوتا کہ چائے بھجوا دو چار آدمیوں کے لئے ساتھ میں وائے بھی ہو تو زیادہ اچھا ہوگا۔ کبھی یہ کہ سعید صاحب (احمد سعید ملیح آبادی) دفتر میں ہیں۔ اچھی سی چائے بھجوادو۔ کبھی کسی اہم شخصیت کے دفتر آنے پر، ہماری امی کی مصروفیتیں اور بڑھ جاتیں۔ ہمارا گھر اور دفتر قریب ہونے کی وجہ سے گھر دفتر اور دفتر گھر بنا رہتا تھا۔ اور یہ تمام لانے لے جانے کا کام عنایت نام کے ایک بزرگ اور برکت نام کا ایک لڑکا انجام دیا کرتے تھے جن کے ذمہ دفتر کی دیکھ ریکھ کرنا تھا۔

کبھی اخبارات پتھروں کے ذریعے طباعت کے محتاج تھے کوئی اور طریقہ نہ تھا۔ پھر لیتھو پریس ہونے لگے جس میں چھاپنے والے کے ہاتھ اور کپڑے بھی کالے ہو جاتے تھے۔ ہم نے بھی وہ دن دیکھے ہیں جب'' آزاد ہند'' لیتھو مشین سے نکلا کرتا تھا۔ ایک طرف کانٹے دار مشین تھی جس پر ایک شخص کاغذ چپکایا کرتا تھا اور پھر مشین کا کانٹا اسے چھپائی کی طرف لے جاتا تھا۔ اس پر چھپائی ہوتی رہتی لیکن ہم پریس میں چھپائی ہوتے دیکھنے نہیں جایا کرتے تھے بلکہ ہماری دلچسپی کا حصہ پریس کا وہ کونا تھا جہاں ایک مشین سے جڑی ایک بڑی سی ٹرے پر شیشے کے کنچے شور مچاتے رہتے تھے۔ بڑے، درمیانی اور چھوٹے ہر سائز کے کنچے اور میں وہاں کام کر رہے آدمیوں سے خوشامد کیا کرتی کہ وہ ہمیں تھوڑے سے کنچے دے دیں۔ اس سائز کے کنچے بازار میں نہیں ملا کرتے تھے اور میں دوسرے بچوں کے سامنے اس معاملے میں ہمیشہ سرخرو رہتی اور کھیل میں بازی لے جاتی۔

اسی پریس سے جڑا ایک حادثہ آج بھی میری نظروں کے سامنے آجاتا ہے تو دل دہل جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پریس میں اخبار کے کاغذ کاٹنے والی مشین اچانک خراب ہوگئی اور نیاز نامی پریس کا ایک ملازم مشین کو ٹھیک کرنے لگا کہ اچانک مشین چل پڑی اور اس کا ایک ہاتھ بازو سمیت کٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اسپتال سے سیدھا وہ ابّا کے پاس ہمارے گھر آیا اس کے ایک ہاتھ میں کاغذ میں لپٹا وہ کٹا ہاتھ تھا۔ ہم سب چیخ پڑے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ابّا اس کی ہمت بڑھاتے رہے۔

آج کل تو زیادہ تر اردو اخبارات میں اداریہ لکھا نہیں جاتا بلکہ اس کی جگہ کوئی انٹرویو، مضمون یا کسی اہم موضوع پر مختلف لوگوں کے خیالات لکھ کر خانہ پری کر دی جاتی ہے لیکن ایک وقت تھا جب'' آزاد ہند'' کا اداریہ نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ قومی سطح پر لوگوں کا منظورِ نظر تھا۔ لوگ خاص کر اداریہ کے لئے ہی اخبار خریدا کرتے تھے۔ یہ اداریے احمد سعید ملیح آبادی لکھا کرتے تھے جو آزاد ہند کے مالک و ایڈیٹر تھے ان کی غیر حاضری میں اداریے کی ذمہ داری جناب راقم لکھنوی یا جناب منیر نیازی کے ذمے ہوا کرتی تھی۔ آزاد ہند میں یک مخصوص کالم 'نمکدان' بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ طنزیہ کالم تھا جسے حالات حاضرہ کے مخصوص موضوع پر لکھا جاتا ہے۔ اسے راقم لکھنوی صاحب لکھا کرتے تھے۔ ترجمے کی ذمہ داری سجاد نظر صاحب، ظہیر احمد صاحب، رضوان اللہ صاحب، شمس الزماں انصاری اور منیر نیازی کے ذمہ تھی جب کہ کھیل کود کی تمام خبریں پروفیسر جاوید نہال صاحب سنبھالا کرتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ وہ دور تھا جب ہر کوئی یہ سمجھتا تھا کہ یہ اخبار اس کا اپنا اور قاری اس کے گھر کے افراد ہیں جنہیں حالات حاضرہ سے روشناس کرانا اس کی اولین ذمہ داری ہے۔

کتابت کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔ عہد حاضر تک اچھے کاتبوں کی بڑی مانگ تھی۔ ان کی خوش نویسی اخبار کی خوبصورت اشاعت کا اہم حصہ مانی جاتی تھی۔ اخبارات میں شہ سرخی ایک مخصوص انداز میں لکھی جاتی تھی جو متاثر کن ہوا کرتی تھی۔ جس بلڈنگ میں ہمارا مکان ہے اسی میں گراؤنڈ فلور پر'' آبشار'' کا پریس ہوا کرتا ہے۔'' آبشار'' ان دنوں

شام کو نکلا کرتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر سالک لکھنوی، معین الدین صاحب اور ابراہیم ہوش تھے۔ دن بھر کاتب حضرات اپنی کمر تختہ کئے کرسیوں سے ٹیک لگائے خوش نویسی میں لگے رہتے اور بجلی کٹ جانے کی صورت میں صحن میں کرسی لگا کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں پسینہ بہتا رہتا اور وہ اپنے کام میں مشغول رہتے لیکن ہر حال میں شام چار بجے تک اخبار چھپ جاتا اور ہاکر حضرات جو تین بجے سے ہی بلڈنگ کے صحن میں ڈیرہ لگائے رہتے تھے اپنے اپنے حصے کا اخبار لے کر رول بناتے اور کندھے پر اٹھا کر نکل پڑتے۔ اکثر ہم سب اپنی کاپیاں اور کتابیں اُن کاتبوں کے پاس لے جایا کرتے جس پر وہ خوبصورتی کے ساتھ ہمارے نام لکھ دیا کرتے تھے۔ جب بات کاتب کی نکل پڑی ہے تو میں آپ کو بتاتی چلوں کہ ہمارے ابا کے دفتر 'آزاد ہند' میں ایک کاتب عثمان صاحب ہوا کرتے تھے لیکن ہم سب اُن کے اصل نام سے واقف نہیں تھے ہمیں ان کا نام 'خوردن' معلوم تھا۔ آفس کے اسٹاف نے ان کی اچھی خوراک کے سبب اُن کا یہ نام رکھ دیا تھا۔ جیسے ہی انہیں اس نام سے پکارا جاتا وہ ناراض ہو جاتے لیکن دل کے بہت بھلے انسان تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں خدا اُن کی مغفرت کرے۔

اُن دنوں کلکتے سے دس بارہ اخبار نکلا کرتے تھے جن میں ''آزاد ہند'' کا نام سرفہرست تھا۔ اس کے علاوہ ''روزانہ ہند''، ''عصر جدید''، ''امروز''، ''غازی''، ''عکاس''، ''آبشار'' وغیرہ نکلا کرتے تھے۔ ''روزانہ ہند'' کے ایڈیٹر رئیس الدین فریدی کا مکان ہمارے مکان کے مقابل سمت تھا۔ وہ امروہہ کے رہنے والے تھے۔ اخبار بند ہونے کے بعد انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ نامور صحافی تھے۔ ان سے بھی مستفیض ہونے کا مجھے موقع ملا۔ ۱۹۸۲ء میں کلکتہ کی سرزمین پر پہلی بار آفسیٹ مشین پر 'اخبار مشرق'' کی اشاعت شروع ہوئی۔ ۱۹۸۲ء سے ''آزاد ہند'' بھی آفسیٹ پر شائع ہونے لگا۔ پھر اسی سال ۱۹۸۲ء میں ہی ''اقراء'' نام کے اخبار کی اشاعت شروع ہوئی جس کے ایڈیٹر عمر حیات خاں تھے۔ یہ اخبار ۱۹۹۲ء میں بند ہو گیا۔ اس کے علاوہ ''شان ملت'' نام کا اخبار جاری ہوا لیکن جلد ہی وہ بھی بند ہو گیا۔

آج اردو صحافت اس مقام پر ہے جہاں زرد صحافت نے صحافت کے معنی ہی بدل دیئے ہیں۔ وہ صحافت جس نے آزادی کی لڑائی میں اہم رول ادا کیا تھا، آج عدم رواداری کا شکار ہے۔ آج بھی دیگر زبانوں کے ایڈیٹروں اور سینئر صحافیوں میں رواداری اور کشادہ دلی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اردو اخبارات کا معاملہ اس سے جداگانہ ہے جہاں ذاتی پرخاش کا استعمال اخبار کے صفحات کو سیاہ کر کے کیا جاتا ہے۔ اردو اخبار کے زیادہ تر مالک اور ایڈیٹر وہ ہیں جو خود یہ بھی نہیں پڑھ سکتے کہ اُن کے اخبار میں کیا چھپا ہے۔ زیادہ تر اردو اخبارات کے مالکان یا ایڈیٹر کاروباری نقطۂ نظر سے اخبار کی اشاعت کو دیکھتے ہیں۔ تمام تر ذمہ داریاں ایسے لوگوں پر ڈال دی جاتی ہیں جو اس کے اہل تک نہیں۔ دوسری زبانوں کے اخبارات آج بھی تقرری، اہلیت اور کام کی نوعیت کے اعتبار سے ذمہ داری سونپتے ہیں لیکن اردو اخبارات کا حال ابتر ہے۔ وہاں عام سا Reporter یا Correspondent ہی اخبار نویس/کالم نویس، صحافی اور شعبہ جاتی ایڈیٹر ہوتا ہے۔ اخبار کی اشاعت کی باگ دوڑ ایسے غیر ذمہ دار صحافیوں کے سپرد کر دی جاتی ہے جو اس کا غلط استعمال بے دھڑک اور ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ المختصر یہ کہ آج صحافت کا عروج جو ہماری جمہوریت کا چوتھا ستون مانا جاتا ہے، خواہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرونک میڈیا، Social Media ہو یا News Media قوم کے اخلاقی زوال کا سبب بن کر رہ گیا ہے۔

....

صدر، شعبۂ اردو، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا

ڈاکٹر احسان عالم

اردو صحافت کا بدلتا رنگ: اکیسویں صدی میں

عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ انسانی زندگی کا ایک اہم اور لازمی حصہ بن گیا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام تر حصے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ کی کرشمہ سازی ہے کہ سکنڈوں میں دنیا بھر کی خبریں دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ آج اکیسویں صدی میں صحافت کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک پرنٹ میڈیا اور دوسرا الیکٹرانک میڈیا۔ الیکٹرانک میڈیا میں کشش زیادہ ہے اس کی وجہ اس میں رنگ و روغن کا پایا جانا ہے، لیکن پرنٹ میڈیا کی اپنی خصوصیات برقرار ہے۔ پرنٹ میڈیا آج بھی اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔

لفظ صحافت ''صحیفہ'' سے نکلا ہے۔ صحیفہ کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ صحیفہ سے مراد ایک ایسا مواد ہے جو ایک خاص وقفہ پر شائع ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام اخبارات، رسائل وجرائد صحیفہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

اپنے لغوی معنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحافت، صحیفہ نگاری ہے اور Journalism یا صحافت کی تعریف بھی صحیفے یا Journal سے تعلق رکھتی ہے۔ واقعات یا حقائق جاننے کا نام صحافت ہے۔ سچائی اور انکشافات کا پتہ لگانا ہی صحافت ہے۔ عوام کو سچائی اور تمام تر واقعات سے باخبر کرنا ہی صحافت ہے۔ صحافت کی تعریف مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں دی ہے، لیکن سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔

جن لوگوں نے جرنل کی ترتیب دی ہے ان کے لئے جرنلسٹ لفظ کا استعمال کیا گیا اور اس پیشے کو جرنلزم کہا گیا۔ ایم وی متھ اور ایم کے رستم جی اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

> "Journalism means several things. First of all , it means the ability to write and to convey thoughts in a way that people will understand quickly."

اس تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صحافت میں حقیقت اور سچائی سب سے اہم چیزیں ہیں اور ان سچائیوں کو بہتر الفاظ میں ڈھالنا ایک فن ہے۔ کسی بھی خبر کو بہتر الفاظ میں ڈھال کر اس طرح شائع کرنا جو لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں آجائے، صحافت ہے۔ ہر صحافی پر یہ فرض ہے کہ وہ سچائی کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیں ورنہ اس مقدس پیشے کا مقصد فوت کر جائے گا۔

صحافت کی ایک تعریف ایکسپلورنگ جرنلزم کے مصنفین لارنس آر کیمپل اور رولینڈ نے اس طرح پیش کی ہے:

> "Journalism is the systematic and reliable dissemination of public information public opinion and public entertainment by modern mass media of communication."

بہار کے مشہور صحافی اور سابق وزیر تعلیم جناب غلام سرور (مرحوم) نے اپنے ایک ریڈیو پروگرام میں صحافت

کے سلسلہ میں یہ باتیں عرض کیں:

''صحافت شاعری نہیں، صحافت داستان سرائی بھی نہیں، صحافت خطابت کا نام نہیں، صحافت سیاست بھی نہیں ہے۔ مگر صحافت دراصل بیک وقت ادب، شاعری، داستان گوئی، سیاست بازی، خطابت کی شعلہ سامانی سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ صحافی کا قلم کبھی شعلہ برساتا ہے، کبھی شبنم ٹپکاتا ہے، کبھی سماج کے ناسور پر نشتر لگاتا ہے اور کبھی دکھے دلوں کے زخم پر مرہم رکھتا ہے۔ سیاست داں ملک دھاری سمراٹ ہے، اخبار نویس ہے، بے تاج بادشاہ ہے۔ سیاست کے حدود متعین نہیں۔''

(''سیاست اور صحافت'' غلام سرور ۱۹۷۸ء)

صحافت ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے بہت کچھ کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اپنی تخلیقی توتوں کو ابھارا جائے اور انہیں صحیح طور پر استعمال کیا جائے۔ آج کے ترقی یافتہ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں اخبارات کی طاقت بہت بڑی ہے۔ کسی بھی جمہوری ملک کیلئے صحافت ایک بڑی طاقت ہے۔ اخبارات، رسائل و جرائد ہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ عوام کی رائے کو عوام کے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ صحافت ہمیں قانون کا احترام کرنے کا سبق دیتا ہے۔ صحافت صرف اخبار، رسائل اور جرائد کا ہی نام نہیں بلکہ ریڈیو، فلم، ٹیلی وژن اور اب انٹرنیٹ سے جڑا وہاٹس اپ، فیس بک، ٹوئٹر بھی صحافت کے حدود میں شامل ہو چکا ہے۔

اکیسویں صدی میں ہندوستانی صحافت آج جس موڑ پر آ پہنچی ہے اس کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔ اردو صحافت دو سو سال کا سفر مکمل کرنے جا رہی ہے۔ آزادی کے بعد کی ۶۸ رسالہ مدت میں اردو صحافت نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ ہندوستان کے قومی افق پر اردو صحافت کو تیسرا مقام حاصل ہے۔ ڈی اے وی پی نے جون ۲۰۱۵ء میں ایک رپورٹ شائع کی جس کے مطابق صرف دہلی سے ۸۶؍ اردو روزنامہ اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ دہلی میں اخبارات کی ترسیل کا ایک مربوط نظام ہے جس کے تحت قومی دارالحکومت میں ۵۷؍ اخباراتی مراکز قائم ہیں۔ دہلی میں عام اردو قارئین تک پہنچنے والا ایک اخبار ''انقلاب'' ہے اور دوسرے نمبر پر سب سے بڑا اخبار ''راشٹریہ سہارا'' ہے۔ ان دونوں اخبارات کے علاوہ دیگر اخبارات ''پرتاپ''، ''حالات وطن''، ''ہمارا سماج''، ''حالات ہند''، ''ہمارا مقصد''، ''ہندوستان ایکسپریس''، ''اقدام''، ''آفتاب ہند'' ہیں جن کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔

اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کافی ترقی ہوئی۔ ان ترقیوں کے ساتھ اردو صحافت کے آنگن میں نئی روشنی آب و تاب کے ساتھ نظر آئی۔ اردو اخبارات، رسائل و جرائد کی اشاعت اور طباعت کا مرحلہ آسان سے آسان تر ہوتا چلا گیا۔ دنیا آج Global Village میں تبدیل ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی اردو صحافت کے مسافت پر لگام لگانا آسان ہوتا گیا۔ کمپیوٹر کی آمد اور انٹرنیٹ کے پھیلاؤ کے ساتھ اردو صحافت کا دائرہ کافی تیزی سے وسیع ہوتا گیا۔ اکیسویں صدی کی شروعات کے ساتھ ہی اردو اخبارات کی ظاہری شکل صورت اور خوبصورتی میں کافی اضافہ ہو گیا جو عام قارئین کے توجہ کا مرکز بنا۔ دہلی، اتر پردیش، بہار، جموں کشمیر، جھارکھنڈ، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال وغیرہ صوبوں میں اردو صحافت نے کافی ترقی کی۔ اخبارات اور رسائل

بڑے پیمانے پر شائع ہونے لگے۔

اخبارات، رسائل و جرائد کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا لیکن ان کے معیار میں جو اضافہ ہونا چاہئے وہ آج بھی نہیں پایا ہے۔ ضرورت ہے اسے معیاری بنانے کی۔ یہ آئندہ نسلوں کے لئے فائدہ بخش ہوگا۔ آج کچھ اخبارات میں ایسی خبریں شائع کی جاتی ہیں اور تصویریں چھاپی جاتی ہیں جسے ایک مہذب فرد اپنے گھروں میں رکھنا گوارا نہیں کرتا۔ ایسی خبروں اور تصویروں کا مقصد صرف اور صرف پیسہ کمانا ہے۔ اسے تجارت سے جوڑ کر اس حد تک پہنچا دیا جاتا ہے جس کا کوئی دوسرا مقصد نظر نہیں آتا۔ الیکشن کے زمانے میں ہمارے کچھ صحافی چاہے وہ پرنٹ میڈیا کے ہوں یا الکٹرونک میڈیا کے چند بکواس اور یکطرفہ خبریں شائع کرتے ہیں جو ہندوستان کی جوان ہوتی جمہوریت کے لئے خطرہ ہے۔ آج اگر مولانا ابوالکلام آزاد جیسے صحافی حیات سے ہوتے تو انہیں سخت مشکلات کا حالات کرنا پڑتا۔ ایسی صحافت سے بچنے کی ترغیب وہ آج سے تقریباً اسی سال پہلے بھی کرتے تھے:

> ''اخبار نویسی کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے۔ چاندی اور سونے کا تو سایہ بھی اس کے لئے سم قاتل ہے۔ جو اخبار نویس رئیسوں کی ضیافتوں اور امیروں کے عطیوں کے قومی اعانت، قومی عطیہ اور اس کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں، وہ بہ نسبت اس لئے کہ اپنے ضمیر اور ایمان کو بیچیں۔ بہتر ہے کہ دریوزہ گر کی جھولی گلے میں ڈال کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچے، ''کام ایڈیٹری کا'' کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے ہیں۔''

بہار بھی اردو صحافت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ بہار اور جھارکھنڈ دونوں نے اردو صحافت کو ایک زرخیز زمین عطا کی ہے۔ یہاں سے بہت سے رسائل، جرائد اور اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں ''قومی تنظیم، راشٹریہ سہارا، انقلاب، پندار، فاروقی تنظیم، زبان و ادب، سنگم، کوہسار، مریخ، اردو جرنل، عوامی نیوز، جسارت بہار، امین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شہر دربھنگہ بھی اردو صحافت کے میدان میں کافی آگے ہے۔ موجودہ دور میں یہاں سے چار ایسے رسالے نکلتے ہیں جن کی شہرت عالمی ہو چکی ہے۔ وہ رسالے ''تمثیل نو''، ''جہان اردو''، ''دربھنگہ ٹائمز'' اور ''الہدیٰ'' ہیں۔ ''تمثیل نو'' کے مدیر ڈاکٹر امام اعظم ہیں جو کافی جانفشانی کے ساتھ اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ''جہان اردو'' کے مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد ہیں۔ وہ بھی کافی متحرک اور فعال شخص ہیں۔ ''دربھنگہ ٹائمز'' منصور خوشتر کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ ''الہدیٰ'' کے ایڈیٹر شکیل احمد سلفی ہیں۔ وہ عرصۂ دراز سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔

اس طرح مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں اردو صحافت نے کافی ترقی کی ہے اور ایک لمبا سفر طے کرتے ہوئے آج بھی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ امید ہے آنے والوں برسوں میں اردو صحافت کو اعلیٰ مقام حاصل ہوگا۔

....

الحرا پبلک اسکول، رحم خاں، دربھنگہ-۴ (بہار)

ڈاکٹرامام اعظم

متھلا میں اردو صحافت

''صحافت کی اس تیز رفتار ترقی سے متاثر ہو کر اس کو حکمرانی کے چوتھے ستون کا درجہ دیا گیا ہے۔ بالخصوص جمہوری نظام میں مقننہ یعنی قانون سازی، عدلیہ یعنی انصاف اور انتظامیہ یعنی نوکر شاہی کے بعد چوتھی طاقت کی حیثیت سے اگر کسی کو تسلیم کیا جاتا ہے، تو وہ صحافت ہے اور اسی لیے ہر جمہوری نظام میں اخبارات کی اہمیت اور جمہوریت کی بقاء واستحکام میں ان کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

(مضمون ''صحافت، انسانیت کی خدمت کا سب سے موثر ذریعہ'' روزنامہ ''عکاس'' کولکاتا ۷ردسمبر ۲۰۱۵ء)

عارف عزیز (بھوپال) کے مذکورہ خیالات کی روشنی میں ملک کے تمام خطوں سے وابستہ صحافت کا مطالعہ بڑا ہی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی متھلا میں اردو صحافت کی پیش رفت کا جائزہ ہے۔

متھلا کی سرزمین علماء وفضلاء کی آماجگاہ رہی ہے۔ یہ خطہ زبان وادب کی آبیاری کے ساتھ صحافت کے میدان میں بھی پیش پیش رہا ہے۔ اس علاقے میں مدارس کا جو رول رہا ہے اس کے سبب یہاں کے علماء اور بڑے اسکالرز ہمیشہ سے تہذیبی آبیاری کے لئے تحریکی اور تحریری دونوں اعتبار سے فعال رہے ہیں۔ نیپال کی سرحد قریب ہونے کے سبب آزادی کے اس طوفان میں مسلم علماء نے علمی طور پر متھلا کی زمین کو اس لئے منتخب کیا کہ فرنگی جبر وتشدد کے شکنجے سے بچنے کے لیے نیپال کے دامن میں پناہ لینے میں آسانی تھی۔ اس لیے جہاں مذہبی، اخلاقی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز متھلا رہا، وہاں اشتراک باہمی اور اس وقت کے سیاسی حالات کے درمیان اس بات کی تلاش بھی رہی ہے کہ دوسرے ہم خیال لوگ جو فرنگیوں کے نشانے پر تھے اور جو یہ چاہتے تھے کہ عوامی سطح پر ایسی بیداری ہو ان سے رابطے کے لئے اخبار کی ضرورت تھی۔ اسی لیے میتھلی زبان وادب کی جہاں نشوونما ہو رہی تھی وہیں ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کا بھی اپنے طور پر فروغ جاری تھا۔ ابتداء میں یہ مسئلہ میتھلی والوں سے حل نہ ہو سکا تو اردو، فارسی نے ان کی مدد کی کیونکہ یہاں واقعہ نگاری کا رواج تھا، صحافت کی اس لیے ضرورت تھی کہ سماج کا وہ باشعور طبقہ اور وہ مجاہدین جو آزادی سے جڑے ہوئے تھے وہ اپنی آواز رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ ہی عوام تک بہ آسانی پہنچا سکتے تھے۔ یہ الگ سی بات ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی آج جتنی سہولت ہے متھلا کی سرزمین پر وہ سہولتیں موجود نہیں تھیں، پھر بھی صحافی کے قلم کی جولانی اور ان کے تیور متھلا کی اردو صحافت میں موجود تھے۔ شروع میں قلمی اخبار جاری کئے گئے اور یہ اخبار قرب وجوار میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ جہاں تک اخبار نویسی اور خبروں کے مجموعے (اخبار) کی اشاعت کا سوال ہے مولانا سید ابوالخیر رحمانی (قاضی بھیروی) کو پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ ممتاز شاعر شوق نیموی نے ''یادگار وطن'' میں ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ دربھنگہ میں مطبع نہ ہونے کی وجہ سے وہ مونگیر سے ماہ نامہ ''شوخ'' (۱۸۸۹ء) عرصے تک نکالتے رہے۔ پھر ۱۸۹۷ء میں پٹنہ آ کر ہفتہ وار اخبار ''الپنچ'' سے بحیثیت مدیر وابستہ ہوئے اور جنوری ۱۹۰۲ء تک اس سے وابستہ رہے۔ اس اخبار میں مدیر موصوف کی صحافتی تحریروں میں قومی جذبات کا برملا

اظہار ہوا کرتا تھا۔ رسالوں کی تعداد کم ہونے کے سبب اسے دور دراز علاقوں میں پہنچانا دشوار تھا۔ پھر بھی ایسے حلقے بنائے گئے تھے جہاں پرنٹ میڈیا کی مختصر تعداد ہونے کے سبب قلمی تحریروں کے ذریعہ قسطوں میں گاؤں گاؤں تک پہنچایا جاتا تھا اور روایت یہ بھی ہے کہ گاؤں کے چوپال میں جہاں میتھلی کے گیت گائے جاتے تھے وہیں اردو کے چھوٹے بڑے رسالے بھی پڑھ کر سنائے جاتے تھے اور بتایا جاتا تھا کہ سامراجیت کا ظلم وتشدد کس طرح جاگیرداروں اور زمینداروں کے ذریعہ ہورہا تھا۔ اسی طرح متھلا کے اردو صحافیوں نے لارڈ میکالے کے نئے تعلیمی نظام کی بھی بھرپور مخالفت کی۔ اردو صحافیوں نے پریم چند کی ان کہانیوں کو بھی اپنے اپنے رسالے میں جگہ دی جن میں مغلوں کے زمانے سے جو روایت چلی آرہی تھی کہ جن علاقوں میں پیداوار نہ ہو اور قحط پڑ جائے یا سیلاب کی صورت ہو، وہاں سے ٹیکس وصولی نہیں کی جائے، لیکن برٹش سرکار نے گاؤں کے کسانوں کو جب جھیڑا اور یہ قانون پاس کردیا کہ جیسے بھی ہو، کھیتوں کے مالکان اپنا ٹیکس ادا کریں، خواہ پیداوار ہو یا نہ ہو، اس کی بھی بھرپور مخالفت اردو صحافیوں اور بالخصوص متھلا کے صحافیوں نے کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو آگ دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی اور انگریزوں کی مخالفت جو شہروں تک محدود تھی نیز پڑھے لکھے طبقوں میں پائی جاتی تھی اس کے اثرات جب گاؤں کے کسانوں پر پڑنے لگے تو صحافیوں نے اس ظالمانہ قانون کی مخالفت میں اپنے قلم کے ہتھیار اٹھا لیے، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور انگریزوں کو صرف شہروں میں ہی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ دیہی علاقوں میں بھی اسے نفرت کے شعلوں میں جھلسنا پڑا اور متھلا کی ہی سرزمین تھی جہاں مولانا ظفر علی خاں کے ''زمیندار'' جیسے قوم پرست اخبار کے اداریوں کی میتھلی میں سلیس ترجمانی اس انداز میں کی گئی کہ قومی جذبے کی راست صحافت Communication کا بڑا ذریعہ بنا اور گاؤں گاؤں کی جھوپڑیوں اور کھیتوں تک پہنچ گیا۔ اس زمانے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جلسے جلوسوں پر لگی پابندیوں کے باوجود ایک ایسی عوامی فضا تیار کی جاسکتی ہے۔ بقول فیضؔ:

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

متھلا کی صحافت کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جس کے نقوش آج بھی مدرسہ امدادیہ میں دیکھے جاسکتے ہیں، جس کے اہم اساتذہ مثلاً مولانا عبدالوہاب بلاسپوری اور مولانا عبدالودود محی الدین نگری وغیرہ نے اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور آج اس کا اثر ہے کہ بہار کی اردو صحافت میں ''قومی تنظیم'' جیسا اخبار متھلا کی سرزمین سے ایس ایم عمر فرید مرحوم نے جاری کیا، جو آج بھی اس روایت کی غیر منقطع کڑی ہے۔

اردو صحافت ریاستی پیمانہ پر اور ملک گیر پیمانے پر ہر زمانے میں متھلا کی سرزمین کے افراد کی مرہون منت رہی ہے۔ مولانا خیر رحمانی کے صحافتی کارناموں کا ذکر ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ متھلا کے مولانا عبدالعلیم آسی کلکتہ میں روزنامہ ''الحق'' کی ادارت سے منسلک تھے اور پھر مشہور کمیونسٹ دانشور ایم این رائے کے اخبار ''جنتا'' کی زمام ادارت بھی سنبھالی۔ ان کے علاوہ موضع ارئی، دربھنگہ کے محمد یونس نظری کلکتہ سے ہفتہ وار ''نقاش'' مدتوں تک نکالتے رہے اور روزنامہ ''کارواں'' نکالا، جس کی مجلس ادارت سے مظہر امام بھی منسلک رہے۔ اس سے پہلے حسن امام درد

روزنامہ ''عصر جدید'' میں خبروں کے ترجمے اور تدوین کا کام کرتے رہے۔ روزنامہ ''غریب کی دنیا'' پٹنہ کے ایڈیٹر نیز ہفتہ وار ''آدرش'' اور ''دور حاضر'' کی مجلس ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ اسی علاقے کے بدر جلیلی ''دور حاضر'' کے مدیر تھے۔ جہاں تک ادبی اور تحقیقی رسالوں کا تعلق ہے اس میں شرف عالم آرزو جلیلی ''معیار'' پٹنہ کی مجلس ادارت میں قاضی عبدالودود کے ساتھ شریک رہے۔ مولانا آزاد کا اخبار ''الہلال''، ''البلاغ'' ہو یا علی برادران کا ''ہمدرد'' ان تمام اخباروں سے متھلا کے لوگ کسی نہ کسی حیثیت سے جڑے رہے ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ گردش زمانہ اور کوتاہ نظری کے سبب ان افراد کے ناموں کی فہرست لوگوں نے محفوظ نہیں رکھی۔

اردو صحافت میں مذہبی اخبارات و رسائل کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ کچھ تو تلف ہو گئے لیکن اخلاقیات پر مبنی چھوٹے چھوٹے رسائل دینی مسائل کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں موجود ہیں۔ مناظرے بھی مرتب کئے گئے اور متھلا کی سرزمین جو مذہبی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کی خاص پہچان رکھتی ہے وہاں دل کو چھو لینے والی ایسی باتیں بھی موجود ہیں جن کو مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے قلم بند کیا ہے۔ اس موقع پر راقم الحروف کا یہ قطعہ مناسب معلوم پڑتا ہے :

تحریر کی زباں پہ نہ تالے لگے کبھی — ایسے مجاہدین ہیں حیرت کی بات ہے
متھلا کی سرزمیں کو نہ کم آپ مانئے — جو بات کہہ رہا ہوں صحافت کی بات ہے

سرزمین متھلا سے بہت سے ادبی و نیم ادبی رسائل ''مسیحا'' دربھنگہ (اجرا ۱۹۰۲ء)، مدیر حکیم ابوالحسنات ناصر دہلوی، ''پرواز'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۲۸ء) مدیر: سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری، 'البدر' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۲۹ء) ہفت روزہ مدیر مسئول: سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری، ماہنامہ ''بشریٰ'' آفتاب، دربھنگہ (اجرا: ۱۹۲۹ء)، مدیر سید حفاظت علی فائق رزاقی، دارالعلوم احمدیہ سلفیہ کا ہفت روزہ رسالہ ''مجلّہ سلفیہ'' (اجرا: ۱۹۳۴ء) مدیر: سید عبدالحفیظ نیر گیاوی، پندرہ روزہ رسالہ ''الہدیٰ'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۴۰ء)، مدیر: سیّد عبدالحفیظ سلفی، ماہنامہ ''ہمالہ'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۴۱ء) مدیر: شین مظفر پوری، ماہنامہ ''حسن و شباب'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۴۱ء) مدیر: مطیع الرحمٰن غوثی، ''نئی کرن'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۴۹ء) مدیران: مظہر امام اور منظر شہاب، ''صبح زندگی'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۴۹ء) مدیر: محمد سلطان احمد، ماہنامہ ''ہونہار'' پستک بھنڈار لہیر یا سرائے دربھنگہ ہفت روزہ ''سلام'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۵۳ء) مدیر: سلمان ندوی، 'افق' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۵۳ء) مدیر شمیم سیفی، ''شگوفہ'' (اجرا: ۱۹۵۱ء)، ''نادی'' (اجرا: ۱۹۵۲ء) مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ کے طلبا کی انجمن نادی الاصلاح کا سہ ماہی ترجمان ہفت روزہ ''سیرت'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۵۸ء) مدیر: زین العابدین الحسنی جالوی سہ ماہی، ''رفتار نو'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۶۰ء) مدیران: سید منظر امام، مجاز نوری ہفت روزہ، ''قومی تنظیم'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۶۰ء) بانی مدیر: ایس ایم عمر فرید، ماہنامہ ''اشرف العرفان'' سمستی پور (اجرا: ۱۹۶۸ء) مدیر: عبدالمنان مرحوم، ماہنامہ ''کسوٹی'' سمستی پور (اجرا: ۲۰۰ء) مدیر: افضل خاں، پندرہ روزہ ''ہم اور آپ'' (اجرا: ۱۹۷۰ء) مدیران: شمیم سیفی، شاکر خلیق، شوکت خلیل، ''توازن'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۷۳ء) مدیر: نجیب اختر، ڈائجسٹ ''کردار'' میرو ادربھنگہ (اجرا: ۱۹۷۸ء)، مدیران: شمس شادمانی، ڈاکٹر نقی امام، ماہنامہ ''تحفۂ ادب'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۸۰ء) مدیر: مجاز نوری،

مدرسہ امدادیہ کا سالانہ مجلّہ ''الامداد'' مرتب: عطاء الرحمٰن رضوی (اجرا: ۱۹۸۶ء)، پندرہ روزہ ''آگ کا دریا'' دربھنگہ ، اردو (اجرا: ۱۹۸۴ء) مدیر: آچاریہ شوکت خلیل ہفت روزہ ''جدید سلسلۂ جنگ'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۸۴ء)، مدیر: مطیع الرحمٰن نعمانی، ماہنامہ ''علم وادب'' بیگوسرائے (اجرا: ۱۹۹۴ء)، مدیر: طارق متین، پندرہ روزہ ''مسافر'' ململ، مدھوبنی (اجرا: ۱۹۸۶ء)، مدیر: عطا عابدی، ماہنامہ ''آوازِ نو'' لوام دربھنگہ (اجرا: ۱۹۹۷ء)، مدیر: ڈاکٹر نذیر انجم، ''ادب'' دربھنگہ (اجرا: ۱۹۹۱ء)، مدیر: مجاز نوری، ڈاکٹر ذاکر حسین ٹیچرس ٹریننگ کالج کا مجلّہ ''روشنی'' (اجرا: ۱۹۹۸ء)، صغریٰ گرلس ہائی اسکول کا مجلّہ ''صغریٰ'' (اجرا: ۱۹۹۹ء) شفیع مسلم ہائی اسکول کا مجلّہ ''شفیع'' (اجرا: ۲۰۰۱ء)، اسٹوڈنٹس ایجوکیشنل سوسائٹی، بکھتہ (مدھوبنی) کا سالانہ میگزین ''نشانِ منزل'' نکلتے رہے ہیں۔ روزنامہ ''قومی تنظیم'' (مدیران: ایس ایم اشرف فرید اور ایس ایم طارق فرید) پٹنہ سے پندرہ روزہ ''الہدیٰ'' (مدیر: شکیل احمد سلفی)، دربھنگہ سے پابندیِ وقت کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں نیز ۲۰۰۱ء سے سہ ماہی ''جہان اردو'' (مدیر: ڈاکٹر مشتاق احمد)، سہ ماہی ''تمثیل نو'' (مدیر: ڈاکٹر امام اعظم) اور ''ندائے بصیرت'' ململ، مدھوبنی (مدیر: عمر فاروق قاسمی اجرا: ۲۰۰۳ء) بھی نکل رہے ہیں۔ ہفت روزہ ''بے خبر'' (مدیر: نظیر عالم اجراء ستمبر ۲۰۰۸ء) کے چند شمارے شائع ہوئے اور سہ ماہی ''اسالیب'' (مدیر: انور اعظم اجراء ''جولائی ۲۰۰۷ء) کا ایک شمارہ شائع ہوا نیز ''دربھنگہ ٹائمز'' (مدیر: منصور خوشتر اجراء جنوری ۲۰۰۵ء) بھی یہاں سے شائع ہو رہا ہے۔ ادبی صحافت نے اردو زبان وادب کے گیسو کو سنوارنے میں اپنا اہم رول ادا کیا ہے بلکہ ادبی شناخت اور ادبی سمت متعین کرنے میں بھی یہاں کے رسالوں نے اہم کردار ادا کیے ہیں۔ یہاں سے جہاں کئی رسائل نکل رہے ہیں وہیں ''تمثیل نو'' نے چھپنے والوں کو چھپنے کا موقع دیا۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر منور رانا نے پروفیسر عبدالمنان طرزی کے حوالے سے لکھتے ہوئے ''تمثیل نو'' اور ڈاکٹر امام اعظم کا ذکر اس طرح کیا ہے :

> ''...... ایمان داری سے دیکھا جائے تو طرزی صاحب کے علم ولیاقت کی زمین تک سب سے پہلے باقاعدہ جو کوئی بس پہنچا اس کا نام امام اعظم ہے۔ وہ اپنے رسالے ''تمثیل نو'' کے ذریعہ ان کی تخلیقات کو برابر منظرِ عام پر لاتے رہے بلکہ ان کے تذکرے میں بھی ہمیشہ طرزی صاحب موجود رہے ہیں۔''

(مضمون ''کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی'' مطبوعہ روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' پٹنہ/ رانچی ۱۹ نومبر ۲۰۱۵ء)

ان کے علاوہ اردو کی قد آور شخصیتوں کو چاہے وہ کسی پلیٹ فارم پر ہوں، خواہ وہ سیاسی میدان میں ہوں، ادبی رجحان کے بانی ہوں، ان سبھوں کو نئے پیرائے میں پیش کر کے متھلا کی سرزمین کی کشادگی اور صحافتی ایمانداری کی مثال بھی پیش کی ہے۔ یہ الگ سی بات ہے کہ جس مختصر سی مدت میں اس رسالے نے فولڈر سے کام شروع کیا تھا اب یہ بین الاقوامی سطح پر متعارف ہو چکا ہے، جس نے متھلا کی سرزمین کی سوچ کو بھی وہاں تک پہنچایا جہاں تک اس سے پہلے متھلا کے کسی رسالے کا اتنا بڑا دائرہ کار اور اتنا بڑا حلقہ نہیں بن سکا۔ جس کا اندازہ پوری اردو دنیا کے ''تمثیل نو'' کے قارئین کی آراء سے ہوتا ہے وہیں برصغیر کے بعض مستند قلم کاروں کے تاثرات سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ممتاز شاعر مظہر امام اپنے مضمون ''دربھنگے میں اردو ادبی صحافت'' مشمولہ ''تنقید نما'' ۲۰۰۴ء میں

لکھتے ہیں کہ:

''تمثیل نو'' کے مدیر ناقد اور شاعر ڈاکٹر امام اعظم ہیں۔ اردو کے نمایاں رسالوں میں اس نے اپنی جگہ بنائی ہے اور اسے ہندوستان کے علاوہ پاکستان اور اردو کی نئی بستیوں میں بھی ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔''

ہفت روزہ ''ہماری زبان'' نئی دہلی (۲۲ تا ۲۸ نومبر ۲۰۰۱ء) میں ممتاز ادیب ڈاکٹر خلیق انجم نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سہ ماہی تمثیل نو' ایک اچھا، صاف ستھرا ادبی رسالہ ہے۔ ہمارے ادبی رسالوں میں ایک ممتاز حیثیت کا مستحق ہے۔''

اس سے قطع نظر معروف ادیب اور صحافی احمد جاوید کی بات سے بھی شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ:

''جنگ آزادی کے آخری دور میں قلعہ گھاٹ کا 'امیر منزل' شمالی بہار کے انقلابی نوجوانوں، شاعروں اور ادیبوں کا لال قلعہ تھا اور اس ایک گھر نے اردو اور ہندوستان کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ آج کے بہت سے ادارے بھی انجام نہیں دے سکتے۔''

موصوف کے اس خیال کو ذہن میں رکھئے تو کہنے میں آسانی ہوگی کہ متھلانچل میں اردو صحافت کے تعلق سے دربھنگہ کا کیا رول رہا ہے؟ انہوں نے منقولہ بات ''تمثیل نو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم کی اور مزید لکھا ہے کہ:

''......شمالی بہار کے دربھنگہ سے ''تمثیل نو' جیسا معیاری ادبی رسالہ نکالنا کسی جہاد سے کم نہیں۔ یہ اس شہر کی مٹی میں بسی اردو کی خوشبو اور اردو سے اس کا عشق ہے۔''

(ہفت روزہ ''نئی دنیا'' دہلی۔ ۱۵ ر تا ۲۱ ستمبر ۲۰۰۲ء)

معروف صحافی اور ادیب احمد ابراہیم علوی ''تمثیلِ نو' پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں گویا ہیں:

''تمثیلِ نو'' دربھنگہ سے شائع ہونے والا ایک معیاری رسالہ ہے......''

(روزنامہ ''آگ'' لکھنؤ ۲ راگست ۲۰۱۴ء)

خط کشیدہ سطر میں بھی اس خطے کی جس عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے وہ یہاں کی اردو ادبی صحافت سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے اپنے مکتوب (''تمثیلِ نو'' جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء) میں اس کی اہمیت یوں بتائی ہے:

''......آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ اپنے ہر شمارہ کو کسی نہ کسی اعتبار سے تمثیل بنا ہی دیتے ہیں۔''

روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد، ۲۲ ر جولائی ۲۰۰۲ء میں معروف ناقد اور محقق ڈاکٹر مجید بیدار نے اپنے تبصرے میں بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:

''اس رسالے کی ترتیب میں ندرت دکھائی دیتی ہے۔''

روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ (۱۱ ر جولائی ۲۰۰۵ء) میں معروف ناقد ڈاکٹر قاسم فریدی اپنے تبصرے میں کہتے ہیں:

" ...... 'تمثیل نو' ڈاکٹر امام اعظم کی بہتر منتظمانہ صلاحیت اور ان کی نفاست قلبی کا ترجمان ہے۔ ان کا وفورِ شوق اگر اسی طرح زندہ پائندہ اور حوصلہ افزا رہا تو 'تمثیل نو' اردو کے ہر باذوق قاری کے لیے دل کی دھڑکن بن جائے گا۔"

معروف جمالیاتی نقاد حقانی القاسمی کی اس رائے سے بھی شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ:

"'تمثیل نو' ہر حلقے میں مانند شمع، ضوفشاں اور ضیا بار ہے۔" (کتاب نما، دہلی جنوری ۲۰۰۵ء)

روزنامہ "قومی تنظیم" پٹنہ (۲۴؍ اکتوبر ۲۰۰۵ء) میں "تمثیل نو کی بازیافت" کے عنوان سے معروف افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے "تمثیل نو" کی فعالیت کا سنجیدگی سے جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ:

" ......اس کا دائرہ امکانی طور پر آفاقی ہے۔"

دربھنگہ جیسے تاریخی شہر سے کئی رسالے اور روزنامے نکالے گئے لیکن "تمثیل نو" واحد رسالہ ہے جس پر نامور کالم نگار اور صحافی خشونت سنگھ نے اس کی اہمیت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

"There is an Urdu quarterly **"Tamseel-e-Nau"** edited by Dr. Imam Azam of Qilaghat, Darbhanga, which I make point to read: It has good articles, short-stories and poems......"

(ٹیلی گراف کولکاتا/ٹریبون، جالندھر، ۷؍ فروری ۲۰۰۴ء، دکن ہیرالڈ، ۷؍ جولائی ۲۰۰۴ء)

اس طور پر جاننا چاہئے کہ جہاں اردو رسائل و جرائد نے یہاں کی صحافت میں اہم رول ادا کیا ہے وہیں اپریل ۱۹۹۵ء میں راقم الحروف کی کاوش سے آکاش وانی دربھنگہ سے "ہفتہ وار جائزہ" کا پروگرام شروع کیا گیا اور یہاں سے نشر ہونے والا پہلا جائزہ بھی اسی خاکسار نے پڑھا۔ کہنے والی بات نہیں کہ اس توسط سے بعد میں مختلف لوگوں نے اپنے صحافتی جوہر کا ثبوت پیش کیا۔

آخر میں یہ بات بھی گوش گذار کرتا چلوں کہ متھلا کا دائرہ وسیع اور عریض ہے اور یہ کئی اضلاع پر مشتمل ہے لیکن اردو صحافت کی نشو و نما میں متھلا کے شہر قلب "دربھنگہ" کو جو اہمیت حاصل رہی ہے وہ کسی دوسرے شہر یا علاقے کو میسر نہیں ہے۔ اس مقالہ کو میں اپنے اس قطعہ پر ختم کرتا ہوں:

ودیاپتی کے شعر و سخن کا نہیں جواب — اردو زبان پھیلی یہاں مثلِ آفتاب
آسی[1] امام[2] اور مجاہد[3] کا یہ وطن — دربھنگہ "ایک شہر ہے عالم میں انتخاب"

[1] مولانا عبدالعلیم آسیؔ [2] مظہر امامؔ [3] حضرت قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ

....

Mobile : 08902496545 / 09431085816

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

صدیق عالم کی نظموں میں فعال کائنات کی شیشہ گری

تھکا دینے والی زندگی میں اور موضوعات کی بھیڑ میں ثقافتی ضرورتوں کے تحت زبان کے ساختیاتی عمل کو وسیع کرنے کے لئے شاعر نظم کے ذریعہ فلسفہ بشریات، نفسیات، طبعیات اور سائنس کو پیش کرتا ہے۔

صدیق عالم کی نظمیں ایسی ہی ہیں۔ حقیقت اور بصریت کی تھیوری سے وہ واقف ہیں۔ فلسفہ ابلاغ میں فکری جہت سے کام لینے کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ سنجیدہ کمٹمنٹ کے لئے ترکیب، مفہوم کے ساخت اور الفاظ کی موزونیت پر وہ خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ متکلم الفاظ سے موجودگی کی ثنویت کے تصور کو ابھارتے ہیں اور رشتہ قائم کرتے ہیں جس میں موضوع حوالہ بنتا ہے۔ مرکز کے بطلان میں توسیع کا یہ عمل غور وخوض کی دعوت دیتا ہے جہاں قطرہ دجلہ بنتا ہے اور بنیادی جزو کے عقب میں موجود اس Social milieu کو نشان زد کرتا ہے جو ذات کے سسٹم پر اثر انداز ہوتا ہے اور Serial Time کے اتار چڑھاؤ سے مرورِ زماں میں سمٹتا ہے:

یہ وہی خرگوش تھا ہارا ہوا جس نے کہا/ تم انسان ہو/ تم اپنی مرضی کے مطابق قانون بدل سکتے ہو/ تم کچھوے کے گوشت سے منا سکتے ہو اپنی بھوک/ یا پھر اس کے گلے میں ایک تمغہ ڈال سکتے ہو

مگر نیم شب اچانک تمہیں دکھائی دے گا/ کہ ٹیکسیوں کے تمام میٹر کپڑوں سے ڈھک دیئے گئے ہیں/ اور تم اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود/ ایک کچھوے سے زیادہ تیز چل نہیں سکتے/ اور چھوارے کی طرح سوکھا ایک بھکاری/ تمہارے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے/ ہمارا عظیم المرتبت کچھوا بس اسی راستے سے گذرا ہے/ سنگ مرمر کی میز پر، شوربے سے مہکتے ماحول میں/ تم اربوں حقائق کی چکاچوندھ کر دینے والی روشنی میں/ ایک بنچ کے بازو چبا رہے ہو/ تم سوچ رہے ہو اس دنیا میں بہت کم لوگ خوش ہیں/ مگر لوگ اس ملاح سے کم بدنصیب تو نہ تھے/ جس کے ہاتھ سے قطبی تارا کھو گیا/ ہمارے شہر کے راستوں کے نام کبھی خوب صورت تھے/ مگر وہ جنہوں نے اندھیروں پر حکمرانی کی ہے/ انہوں نے کچھوے کا ایک بت بنا کر/ شاہراہ خرگوش پر نصب کر دیا ہے/ اور شور کرتی گھنٹیوں، پھٹتے پروں، گردش کرتے پہیوں/ اور لیٹر بکس میں ڈالتے خطوں کی روزمرہ کی یکسانیت کے بعد/ وہ جو ایک لمبی یاداشت کی سزا کاٹ کر آیا ہے/ اس نے بھی کہا ہے/ ٹریفک کی روشنیاں کچھ بھی کہہ لیں/ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ میں/ کسی کو تو ہارنا تھا/ تو کیا برا تھا اگر آدم کو زندگی کی صعوبت اٹھانی پڑی؟/ یوں بھی ہر واقعے کو انجام تک تو پہنچنا ہی ہوتا ہے

(کچھوا اور خرگوش)

صدیق عالم کی نظمیہ شاعری میں جو ہر وسیع اور بے کنار ہے ساتھ ہی لبریز اور مکمل ہے حالانکہ شگاف میں سے ننگی حقیقت جھانکتی اور جاگتی رہتی ہے اور گفتار کی بُت کو اجاگر کرتی رہتی ہے۔ نظم "شب و روز کے سیاہ و سفید خانے" سے یہ چند مصرعے دیکھئے:

کیا اس اتنے بڑے شہر میں/ ایک غیر جانبدار خطہ اراضی موجود نہیں/ جہاں کھڑے ہو کر/ ہم اپنی عادتوں کے ملبوں سے باہر آسکیں؟/ ایک اوسط انسان کے لئے روشنیاں علامتی ہوتی ہیں/ ان کے ساتھ وہ بدلتا رہتا ہے/ اگر تم جو ہر رات ایک خوف کے ہالے میں جیتے ہو/ دن کے خانے میں پہنچ کر تمہیں پتہ چلتا ہے/ تمہارے پاس صرف ایک آواز ہے/ جو فلک بوس عمارتوں سے ٹکراتے ہوئے/ اپنے مفاہیم کی تلاش میں ناکام/ تمہارے پاس لوٹ آتی ہے

انسان کا روپ منفی پہلو سے محفوظ نہیں رہتا۔ وقت ہمیشہ خون آشام رہا ہے، حال کے اندر ایک زندہ شئے کی صورت کارفرما رہتی ہے، جو دوئی کے تابع ہوتی ہے۔ اور جس میں مقصود بالذات وخود مختار انفرااسٹرکچر دریافت کو سامنے لاتا رہتا ہے۔ صدیق عالم نے سسٹم کی پرتوں کو پیکر کا اثبات بنایا ہے۔ نظم ''اے میرے گمشدہ شہر'' سے یہ چند مصرعے ملاحظہ کریں:

اے میرے گم شدہ شہر کے لوگو/ تم سوتے رہے/ اور دھول اڑتی رہی/ یہاں تک کہ خون اور نمک کے رشتے/ تار تار ہو گئے/ مصور اپنے زخموں کی تصویر بنانے پر مجبور ہوئے/ مغنی کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھا گیا/ اور تاریخ دانوں نے کہا/ جنگ سے جھلسے ہوئے بچے/ وہ جنگ اور امن کے درمیان بے تار پل ہیں

صدیق عالم کی فکر تخلیق کے رگ و پے میں روح رواں کی طرح دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجود کے سارے تنوعات، پیچ وخم کی ساخت تک لکیر کھینچتے ہیں اور تخلیقیت کو اہمیت بخشتے ہیں۔ لفظوں کے ABYSS کی موجودگی سے وہ احساس کو ذہن نشیں کراتے ہیں اور موجودیت کی کیفیت پر لا کھڑا کرتے ہیں۔ نظم ''سمندر پر رات دائمی ہے'' کے درج ذیل مصرعوں میں تخلیقی عمل کی کاریگری یوں ملتی ہے:

ریت جھاگ پیتی رہتی ہے/ انسان کی طرح/ جن کے زخم اندر کو رستے ہیں/ سمندر کسی سہ راہے پر کھڑے/ بت کی آنکھوں کی طرح سفید ہے/ اور ہمارے سائے/ ہم سے زیادہ عظیم اور پائندار ہیں/ وہاں جہاں بے ربط پہاڑی سلسلوں کے پیچھے/ تاروں کی برچھیوں سے آسمان زخمی پڑا ہے/ ہم اپنے منڈے ہوئے سروں کے ساتھ/ بظاہر کہکشاں کی طرح جگہیں بدلتے دکھائی دیتے ہیں/ اگر حقیقت میں اس جاوداں ساحل پر/ ننگے کھڑے ہیں ہم لوگ/ ساحل/ جس سے پرے/ ملبوں اور کیچڑ کے ڈھیر کا لافانی سمندر ہے

تہہ در تہہ وجود کو کھولنا یعنی Disentangle کرنا ایک آرٹ ہے۔ دوسرے لفظوں میں تخلیق کی ساخت کی موجودگی ہے جس سے معنی خیز تجربہ یا مشاہدہ کی جزوں کا منظرنامہ سامنے آتا ہے۔ معنی ومطلب خود کو مسلسل ظاہر کراتا ہے۔ حجاب اندر حجاب سے متعین معانی ساخت کو Deconstruct کرتا جاتا ہے اور قاری کو گنگ میں روشنی کی کرن ضرور نظر آتی ہے۔ نظم ''شہر خبرا'' سے یہ چند مصرعے مدلل طریقے سے اکیسویں صدی کے بنیادی عنصر کا سراغ دیتے ہیں:

شاید تمام جنگیں ایک جیسی ہیں/ اور ہم جنہیں یاد رکھنا چاہتے ہیں/ وہ ریت کے ٹیلے ہیں، بکھرتے رہتے ہیں/ نئی شکلیں لیتے رہتے ہیں/ لوگ کہتے ہیں ان سب باتوں کا کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلتا/ اور جبکہ ہر چیز سب

کچھ ہے/تو اس میں کیا برائی ہے/اگر تاریخ ایک ہی واقعے کا ان گنت بیانیہ ہو؟/آؤ ہم عہد کریں/اس مسخ ہوتی دنیا پر/کبھی جال نہیں پھیلائیں گے/اگر آسمان شق ہو گیا/تم اس کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہو گی سگنی فائڈ کو سگنی فائر سے پہلے جگہ دیتے ہوئے صدیق عالم مقصدی معنویت کو قرأت سے گذارتے ہیں کہ ماورائیت اور پراسراریت سے پہلے آج کی متعین حقیقت بدل چکی ہے۔ نظم ''شہر جبر:۳'' کے یہ مصرعے گواہ ہیں:

ایٹمی گھڑی صحیح وقت بتاتی ہے/جب کہ کراہتے ہوئے بھاگنا اور درد سے چیخنا/یہ ہمارے بنیادی حقوق ہیں/تم ان گولیوں کا ذکر نہ کرنا/جو مغز میں گھر کر رہ گئیں، وہ جینس کے راستے/اگلی نسل کو منتقل ہوں گی

صدیق عالم نے خالق اور تخلیق کے رشتہ کو بھی اجاگر کیا ہے۔ مرد اور عورت کے تخلیقی عمل پر بھی روشنی ڈالی ہے اور عہد بہ عہد کے نظریے کی بھی توضیح کی ہے لیکن وہ فرائیڈ کی لیبڈو اور شعور ولاشعور کی تھیوری سے متاثر نہیں ہیں۔ بلکہ جنسی رویہ یا کج روی کی تھیوری سے الگ تکعیبیت اور تعبیریت کے نئے عوامل پر اپنی سوچ کو منطبق کرتے ہیں۔ نظم ''تخلیق کا نوحہ'' کے یہ چند مصرعے کثیر المعنویت کو سامنے لاتے ہیں:

عورتیں شیولنگ کی پوجا کچھ یوں ہی نہیں کرتیں/عورتیں مردوں کے بیج چرا کر نہیں ٹھنٹھ میں بدل دیتی ہیں/اور بیج کو تناور درخت میں بدل کر/مردوں سے زیادہ جان لیتی ہیں/عورتیں شیولنگ کی پوجا یوں ہی نہیں کرتیں/تخلیق کا صحیح عمل عورتوں کے پاس ہے/مردوں کے عضو تناسل تو اکثر صحیح وقت پر سوئے رہتے ہیں/اگر عورتیں نہ ہوتیں/تو ہم مرد اپنے بیج سے محروم/کب کے پتھروں میں بدل گئے ہوتے/تخلیق دراصل ایک طرفہ عمل نہیں/کہ آپ نے مٹی لی اور بن مانس بنا دیا

لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو پہچان کو گہرے بھری ندی کے کنارے لا کھڑا کرتا ہے۔ جسم ہونا الگ بات ہے اور اسے ٹٹول کر حق جتانا دوسری بات ہے۔ نظم ''میرا باپ اور میں'' کے درج ذیل مصرعے لامحدود کے اندر داخل ہونے اور دریافت کے ملبے کو سامنے لانے کی استخوانی سرنگیں ہیں:

میرا باپ/اس نے تیس برس تک/میری تینوں ماؤں کے ساتھ ہم بستری کی/اور اپنے آخری لمحے کی اداسی کے/تار عنکبوت سے/اپنے سارے سوال لٹکا دئے/اس نے فرار کے تمام راستے مسدود کر دیے/اور ہم کہ اس کے نقش پا کی تلاش میں/دور تک گئے، ہم نے دیکھا/وہ پیالوں کی طرح ٹوٹے پڑے تھے!

صدیق عالم اپنی نظموں میں کثیر ابعادی امیجز استعمال کرتے ہیں جن سے گم شدہ سامنے آتے ہیں، بے پناہی کی ایستادگی ہم دیکھتے ہیں، فراموش شدہ چوبی پشتے دکھائی دیتے ہیں۔ تلاش کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، چہروں کا ایک غیر مختتم سلسلہ افسوں گری کرتا ہے، بے کار کے قدموں کا تھکا ماندہ تذبذب ہے۔ مانوس دروازوں کی نشاندہی ہے، نئی صدی کی تھکن کی دھندلی روشنی ہے، خون آشام زمین کے حاشیے ہیں اور بھی بہت کچھ ہے جن میں معاشرتی ساخت کے خدوخال ہیں اور وقت کے امتزاج کا وسیع ترین پس منظر ہے۔

....

کوہسار، بھیکن پور-۳، بھاگلپور-۸۱۲۰۰۱ (بہار)

ڈاکٹر امام اعظم

ناول ''چار رنگ کی کشتی'' میں عورتوں کے مسائل

صدیق عالم برصغیر کے ان چند نمایاں ناموں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے فکشن میں عورتوں کی اس تصویر کو پیش کرنے تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے جسے ہم اپنے معاشرے میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں بلکہ وہ اس کے اندر کی عورت کو سامنے لانے پر قادر ہیں جن تک ہماری نظروں کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ جہاں تک ان کے ناول ''چار رنگ کی کشتی'' میں نسوانی کرداروں کا تعلق ہے تو ان پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ تھوڑا بہت صدیق عالم کے بارے میں بتا دیا جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بنیادی طور پر وہ فکشن نگار ہونے کے باوجود انھوں نے شاعری کے اتنے نئے تجربے کیے ہیں کہ وہ حیران کن ہیں بلکہ اپنے اس جنون میں انھوں نے نثری نظم نگاری میں کمال دکھاتے ہوئے اپنے ناول ''چار رنگ کی کشتی'' کو نثری نظم کی ہیئت میں لکھ ڈالا ہے۔ پڑھنے والے اسے ناول کی ایک کمزوری سمجھ سکتے ہیں مگر میں اس سے اتفاق نہیں رکھتا۔ اس بحث سے قطع نظر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی تخلیق کو کسی preconceived notion کے ساتھ پڑھنا دانشمندی نہیں ہے۔

ناول ''چار رنگ کی کشتی'' میں چھوٹے بڑے بہت سارے نسوانی کردار ہیں جن میں دو اہم نسوانی کردار کو میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے، ایک اینگلو انڈین لڑکی ایلین اور دوسری کلیسا۔ اختصار کی خاطر میں نے صرف کلیسا کی تصویر کشی تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ بظاہر اس ناول میں عورتوں کے استحصال کی کہانی بیان کی گئی ہے مگر یہ قرأت اس کردار کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ دراصل کردار کلیسا کے ذریعے ہم اس catchment تک پہنچ جاتے ہیں جہاں سے یہ لڑکیاں لائی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں عورتوں کا کاروبار ہوتا ہے، مگر یہاں ناول نگار کا مقصد محض اس کاروبار کی تصویر کشی کرنا نہیں ہے بلکہ اس سارے نظام کی طرف توجہ کرنا ہے جس سے یہ سارا کاروبار جڑا ہوا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں اپنے معاشرے کا پورا چہرا دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس لئے صدیق عالم نے اس ناول میں خواتین کے اس مسئلے کو منٹو کی طرح نہیں بیان کرتے ہوئے قحبہ خانوں تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس نے اس کاروبار کی جڑیں ہمارے اس مقدس معاشرے کے اندر تک کھود نکالی ہیں جہاں سے یہ استحصال اپنی نمو حاصل کرتا ہے۔ میرا مطلب ہمارے شہروں کے مضافات اور بظاہر اس پاک وصاف زندگی سے ہے جسے ہم اپنے آس پاس دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں کیوں کہ اس پر تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ مذہب کی ملمع کاری ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان جب بنگلہ دیش بنا تو مظلوم اور ناچار پناہ گزینوں کا انخلاء شروع ہوا اور ان میں سے کچھ اس گاؤں میں آگئے جس کا نقشہ صدیق عالم نے کھینچا ہے۔ کردار 'بجرل' اور 'کھانی بیگم' سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ دونوں کے اپنے نصب العین ہیں۔ ان کے وضع قطع کی عمل داری الگ ہے۔ صدیق عالم بتاتے ہیں :

> ''تھے گھنگھریالے بجرل کے سینے کے نیم سیاہ بال/ ان میں تھی پیوست کھانی بیگم کی پانچوں انگلیاں/
> کھانی کہ تھی چست بدن، فربہ اندام''

مکھانی کا بوڑھا جاں بلب شوہر یہ سب دیکھتا ہے لیکن بجرل اور مکھانی ذاتی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مکھانی کے بارے میں ناول نگار لکھتے ہیں :

''ارے مکھانی کا جسم ہے وہ استھان/ کہ اس میں جنم جنمانتر کے لیے ڈوب جائے انسان/ وہ بوڑھا جانے کب دم توڑ دے''

بوڑھے شوہر سے اولاد نہ پانے کا دکھ مکھانی کو ہے۔ وہ بجرل کو بتاتی ہے :

''کیا کیا نہ کیا میں نے گنڈا اور تعویذ/ ڈال نہ سکا میری کوکھ میں مگر وہ بیج/ تم سے ڈرتی ہوں، تم ہو بلا/ کے زرخیز/ آئندہ احتیاط ضروری ہے/ آخر میں ٹھہری ایک عورت''

لیکن بجرل کی نظر اس کی جوان ہوتی ہوئی بیٹی کلیسا پر بھی ہے۔ یہ لڑکی چرچ کے احاطے میں اسے ملی تھی۔ تب بوڑھے شوہر کی پہلی بیوی نے اس کا نام کلیسا رکھ دیا تھا۔ صدیق عالم رقم طراز ہیں :

گاؤں کی جل پری تھی وہ، کلیسا تھا اس کا نام/ ایک تتلی کی طرح منڈلاتی رہتی صبح تا شام/ کیچڑ بھرے پانی میں ٹخنوں تک غرق/ کنول کے نیلے پھولوں کو لامبے ڈنٹھلوں پر کھینچتی/ سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کے لیے/ اپنی خوب صورت آنکھیں بھینچتی''

اسی سلسلے کی آگے کی باتیں اس طرح ہیں :

''حاجی قطب الدین کاظمی بیٹھے تھے دروازے پر/ مکھانی بیگم اس کی ٹانگوں کو پلا رہی تھی تیل/ ثواب بٹورنے میں مصروف تھی بجرل کی رکھیل''

صدیق عالم نے جس ماحول کا ذکر کیا ہے، یہ مسکین طبقہ ہے جہاں عورتیں اپنا وجود سمیٹتی رہتی ہیں اور مرد خاص کر بوڑھا مرد غصہ بھی اتارتا رہتا ہے لیکن اس گھر کا مسئلہ ہی کچھ اور تھا۔ سنی میاں جیسا مرد غیرت مند اور بے حیا بھی تھا۔ اس نے ایک دن انتہا ہی کر دی :

''جس شام سنی میاں نے کیا مکھانی کا تعاقب/ اور اسے بجرل کے ساتھ داخل ہوتے دیکھا/ ایک مخدوش حجرے میں/ کلیسا نے اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھی وہ نفرت/ کہ ڈری سہمی وہ دبک گئی گھر کے اندر/ جیسے ایک پر کٹا پرندہ پنجرے کے اندر/ مگر سنی میاں نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا/ اسے سینے سے لگایا/ اس سے ہم بستر ہونے کی کوشش میں/ ہو گئیں اس کے دل کی دھڑکنیں تیز''

یہاں صدیق عالم نے آج کی مجبور، بے بس، ٹھکرائی ہوئی اور فیشن ایبل عورتوں کے مسائل پر گہری نظر ڈالی ہے :

''ختم ہوا وہ دور جب بیوی ہوتی تھی کنیز/ ایثار و محبت کا ہوتی تھی پتلا/ اب تو عورتیں جسمانی پیاس مٹاتی ہیں/ شوہر کہیں اور ہوتا ہے/ اپنا حسن وہ کہیں اور لٹاتی ہیں''

کلیسا کی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ اس کے درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سنی میاں اپنا غصہ، جنسی غصہ اس پر اتار رہا ہے:

''کلیسا نے چیخ کر باپ کو پیچھے ڈھکیلا/ مگر وہ کمزور نازک لڑکی/ جلد ہی مفتوح، آنکھیں اشک ریز/ بن گئی تھی بوڑھے سنی میاں کی کنیز''

دریں اثنا جب سنی میاں کا انتقال ہو جاتا ہے تو عدت کی مدت پوری ہو جانے کے بعد بجرل اپنی بیوی کو گنگا پار بھیج دیتا ہے اور مکھانی بیگم سے نکاح کر لیتا ہے۔ کلیسا دریا کے کنارے گھومتی بھاگتی رہتی لیکن اکثر رات میں اسے سنی میاں کی حرکتیں یاد آتی ہیں۔ صدیق عالم لکھتے ہیں :

''اکثر رات رات بھر جاگتی رہتی/ جانے تھے وہ کس کے انجانے ہاتھ/ جو کھیلتے رہتے اس کے جسم کے ساتھ/ اس کی ٹانگوں کے بیچ آتے/ اس کا سینہ سہلاتے/ اور اکثر رات کی خاموشی میں/ کلیسا اپنے کانوں میں ڈالتی انگلیاں/ کہ ڈوبتی ابھرتی سانسیں بتاتیں ایک ننگی داستان''

بجرل سے کلیسا بہت حد تک مانوس ہو چکی تھی اور بجرل کی آنکھیں کلیسا کا سراپا ناپتی رہتیں۔ اور ایک دن کا واقعہ ہے :

''جس دن پہلی بار اس نے کلیسا کو سینے سے لگایا/ کلیسا کی ہڈیوں میں دوڑ گئی کپکپی/ اس نے رد کرنا چاہا بجرل کا بوسہ/ کہ اس کے پیٹ پر پڑا ایک زبردست گھونسہ/ حرام زادی! کسی دن دبا دوں گا تیرا ٹیٹوا/ مکھانی کا بھاری بدن تو صرف ایک بہانہ تھا/ مجھے تو اپنے نازک پھول تک آنا تھا/ تجھے ایک دن بجرل کے ہاتھوں کھلنا ہے''

اور کلیسا کی جھجک ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اکثر اس کی حرکتوں پر ہنسنے لگتی ہے۔ صدیق عالم نے آگے کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے :

''اس کی للچاتی آنکھیں دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ جاتی / اس سے اپنا ناڑا چھڑاتی / اس کی لائی ہوئی مٹھائیاں کھاتی / اس کے رخساروں پر مچلنے لگا تھا / ایک مکار تبسم/ بجرل ایک کتے کی طرح ہلاتا رہتا دم''

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ:

''حاجی کی آنکھیں اس پر چمکاتیں بجلی/ بجرل بھی وصول کرتا اپنے حصے کا مال/ اس نے بھی حاجی پر تان رکھا تھا کلیسا کا جال''

پھر ایسا ہوا کہ بجرل دو فربہ اندام شریف زادوں کو لے آیا۔ ایک کا نام عبدالرب لشکر تھا۔ اس نے کلیسا کو دیکھ کر بجرل کو مشورہ دیا کہ حاجی اسے اڑا لے جائے، اس سے پہلے ہم دونوں کچھ پیسہ بنا لیں۔ کلیسا کے لیے بیس ہزار روپے مل سکتے ہیں۔

بجرل کے منہ میں رس گلہ آ گیا۔ اس نے کلیسا کو حاجی سے دور رکھنے کی کوشش کی کہ بوڑھا اس سے مباشرت کر نہیں سکتا کہ اس کی کمر میں دم ہی نہیں ہے۔ مکھانی خواب دیکھ رہی تھی کہ حاجی سے کلیسا کی شادی ہو جانے پر ہماری قسمت سدھر جائے گی۔ وہ بڑے گھر کی ساس کہلائے گی لیکن لشکر کے ساتھ شہر میں رہ کر اچھی زندگی کی لالچ دے کر بجرل نے کلیسا کو شیشے میں اتار لیا اور آخر ایک رات چپکے سے بنی پرایا دھن کی طرح اس نے اسے لشکر کے حوالے کر دیا۔ کلیسا نے پہلی بار بڑا شہر، کلکتہ دیکھا۔ لشکر نے اسے شیث محمد اور شیخ طوطا کے حوالے کر دیا۔ ان دونوں کے بارے میں صدیق عالم گویا ہیں :

''چاندنی کی ایک گلی سے چلاتے تھے کاروبار/ دونوں ساجھے دار/ شیث محمد اور شیخ طوطا/ بلیک میں ٹکٹ

بیچنے کے لیے/ عورتیں چھوڑ رکھی تھیں سینما ہالوں پر/ پالتے تھے جیب کترے/ مسخ بھکاری پھیلا رکھے تھے
ہر چوک ہرنا کے پر/ شیخ طوطا نے حقارت سے کلیسا پر نظر ڈالی/ اتنی بڑی رقم کے بدلے کیا اٹھالایا موالی/
اس غریب کو نچوڑ کر لوگ کیا پائیں گے؟/ گاہک کتے نہیں کہ سوکھی ہڈی چبائیں گے/ فی الحال اسے
کرزن پارک میں کام پر لگادو/ خوب کھلاؤ پلاؤ، کرو تندرست/ مجھے چاہیے اس کا بدن چست/ اتنا رکھنا
ہے خیال/ اس کے کنوارے پن پر نہ آئے آنچ/ آج کل گاہک نہیں جھجکتے کروانے سے ڈاکٹری جانچ''

کلیسا کو دن بھر گھر کے کام کاج کے لیے جی توڑ محنت کرنی پڑتی اور شام کو سجا سنوار کر کرزن پارک لائی جاتی جہاں اس کے بدن کو ڈرائیور، دوا فروش، کلرک اور عطار چھوتے جس کے لیے وہ پیسے دیتے اور جس کا آدھا حصہ پولیس لے جاتی۔ کلیسا یہ سب کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن لاچار تھی۔ شہر کے اس غلیظ چہرے کے بیچ اسے رہنا تھا، ننگے پیروں وہ بہت دور نکل آئی تھی۔

صدیق عالم نے بظاہر ایک سامنے کی کہانی بیان کی ہے مگر اس کا پس منظر کافی وسیع اور پیچیدہ ہے۔ ناول نگار کا مقصد صرف یہ نہیں کہ اس کی تصویر کشی کی جائے کہ گاؤں کے ماحول میں غربت کی زندگی جینے والی عورتیں کیسے کیسے مسائل سے جوجھتی ہیں اور کون سی قوتیں ہیں جو انھیں فطرت کے اس صاف ستھرے ماحول سے اٹھا کر بڑے بڑے شہروں کے قحبہ خانوں تک لے آتی ہیں یہاں تک کہ باگماری (شہر کا ایک معروف قبرستان) جیسی جگہ میں چنوادی جاتی ہیں بلکہ وہ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ قدرت کا یہ انتظام نہیں ہے، یہ نظام خود انسان کا اپنا ڈھالا ہوا ہے جس نے عورت کو ایک commodity کے طور پر استعمال کرنے کے لئے تہذیب وتمدن کے تمام ہتھکنڈے استعمال کر رکھے ہیں یہاں تک کہ خدا کے نام کا سہارا لینے سے بھی نہیں جھجکتے۔ انھوں نے کہانی بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا خیال رکھا ہے کہ عورتوں کی جنسی خواہشیں ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے اپنے جذبات ہوتے ہیں۔ بوڑھا مرد جوان جسم کو تسکین نہیں پہنچا سکتا۔ یہیں سے جنسی بے راہ روی کی شروعات ہوتی ہے اور مذکورہ کردار و واقعات ہمارے سامنے ہوتے ہیں اور ان سب کے درمیان عورت کہیں مکھانی تو کہیں کلیسا بن کر ہمارے سماج کی سچائی بیان کرتی ہے۔ یہ ایک مسئلہ ہے جس پر سوچنا ہی پڑتا ہے۔

....

موبائل : 08902496545

● عالمی شہرت یافتہ شاعر منور رانا کی والدہ ماجدہ بیگم انور علی (عمر تقریباً ۸۴ رسال) کا انتقال ۹ رفروری ۲۰۱۶ء کو لکھنؤ کے سہارا اسپتال میں ہوگیا، جہاں وہ گردوں کے عارضہ کے علاج کے لئے داخل تھیں۔ مرحومہ کا جسد خاکی ان کے آبائی وطن رائے بریلی لے جایا گیا جہاں ان کی تدفین ۱۰ رفروری کو صبح ۱۰ ربجے ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی۔ ان کے خاوند انور علی رانا کا انتقال ۸ ربرس قبل ہو چکا تھا۔ مرحومہ نہایت ملنسار، خوش مزاج اور دیندار خاتون تھیں۔ پسماندگان میں ۵ ربیٹوں منور رانا، اسماعیل رانا، شافع رانا، شکیل رانا اور جمیل رانا کے علاوہ ایک بیٹی ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

ابواللیث جاوید کے افسانوں میں ضمیر کا پنچھی

ابواللیث جاوید اس نسل کے تازہ کار افسانہ نگار ہیں جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد انحطاط اور انتشار دیکھا ہے، کرب اور سیل بلا آنکھوں کے سامنے ہے اور ذرائع ابلاغ اور دیگر مشاغل و مصروفیت روزگار کی خارجی اور داخلی تبدیلیوں کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درجنوں افسانے میں واقعات کا مشاہدہ زیادہ عمیق اور صداقت پر مبنی ہے۔ شدت احساس اور گہرے تجربے کا بھرپور عکس فنکارانہ رنگ میں ہے اور نئے حالات، نئے مسائل اور نئے رویوں میں جاری و ساری لہولہان سچائی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر فنکار اپنے ماحول سے متاثر ہو کر لکھتا ہے اور معاشرے کی ترجمانی کرتا ہے۔ تہذیب، رسم و رواج، عقائد و نظریات یہاں تک کہ زبان اور لب و لہجہ تخلیق کے اجزا بن جاتے ہیں۔

ابواللیث جاوید نے بے حسی، بے غیرتی، جبر و ظلم اور ناعاقبت اندیشی و خودغرضی جیسے موضوعات کو بھی افسانے کا حصہ بنایا ہے اور ٹوٹتے بکھرتے نظام کے معاشرتی پہلو کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ علامت، تجریدیت اور وجودیت کے فلسفے سے وہ متاثر ضرور ہیں لیکن بیانیہ انداز کی ایک الگ راہ انہوں نے اپنائی ہے۔ حقیقت نگاری سے چل کر اور علامت تک کا سفر طے کر کے ابلاغ سے بچ نکلنا ان کی فن کاری ہے۔ زمان و مکان کے روشن مسائل کے تاریخ پہلوؤں کی ترجمانی جس مخصوص انداز بیان سے کرتے ہیں اس اسلوب سے نئے تقاضے کا ٹریٹمنٹ سامنے آتا ہے اور ابواللیث جاوید کے افسانوں کی جہت نمایاں ہوتی ہے۔ تاریخی حقیقت سے بھرپور افسانے کی ہم آہنگی سے ایک اقتباس دیکھئے:

> ''احساس کی آنکھیں راجہ مان سنگھ کے زمانے کو بہت قریب سے دیکھنے لگی تھیں۔ سارا قلعہ معمور تھا اور شاہی فرمان لوگوں کو سنایا جارہا تھا۔ لوگ دست بستہ گردن جھکائے بہت انہماک سے سن رہے تھے۔ دلی سے قاصد ابھی ابھی آیا تھا۔ راجہ مان سنگھ کو بہار، بنگال اور اڑیسہ کا حکمراں بنا کر بھیجا گیا تھا اور اس خطہ کوہ و بیاباں کو چمن زار بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اب اس ذرہ کو آفتاب کی چمک بخشی گئی تھی۔ اس چار پانچ برسوں کی قلیل مدت کے قیام میں راجہ مان سنگھ نے اس خطہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور اسے ایک تاریخی اہمیت بخش دی۔ بعد میں ان کے وفادار اور جاں نثار جاگیرداروں نے پہاڑ سے نیچے اتر کر بستیاں آباد کیں۔ ظفر نے رضیہ کو ان سارے مقامات کی سیر کرائی۔'' (پتھر کی زبان)

ابواللیث جاوید نے بعض افسانوں میں پہیلیاں نہیں بیان کی بلکہ سمل سے مناسب مطالب اخذ کئے ہیں اور سماجی، سیاسی اور اقتصادی تغیرات سے حیات کے مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ افسانہ ''تیسری سمت کا سفر'' میں بے رحم تخریبی سرگرمیوں کی اس طرح نشاندہی کی گئی ہے:

> ''یہ علاقہ دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی میدانوں پر مشتمل ہے جہاں دو مختلف سمتوں سے آنے والی

پہاڑیاں ملتی تھیں، یہ تمام لوگ اسی میدان میں صدیوں سے آباد تھے مگر پہاڑیوں کی دوسری جانب سے آنے والی وحشی قوموں کے فسادات سے بری طرح پریشان تھے۔ گزشتہ کئی نسلیں اپنی تمام تر طاقتیں انہیں وحشیوں سے مقابلہ کرنے میں صرف کر چکی تھیں۔ ان کی تمام تر ترقیاں ان کے فسادات کی نذر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ فسادات.... فسادات.... اور صرف فسادات۔ ان کی زندگی میں صرف فسادات کی ہی وحشت باقی رہ گئی تھی۔''

ابواللیث جاوید دکھ بھری کہانی داستانوی انداز میں سنانے کے عمل سے بھی گذرتے ہیں۔ جن راستوں کی پیشانی پر لکیریں ابھرتی ہیں اس ماحول میں منزل کے نشان تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن وقت کی تختی پر مدھم مدھم عکس ضرور برقرار رہتے ہیں۔ یہ دراصل وجود کا آئینہ ہوتا ہے جس کی تھرتھراہٹ کی شناخت اس طرح بھی نظر آتی ہے:

''اس نے جب آنکھیں کھولیں تو گھائل رات لنگڑاتی ہوئی رینگ رہی تھی۔ اور فضاؤں کی جیب سے سورج جھانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رات کی دی ہوئی چند روٹیاں موجود تھیں جسے وہ بار بار نوچ کر لقمہ بنانا چاہتا تھا۔ مگر روٹیوں کے ٹکڑے نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے بار بار روٹیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ہر بار بھوک میں شدت محسوس کی، جب سورج پوری طرح چھت پر اتر آیا تو اس نے تمام روٹیوں سمیٹ کر جیب میں رکھ لیں اور باہر نکل پڑا۔ سڑک سنسان تھی اور ہوائیں گرم۔ دھیرے دھیرے ہواؤں کی رفتار تیز ہوتی گئی اور وہ اداس اداس سارا راستہ طے کرتا رہا بغیر منزل کے۔ منزل کا پتہ اگر ہوتا تو وہ اپنی جیب میں ارتی ہوئی روٹیوں کو کھا جانے کی بات ہرگز نہ سوچتا۔ کیوں کہ منزلیں خود بخود اسے زندگی کی تمام سہولتیں مہیا کر دیتیں اور اس کی یہ روٹیاں جیب سے نکل کر اس کے دل کا بوجھ ضرور ہلکا کر دیتیں۔'' (منی پلانٹ)

آج اپنا ملک ترقی پذیر ہے۔ لیکن بھوک اور فرقہ وارانہ فساد کے تماشے جا بہ جا دیکھنے کو ملتے رہتے ہیں۔ دھرم اور جنون کی راج نیتی نے آگ اور خون کی ہولی سے صورت حال کو نازک بنا رکھا ہے۔ بربادی کے کھنڈروں نے صرف بربریت کی تاریخ رقم کی ہے۔ زمین اپنی جگہ پر قائم ہے۔ تہذیب اور تمدن کو بھی بانٹا نہیں جا سکتا۔ جب آوازوں کا جنگل اگتا ہے اور فضاؤں کی کی مانگ لہو سے بھری جاتی ہے تو دو طرح کے حالات سامنے آتے ہیں۔ نڈھال منظر کا نقشہ ابواللیث جاوید پیش کرتے ہیں:

''باپ نے ایک وقت کی روٹی کے لئے اپنی بیٹی کا سودا کر ڈالا۔ بھوک۔ ہر طرف بھوک اور پیاس۔ ہوٹل کی نالیوں سے بہنے والے گندے پانیوں سے بھوکے بچے کو کچھ کھانے کی چیزیں.... بیکاری.... بے روزگاری.... ایک نوجوان نے ایک کتے کے منہ سے روٹی کا ٹکڑا چھین کر کھا لیا.... بھوک پھر ہی بھوک.... اور اس کے بعد سارے دیس میں آگ کی ایک زبردست لپک.....''

اس آگ میں واقعاتی سازش انگڑائیاں لیتی ہے اور ہر طرف کی فضا لہو رنگ ہو جاتی ہے۔ ابواللیث جاوید نے آہنی شہر جمشید پور کی کہانی بیان کی ہے۔ اسی شہر میں امن اور شانتی کے مسیحا افسانہ نگار ذکی انور رہتے تھے جنہوں

نے مسکراہٹ کی چاندنی کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انہیں تہہ تیغ کر دیا گیا:

''اور اس دن آہنی شہر کی زہریلی ہواؤں کی زد میں پیار و محبت، امن و سلامت کا پیغامبر نفرت کی خلیج پاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مختلف مزاج کے لوگوں کی مختلف آب و ہوا والی بستیوں کے درمیان ایک لنکنگ چین (Linking Chain) بنا ہوا تھا۔ اس نے نفرت، بغض و عناد کی جڑیں کاٹ دینا چاہا۔ آپس کے صدیوں پرانے سمبندھ بحال رکھنا چاہا مگر دشمنی کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ درخت بہت گھنا اور سایہ دار ہو چکا تھا جس کے سایہ میں پاک روحیں مجروح ہوا کرتی ہیں۔ وہ بڑھتا ہی رہا۔ پیار کا پیغام دیتا رہا مگر نفرتوں کی آگ بھڑکتی رہی۔ اس پار جہاں انسانیت کی ساری حدیں ختم ہو جاتی ہیں، ساری بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں، دور دور تک کڑی دھوپ کا شامیانہ تنا ہوا تھا۔'' (ایک ادھوری کہانی)

ابواللیث جاوید کتنی ہی ننگی سچائیاں سامنے لاتے ہیں۔ لفظوں کی زخمی پنکھڑیوں سے کیفیت بیان کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اعتماد کے ساتھ فکری مہم میں شریک کرتے ہیں:

''جب میں نے کسٹم آفس کی طرف دیکھا تو مارگریٹ کے سامان کی O.K. کر دی گئی تھی اور مارگریٹ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، پورے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس نے میز سے بچہ کو پھر گود میں لے لیا اور دو ہی قدم بڑھی تھی کہ ایک کسٹم آفیسر بہت تیزی سے اس کی طرف لپکا اور قریب پہنچتے ہی بچے کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ کسٹم آفیسر کو اتنی دیر تک بچے کے بالکل جامد و ساکت رہنے پر شک ہو گیا تھا۔ مارگریٹ کی ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور بچہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ گرا۔ بچہ مرا ہوا تھا۔ کسٹم فورس نے مارگریٹ کو گھیر لیا تھا۔ کسٹم آفیسر بچہ کو ضبط کر لیا تھا۔ اس کا ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ بچے کی پیٹ کو چیر کر اس میں تیس پونڈ سونا پوشیدہ کر کے کیمیائی مرکب دے کر پھر اسے سی دیا گیا تھا۔ مارگریٹ کو اسمگلنگ کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔''

(روپ بہروپ)

ابواللیث جاوید کے افسانوں میں اردو کے مسائل بھی ملتے ہیں۔ غزالی صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ بلکہ کتابیں ان کی زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔ اکثر معتبر لوگ آتے اور اپنی ضرورت اور پسند کی کتابیں لے جاتے لیکن لوٹانے کا اخلاقی فرض ادا نہیں کرتے۔ دو ایک بار نایافت کتابیں تقاضہ کے بعد لوٹیں بھی تو بیس بیس صفحات غائب ملے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کے بعد ان کے بچے ان کتابوں کو کباڑی کے ہاتھ بیچ دیں گے۔ غزالی صاحب کا ایک شاگرد وزیر بنا تو اس نے انہیں یقین دلایا کہ شاندار لائبریری سرکاری امداد سے بنوا دے گا لیکن اس کا وعدہ سیاسی تھا۔ ایک بہی خواہ نے انہیں مشورہ دیا کہ اردو اکادمی لائبریری کے لئے مالی امداد دیتی ہے: غزالی صاحب کی زبانی ابواللیث جاوید اردو کے ایسے اداروں کی سچائی بیان کرتے ہیں:

''میں شامت کا مارا ہوا سکریٹری کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے فرمایا یہاں سے نکلنے والا جریدہ لائبریری کے لئے جاری ہو سکتا ہے بشرطیکہ آپ اپنے علاقہ کی اردو آبادی کے اعداد و شمار بتائیں۔

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ جناب یہ ذمہ داری تو اکادمی کی بنتی ہے کہ وہ ہر علاقے کا اس طرح سروے کرائے۔ اس کے بعد اردو زبان کو زندہ رکھنے لئے اقدام کرے۔ اردو کی ترویج واشاعت کا ہی مقصد ان اکادمیوں کا ہے نہ کہ مشاعرے، سیمنار اور افطار پارٹیاں کر کے سرکاری گرانٹ کو ضائع کرنا۔ آپ مصروف شعراء وادباء کے مجموعوں کی اشاعت کے لئے مالی تعاون کرتے ہیں، انعامات تقسیم کرتے ہیں۔ میں اکادمیوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب اردو پڑھنے والے ہی ناپید ہو جائیں گے تو ان کتابوں کو کون پڑھے گا۔ آپ نے اردو کی بنیادی تعلیم کا کیا انتظام کیا ہے۔ اتنا سن کر انہوں نے جھلا کر کہا کہ میرا وقت فضول باتوں میں ضائع نہ کریں۔" (آندھی)

آج ملک کے حالات ناگفتہ بہہ ہیں۔ ہر طرف بے اطمینانی ہے۔ افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ تشدد کی آگ ہم ہر طرف دیکھتے ہیں۔ سیاست داں کے چنگل میں عوامی زندگی پھنسی ہوئی ہے۔ یہ رکھوالے شیطانیت پھیلاتے ہیں اور اچھی زندگی جینے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اسی لئے ہمارے اندر دراڑیں ہی دراڑیں ہیں۔ ابواللیث جاوید بگڑے حالات کا جائزہ لیتے ہیں:

"تو کیا آج ہندوستان کے اندر پھیلی اتنی ساری برائیاں کسی ایک رویہ کی ناکامی نہیں ہے۔ تو پھر اس خاص رویہ کا خاتمہ کیوں نہیں ہوتا۔ آج معاشرے میں لاقانونیت، مذہبی بنیادی پرستی، عدم تحفظ استحصال، لوٹ، قتل، عصمت دری جیسی ان گنت برائیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ حکومت کے اندر لوگ رشوت ستانی اور گھپلے جیسے جرائم میں ملوث ہیں۔ ان کا سد باب کیوں نہیں ہوتا۔ عوام راحت چاہتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں سہولیت چاہتی ہے۔ مگر یہ راحت اور سہولت ہے کہاں؟ جہاں جائیے من مانی ہے۔ جہاں دیکھئے رشوت ستانی ہے۔ آخر ہم کیا کریں؟ عوام سے غلطیاں ہوتی ہیں تو ملک قانون سے اسے سزا دیتا ہے مگر حکومت میں شامل لوگ عوام سے دغابازی کریں تو ان کو سزائیں کون دے گا۔ کہتے ہیں یہاں سیاست کا Criminalisation ہو گیا ہے۔ سماج کا ایماندار طبقہ سیاست کے حلقہ سے الگ ہو گیا ہے اور بدنام زمانہ لوگ ہی سیاست میں در آئے ہیں۔ آخر یہ کب تک چلتا رہے گا۔ یہ کروڑوں کی عوامی دولت کا گھپلا سیاست دانوں کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ عدلیہ اگر عوام کے ان مجرموں کو سزائیں نہیں دے سکتی تو انہیں عوام کی عدالت میں کیوں نہیں پیش کر دیتی۔"

(دروازہ بند ہے)

ابواللیث جاوید کے افسانے گرم چھاچھ کی طرح ہیں۔ کتنے ہی سماجی اور معاشرتی مسائل میں ان کا فن پھونکیں مارتا ہے۔ کڑوا گھونٹ سامنے آتا ہے۔ دلیلیں لکڑی بنتی ہیں اور ضمیر کا پنچھی پھڑپھڑاتا رہتا ہے۔ ان کا اسلوب دلنشیں ہے اور ان کا بیانیہ انداز بے زبانی کو زبان عطا کرتا ہے۔

....

موبائل: 09430966156

پروفیسر عبدالمنان

اشرف واعلیٰ شخصیت کے تنقیدی زاویے

ڈاکٹر وہاب اشرفی کی ہمہ جہت شخصیت کو احاطہ تحریر میں مقید کر کے چمن زاری کی بھینی بھینی خوشبو سے دل ونظر کو شگفتہ خاطر کرنا، ہر رہ گزر پر چراغ جلانا اور اس کی ضیا پاشی سے احساس کے گل تر کی خوشبو کو لٹاتا ہے۔ فن کا مقصد تخلیق حسن کی جلوہ گری ہے۔ جمالیات کے تشکیلی مرحلوں میں فطرت کی لالہ بندی احساسات وجذبات کو مرتعش کرتے ہیں اور جس فنکار کے خیالات رنگین حقائق سے قریب تر ہوتے ہیں اتنی ہی کامیابی اس کے بصیرت افروز دل کے قریب ہوتی ہے۔ ہر دور میں کچھ ایسے فن کار متاع ہنر لئے کھڑے ہوتے ہیں جو تفہیمی مراحل میں اظہار کی کشادگی اور اسلوب کی نکتہ رسی کے لئے سوز نہاں کی راہ نکالنے میں انفرادیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ وجدان حیات کی رنگارنگی میں فن کا مقصد جمالیاتی تاثر کا آفریدہ ہوتا ہے اور جو اسلوب ابھر کر سامنے آتا ہے وہ Transforming دنیا اور اکتسابی صلاحیتوں کا زائدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شخصی تجربات وجدید افکار کی حنابندی سے جیسی جہاں بانی اور رنگارنگی ملتی ہے اس کی تازگی محراب حیات اور زم لَو سے مزین ہے۔ جس کی تزئین کاری کیلئے وہاب اشرفی کے منفرد زاویۂ نظر اور فکری اساس پر نظر ڈالنی ہوگی اور اس کی تہہ میں جیسی تنقیدی روش اور نظریاتی عمل کی روشنی نظروں کو مسحور کرنے کا سبب پیدا کرے گی۔ اس کا اندازہ ان کے فکری زاویوں اور اسلوب کی رنگارنگی سے ہو سکے گا۔ وہاب اشرفی کی تنقید کئی اہم اور اکتسابی افکار کا وہ عزیز ترین سرمایہ ہے، جن کو مشرقی نظریۂ فکر اور مغربی اصول نگاہ سے دیکھا اور محاسبہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تنقید میں مغرب سے متاثر ہو کر ایک پر فکر راہ نکالنے کا سماں جس منزل کی طرف گامزن ہے اس میں نکتہ رسی کا تجزیاتی جلوہ جوش مارتا نظر آتا ہے۔ ان کی تنقید شراب لغزش مستانہ، طبیعت کا چلبلاپن اور نوائے قلقلِ مینا کے اشارات میں شعلے کی لپک پر قدم مرکوز رکھتی ہے اور اردو تنقید نگاری کے تنگیِ داماں کا علاج اس تیور اور وفا شعاری کے ساتھ کرتی ہے کہ ایک نیا باب روشن نظر آتا ہے، جس کی جھلک معنی کی تلاش، آگہی کا منظر نامہ، تاریخ ادبیات عالم وغیرہ میں ملتی ہے۔ وہ اس راہ پر گامزن ہونے کے لئے صرف اور صرف مغربی نظریہ فکر کی بنیاد پر نظر ڈال کر اردو تنقید کا دامن وسیع نہیں کرنا چاہتے بلکہ مشرقی نگاہ فکر سے مزین کرنے کے لئے اردو کے تمام سرمایوں پر نظر رکھتے ہیں اور ایک انفرادی زاویۂ نظر کا ثبوت اس انداز سے دیتے ہیں کہ محاسباتی نئے گوشے ابھر جاتے ہیں اور محدود حصار بندی کا علاج نظر آجاتا ہے۔

اردو تنقید نگاری نے عالمی سطح کی مختلف تفکراتی رنگارنگی اور سحر آفرینی کو دامن میں پناہ دے کر اپنی بخت رسائی کا ثبوت جس طرز ادا سے دیا ہے اس نے قلیل مدت میں کوتاہ دامانی کے اعلام میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ احساس کی گرمی، فکر میں ہجیلاپن اور اسلوب میں کشادگی مشرقی ومغربی تنقید کے حلول یافتہ نکتوں کا وہ بہاؤ ہے، جس کے دو دھارے ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو میزان نقد پر تل کر جوان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے اردو تنقید کو یونیورسل رندی اور دور فہمی کے آداب سکھائے ہیں۔ نئے فکری زاویوں اور تفہیمی تہہ داری کی نقاب کشائی کے مانوس وغیر مانوس جلووں کا سماں پیش کیا ہے۔ ان کی تنقید اس حسین محراب کی مانند نہیں ہے جو رنگین وادیوں کی سیر کے بعد اپنا دائرہ

تنگ کر لیتا ہے بلکہ اس کھلی رت کی مانند ہے جہاں بہار و خزاں کا آویزہ ملتا ہے۔ نظر میں نظریے کی شبیہ قائم ہوتی ہے اور محاکماتی جلووں کے ابواب دکھائی دیتے ہیں۔ خیال و فکر کے اثاثے خواہ افسانوی نوعیت کے ہوں یا شعری، تنقیدی یا تاریخی الفاظ قلیل و چست و برمحل فقرے میں اس تیور کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں کہ موضوع کی صورتیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ایسا فنکار مزید ادب کے گم و کاکل کی آرائش نہیں کر سکا۔ ذوق نے کہا تھا :

افسوس آج ذوق جہاں سے گذر گیا　　　حق مغفرت کرے بڑا آزاد مرد تھا

ان کی نقد و نگاہ کی پاسداری نے گلستانِ ادب کی ایسی چمن بندی کی ہے کہ اس کا ظاہری و باطنی حسن ذوق جمال کا آئینہ دار بن گیا ہے۔ انہوں نے قلیل مدت میں کوتاہ دامانی کے علاج میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ احساس کی گرمی، فکر میں تیکھا پن اور اسلوب مین کشادگی مشرقی و مغربی تنقید کے حلول یافتہ نکتوں کا وہ بہاؤ ہے جس کے دو دھارے ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو تنقید کی میزان پر تل کر جوان ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے اردو تنقید کو دور از فہم سرمستی کے آداب سکھاتے ہیں۔

فطرت کے دل میں جب کسی کا انمٹ نام انگڑائیاں لیتا ہے تو سوا ہو کر انسان کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے اور توقع بندھتی ہے کہ اس کے ذہنی کرامات وہ پھول کھلائیں گے تو فنا پر موقوف نہیں ہو سکتے :

تھی ایک کاوشِ بے نام دل میں فطرت کے سوا　　　ہوئی تو وہی آدمی کی ذات ہوئی (فراق)

پروفیسر وہاب اشرفی کے ارتحال کی خبر سن کر کلیجہ منہ کو اس وجہ سے آیا کہ اردو ادب کا جاں باز سپاہی جس نے ادب کی خدمت کو مقصد حیات بنایا تھا اور بے شمار بیماریوں اور مخالفتوں سے لڑ کر آگے قدم بڑھا رہا تھا ۲۰۱۲ء میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ایک دن دنیا سے رخصت ہونا ہر فرد و بشر کی قسمت کا ثمرہ ہے لیکن اس کے شدید احساس کی وجہ سے مایوسی کی چادر اوڑھ لیا اور زندگی کرنے کے جتن سے کنارہ کشی اختیار کرنا جہد مسلسل اور نظام حیات کے ارتقا سے پہلو تہی کرنا ہے۔ اگر زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا تو غالب کا یہ شعر حوصلہ دینے کا بیش بہا ذریعہ ہے:

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ　　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اور اقبال کے اس شعر پر نظر ڈالئے:

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ　　　جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اگر چہ اس دور میں افسردگی اور اضمحلالی کیفیت کی بدلیاں سر پر چھائی ہوئی ہیں اور انسان کی زندگی بقول فراق گورکھپوری بیمار کی رات کی طرح ہے تو شراب حیات کے پیے جانے کا نام زندگی ہے اور بقول میر :

لے سانس بھی آہستہ کے نازک ہے بہت کام　　　آفاق کے اس کارگہ شیشہ گری کا

وہاب اشرفی کی زندگی پختہ تر ہوئی گردش ایام کی پے در پے یورش اور عزم راسخ سے، ادب سے وفا شعاری، انسانیت سے پریم کی بھاونا کی ایکتائی، دور فہمی کو قرب کی لذت، صداقت شعاری پر مر مٹنے کی تڑپ اور سود و زیاں کی اندیشگی کا احساس پیکر خاکی میں جینے کی لہر پیدا کرتی ہے تو وہاب اشرفی جیسا قد آور شخص اشرف و اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ وہ نہ علم و ادب سے بیگانہ رہے نہ اپنے افراد خانہ سے مجتنب۔ دوست داری نبھانے اور حاجت روائی میں کوتاہ قلبی سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی رہے تبسم ریزی کی وفا نبھائی۔ میں نے ان کو تین جگہوں پر دیکھا اور

ان کی محبت وشفقت سے علم و دانش کو بڑھایا۔ پہلی بار 'گیا' میں جہاں وہ مگدھ یونیورسٹی میں بہ حیثیت لکچرار درسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ دوسری بار رانچی یونیورسٹی میں جہاں وہ صدارت کی کرسی پر فائز تھے۔ یہاں دوستوں بہی خواہوں اور طالب علموں کے لئے ان کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے حاجت روائی میں حاتم کی قبر پر لات مارنے کی سخاوت دکھائی تھی۔ بھابی صاحبہ چائے کی پیالیاں بھیجنے میں پریشان رہتی تھیں اور بچے اپنی پڑھائی میں اس قدر مستغرق رہتے تھے کہ دوسرے کمرے کی محفل آرائی کی خبر نہیں رہتی تھی۔ جب بھی ان کے بڑے بھائی (جبار اشرفی) کا فون آتا تو سنبھل کر احترام کے ساتھ محو گفتگو ہوتے۔ انہوں نے LIC کی ملازمت بھی اختیار کی تھی لیکن یہ ملازمت۔ راضی تھی اور ان کے مزاج سے لگا نہیں کھا رہی تھی اس لئے اسے تج کر ادب کی خدمت کو مقدم سمجھا اور کبھی افسانے لکھتے رہے اور کبھی مضامین لکھنے کی خواہش کی تکمیل کی:

ہر چند رہا رہین ستم ہائے روزگار ‏ ‏ ‏ ‏ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

تیسری بار پٹنہ میں جہاں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور انٹر میڈیٹ سروس کمیشن کے چیئرمین رہے۔ ایک بار ان کی رہائش گاہ واقع اسمبلی ہاؤس کوارٹر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جاڑے کا زمانہ تھا اور وہ رضائی میں اپنی نقاہت ونحافت چھپائے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ رہین ستم وفا کا حساب دل کو مضطرب کر رہا تھا کہ میری دستک کا تازیانہ لگا اور محو گفتگو اس طمطراق کے ساتھ ہوئے کہ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ کلکتہ میں کالج اسٹریٹ کی پرانی کتابوں کے چکر لگانے سے لے کر نیشنل لائبریری تک کا سفر کبھی سنجیدگی کے ساتھ اور کبھی زعفران زار کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ یہاں ان کا مزاحیہ انداز روپ دکھانے لگا کہ وہ ہر عظیم شخص کی طرح تمسخر بھرا فقرہ چست کرنے میں کوتاہ قلب نہ ہوئے تھے۔ شکر خداوندی کہ میری شخصیت زد میں نہیں آئی اور اثر داستاں میں ایسے کھوئے کہ وقت گذر جانے کا احساس جاتا رہا۔ چونکہ میں ان کے شاگردوں کی عمر کے برابر تھا اور حصول علم کی تشنگی بجھانے کی خاطر ان سے رغبت رکھتا تھا اس لئے سر کے بل جائے سے نہیں چوکتا تھا۔ ان کی شخصیت اور کارناموں پر خاکسار کا مضمون بعنوان ''ادبی سفر کا اشرفی'' مرتبہ ہمایوں اشرف اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہاب اشرفی نے تنقید وتحقیق کے میدان میں اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑا ہے۔ اگر ان کے کارناموں سے واقف ہونا ہو تو ان کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔ بالخصوص عالمی ادب کی تاریخ جس کے بارے میں اردو کے ممتاز ادیبوں نے یک زبان ہو کر یہ کہا ہے کہ وہاب اشرفی نے ادب میں انفرادیت کا نقش چھوڑنے میں جیسی وفا شعاری تبحر علم نکتہ رسی اور راست بازی کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ انہوں نے درجنوں افسانے لکھے جس میں کہانی پن کی جان کے لئے مکالمے کی چستی اور کردار کی نفسیاتی اور داخلی وخارجی جلوہ گری سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی کہانیاں عہد رفتہ کا شاخسانہ، زمین دارانہ ماحول کا متاعکس جابر وظالم طبقہ کا استبداد اور نئے دور کی آمد کا ایسا روپ ہے جس سے استفادہ کے ذریعہ احساس کے درپن میں حیات ابدی کے چاند اتارے جا سکتے ہیں۔ تمنا کی بے تابی، ایمان کے روکنے اور کفر کے مائل کرنے کے درمیان نفسیات کی تلاطم خیزی جیسی تماش بینی نمودار کرتی ہے جس کا عکس وہاب اشرفی کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کا افادی پہلو افسانہ نگاری کی تاریخ کو نفیس تازگی اور عصری تابندگی سے اس طرح ہمکنار کرتی ہے کہ افادی پہلو کے ساتھ جمالیاتی پہلو بھی نظر آتا ہے۔

ہر معتبر فن پارہ ایک گہرے تجربے سے آشنا کرتا ہے اس میں تنقیدی نظر کے سہارے اس خیال پر موقع فراہم

کرنے کا موقع جا گزیں ہوتا ہے کہ ہر تحریر تجرباتی رویے کی ضامن نہیں ہوتی اس کی ادبی صورت پر بحثیں ہو سکتی ہیں۔ اس میں تجربوں کو عملی تقویت پہنچانے کے لئے آرک میڈس کا تجربہ مدد کر سکتا ہے کہ جب وہ غسل کر رہا تھا تو پانی کی انجانی طاقت اسے اچھالتی تھی۔ اس تجربے سے فائدہ اٹھا کر آرکمڈیس نے Law of buoyancy پیش کیا۔ نیوٹن کا Law of Gravitition جو پیڑ سے پھل زمین پر گرنے کو واضح کرتا ہے ایک نیا تجربہ سامنے لاتا ہے یعنی مشاہداتی کاوش علم میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ علمی حیثیت کو مشاہدہ اشد مدد کرتا ہے۔ فاروقی کا خیال ہے کہ نظریاتی تنقید فن پارے کی روح سے تخصیصی رویہ اختیار کرتی ہے تو ان کے موضوع سے متعلق نظریاتی تنقید کے عناصر سے اثر قبول کر کے اپنی ذہانت جو اس موضوع کے تجزیے سے ہو سکتا ہے (فاروقی) کی Advocacy ناقدانہ عظمت کو تقویت پہنچاتا ہے۔ کیا نظریاتی تنقید ممکن ہے؟ وہ فرماتے ہیں:

''غیر قطعی اور گول مول بات کرنا نقاد کے منصب کے منافی ہے۔ تنقید کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ علم میں اضافہ کرنا ہے لیکن علم سے مراد یہ بھی ہے کہ کسی شئے کے بارے میں آگاہی حاصل ہو۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کسی چیز کا صحیح بیان اس کی صحیح آگاہی فراہم کرتا ہے۔''

فاروقی معلومات کا خزانہ رکھتے ہیں اور تقابلی مطالعہ نے ان کے فہم و فراست میں بلا کی روشنی پیدا کر دی ہے لیکن وہ باتوں کے الجھاؤ میں اس طرح الجھ کر رہ جاتے ہیں کہ اصل موضوع کا سرا گڈ مڈ ہو جاتا ہے۔ تنقید علمی گہرائی اور عمیق نگہی کے بغیر سطحیت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ علم کی گہرائی اور شعور نقد کے بغیر تفہیم کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔ تبحر علمی کا مطلع صاف نہ ہو تو غور طلب امر سے واقف ہو کر ایک پر مغز خیال کی جادوگری کا کرتب دکھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وارث علوی کی طرح شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید Assimilated نہیں ہونے کی وجہ سے ادعائیت کی کارفرمائی ظاہر کرتی ہے۔ علوم کی روشنی میں ادبی شہ پاروں کا تجزیہ منفرد رویوں کی دلالت کرتا ہے لیکن اسے من و عن قبول کرنا اور درستگی کا لیبل چسپاں کرنا، غیر یقینی امر ہے۔ فاروقی تجزیاتی نوعیت کے مراحل میں ناقدانہ فن کی بروئے کاری کی تقدمی اختیار سے انحراف کو، مناسب اور برمحل نہیں سمجھتے۔ موضوع کے انتخاب میں اچھے یا برے کی تمیز کو فوقیت نہیں دیتے کہ ادب پارے کی اچھائی یا سطحیت کا تعلق موضوع سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے برتنے کے انداز سے ہوتا ہے۔ اقبال کی عظمت کا راز ان کے شعری رویہ میں تلاش کرنا چاہئے نہ کہ ان کی شاعری کی تفہیم بالخصوص عشق رسول میں۔ اگر وہ عشق رسول کو شاعرانہ حسن عطا کرنے اپنی تبحر علمی اور فنی ربودگی کا جوہر دکھاتے ہیں تو ایک کامیاب شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ غالب زندگی کی رفت خیزی اور غم کاکل کے پردے میں اندیشہ ہائے دور دراز کا وظیرہ باندھ کر گلوں کی سسکیوں کو بے سبب نغمات کہنے کا لیبل نہیں لگاتا بلکہ ' خاک کر سر بلند ہونے کی بارگاہ تلاش کرتا ہے اور اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے۔ وماخلقت الانس والجن الا لیعبدون۔ حالی کا قول ہے :

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان بننا   مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

ایسے فنکار کا فکری اثاثہ بازار نطق گویائی میں جنس خرید کر نہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور بے اصولوں کی نظر میں محترم قرار دینے کی جسارت نہیں کرتا تو وہ قطعی طور پر مثبت رویوں کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ درخت کی شاخیں خشک ہو کر قلم بن جائیں پھر بھی پھولوں کی آمد کا سلسلہ نسلاً در نسلاً ختم نہیں ہوتا اور تخم گل کی

حفاظت کا مسئلہ قائم رہتا ہے۔ ان کے خیالات حسن کی تہذیب کا پیش خیمہ بھی ہیں اور تہذیب کا حسن بھی۔

تہذیب کی حسن کاری زندگی کو حسین بنا کر میں اور تُو کی دوری کو مٹاتی ہے تو خود کو کھو کر پاتی ہے :

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے　　　　کہ دانا خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے

وہاب اشرفی کی علمی وادبی ریاضت کائنات ادب کے دامن کو فکر جہاں، ساز درد کی لذت اور سوز نہاں کی الفت اور تخلیقی لمحوں میں احساس کی تپش، دانش وری اور داخلی کشمکش سے بھر دیتی ہے تو ایک ایسا ادبی دروازہ کھلا ملتا ہے جہاں رنگا رنگ جلووں کی تازہ ہوا داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ زندگی کا بیش قیمت لمحہ سود وزیاں سے عبارت ہے تو حسیت کی تشکیل کی آئینہ گری نئے آب وتاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ عروج وزوال کی ساعتیں جو لمحاتی ہوا کرتی ہیں ایک ایسا درِ نہاں چھوڑ جاتی ہیں جو بصیرتوں کی دنیا وسیع کرتی ہیں :

میری صفات کا جب اس نے اعتراف کیا　　　　بجائے چہرہ کے آئینہ اس نے صاف کیا

شعورِ ذات وکائنات، تجربات ومشاہدات کے سہارے ترسیل کا جامہ نہیں پہنتا تو احساس کی شدت ذات میں دم بخود ہو جاتی ہے اور یہی درگی رویہ فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ الفاظ کا لباس زیب تن کراتا ہے تو وہاب اشرفی جیسا فنکار اپنی متاع نقد کے لئے بازار ادب میں کھڑا ہو کر جوہر دکھاتا ہے۔

ادب کا دائرہ وسیع تر ہو کر جاذبیت اور شائستہ بیانی سے قریب تر ہوتا ہے تو اس کے ہمہ گیر امکانات کا محبت بھرا سفر مسرت اور بصیرت کے ساتھ موضوع کا تنوع ڈھونڈتا ہے۔ زبان زندگی کی نوع بہ نوع کروٹوں، متعدد حادثوں، دائمی کوششوں اور کرامتوں سے عبارت ہے۔ یہ جہد مسلسل، تیشۂ نفس اور سنگ گرانی کے جلووں سے آشکارا ہے تو انسان کی صبح ومسا کی سعی کوہ کنی کے در پر جرأت رندانہ کے ساتھ دستک دیتی ہے تو ہمہ گیریت کے پردے چاک دکھائی دیتے ہیں اور مانوس وغیر مانوس جلووں کا طلسم نئی شکل دکھاتا ہے جو افکار کی تازہ کاری کا استعارہ سمجھا جاتا ہے اور اضطراب اعلیٰ قدروں کا متمنی ہوتا ہے۔ لالہ کی حنا بندی عرفان ذات کی فطرت سازی کا وہ کرشمہ ہے جو بسا اوقات مفکروں کے قلم سے نمایاں ہوتا ہے۔ یہی کرشمہ وہاب اشرفی کی تنقیدی متاع اور روشن فکر کو دور فہمی کے پر اثر کاوش کی جاں کاہی عطا کرتی ہے تو ان کے جنون فکر دید کے قابل اور تقلید کے لائق بن جاتی ہے۔ جس قدر انہیں کامیابی ملتی گئی اسی قدر قاری کا اندیشہ ہائے دور دراز مسرت افزائی میں بدلتا گیا۔ ان کے الفاظ ایوان رنگ وبو میں اس خندہ جبینی کے ساتھ کھڑے ہیں جیسے خیال کی دلہن کو مست خرامی کا پیغام مل گیا ہو۔ معتبر اور فکر وغنا میں ڈوبا ہوا شخص در کعبہ سے پھر آنے کی جسارت رکھتا ہو تو وہ حیات کی کرشمہ زائی کو بازیچۂ اطفال نہیں سمجھتا اسے اورنگ سلیمانی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس وطیرہ سازی نے وہاب اشرفی کو قصۂ قدیم وجدید سے ایسا ناتا جوڑنے کا درک دیا ہے کہ نئے تجربوں سے بیزاری پیدا کر کے صرف اور صرف اردو ادب پر اکتفا نہیں کرتے عالمی ادب کا منظر نامہ اس قدر متاثر کرتا ہے کہ اس میں مخفی مواد کا سیلِ رواں غور وفکر کا نیا زاویہ قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں نے نئے زاویے کی بات کی ہے جس کا دائرہ کار وہاب اشرفی کو ستائش کی تمنا سے دور نئے میلانات کی طرف لے جاتا ہے اور رقصِ جہاں تابی میں زنجیر سلاسل کی جھنکار نہیں دیکھتے۔ فرد کی بخیہ گری پر جنوں کی جامہ دری کو نئی راہ پر چھوڑتے ہیں۔

مکان کی سایہ داری دھوپ کی تپش کو برداشت کرنے کا موقع فراہم نہیں کرتی ہے تو اس سے دو صورتیں جلوہ

گر ہوتی ہیں۔ ایک صورت مشکل کشائی کی لذت سے مل کر کسی شئے کے حاصل ہونے کی مسرت افزائی کو پیکر خاکی کے لئے کندن بناتی ہے اور دوسری صورت سایہ داری کی برکت کو آواز دیتی ہے۔ دونوں صورتیں جب مل جاتی ہیں تو ایک تیسری شکل نمودار ہوتی ہے۔ جس میں زندگی کی رمق زیادہ ہوتی ہے اور یہ شکل وہاب اشرفی کے روپ میں نمایاں ہوتی ہے۔ جو احساس کی کروٹوں پر مشاہداتی رنگ کی جلوہ گری نچھاور کرتی ہے۔ اس کی جھلک ان کی افسانہ نگاری میں بھی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی کشتی آگ کے دریا میں اترنے کے لئے موم کی مانند نہیں ہے۔ آہنی تلوار کی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ اپنی جان کے ریشوں سے زمانے کا چلن باندھنے کی جرأت اور ہنرمندی وہاب اشرفی کی کہانیوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں نہ ذہنی قلابازی کا ذریعہ بنتی ہیں اور نہ الہڑ پن کی مثال پیش کرتی ہیں۔ اس رنگ بدلتی دنیا کی شکلیں جن حالات کا مظاہرہ کرتی ہیں ان کی کراہت تنفر کو جنم دے کر دور جانے کا احساس پیدا کرتی ہے ضرور لیکن ارد گرد کی پھیلی صورتیں جکڑ لیتی ہیں۔ ع کتنے ہیں دلفریب غم روزگار کے
زمانے کے رگ وریشہ کو باندھنا سب کے بس کی بات نہیں۔ اس دشت خار میں وہاب اشرفی جیسا مجنوں برہنہ پا نظر آتا ہے اور نقد و نظر کا اصول سکھا جاتا ہے۔

جب ماضی کے جھروکوں سے جھانکتا ہوں تو کئی جگہوں کی یادیں شیر و شکر ہو کر طبع حزیں پر گراں خاطری کا ذریعہ نہیں بنتیں اور ہمہ تن گوش ہو کر نزاکت آواز میں ایسا کھو جاتا ہوں کی دھوپ چھاؤں کے مزہ چکھنے میں اور فصلوں کی بربادی کو چڑیوں کی چہچہاہٹ کی سازش پر محمول قرار نہیں دینے میں اقرار کو آواز دیتا ہوں اور اس خواہش کی تکمیلیت کا جامہ پہنانے سے قاصر رہتا ہوں کہ وہاب اشرفی کی حیات میں جو ان سے متعلق رہی ہے اور میرے علم میں آئی ہے، اثر کے ساتھ سناتا جاؤں۔ میں جوں ہی جوش شوق کے ساتھ بیٹھ کر نطق خامہ میں حرکت دینے والا تھا کہ اپنی نقاہت اور علالت میں ڈوبا ہوا عزم راسخ کو چھوڑ کر اپنے رشتہ داروں بہی خواہوں اور دوستوں کو روتا ہوا وہاب اشرفی اس دار فرانی سے کوچ کر گئے۔ جنہوں نے رفاقت کی داد دینے کی خواہش رکھی تھی، ان کے قلم تکتے رہ گئے اور ان کے کارہائے نمایاں کے رنگ اتارنے کی جسارت کی شمع قرطاس پر بے شمار افکار و خیالات کے پتنگے گرنے لگے۔ نعمان ہاشمی نے ان کی فکری جہاں گیری کو لوٹے سے تعبیر کیا ہے۔ میں اسے جھیل سے مشابہ قرار دیتا ہوں کہ جھیل میں گہرائی بھی ہوتی ہے اور آب کی کثرت بھی۔ جھیل جب رواں ہوتی ہے تو دلِ عاشق کی لہر میں ڈوب کر وہاب اشرفی جیسے نباض کے افکار و کہنیات کو اپنے دامن میں سمونے کی جسارت کرتا ہے اور ایک در کا حصہ بنتا تو اس کے گرد و نواح میں بے شمار پرندوں کا غول سمٹ آتا ہے۔ اس جھیل سے پار اترنے کے لئے بی بی پور، کلکتہ، ڈھاکہ اور پٹنہ کا طویل سفر کرنا ہوگا کہ کسی عظیم شخص کی روداد حیات ایک جگہ مقید نہیں ہوتی۔ اس کی نیرنگی ضوئے کم آب میں نہیں ڈوبتی۔ برگ شباب المنا کی کے ساتھ زیست کے شجر سے بہت بے آبرو ہو کر جدا نہیں ہوتی اور ٹھوکروں کو اپنے کام و دہن سے مستول کرتی ہے تو حیات کی کندنی اپنا جوبن دکھاتی ہے اور کھٹے میٹھے جذبات رنگ آمیزی کا سبب پیدا کرتے ہیں۔ ایسے جذبات کی رو میں غرق آب ہو کر پار اتر جانے کی جسارت کرتے ہیں وہاب اشرفی۔

....

● ۲۴/بی، عبدالحلیم لین، کولکاتا-۱۶ (مغربی بنگال) موبائل : 09907171781

ڈاکٹر سید تقی عابدی

حالی کی قلبی واردات: سر سیّد کا مرثیہ

سچ ہے ع: "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔" یہ مرثیہ حالؔی کے فن اور ان کا سرسید سے خلوص کا شاہکار ہے۔ حالؔی نے سرسید کے مرثیہ کو فارسی میں ترکیب بند کے سات بندوں میں تخلیق کیا جس کے ہر بند میں دس شعر ہیں یہ مرثیہ ایرانی شاعر محتشم کاشی کے مرثیے کی بحر میں ہے۔ یہ فارسی کا مرثیہ مئی ۱۸۹۸ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔ مرثیہ کے پہلے حصے میں سرسید کے انتقال سے جو رنج وغم کی لہر برصغیر میں پھیلی اور ان کی کمی سے جو شدید نقصان قوم کو ہوا اس کو بڑے ہی خوبصورت اور پُر تاثیر انداز میں بیان کیا ہے جو ان کی قلبی واردات اور فن پر مہارت کی دستاویز بھی ہے:

اے عجب گز مُردنِ یک پیرِ مردِ سال خورد	تاب وتب در کودک و پیر و جواں انداختند
اے عجب کز سوزِ اندوہِ وفاتِ مسلمے	مردمِ ہر کیش را آتش بجاں انداختند
سید اندر قوم نقدے بد اندر کیسۂ ای	کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند
قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت	بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند

یعنی تعجب ہے کہ ایک بڈھے کے مرنے سے اضطراب اور بے چینی بچوں جوانوں اور بزرگوں میں پھیل گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان کی موت نے ہر قوم وملت کے لوگوں کے دلوں کو جلا دیا ہے۔ سرسید قوم کی تھیلی کی نقدی تھے چنانچہ نقدی گر گئی اور اب تھیلی خالی ہے۔

قوم کی تعمیر اور عظمت کی دولت ہاتھ سے نکل گئی اور بعد میں اُسے خاک میں دفن کر دیا گیا۔ سرسید نے تمام عمر ملت اور دین کی حفاظت کی۔ یہی ان کا حج تھا یہی روزہ اور یہی ان کی نماز وہی قوم کا سید اور سردار ہے جو قوم کا خدمت گزار ہے یقیناً سرسید کی سیادت اس کی گواہی بھی دے رہی ہے۔

در مصافِ دہر بودن دین و ملّت را سپر	حج او ایں بود ایں صوم وایں بودش صلواۃ
سید القوم ست ہر کس قوم را خدمت کند	قدمت او بر سیادت بس بود او را گواہ

حالؔی مرثیے کے تیسرے بند میں انسان بننے کی اہمیت کو بہت خوب صورت تمثیلوں اور تلمیحوں سے مضمون باندھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ حالؔی کہتے ہیں کوئی فضل وعلم میں نابغۂ روز ہو سکتا ہے کوئی فصاحت میں مثل سحبان یا عقل وحکمت میں لقمان جیسا بن سکتا ہے، دولت میں قارون کو پیچھے کر سکتا ہے سلطنت اور ثروت میں خسرو اور پرویز بن سکتا ہے کہیں بہادری میں رستم تو کبھی قطب اور غوث سب کچھ ہو سکتا ہے مگر انسان ہونا دوسری چیز ہے۔

انسان وہ ہے جو ہمسائے کے رنج و درد سے بے تاب رہتا ہے وہ جنت کی ہوا میں بھی محروموں کی زندگی سے افسردہ رہتا ہے وہ دوسروں کے مقابل خود کو خوار و ذلیل محسوس کرتا ہے اس کا دل دکھ سے بھرا رہتا ہے اگرچہ شبستان ہی میں کیوں نہ ہو کیونکہ وہ محنت کشوں کی زحمتوں کا احساس رکھتا ہے۔

می تواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن
در فصاحت ہمچوں سحبان، در خرد لقماں شدن
می تواں در جاہ و ثروت گوے از قاروں ببرد
می تواں در زہد و طاعت غیرتِ صنعاں شدن
می تواں در ملک و دولت خسروِ پرویز گشت
می تواں در زور و طاقت رستمِ دستاں شدن
میں تواں قطبِ زماں شد، می تواں شد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن
چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسایگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواریِ ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

پھر اس مضمون کو خوب صورت گریز سے دو آتشہ بنا دیتے ہیں قوم کی فکر میں زندگی گزارنا اور قوم ہی کے زندان میں گھٹ کر مر جانا اگر کوئی کرسکتا ہے تو وہ سر سید احمد خان بن سکتا ہے:

زیستن در فکر و مردن اندر بند قوم
گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

حالی نے مرثیے کے چوتھے بند میں بتایا کہ سر سید کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ سر سید کو ہر طرح سے بُرا کہا گیا۔ سر سید پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا یعنی ایک پورا محاذ سر سید کے خلاف کھڑا کیا گیا لیکن سر سید کے پایے استقلال میں جنبش نہ ہوئی وہ شیر مردوں کی طرح اپنی داخلی روشنی اور حرارت سے کام کرتا رہا وہ محفل کو روشن رکھنے کے لئے شمع کی طرح خود پگھلتا رہا لیکن اپنے گھوڑے کی مہار آخری وقت تک منزل مقصود کے پہنچنے تک تھامارہا اگر چہ راستہ کانٹوں بھرا تھا حیف کہ نادانوں میں جو دانا تھا چلا گیا جو بنجر زمین میں میوہ دار درخت تھا اکھڑ گیا۔

بود در امت بہ بدعت متہم از راستی
ارے ایں باشد دریں عالم سزائے راستاں
یار جز علمش نہ بود وعلم دانی تا درست
ایں چنیں بے کس سزد کز جہل پرداز جہاں
بود یاراں را سپر تا بود در ہر شور و شر
لیک یاراں بر سرش تیغ جفا می آختند
خواجہ در فکرِ صلاحِ دین و ملت در گزشت
لیک اہلِ دین و ملت قدرِ اُو نشناختند
کار کارِ شیر مردان است کز سوزِ دروں
بزم را افروختند و شمع ساں بگداختند
سید از رہ تا دمِ آخر عناں را بر نتافت
گر چہ در راہش بسے خار و خسک انداختند
حیف کاندر جمعِ مستاں ہوشیارے بود، رفت
در زمینِ شور نخلے بار دارے بود، رفت

اے علی گڑھ ذرا تو ہی بتا کس نے تجھے شہروں میں شہرت یافتہ کیا کس نے تیری خاک کو آسمان پر پہنچا دی:

اے علی گڑھ آں کہ کردت شہرت در امصار، کو؟
آں کہ از خاکت بہ گردوں برد آں معمار کو؟

حالی مصلح بھی ہیں مجدد بھی ہیں۔ وہ سب سے زیادہ قوم کی فکر میں ہیں انھیں معلوم ہے کہ ہمارے قدم رکنے نہ پائیں یہ تعلیمی تربیتی ادارے اسی طرح سے ترقی کے راستے پر گامزن رہیں۔ وہ مرثیہ کے آخری بند میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں جس کے لیے یہ سارا مرثیہ کہا گیا۔ وہ ملت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں سر سید نے دار العلوم تمہارے

لئے بنایا ہے تاکہ نسل درنسل دولت علم سے مالا مال رہے انھوں نے پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نکالی ہے جو پانی نالے میں بہہ چکا تھا اُسے واپس لوٹا دیا ہے مجھے خوف یہ ہے کہ مخالفت کے زور سے یہ چشمہ کا پانی استعمال کے قابل نہ رہے ہاں یہی اور صرف یہی وقت ہے کہ ہم سب باہم متفق ہو جائیں۔ عزم و استقلال کے ساتھ کھڑے ہوں ہاتھوں میں ہاتھ ہو اور ہماری کمریں کام کرنے کے لیے کسی ہوئیں ہوں۔

خواجہ دار العلمے از بہر شما بگزاشت است — تا بود نسلِ شما از علم و دولت بہرہ ور
کوہ با کندہ است تا این جوئے شیر آوردہ است — بو کہ آب رفتہ در جوے شما آید ز سر
ترسم این سر چشمہ گردد تیرہ از سنگ خاف — ہان وہاں وقت است، وقتِ اتفاق ہم دگر
عزم جزم آرید و برخیزید و ہم دستاں شوید — دست بکشائید و بر بندید دامن بر کمر

جہاں تک زبان و بیان سوز و تاثیر زور و جذبات کا تعلق ہے یہ فارسی کا مرثیہ حالی کی فارسی تصانیف کا گل سر سبد ہے۔ یہاں تشبیہات کی ندرت استعارات کی لطافت ترکیبوں کی بلاغت اور لفظوں کی فصاحت حالی کی فارسی شاعری کا سکہ منوا رہی ہے۔

....

۱۰ ار سکر ہیریٹ روڈ، نیو مارکیٹ آن، ۱۳ ار ایکس، ایم ۴، کینیڈا

ڈاکٹر شکیل احمد مانو کے نئے رجسٹرار

ڈاکٹر شکیل احمد، جوائنٹ سکریٹری، یو جی سی، نئی دہلی نے مورخہ یکم فروری ۲۰۱۶ء بروز پیر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد کے رجسٹرار کے عہدے کا جائزہ انچارج رجسٹرار پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ سے لیا۔ ان کا تعلیمی انتظامیہ میں تجربہ وسیع رہا ہے۔ وہ یو جی سی میں ڈپٹی سکریٹری اور جامعہ ہمدرد دہلی یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار کی ذمہ داریاں سنبھال چکے ہیں۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۸۵ء میں بی کام اور ۱۹۹۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم کام کیا نیز ۱۹۹۸ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر شکیل احمد کی کتاب "ہیومن ریسورسز ڈیولپمنٹ ان یونیورسٹیز" ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ ان کے تحقیقی مقالات برصغیر کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

منیزہ احتشام، پاکستان

''نالۂ شب گیر'': مختصر تجزیہ

سحرزدہ ہوں—اس ناول کو پڑھنے کے کافی دیر بعد تک مجھے چپ رہنا پڑا کہ کبھی کبھی کوئی فن پارہ دماغ کی کچھ اس طرح مرمت کرتا ہے کہ اس کے بعد سکوت لازم ٹھہرتا ہے—

عورت آج نہ صرف ادب بلکہ معیشت، سیاست اور میڈیا کا بھی بڑا موضوع ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سے قبل ایسا کیوں نہیں تھا؟ ناہید ناز کا جو کردار مشرف عالم ذوقی نے تخلیق کیا وہ اس سے بیشتر کیوں تخلیق نہیں کیا گیا؟

اس سے قبل ہر داستان، کہانی اور ناول کی عورت بے وفا اور جنس زدہ ہی کیوں ہے؟

کیا کہانی لکھنے والے مردوں کا واسطہ کبھی عورتوں سے نہیں رہا......

آخر کیا وجہ تھی کہ باکردار عورت کہانی سے غائب رہی؟

یہ سوال اکثر میرے پیش نظر رہتے ہیں......

عورت کو ہمیشہ جنس زدہ کیڑا بنا کے پیش کیا گیا جو شوہر سے بے وفائی کرتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں دوسرے مردوں سے تعلقات بنالیتی ہے۔ اسی سماج میں بیس بائیس سال کی عمر میں بیوہ ہو کے بغیر مرد کے صبر کی زندگی گزارنے والی عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ مگر وہ کہانی کا موضوع کیوں نہیں بنتیں... ان کی عزت ان کے صبر کا صلہ کیوں نہیں دیتا سماج ...... انہیں سیلوٹ کیوں نہیں کرتا ...... بلکہ اس سماج کی آنکھ میں سور کا بال ہے کہ ان کو ایسی عورت کی بغل میں بھی چور نظر آتا ہے...

کیا خدا کبھی کسی مریم کی گواہی دینے زمین پر اترا؟ /نہیں۔

ہمارے سماج میں طوائف پہلے شاعری کا موضوع رہی پھر کہانی کا موضوع بن گئی.. عام عورت جس کی کہانی لکھی گئی وہ بھی وہ تھی جس سے کوئی غلطی ہوئی پھر مرد نے ہاتھ میں قلم پکڑ کے اس کو خوب رگیدا اور مسلا...... معاملہ اتنا آگے بڑھا کہ یہ تاثر ہی ختم ہو گیا کہ عورت صابر شاکر اور پاکباز بھی ہو سکتی ہے...

ناہید ناز اپنے ہی گھر کی غلام گردشوں میں کچلی اور مسلی گئی ...... یہ زیادتی اس کی رگوں میں بغاوت بن کے دوڑی اور پھر اس نے آخر میں ایک ملکہ ایک طاقتور شخصیت کا روپ بدلا اور مرد کو اس خوف میں مبتلا کیا جس خوف میں اکثر مرد، عورت کو مبتلا کیا کرتا تھا...... نالہ شب گیر کا راوی مرد آخر اس دبنگ عورت کے سامنے خود کو بے بس چوہے میں بدلتے دیکھتا رہا......

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ عورت ہو یا مرد دونوں کا اصل خوف ان کی ٹانگوں کے بیچ ہے۔ عورت بھی یہیں سے مار کھاتی ہے اور مرد بھی ...... میں غلام باغ میں مرزا اطہر بیگ کا وہ جملہ کبھی بھول نہیں سکتی جو انہوں نے ایک عطائی کے بارے میں لکھا تھا:

''شہر بھر کے بھی دولت مند اس کی مٹھی میں تھے ...... اس نے بھی طاقتوروں کو ان کے آلات تناسل سے پکڑا ہوا تھا۔''

کیوں کہ وہ ان کو ایفروڈائز کس دیتا تھا...... ذوقی صاحب نے بھی اسی مرکز کو جا کے پکڑا ہے...... اور ناول کے آخر میں ناہید ناز کا جو تمکنت اور وقار ہے وہ اس لیے کہ وہ جنس کی طلب سے الگ ہو چکی ہے۔ اب مرد اس کے لیے مسئلہ نہیں رہا— یہی وجہ ہے کہ مرد خود کو اس عورت کے مقابل چوہا محسوس کرتا ہے۔ جبکہ اس کے پیرالل دوسری طرف صوفیہ ہے...... صوفیہ جیسے مرد کی جنسی محبت میں مبتلا ہو رہی ہے ویسے ہی خوفزدہ ہوتی جا رہی ہے...... صوفیہ کا اصل خوف یہی ہے جس نے اس کو کمال کے ساتھ ''جنس'' کے ساتھ باندھا ہوا ہے اور جتنی وہ محتاج ہو رہی ہے اس جبلت کی اتنی ہی مرد کی جانگھوں میں گھس رہی ہے...... یہ دو نسوانی کردار ہیں ایک سہما ہوا اور دوسرا چھایا ہوا...... دونوں کا تعلق جنس کے ساتھ ہے...

یہ ناول اپنے اندر ایک بڑے موضوع کو لیے ہوئے ہے...... جس پہ جتنی بات کی جائے کم ہے۔

عورت تب تک منظر نامے سے غائب رہی جب تک اس کے ہاتھ میں قلم نہیں تھا۔ اور وہ محض جسم تھی۔ آج اس کے ہاتھ میں قلم ہے اور اس کی کھوپڑی کے اندر دماغ ہے۔ اب وہ مرد کو اتنی آسانی سے یک طرفہ فیصلے کرنے اور اس کے بارے میں الٹی سیدھی رائے قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی.. اب وہ محض ادب کا موضوع نہیں بلکہ خود ادب کی خالق ہے۔

اب وہ محض کردار نہیں بلکہ کرداروں کی خالق ہے......

یہی وجہ ہے کہ مرد کو بھی اس کے لیے کچھ مختلف سوچنا پڑ گیا ہے...... اب وہ صرف صوفیہ نہیں بلکہ ناہید ناز بھی ہے...... نالہ شب گیر اسی انقلاب کا اعلامیہ ہے...... کہ اب عورت کے کردار کو کچلا نہیں جا سکتا...... کہ کبھی تو اتنا چڑھایا کہ مشتری و ثریا کا ہم نوا بنا دیا اور کبھی ظالم...... بیوفا...... دغاباز کہہ کے زمین پہ لا پٹخا...... وہ کچھ نہیں کہے گی...... وہ بچے کے ہاتھ میں پلاسٹک کی گڑیا کی طرح ہے کہ جس طرح چاہے برتے...... کبھی نہلائے کپڑے پہنائے کبھی گندی نالی میں ڈالے احتجاج نہیں کرے گی...... بلکہ اب وہ زندہ ہے اور روبرو ہے۔

....

ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی

مکاں سے لامکاں تک کا شاعر: شمس جلیلی

پورنیہ ہر عہد میں تہذیب وثقافت، علم ودانش اور ادب وفنون کا ترجمان رہا ہے۔ اسلامی عہد ہو یا عہد برطانیہ یہ کارواں کبھی نہیں رکا اور نہ یہ تخلیقی آبشار خشک ہوئے۔ کوہ ہمالہ کے دامن میں پھیلا ہوا یہ علاقہ محبتوں کا نغمہ بکھیرتا رہا۔ پوری وادی اتفاق واتحاد، ایثار ورواداری کی وجہ سے دارالسرور ہے۔ یہاں کی فضائیں پر کیف اور ہوائیں مشک بیز ہیں۔ کیف وسرور کا یہ عالم ہے:

اے پرنیہ کی سرزمیں تو بھی ہے کتنی دلنشیں — ہر خار ہے رشک چمن رشک فردوسِ بر
کچھ بھی نہیں اس میں گماں بیشک ہے تو جنت نشاں — بہتی ہزاروں ندیاں جیسے فلک پر کہکشـ

....

سرزمینِ پرنیہ پر ناز ہے ہم کو بہت — کردئے یزداں نے افشا راز بھی یاں پر بہت
یہ ہمالہ کا ہے دامن اور تجلی زار ہے — جو بھی گلشن ہے یہاں پر گلشنِ بے خار ہے
ہر طرف پھیلی ہوئی یاں ہیں پہاڑی ندیاں — گل فروشاں دامنِ کوہ و بیاباں بھی یہاں

پروفیسر طارق جمیلی ہوں یا پروفیسر احمد حسن دانش، مولانا محی الدین ہوں یا مولانا حسین احمد کون نہیں جانتا ہے کہ یہ حضرات اس سرزمین کے سپوت نہیں، پر اب یہی ان کا وطن ہے، سبھوں کے دلوں میں بستے ہیں اور ایک ساتھ محبت کے گیت گاتے ہیں:

تمیز رنگ و بو برما حرام است — کہ ماپروردۂ یک نو بہار یم

اس حسین وادی کی تہذیب وثقافت اور قدیم علمی وادبی روایت کو جناب اکمل یزدانی جامعی نے سینے سے لگایا اور اپنی تخلیقات بے بہا اور تصنیفات نادرہ سے دنیائے علم وادب کو آشنا کیا۔ فردوسی نے تیس سال میں اپنا شاہنامہ مکمل کرنے کے بعد یہ دعویٰ کیا تھا:

بسی رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم بدیں پارسی

لیکن اکمل یزدانی کے یہاں "فقیرانہ آئے صدا کر چلے، میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے" کی صدائے بازگشت ہے۔ عجز وانکسار ہے، محبت ووارفتگی ہے۔ اکمل یزدانی کی علمی وادبی کاوشوں میں پورنیہ میں فوجداروں کی حکومت، پورنیہ نمبر، پورنیہ کے دو ولی، مولانا حسین احمد مدنی کے اسفارِ بہار وغیرہ ایسی تخلیقات ہیں کہ پورنیہ کی علمی وادبی اور ثقافتی تاریخ ان حوالوں سے استثناء واعتبار حاصل کرتی ہے۔

اس سرزمین کی دوسری مشہور ادبی شخصیت جناب شمس جلیلی کی ہے۔ آپ کا اصل نام محمد شمس الزماں اور تخلص شمس ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ایک دینی اور علمی خانوادہ میں پیدا ہوئے۔ دولت کی فراوانی اور مال وزر کی ارزونی آپ کی علمی کاوش اور ادبی ذوق میں کبھی سدراہ نہیں بنی۔ ورنہ اس بت طناز نے بہتوں کے وارے نیارے کردئے۔ جن کو زمانہ بھلا چکا ہے۔ جناب شمس جلیلی نے ابتدائی تعلیم مجم بری پوری، منشی مہتاب الدین اور محب الحق جیسی معروف

شخصیتوں سے حاصل کی اور وفور شوق میں گلستاں، بوستاں سعدی اور دیوان حافظ تک پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد علوم عصریہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ بہار کی سب سے قدیم علمی اور تہذیبی مرکز پٹنہ یونیورسٹی میں اس وقت کے نامور اساتذہ پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر صدرالدین فضا شمسی، علامہ جمیل مظہری اور پروفیسر محمد مطیع الرحمن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

پٹنہ کے قیام کے دوران شعروادب سے دلچسپی ہوئی۔ عباس علی خاں بیخود سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ پروفیسر کلیم عاجز اور وفا ملک پوری سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہے۔

جناب شمس جلیلی ایک مستند شاعر اور فنکار ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات ''مکاں سے لامکاں تک'' کے کئی جہات و ابعاد ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں حزن وملال بھی ہے اور حسینوں سے چھیڑ چھاڑ بھی۔ زمانے کی روش پر طنز بھی ہے اور سالوی فطرت پسندوں پر طعن و تشنیع بھی۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے مداح بھی ہیں۔ ان کے کلام میں حکایت دل اور معاملات عشق بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے :

متاعِ خود فریبی تھا وفورِ سجدہ ریزی بھی ۔۔۔ کہ میں نے لائقِ سجدہ کسی کا آستاں سمجھا

غزل میں شمس دل کی ٹوٹی پھوٹی باتیں تھیں ۔۔۔ کسی نے شاعری سمجھی کسی نے داستاں سمجھا

....

دوستی بھی مصلحت سے کم نہیں ۔۔۔ دوستی رکھتی ہے پیمانے بہت

آپڑا ہے وقت جب بھی شمس پر ۔۔۔ دوست کم تھے اور انجانے بہت

....

ہوئے جب سے محافظ تم نہیں محفوظ ہے کوئی ۔۔۔ جو آئے بام سے نیچے وہ زیرِ دام ہو جائے

....

منور کس قدر رہبر کا گھر ہے ۔۔۔ بہت تاریک ہر اک رہ گزر ہے

شمس کی غزلیہ شاعری میں جذبات وکیفیات کی ترجمانی بہت لطیف پیرائے میں ہوئی ہے۔ انہوں نے وفور شوق میں عروس فن کے تقدس کا نہ صرف خیال رکھا ہے بلکہ اس بت طناز کی ناز برداریاں بھی کی ہیں۔ کیف ومستی میں نہ تو قدم بہکے اور نہ وارفتہ ہوئے۔ ان کے یہاں معشوق سے سرگوشیاں کس لطیف پیرائے میں ہوئی ہے ملاحظہ کیجئے :

خیالوں میں ان کو بلاتے رہے ۔۔۔ شب ہجر یوں ہی بتاتے رہے

شب ہجر یادیں ستاتی رہیں ۔۔۔ تھپک کر انہیں ہم سلاتے رہے

گلے اور شکوے کا انجام تھا ۔۔۔ وہ روتے رہے اور رلاتے رہے

جناب شمس جلیلی انسانیت کے بلند اقدار کے امین ہیں اور شرف انسانیت کے ثناخواں بھی ہیں۔ وہ اس پندار اور غرور سے بچنے کے لئے خدا سے دعا گو بھی رہے۔ جو اس میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ اپنے آئینہ پندار میں اپنے علاوہ کسی دوسرے کی تصویر دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔ جلیلی صاحب کے یہاں مذہبی گرفت بھی زبردست ہے۔ وہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی تلقین کرتے ہیں :

خدا مجھ کو ایسی بڑائی نہ دے ۔۔۔ جو چھوٹا ہو ہم کو دکھائی نہ دے

وہ انسان کیا وہ انسان ہے ۔۔۔ برائی کے بدلے بھلائی نہ دے

جلیلی صاحب کے یہاں عشق کا اظہار مختلف انداز میں ہوا ہے لیکن کہیں سطحیت اور اوچھا پن نہیں۔ انہوں نے غزل کی آبرو کا کس حد تک پاس رکھا ہے:

زبانِ عشق پابندِ رسومات نگاہ حسن کچھ مبہم نہیں ہے
چلے آؤ ابھی روشن ہے محفل چراغ آرزو مدھم نہیں ہے

....

کریں گے کام کچھ اہلِ جنوں ہی اسیر عقل فرزانے رہیں گے

....

فرازِ دار تک ہم ڈھونڈ آئے خدا جانے کہاں قاتل گیا ہے

....

میں اس کی بزم سے آیا ہوں اٹھ کر یہ کچھ دل ہی بتا سکتا ہوا کیا ہے

....

نگاہ حسن کی جاتی ہے کیا کیا زبانِ عشق گویا بے زباں ہے

جلیلی صاحب کے کلام کا خاصا حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں جہات کا احاطہ کرتی ہیں۔ انہوں نے علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی شخصیات پر بڑی جامع اور وقیع نظمیں لکھی ہیں۔ یہ شخصیات زیادہ تر ان کے دیدہ وشنیدہ ہیں اور انہیں علاقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ شخصیتیں علاقائی ضرور ہیں لیکن ان کی خدمات اور تخلیقات سے علمی اور سیاسی دنیا متعارف ہیں۔ جیسے مولانا اسرار الحق قاسمی، اکمل یزدانی جامعی، وفا ملک پوری، پدم شری سید حسن، سیاسی رہنما میں رفیق عالم اور محمد حسین آزاد جو ایک عرصہ تک ملکی سیاست میں بڑے سرگرم رہے اور ناموری حاصل کی۔ نظموں کی اس جھرمٹ میں عالم گیر شہرت کی حامل شخصیتیں بھی شامل ہیں جیسے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، باپو، ویر کنور سنگھ وغیرہ۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد نظمیں ہیں۔ ان کی بعض نظمیں اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ جس میں فکر اور فن کا حسین امتزاج ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ جیسے "بیکل کوئل بیکل کوئی" اور "دختر کشمیر" تو ان کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

دخترِ کشمیر

یہ وزیرا جو کہ آئی ہے یہاں کشمیر سے دیکھ لو ابرو کو اس کی کم نہیں شمشیر سے
رخ کتابی، قد میانہ، چال ہے مثلِ نسیم آنکھ نرگس، زلف سنبل، ہونٹ ہیں انجیر سے
سنبل و ریحاں کی وادی سے یہاں آئی ہے وہ ہوگئی مجبور بالکل فکر کی تعمیر سے
قوم کی خدمت کا جذبہ اس طرح معمور ہے آگئی ہے چھوڑ کر جنت کو یہ کشمیر سے

مذکورہ بالا نظم "دختر کشمیر" پٹنہ میڈیکل کالج کی ایک طالبہ ہے۔ کس خوبصورتی سے شاعر نے سراپا نگاری کی ہے کہ اس کی پوری شبیہ ہمارے سامنے تجسیم ہوجاتی ہے۔ بلاشبہ جلیلی صاحب اردو کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام سے چند اشعار مشتے نمونہ از خروارے پیش کیے گئے ہیں۔

....

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ موبائل: 08409715634

ڈاکٹر عشرت بیتاب

سرور عثمانی: یادیں، باتیں اور تحریریں

سرور عثمانی صاحب اب نہیں رہے لیکن ان کی یادیں، باتیں اور تحریریں آج بھی زندہ ہیں۔ آپ ایک لافانی شخصیت کے مالک تھے سرور عثمانی ایک تجربہ کار مدیر، ایک پختہ قلمکار اور قادر الکلام وکہنہ مشق وشاعر وادیب تھے۔

کل ہی کی تو بات ہے جب الہ آباد سے نعیم اشفاق نے فون پر اطلاع دی کہ سرور عثمانی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یقین جانئے یہ سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ گذشتہ ماہ ہی موصوف سے کلکتہ علاج کیلئے جاتے وقت، آسنسول اسٹیشن پر کافی دیر تک گفتگو ہوئی۔ سرور صاحب کے ہمراہ ان کے چھوٹے صاحبزادے بھی تھے۔ سفر کے تھکان اور علالت کی کمزوری کے باوجود محترم اپنے رسالے پر ہی تبصرہ کرتے رہے۔ ''ناولٹ نمبر'' کی تیاری پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے بنگال کے قلمکاروں کی شمولیت پر زور دے رہے تھے۔ سرور صاحب نے اپنے رسالے کے اس دور ثانی میں ''مفاہیم'' کو عصری تقاضوں کے نقیب کی صورت پیش کرنا چاہ رہے تھے۔ رسالے کے اس نئے دور میں موصوف اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود اپنی پوری قوت کے ساتھ لگے رہے اور گو کہ اس نئے دور میں دو ہی شمارے ابتک دے پائے لیکن یہ دو شمارے اپنی ضخامت اور مواد کی روشنی میں کئی رسالوں کے سالناموں پر بھاری ہے۔

موت سے تین دن قبل سرور صاحب سے فون پر باتیں ہوئیں تھیں۔ موصوف کی آواز میں نقاہت تھی جب میں نے صحت کی بابت پوچھا تو کہنے لگے۔ ضعیفی اور بیماری سے کمزور پڑ گیا ہوں لیکن ''ناولٹ نمبر'' کی تیاری میں لگا ہوں۔ ایسے جواں مرد صحافی کو سلام صد سلام۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین!

طلعت انجم فخر بھی اس الم ناک خبر سے حیران رہ گئی۔ کہنے لگی کہ ابھی تو گذشتہ ہفتے ہی آپ سے (عشرت بیتاب) باتیں ہوئیں تھیں کہ 'ناولٹ نمبر' کے لئے سرور صاحب کا تقاضا آرہا ہے۔ مدیر موصوف سرور صاحب کی فرمائش پر ہی طلعت انجم اپنے ناول کو ناولٹ کی صورت دے رہی تھی افسوس کہ مدیر موصوف اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ان کے ادھورے کاز ان کے عزیز فرزندوں، شفیق بھائیوں اور محب اردو کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے اور ان کے دیرینہ خواب کی تکمیل ہوجائے۔

شازیہ فخر جو اس رسالے کو شوق سے پڑھتی تھی کہنے لگی ___ ''مفاہیم کے دونوں شمارے میرے مطالعے میں رہی۔ اتنا ضخیم اور معیاری رسالے کے مدیر کا یوں اچانک ہم سے جدا ہوجانے سے ادب کا ناتلافی نقصان ہوا ہے اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔''

شگوفہ تمنا اپنی ذاتی مصروفیت کے باوجود ادب کو پڑھ رہی ہیں محترمہ کی ایک تحقیقی کتاب عنقریب منظر عام پر آنے والی ہے۔ میں نے جب سرور صاحب کی موت کی اطلاع دی تو کہنے لگی کہ :

''سرور عثمانی صاحب ادب کے مرد مجاہد تھے افسوس کہ انکے رسالے میں چھپنے کی میری خواہش اب شاید ہی پوری ہوسکے۔ اللہ ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے اور موصوف کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔''

راقم الحروف نے جب اپنی اس تحریر کیلئے نعیم اشفاق سے ان کے تاثرات جاننے چاہے تو چودھری ابن النصیر (نعیم اشفاق) نے کہا کہ ''سرور صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات تھے، موصوف نے ''مفاہیم'' کے ''کہانی نمبر'' کا ذکر کرتے ہوئے کہا ''سرور صاحب سے ان کے ۳۵ سالہ تعلقات تھے۔''

نعیم نے سرور عثمانی صاحب کی رحلت پر اپنے دلی صدمے کا اظہار کیا۔ رسالہ ''مفاہیم'' کے دور ثانی کا بیان درج کراتے ہوئے کہا کہ۔ ''نئی شکل وصورت اور معیاری مواد کی فراہمی میں مدیر موصوف انتہائی لگن اور دلجمعی سے کرتے تھے۔ 'ناولٹ نمبر' کی تیاری میں بھی ان کی سرگرمیوں کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہوا کہ اب بھی موصوف اپنے ادبی کاموں میں تازہ دم ہیں۔''

میں اپنی تحریر کو طوالت دیتے ہوئے احسان ثاقب (نوادہ) سے جب فون پہ رابطہ کیا تو موصوف کہنے لگے۔ ''ہاں بھائی عشرت، میں نے یہاں کے اخباروں میں انکی وفات کی خبر پڑھی ہے۔ بہت دکھ ہوا۔ ایک اچھے اور معیاری رسالہ کے مدیر کی جدائی ناقابل برداشت صدمہ ہے۔ مگر اللہ کی مرضی کے آگے ہم سب بے بس ہیں۔ اللہ مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ آمین''۔ اس کے بعد معراج احمد معراج نے تفصیل سے جو جانکاری دی وہ یہ ہے۔

''سرور عثمانی اپنی ذات میں انجمن تھے۔ وہ ایک عظیم شاعر و ادیب کے علاوہ ایک ذمہ دار مدیر بھی تھے۔ گذشتہ دنوں 'مفاہیم' کا جو لسانیات نمبر شائع ہوا تھا اس کی ترتیب و تزئین میں انہوں نے انتھک کوشش کی تھی اور بڑے نایاب مضامین شامل کئے تھے''۔

شان بھارتی ''مدیر رنگ'' دھنباد نے کہا کہ ''ان کا رسالہ 'مفاہیم' ادبی دنیا میں ایک منفرد پہچان رکھتا تھا''

سرور عثمانی صاحب ایک پختہ کار وقادر الکلام کہنہ مشق شاعر وادیب کے علاوہ ایک تجربہ کار مدیر بھی تھے سہ ماہی ''مفاہیم'' موصوف کی مدیرانہ بصیرت کی منہ بولتی تصویر ہے ۱۹۸۰ میں آپ نے بے حد معیاری اور تاریخ ساز ''ادب نمبر'' شائع کیا تھا۔ آپ کی صحافتی پختگی کے سبب ''مفاہیم'' کا وہ ''ادب نمبر'' نے پوری ادبی دنیا میں اپنی گہری چھاپ چھوڑی تھی جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ''مفاہیم'' (گیا) کے دور اول کا ''ادب نمبر'' یقیناً موصوف کا ایک شاہکار کارنامہ تھا۔

اب اس دور ثانی میں سرور صاحب ایک بار پھر ''ادب نمبر'' سے شمارے کا افتتاح کیا جب کہ اس درمیان ان کے وقت کی پوری نسل ان کی گرفت سے باہر تھی۔ کچھ ادیب وشاعر کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ بعض تو اللہ کو پیارے ہوگئے اور جو باحیات وفعال رہے بھی تو ان سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس طرح اس نئے دور میں موصوف جنریشن گیپ کے بھی شکار رہے لیکن واہ رے جوش ادب، کہ اپنی عمر کے اس حصے میں بھی بالکل تازہ دم ہو کر بے حد معیاری اور تاریخی ہئیت کا 'ادب نمبر' لیکر میدان علم وادب میں اتر آئے جیسا کہ سرور صاحب مفاہیم کے دور ثانی (رانچی) کے پہلے شمارے کے اداریہ میں رقم طراز ہیں ''ایک طویل عرصہ کے بعد تمام ادبی تعلقات کا گمشدہ قرار پانا یقینی بات ہے۔ ہمیں اپنی شکست کا شدید احساس ہے اسے افتتاحی شمارہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔''

موصوف کا یہ اعتراف نامہ خاکساریت پر مبنی ہے ورنہ شمارہ کی ورق گردانی کے بعد قاری کی آراء دیکھ کر ان کی محنت وجانفشانی پر رشک آتا ہے۔

''ادب نمبر'' کی اشاعت نو کے بعد اردو احباب نے جو حوصلہ بخش خطوط لکھے انہیں مختصراً آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

''بلاشبہ آپ اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں اللہ کار خیر کا اجر ضرور دے گا'' (گوپی چند نارنگ، دہلی)

''مفاہیم ملا۔ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔۔۔ آپ اپنی روایت کو برقرار رکھا ہے۔'' (رشید امجد، پاکستان)

''مختلف اصناف سے آراستہ یہ ادبی گلدستہ ادبی حلقوں کی سیرابی کا باعث قرار پا کر ایک جداگانہ شناخت قائم کرے گا۔'' (خواجہ محمد اکرام الدین، نئی دہلی)

''اردو ادب کے لئے یہ ایک تحفہ ہے لیکن جھارکھنڈ کیلئے میل کا پتھر ہے۔'' (مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور)

''آپ سے ایسی ہی شاندار واپسی کی توقع تھی۔'' (مظفر حنفی، نئی دہلی)

''دور ثانی میں 'ادب نمبر' کی شاندار پیشکش اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافے کا حامل اس نئے شمارے میں ایک سن رسیدہ مگر تھکا ہوا نہیں بلکہ مشاق مدیر کے عزم جواں اور بصیرت افروز نگاہیں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ (عشرت بیتاب، آسنسول)

''ہر چیز کا انتخاب آپ کے حسن انتخاب کی عمدہ مثال ہے۔'' (ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ)

''مدیر 'مفاہیم' کا اعلیٰ ذوق اور لگن ہر صفحہ پر مسکراتی نظر آ رہی ہے۔ (شمیمہ سید، لاہور)

سرور صاحب صحافی کے علاوہ ایک ذہین اور باشعور شاعر بھی تھے۔ آپ نئے نئے خیالات کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہوئے اردو شاعری کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہے آپ ایک فطری اور ہوشمند تخلیق کار کی طرح اپنے گرد و پیش کے مسائل کے اظہار اور اصلاح کیلئے مبلغ اور ناصح کے بجائے ایک شاعر کا رول ادا کیا ہے۔

سرور صاحب نے شاعری کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزلوں میں جہاں آپ اپنی نوعیت کے ایک طرح دار شاعر تھے وہیں نظموں میں بھی اپنے رنگ و آہنگ کی انفرادیت رکھی ہے جہاں احساس کی شدت اور جذبے کی حدت کی فراوانی ملتی ہے ملاحظہ کیجئے۔

سنو آسماں کے فرشتوں! /تمہیں ایک عذاب مسلسل سے دوچار ہونا پڑے گا/ فلک کے مکیں بھی پریشاں ہوں گے/ خدا کالے سورج کو روتا ہوا دیکھ کر حکم دے گا (ماتمی رقص)

زندگی سے فرار ناممکن/ چاہ کر بھی وہ مر نہ پائے گا/ ایک ویران قبر کی جانب/ کون اپنا قدم بڑھائے گا (یہ سچ ہے)

مناظر عاشق ہرگانوی صاحب، سرور عثمانی کی نظم ''یہ سچ ہے'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''سرور عثمانی لفظ و پیکر کے علامتی برتاؤ سے مشاہدہ کے طلسم کدہ کی ناگزیریت پر زور دیتے ہیں۔''

اور زندگی کے سفیر کی حیثیت سے موسم گل کے وسعت طلب وجودی ادراک کا احساس دلانا چاہتے ہیں تاکہ منکشفانہ شعوری اہمیت برقرار رہے''۔ آخر میں موصوف کے اس شعر کے ساتھ آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔

شوق مٹی کے کھلونوں کا اُسے بچپن سے تھا
راس مٹی آ گئی! ویران گھر اس نے کیا

....

زیب کدہ، جہانگیری محلہ، آسنسول ۷۱۳۳۰۲ (بنگال) موبائیل نمبر: ۹۸۵۱۴۳۹۶۳۹

پروفیسر حافظ شائق احمد یحییٰ

پروفیسر شاکر خلیق: کامیاب استاد، باشعور سماجی کارکن اور مشہور شاعر

''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا'' کے سنہرے اصول پر گامزن پروفیسر شاکر احمد یحییٰ اردو فارسی کے ایک نہایت کامیاب استاد کے ساتھ ساتھ مشاعروں میں چھا جانے والے ایک مشہور شاعر بھی ہیں۔ ان کی جواں ساز شاعری کے دور میں ان کا قلمی نام ''شاکر خلیق'' مشاعروں کی کامیابی کا ضامن سمجھا جاتا تھا۔ بعدہٗ انکی شاعری میں صوفیانہ رنگ بھی غالب آ گیا اور اب انکی حمد، نعت و مناجات ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام ''اعتراف جنوں'' کی غزلیں بے حد دلکش، دل سوز اور رومان پرور ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''احتساب جنوں'' زیر طبع ہے۔ ان سب خصوصیات کے علاوہ ڈاکٹر شاکر خلیق شروع ہی سے ایک سرگرم سیاسی اور سماجی کارکن بھی رہے ہیں۔

گرچہ اپنے قریبی رشتہ دار اور خاص کر اپنے محسن بڑے بھائی پر کوئی مضمون لکھنا ایک مشکل سعی ہے، اس مختصر مضمون میں پروفیسر شاکر خلیق جنہیں میں پیار سے شاکر بھیا پکارتا ہوں، کی شخصیت کے چند ایسے پہلوؤں کا تذکرہ ہے جو شاید عام لوگوں سے مخفی ہو۔ ان کے علمی اور ادبی کاوشوں پر بشمول ان کے استاد مرحوم عطاء الرحمٰن عطا کا کوی کے کئی حضرات نے خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کے کوائف اور تعلیمی سفر پر میرے دوسرے بڑے بھائی پروفیسر شاہد احمد یحییٰ نے والد ماجدؒ کی کتاب ''تذکرہ آل تراب و سرگزشت عبدالخالق خلیق'' کے ملحقات (Appendix) میں روشنی ڈالی ہے۔ والد مرحوم کے انتقال کے چوبیس برسوں بعد ناچیز نے ان کی خود نوشت سوانح حیات اور ''سفرنامہ حج بیت اللہ'' مرتب کی جو بالترتیب 2010ء اور 2011ء میں شائع ہوئی۔ ان کتابوں کا قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مولانا آزاد لائبریری میں اور عکسی نسخہ خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ والد ماجدؒ مصلح انسان اور پکے مسلمان کے ساتھ ساتھ ایک باکمال ادیب و شاعر بھی تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم چار بھائیوں میں تین کو ادبی ذوق و شوق ورثہ میں ملا۔ سب سے بڑے بھائی مرحوم جناب شوکت احمد یحییٰ صاحب کو بچپن ہی میں والد صاحب نے اپنے واحد بڑے بھائی مرحوم عبدالسبحان صاحب (جنہیں کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ ملک کے بٹوارے کے بعد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے تھے) کو گود دے دیا تھا۔ اس طرح بڑے بھائی صاحب کی تربیت ادبی ماحول میں نہیں ہو پائی اور وہ اس ورثہ (Inheritance) سے مستفید نہیں ہو سکے۔ حالانکہ ان کی علمی صلاحیت کم نہ تھی اور عام معلومات (General Knowledge) شاید ہم تینوں بھائیوں سے زیادہ تھی۔ گرچہ اپنی اولاد کی ایسی قربانی والدین کے لئے ایک بڑی سعادت اور جسارت کا کام ہے مگر اس کا نفسیاتی اثر اولاد پر اکثر بہت منفی ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے بڑے بھیا کی زندگی میں دیکھا۔ انکی شخصیت پر ایک مضمون الگ سے درکار ہے۔

شاکر خلیق صاحب میرے تیسرے بھائی یعنی مجھ سے بڑے اور شاہد صاحب سے چھوٹے ہیں۔ میرے اور شاکر صاحب کے درمیان ایک بہن شبیبہ خاتون تھیں جن کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا۔ لہٰذا شاکر صاحب اور میری عمر میں اچھا خاصہ فرق ہے۔ مگر مزاج کی ہم آہنگی اور میری شوخی کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان نہایت دوستانہ

تعلق رہا ہے۔ ویسے بھی اپنے تمام بھائی و بہنوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں پورے خاندان کا محبوب (Darling) رہا ہوں اور میری طفلانہ یا بے جا حرکتوں کو سبھوں نے نظر انداز کیا ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر میرے بے باک فیصلوں اور مشوروں کو سراہا اور مقدم رکھا۔ ایسی دوسری مثال شاید کم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تینوں بھائیوں میں نہایت گہرے مراسم ہیں اور آج تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی ہے جس سے آپس میں کوئی شکر رنجی یا اختلاف رائے ہو۔ بچوں کی تعلیم، شادی بیاہ، زمین و جائداد کی تقسیم و دیگر تمام مراحل باہمی پُرخلوص مشورہ سے حل ہوتے رہے ہیں اور انشاء اللہ تا عمر ایسا ہی ہوگا۔ گرچہ مندرجہ بالا باتیں ذاتی ہیں لیکن ان کا تذکرہ یہاں اس لئے آ گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان کم ہی رکھا جاتا ہے جس سے آپس میں تعلقات خراب ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو دخل اندازی کر کے حالات خراب کرنے کا موقع بھی ہاتھ آ جاتا ہے۔ ہر چند کہ ہماری دینی تعلیم ایسے کاموں سے صریحاً روکتی ہے، افسوس کے ہمارے سماج میں منفی سوچ رکھنے والے اور آپس کے تعلقات خراب کرنے والے زیادہ ہو گئے ہیں اور ہمدردی اور غم گساری کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

شاکر صاحب کا میں ہم مکتب نہیں رہا مگر کھیل کے میدان میں ساتھ ساتھ دوڑنے اور فٹ بال کھیلنے کا کافی موقع ملا۔ ہماری بستی نظر احمد آباد سے ایک کیلومیٹر کی مسافت پر ایک بڑے تالاب کے کنارے بستی کے نوجوانوں نے ایک بڑا فٹ بال کا میدان بنا رکھا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد ہم لوگ وہاں فٹ بال کھیلتے اور مغرب کی نماز چھوٹ نہ جائے اس لئے شام ہوتے ہی دوڑتے ہوئے واپس آتے۔ شاہد بھائی و شاکر بھیا جب بھی اسکول و کالج کی فرصت میں نظر آتے تو کھیل میں ہمارے ساتھ شریک ہوتے۔ ان دنوں ہماری بستی کی فٹ بال ٹیم کافی مضبوط تھی اور اطراف میں کئی ٹورنامنٹ جیت کر بہت مشہور ہو گئی تھی۔ ٹیم میں ہمارے بھائی صاحبان کی شمولیت کامیابی کا ضامن سمجھی جاتی۔ چونکہ والد صاحب خود بھی اپنے کالج کے فٹ بال اور ہاکی ٹیم کے مشہور کھلاڑی رہ چکے تھے وہ تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ کھیل کود، سیر و تفریح کی اہمیت کو بخوبی جانتے تھے اور ہمیشہ ہماری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ شاکر صاحب و شاہد صاحب سنٹر فارورڈ کی پوزیشن پر نہایت تال میل سے کھیلتے تھے۔ میری اسکول کی تعلیم صرف دو سال کی ہوئی کیونکہ قرآن حفظ کرنے میں اچھا خاصہ وقت صرف ہوا تھا اور اس کی بھرپائی کے لئے اسکول کے کئی کلاس کے امتحانات پرائیوٹ طور پر دئے جب کہ دو کلاس میں Double Promotion ملا۔ جب میں نرپت نگر ہائی اسکول (ضلع مدھوبنی) سے 1968ء میں فرسٹ ڈیویژن میں میٹرک پاس کر کے دربھنگہ میں ملت کالج میں داخلہ لیا تو باضابطہ شاکر صاحب کے زیر نگرانی (Guardianship) آ گیا کیوں کہ اس وقت تک وہ پٹنہ یونیورسٹی سے اردو و فارسی میں ایم. اے.، فارسی میں پی ایچ. ڈی. اور وکالت کی ڈگری حاصل کر کے لہریا سرائے کچہری میں وکالت شروع کر چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ اپنی گوناگوں صلاحیت اور فعال سماجی و سیاسی سوجھ بوجھ کی بنا پر ایک کامیاب وکیل بنتے انھوں نے بہت جلد اس پیشہ کو چھوڑ دیا اور سی ایم کالج دربھنگہ میں اردو و فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے بحال ہو گئے۔ بعد ازاں ریڈر پھر پروفیسر اور کالج و یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر بھی رہے۔ تقریباً تین سال کے لئے وہ متھلا یونیورسٹی کے Coordinator of College Development Counsellor (CCDC) بھی رہے اور اپنی تمام ذمہ داریاں

بخوبی انجام دیں۔ اپنی لمبی تدریسی خدمات کے درمیان ایک نہایت مشفق، مدبر، فہیم اور ہر دل عزیز استاد رہے۔ اس درمیان وہ کئی ادارے اور مجلسوں کے فعال ممبر بھی رہے اور دربھنگہ شہر کے معتبر سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی اپنی جگہ بنائی۔ متھلا یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ سے بھی ان کی خدمات نمایاں رہی ہیں۔ وہ کانگریس پارٹی کے ممبر اپنے تعلیمی زمانے سے ہی تھے اور مرحوم عبدالقیوم انصاری اور پھر للت نارائن مشرا سے ان کے تعلقات بہت نزدیکی رہے، نیز ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے بھی انہوں نے متھلا یونیورسٹی قائم ہونے اور بعد میں CCDC کے عہدہ پر گراں قدر خدمات انجام دیں۔ جیسا کہ زمانے کا عام رواج ہے کہ کسی بھی فعال انسان کو غیروں کے حسد وجلن کا شکار ہونا پڑتا ہے، لہٰذا شاکر صاحب کو بھی کئی ایسے معاملوں میں الجھا دیا گیا جسکا انہیں علم بھی نہ تھا۔ بحر حال وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ کے مصداق تمام معاملوں سے بحسن وخوبی بری ہوئے۔ دربھنگہ میں جو ہمارا مکان ہے اسکی زمین کو غاصبوں سے دوبارہ حاصل کرنے میں ان کے تدبر اور جفاکشی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس مکان میں میرے حصے کا فلیٹ بھی انہوں نے اپنی نگرانی میں بنوا دیا جس کے لئے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا شاکر صاحب کے زیر نگرانی اپنے کالج کی زندگی کے چار برسوں کا۔ خدا شاکر صاحب جیسا گارجین ہر طالب علم کو نصیب کرے۔ ہر چند کہ وہ میرے برادر بزرگ ہیں اور میری گوش مالی کے ہر طرح سے مستحق، مگر مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی بھی مجھ سے سخت لہجہ میں کوئی بات کی ہو۔ ہوسکتا ہے میں نے بھی اپنی طرف سے ایسا کوئی موقع نہیں دیا ہو مگر میری سعادت مندی سے زیادہ اس بات کے لئے شاکر صاحب کی فراخ دلی ذمہ دار ہے۔ تعلیمی امور کے علاوہ بھی ہر طرح کی تربیت کرتے۔ انتہا تو یہ کہ دربھنگہ میں جب کوئی اچھی فلم آتی تو جیب خرچ کے علاوہ الگ سے کچھ پیسے دیتے اور کہتے کہ جاؤ فلاں فلم اچھی ہے دیکھ لو۔ حالانکہ ان دنوں وکالت سے انکی آمدنی قلیل ہی ہوتی تھی۔ نگران کی لاجواب کشادہ دلی بے مثال ہے۔ ایسے ہی فراخ دل نگرانی کا شاید یہ نتیجہ تھا کہ میں کبھی بھی کسی معاملے میں بے راہ رو نہ ہوا اور اچھے برے کی تمیز شروع سے ہی ہوگئی۔ میری دربھنگہ کی تعلیمی زندگی کے درمیان اندرا گاندھی، خان عبدالغفار خان و دیگر کئی مشہور سیاسی و ادبی شخصیت سے ملاقات بھی شاکر صاحب کے اثر ورسوخ کی وجہ سے رہی۔ جب میں نے زولوجی (Zoology) میں آنرس کے لئے سیتامڑھی کے گوئنکا کالج میں داخلہ لے لیا تو محض ایک سال کے اندر انہوں نے میرا داخلہ دربھنگہ کے سی ایم سائنس کالج میں کرادیا جہاں میں نے اپنے بیچ (Batch) میں ٹاپ کیا۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور میں تعلیم کے دوران بھی وہ ہمیشہ میری ہمت افزائی کرتے رہے اور ایم۔ اس۔ سی کے بعد ڈاکٹر سالم علی کے زیر نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کے داخلہ کی تگ ودو میں بھی اُن کی ہی امداد اور دور اندیشی کار فرما رہی۔ کیونکہ سالم علی صاحب کے توسل میں جانے کے چند مہینے بعد ہی مجھے سیوان کے ذکیہ آفاق کالج میں لکچرر کی حیثیت سے کام کرنے کی پیش کش ملی تھی۔ لیکن شاکر بھیا نے خط لکھا کہ ہر بڑے کام کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے۔ لہٰذا تم سالم علی صاحب کے زیر نگرانی کام کرتے رہو اور فی الوقت تم گھر کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور اس طرح نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک میں مجھے اپنی صلاحیت اُجاگر کرنے کا موقع ملا۔

شاکر صاحب نے میری رہنمائی صرف تعلیمی معاملات تک نہیں کی بلکہ میری شریک حیات کے انتخاب میں بھی ان کا ہی دخل رہا اور اپنے ادبی دوست محمد سالم صاحب کی بڑی صاحبزادی نسرین اختر سے میری شادی میں پیش پیش رہے۔ متھلا یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے 1982ء میں میرا تقرر اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں معلمی سلسلہ بھی انہیں کے گراں قدر مشوروں پر مبنی ہے۔ اردو ادب میں میری بساط اور جسارت طفلانہ ہے مگر جو بھی ہے اُس میں شاکر صاحب کی تربیت کا جلا ہے۔ یہی نہیں انہوں نے میری تعلیمی، ادبی و معاشی سرگرمیوں کے بارے میں تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے خاص شمارہ اگست 2013ء میں ایک مضمون بھی رقم کیا جسکے لئے میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔

میری تمام تر صلاحیتوں اور کامیابیوں میں اپنے والدین کی دعاؤں اور دیگر بھائی بہنوں کی نیک خواہشات کے علاوہ شاکر بھیا کی رہنمائی بے حد اہم رہی ہے۔ اللہ اس کا صلہ انہیں دنیاوی و اخروی زندگی میں عطا کرے اور صحت کے ساتھ ان کا سایہ تا دیر قائم و دائم رکھے۔ آمین، ثم آمین۔

میں نے اپنی انگریزی میں ساتویں کتاب An Autobiography of my Dreems مطبع 2015ء میں کئی ایسے خوابوں کا ذکر کیا ہے جو ہم بھائیوں اور اہل خانہ کے باہمی اتفاق اور محبت کو منعکس کرتا ہے۔ یہ میری گذشتہ ۱۱ر کتابوں سے بالکل منفرد کتاب ہے جو عام قاری کے علاوہ کسی بھی نفسیات اور Neorobiology کے اسکالر کے لئے بہترین حوالہ (Reference) فراہم کرے گی۔

اپنوں کے علاوہ غیروں کی مدد بھی شاکر صاحب کی عادت ہے۔ اپنی تمام تر مشغولیات کے باوجود وہ لوگوں کی مدد طرح طرح سے کرتے رہتے ہیں۔ غریب سے غریب کی عیادت اور امداد ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ کئی انجمنوں کی وہ رہبری بھی کرتے ہیں۔ اپنی جوانی کے دنوں میں وہ نہایت جوشیلے تھے اور بستی کے اطراف میں اگر کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا تو بستی کے جیالے جوانوں کی قیادت کرتے اور عین جائے واردات پر جا کر کمان سنبھالتے۔ شاید یہ جذبہ بھی خاندانی ورثہ میں ملا ہے کیوں کہ والدؒ نے بھی اپنی جوانی میں ایسے کئی معرکے کی قیادت کی تھی۔ اپنی بستی کے علاوہ دیگر بستی کے آپس کے اختلافات یا محرم کی لڑائی وغیرہ کی صلح و صفائی میں پیش پیش رہنا بھی ان کا مشغلہ ہے۔ ان کے دانشکدہ پر اکثر ادبی نشست بھی ہوتی رہتی ہے اور وہ مسلم نوجوان نسل کی ادبی و سماجی رہنمائی بھی بڑے انہماک سے کرتے ہیں۔ خدمت خلق کا جذبہ بھی شاکر صاحب میں بدرجہ اتم ہے، والدہ مرحومہ کے آخری ایام میں انہوں نے جس محنت و شفقت سے ان کی خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

شاکر صاحب کی منتظمانہ صلاحیت کے بھی ہم قرض دار ہیں کیوں کہ جب سے شاہد بھائی کی اہلیہ محترمہ عترت فاطمہ کا انتقال ہو گیا اور شاہد بھائی تنہائی کی وجہ سے اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت ملک سے باہر گذارنے لگے تو آبائی جائداد اور مکان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی شاکر صاحب کے کندھوں پر آپڑی ہے۔ اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ وہ اس ذمہ داری کو بھی بخوبی نبھا رہے ہیں۔ جزاک اللہ خیر۔ تعلیمی و معاشی سلسلے سے ان کی اولادیں، لڑکا افضال شاکر اور بیٹی زینب فاطمہ بالترتیب برطانیہ و امریکہ میں مقیم ہیں۔ جس وجہ کر شاکر بھیا کی زندگی فی الحال اپنے بچوں کی براہ راست رفاقت سے محروم ہے۔ مگر گاہے گاہے وہ لوگ دربھنگہ آتے رہتے ہیں اور شاکر بھیا بھی

دوبار امریکہ و برطانیہ کا سفر کر کے ان سے مل آئے ہیں۔ اللہ کرے کوئی ایسی صورت نکلے کہ ان کے اعزا ان کے شامل رہیں۔ فی الحال میری بھابھی صنوبر صاحبہ کی ذمہ داری میں شاکر بھیا اپنے نام کے موافق اللہ کے شکر، حمد وثنا و نماز و روزہ کی مستعدی کے ساتھ ایک خوش گوار زندگی گذار رہے ہیں۔

والد صاحب کی طرح شاکر صاحب بھی ایک فی البدیہہ شاعر ہیں۔ اور شادیات و دیگر مجالس کے اعتبار سے بہترین نظمیں لکھتے ہیں۔ ایک بار میں اور شاکر صاحب نہایت چلچلاتی دھوپ میں شکری ریلوے اسٹیشن سے اپنی آبائی بستی نظر احمد آباد پیدل جا رہے تھے۔ حالانکہ وہ اپنی عادت کے مطابق چھاتا لئے ہوئے تھے، مگر دوپہر کا وقت تھا اور گرمی شدید تھی۔ غالباً یہ 1976ء کی بات ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد دور سے بستی کی مسجد کا مینار نظر آنے لگا۔ شاکر بھیا کی شاعرانہ طبیعت عود کر آئی۔ انہوں نے ایک مصرع ''دور سے گاؤں نظر آتا ہے'' کہا اور مجھ سے بولے کہ ثانی مصرع کہو۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر کہا ''کڑی دھوپ میں چھاؤں نظر آتا ہے''۔ وہ بہت خوش ہوئے اور بولے صرف لفظ ''کڑی'' نکال دو تو ایک بامعنی اور باوزن شعر ہو جائے گا:

دور سے گاؤں نظر آتا ہے
دھوپ میں چھاؤں نظر آتا ہے

پروفیسر شاکر خلیق صاحب کی علمی و ادبی سرگرمیاں تقریباً پانچ دہائیوں پر محیط ہیں۔ وہ کئی کتابوں اور سینکڑوں مضامین و غزل کے مقبول (Popular) ادیب و شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی نگرانی میں کئی پی ایچ ڈی بھی کرائی ہیں۔ ان کی نگارشات کئی میگزین کی زینت بنتی رہی ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات پر کچھ لکھنا میرے لئے سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ ان کے ادبی سفر پر ایک ریسرچ اسکالر Ph.D. کے لیے تحقیقی کام کر رہے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ اپنی تحقیق عرق ریزی سے کریں گے۔ لہٰذا اس مضمون کو میں ان کے چند خوبصورت اشعار کے ساتھ ختم کرتا ہوں جو مجھے بے حد پسند ہیں اس امید کے ساتھ کہ قارئین حضرات بھی محظوظ ہوں گے:

گھر کے بٹوارے میں پنچوں کی عجب سازش ہوئی
منہدم گھر کو کیا ملبے کی پیمائش ہوئی

امت کی۔ نئی نسل سے گر مانگنا چاہو
اسلاف کی دستار و قبا مانگتے رہنا

پڑھیں گی بعد کی نسلیں سند کے طور پر ہم کو
رواداری کی رسمِ خاندانی چھوڑ جائیں گے

نمایاں ہے کئی نسلوں سے لوگو
خدا کے فضل سے یہ خانوادہ

تھا جن پہ ناز ملت کو انہیں اب ڈھونڈتے ہیں ہم
جو کرتے تھے فقیری میں بھی سلطانی میرے مولا

ٹپک کے آنکھ سے بس رایگاں ہوئے آنسو
صدف میں موتیوں کی طرح پل کے بھی دیکھ

ٹوٹتی اور بکھرتی ہوئی قدروں کو تو دیکھ
کس طرح گاؤں پہ شہروں کا عتاب آتا ہے

ایمان کی دولت جو وراثت میں ملی ہے
شاکر کسی دولت کی تمنا نہیں کرتے

....

ڈین فیکلٹی آف لائف سائنسز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ موبائل: 09808179050

صفی اختر

عالمانہ بصیرت کے نئے امیر: مولانا سیّد محمد ولی رحمانی

حضرت مولانا سیّد محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم کی تاریخ ولادت 5 جون 1943ء ہے۔ آپ امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ کے خلف الرشید، جامعہ رحمانی مونگیر کے سرپرست، رحمانی فاؤنڈیشن' مونگیر کے چیئرمین اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے کارگزار جنرل سکریٹری ہیں۔ ابتدائی تعلیم خانقاہ رحمانی کے احاطہ سے ملحق پرائمری اسکول سے ہوئی جب کہ اپنے والد ماجد حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی علیہ الرحمہ کی خصوصی تربیت میں دار العلوم ندوۃ العلماء اور جامعہ اسلامیہ دار العلوم دیو بند' ضلع سہارنپور (یوپی) سے بالترتیب عالمیت وفضیلت کی اسناد حاصل کیں۔ دینی تعلیم کے حصول کے بعد حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے بہار کے تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی سے ''تاریخ'' میں ایم اے کیا اور ٹاپ رہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور سے ہی مولانا مدظلہ نے صحافت سے تعلق رکھا اور مختلف اخبارات وجرائد میں آپ کے مضامین بار پاتے رہے۔ اپنی تحریکی، دعوتی اور علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ایک وقت وہ بھی آیا کہ آپ کو 1974ء میں بہار لجسلیٹو کونسل میں ایم ایل سی کی حیثیت سے منتخب کیا گیا، سیاست کے نشیب وفراز سے جوجھتے ہوئے پھر دوبارہ ایم ایل سی بنائے گئے اور بہار میں وزیر اعلیٰ چندر شیکھر سنگھ کے دور حکومت میں کانگریس کے چیف وہپ کی حیثیت سے بہار ودھان پریشد میں ڈپٹی چیئرمین شپ حصہ میں آئی لیکن آنجہانی راجیو گاندھی کی وزارت عظمیٰ میں ان کے حریفوں کی شکایات پر اس عہدہ سے انھیں ہٹا دیا گیا۔ تاہم مولانا محترم اپنے علم، غور وفکر اور تدبر وتفکر کی برکت سے آسمان پر کمندیں ڈالتے رہے، دین سے وابستگی فطری طور پر رہی تھی، اسلئے مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۹۱ء بمقام جامعہ نگر نئی دہلی میں آپ کو بورڈ کا سکریٹری برائے اصلاح معاشرہ منتخب کیا گیا' چنانچہ اس کے بعد سے ملک گیر سطح پر معاشرتی اصلاح کے لیے اپنا خونِ جگر جلاتے رہے، یہ ایک ایسا معرکہ ہے جنھیں سر کرتے کرتے خون پانی بن جائے، حوصلے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائیں اور عزم وہمت کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔

آپ نے بہار کے سیاسی حالات کے تناظر میں صحافیانہ ضرورت کے تحت ایک اردو روزنامہ ''ایثار'' کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا جو کبھی بہار کی صحافت میں سب سے نمایاں اخبار کی صورت میں چل پڑا تھا، لیکن وقت کی ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ بعض حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنا رُخ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے، یہ اخبار نکال کر گویا مولانا محترم نے آگ میں ہاتھ ڈال دیا تھا، لہٰذا وقت نے ساتھ نہ دیا، اخبار بند کر دینا پڑا۔ بہر حال امارت شرعیہ کی ''امارت'' کی حیثیت کو کسی راج سنگھاسن کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا، یہاں تو ایثار، قربانی اور پتہ ماری کرنا ہوتی ہے، آج مسلمانوں کو ایک بہترین قیادت کی ضرورت ہے جسے انہیں بحیثیت امیر شریعت فراہم کرنا ہوگا، حضرت محترم کا انتخاب ایک بہترین فیصلہ ہے۔ حالات متقاضی ہیں کہ امارت شرعیہ کے ماضی کی بازیابی ہو اور پورے توسع کے ساتھ عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل کیا جائے:

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف!

مولانا محترم کی زندگی متصوفانہ بھی رہی کیونکہ حضرت امیر شریعت رابعؒ کے وصال کے معاً بعد آپ خانقاہ رحمانی مونگیر کے صاحب سجادہ بنادئے گئے تھے، واقعہ یہ ہے کہ حق کے مشاہدے سے انسان خود کو بھی نہیں دیکھ پاتا۔ پھر تصوف تو سراسر ادب ہے، ہر وقت، ہر مقام اور ہر حال کے لیے متعین آداب واحکام ہیں، اگر رسم کا نام تصوف ہوتا تو ریاضت و

مجاہدے سے حاصل ہو جاتا۔ ''انصاف'' کو اپنے اوپر استعمال نہ کیا جائے تو ہرگز تصوف حاصل نہ ہوگا۔ حضرت موسیٰ کے وجود میں عدم نہیں تھا، لہٰذا دعا کی ''اے میرے رب مجھے شرح صدر عطا فرما اور میرا معاملہ مجھ پر آسان کردے۔''

کسی بھی انسان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بے شمار عناصر کارفرما ہوتے ہیں اور ان ہی عناصر کے مکمل اور متوازن امتزاج سے ایک کامیاب شخصیت کا ظہور عمل میں آتا ہے۔ مولانا محترم کے لہجے میں اعتماد اور جسارت بھی ہے۔ حلئے، بشرے، لباس اور وضع قطع سے آپ باوقار نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ایک ازلی حقیقت ہے کہ جو جتنا خون جلائے گا اس کے شبستانِ حیات میں اتنی ہی روشنی ہوگی۔ ان کی خدمات کی جتنی بھی جہات ہیں سردست اس چھوٹے سے مضمون میں ممکن نہیں کہ احاطہ کیا جائے۔ حضرت مولانا سے راقم السطور کی کسی قدر بے تکلفی بھی رہی ہے، تاہم اس بے تکلفی میں بھی ادب واحترام کی فضا ہمیشہ ملحوظ نظر رہی۔ بغیر رکے اور بغیر تھکے مسلسل آگے بڑھتے رہنا آپ کا وطیرہ ہے۔ طبیعت میں بشاشت اور ظرافت بھی ہے جس کا گفتگو کے دوران مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ آپ کے علمی وادبی سرمایہ کی ہمارے پاس کوئی فہرست بھی نہیں اور نہ ہی کسی نمائندہ تخلیقات کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ کے قلم سے جو کچھ ظہور پذیر ہوتا رہا بصد شوق اسے ضرور پڑھا۔ آپ کا ذہن تخلیقی واختراعی ہے۔ الفاظ کے استعمال پر بھی قدرت رکھتے ہیں، حسن تعبیر کی ندرت وبرجستگی بھی اپنی جگہ۔ کبھی غالب نے کسی رہزن تمکین وہوش کے لیے کہا تھا:

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات   عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

مولانا ولی رحمانی مدظلہ خوبصورت طنز ومزاح کے ماہر بھی ہیں۔ آپ زندہ دلی اور پرلطف انداز بیان کے ذریعہ اپنی باتیں کہہ جانے کے عادی ہیں۔ اگر آپ کی زندگی متصوفانہ نہ ہوتی تو آپ کے علم وفضل اور زبان وادب سے توقع تھی کہ آپ کا شمار مشاہیر ادب میں ہوتا اور آپ کے رشحات قلم سے اردو کی نئی بستیاں بھی استفادہ کرتیں۔ آپ بڑے لہجہ تراش فکر کے حامل ہیں، اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ فرماتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے باطن کی ساری کیفیت صفحۂ قرطاس پر بکھیر گئے، بطور تمثیل ایک تحریر شدہ مکتوب کی درج ذیل عبارتیں ملاحظہ ہوں، جو امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدین کی زندگی پر مبنی ایک وثیقہ ''باتیں میر کارواں کی'' کے تعلق سے ہے:

> ''ایک وقت تھا کہ شخصیت کو اپنی داستان زندگی لکھوانے کا شوق ہوتا تو مرنا پڑتا تھا، تب جا کے کہیں کوئی اہل قلم سوانحی خاکہ میں رنگ بھرتا تھا، مگر اب یہ روایت چل پڑی ہے اور عزیزوں کو خیال آجاتا ہے کہ زندگی ہی میں اپنے بڑوں کی زندگی کو محفوظ کردیا جائے، یہ اچھی جہت ہے اس طرح بڑوں کا حق ادا کرنے کرانے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے اور بڑوں کو بھی یہ صدمہ نہیں ستاتا کہ مرنے کے بعد پتہ نہیں کوئی یاد کریگا بھی یا نہیں، پھر عزیزوں کی یہ جرأت تحریر' اور جسارت اقدام' مروہ نوازی کی روایت سے کامیاب اور خوشگوار بغاوت ہے۔'' (مکتوب مجریہ 18 /جولائی 2013، ''باتیں میر کارواں کی'' صفحہ نمبر 91)

مجموعی طور پر مندرجہ بالا نکات سے جو تأثر ابھرتا ہے، وہ ہر باذوق قاری کے لیے پیش کردیا گیا ہے، آپ کی صاف گوئی (Outspokenness) اور عالمانہ بصیرتوں کو سلام کہ انداز بیان کی ندرت نے اپنے باطن کی کیفیات کو کس طرح صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے، قاری کا فیصلہ ہوگا کہ وہ اسے کس طرح سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ خاکسار اپ فہم کی سترس کو بھی سمجھتا ہے، لہٰذا چند سطریں مولانا محترم کی شخصیت کے حوالے سے سپرد قلم کردی ہیں۔

Mob. 09312365502 ; Email:-safi_akhtar@yahoo.com

ڈاکٹر ایم. صلاح الدین

ثناء الہدیٰ قاسمی کی تنقیدی بصیرت

''تنقید صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کرسکتا ہے جس کا تجزیہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دور بین ہو، جو صرف ذوق، صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دنیائے ادبیات کا شناور ہو، جس نے ایک مدت کے مطالعے اور غور وفکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہو اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور دوسروں کو دلنشیں کرسکتا ہو۔''

مولوی عبدالحق (بحوالہ ''اردو تنقید پر ایک نظر'' ص:۱۳۳)

اس میزان پر مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کا ''نقد معتبر'' تلتا نظر آتا ہے حالانکہ موصوف حسب زمانہ، نرے تنقید نگار نہیں ہیں بلکہ ''نقد معتبر'' میں مشمولہ دو تبصرہ کتب، مظفر پور۔ علمی، ادبی وثقافتی مرکز''، ''من شاہ جہانم'' اور عبداللطیف اوج تلمیذ داغ دہلوی کے دیوان کے تعارفی مضمون کے علاوہ تمام مقالات مختلف تنظیموں کے سیمناروں کے تقاضے کے تحت جنبش قلم کے ثمرات ہیں۔ ان میں اسلام کا ادبی رجحان، آزاد غزل۔ ایک تنقیدی جائزہ اور اقبال کی سہ بتی کی کہانی۔ حقائق کی زبانی'' عہد طالب علمی کے نمونے ہیں جن میں ان کے نقد ونظر کی اٹھان دیدنی ہے۔

دنیا میں صدیوں سے ادب کے مختلف نظریات اور ازم کے پنپنے اور مٹنے کا سلسلہ جاری ہے مگر وہ ادبی نظریہ جو لایحب اللہ الجہر بالسوء من القول (النساء آیت:۱۴۸) یعنی اللہ بری باتوں کا اعلانیہ بیان کرنا پسند نہیں کرتا اور حدیث ''مومن طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا اور فحش گو نہیں ہوتا (جامع صغیر جلد ۳ ص:۳۸۹) کی اساس پر مبنی چودہ صدیوں سے یکساں آب وتاب کے ساتھ حرز جاں بنا ہوا ہے وہ ''اسلامی ادب'' کی حیثیت سے بالعموم اہل نقد ونظر کے حلق میں اترنے سے قاصر ہے۔ طرہ یہ کہ معماران اردو ادب کے فکر ونظر کا منبع بھی مغرب سے کھوج نکالا گیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی جو اردو کے منفرد صاحب طرز نثار تھے، اردو (نثر) کی ارتقائی تاریخ میں وہ مقام نہ پاسکے جس کے حقدار ہیں کیونکہ ان کا تعلق اسلامی نظریۂ ادب سے تھا۔ لہٰذا اول الذکر مقالہ میں مفتی صاحب نے ادبیات، عربی، فارسی اور اردو کے حوالے سے اسلامی ادب کے رجحان ورویے کے جواز کی تفریح کی ہے۔

آزاد غزل پر کی گئی گفتگو کی اٹھان خوب ہے مگر نقد تراشیدہ کا تاثر چھوڑ ہی جاتا ہے۔ اس کی تلافی شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ پر علامہ اقبالؒ کی کہی پھبتی یعنی مشہور فارسی سہ بتی:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست

کی حقیقت واشگاف کرکے کردی ہے۔ یہ سہ بتی دونوں بزرگوں کی حیات میں ہی دانشوروں اور قلمکاروں کی معرکہ آرائیوں کا موجب بنا۔ افہام وتفہیم کے بعد علامہؒ نے اپنے خیال سے رجوع بھی کرلیا، باوجود اس کے بقول مفتی صاحب:

''جب کسی کلام کا سہارا لے کر تحریکی انداز میں امت کا رشتہ علماء امت سے کاٹنے کی منظم کوشش کی جا رہی ہو تو حقائق کی سنگلاخ وادیوں کو عبور کر کے یہ بتانا فرض ہو جاتا ہے کہ غلط فہمی کہاں کہاں ہوئی اور کیوں ہوئی ہے۔ یہ مقالہ اسی فرض کی ادائیگی کے احساس کے لکھا گیا ہے۔'' (حرف چند مجموعہ نقد معتبر)

اس احساس کے ساتھ کی گئی نقد پر حاوی نظریے کا توازن موصوف نے اپنے ریشمی لہجے سے قائم رکھا ہے۔ یہ ان کے عنفوان شعور کا رنگ ہے۔

اب دیکھیں کہ علامہ اقبال ہی کی ظریفانہ شاعری کا تجزیہ اس طور کیا ہے کہ علامہ ایک الگ رنگ میں سامنے آتے ہیں، جس کی طرف اقبالیات پر کام کرنے والوں نے کم توجہ دی ہے۔ اسی طرح مقالہ ''کلیم الدین احمد کا تنقیدی شعور'' میں نرے ناقدین کی ڈگر سے ہٹ کر بات کی ہے اور نئے گوشے اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ ایسی ہی کاوشیں کلیم عاجز کی شاعری، قوس صدیقی کے مجموعہ کلام 'لفظاب' اور نقی احمد ارشاد کی کہانیوں کے تجزیے میں بھی ملتی ہیں۔ قوس صدیقی نے شعری روش و روایت سے ہٹ کر بہت سے غیر مانوس خود وضعی الفاظ وتراکیب سے اردو شاعری کو نوازا ہے اور ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے مگر یہ اہل نقد و نظر کی نظروں میں کھپ نہ سکا۔ مفتی صاحب نے قوس کے شعری تجربے کا سیر حاصل تجزیہ کیا ہے۔ نئے رنگ و آہنگ کی شاعری کی قدر آنکی ہے اور ''سنگ درک'' کی مثل نئی وضعی لفظیات وتراکیب کو قوس کے تخیل، فکر اور تخلیقی اپج کی تابعدار ٹھہراتے ہوئے ''لفظاب'' کی غزلوں کو زندہ رہنے والا فن قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں شعری لفظیات، ساختیات، پس ساختیات وغیرہ پر جس طرح گفتگو کی ہے وہ ان کے ستھرے اور ادبی مذاق اور مطالعے کی وسعت و گیرائی پر دال ہے۔

مقالات ''بہار کے چند نثر نگار علما''، ''عرفان محبت کے پیامبر: مولانا محمد احمد پھولپوری''، ''اسلامی ادب کے علمبردار: مولانا سید احمد عروج قادری''، ''عزیز بگھروی: ایک شخص اور شاعر''، ''اسلامی ادب کا نقیب: نواز دیوبندی'' اور ''عبدالرب جاوید کی شاعری'' میں مولانا موصوف کا فکر و قلم جس طرح چلا ہے ان میں شخصیت اور ادبی کمالات کو اجالنے اور فکر و فن کے کھرے کھوٹے پر اپنی دوٹوک رائے کا اظہار کا دلکش سلیقہ ملتا ہے۔ اس سلیقے کی ایک جھلک دیکھیں۔ مولانا محمد احمد پھولپوری کی شاعری پر لکھا ہے:

> ''___ مولانا کے یہاں شاعری کچھ ذریعۂ عزت نہیں تھی۔ انہوں نے اس سے بڑا کام لیا ہے۔ ان کے سارے کلام کے ہر شعر میں ایمانی نور کی شعاعیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان میں عرفان ذات بھی ہے اور عرفان نفس بھی۔ یہ عشق و محبت مولانا کی زندگی کا سرمایۂ حیات ہے، غالب کی طرح عشق نے مولانا کو نکما نہیں بنایا ہے بلکہ اس عشق کی بدولت نام سے کام کے ہو گئے ہیں۔''

تنقیدی عمل کے دوران تاویل، تشریح میں کہیں نظر چوکتی ہے، کہیں تخیل دھوکا کھاتا ہے تو کہیں نقطۂ نظر موجب اختلاف بن جاتا ہے۔ اس سے کوئی بھی تنقیدی نگارش کا دامن دودھوں دھلا نہیں ہوتا۔ سو ''نقد معتبر'' میں بھی اس کی گنجائش نکلتی ہے مگر مجموعی طور پر تمام شمولات میں تحقیق، تنقید اور نظریہ کی ہم آہنگی، کہیں عملی تنقید کے گہرے تو کہیں ہلکے رنگ اور لہجے کی شیرینیت و متانت نے اپنی معتبریت قائم رکھی ہے۔ ممتاز ناقد پروفیسر سید احتشام حسین نے لکھا ہے کہ:

• ''جس طرح بغیر ایک مخصوص فلسفۂ حیات رکھے ہوئے اچھا ادیب نہیں بن سکتا، اسی طرح ایک اچھا حکیمانہ دماغ رکھے بغیر کوئی شخص اچھا نقاد نہیں بن سکتا۔'' (تنقیدی نظریات، جلد اول، ص:۲۹)

سو مفتی صاحب کا ''مخصوص فلسفہ حیات'' ظاہر و باہر ہے۔ بنابریں ادبی شہ پاروں کو آنکنے کا پیمانہ آفاقی و اسلامی نظریۂ ادب ٹھہرتا ہے۔ جس نے انہیں ادب کا ذوق صحیح، ودیعت کیا۔ اس ذوق صحیح نے عربی، فارسی اور اردو ادبیات کی شناوری کی تو حکیمانہ فکر پیدا ہوئی، نظر دوربین ہوئی اور دوٹوک رائے کے اظہار کی قدرت کہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' کا حامل اسلوب بیان کے ساتھ حاصل ہوئی۔ لہٰذا بقول وسیم بریلوی:

کون سی بات کہاں، کیسے کہی جاتی ہے
یہ سلیقہ ہو تو ہر بات سنی جاتی ہے

یہ سلیقہ ان کی تمام نگارشات میں ہی نہیں بلکہ ہر مجلس اور اسٹیج پر بھی دلنشیں ہوا کرتا ہے۔ اس لئے ''نقد معتبر'' اپنے وزن کے اعتبار سے اردو کے تنقیدی سرمایہ میں یقیناً ایک اضافہ ہے۔

....

موضع و پوسٹ: رام نگر دھونسی، وایا نہرا، ضلع: دربھنگہ (بہار)

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

سلطان شمسی کی شاعری

شاعری جذبات درون کے حسین پیکر اظہار یہ کا نام ہے۔ جذبات واحساسات فن کا روپ دھارن کر لے اور اثر انداز کرنے کی صلاحیت سے مزین ہو جائے تو تخلیق جلا پانے کی صف میں آجاتا ہے۔ شاعری کے سلسلے میں ناقدین کی آراء سے یہ نکتہ چھن کر باہر آتا ہے کہ اس میں صرف جذبات کافی نہیں بلکہ جذبے کے بیان کا انداز بھی معنی رکھتا ہے۔ اسی لئے دنیا کی بڑی شاعری کا محاکمہ فکر وفن کے حوالے سے کیا جاتا رہا ہے۔ اردو شاعر بالخصوص غزلیہ شاعری کے لئے یہ باتیں بیحد ضروری ہیں کہ افکار جب اشعار کے پیکر میں ڈھل جائے تو فکر وفن باہم شیر وشکر ہو جانا چاہئے۔ اردو شعراء نے مروجہ اصناف میں اپنے جذبات و کیفیات بیان کرتے ہوئے شائقین کا دل جیتا ہے۔ غزل میں خاص طور پر اہل دل و دنیا کی کیفیت قاری کو متوجہ کرتی رہتی ہے۔ غزل گو شعراء اپنے خیالات و جذبات سے قارئین کا دل جیتتے رہے ہیں۔ یہ بھی اس زبان کی خوبی ہے کہ ہر علاقے میں شعروادب کو مقبول بنانے والے جیالے موجود ہیں، ان شعراء میں سے ایک سلطان شمسی ہیں جن کا تعلق بردا ہا، وایا کھول ضلع مدھوبنی سے ہے۔

ان کی غزلوں میں جذبہ دل کی کیفیت کا رنگ نکھرا نکھرا ہے۔ اس میں راہ وفا کی گفتگو ہے، چشم نار کی توصیف ہے، زلف عنبریں کی پاکیزگی کا ذکر ہے۔ مدتوں بعد محبوب سے ملنے کی دھڑکن ہے اور ان سب میں شاعر کا معصوم دل اس سفر میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا چاہتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

ہم راہ وفا میں جو نشاں چھوڑ کے آئے
صدیوں وہ ہمیں شام وسحر یاد کریں گے

ان کی چشم ناز میں کاجل کی وہ کالی لکیر
پیڑ کے سائے ہوں جیسے جھیل پر چھائے ہوئے

باد صبا سے کہہ دو آئے وہ ہلکے ہلکے
اس زلف عنبریں سے آنچل کہیں نہ ڈھلکے

یہ حسن کی ہے نگری چلئے ذرا سنبھل کے
تھامے کوئی زلیخا دامن نہ خود مچل کے

مدت کے بعد کوئی آیا ہے مجھ سے ملنے
اے دل ذرا سنبھل کے اے دل ذرا سنبھل کے

سلطان شمسی کے یہاں صرف حسن عشق کی باتیں نہیں ہیں بلکہ حالات کی تصویر کشی بھی ہے۔ بیچ راہوں کی مشکلیں وہ جانتے ہیں، حالات کی ستم ظریفی سے وہ واقف ہیں، یاس انگیزی کا ان کو تجربہ ہے۔ زخم دل اور زخم تمنا کے علاج کی مشکلوں اور مصائب سے آشنا ہیں۔ ان کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں زندگی کی سچائی اور مشکلات کا بیان ہے۔ غزل کا ہر شعر چونکہ اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے اس لئے خیال کی ترسیل وہاں مکمل ہونا فطری ہے۔ مگر یہاں ردیف وقافیہ کی تکرار سے جو بات بنتی ہے اس کا جواب مشکل ہے:

سچائی سے آنکھ ملانا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے
اپنی انا کو زندہ رکھنا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے

زلف بتاں سے بچ کے نکلنا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے
راہ وفا میں قرباں ہونا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے

کیسی ہے یہ صحرا نوردی اور شب تنہائی ہے
ورطۂ بحر وقت سے بچنا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے

چھائی ہوئی ہے یاس انگیزی دیکھو تو ماحول میں کیسی — خون جگر میں گرمی آنا، برف پگھلنا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے
ہرا ہے اب تک زخم تمنا نہیں ہے اس کا کوئی مرہم — زخم تمنا کا بھر جانا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے
خزاں نے لوٹی بہار گلشن نہیں ہے اس تو رعنائی شمسی — موسم گل کا ایسے میں جانا کھیل نہ سمجھو کھیل نہیں ہے

سلطان شمسی کی غزلوں پر روایتی رنگ غالب ہے۔ وہ کلاسیکی اردو شاعری سے حددرجہ متاثر ہیں۔ انداز بیان بھی قدما کی طرح ہے البتہ عصری معاملات اور معاصر مسائل کی عکاسی سے گریز نہیں کرتے ہیں۔ مسائل عصر کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی انداز وہی ہوتا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتا ہوں:

پھر شیخ حرم بیٹھے ہیں منبر پہ بصد شان — کیا جانئے کیا آج وہ ارشاد کریں گے
ہر لمحہ دستکیں درد دل پر لہو کی ہیں — لگتا ہے تیرے آنے کی ساعت قریب ہے
پلا دے ساقیا جیسی بھی مئے ہو آج پی لوں گا — ہوا ہے مدتوں کے بعد ظالم دل جواں اپنا

سلطان شمسی صرف شاعری کے ذریعہ ہی زبان وادب کی خدمات نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کا انسلاک کئی مقامی ادبی انجمنوں سے رہا ہے۔ دربھنگہ کی ادبی فضا کبھی ماضی میں ان جیسے جیالوں کی سرگرمی سے خوشگوار تھی۔ انہوں نے کئی یادگار مشاعرے کرائے۔ ادبی نشستوں کے اہتمام میں ذاتی دلچسپی لی۔ پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کی مصروفیت کے باوجود ادبی انجمنوں میں بے حد فعال رہے۔ ان کے شعر پڑھنے کا انداز بھی متاثر کن ہے۔ حالات کی ستم ظریفی کے لئے وہ اوروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بجائے خود پر بھروسہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ذہن میں محفوظ ہو گیا ہے:

اپنے دامن میں جو ہیں لعل و گہر ڈالے ہوئے
غیر کے آگے وہ کیوں ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے

جناب سلطان شمسی کا شعری مجموعہ جب منظر عام پر آئے گا تو ان کی شعری وزن اور ان کے ادبی سروکار پر ناقدین خامہ فرسائی کریں گے۔ اس وقت یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کی شاعری ان کے دلوں میں موجود جذبہ احسن کی روداد ہے جسے پھول، خوشبو، آرزو اور بوئے وفا کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے خود کہا:

پشت پر عزم جواں کی گٹھریاں لادے ہوئے
کاروان شوق ہے زاد سفر باندھے ہوئے
پھول ، خوشبو، آرزو، بوئے وفا
دیکھئے ہیں تحفہ لے کر مہماں آئے ہوئے

خاں صاحب کی ڈیوڑھی، محلہ: فیض اللہ خاں، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴ (بہار) موبائل: 9430898766

''اردو زبان دنیا کی چند بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں دوسری زبانوں اور تہذیبوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔'' (ادارہ)

ایم نصر اللہ نصر

''لمبی چپ کا شور'' اور احسان ثاقب

''لمبی چپ کا شور'' معروف شاعر احسان ثاقب کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو کافی عرصہ کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ وہ عرصۂ دراز سے شعر و سخن کے شغل سے منسلک ہیں۔ آغاز میں موصوف نے اسے بازیچۂ اطفال سمجھ کر شوق فرمایا بعد ازاں اپنی علمیت اور صلاحیت کا مظاہرہ بھی کیا جس کا نتیجہ یہ مذکورہ شعری مجموعہ منصۂ شہود کی زینت بنا۔ احسان ثاقب کی سخن سازی اور شعری پیکر تراشی میں ان کے استادِ محترم سہیل واسطی کا اہم رول رہا ہے۔ ہر چند کے ثاقب صاحب نے مطالعے کی بنیاد پر اپنی بساط کو زیادہ مستحکم کیا ہے۔ وہ شاعری کے رموز و اوقاف سے اچھی طرح واقف ہیں۔ فن پر بھی انھیں عبور حاصل ہے۔ مشاہدات و تجربات کی بھی کمی نہیں۔ لسانی اعتبار سے بھی ان کی شاعری پختہ نظر آتی ہے۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ، سماجی بیزاری، سیاسی منافرت۔ عصری آگہی ہر موضوع پر انھوں نے اشعار کہے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف غزلیں کہی ہیں بلکہ غزلوں میں نئے نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ موصوف کی شاعری سے متعلق استاد شاعر اور علم و دانش کی محترم شخصیت ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی رقم طراز ہیں:

> ''احسان ثاقب کی غزلوں میں زندگی کا سوز بھی ہے اور ساز بھی، ایک جولانی ہے، ایک شگفتگی ہے اور بے باکی بھی ہے جو دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ رنگا رنگ کیفیات کو انھوں نے جزئیاتی انداز میں پیش کیا ہے اور نئے رجحان سے آشنائی کا پتہ دیا ہے۔''

اس میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ ثاقب صاحب نے سچے دل سے شاعری کی ہے اور اپنے دل کے زخموں کو الفاظ کی شکل دے کر سطح قرطاس پہ سجا دیا ہے ان کی شاعری قاری کے دلوں کو نہ صرف گرماتی ہے بلکہ دیر تک محوِ حیرت بھی رکھتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بدل جاتا ہے دریاؤں کا تیور　　بدن کے جب ستارے ٹوٹتے ہیں
پتہ ہے سب کو یہ احسان ثاقب　　ہمیشہ غم کے مارے ٹوٹتے ہیں

سر سے گرتی ہوئی دستار سجائی جائے　　آبرو اس طرح اب اپنی بچائی جائے
تا کہ احساس ہو تقسیم کے سناٹے کا　　اس کے آنگن میں بھی دیوار اٹھائی جائے

احسان ثاقب کا اصل نام محمد احسان ہے اور قلمی نام احسان ثاقب۔ ان کی پیدائش ۱۸ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو مروئی (نوادہ، بہار) میں ہوئی۔ وہ مدرسہ پرائمری اسکول اسلام پور، آسنسول میں بحیثیت مدرس درس و تدریس کا فریضہ ادا کرتے رہے اور ۱۸ر اکتوبر ۲۰۱۰ء کو سبکدوش ہو گئے۔ فی الحال وہ اپنے آبائی وطن میں زندگی کے باقی دن گزار رہے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں اب تک دو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ایک عادل نامہ (منظوم) اور دوسرا مجموعۂ کلام ''لمبی چپ کا شور''۔ مذکورہ کتاب واقعی لمبی چپ کے شور جیسی خصوصیات کی حامل ہے۔ جس طرح لمبی چپ کے بعد جب کوئی شور بلند کرتا ہے تو اس کی آواز میں کافی شدت اور توانائی ہوتی ہے۔ نیز دیر تک وہ صدائے دل خراش فضا

میں گونجتی رہتی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں بھی شاعر نے کافی عرصہ خاموش رہنے کے بعد ایک ایسی کتاب منصۂ شہود پر لانے کی جسارت کی ہے جس کی گونج برسوں تک سنی جائے گی۔ اس کتاب میں شاعر نے شعری اصناف کی اتنی صنفوں کو جمع کر دیا ہے جس کو دیکھ اور پڑھ کر ان کی علمیت اور قابلیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ حمد، حمدیہ دوہے، نعت پاک، دعا، غزلیں، غزل مثلث، دوہا گیت، دوہا غزل، دوہا، آزاد غزل، کرجاں غزل، سورٹھا غزل، ہمشیرہ غزل، سورٹھا غزل مثلث، غزل نما، غزالہ، کرجاں دوہا، ترائیلے، کہہ مکرنیاں، لعلن اور چہاران، ہائیکو، ریختی، رباعیانہ، ماہیے، سمیا پورتی، تکنی، ہکرولی کے علاوہ اہم موضوعات پر نظمیں بھی موجود ہیں۔

مذکورہ اصناف پر تخلیقات کو دیکھ کر لگتا ہے کہ موصوف اردو شاعری کے علاوہ ہندی چھندوں کا بھی اچھا خاصا علم رکھتے ہیں۔ شعری رموز و اوقاف کو سمجھنے اور پرکھنے میں کافی وقت صرف کیا ہے۔ تمام اصناف سے شاید ہی کسی کو واقفیت ہو مگر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے تفصیل سے موصوف کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے اور ہر صنف سے متعلق اچھی خاصی بحث بھی کی ہے۔ ان کی تقریظ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ موصوف کا ایک بیان ملاحظہ فرمائیں:

> ''احسان ثاقب اختراعی ذہن کے مالک ہیں۔ ان کے شعری سرمائے پر نگاہ ڈالیں تو وہ بے کراں وسعتیں پہن کر عصر کے ہم سفر نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سحر دم حمد کرتے پرندوں' گنگناتی ہواؤں' لوک گیت گاتی ندیوں' فلک بوس پہاڑوں' بے کنار دریاؤں' بسیط صحراؤں' رم جھم بارشوں' پہلی بارش کے وصال سے مخمور دھرتی کی خوشبوؤں' بہار کے اولین گلابوں' خزاں کے تنہا پیڑوں' دوستی نبھاتے اپنوں' رنگ بدلتے منظروں' کلی کلی منڈلاتے بھونروں' اور ہواؤں کے ہاتھوں پر بیٹھی تتلیوں سے باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں''

اس قدر جامع تمہید و توصیف کے بعد اور کچھ کہنے کو باقی نہیں بچتا۔ اس میں شک نہیں کہ ثاقب صاحب نے اپنی شعر گوئی میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے اور یہ ثابت بھی کیا ہے کہ ''ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا''
ان کے مزید چند اشعار ملاحظہ کریں:

دلوں کو بانٹ کر سادھو کوئی نہیں ہوتا — خلوص بانٹئے مذہب یہی سکھاتا ہے
خوش نگاہی اوڑھ کر بازار میں جائیں نہ آپ — ہر طرف بکھرے پڑے ہیں شیر' چیتے' بھیڑیے
نفس نفس ہے خلش کا عالم لہولہو ہے حیاتی منظر — یہاں تو رہبر ہی راہزن ہے کسے پکارو کسے بلاؤ
گر گیا آخری پتہ بھی شجر سے اک دن — بے قبا ہوگیا خود چھاؤں دکھانے والا
کس طرح گیلی تھکاوٹ سے نکل پائے گا وہ — پیڑ کے اوپر ہے سورج اور لمبے راستے

ایسے ایسے بے شمار اشعار ان کے اس مجموعے میں درج ہیں جن کی قرأت سے دل میں ایک الگ سی کیفیت اور کیف و سرور کا احساس ہوتا ہے۔ کچھ نیا پن اور جدت نگاری کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔ اسلوب کی تازگی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ خیال آفرینی کی جھلک بھی دکھ جاتی ہے۔ ادراک اور افہام کی کرنیں بھی روزنوں سے دل کے خانوں میں داخل ہوتے ہوئے محسوس ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ احسان ثاقب کی شاعری میں واقعی جان ہے۔ تلخیاں ہیں' تیکھا پن

بھی ہے اور تیور کے ساتھ شیرینیت بھی۔ پند و نصائح کے اشارات بھی کم نہیں۔ ملاحظہ کریں:

گزرر ہا ہے میرا وقت اجنبی کی طرح — فریب دیتا ہے یہ دور آدمی کی طرح

کبھی بھی اس پہ بھروسے کی اینٹ مت رکھنا — نیا سماج ہے سوکھی ہوئی ندی کی طرح

اگر کوئی لکھنے بیٹھے تو موصوف کی شاعری پر مکمل ایک کتاب ترتیب پا سکتی ہے۔ اس کے اتنے شیڈس ہیں جس پر بحث کے لئے ایک باب نہیں بلکہ ایک کتاب کی ضرورت پیش آئے گی۔ دیگر اصناف کی تمثیل بھی ملاحظہ فرمالیں:

بقول ڈاکٹر مناظر عشق ہرگانوی غزلِ مثلث کے موجد جمیل مظہری ہیں۔ اس طرح کی غزلوں میں تین مصرعے مل کر مکمل شعر بناتے ہیں یا پھر پوری بات کہتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ صنف اردو شاعری میں خاصی مقبول نہیں لیکن غزل کے رمز آشناؤں نے اسے بھی منہ لگانے سے گریز نہیں کیا۔ سو احسان ثاقب نے بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی اچھی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کریں:

سلگتی دھوپ اور سوکھی ہوئی ندی کا سفر — بہت محال ہے اس وقت آدمی کا سفر

سنبھل سنبھل کے چلے ہے یہ زندگی کا سفر

شدت کی دھوپ اور بھری دوپہر کی بات — کچھ اجنبی سی لگتی ہے دیوار و در کی بات

رسوائیاں بڑھائیں گی پہلی نظر کی بات

دوہا غزل کے موجد ڈاکٹر فراز حامدی ہیں۔ دوہا گیت' کرجاں غزل اور کرجاں دوہا غزل کی ایجاد کا سہرا بھی انھیں کے سر جاتا ہے۔ دوہا غزل کے مجموعے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ احسان ثاقب نے بھی اس صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

جب تک چادر ہے تنی تن پر عورت پھول — چادر تن سے گر گئی عورت پاؤں کی دھول

کس کا آنگن جھانکتی ڈرتی ڈرتی نیند — چنتاؤں کی بھیڑ تھی پھر سے اُٹ گئی نیند

کرجاں غزل میں ردیف کو شاید دو دو بار مصرعوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں موصوف کی ایک ہی غزل اس صنف کی شامل ہے اس لئے یہ نتیجہ نکل کر سامنے آیا ہے۔ اگر اس کی اور کوئی تعریف ہو تو مجھے اس کا علم نہیں۔ مثال دیکھیں:

عجیب طرز کی صورت بھلی بھلی سی لگی — کرجاں تیری یہ عادت بھلی بھلی سی لگی

قریب ہوتے گئے ہم گھڑی گھڑی آخر — نظر کی اجلی روایت بھلی بھلی سی لگی

آزاد غزل کے موجد مظہر امام ہیں۔ انھوں نے اس صنف میں کافی تجربے کیے۔ ان کی ایسی غزلیں رسائل کی زینت بھی بنتی رہیں۔ دوسرے شعرا نے بھی اس کی تقلید کی جن میں ایک نام احسان ثاقب کا بھی ہے ان کی ایک آزاد غزل کے کچھ حصے آپ بھی دیکھیں:

سڑک کی بھیڑ سے بچیے کہ ہر لمحہ یہاں اک حادثہ ہونے لگا ہے

ہوس ایسی جنوں اتنا کہ اب انسان خود اپنے لہو کو چاٹتا ہے

مناظر عاشق ہرگانوی کی اطلاع کے مطابق ''امریکہ کی رہنے والی اردو کی شاعرہ پنہاں نے 'ہمشیرہ غزل' کا پہلا تجربہ کیا تھا۔'' جس سے احسان ثاقب نے بھی استفادہ کیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

کب ہوئی تھی گرم یہ ٹھنڈی ہوا معلوم کیا | کب ہوئی تھی گرم یہ ٹھنڈی ہوا معلوم ہے
جل اٹھی کب آدمیت کی چتا معلوم کیا | جل اٹھی کب آدمیت کی چتا معلوم ہے
توڑ ڈالا کس طرح امن و آشتی کا دائرہ | کس طرح ٹوٹا تھا امن و آشتی کا دائرہ
راہزن تھا وہ کہ اک رہنما معلوم کیا | راہزن کے روپ میں تھا رہنما معلوم ہے

غزل نما بھی اردو شاعری کی ایک صنف رہی ہے جس کی ایجاد کا سہرا شاہد جمیل کے سر جاتا ہے۔ لیکن یہ صنف بھی اردو شاعری میں نامقبول رہی۔ احسان ثاقب نے اس صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے ملاحظہ فرمائیں:

بے تنگ بے زمیں ہے پیمانہ حسیں ہے | ہر چند کہ نہیں ہے
سربستہ زندگی ہے ہر سمت خامشی ہے | اندیشۂ یقیں ہے

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ 'غزالہ' کے موجد انور شیخ ہیں۔ اس میں مکرر ردیف ایک عجیب جذباتی کیفیت 'روانی اور زور پیدا کرتا ہے۔ لیکن مقطع مکرر کے بجائے معکوس ردیف میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی ہو مگر احسان صاحب کب ماننے والے تھے سو انھوں نے بھی غزالہ سے آنکھیں چار کر لیں۔ ملاحظہ کریں:

اٹھتا دریا بہتا دریا پارہ پارہ | اوپر کشتی نیچے دھارا پارہ پارہ
دن تو اترا احسان ثاقب سورج لے کر | لیکن رات کا رخ ہے تھوڑا ٹھہرا ٹھہرا

احسان ثاقب کی کس کس صنف کا ذکر کروں یا محاسبہ پیش کروں۔ انھوں نے ایک طرح سے صنف سخن کی بیشتر اصناف کی تجدید کی ہے۔ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکتی ہیں۔ ابھی کرجاں دوہا' ترائیلے' کہہ مکرنیاں' ہاکو' لعلن اور چہارن' ریختی' ماہیے' سمپا پورتی اور تلخی کی مثالیں تو باقی ہی رہ گئیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ثاقب صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہر فن میں مولا ہیں۔ نظمیں بھی اچھی اور عصری تقاضے کی مناسبت سے لکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی کافی گہرائی اور گیرائی ہے۔ مفاہیم و مطالب کے سواد سے پر ہیں، انھوں نے اپنی نظموں میں حالات حاضرہ پر اچھی گفتگو کی ہے۔ اہم حادثات اور واقعات پر کہی گئیں ان کی نظمیں واقعی قابل داد و تحسین ہیں۔ اگر ان کی پذیرائی ہوئی تو وہ اور بھی اپنے علم و ہنر کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ انھیں یہ مواقع ضرور ملنے چاہئے تاکہ اردو شعر و سخن کا دامن غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن سے بھی مالا مال ہوتا رہے۔ غزل تو غزل ہے جس کے بارے میں موصوف فرماتے ہیں:

غزل کا صوت سے رشتہ تو دیکھئے ثاقب | یہ صنف بجتی ہے ہر بار بانسری کی طرح

....

(موبائل : 09339976034)

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو ☆ کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

سلیمانی کولور

اُردو غزل کا کردار ہندی فلموں میں

تاریخی پس منظر کے حوالے سے اُردو غزل نے فارسی غزل سے استفادہ کیا اور فارسی شاعروں نے غزل لکھنے کے لیے عربی زبان کے قصائد میں موجود بادشاہ یا امیر کی مسلسل مدح کے دوران پیدا ہونے والی خشکی کو دور کرنے کی غرض سے قصیدہ کے قافیہ اور ردیف کو برقرار رکھتے ہوئے یا پھر بے ردیف قصیدہ کے دوران بھی مسلسل رنگین خیالات اور حسن و عشق کی واردات کو بیان کر کے بادشاہ یا امیر کی توجہ کو رنگینی اور خوش مزاجی کی طرف مائل کرنے والی شاعری کو ''غزل'' کا نام دیا گیا جس میں تغزل ہوتا ہے جس کے لغوی معنی ہیں صنف نازک سے گفتگو یا اپنے محبوب سے حسن و عشق کی حکایات بیان کرنا ان کے عشق کا دم بھرنا۔ شمس قیس رازی نے غزل کی جو تعریف پیش کی ہے ملاحظہ ہو ''غزل در اصل لغت حدیث زناں وصف عشق بازی با ایشاں وتہالک دردوستی ایشاں است'' (المعجم فی معائیر اشعار العجم) قیس رازی کے مطابق ایسا شعر جس میں فنون عشقیات کا بیان ہو جس میں مختلف پہلوؤں کا احاطہ ہوتا ہے۔ جیسے وصف رخ، زلف وخال، خوبی گل وگلزار، حکایت وصل و ہجر، ذکر باغ و بہار، بیان ابرو باد و باراں، رنگ و بوئے گلستاں، وصف کوئے یار و مقام دلدار سب کچھ فنونِ عشقیات و مضامینِ عاشقانہ میں شامل ہیں۔ اردو میں سب سے پہلے رنگین غزلیں لکھی گئیں اسی رنگینی و دلکشی کے سبب ہندی فلموں میں بھی اُردو غزل بہت مقبول ہوئی اور فلموں کو بھی مقبولیت عطا کی۔ مختلف ادوار میں غزل ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے عاشقانہ مضامین کی تنگنائے سے نکل کر ہر قسم کے مضامین بیان کئے جانے کے قابل ہوگئی تو مضامین میں تنوع ہی اس کی مقبولیت کا سبب بنا۔ غزل کم سے کم لفظوں میں بڑی سے بڑی بات کہہ جانے کا ہنر جانتی ہے۔ اُردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی لکھی اور پڑھی جا رہی ہے جو صنف سخن اس طرح عوام و خواص کے اعصاب پر چھا ئی ہو اس کے معیار متعین کرنا بھی آسان نہیں۔ بقول وسیم بریلوی؛

> ''غزل کی فکر انگیز لفظی و معنوی تفہیم ہی آج اسے ایسے مقام پر لائی ہے کہ دیگر اصناف سخن اسے رشک سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ اُردو شاعری کے ہر دور کا بڑا شاعر غزل گو ہی ہوا ہے۔ شاید اس لیے کہ غزل سے بڑھ کر کوئی دوسری صنف سخن انسانی مزاج کی ہر لمحہ بدلتی کیفیات کو اتنے واقعاتی انداز میں موضوع فکر بنا ہی نہیں سکتی۔'' (ص:۸ آنکھوں آنکھوں رہے، وسیم بریلوی)

غزل گو شعراء روزمرہ کے تجربات و واقعات کو پہلے بھی یعنی اپنے اپنے مخصوص دور کے عام بول چال کی زبان اور اسلوب میں پیش کرتے تھے اور آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ ولی کے تحریک سے ہی اس کا رشتہ دیسی زبان یا عوامی زبان سے استوار ہو چکا تھا بلکہ اُردو بذات خود عوامی زبان ہے جو کہ ہر پل بے تکلف لہجے کے ساتھ عوام کے قریب ہوتی رہی ہے لیکن علامات اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہی بدلتے رہے ہیں چونکہ اُردو غزل عربی سے فارسی اور پھر ہندوستان میں اُردو کے وسیلے سے تقریباً 1000 / ہزار سال کے طویل سفر کے بعد بقول کامل

قریشی "جب یہ طرح طرح کے ملبوسات بدل چکی تو ہندوستانی پوشاک کی سج دھج نے اسے کچھ اور بنا دیا۔"

غزل کے محدود کینوس پر لامحدود نقوش کو فنکار پوری تفصیل کے ساتھ اپنے عصری ماحول کے تقاضوں کو پیش کرتا ہے اسی عصری ماحول نے ہر زمانے میں غزل کی فنی قدریں متعین کی ہیں دنیا کی مختلف زبانوں کے اصناف سخن میں صنفِ غزل کی اہمیت اور معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے ابنِ فرید رقمطراز ہیں۔

"غرض دنیا میں اتنے بہت سے واقعات و حوادث ہیں کہ ان کی تفصیل کا احاطہ نہ انسان کے بس کی بات ہے اور نہ ہر اجمال کی تفصیل میں پر کیف فنی حسن ہوتا ہے۔ پھر بھی فنکار چاہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مختصر سے عرصے اور فن کے محدود کینوس پر بہت سے لافانی نقوش ثبت کر دے۔ یہ آرزو ہر زبان و ملک کے شاعر نے کی ہے۔ مغرب کے کوارٹٹ، فرانس کے ترائیلے، قدیم فارس کے چامہ، بھاشاؤں کے دوہے، پنجابی کے ماہیا، جاپان کے ہائیکو، ہر جگہ شاعر نے چھوٹے سے چھوٹا کینوس تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن غزل کا جیسا کینوس جو بے حد محدود ہوتے ہوئے بھی بہت عریض ہے ہر زبان کو میسر نہ آسکا۔ یہ ہیئت فنی لحاظ سے اتنی ترقی یافتہ اور جامع ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں بے جان اور فرسودہ نہیں ہو پاتی بلکہ ہر زمانے کے حوادث اور تقاضے اس کی جولانی میں اور زیادہ اضافہ کر دیتے ہیں اور یہ پھر تازہ دم و تازہ کار ہو کر اور زیادہ پُرکشش ہو جاتی ہے کیونکہ صرف اسی صنف میں شاعر پابند ہونے کے باوجود اپنے فنی تجربوں کے اظہار میں کسی طرح کی گھٹن یا رکاوٹ محسوس نہیں کرتا اس کے علاوہ اسے بہت زیادہ دستور بندیوں یا بے رس (Prosaic) طوالت کا بھی شکار نہیں ہونا پڑتا بہت بڑی بات کو بہت زیادہ ترشے ہوئے انداز میں بیان کرنا اس کے ایجاز کا اعجاز ہوتا ہے۔"

(غزل اور انسانی نفسیات، ابنِ فرید، آواز آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام 16 تا 31 اگست 1979)

اس طرح آج دیکھ سکتے ہیں کہ نہ صرف اُردو بلکہ اردو کے توسط سے ہندی، مراٹھی، گجراتی، اڑیہ، بنگالی، ٹمل، ملیالم، تیلگو زبان میں بھی غزل اپنا ڈیرا جمایا ہے ان زبانوں کے شعراء غزل کی ہیت اور خصوصیت کو اپنا کر اپنے ادب کو امیر بنا رہے ہیں۔ اس بات کی تاکید میں خلیق انجم کا قول پیش نظر ہے۔

"برصغیر کی تمام زبانوں کے اصناف ادب میں سے سب سے زیادہ مقبولیت اردو غزل کو حاصل ہے اس علاقے کی کوئی زبان ایسی نہیں جس نے اس صنف سخن کو نہ اپنایا ہو۔"

جس طرح دوسری زبانوں کے فنکار آج غزل کو اپنا کر اپنی فنکاری کو جلا بخشنے کی سعی کر رہے ہیں ایک دن ایسا آئے گا کہ ہندوستان کے مختلف اہل زبان اس صنف سخن پر فخر محسوس کرنے لگیں گے۔ غزل کی مخالفت کے باوجود ترقی پسند تحریک کے کئی شعراء نے بھی فلموں کیلئے غزلیں لکھی ہیں ان میں فیض احمد فیض مخدوم محی الدین مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی بشر نواز وغیرہ ہیں۔ بیسویں صدی میں غزل نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے وہیں سنیما رفلموں کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکا بلکہ اُردو غزل ہندی سنیما کا اٹوٹ حصہ بن گئی۔"

غزل اُردو شاعری کی آبرو" اُردو شاعری کی روح، اُردو شاعری کا عطر، اُردو کی پاکیزہ صنف سخن اپنی گونا گوں خوبیوں کے بناء پر جہاں ہر زبان وادب کے فنکاروں کی منظور نظر بن گئی ہے وہیں تغزل اس کی خاصیت، عشق اس صنف سخن کا خاص موضوع ہے۔ علاوہ ازیں اس کا سانچہ حیات وکائنات کے ہر موضوع کے اظہار کے لیے موزوں ہونے کے سبب ہندی فلموں کی جان بنی ہوئی ہے اور فلموں کو ہر دالعزیز بنانے میں بھی اس نے اہم رول ادا کیا ہے فلم کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پورے ملک میں بلکہ غیر ممالک میں بھی مذہب وملت اور زبان کی تفریق کے لوگ فلمی غزلیں سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے غزل کے شایان شان مذکورہ بالا جو جملہ کہا تھا اسی خطاب و اعزاز کے اعتراف میں تھا اور خلیق انجم صاحب کی وضاحت بھی اسی حقیقت سے تعلق رکھتی ہے کہتے ہیں کہ:

"نثر تو پڑھے لکھے لوگوں تک محدود رہتی ہے لیکن غزل نے مشاعروں، موسیقی کی محفلوں، فلموں، ریڈیو ٹیلی ویژن کے ذریعے ان ہندوستانیوں کے دل میں بھی اپنے لیے جگہ بنائی جو پڑھنے لکھنے کی نعمت سے محروم ہیں"۔

انٹرنیٹ کے فری انسائکلو پیڈیا میں فلمی غزل کے عنوانات سے اس کا تعارف اس طرح پیش کیا گیا ہے:

"Filmi-ghazal is a gener of film songs based on ghazal poetry in hindustani or Urdulanguge, used in Indian films, especially Hindi cinema (Bollywood). The filmi-ghazal retain the couplet format and rhym scheme similar to that in ghazals. But instead of vocal or instrument passage as interludes, this gener usually uses pre-composed musical pieces."

ہندی سنیما میں جس غزل کو برتا گیا ہے وہ اُردو زبان وادب سے الگ نہیں ہے اکثریت اردو شعراء کی ہے جنہوں نے ہندی سنیما میں قلم فرسائی کی ہے چاہے ان کی شاعری کسی بھی سطح کی کیوں نہ ہو جو کچھ لکھا ہے سنیما رفلم کے تقاضوں کے پیش نظر ہی لکھا ہے اور اگر غیر اُردو داں شاعروں نے ہندی سنیما میں غزلیں لکھیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غزلیں ہندی والوں کے پاس آسمان سے ٹپکی ہیں بلکہ اُردو غزل کو ہی ہندی غزل کہہ کر ہندی والے خوش ہونے اور دل کو تسکین دی ہے۔ ان کا یہ سلوک اردو کی گردن زنی کرنے یا اپنے آپ کو دھوکا دینے کا ہو، سچائی سے منہ پھیرا نہیں جا سکتا اور اگر حقیقت سے منہ پھیر بھی لیں تو تاریخ اس کو کبھی معاف نہیں کر یگی' وقت بتا چکا ہے کہ سچ کیا ہے کیونکہ سانچ کو آنچ نہیں، سچ تو یہ ہے کہ اُردو میں غزل فارسی سے اور فارسی میں عربی کے صنف قصیدہ گوئی سے تشکیل پائی ہے، آزادی سے پہلے اور بعد میں ہندی کے نام پر جس زبان کا اعلان کیا گیا اس کے پاس ادب کا وافر ذخیرہ کہاں تھا؟ جو کچھ اردو ادب میں اور اردو والوں کے پاس تھا اسی کو ہندی والوں نے خاص کر فلموں میں استعمال کیا ہے اسکے علاوہ ہندوستان کا تہذیبی وتمدنی پس منظر اردو ہی کا تھا اردو غزل کے اشعار کا استعمال سنیما میں نہ صرف غزلیہ کلام کے طور پر ہوا ہے بلکہ گیتوں' قوالیوں' نغموں' مکالموں وغیرہ میں بھی خوب خوب برتا گیا ہے، اس

لئے ہندی سنیما کی آفاقی مقبولیت اُردو غزل سے ہے اردو غزل کو سنیما والوں نے دنیا والوں کو ہندی غزل باور کرایا ہے، البتہ ہندی سنیما کے صد سالہ موقع پر اہل فکر و نظر اور ارباب علم و فن نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے اور اس کا ذکر صرف محفلوں میں زبانی جمع خرچ سے نہیں کیا گیا بلکہ انٹرنیٹ کے ویب سائٹس میں بھی اس سچائی کا اعتراف کیا گیا ہے اب سیاست دانوں و فرقہ پرستوں کو بھی یہ توفیق حاصل ہو جائے، کہ ہمیشہ سچ کی جیت ہوتی ہے۔

ہندی فلموں میں اردو کے شعراء جن کی ایک طویل فہرست ہے ان میں محمد قلی قطب شاہ، میر، غالب، مومن، امیر مینائی، اکبرالہ آبادی، فیض احمد فیض، علامہ اقبال، جگر مرادآبادی، آرزو لکھنوی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، راجندر کرشن، اندیور، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، ندا فاضلی، سدرشن فاکیر، حسرت جے پوری، انجان، گلزار، جاوید اختر، شہریار، محسن نقوی، قیصر الجعفری، فاروق قیصر، گوہر کانپوری، کیف عرفانی، تاجدار امروہوی، ضمیر کاظمی، واحد قریشی، ساحل سلطان پوری، اختر رومانی، ساجن دہلوی، ضیا سرحدی، تنویر نقوی، سرشار سیلانی، تاج بھوپالی، ظفر راہی، ساحل سلطان پوری، طاہر انبالوی، نور لکھنوی، شکیل اعظمی، راحت اندوری، شبیر احمد، ارشاد کامل، ظہیر کاشمیری، کمال رشید خان، راجہ مہدی علی خان، ور ما ملک، سعید قادری، جلیس شیروانی، کیف بھوپالی، اسد بھوپالی، بشر نواز، خمار بارہ بنکوی، عباس ٹائروالا 'حسن کمال' ہمیر وغیرہ ہیں ابتدائی فلموں کے چند اُردو شعرا جنہوں نے فلموں کے لیے نغمے غزلیں لکھیں گمنامی کے اندھیرے میں کھو گئے ہیں آزادی سے قبل جتنے بھی غیر مسلم شعرا نے فلموں کے لیے گیت لکھے سب اُردو پس منظر یا اُردو ذریعہ تعلیم سے تھے اسلئے فلمی گیتوں اور غزلوں میں اُردو زبان کی چاشنی شیرینی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ فلموں میں جن کلاسکی شعراء کا کلام پیش کیا گیا ہے ان میں بقول پریم پال اشک:

> ''ہندی فلموں میں اردو کے جن کلاسکی شعراء کا کلام پیش کیا گیا ان میں غالب اور ذوق کے علاوہ مومن میر امیر خسرو قلی قطب شاہ واجد علی شاہ بہادر شاہ ظفر اور مرزا شوق لکھنوی کے نام نمایاں طور پر شامل ہیں۔ محبوب خان کی فلم ''دکن کوئن میں سریندر نے غالب کی یہ غزل گائی تھی 'یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔ فلم نیکی اور بدی 1949 میں مومن کی غزل وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو کے ایل سہگل نے فلم کاروانِ حیات اور یہودی کی لڑکی' میں غالب اور مومن کی غزلیں 'لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے' گائی تھیں۔''
>
> (ہندوستانی سنیما کے پچاس سال ص: ۱۴۵)

'مرزا غالب' کے عنوان سے 1954 میں غالب کی حیات پر فلم بنی جس میں ثریا اور طلعت محمود نے مرزا غالب کی غزلیں گا کر اردو والوں کے دلوں کو لوٹ لیا۔ غالب کی یہ غزلیں نہ صرف اُردو والوں پر بلکہ غیر اُردو داں حضرات اور زبان و ادب سے تعلق نہ رکھنے والے عوامی سطح پر بھی اتنی ہی اثر کر گئیں اور لوگوں کے دلی جذبات و احساسات کی ترجمان بن گئیں اور ہر کوئی یہی محسوس کرتا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اس فلم کی غزلیں ہیں۔ آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک، کون جیتا ہے ترے زلف کے سر ہونے تک، نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے، عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی، میری وحشت تری شہرت ہی سہی، رہی سہی

رکبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے رجفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے ،ردلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے رآخر اس درد کی دوا کیا ہے، رپھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ردل' جگر تشنۂ فریاد آیا، رر ہیے ایسی جگہ چل کر کہ جہاں کوئی نہ ہو رہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو، ریہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا راگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا، رہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور رکرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے رکہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور فلم اپنا دیش 1949ء میں پشپا ہنس نے موسیقار پرشوتم نے دو غزلیں گائیں تھیں فلمی دنیا میں اور اُردو والوں سے پشپا ہنس کا تعارف غالب کی انہی غزلوں کی گلوکاری سے ہوا تھا۔ وہ غزلیں تھیں دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے رآخر اس درد کی دوا کیا ہے رکوئی امید بر نہیں آتی رکوئی صورت نظر نہیں آتی، غالب کے کلام کو، کے۔ ایل۔ سہگل اور سریندر کے علاوہ ثریا، طلعت محمود، محمد رفیع اور پشپا ہنس نے مختلف فلموں میں اپنی آواز کے جادو کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقول پریم پال اشک کے ''ہندی سینما میں سب سے زیادہ غزلیں غالب کی پیش کی گئی ہیں ان فلموں کی تعداد درے ہے۔'' اس کے علاوہ غالب کی غزلوں کے کئی منتخب اشعار بے شمار ہندی فلموں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ کے ایل سہگل کی آواز میں غالب کی یہ غزلیں پرائیوٹ طور پر ٹو مین ریکارڈ کمپنی والوں نے بھی پیش کر کے مرزا اسد اللہ خاں غالب کو خراج تحسین پیش کیا تھا اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ہندی سینما کے کئی شعرا نے محمد قلی قطب شاہ، غالب اور میر کی غزل کے مطلع اور مصروں کو اور کبھی مصرعوں کے ٹکڑوں کو لے کر تضمین بھی کی ہے طرح بھی دی ہے، غزلوں کے ردیف اور قافیہ کو بھی اپنی غزلوں میں برتا ہے طرحی مصرعوں پر راسی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ ان میں مجروح سلطان پوری' حسرت جے پوری' راجندر کرشن، اندیور، شکیل بدایونی' ساگر سرحدی' شیلیند ر' ضیا سرحدی' انجان وغیرہ۔

مومن کی شہرۂ آفاق غزل کا یہ شعر جس پر غالب اپنا دیوان نچھاور کرنے پر آمادہ ہوئے تھے، تم میرے پاس ہوتے ہو گویا رجب کوئی دوسرا نہیں ہوتا رصرف ایک لفظ کو کم کر کے حسرت جے پوری نے پورا شعر فلم 'لو ان ٹوکیو 1966ء کے گانے میں استعمال کیا تھا، وہ میری شاد خوباں او میری جانِ جاناں۔۔۔ تم میرے پاس ہوتے ہو کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ مومن کی اسی غزل کا ایک اور شعر حالِ دلِ یار کو لکھوں کیوں کر رہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا رفلم رستم سہراب 1963ء پھر تمہاری یاد آئی اے صنم رہم نہ بھولیں گے تمہیں اللہ قسم راس گیت کا دوسرا شعر' کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ مومن کی غزل' فلم' تہذیب' 2003ء پیش نظر ہے۔' مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے مفت بیٹھے بیٹھائے لوگوں نے۔

میر تقی میر کی غزل کو اپنی فلم 'میں نشے میں ہوں' میں ساگر سرحدی اور شیلندر نے بڑی ہی خوبصورتی سے استعمال کیا تھا' یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں اب دو تو جام خالی ہی دو میں نشے میں ہوں'1972 ساگر سرحدی کی زیر ہدایت میں فلم' ایک نظر' بنی تھی اس فلم کے گانے میں میر تقی میر کی غزل کے مطلع کی تضمین کی گئی وہ ہے پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے 1981 کی فلم' بازار' میں موسیقار خیام نے لتا منگیشکر کی آواز میں میر کی غزل دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا رہمیں آپ سے بھی

جدا کر چلے۔ پیش کیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ دکن میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کی مشہور غزل فلم 'نشانت' 1975 میں پریتی ساگر کی آواز موسیقار ونراج بھاٹیا نے پیش کیا تھا۔ 'پیا پاج پیالا پیا جائے نا' پیا باج اک تل جیا جائے نا نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے/کدی اس سے مل بسیا جائے نا/قطب شاہ نہ دے مجھ دیوانے کو پند/دیوانے کو کچھ پند دیا جائے نا اسی غزل کے طرح میں اور موضوع پر شکیل بدایونی نے ایک غزل فلم پنچایت 1958 کے لیے لکھی جس کے بول تھے۔ تیری یاد دل سے بیا جائے نا/اک پل بھی تجھ بن جیا جائے نا۔ مجروح سلطان پوری نے فلموں کے لیے کافی تعداد میں طبع زاد گانے لکھے ہیں متقدمین کی تقلید بھی کی ہے جو بہت مقبول ہوئیں۔ فلم 'ابھیمان' 1973ء کا وہ گانا جو، جیا بہادری پر فلمایا گیا ہے مجروح سلطان پوری کے بول تھے 'پیا بنا پیا بنا پیا بنا بسیا باجے نا باجے نا' اس گیت کے بول الفاظ تقریبا اسی غزل سے لئے گئے ہیں بس گانے کی ترتیب مجروح سلطان پوری کی ہے۔

امیر مینائی کو اردو نعت گوئی میں خاص مرتبہ حاصل ہے 1982 کی فلم 'دیدار یار' میں ان کی غزل کو بہت خوبصورتی سے ٹینا مونیم اور رشی کپور پر فلمایا گیا تھا موسیقار لکشمی کانت پیارے لال آواز کشور کمار اور لتا منگیشکر ،غزل کے اشعار 'سرکتی جائے ہے رخ سے نقاب' آہستہ آہستہ/نکلتا آرہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ' یہ غزل بے حد خوبصورت اور جدت طرازی کا نمونہ ہے اس غزل کو فلم کے علاوہ بھی کئی فنکاروں نے اپنے البم میں پیش کیا ہے فلم 'نیکی اور بدی کی غزل تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو' کے علاوہ 'فلم 'تہذیب' 2003ء میں مومن خاں مومن کی غزل 'مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے/مفت بیٹھے بیٹھائے لوگوں نے۔ داغ دہلوی کی غزل 'سبق ایسا پڑھا دیا تو نے/دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے/موسیقار اے آر رحمٰن نے سجاتا بھٹا چاریہ کی آواز میں پیش کیا ہے عذر آنے میں بھی ہے

ابتدائی ہندی فلموں میں اکثر اُردو ادب اور اردو شاعروں کے نغمے غزلیں اور گیتوں کے ذریعہ فلموں کو ہر دلعزیز بنانے اور سامعین کے ذوق کو حظ اور تسکین دینے کے لیے خوب خوب برتا گیا ہے 80-1870ء کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اس کا چلن ذرا سا کم ہوگیا ہو لیکن 1983 میں بھی ظفر کی نظم کو فلم کی زینت بنایا گیا ہے۔ فلم 'لال قلعہ آئی تھی اس فلم میں بہادر شاہ ظفر کی غزلیں محمد رفیع نے گائے تھے موسیقار ایس این ترپاٹھی تھے یہ فلم معمولی ہونے کے باوجود غزلوں کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ غزلیں یہ تھیں۔ نہ کسی کے آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں/لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں/کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں/1983 کی فلم ''منڈی'' میں بہادر شاہ ظفر کی مندرجہ ذیل غزل پربتی ساگر کی آواز میں ونراج بھاٹیہ کی موسیقی کے ساتھ مجرا گیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی یہی غزل 1974 میں پاکستان کی فلم 'ٹائیگر گینگ' میں بھی فلمائی گئی ہے۔ شمشیر برہنہ مانگ غضب بالوں کی مہک پھر ویسی ہی/جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا بالوں کی لہک پھر ویسی ہی۔۔۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کی غزل کبھی اے حقیقت ومنتظر نظر آ لباسِ مجاز میں/کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں/فلم دلہن ایک رات کی' 1966ء موسیقار مدن موہن، لتا منگیشکر کی آواز میں اداکارہ 'نوتن' پر فلمایا گیا ہے۔ فلم داستان 1972ء محمد رفیع کی آواز میں ساحر لدھیانوی نے مصرعہ اولیٰ اقبال کا لیا ہے 'نہ تو زمیں

کے لئے ہے نہ آسماں کیلئے اسکے علاوہ کئی ہندی فلمی گیتوں میں علامہ اقبال کے کلام کو استعمال کیا گیا ہے۔ انہی کے ہم عصر مشہور طنزیہ ومزاحیہ اردو کے شاعر اکبر الہ آبادی کی غزل ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے/ ڈاکا تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے' غزل کے مطلع کے دونوں مصرعوں کے آخری ٹکڑوں کو تھوڑی سی جو پی لی ہے/ چوری تو نہیں کی ہے کو جوڑ کر ایک خوبصورت گیت بنایا ہے انجان نے فلم 'نمک حلال' 1982 کے لئے۔ گیت امیتابھ بچن پر فلمایا گیا ہے ہدایت کار پرکاش مہرا فلمساز ستندر پال کشور کمار کی آواز میں موسیقار بپی لہری ہیں۔

فیض احمد فیض نے آزادی سے قبل ہندوستانی فلم انڈسٹری کے لئے دو غزلیں اور ایک نظم دی تھی جس کا ذکر فلم 'قیدی' کے ضمن میں لیا جا چکا ہے فلم 'رومیو اور جولیٹ 1947 موسیقار حسن البختر م، گائیکی زہرہ بائی امبالے والی اور موسیقار خیام ہیں" دونوں جہان تیرے محبت میں ہار کے/ روتا جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے۔ یہ اپنے زمانے کی بہت ہی مقبول غزل رہی ہے آج بھی اس کے سننے والوں کی کمی نہیں۔ فلم' جانور 1965 موسیقار شنکر جے کشن، آشا بھونسلے کی آواز میں فیض کی غزلوں اور نظموں کے ملے جلے اشعار کو اداکار شمی کپور، راج شری پر بہت ہی رومانی منظر کے ساتھ فلمایا گیا ہے، اشعار ہیں، رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی/ عجب رنگ میں اب کے بہار گزرے ہے جیسے کوئی ویرانے میں چپ کے سے بہار آ جائے/ تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے۔

مخدوم محی الدین کی بڑی خوبصورت اور کانوں میں رس گھولنے والی نظمیں اور غزلیں ہندی فلموں کے لیے فلمائے گئے ہیں۔ فلم ساز ہدایت کار اور اداکار چندر شیکھر نے بھی اپنی فلم' چا چا چا 1964 میں مخدوم محی الدین کا کلام پیش کیا تھا جو کافی مقبول رہا ہے۔ اک چنبیلی کے منڈوے تلے/ مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر/ دو بدن/ پیار کی آگ میں جل گئے/ پیار حرف وفا پیار ان کا خدا/ پیار ان کی چتا/ اوس میں بھیگتے چاندنی میں نہاتے ہوئے/ جیسے دو تازہ دم پھول پچھلے پہر/ ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا/ صرف ماتم ہوئی/ کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر/ اک پل کے لیے رک گئی/ ہم نے دیکھا انہیں/ دن میں اور رات میں/ نور وظلمت میں/ مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انہیں/ مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انہیں/ مے کدوں کے دراڑوں نے دیکھا انہیں/ ازل تا ابد یہ بتا چارہ گر/ تیری زنبیل میں/ نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے/ کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے/ اک چنبیلی کے منڈوے تلے۔ فلم' گمن، 1978، مخدوم کی یہ غزل۔ رات بھر درد کی شمع جلتی رہی/ غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر۔۔ بہت مقبول عام ہوئی۔ 1981 کی فلم" بازار" میں ساگر سرحدی نے خیام کی موسیقی سے آراستہ لتا منگیشکر اور طلعت عزیز کی آواز میں نامور ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کا کلام پیش کر کے بقول پریم پال اشک' اپنے اعلیٰ ادبی شعور کا ثبوت پیش کر دیا'۔ پھر چھڑی رات بات پھولوں کی/ رات ہے یا بارات پھولوں کی/ پھول کے ہار پھول کے گجرے آپ کا ساتھ ساتھ پھولوں کا/ پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں۔ اسی فلم' بازار' میں جگجیت کور نے مرزا شوق کی مثنوی کے اشعار دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے/ کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے دلکش آواز میں گائی ہے۔

بہزاد لکھنوی جن کے کلام میں جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ امیجری کا ہنر بھی ملتا ہے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کی اور دہلی وبمبئی کے ریڈیو اسٹیشنوں پر اسکرپٹ رائٹر کے طور پر خدمات انجام دیں اس کے

علاوہ انہوں نے فلموں کے لیے گیت بھی لکھے فلم 'آگ' 1948 کا یہ مقبول گانا 'نا آنکھوں میں آنسوں نا ہونٹوں پہ ہائے رمگر ایک مدت ہوئی مسکرائے موسیقار رام گانگولی اور شمشاد بیگم نے گایا تھا آج بھی لوگوں کی یادوں میں محفوظ ہے۔ اسی فلم کا اور نغمہ جسے مکیش نے اپنی جادو بھری پرسوز آواز میں پیش کیا تھا آج تک ہٹ ہے گیت کے بول ہیں 'زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں رجلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں فلم 'ادا' کے لیے بہزاد لکھنوی کا لکھا ہوا گیت ، جسے دل میں بسانا چاہا تھا اسے دل میں اپنے بسا نہ سکے ر پر اب یہ تمنا ہے دل کی' ہمیں یاد بھی اسکی آ نہ سکے طلعت محمود نے گایا تھا اور کافی مشہور ہوا تھا۔ تقسیم وطن کے بعد پاکستان ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور صبح کی نشریات میں دس سال تک نعت خوانی کرتے رہے۔

مجاز لکھنوی علی گڑھ یونیورسٹی سے اُردو میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد دہلی ریڈیو اسٹیشن میں آواز کے سب ایڈیٹر رہے۔ ان کی چند ہی غزلیں اور نظمیں فلموں کی زینت بنیں نغموں کو سننے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جواں مرگ شاعر اگر حیات ہوتا تو اُردو شعر و ادب اور فلمی دنیا کو کس کس طرح سے نوازتا! 1953 کی فلم 'ٹھوکر موسیقار سردار ملک' طلعت محمود کی آواز میں مجاز کی مشہور نظم 'اے غم دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں' شہر کی رات اور میں نا شاد و ناکارا پھروں جگمگاتی، جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں رآہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال راے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں راستے میں رک رک کے دم لے لوں میری عادت نہیں رلوٹ کر واپس چلا جاؤں میری فطرت نہیں فلم 'پیاسا' 1957 ایک بے حد مقبول عام ہندی سنیما رہی ہے مجاز کی مترنم غزل کو گرودت پر فلمایا گیا تھا' روداد غم الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے راک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسوں آ بھی گئے فلمساز و ہدایتکار کے اے عباس کی فلم آسمان محل' 1965 موسیقار جے پی کوشک آواز مہندر کپور و جے مجمدار مجاز کی نظم 'مجبوریاں' میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا رسکون لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا'

جگر مرادآبادی نے فلمی دنیا سے ناطہ جوڑنے کی کوشس کی تھی لیکن بہت جلد کنارہ کشی اختیار کر لی۔ فلم 'چورنگی' 1942 موسیقار قاضی نذرالاسلام ہنومان پرساد شرما آواز انیس خاتون وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں ابتک سما رہے ہیں یہ چل رہے ہیں' وہ پھر رہے ہیں' یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں ریہ کس کا تصور ہے کے علاوہ اس فلم کے ہر نغمے کی کمپوزنگ میں آرزو پرتو لکھنوی اور قاضی نذرالاسلام کے ساتھ انکی حصہ داری ہے راک لفظ محبت کا ادنی یہ فسانہ ہے رجوان پہ گزرتی ہے رہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے ربعد وفات انکی غزل عشق نے توڑی سر پہ قیامت ر زورِ قیامت کیا کہئے رسننے والا کوئی نہیں رودادِ محبت کیا کہئے فلم 'جنون' 1978 موسیقار ونراج بھاٹیا، آواز محمد رفیع، ہدایتکار عصمت چغتائی۔

مولانا حسرت موہانی مجاہد آزادی اور آئین ساز اسمبلی کے رکن جنھوں نے 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دیا انکی شہرۂ آفاق غزل 'چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے رہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے 1982 فلم 'نکاح' میں غلام علی کی آواز میں بڑی خوبصورت طرز ادا کے ساتھ راگ کافی میں پیش کیا گیا ہے اسی غزل کو مختلف فنکاروں نے البم کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

شہر یار بھی اُردو کے ان شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے با قاعدہ فلمی دنیا میں رہ کر سچویشن کے مطابق نغمہ نگاری نہیں کی بلکہ ان کی شعری تخلیقات کو فلموں میں استعمال کیا گیا اور عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1979 کی گمن پہلی فلم تھی جس میں موسیقار جے دیو، آواز ہری ہرن 'عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو / میں اپنے سائے سے ڈر گیا یارو' 'سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے / اس شہر میں ہر شخص پریشاں سا کیوں ہے' ان کی یہ دونوں غزلیں کافی مشہور ہوئیں گمن، امراؤ جان، انجمن ان کی خاص فلمیں ہیں مظفر علی کی فلم 'امراؤ جان ادا' 1982 کی کل چھ غزلیں 'جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے / دل چیز کیا ہے آپ میری جان لیجئے / ان آنکھوں کی مستی میں افسانے ہزاروں ہیں / جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی سی لگتی کیوں ہے / یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کونسا دیار ہے / زندگی جب بھی تیری بزم میں لاتی ہے ہمیں' اسی ایک فلم نے انہیں ہندوستان کے گھر گھر میں پہنچا دیا ہے' انہیں 2008ء کا گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

جاں نثار اختر کی خوبصورت غزلیں خاص و عام کی پسندیدہ رہی ہیں فلم سوشیلا 1966 گلوکار طلعت محمود محمد رفیع غم کی اندھیری رات میں دل کو نا بے قرار کر / فلم کلپنا 1960 موسیقار او پی نیر / آشا بھونسلے بیکسی حد سے جب گزر جائے / کوئی اے دل جئے یا مر جائے فلم رضیہ سلطانہ 1983 موسیقار خیام گلوکار کبّن مرزا آئی زنجیر کی جھنکار خدا خیر کرے / دل ہوا کس کا گرفتار خدا خیر کرے۔

شکیل بدایونی کی غزل سال 1960 کی فلم 'مغل اعظم' فلمساز و ہدایت کار کے آصف موسیقار نوشاد علی، آواز لتا منگیشکر 'اے عشق یہ سب دنیا والے بیکار کی باتیں کرتے ہیں / پائل کے غموں کا علم نہیں جھنکار کی باتیں کرتے ہیں' 1955 کی فلم 'ستارہ' موسیقار غلام محمد آواز لتا منگیشکر 'تقدیر کی گردش کیا کم تھی' 'بے تابیٔ دل جب حد سے بڑھی گھبرا کے محبت کر بیٹھے / فلم دل دیا درد لیا / 1966 موسیقار نوشاد گلوکار محمد رفیع کوئی ساغر دل کو بہلاتا نہیں / بے خودی میں بھی قرار آتا نہیں۔ عیش کنول کا مقبول نغمہ / میں تو تیرے حسین خیالوں میں کھو گیا / دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ دیوانہ ہو گیا / فلم سنگرام 1965۔

مجروح سلطان پوری کی بے شمار غزلیں ہندی فلموں کی زینت بنی ہیں۔ فلم 'انداز' 1949 آواز لتا منگیشکر موسیقی، نوشاد علی فلم ساز، محبوب خان / اٹھائے جا اُن کے ستم اور جئے جا یونہی مسکرائے جا' آنسوں پے جا' فلم 'دستک' 1970ء اداکار ریحانہ سلطانہ / سنجیو کمار، آواز لتا منگیشکر، موسیقی، مدن موہن، فلم ساز راجندر سنگھ بیدی، ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح / اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح اب کیا مثال دوں تمہارے شباب کی / اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو / اپنا پرایا مہرباں نامہرباں کوئی نہ ہو / فلم 1966 ماں رہتے تھے کبھی جن کے دل میں ہم جان سے بھی پیاروں کی طرح

ساحر لدھیانوی اہم ترین ترقی پسند شاعر و ممتاز نغمہ نگار نے اپنی بے شمار غزلیں نغمیں ہندی فلموں کو عنایت کی ہیں جن میں فلم پیاسا 1957 تنگ آ چکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم / سال 1976 کی فلم 'لیلیٰ مجنوں' موسیقار مدن موہن' آواز محمد رفیع' برباد محبت کی دعا ساتھ لئے جا / ٹوٹا ہوا اقرار وفا ساتھ

لئے جا سال 1965 کی فلم کاجل موسیقار روی آواز محمد رفیع 'یہ زلف اگر کھل کے بکھر جائے تو اچھا' اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا رفلم ہمراز موسیقار روی 'تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو میں یوں ہی مست نغمے لٹاتا رہوں ر وغیرہ۔

کیفی اعظمی اردو میں ترقی پسند تحریک کا ممتاز شاعر نے بھی اپنی ساری زندگی فلموں کیلئے وقف کر دی۔ فلم ہیر رانجھا کے لئے منظوم مکالمے لکھ کر اردو زبان کی شیرینی سے ہندی فلم کو مالا مال کیا ہے۔ سال 1983 کی فلم 'ارتھ' موسیقار کل دیپ سنگھ، آواز جگجیت سنگھ، اداکار اشبانا اعظمی راج کرن جھکی جھکی سی نظر بے قرار ہے کہ نہیں ر دبا دبا سا سہی دل میں پیار ہے کہ نہیں سال 1983 کی فلم 'ارتھ موسیقار کل دیپ سنگھ، آواز جگجیت سنگھ اداکار شبانا اعظمی 'راج کرن غزل تم اتنا جو مسکرا رہے ہو' کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو سال 1983 کی فلم 'ارتھ' موسیقار کل دیپ سنگھ ہیں آواز جگجیت سنگھ' اداکار شبانہ اعظمی 'راج کرن، یہ کلام غزل کے فارم نہ ہو کر بھی غزل کے انداز میں پیش کردہ ہے ملاحظہ فرمائے' کوئی یہ کیسے بتائے کہ وہ تنہا کیوں ہے'۔ وہ جو اپنا تھا وہی اور کسی کا کیوں ہے۔

قتیل شفائی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے مگر ہندی فلم انڈسٹری سے انکے تعلقات برابر بنے رہے فلم جگنو 1947 موسیقار فیروز نظامی آواز راداکار نور جہاں ر دلیپ کمار غزل جگر کی آگ سے اس دل کو جلتا دیکھتے جاؤ ر لوٹی جاتی ہے ارمانوں کی دنیا دیکھتے جاؤ ر 1993 فلم 'پھر تیری کہانی یاد آئی موسیقار انو ملک آواز پنکج اداس غزل دل دیتا ہے رو رو دہائی کسی سے کوئی پیار نہ کرے'

اسد بھوپالی نے ہندی فلم کے ہر بڑا ینکا ر موسیقار کے ساتھ کام کیا ہے تقریباً چار سو سے زائد فلموں کے لیے گیت اور غزلیں لکھی ہیں کئی فلم فیئر ایوارڈ سے نوازے گئے ہیں فلم آوارگی 1990 موسیقار انو ملک رغلام علی کی آواز میں غزل چمکتے چاند کو ٹوٹا ہوا تارہ بنا ڈالا ر میری آوارگی مجھ کو آوارہ بنا ڈالا۔ فلم 'پارس منی' 1963 موسیقار لکشمی کانت پیارے لال آواز لتا منگیشکر اور محمد رفیع، وہ جب یاد آئے بہت یاد آئے غمِ زندگی کے اندھیرے میں ہم نے چراغ محبت جلائے بجھائے۔ کیف بھوپالی کی فلمی غزلیں خاص طور پر فلم 'پاکیزہ' کے لیے مشہور ہیں' آج ہم اپنی دعاؤں کا اثر دیکھیں گے ر تیر نظر دیکھیں گے زخم جگر دیکھیں گے رچلو دلدار چلو چاند کے پار چلو ر آنسوں تو نہیں آنکھوں میں پہلو میں مگر دل جلتا ہے طلعت محمود کی آواز میں فلم دائرہ 1953۔ محمد خاں خمار بارہ بنکوی نے ہندی فلموں کو نغمے غزلیں اور گیتوں سے نوازا ہے۔ انکی غزل تصویر بنا تا ہوں تصویر نہیں بنتی ر اک خواب سا دیکھا ہے تعبیر نہیں بنتی فلم بارادری 1955 طلعت محمود کی آواز میں بیحد مقبول ہوئی فلم مہندی 1958 موسیقار روی اپنے کئے کوئی پشیمان ہو گیا رلو اور میری موت کا سامان ہو گیا فلم ہلچل 1951 آج میرے نصیب نے مجھ کو رلا دیا ر بیتے ہوئے دنوں کی یاد نے پھر مرا دل دکھا دیا رفلم شاہجہاں 1946 موسیقار نوشاد نے نسیم اختر کی آواز میں پیش کیا ہے برباد نہ کر دے کہیں بے درد زمانا رالله محبت کو تباہی سے بچانا۔ راجا مہدی علی خان فلم انپڑھ لتا منگیشکر ہے اسی میں پیار کی آبرو وہ جفا کرے میں وفا کروں رفلم نیلا آکاش موسیقار مدن موہن گلوکار محمد رفیع ر آخری گیت محبت کا سناؤں تو چلوں رمیں چلا جاؤں نگاہ و اشک بہا لوں تو چلوں رفلم آپکی پرچھائیاں 1964 اگر مجھ سے محبت ہے مجھے سب اپنے غم

دے دو۔ حسرت جے پوری کا کلام رکسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے رکہاں ہو تم کہ یہ دل بیقرار آج بھی ہے۔ فلم اعتبار 1985 گلوکار بھوپیندر آشا بھوسلے۔

گلزار متحدہ ہندوستان کی سرزمین ضلع پنجاب بمقام دینا، جھیلم سے اردو زبان کی سوغات ساتھ لئے بمبئی آئے گیت نغمے غزلیں مکالمے ہدایت کاری کے ذریعے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں سال 2003 کی فلم پنجار' موسیقار اوتم سنگھ، آواز جگجیت سنگھ' اداکار رمیلا مانتوڈ کر غزل' ہاتھ چھوٹے بھی تو رشتے نہیں چھوٹا کرتے' وقت کی شاخ سے لمحے نہیں ٹوٹا کرتے سال 1988 فلم' اجازت' موسیقار آرڈی برمن' آواز آشا بھونسلے، اداکار ریکھا نصیر الدین شاہ غزل' خالی ہاتھ شام آئی ہے' خالی ہاتھ جائیگی آج بھی نہ آیا کوئی خالی لوٹ جائیگی 1985 کی فلم 'غلامی' میں گلزار صاحب نے بانیِ اردو حضرت امیر خسرو کی غزل' زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں' سے ترغیب پاکر پہلا مصرعہ استعمال کیا ہے فلم کا نغمہ' زحال مسکین مکن بہ رنجش بہ حالِ ہجراں بیچارہ دل ہے' لوگوں کی رائے ہیکہ پچھلے دو تین دہائیوں میں یہ اپنے وقت کا اعلیٰ و بہترین نغمہ ہے۔ فلم موسم 1976 گلوکار بھوپیندر' دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہے تصورِ جاناں کئے ہوئے رر کے رکے سے قدم رک کے بار بار چلے رفلم خاموشی 1968 ہم نے دیکھا ہے ان آنکھوں میں مہکتی خوشبو گلوکار لتا منگیشکر ہیمنت کمار۔

راجیندر کرشن نے اردو پس منظر سے ہندی فلمی دنیا میں قدم رکھا' بیشمار خوبصورت غزلیں نغمیں لکھ کر ہندی فلموں کو ہر دلعزیز بنایا۔ 1958 فلم' عدالت' موسیقار مدن موہن آواز لتا منگیشکر اداکار نرگس غزل' ان کو یہ شکایت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے اپنی تو یہ عادت ہے کہ ہم کچھ نہیں کہتے ر1963 فلم' بھروسہ' موسیقار روی' آواز محمد رفیع اداکار گرودت' اس بھری دنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ ہوا رغیر تو غیر ہیں اپنوں کا سہارا نہ ہوا 1964 فلم'' میرا قصور کیا ہے موسیقار چترگپتا آواز محمد رفیع اداکار دھرمیندر' کانٹوں پہ چل کے پاؤں کے چھالوں سے کیا گلا' مانگی تھی خود ہی رات اجالے سے کیا گلا 1958 فلم' عدالت' موسیقار مدن موہن، آواز لتا منگیشکر اداکار نرگس ہدایت کار کالی داس غزل' یہ حسرتوں کے داغ محبت میں دھو لئے رخود دل سے دل کی بات کہی اور رو لئے 1964 فلم' آؤ پیار کریں' موسیقار اوشا کھنا آواز لتا منگیشکر اداکار سائرہ بانو غزل میری داستان مجھے ہی میرا حال سنا کے روئے رکبھی رو کے مسکرائے کبھی مسکرا کے روئے 1964 فلم' جہاں آرا موسیقار مدن موہن' آواز محمد رفیع اداکار بھارت بھوشن اور مالا سنہا، غزل' کسی کی یاد میں دنیا کو ہیں بھلائے ہوئے 1964 فلم' شہنشاہ موسیقار روی، آواز محمد رفیع اداکار راج شری غزل' نہ جھٹکو زلف سے پانی یہ موتی ٹوٹ جائیں گے رتمہارا کچھ نہ بگڑے گا مگر دل ٹوٹ جائیں گے 1967 فلم' روشنی موسیقار روی، آواز محمد رفیع، غزل' کس طرح جیتے ہیں یہ لوگ بتادو یارو' ہم کو بھی جینے کا انداز سکھادو یارو۔

گوپال داس نیرج ہندی کوی کہلائے جانے کے باوجود انکے اکثر گیتوں میں غزلیہ اشعار کی ترتیب اور خالص اردو فارسی کے الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے کیونکہ ان کا شعری سفر اردو کے مایہ ناز شعراء مجاز حفیظ' جگر' شکیل وغیرہ کے علاوہ کانپور لکھنو کی ادبی فضا کے ساتھ رہا ہے۔ 1964 فلم چاچا چا کی مقبول غزل' وہ ہم نہ تھے وہ تم نہ تھے

رہ گزر تھی پیار کی رُلتی جہاں پہ بے وجہ پالکی بہار کی' آواز محمد رفیع

آنند بخشی پاکستان سے ہجرت کر کے دہلی میں سکونت اختیار کر لی 1962 فلم مہندی لگی میرے ہاتھ کے نغموں سے کامیابی کے کئی زینے طے کئے اس کامیابی کی ضامن انکی زبان ہے۔ 1964 فلم 'ایکس ان بمبئی' موسیقار لکشمی کانت پیارے لال آواز کشور کمار، غزل 'میرے محبوب قیامت ہوگی' آج رسوا تیرے گلیوں میں محبت ہوگی بہاروں نے میرا چمن لوٹ کر خزاں کو یہ الزام کیوں دے دیا/ میں شاعر تو نہیں مگر اے حسیں/درد دل درد جگر دل میں جگایا آپ نے/پہلے تو میں شاعر تھا عاشق بنایا آپ نے/زندگی کے سفر میں گزر جاتے ہیں جو مقام وہ پھر نہیں آتے۔

انجان اور انکے فرزند سمیر یو پی ولکھنو کے اردو پس منظر سے ہیں انکے کلام میں اردو کا جادو چھایا ہے پیار زندگی ہے پیار بندگی ہے/وفا جو نہ کیجئے تو جفا بھی نہ کیجئے دل تو ہے دل دل کا اعتبار کیا کیجئے/زندگی تو بے وفا ہے ایک دن ٹھکرائیگی موت محبوبہ ہے اپنے ساتھ لے کر جائیگی' فلم مقدر کا سکندر 1978 کے نغمے بہت مشہور ہے فلم بہاریں پھر بھی آئیں گی 1966 محمد رفیع موسیقار او پی نیر' آپکے حسین رخ پہ آج نیا نور ہے/میرا دل مچل گیا تو میرا کیا قصور ہے۔ سمیر نے بھی اردو غزلیں لکھی ہیں فلم شکاری 2000 موسیقار آدیش سریواستو بہت خوبصورت غزل لکھ رہا ہوں/تمہیں دیکھ کر آج کل لکھ رہا ہوں فلم آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے 2003 ایسی آنکھیں نہیں دیکھی ایسا کاجل نہیں دیکھا/ایسا جلوہ نہیں دیکھا ایسا چہرہ نہیں دیکھا۔

نقش لائل پوری فلموں کو اردو غزل کی رنگینی سے نکھارا ہے فلم دل کی راہیں 1973 لتا منگیشکر موسیقار مدن موہن غزل رسم الفت نبھائیں تو نبھائیں کیسے/ہر طرف آگ ہے دامن کو بچائیں کیسے 1979 فلم خاندان لتا منگیشکر موسیقار خیام یہ ملاقات اک بہانہ ہے پیار کا سلسلہ پرانہ ہے فلم وہی بات 1977 لتا/آشا بھونسلے بھوپیندر/زہر دیتا ہے مجھے کوئی دوا دیتا ہے/جو بھی ملتا ہے میرے غم کو بڑھا دیتا ہے/زندگی ہم تیرے حال پہ مسکرا کے رویا کریں/مانا تیری نظر میں تیرا پیار ہم نہیں/فلم دلِ ناداں 1982 لتا منگیشکر کشور کمار/چاندنی رات میں اک بار تمہیں دیکھا ہے'

• اندیور نے ہندی عربی فارسی اردو کے الفاظ کا استعمال کر کے غزلیں لکھیں۔ فلم پریم گیت 1981 جگجیت سنگھ/ ہونٹوں سے چھو لو تم میرے گیت امر کر دو/فلم آخر کیوں 1985 موسیقار راجیش روشن لتا منگیشکر دشمن نہ کرے دوستنے وہ کام کیا ہے/عمر بھر کا غم ہمیں انعام دیا ہے۔ سدرشن فاکیری کا کلام 'زندگی میں جب تمہارے غم نہیں تھے/اتنے تنہا تھے کہ ہم بھی ہم نہیں تھے 1990 کی فلم 'آج' موسیقار جگجیت سنگھ ہیں گلوکار چترا سنگھ اور جگجیت سنگھ نے گایا ہے۔

مقبول عام شاعر و فلمی نغمہ نگار اور نثر نگار ندا فاضلی نے ہندی فلموں کو کچھ ایسی غزلوں سے نوازا ہے جن میں انسانی زندگی کے حوادث کا اظہار معنی خیز و پر اثر انداز میں ہوا ہے۔ 'کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا' کے لئے مشہور ہیں' سال 1999 کی فلم 'سرفروش' میں موسیقار جتین للت نے جگجیت سنگھ کی آواز میں پیش کیا ہے' ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے عشق کیجئے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے سال 1981 کی فلم 'آہستہ آہستہ' میں موسیقار خیام آشا بھونسلے کی

آواز میں بھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا رز میں ملی ہے مگر آسماں نہیں ملتا رجسے بھی دیکھئے وہ اپنے آپ میں گم ہے۔ ہندوستانی فلمسازوں نے حسب ضرورت پاکستانی فنکاروں سے بھی ہندی فلموں کے لیے خدمات لیتے رہے ہیں۔

مرحوم محسن نقوی کی غزل بھی ہندی فلم کی زینت بنی ہے۔ جبکہ دونوں ملکوں کی زبان ایک ہی ہے نام الگ الگ ہیں اس لیے کسی کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ یہ فنکار شاعر پاکستان کا ہے یا ہندوستان کا عوام بس محظوظ ہونے سے سرور کار رکھتی ہے سال 1984 کی فلم 'ماتھی مانگے خون' موسیقار آر ڈی برمن، آواز غلام علی' یہ دل پاگل دل مرا بجھ گیا آوارگی۔

'بشر نواز (اورنگ آبادی) اُردو کے ممتاز شاعر' ہجو گو' نقاد' ادیب اپنے شعری آہنگ سے پہچانے جانے والے نغمہ نگار ایک عرصے تک ہندی فلموں سے وابستہ رہے۔ فلم بازار 1982 کا نغمہ کروگے یاد تو ہر بات یاد آئے گی رگزرتے وقت کی ہر موج ٹھہر جائے گی' ہندی فلم کی بے حد مقبول عام غزل رہی ہے فلموں میں ان کی مقبولیت کے لئے یہی ایک غزل کافی ہے اس کے علاوہ فلم شنکر خان 1968 لوری 1985 تمہیں سے روشن ہے رات میری تمہیں سے ہر دن ہوا سویرا رُاٹھے جہاں بھی نظر تمہاری ہو زندگی کا وہیں سویرا۔ فلم جانِ وفا 1990 کی غزل آشا بھوسلے کی آواز میں "اب تو ہم ہیں اور یہ رسوائیاں رکون سمجھے درد کی گہرائیاں' ہم ہیں خیال یار ہے ہم کو جہاں سے کیا ر یہ رازِ عشق ہے اسے کہئے زبان سے کیا رگذرے ہیں راہِ عشق سے دیوانہ وار ہم راب اس مقام پر ہیں کہ لوٹنے وہاں سے کیا' وغیرہ نغمے لکھے۔ افتخار امام صدیقی اردو والوں کے روحِ رواں سیماب اکبر آبادی کے جانشیں' ماہنامہ شاعر کے مدیرِ اعلیٰ نے بھی 1983 میں ہندی فلم' ارتھ' کو ایک بہت ہی خوبصورت غزل عطا کی ہے موسیقار کلدیپ سنگھ اور گائیکی چترا سنگھ کی پیش کش 'تو نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا ر دور تک تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا ر درد کی ساری تہیں اور سارے گذرے حادثے ر سب دھواں ہو جائیں گے ایک واقعہ رہ جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی انکی اور چند غزلیں جو ہندی فلموں کی نذر ہو گئیں وہ ریلیز نہیں ہو سکیں۔

حسن کمال کو نکاح' آج کی آواز' طوائف' فلموں کی نغموں اور غزلوں کے لئے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ غزل بیتے ہوئے لمحوں کی کسک ساتھ تو ہوگی رخوابوں ہی میں ہو چاہے ملاقات تو ہوگی' فلم نکاح 1982 موسیقار روی گلوکار مہیندر کپور۔ فوق جامی نے فلم ساون کو آنے دو' 1979 کی ایک غزل لکھی تیری تصویر کو سینے سے لگا رکھا ہے رہم نے دنیا سے الگ گاؤں بسا رکھا ہے۔ گلوکار ایسو داس

جاوید اختر جاں نثار اختر اور زیرِ لب کی مصنفہ صفیہ اختر کے بیٹے ہیں جنکی کئی پشتوں سے اردو شعر و شاعری کا سلسلہ چلا آ رہا ہے مضطر خیر آبادی ان کے دادا اور مجاز لکھنوی سگے ماموں ہیں جاوید اختر کے پر دادا سید احمد حسین رسوا اور پر دادی کے والد علامہ فضل حق خیر آبادی اپنے عہد کے انتہائی معتبر عالم فلسفی منطقی اور شاعر تھے اسطرح جاوید اختر کو شاعری کا فن ورثہ میں ملا۔ ڈائرکٹر بننے کا خواب لئے 1879 تک کے مشکل سفر کو طے کرتے ہوئے پہلی بار ایک نغمہ لکھا "دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے" لیش چوپڑا کو یہ نغمہ بہت پسند آیا اور اپنے فلم کا نام 'سلسلہ' رکھ دیا یہ سلسلہ خوب چل پڑا اور جاوید اختر بے حد مقبول نغمہ نگار و غزل گو شاعر بن گئے انکی فلمی غزلیں نمونتاً پیشِ نظر ہیں۔ 1982

کی فلم' ساتھ ساتھ' موسیقار کلدیپ سنگھ، آواز جگجیت سنگھ، چترا سنگھ، کیوں زندگی کی راہ میں مجبور ہو گئے اتنے ہوئے قریب کہ ہم دور ہو گئے سال 1982 کی فلم' ساتھ ساتھ' موسیقار کلدیپ سنگھ، آواز جگجیت سنگھ،' پیار مجھ سے جو کیا تم نے تو کیا پاؤ گی رمیرے حالات کی آندھی میں بکھر جاؤ گی رتم کو دیکھا تو یہ خیال آیا زندگی دھوپ تم گھنا سایہ ریہ تو بتا دے مجھے زندگی پیار کی راہ کے ہمسفر کس طرح بن گئے اجنبی یہ بتا دے مجھے زندگی۔ شکیل اعظمی نے غزلیہ اشعار کو پچویشن کے مطابق نغموں میں ڈھال دیا ہے رفلم ضدی 1914 تو ملا تو خدا کا سہارا مل گیا رزندگی کا پتا دوبارہ مل گیا تم بھی تنہا تھے ہم بھی تنہا تھے مل کے رونے لگے راک جیسے تھے دونوں کے غم دوا ہونے لگے۔

ضمیر کاظمی کا نیا لب ولہجہ' انوکھا انداز ہندی فلموں کو خوش آئند اُمید دلاتا ہے' جو گرس پارک 2003 جگجیت سنگھ بڑی نازک ہے یہ منزل محبت کا سفر ہے ردھڑک آہستہ سے اے دل محبت کا سفر ہے

دراصل ابتدائی فلموں میں اُردو کلاسکی شعراء کے کلام اور منتخب غزلوں سے کام لیا کرتے تھے۔ پھر جب آزادی کے بعد ہندوستان میں نئی کیپ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئی تو ان میں بھی اکثر شاعروں نے اُردو کے کلاسکی شعراء کے کلام کی تقلید میں، ہم طرح غزلیں کہیں' کبھی اشعار کو منتخب کرلیا جاتا کبھی مطلع یا طرحی مصرعے کو تضمین کیا جاتا کبھی ردیف اور قافیہ یا مصرعے کے آدھے ٹکڑے کو گیتوں کا حصہ بنا دیا جاتا اسطرح تقلید میں ترقی ہوتے ہوتے اُردو کی بے شمار غزلیں ہندی فلمی گیت کا اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں اس کے علاوہ بیسویں صدی کے چند شعراء نے فلموں کے لیے اپنے طبع زاد تخلیقات کو پیش کیا ہے گذشتہ پچاس سالوں میں غزلیات کے موضوعات میں جو وسعت و گہرائی پیدا ہوئی اس کے اثرات سے فلمی غزل گو شعراء بچ نہ سکے صالح معاشرتی قدریں تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت اور موجودہ عصری مسائل و تقاضوں کو پیش کیا ہے۔ فلمی غزلوں میں اُردو زبان و بیان کے ذریعہ انسانی زندگی کے حوادث کا اظہار معنی خیز و پر اثر انداز میں ہوا ہے۔ ان غزل گو شعراء کا لہجہ اُردو غزل کی سی سادگی اور معصومیت ہے اور رویہ عوام پسند ہے انھوں نے اُردو غزلوں اور گیتوں میں ہندی اور انگریزی کے الفاظ کو اس طرح شامل کرلیا ہے کہ غزل کے خصوصیات کو زک نہیں پہنچا بلکہ اس کی نغمگی میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ فکری، موضوعاتی، لفظیاتی علاماتی، تشبیہاتی، استعاراتی اور غزل کی روایتی ہئیت میں حسب ضرورت تبدیلی کے ساتھ اور کبھی ایک مصرعے کے اضافے کے ساتھ بھی فلمی غزلیں لکھی گئی ہیں پابند غزل کے علاوہ آزاد غزل کا استعمال بھی ہوا ہے۔ اس سے اس کی غنائیت ،صوتی آہنگ' نغمگی اور تاثیر میں کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے۔ اُردو زبان دراصل عشق اور دوستی کی علامت ہے پیار و وفاداری کی ضمانت ہے دلوں کو موہ لینے والی اُردو کی زندہ صنف سخن غزل جو پہلے ہر شاعر کی دل پسند صنف بنی اور اس کی انہیں خوبیوں کے سبب اُردو کی آبرو بن گئی جو ہر دور میں ہر حال میں ہر کسی کی دل کی دھڑکن اور سوچ سمندر کی ترجمان بن گئی۔ اردو جاننے والے تو اس کے شیدائی ہیں ہی غیروں کو بھی اپنی طرف کشش کرتی رہی ہے اُردو غزل۔

....

صدر شعبہ اردو و فارسی (یو جی سی میجر ریسرچ پروجیکٹ) کرناٹک آرٹس کالج دھارواڑ۔ ۵۸۰۰۰۱

ایم نصر اللہ نصر

مجیر احمد آزاد کی افسانہ نگاری ''ٹھہری ہوئی صبح'' کے حصار میں

صغیر اشرف لکھتے ہیں:

''اردو افسانے نے اپنے آغاز ہی سے حیات انسانی کے مسائل اور عصری تقاضوں کو اپنے اظہار کا بھرپور وسیلہ بنایا ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس نے ابتدا تا انتہا فرد اور معاشرے کے درمیان پیدا ہونے والی متنوع صداقتوں اور سنگین حقیقتوں کی نقاب کشائی بڑی چابک دستی سے کی ہے۔ مختصر یہ کہ افسانہ کا ظہور ہی عصری مطالبات اور معاشرتی زندگی کے تناظر میں ہوا ہے۔ تمام افسانہ نگاروں نے خواہ وہ کسی دور سے متعلق ہوں افسانے کے اسی مزاج کو ملحوظ رکھا اور وقت کے بے رحم حقائق کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ بڑی حد تک جراحی بھی کی ہے۔'' (آجکل ستمبر 2015 ص:23)

مذکورہ بیان کی روشنی میں اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ افسانے کے تانے بانے کیسے ہونے چاہئے۔ افسانے کے موضوعات کیا ہوں۔ افسانے کے اجزائے ترکیبی کیسے ہونے چاہئے۔ موصوف کے بیان میں وہ ساری باتیں سمٹ کر آگئی ہیں جو ایک افسانہ نگار کے لیے لازمی ہیں۔ افسانہ نگاری کی پاسداری میں یہ سارے عوامل کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ افسانے کی کامیابی کی بنیاد انھیں باتوں پر ہو تو بیشک افسانہ متجسس، متفکر اور توجہ طلب ہوگا۔

مجیر احمد آزاد بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور انھوں نے مذکورہ باتوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانی مسائل اور عصری تقاضوں کا عکس نمایاں ہے۔ معاشرے کی سنگین حقیقتوں کی نقاب کشائی میں انھوں نے کہیں بھی بخالت سے کام نہیں لیا ہے اور نہ تنگ دامانی کے شکار ہوئے ہیں۔ افسانے کے موضوعات کے انتخاب میں عجلت سے کام بھی نہیں لیا ہے۔ نیز جس موضوع کو زیر بحث لایا ہے اس کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے۔ خصوصی طور پر دیہات کی منظر کشی میں اپنا خوب کمال دکھایا ہے۔ چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں کو وہ جس طرح لائم لائٹ میں ہیں وہ داد کے مستحق ہیں۔ مجیر احمد کا اصل نام محمد مجیر احمد آزاد ہے۔ تاریخ پیدائش ۷ر نومبر ۱۹۶۹ء ہے۔ جائے ولادت مدھوبنی (بہار) ہے اور تعلیم ایم. اے، بی. ایڈ، پی. ایچ. ڈی ہے، مشغلہ درس و تدریس۔

موصوف کی اب تک سات کتابیں (ذوم۔۲۰۰۴، اندھیرے کا کرب۔۲۰۱۰، جھکی ہوئی شاخ۔۲۰۱۳، ٹھہری ہوئی صبح۔۲۰۱۵، آؤ کہانی بنتے ہیں۔ بچوں کے لیے۔۲۰۱۵، مقالات طرزی۔۲۰۰۹، اور منظوم مقالے۔۲۰۱۰) منظر عام پر آچکی ہیں۔ دوردیس میں' کلاس ٹاپر' مدھوبنی۔ تاریخ و تعارف (تحقیق) اور متھلا میں اردو افسانہ۔ سمت و رفتار' منتظر اشاعت ہیں۔ موصوف کو کیفی اعظمی ایوارڈ اور پریم چند ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جاچکا ہے۔

مذکورہ کوائف کی روشنی میں موصوف کی ادبی حیثیت کو متعین کیا جاسکتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر اچھی بحث ہوسکتی ہے۔ ان کے اسلوب کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ ایک انصاف پسند ناقد یا محتسب جب بھی ان کی افسانہ نگاری پر قلم اٹھائے گا اسے مایوسی نہیں ہوگی۔ مجیر احمد آزاد نے اوراق بے داغ کو داغدار نہیں کیا ہے بلکہ عصری حقائق اور انسانی مسائل کا وہ نقشہ پیش کیا ہے جس کی حقیقت نگاری سے روگردانی ممکن نہیں۔

زیر مطالعہ افسانوی مجموعہ ''ٹھہری ہوئی صبح'' کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف کو افسانہ نگاری آتی ہے۔

وہ اس فن پر دسترس بھی رکھتے ہیں۔ پلاٹ کے انتخاب میں عجلت سے کام نہیں لیتے۔ دیر تک موضوع کو پہلے اپنے ذہن میں پکاتے ہیں پھر کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اگر وہ قابلِ اعتنا ہوتا ہے تو اس پر قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ افسانوی لوازمات سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ لطیف جنسی تلذذ کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ذہن کو گراں بھی نہیں گذرتا۔ فحاشی کا احساس بھی نہیں ہوتا مگر لطف کا عنبریں جھونکا قاری کو معطر کر کے چلا جاتا ہے۔ نیز وہ انسانی مسائل کو اجاگر کر کے تماشے کا منتظر نہیں بلکہ ان مسائل کا مناسب حل بھی تلاش کرتے ہیں۔ حالات حاضرہ کی عکس ریزی، جلتے مسائل، تلخیاں، محرومیاں، مجبوریاں، ناکامیاں، خوشی اور غم کی دھوپ چھاؤں، سیاست کی آنکھ مچولی اور بے بسی و کرب کی کڑوی سچائیوں کا جاننا ہو تو ان کے افسانوں کا مطالعہ لازمی ہے۔ دیمک زدہ تمناؤں اور زخم خوردہ جذبات کی عکاسی موصوف نے اپنی کہانیوں میں خوب کی ہے۔

ٹائٹل کہانی ''ٹھہری ہوئی صبح'' قاری کو ایک انوکھے تجربے سے سرشار کرتی ہے۔ عام طور پر دیکھا یہ جاتا ہے کہ گاؤں سے شہر جانے والے جب شہر میں خوشحال زندگی گذارنے لگتے ہیں، جگہ جائداد کے مالک ہو جاتے ہیں اور ان کا کاروبار چمک اٹھتا ہے تو اپنے گاؤں کی ملکیت فروخت کر کے شہر میں دائمی طور پر مقیم ہو جاتے ہیں۔ پھر انھیں گاؤں سے کوئی واسطہ نہیں رہتا ہے۔ کبیر الدین صاحب جب اپنے گاؤں آتے ہیں اور شاہو کار ان کی جائداد کا سودا کرنے ان کے پشتینی مکان پر آتے ہیں تو وہ ان کی نگاہیں بچپن کی یادوں میں کھو جاتی ہیں۔ وہ خود کو گاؤں کے کھیتوں میں دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ حویلی کی وسیع چہار دیواری میں کودتے پھاندتے محسوس کرتے ہیں۔ گاؤں کے پیڑ پودے اور بانسواڑیاں انھیں نم آنکھوں سے دیکھتی ہیں اور وہ بغیر سودا کیے صبح کو شہر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے کہ صبح ٹھہر گئی ہو۔ اس کہانی سے ایک سبق یہ ملتا ہے کہ انسان کو اپنے آبائی وطن کا سودا کبھی نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ [illegible] ایسا جن لوگوں نے کیا ہے ان کو بڑا تلخ تجربہ ہوا ہے۔ مہاجرت بھی سکون افزا نہیں رہی ہے۔

ا[illegible] ے میں [illegible] سولہ کہانیاں شامل ہیں۔ جس کی پہلی کہانی ''داستان گو'' ہے جو سخن زار (پاکستان) میں ۲۰۰۹ [illegible] شائع [illegible] ہی۔ اس کہانی میں سیاست کا رنگ گہرا ہے۔ پرانے زمانے میں دادا دادی، نانا نانی اور دوسرے بزرگ لوگ بچوں کو داستان سنایا کرتے تھے۔ جن میں استقلال و بہادری، نیکی و بدی کی باتیں اور شہزادہ و شہزادی کی کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ مگر آج کا یہ داستان گو آج کے سیاسی بازیگروں کی کہانیاں سناتا ہے اور نئی نسل کو ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ انھیں اپنے روشن مستقبل کی تعمیر کی صلاح دیتا ہے۔ جس میں دلچسپی کے سامان کم ہیں مگر حقیقت کا اظہار نمایاں ہے۔ داستان کی اس پیغام رسانی کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

انشاء (کولکاتا) کے مدیر اور معروف شاعر و ادیب ف۔س۔ اعجاز فرماتے ہیں:

> ''افسانہ نگاروں میں جہاں محض روایت کے تسلسل کو جاری رکھنے والے افسانہ [illegible] رہیں وہاں ایسے کہانی کار بھی موجود ہیں جو خود کو اس تنگ دائرے سے باہر نکال کر کھلی فضا میں لے آئے ہیں اور نئے افلاک کی سیر کے لیے تیار ہیں۔''
> (انشاء اکتوبر ۱۹۹۲)

اس قول کی روشنی میں جب ہم مجیر احمد آزاد کے افسانوں کا محاسبہ کرتے ہیں تو انکے یہاں ایسے نقوش جا بجا نظر آتے ہیں۔ وہ بھی روایتی تسلسل کے حصار کو توڑ کر باہر نکلنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں۔ کھلے آسمان کی سیر کی انھیں بھی شدت سے طلب ہے۔

ان کا تیسرا افسانہ ''ہم سائیگی'' ہے۔ جس میں اس نکتے کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ خود کو اعلیٰ طبقہ' تہذیب یافتہ' دولتمند اور ترقی یافتہ سمجھنے والے پڑوسی کبھی مصیبت میں کام نہیں آتے۔ وہ سکھ کے ساتھی ہو سکتے ہیں مگر دکھ میں ان کا سایہ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ دور سے تماشہ ضرور دیکھ سکتے ہیں مگر مدد کو کبھی ہاتھ نہیں بڑھا سکتے۔ ایسے ۔بتعوں پر غریب' نادار' غیر مہذب اور وہی لوگ کام آتے ہیں جن کو یہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ نعمت علی بھی گاؤں کے ایسے ہی دولتمند' ترقی یافتہ اور خود کو اوروں سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھنے والے رئیس ہیں۔ رئیسوں کے محلے میں ان کی رہائش گاہ بھی ہے۔ لڑکے لڑکیاں جدید تہذیب کی پروردہ ہیں۔ امیر گھرانوں کے لڑکوں سے لڑکیوں کی دوستی' ان کے ساتھ دھینگا مستی گھر کے بزرگوں کو ذرا بھی ناگوار نہیں گزرتا۔ وہ اسے نئی تہذیب کا نام دیتے ہیں۔ مگر ،ہی بچے جب ایک روز نعمت علی کی بیٹی کو ان کے گھر سے اٹھا کر لے جاتے ہیں تو یہ رئیس لوگ اپنی اپنی چھتوں سے تماشہ دیکھتے ہیں۔ کوئی مدد کو نہیں آتا۔ جب گاؤں کے غیر مہذب لوگ اس حادثے کو دیکھتے ہیں تو ان کی مدد کو دوڑ پڑتے ہیں اور سب کو مار بھگاتے ہیں اس طرح ایک رئیس زادی کی وہ عصمت کو تار تار ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ بعد ازاں جب ان کے رئیس پڑوسی نعمت علی کے دروازے پر خیریت پوچھنے آتے ہیں تو ان کی اہلیہ یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر لیتی ہیں کہ تم لوگ نہیں بلکہ یہی غریب اور غیر مہذب گاؤں کے لوگ ہمارے سچے ہمسائے ہیں۔

مجیر احمد کی دیگر کہانیوں میں دہشت گردی' پولس کا ظلم' سیاسی لیڈروں کا تظلم' غنڈوں کا راج' انتخابی بدعنوانی' عورتوں کا استحصال' جنسی تلذذ' بے وفائی اور ریاکاری جیسے مسائل پر اچھی گفتگو سلیقے سے کی گئی ہے۔ اس کے پیش نظر ف۔ س۔ اعجاز لکھتے ہیں:

> ''بیشتر کہانیوں کا محور آجکل دہشت گردی' آتنک واد' پولس کے مظالم' سیاسی لیڈروں کی وعدہ خلافی' الیکشن کرپشن' مرد اور عورت کی جنسی بے وفائی یا زناکاری تک ہی محدود ہے۔ یہ تمام ریڈی میڈ موضوعات ہیں اردو میں سیکڑوں کہانیوں کا جنم ہونے کے باوجود کہانیوں کا قحط برقرار ہے۔''
>
> (انشاء گفتنی نمبر)

موصوف کے خیال سے انحراف واقعی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ تھوڑی بہت ترمیم و اضافے کے ساتھ قاری کو ایک ہی طرح کی کہانیاں پڑھنے کو مل جاتی ہیں جس سے قاری کی دلچسپی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ وہی گھسی پٹی کہانیاں' وہی امرا کا غریبوں پر ظلم' وہی کسانوں کا استحصال' عصمت کی پامالی' فریب دغابازی' غنڈہ گردی' سیاست کا گھناؤنا کھیل وغیرہ وغیرہ۔ مگر مجیر احمد نے ان سب سے دامن بچانے کی پوری کوشش کی ہے۔ باتیں وہی ہیں مگر نئے انداز میں۔ یعنی پرانی شراب نئی بوتل میں۔ جس سے قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا ذہن ان کے افسانوں کا اثر ضرور قبول کرے گا۔ بشرطیکہ وہ انھیں انہماک کے ساتھ پڑھیں۔ مجیر احمد آزاد کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں۔ ان میں یکسانیت ہونے کے باوجود انفرادیت ہے۔ اسلوب عمدہ ہے۔ انداز بیان بھی خوب ہے۔ بیشک ان کا بیانیہ انداز دل کو بھاتا ہے۔ ان کے یہاں جدت کاری اور ندرت بیانی بھی موجود ہے۔ آپ ان کے افسانوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو تضیع اوقات کا احساس بالکل نہیں ہوگا۔ اللہ کرے رخش قلم اور زیادہ۔

****

Mob. : 9339976034 E-mail : nasrullah786nasr@gmail.com

ڈاکٹر سرور کریم

دربھنگہ کا ادبی منظرنامہ (بیسویں صدی کے حوالے سے)

(قسط سوم)

ڈاکٹر محمد ظفیر الدین (پ: ۱۹۲۷ء)

ڈاکٹر محمد ظفیر الدین دربھنگہ کے ایک معزز خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد الحاج نبی اختر، مہدولی شہر کے اہم روسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ وہ ایک عرصے تک میونسپل کمشنر بھی رہے اور مختلف سیاسی اور فلاحی اداروں سے وابستہ رہے۔ جدید تعلیم کی جانب ان کی خاص توجہ تھی اور انہوں نے اپنے تینوں فرزندوں ڈاکٹر محمد ظفیر الدین (حال مقیم امریکہ)، محمد سالم (انجینئر، حال مقیم امریکہ) اور محمد صالح (انجینئر، سکریٹری امارت مجیبیہ ٹیکنیکل انسٹی چیوٹ، مہدولی) کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں دربھنگہ کے فعال نوجوان ادیبوں میں آپ کا شمار رہا ہے۔ عہد طالبعلمی سے ہی اردو ادب سے آپ کا گہرا لگاؤ رہا۔ سی ایم کالج، دربھنگہ کی ادبی انجمن کے جوائنٹ سکریٹری بھی رہے۔ دربھنگہ سے نکلنے والے رسالے ''صبح زندگی'' میں آپ کے مقالے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ادب سے اپنی وابستگی اور لگاؤ کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اسکول و کالج کے طالب علمی کے دور میں میرا اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ حسن امام درد، مظہر امام اور سید منظر امام کے دولت کدہ ''امیر منزل'' میں ہم لوگوں کی اکثر ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ سی ایم کالج میں ۱۹۴۵-۴۷ء کے دوران کالج کے اردو ادب کی انجمن کا میں جوائنٹ سکریٹری تھا۔ اس وقت شاداں فاروقی صاحب بھی طالب علم تھے اور علی اشرف مرحوم بھی تھے۔ دربھنگہ سے ہاشم مرحوم نے ایک اردو پرچہ ''صبح زندگی'' نکالا تھا اس کے متعدد شمارے شائع ہوئے تھے۔ جن میں میرے متعدد مقالے چھپے تھے۔ میڈیکل کالج میں داخل ہونے کے بعد اردو ادب سے پہلے جیسا تعلق نہیں رہا۔ امریکہ آنے کے بعد قرآنی ادب'' سے وابستہ ہو گیا ہوں۔ پھر بھی اردو سے لگاؤ باقی ہے اور کبھی اقبال کے اشعار، اردو غزلیں اور نعتیہ کلام سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہوں۔'' (''راہ و رسم'' تمثیل نو جون ۲۰۰۲ء ص: ۸۹-۹۰)

دربھنگہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میڈیکل سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ انگلینڈ تشریف لے گئے بعد ازاں، آپ نے امریکہ میں سکونت اختیار کر کے اسے اپنا وطن ثانی بنا لیا۔ امریکہ میں میڈیکل کے شعبے سے وابستگی اور اس کی مصروفیات کے باوجود ادب سے آپ کا لگاؤ برقرار رہا۔ امریکہ میں قیام کے دوران ڈاکٹر محمد ظفیر الدین کی طبیعت مذہبی ادبیات کی جانب مائل ہو گئی ہے۔ انگریزی میں اسلامیات پر آپ کی متعدد تصنیفات و تالیفات معرض وجود میں آئی ہیں۔ لیکن اردو ادب سے ان کا رشتہ ہنوز استوار ہے۔ اردو کے رسائل و جرائد نہ صرف آپ کے مطالعے میں شامل رہتے ہیں بلکہ ان کے مشمولات پر آپ کی آرا بھی سامنے آتی رہتی ہیں جن سے نہ صرف آپ کی ادب سے گہری وابستگی اور تخلیقی و تنقیدی شعور کا اظہار ہوتا ہے بلکہ آپ کی شخصیت، مزاج، افکار و اقدار اور نصب العین بھی روشن ہوتا ہے:

''آپ کا اداریہ 'مجھے کچھ کہنا ہے' بہت پسند آیا۔ اداریہ کی سرخی میں بھی ایک خاص جدت اور اچھوتا پن ہے۔ ہندوستان میں اردو زبان کی اہمیت کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں اس سے بالکل متفق ہوں۔ ہمارے دینی لٹریچر کا بہت بڑا حصہ اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لئے کوشاں رہیں ورنہ وہ اپنے دینی روایات سے دستبردار ہو جائیں گے۔ 'تمثیل نو' کے ذریعہ صحت مند اردو ادب کے فروغ کی نہایت ضرورت ہے۔ تمثیل نو کے اکثر مضامین معیاری اور بہت اچھے ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی قابل تعریف ہیں۔ عزیزی محمد سالم سلمہٗ کا مقالہ ''نئی سمت اور نئے تقاضے'' پسند آیا۔ اللہ کرے کہ وہ اردو ادب میں دائمی اقدار کے علمبردار بن کر دوسرے ادیبوں کی ہمت افزائی کریں گرچہ ہماری یہ زندگی فانی ہے مگر ہم اپنے لافانی عقیدے اور اعمال کے ذریعہ اس زندگی کو جاودانی بخش سکتے ہیں۔ پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی صاحب کی تصنیف ''رفتگاں و قائماں جو دربھنگہ کی منظوم ادبی تاریخ ہے قابل تعریف ہے۔ ان کے کلام میں بہتے ہوئے پانی کے چشمے جیسی روانی ہے ساتھ ساتھ سادگی اور بلا کی اثر انگیزی بھی ہے۔ اس پر مزید قائماں اور رفتگاں شخصیتوں کے متعلق طرزی صاحب نے اچھا خاصا مختصر معلومات کا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔''

(''راہ و رسم''، تمثیل نو، جلد: ۱ شمارہ: ۵ اپریل تا جون ۲۰۰۲ء ص: ۹۰)

مجاز نوری (پ: ۱۷ر نومبر ۱۹۳۰ء و: ۲۷ر اپریل ۲۰۰۷ء)

انوار احمد نوری ادبی حلقے میں مجاز نوری کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ شعر و شاعری اور صحافتی امور سے شغف تھا۔ کئی رسالوں کی ادارت کی ذمہ داری نبھائی جس میں ''ادب'' دربھنگہ اور ''تحفہ ادب'' دربھنگہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فن شاعری پر اچھی پکڑ تھی۔ مہر شکروی کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''مرکز نگاہ'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ ان کے چند اشعار درج ہیں:

شام کا وقت قیامت تھا گذرتا کیسے — بات اک عمر کی تھی شوق نہ مرتا کیسے
وہ تو کہئے کہ نقاب رخ جاناں تھی نظر — راہِ دشوار سے دیوانہ گذرتا کیسے

محمد سالم (پ: ۶ر اپریل ۱۹۳۳ء)

دربھنگہ کی ادبی محفلوں کو بارونق بنانے والوں میں ایک نمایاں ترین نام محمد سالم کا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں حسن امام درد، منظر شہاب اور مظہر امام کی سرپرستی میں جن جواں سال ادیبوں نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے دربھنگہ کی ادبی فضا کو خاصا متحرک بنا دیا تھا، ان میں محمد سالم بھی شامل تھے۔ جس زمانے میں دربھنگہ میں مولانا عبدالعلیم آسی اور حسن امام درد کی سعی سے ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کا قیام عمل میں آیا، اسی عہد میں دربھنگہ کے چند نوخیز ادیبوں نے اسی طرز پر ایک انجمن ''نوعمر مصنفین'' کی داغ بیل ڈالی جس کے صدر محمد سالم اور سکریٹری سید منظر امام مقرر ہوئے۔ سید منظر امام نے اپنی خودنوشت ''یہ سرگزشت ہی ہے'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ محمد سالم دربھنگہ کے کئی ادبی اداروں کے روح رواں بھی رہے۔ انہوں نے ''فرینڈ سرکل'' کے تحت دو ادبی جلسوں ''بزم شین مظفر

پوری'' اور ''شامِ مظہر امام'' کا انعقاد کیا تھا۔

محمد سالم نے اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کا ایک افسانہ ''لنی بٹیا'' ۱۹۵۷ء میں ماہنامہ ''سہیل'' گیا میں شائع ہو کر کافی مقبول ہوا۔ ان کا ایک اور افسانہ ''دل زخمی ہے'' بھی ان کے اہم افسانوں میں شامل ہے جس کی اشاعت ''توازن'' مالیگاؤں میں ہوئی۔ ۱۹۶۲ء تک محمد سالم نے افسانہ نگاری کی۔ پھر اچانک ان کی دلچسپی ادبی تخلیق سے ہٹ کر مذہبیات کی جانب مائل ہو گئی اور وہ تبلیغی جماعت سے منسلک ہو گئے۔ اپنی اس ذہنی رو کے سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں:

> ''....۱۹۶۲ء میں میری زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ میں تبلیغی کاموں سے منسلک ہو گیا اور پھر میری مصروفیت اس قدر بڑھی کہ ادب سے میرا تعلق برائے نام رہ گیا۔ ساتھ ہی میرا تخلیقی کام بھی گویا بند ہو گیا مگر چھ سال بعد جب چند گھریلو وجوہ کی بنا پر ملازمت سے استعفیٰ دے کر میں دربھنگہ چلا آیا تو اچانک میں اپنے اندر تبدیلی محسوس کرنے لگا اور میرے اندر کا سوتا ہوا فنکار جاگ اُٹھا پھر مجھے ایسا لگا کہ میرے دل و دماغ کے اندر تخلیق کے سوتے پھوٹ رہے ہیں مگر افسانہ لکھنے کے بجائے شعر کہنے لگا۔ اس طرح میں ادبی دنیا میں ایک طویل مدت کے بعد پھر لوٹ آیا۔'' (''دوراں: غمزدوں کا شاعر'' مشمولہ ''زاویۂ خیال'' مصنف: محمد سالم ص:۱۹۱)

اس طرح افسانہ نگار محمد سالم کی شاعری کا سفر شروع ہوا۔ شاعری کی مختلف اصناف غزل، نظم، آزاد غزل میں آپ نے طبع آزمائی کی اور ایک اہم جدید شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ آپ کے دو شعری مجموعے ''صبائے سنگ'' (۱۹۸۸ء) اور ''درد کا سفر'' (۲۰۰۳ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے انہیں زندگی کا تحرک، طاقت اور تازگی رکھنے والا شاعر قرار دیا ہے۔ ۸۸؎ اور نظام صدیقی لکھتے ہیں:

> ''محمد سالم کے غزلیہ اور نظمیہ آئینہ خانہ میں بیک وقت ''خود بینی'' اور ''جہاں بینی'' کی ہمہ پہلوی بڑی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ کارفرما ہے۔ وہ خارجی تجربات، مشاہدات اور واردات کو بڑے خلوص اور گہرائی سے ذاتی تجربہ میں کشید کر کے منکشف کرتے ہیں۔''
> (''محمد سالم کی نئی غزلیہ تخلیقیت کے مختلف زاویے'' مشمولہ ایضاً ایضاً ص:۱۹)

محمد سالم کے کلام سے کچھ مثالیں پیش ہیں:

رات بہت اس چاہ میں جاگے شاید کوئی آئے گا
صبح کے تارے ڈوب گئے تو شوق بھی ڈوبا کمرے میں

یوں بیٹھا ہوں آس لگائے جانے کتنی صدیوں سے
جیسے کوئی آئے گا پھر تنہا میرے کمرے میں

شکستِ برگ سے آواز درد نکلی تھی
صبائے سنگ جو شاخوں کو چھو کے گذری تھی

محمد سالم نے شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید پر بھی اپنی گرفت کا ثبوت دیا ہے۔ ''زاویۂ خیال'' (۱۹۸۵ء)، ''شمس الرحمٰن فاروقی: شعر، غیر شعر اور نثر کی روشنی میں'' (۱۹۹۴ء)، ''نئی سمت نئے تقاضے'' (۲۰۰۲ء)، ''بہارِ نو بہار: رفعت سروش، تجزیاتی مطالعہ'' (۲۰۰۷ء) ان کی تنقیدی تصنیفات ہیں۔ محمد سالم کے ان تنقیدی مجموعوں میں کئی بیحد اہم مضامین شامل ہیں۔ خصوصاً جدید شاعری کے تعلق سے ان مضامین میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے

اس سے نہ صرف جدید شاعری پر ان کی بھر پور گرفت کا اندزہ ہوتا ہے بلکہ ان کی تنقیدی بصیرت بھی نمایاں ہوئی ہے۔

امریکہ نقل مکانی کے بعد محمد سالم کے تخلیقی جہان کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ یہاں انہوں نے انگریزی زبان کو بھی اپنے تخلیقی اظہار کے وسیلے کے طور پر اپنا لیا۔ ان کی انگریزی نظموں کا ایک مجموعہ ''دی لوسٹ ڈریمس'' (۲۰۰۵ء) شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تخلیقی اظہار کا ایک اور نیا زاویہ ترجمہ کے حوالے سے سامنے آیا ہے۔ محمد سالم نے اردو شعرا کی تخلیقات کے انگریزی ترجمے کا ایک سلسلہ شروع کیا جو مختلف ورسائل وجرائد میں شائع ہوتا رہا ہے اور اب انہوں نے اسے ''فرام دی ونڈو آف دی ایسٹ'' کے عنوان سے ۲۰۱۳ء میں شائع کر دیا ہے۔ اس طرح محمد سالم اردو کے مراکز سے دور رہ کر بھی اردو کے آفاق کو وسیع کرنے کی بین اللسانی خدمات کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

محمد سالم کے فکر وفن کا اعتراف ''شاعر'' ممبئی، ''توازن'' مالیگاؤں اور ''وقت'' دھنباد جیسے رسالوں نے ان پر خصوصی گوشہ نکال کر کیا ہے۔ معاصر نقادوں نے محمد سالم کی ادبی قدر وقیمت کا اعتراف اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ محترمہ شاہینہ امام نے محمد سالم کے فکر وفن کو جامعاتی تحقیق کا موضوع بنایا اور ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ سے ڈاکٹر امام اعظم کے زیر نگرانی پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

ظہیر ناشاد دربھنگوی (پ:۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۳ء و:۲۴ر نومبر ۲۰۰۷ء)

ضلع دربھنگہ کے کیوٹی بلاک میں واقع موضع سرجاپور میں ظہیر ناشاد کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں میٹرک کیا۔ تلاشِ روزگار کے سلسلہ میں ۱۹۵۵ء میں کلکتہ آئے۔ کلکتہ ڈوک لیبر بورڈ سے وابستہ ہوئے۔ ورکرس یونین میں سرگرم رول ادا کیا۔ ترقی مناصب کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے چیف فورمین کے عہدہ سے ۱۹۹۲ء میں سبک دوش ہو کر وطن لوٹے۔ دورانِ ملازمت حصولِ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے شعبۂ اردو سے پروفیسر محمد مطیع الرحمٰن کے زیرِ نگرانی بحیثیت اولین اسکالر دربھنگہ میں اردو کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء سے شعری کاوشیں اور افسانے اور ۱۹۶۳ء سے تنقید وتحقیقی مضامین رسائل وجرائد میں آنے لگے تھے۔ ان کے سو سے زائد مضامین ملک کے موقر رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں کیوں کہ ان کا قلم کلکتہ کے علاوہ ماقبل اور ہم عصر عام اور سلگتے متنوع موضوعات کو محیط رہا۔ ان کے فکر وقلم کی جولانیاں اہل نقد ونظر سے داد حاصل کرتی رہیں۔ ساتویں دہائی سے آخری بیسویں صدی تک کلکتہ کی ادبی کہکشاں میں درخشاں ستارہ بن کر رہے۔ اس درمیان کلکتہ کا کوئی ادبی تذکرہ ان کے ذکر سے خالی نہیں ہے اور دربھنگہ میں اردو کے حوالے سے بھی ان کی ناقابل فراموش خدمات رہی ہے۔ ان کی تصانیف دربھنگہ میں اردو اور شعری مجموعہ ''آوازِ خوں چکاں'' بہار اردو اکیڈمی نیز تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نقوشِ افکار'' اور کلکتہ کا ادبی تذکرہ ''غلاف روشنائی'' مغربی بنگال اردو اکیڈمی کی انعام یافتہ ہیں۔

۱۹۹۳ء میں حج کیا۔ بعد ازاں دو مسترینے شعری اور تنقیدی مجموعہ کی اشاعت کی تیاری میں لگ گئے تھے کہ ۲۰۰۱ء میں سرجاپور پنچایت کو الگ بنانے کی لڑائی برسوں انھوں نے ہائی کورٹ تک لڑی۔ اس پنچایت کے پہلے مکھیا بننے پر عوام الناس نے مجبور کر دیا۔ پنچایتی سرگرمیوں نے ادبی کام کو ٹھنڈے بستے میں ڈلوا دیا۔ مکھیا کی میعاد ختم ہونے کے بعد ادبی مہموں کے ترتیبی مرحلے کی طرف رجوع ہوئے تو پروانۂ اجل آگیا۔ ان کی ادبی خدمات کی کائنات

باقاعدہ تحقیقی مقالے کا متقاضی ہے مگر اب تک یہ تقاضہ کسی کی راہ ہی دیکھ رہا ہے اس لیے انھیں کہنا پڑا تھا کہ :

نسلِ نو! آج مجھے اتنی حقارت سے نہ دیکھ　　　　ورد کرتا تھا زمانہ بھی میرا نام کبھی

ذکی احمد (پ:۳ر مارچ ۱۹۳۵ء)

سیّد محمد ذکی احمد کا تعلق چندن پٹی، دربھنگہ سے ہے۔ آپ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ادب اطفال پر آپ کی خاص توجہ رہی۔ بچوں کے لئے آپ نے بہت سی نظمیں تخلیق کیں جن کے دو مجموعے ''جھولا'' (۱۹۹۲ء) اور ''میٹھے گیت'' (۲۰۰۷ء) شائع ہوئے۔ ''سیل رواں'' آپ کا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ ان پر محمد سمیع نے ڈاکٹر خالد سجاد کی نگرانی میں مقالہ برائے پی ایچ ڈی ایل این متھلا یونیورسٹی میں جمع کیا ہے۔ ذکی احمد نے ایک منظوم آپ بیتی ''اپنا مرثیہ'' کے عنوان سے لکھی جس کی اشاعت ۲۰۰۲ء میں ہوئی۔ ان پر لکھے گئے مضامین کو ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق (صدر شعبۂ اردو، ویمنس کالج، حاجی پور) نے ذکی احمد: شخصیت اور شاعری کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا ہے۔

سیّد ضیاء الرحمٰن (پ:۲۱ر جون ۱۹۳۵ء و:۵ر اپریل ۲۰۱۴ء)

ڈاکٹر سیّد ضیاء الرحمٰن شعبہ اردو، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ سے منسلک رہے ہیں۔ آپ اس شعبے کے سربراہ کے علاوہ یونیورسٹی کے کئی اہم عہدوں مثلاً رجسٹرار، سی سی ڈی سی وغیرہ پر فائز رہے اور اپنی انتظامی صلاحیتوں کو ثابت کیا ہے۔ آپ کا وطن بلاس پور، حیا گھاٹ دربھنگہ ہے۔ آپ کی ملازمت کا آغاز گوپال گنج کالج ،گوپال گنج سے ہوتا ہے جہاں ۱۹۶۰ء میں آپ کی عارضی تقرری بحیثیت اردو لکچرر عمل میں آئی۔ پھر ۲ر جنوری ۱۹۶۵ء کو سمستی پور کالج، سمستی پور سے وابستہ ہوئے۔ اسی کالج سے آپ کا تبادلہ شعبہ اردو، پی جی ڈپارٹمنٹ، للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں ۱۴ر نومبر ۱۹۸۲ء کو بحیثیت ریڈر ہوا۔ آپ کی دلچسپی کا میدان فن تنقید ہے۔ عصری تنقید پر آپ کی گرفت مضبوط ہے۔ آپ کی تصنیفات میں ''کہانی'' اور ''ساحر لدھیانوی: حیات اور شاعری'' قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ادب وشعر سے شغف غائر رکھتے ہیں۔ بحیثیت شاعر انہوں نے خود کو پوشیدہ رکھا ہے۔ فطرتاً خود کو نام ونمود سے بہت دور رکھنے والوں میں ہیں۔ اس کے باوجود ان کی ایک نظم ہم لوگوں کی نظر سے گذری ہے۔ یہ نظم فنی حیثیت سے اس قدر مکمل ہے کہ یہی ایک نظم ان کو کامیاب شاعر کہلوانے کے لئے کافی ہے۔''　　(''رفتگاں وقائماں'' ص:۲۷۲)

جنونِ شوق تو اے باغباں! کب کا گنوا بیٹھے　　　عروسِ گل بہ اندازِ دگر آئی تو کیا آئی

ہزاروں تیرہ وتاریک راتوں کا کفن اوڑھے　　　چمن میں صبحِ آزادی اگر آئی تو کیا آئی

مرتضیٰ اظہر رضوی (پ:۲۴ر ستمبر ۱۹۳۵ء و:۱۸ر جولائی ۱۹۹۴ء)

دربھنگہ کی علمی وادبی شخصیتوں میں مرتضیٰ اظہر رضوی کا نام کئی جہتوں سے خاص امتیاز کا حامل ہے۔ آپ قادر الکلام شاعر، بحر العلوم، بلند پایہ انشا پرداز اور محقق تھے۔ علم وادب کا مستعلقیتی ذوق انہیں اپنے والد ماجد پروفیسر اجتبیٰ رضوی سے وراثت میں ملا تھا۔ آپ کا مسکن علم وادب کا ایک روشن مرکز تھا جہاں سے دربھنگہ کے تشنگان علم وادب

ہمہ وقت فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ آپ ایک وسیع المشرب شخصیت تھے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت اور مسلک ان کی محبتیں اور شفقتیں جاری و ساری رہیں۔ آپ کے فکر و فن میں بھی اپنے والد کی طرح فلسفے کو کلیدی حیثیت حاصل رہی۔ آپ ملت کالج، دربھنگہ میں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فلسفہ بھی علوم و فنون کا منبع و مخزن ہے۔ فلسفے کے علاوہ آپ جملہ سائنسی علوم، معاشرتی علوم اور اردو ادب پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں بھی شعبے کے افراد استفادے کے لئے رجوع کرتے تھے۔ ثمردار شجر تھے، اسی مناسبت سے طبیعت میں بے نیازی تھی۔ برجستہ کلامی بے پناہ تھی۔ اکثر و بیشتر شاعری کا نزول ہوتا اور وہاں موجود کسی نہ کسی شخص کو ان کا کلام عطا کر دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قادر الکلامی کے باوجود ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا۔ آخر عمر میں جب موذی مرض میں مبتلا ہو کر انہوں نے قوت گویائی کھو دی تھی، اس زمانے میں اپنے تخلیقی اظہار کے لئے خیالات کو تحریری شکل میں لانا ان کی مجبوری بن گئی تھی۔ اسی عہد کا کچھ کلام ان کے صاحبزادے تاج نے مجتمع کر کے ''نوائے سکوت'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔

قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ (پ: ۱۹۳۶ء و: ۴ر اپریل ۲۰۰۲ء)

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کا شمار عالم اسلام کے نامور علماء میں ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں آپ کی گرانمایہ علمی خدمات سے دربھنگہ کا نام عالم اسلام کے منظر نامے پر روشن ہوا ہے۔ آپ دنیا میں فقہ کے ممتاز ماہرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ نے فقہ کے موضوع پر کئی وقیع کام انجام دئے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی فرقہ بندی اور انتشار کو مٹانے کے لئے آپ ہمیشہ کوشاں رہے۔ ہندوستان میں امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ کے فروغ میں آپ کا کردار کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ دار القضا کے توسط سے مسلمانوں کے خانگی تفرقوں کو کم کرنے میں آپ کی کوششیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ اپنے وسیع مطالعے اور منطقی نظریات کے باعث آپ ہر حلقے میں مقبول رہے۔ مذہبی مسائل پر آپ کے افکار کو استناد کا درجہ حاصل تھا۔ ملک میں فقہ اکیڈمی کا قیام آپ کی سعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اس اکیڈمی کا ترجمان رسالہ ''بحث و نظر'' کا بھی اجرا کیا جس کے مشمولات فقہی امور میں مسلمانوں کی رہنمائی میں معاون ہوئے ہیں۔ آپ کے تبحر علمی کے پیش نظر قومی اور بین الاقوامی سطح پر متعدد معزز مناصب کیلئے آپ کا انتخاب ہوا۔ آپ نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار اڑیسہ و جھارکھنڈ، قاضی القضاۃ امارت شرعیہ، صدر وفاق المدارس اسلامیہ، بانی و صدر المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء، رکن اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ، اکسپرٹ ممبر انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ، رکن مجمع العلمی العالی دمشق، رکن اعزازی الہیئۃ الخیریۃ الاسلامیۃ العالمیۃ کویت، سکریٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل اور صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسے معزز مناصب پر فائز رہے۔

قاضی صاحب اردو ادب کا بہت ہی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اپنی بے پناہ مشغولیتوں کے باوجود ادبی فن پاروں کا مطالعہ آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ کسی اچھی کتاب کے مطالعے کے بعد اس پر اپنی ایک واضح رائے بھی قائم کیا کرتے تھے لیکن آپ کی منصبی ذمہ داریوں نے ادبی تحریروں کی تخلیق کا موقع نہیں دیا جبکہ آپ بہترین نثر لکھنے پر قدرت رکھتے تھے جس کا اندازہ آپ کی علمی و مذہبی تصانیف...... اسلامی عدالت (اردو، عربی)، مباحث فقہ، مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ، خطبات بنگلور، موسوعہ فقہ کا اردو ترجمہ، فتاویٰ امارت شرعیہ (جلد اول دوم)، الوقف، (عربی)، فقہ المشکلات (عربی)، کتاب العشر والزکوٰۃ (عربی)، الذبائح (عربی)، دراسات فقیہ، دراسات علمیہ، بحوث فقیہ (بھی عربی میں)، میڈیکل

ایشوز (انگریزی)، ضرورت وحاجات، اشتراط فی النکاح، طبی اخلاقیات، اوقاف اردو، حج وعمرہ، جدید تجارتی شکلیں، ولایت نکاح، بحث ونظر، بعنوان القضاء وعنوان الافتاء، (مخطوطہ ۶۴۳ھ، تحقیق) اور دیگر متعدد کتابوں اور مضامین سے ہوتا ہے۔ آپ کو شعر گوئی سے بھی شغف تھا۔ لیکن یہاں بھی عدیم الفرصتی مانع رہی۔ آپ کے اس پہلو کے متعلق لوگوں کی واقفیت کم ہے۔ آپ کے ہم زلف ابوذر ہاشمی نے قاضی صاحب کے اسی مخفی گوشے کی نقاب کشائی کی ہے:

"کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ قاضی صاحب کو شعر گوئی پر بھی قدرت تھی۔ ملت کے مسائل سے انہیں شب وروز جوجھنا پڑتا تھا۔ ایسے میں وقت کہاں کہ شاعری کرتے۔ ابتدائی دنوں میں مشق کی ہو گی۔ ایک موقع پر خاکسار ان کے ساتھ سفر میں تھا۔ قاضی صاحب اس سفر میں بہت ملول تھے۔ ان کے بھانجہ مولانا شعیب رحمانی، جو رانچی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، عین جوانی کے دنوں میں گذر گئے تھے۔ قاضی صاحب اس صدمے کو بھلا نہیں پا رہے تھے، ایسے میں ان کی زبان سے فی البدیہہ کئی شعر نکلے، وہ اشعار نوٹ نہ کئے جا سکے۔ پھلواری شریف کی نشستوں میں گاہے گاہے انہوں نے کئی غزلیں بھی سنائیں۔ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ سنا تو یہ بھی ہے کہ جو بھی کہتے تھے۔ بجل پر ایک ہجو فارسی میں کہی تھی جو نجی محفلوں میں مقبول بھی رہی۔ ان کے کچھ اشعار آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ تبرکاً دو ایک شعر دیکھیں:

جہاں جہاں سے بھی گذرے ہیں تیرے دیوانے — قدم قدم پر چمن بن گئے ہیں ویرانے
یہ فیض ساقی ہے یا جذب اندروں اپنا — کھنچے چلے آتے ہیں آپ ہی سے پیمانے
مئے نگاہ کے کیف و اثر کو کیا جانے — وہ جس کے سامنے رہتے ہوں صرف پیمانے"

دراصل قاضی صاحب اپنے عہد کے ایک نابغہ تھے۔ آپ قصبہ جالہ کے ایک نامور ذی علم خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد گرامی مولانا عبدالاحد ملک کے جید عالم دین تھے۔ آپ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے اولین شاگردوں میں تھے۔ یہ خانوادہ کئی پشتوں سے اپنے علمی پس منظر کی بنا پر معتبر رہا ہے۔ قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ، بڑے بھائی مولانا زین العابدین، اور والد محترم کے ہاتھوں ہوئی۔ بعدازاں مدرسہ امدادیہ، دربھنگہ میں ایک سال اور مئو ناتھ بھنجن میں ایک سال کی تعلیم کے بعد دیوبند تشریف لے گئے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فارغین میں تھے۔ قاضی صاحب کی شخصیت اور علمی خدمات پر صفی اختر ڈاکٹر ارشد جمیل کی رہنمائی میں تحقیقی مقالہ قلم بند کر رہے ہیں۔

اویس احمد دوراں (پ: ۱۴ر فروری ۱۹۳۸ء)

اویس احمد دوراں مشہور ترقی پسند شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اکثر ادیبوں نے بدلتے ہوئے ادوار میں اپنے نظریات تبدیل کر لئے لیکن دوراں ابتدائی ایام سے اب تک ترقی پسند نظریات سے وابستہ ہیں۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز قیام کلکتہ سے ہوتا ہے۔ آپ کی ذہنی تربیت میں پرویز شاہدی کا اہم رول ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

جبھی تو اتنا چمک رہا ہے غم کے اندھیرے لمحوں میں — دوراں کے انداز میں کچھ پرویز کا جوہر لگتا ہے

آپ کا نام اویس احمد خان ہے اور دوراں تخلص فرماتے ہیں۔ آپ کا آبائی وطن دربھنگہ کا ایک گاؤں کوٹھیا ہے۔ آپ کے والد حاجی عزیز الرحمٰن خان مولانا محمد علی مونگیریؒ سے بیعت تھے اور مذہبیات میں گہرا انہماک

تھا۔ والد صاحب آپ کو حافظ قرآن بنانا چاہتے تھے۔ آپ نے حفظ قرآن کا آغاز کیا لیکن کمزور صحت کے سبب اس سعادت سے محروم رہے۔ بعد ازاں آپ نے ایم اے کیا اور درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہوئے۔ آپ کنور سنگھ کالج میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

اویس احمد دوراں ترقی پسند تحریک کے فعال رکن رہے۔ انہوں نے مختلف سیاسی تحریکات میں بھی عملی طور پر حصہ لیا اور قید و بند کی اذیتیں بھی جھیلیں۔ ان کی ہمدردی مظلوم و محکوم طبقے سے وابستہ رہی۔ آپ نے کمزور طبقے کے شب و روز کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور ان کے استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کیا ہے۔ دوراں کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اس طبقے کے مسائل کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ انہوں نے غزلیہ شاعری بھی کی ہے لیکن ان کی نظموں میں زیادہ داخلیت، اور تخلیقی حساسیت اور اثر انگیزی نمایاں ہوئی ہے۔ اختر اورینوی کا خیال ہے:

"میرا ذاتی خیال یہ کہ دوراں ایک کامیاب نظم نگار بن سکتے ہیں اور بہت ہی کامیاب نظم نگار۔ یوں انہوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور بعض غزلیں بہت ہی خوش آہنگ اور پیاری بھی ہیں لیکن دوراں میں تنظیم حسن کا سلیقہ زیادہ ہے بہ نسبت انتشار حسن کے۔ اگر وہ اپنے مخلصانہ، گہرے، قیمتی اور نادر تجربوں کی بنا پر شعریت بداماں نظمیں لکھتے رہے تو اردو کے سرمایہ شاعری میں اضافہ کرانے والے ہوں گے۔"

("دوراں کی شاعری" مشمولہ ماہنامہ "شاعر" ممبئی ۱۹۶۲ء)

اویس احمد دوراں کے شعری مجموعے "لمحوں کی آواز" اور "ابابیل" شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کے علاوہ آپ نے تنقیدی مضامین بھی قلمبند کئے اور اپنی خودنوشت بھی تحریر کی ہے۔ "تنقید کی منزل سے" آپ کا تنقیدی مجموعہ ہے اور "میری کہانی" آپ کی خودنوشت ہے۔ ان کی ایک نظم "یوم مئی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر سال ہم اک بار آتے ہیں / اس سال بھی دیکھو آئے ہیں / دکھ درد بھرے انسانوں سے / ہم اپنا رشتہ جوڑیں گے / ہم دنیا کے دکھیاروں کو / ایک جیون پہنا دے دیں گے / مزدوروں کو اس دھرتی کے / ہم یوم مئی ہیں یوم مئی

ان کی غزلیہ شاعری سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھ سے میں دور نہیں، دور سے منزل بولے — بھولے بھالے میرے بے چین مسافر ادھر آ
اس دور کے تھکے ہوئے انساں کی گود میں — کروٹ بدل رہی ہے کوئی تازہ کائنات

نور الاسلام نشتر (پ: ۱۲ر جولائی ۱۹۳۸ء ۱۱ر نومبر ۲۰۰۱ء)

نور الاسلام نشتر دربھنگہ کے ادبی حلقوں کا خاصا معروف نام ہے۔ آپ پیشے سے انجینئر تھے لیکن ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ادبی سرگرمیوں میں بہت فعال تھے۔ نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ آپ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "سیال لہریں" کے نام سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ شعری مجموعہ "لمس معنی" زیر طبع ہے۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

بیاں شوق کی داستاں کیجئے — لہو پھر جگر کا رواں کیجئے
یقیں کو بھی نذر گماں کیجئے — گماں کو تو نذر یقیں کیجئے

شبنم کمالی (پ: ۲۲ر جولائی ۱۹۳۸ء و: ۱۹ر اگست ۲۰۰۴ء)

مولانا شبنم کمالی کا وطن پوکھریرا، سیتامڑھی ہے لیکن آپ کی تعلیم و تربیت میں دربھنگہ کا بنیادی رول رہا

ہے۔ آپ مدرسہ حمیدیہ، قلعہ گھاٹ کے فارغ التحصیل ہیں۔ ملازمت کی غرض سے انہیں دیگر جگہوں پر بھی رہنے کا موقع ملا لیکن اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد دارالعلوم فدائیہ خانقاہ سمرقندیہ، دربھنگہ سے وابستہ رہے۔ شاعری خصوصاً نعتیہ شاعری میں آپ کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں کئی نہج پر جاری و ساری رہیں۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۰ء تک مظہر العلوم، چپچھوا (مدھوبنی) میں بانی صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد مدرسہ وحیدیہ (آرہ) میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک صدر مدرس رہے۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۹۹ء مدرسہ امانیہ، لوام (دربھنگہ) میں صدر مدرس کی حیثیت سے وابستہ رہے اور عزت و افتخار کے ساتھ جولائی ۱۹۹۹ء میں سبکدوش ہوئے۔ آپ کی مطبوعات کی تفصیل اس طرح ہے...... انوارِ عقیدت، ریاضِ عقیدت، ضیائے عقیدت، فردوسِ عقیدت، صہبائے عقیدت (نعتیہ مجموعے)، نوائے دل، تنویرِ خیال (غزلوں کے مجموعے)، آؤ گیت گائیں، گیت گاتے رہو (بچوں کے نغمے)، فقہ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ، کمال الصرف، کمال النحو، قیام میلادی، آئینۂ جمال مصطفیٰؐ اور مقالات شبنم (غیر مطبوعہ)۔ ۹۰ معروف صحافی اور ادیب احمد جاوید نے مولانا موصوف کی غزلوں اور نعتوں کا مجموعہ ''صحرا بھی گلزار لگے'' کے نام سے ترتیب دے کر ۲۰۰۵ء میں شائع کرایا۔ ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

ہے عہدِ گل بھی خونِ تمنا سے لالہ زار مسلے ہوئے ہیں آج بھی دورِ خزاں سے ہم

ٹکرا کے ہم سے چلتی ہے بادِ نسیم یوں بیٹھے ہیں جیسے دور بہت گلستاں سے ہم

سید احمد شمیم (پ: ۲راگست ۱۹۳۹ء)

سید احمد شمیم جدید شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ شاعری کا شعور آپ کو وراثت میں حاصل ہوا۔ آپ کے والد گرامی حضرت مولانا سید طٰہٰ الٰہی فکری دربھنگے کی ذی علم شخصیتوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں سید احمد شمیم کا قیام جمشید پور میں رہا۔ وہ کریم سٹی کالج، جمشید پور میں صدر شعبہ اردو کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ سید احمد شمیم اپنے رفیقوں منظر امام اور منظر کاظمی کے ساتھ ادبی سرگرمیوں میں بہت فعال رہے۔ آپ ایک ذہین اور حساس شاعر ہیں۔ وہاب اشرفی نے آپ کی شعری کائنات کا مفصل جائزہ لیا ہے اور شعری امتیازات کی نشاندہی کی ہے۔ سید احمد شمیم کے شعری رویے کے متعلق ان کا خیال ہے:

> ''......موصوف ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری کے آفاق میں بڑی وسعت ہے۔ ان کے یہاں کسی مخصوص علامت یا فضا کی تلاش لایعنی امر ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعری رویئے میں پوری کائنات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی وابستگی ان کے سامنے کئی لاینحل مسائل پیش کرتی ہے جن سے وہ مسلسل جوجھتے نظر آتے ہیں۔''

(''امتیازی جودت اظہار کا شاعر: سید احمد شمیم'' مشمولہ 'مباحثہ' پٹنہ، جون تا نومبر ۲۰۱۰ء، ص: ۱۵۶)

سید احمد شمیم کے دو شعری مجموعے ''بے در و دیوار'' اور ''ڈوبتی شام'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ شمس فریدی کے ساتھ مل کر نظموں کا ایک انتخاب ''گلوب'' ترتیب دیا۔ شاعری کے علاوہ سید احمد شمیم نے تنقیدی مضامین بھی قلمبند کئے ہیں۔ ''ارژنگ'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ علاوہ ازیں، خاکوں کا ایک مجموعہ ''بند آنکھوں کا تماشہ'' ان کی مطبوعہ تصنیف ہے۔ سید احمد شمیم کے فکر و فن پر لکھی گئی تحریروں کا انتخاب ڈاکٹر شاہ بانو رضیہ رمنظر کلیم

نے ''سید احمد شمیم: آئینہ در آئینہ'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ ان کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

جب دائرہ خلوص کا کچھ تنگ ہو گیا ۔۔۔ سمٹا سمٹ کے نرم بدن سنگ ہو گیا
آنکھوں کے سمندر میں وہ تحلیل نہ ہو جائے ۔۔۔ دیکھا نہ کرو چاند کو معصوم نظر سے

سید منظر امام (پ: ۱۰ر اگست ۱۹۳۹ء)

سید منظر امام دربھنگہ کے ادبی مرکز ''امیر منزل'' کے تیسرے فعال رکن ہیں۔ اپنے دونوں بڑے بھائیوں حسن امام درد اور مظہر امام کی طرح سید منظر امام نے بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے توسط سے دربھنگہ کے ادبی منظر نامے پر اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔ منظر امام بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے معتبر رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ صحافت بھی آپ کی دلچسپی کا اہم محور رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کی ادارت میں دربھنگہ سے سہ ماہی ''رفتار نو'' کا اجرا عمل میں آیا۔ آپ کی پہلی ملازمت ٹسکو، جمشید پور میں ہوئی۔ ملازمت کے دوران بھی آپ کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ رسالہ ''ترسیل'' اور منظر کاظمی کے اشتراک سے چینی جارحیت پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ''ہمالہ کے آنسو'' اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ٹسکو کی ملازمت کے بعد آپ نے تدریسی شعبے کی جانب رجوع کیا اور گرونانک کالج، دھنباد کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے جہاں سے اگست ۱۹۹۹ء میں عزت و افتخار کے ساتھ سبک دوش ہوئے۔ یہاں بھی آپ نے تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ ادبی ہلچل برقرار رکھی اور ایک ادبی رسالہ ''وقت'' نکالنا شروع کیا جس کے بعض خصوصی گوشوں کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ ان دنوں آپ دربھنگہ میں گذرے ہوئے بچپن اور نوجوانی کی خواب آسا یادوں کے حوالے سے ایک دلکش اور دل پذیر خودنوشت تحریر کر رہے ہیں جو سہ ماہی 'تمثیل نو' دربھنگہ میں ''یہ سرگزشت ہی ہے'' کے عنوان سے قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ نوجوان قلم کار احمد معراج (معراج الدین خاں) ایل این متھلا یونیورسٹی سے ڈاکٹر ایف ایس یزدانی کے زیر نگرانی بعنوان ''سید منظر امام: شخصیت اور ادبی کارگزاریاں'' پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنی علمی و ادبی تربیت اور ذہنی آبیاری کے سلسلے میں اپنی سرگزشت میں اعتراف کیا ہے:

> ''میرے بڑے بھائی حسن امام درد اور مظہر امام ہمیشہ میرے آئیڈیل رہے ہیں۔ ان بھائیوں کے زیر سایہ ہی میں نے پرورش پائی ہے۔ ہم کلامی کے آداب سیکھے ہیں۔ چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، لکھنا، پڑھنا یہاں تک کہ آداب گفتگو بھی میں نے انہیں سے جانا ہے۔ دو سال کا تھا جب والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دونوں بھائی شجر سایہ دار بنے رہے۔ کبھی والد کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔...... ان بھائیوں نے ہی مجھے لفظوں کے راز بتائے۔ حرف کی سرگوشیاں سنائیں۔ جب میں اندھیروں کے جنگل میں کھو جاتا تو یہی میرے رہنما ستارے بن جاتے تھے۔''

(''یہ سرگزشت ہی ہے'' مشمولہ ماہنامہ 'تمثیل نو' دربھنگہ ۲۶ر اپریل ۲۰۱۲ تا جون ۲۰۱۳، ص: ۵۲، ۵۳)

(جاری)

....

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، آر این اے آر کالج، سمستی پور (بہار)

ڈاکٹر شگفتہ یاسمین، ویشالی

غالب کی شاعرانہ عظمت

اردو شاعری میں غالب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ گوناگوں خصوصیات کے بہترین نمونہ ہیں۔ اردو ادب میں آپ کا شمار بیک وقت ایک معروف شاعر اور کہنہ مشق نثر نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ آپ نے اردو غزل کو ایک نئی سمت اور نئی جہت سے روشناس کیا ہے۔ ان کے خطوط اردو میں جدید نثر کی بہترین مثال ہے۔ شاعری کے مختلف اصناف مثلاً مثنوی، قصیدہ اور رباعی پر انہوں نے طبع آزمائی کی لیکن درحقیقت صنف غزل میں انہیں خاطر خواہ کامیابی ملی۔

اگر چہ اردو کے دیگر شعراء مثلاً آتش، ذوق، میر، مومن، درد اور شاد نے اردو شاعری کو بڑی حد تک کامیابی کی منزل سے ہمکنار کیا لیکن غالب کا انداز سخن اور انداز بیاں کچھ اور ہی تھا۔ ذیل کے اس شعر سے اس حقیقت کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے   کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مجموعی طور پر مذکورہ شعر کی اہمیت و انفرادیت کو اردو کے غالباً تمام ارباب ذوق نے تسلیم کیا ہے۔

غالب کی شاعری کا غائر مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم کے شعراء میں غالب ہی تنہا ایسے شاعر ہیں جو آج بھی اہل قلم اور صاحب علم حضرات کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ غالب فی الحقیقت ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک عہد کا نمائندہ شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ حالی غالب کی شاعرانہ خصوصیت کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں:

''جدت مضامین، طرفگی خیالات، نئی اور موزوں تشبیہات کا استعمال، استعارہ، کنایہ کا برمحل برتاؤ اور شوخی و ظرافت یہ سبھی کلام غالب کے عناصر ترکیبی ہیں۔''

غالب کی ہر دلعزیزی کا بنیادی سبب انکی شاعری کا تنوع اور طرز ادا ہے۔ مضامین کے اعتبار سے کلام غالب میں جتنی رنگارنگی پائی جاتی ہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر آئے۔ جہاں تک اسلوب اور لب و لہجہ کا تعلق ہے غالب کی شاعری ایک گلدستہ صد رنگ ہے جس کا ہر رنگ اپنی جگہ اتنا تابناک اور شوخ دکھائی دیتا ہے کہ نگاہیں وہیں ٹھہر کر رہ جاتی ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے کلام کو الہامی کتاب کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر بجنوری نے کلام غالب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔

غالب کے زمانے کی شاعری الفاظ اور محاورات کی شاعری تھی۔ روزمرہ ضرب المثل، سلاست، روانی اور بندش الفاظ ان کی شاعری کا خاص جوہر تھا۔ دہلی میں ذوق ملک الشعراء تھے تو لکھنؤ میں ناسخ کا طوطی بولتا تھا۔ یہ اور بات تھی لیکن غالب کا کلام گوناگوں خصوصیات کا بہترین نمونہ ہے۔ آزردہ اور شیفتہ جیسے باکمال سخنور اور ساتھ ہی ساتھ متمول حضرات غالب کے قدرداں تھے۔ غالب کے شاگردوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ مغلیہ دربار میں

غالب کی خوب قدر و منزلت تھی۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ بادشاہ کی نگاہ میں غالب کی عزت و تحسین کافی تھی۔ اس لئے یہ کہنا کہ غالب کی قدر ان کے زمانے میں نہیں ہوئی سراسر غلط ہوگا۔ اس جہت سے بھی غالب خوش قسمت ہیں کہ انکی زندگی میں ہی انہیں خراج تحسین مل چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا زمانے نے جتنی بھی قدر دانی کی کم تھی۔ بہر کیف یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ قدر دانی کم ہو یا زیادہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کی شہرت و مقبولیت رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہے۔ انہوں نے مستقبل کے شعلے سے حرارت حاصل کی ہے اور تصور کی مدد سے اس حرارت کو حال کے جسم میں منتقل کر دیا ہے۔

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج　　　میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

کلام غالب میں ہر رنگ کے اشعار جلوہ گر ہیں۔ شوخ، ظریفانہ، سنجیدہ، عارفانہ، دقیق اور فلسفیانہ۔ مختصراً ان خصوصیات کو تغزل، تصوف اور تفلسف کے تین بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے بقول:

"غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔"

غالب کی شاعری میں صنف غزل کی لطافت و نفاست، نازکی و دلبری، شیرنی اور حلاوت اور سرمستی و سرشاری فراواں ہے۔ انہیں عناصر سے غالب کے تغزل کا خمیر تیار ہوا ہے۔ اگر چہ غالب کی شاعری میں اور کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی ان کا یہ تغزل انکو ہمیشہ زندہ رکھنے کیلئے کافی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب کے جذبات عشق میں وہ ربودگی، وہ گیرائی اور وہ خلوص نہیں جو مومن کے عشق کا طرۂ امتیاز ہے۔ پھر بھی غالب کے عشق میں جو نیرنگی پائی جاتی ہے وہ مومن کے یہاں ناپید ہے۔ غالب کی محبت میں وہ پائیداری نہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کا دل محبت سے نا آشنا ہے۔ درحقیقت وہ عشق کو فلسفی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس میں ڈوب کر رہ جانا انہیں گوارہ نہ تھا:

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے میرا کام　　　مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ میرے آگے
میں ۔ کیا بزم ناز چاہئے غیر سے تہی　　　سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
میں جو ۔ ہوں کہ ہم ملیں گے قیامت میں تمہیں　　　کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں
دل سے تری نگاہ و جگر تک اتر گئی　　　دونوں کو ایک ادا میں رضا مند کر گئی

غالب کی شاعری کو مشہور و مقبول بنانے والی دوسری اہم صفت ان کی شوخی و ظرافت ہے۔ شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں:

"مرزا کی ظرافت بہت پاکیزہ اور فحش سے پاک ہے اور تبسم زیر لب سے آگے کبھی نہ بڑھی لیکن اس میں رعایت کسی کی نہ تھی۔ گاہے بگاہے اپنے اور پر بھی ہنس لیا کرتے تھے۔"

(اشعار غالب از عبدالمنان بیدل صفحہ: ۴۲)

یہی وہ خوبی ہے، جس کی بنا پر حالی نے انہیں "حیوان ظریف" کہا۔ اردو شاعری میں غالب سے قبل پھکڑ، ہجوم اور مسخرگی کے نمونے ملتے ہیں لیکن اعلیٰ درجہ کی شوخی و ظرافت کا پہلا نمونہ سب سے قبل غالب کے یہاں ملتا ہے۔ رشید احمد نے بہت صحیح کہا ہے:

''اردو شعر و ادب میں ہی نہیں طنز و ظرافت کی محفل میں غالب اس طرح داخل ہوئے جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکے گانے کا کوئی استاد وارد ہو جائے۔''

اردو شاعری میں غالب کی شائستہ شوخی و ظرافت کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو خوش کرنے کو غالب خیال اچھا ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مجموعی اعتبار سے غالب کی شاعری ایک گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ و بو کے پھول ملتے ہیں جس سے ہر شخص کے ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔ پروفیسر عبدالمنان عظیم آبادی اشعار غالب میں فرماتے ہیں ہر شخص کے مطلب کی بات غالب کے اشعار میں نظر آتی ہے۔ کسی کو مرزا کی شوخی پسند ہے۔ کسی کو اس کی فلسفیانہ سنجیدگی و متانت، کسی کو اس کے دیوان میں حقیقت عرفان کے اشعار ملتے ہیں۔ کسی کو دین مذہب پر استہزا کے کوئی رند سمجھتا ہے اور کوئی صوفی۔ غرض کہ کلام غالب وہ صاف آئینہ ہے جس میں ہر دیکھنے والوں کو اپنی اصل شکل نظر آتی ہے۔

....

فرحت بانو

سرسید کی زبان اور اسلوب: ''تہذیب الاخلاق'' کی روشنی میں

سرسید احمد خاں ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی علمی اور عملی کاوشوں سے ہندوستانی معاشرے میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انیسویں صدی کی تعلیمی تاریخ میں انہیں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ قوم وملت کے محسن، ماہر تعلیم اور صاف ستھری عام فہم زبان استعمال کرنے کے لیے انہیں ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

سرسید احمد خاں کو اپنی قوم کی تنزلی کی فکر دن رات ستائے رکھتی تھی۔ وہ ہندوستانی قوم خصوصیت سے مسلمانوں کی پسماندگی پر بے حد فکر مند تھے۔ انہیں ترقی کی راہ پر لانے کے لیے انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ اس پرچہ کے ذریعہ جہاں تک ہم سے ہوسکے ان کے دین ودنیا کی بھلائی کی کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں، تو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہیں لیکن غیر قومیں ان کو بخوبی دیکھتی ہیں، ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلائیں۔

اس پرچے کے منظر عام پر آنے کے بعد سرسید احمد کے خیالات عام ہوئے اور مسلمانوں کو پسماندگی کا احساس ہوا لیکن ان کے کئی مخالفین میں سامنے آگئے۔ کچھ لوگوں نے ان پر کفر کا فتوہ صادر کیا اور کچھ لوگوں نے انہیں بددین کہا۔ سرسید احمد خاں اپنے مخالفوں سے بددل نہ ہوتے اور انہیں اپنا پیغام دیتے رہے۔ آخر میں ان لوگوں نے بھی ان کی آواز میں آواز ملانا شروع کردیا۔

''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ سرسید احمد نے علی گڑھ تحریک کی علمی اور ادبی بنیادیں مستحکم کیں۔ اس رسالہ میں وہ خود بھی مضامین لکھتے تھے اور ملک کے دانشوروں سے بھی مضامین لکھوا کر اس میں شائع کرتے تھے۔

سرسید احمد نے ''تہذیب الاخلاق'' میں جتنے مضامین لکھے وہ سب کے سب اصلاحی اور قوم کی تعلیم وتربیت کے لیے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان جہالت، اندھی عقیدت اور پسماندگی سے نکل کر روشن دنیا سے روشناسی ہو۔ ڈاکٹر قمر علی نے اس سلسلے میں کتنا درست فرمایا ہے:

> ''سرسید نے اس رسالہ میں جتنے بھی مضامین لکھے وہ سب کے سب اصلاح قوم اور تربیت معاشرہ کی خاطر میں تھے۔ ایک مصلح قوم کی حیثیت سے سرسید، اول وآخر یہی خواہش رکھتے تھے کہ ہندوستانی مسلمان ''جہالت'' کی وادیوں سے نکل کر ''علم وعرفان'' کے کھلے میدانوں میں آئیں اور اپنی محنت و توجہ سے اس کا چپہ چپہ فتح کرلیں اور یقیناً ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت کا سلسلہ اس ہدف کو قریب سے قریب تر لاتا رہا۔''

(تہذیب الاخلاق کی اہمیت، ڈاکٹر قمر علی، ماہنامہ زبان وادب جولائی تا اگست، ۲۰۰۹، ص:۳۹)

''تہذیب الاخلاق'' نے نہ صرف صحافت، مضمون نگاری اور نثری صنف کے تعلق سے اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ اس نے تعلیمی امور اور دوسرے بہت سے فوائد پر توجہ مرکوز کردیا ہے۔ معاشرتی اصلاح میں اس رسالہ نے جو

اہم کارنامہ انجام دیا ہے اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس رسالہ کے آخری شمارے میں سرسید احمد نے خود اس بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''قوم.....بے جا جوش سے جس تاریک گڈھے میں چلی جاتی تھی۔ ہم نے اسے خبردار کیا، دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ مبتلا تھی اس کو روشنی دکھائی.....ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا۔ اردو زبان کے علم و ادب کا ترقی پانا یہی ہماری مرادیں تھیں، جن کو ہم نے بھرپور پایا۔''

(''تہذیب الاخلاق'' آخری شمارہ، یکم رمضان، ۱۲۹۳ھ)

سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ منصوبہ بند طریقے سے صاف ستھری سادہ اور سلیس نثر کو فروغ دیا۔ اس وقت جو نثر لکھی جارہی تھی وہ زیادہ تر مقفع اور مسجع تھی۔ سرسید احمد نے اردو نثر کو تصنع اور تکلف سے آزاد کرایا۔ سادہ نثر کے ذریعہ انہوں نے قوم میں بیداری پیدا کی۔ کم پڑھے لکھے لوگ بھی ان کی نثر کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ ان کے اندر روشن خیالی پیدا ہوتی تھی۔ چونکہ کم پڑھے لکھے لوگ ہی کئی طرح کی اندھی عقیدت، غلط رسم و رواج اور توہمات کے شکار تھے۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ توہمات اور تعصبات کا بہت حد تک خاتمہ ہوا۔ اردو نثر میں جو ایک طرح کی انقلابی ترقی ہوئی وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ سرسید احمد نے اس رسالہ کے چار سال پورے ہونے پر لکھا تھا:

''جہاں تک ہم سے ہوسکا، ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کی املا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی۔ الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیال سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادہ عبارت پر توجہ کی۔''

سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ نثری اسلوب تحریر اور اردو شعر و ادب کی بیشتر اصناف پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ پُر تکلف اور مصنوعی زبان لکھنے سے گریز کیا جانے لگا۔

''تہذیب الاخلاق'' کے منظر عام پر آنے سے پہلے مبالغہ آمیز تحریریں اور مشکل ترین فقرے استعمال کرنا مضمون نگاری اور اردو نثر کی دوسری اصناف کے لیے شان سمجھے جاتے تھے۔ سرسید احمد نے اپنے اس رسالہ کے ذریعہ اردو نثر کو معاشرے کا ترجمان بنایا ساتھ ہی زندگی کے گوناگوں مسائل سے لوگوں کو آگاہ بھی کیا۔ اس رسالہ کے ذریعہ انہوں نے اردو زبان کو وسعت بخشی۔ اسالیب بیان اور موضوعات کا دائرہ وسیع کیا۔ ادب اور زندگی کے رشتے کو مضبوط کیا۔ اردو ادب کو نئی شکل، نیا آہنگ اور نیا عزم بخشا۔ مختصر یہ کہ سرسید احمد خاں نے اس رسالہ کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو ایسی توانائی بخشی کہ یہ ہر قسم کے افکار اور مضامین کو صفائی، سادگی اور پرتاثیر انداز میں پیش کرنے کے قابل ہوگئی۔ ڈاکٹر محمد اسرار انصاری کے مطابق:

''انہوں نے بتایا کہ اعلیٰ ادب عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کا نام نہیں۔ اعلیٰ تحریر وہی ہے جو دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔ انہوں نے بتایا کہ ادب صرف فرد کے دل کی آواز نہیں بلکہ انسانیت کی اصلاح و ترقی اور تکمیل کے لیے اٹھائی جانے والی آواز ہے۔ اس کا مقصد تہذیب کا ایک نیا تصور دینا اور قوم میں ایک بڑا انقلاب لانا تھا۔''

(سرسید تحریک کی معنویت، ڈاکٹر محمد اسرار انصاری، جہان اردو، دربھنگہ، مارچ ۲۰۰۹ء، ص:۸۴)

یہ سچ ہے کہ سرسید احمد نے اپنی نثر خاص طور سے ''تہذیب الاخلاق'' میں شامل مضامین کی نثر کے ذریعہ اردو زبان وادب کو جو نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے اردو زبان کو نہ صرف ادب، تاریخ اور مذہب کے مضامین تک محدود رکھا بلکہ اسے مکمل حیات کا آئینہ بنا دیا۔ انہوں نے اردو نثر کی دنیا بدلنے کے ساتھ ساتھ شاعری کی دنیا کو بھی بدل دیا۔ اردو زبان کو آسان اور عام فہم بنانے کے لیے انہوں نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے رفقا کو بھی اس طرف راغب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے تمام اصناف کی زبان اتنی عام فہم اور ہلکی پھلکی ہوگئی کہ پڑھا لکھا آدمی بھی اسے آسانی سے سمجھنے لگا اور اس میں دلچسپی لینے لگا:

''جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بڑی نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوجاتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جالگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں۔''

(بحث وتکرار۔ سرسید احمد خاں۔ مشمولہ ''مضامین سرسید'' ص:۱۷۹)

مختصر یہ کہ ''تہذیب الاخلاق'' اور اس میں شامل مضامین کے ذریعہ سرسید احمد خاں نے قوم کی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ سادہ اور سلیس زبان میں لکھنے کے رجحان کو اتنا بڑھا وا دیا کہ ہم لوگ ان کے اس کارنامے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ایل این ایم یو، دربھنگہ

● مٹیابرج، کولکاتا کے مقبول شاعر احمد سلطان قریشی کا ۲۰ر دسمبر ۲۰۱۵ء کو ان کی رہائش گاہ میں نماز مغرب سے قبل اچانک دل کا شدید دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ عصر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد ان کی طبیعت بگڑ گئی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ دوسرے دن بعد نماز عصر ان کی تدفین کیل خانہ قبرستان، مٹیابرج میں ہوئی۔ موصوف غزلوں اور قطعات پر طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ربیع الاول کے مہینے میں نعتیہ قصیدہ بھی لکھا کرتے تھے جنھیں قصیدہ خوانی کی محفلوں میں انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔ مرحوم کی عمر تقریباً ۶۰ ربرس تھی۔

علیم الدین

ڈاکٹر وہاب اشرفی: تاریخ ادب اردو کی روشنی میں

اردو ادب کی تاریخ سے پہلے لوگ تذکرے سے کام چلاتے تھے۔ اس کی ارتقائی شکل محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' کی صورت میں ہم لوگوں کے سامنے ہے۔ اس کے بعد رام بابو سکسینہ نے اردو شعروادب کی تاریخ انگریزی میں لکھی جس کا ترجمہ حسن عسکری نے اردو میں کیا جس سے اردو والے فائدہ اٹھاتے رہے۔ پھر اردو ادب کی مختصر تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ ان تاریخوں میں جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' سب سے زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے۔ یوں تو چھوٹی بڑی بہت سی اردو ادب کی تاریخیں لکھی جا چکی ہیں جن سے اساتذہ، طلباء اور دوسرے ضرورت مند لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر اعجاز حسن کی ''مختصر تاریخ ادب اردو''، احتشام حسین کی ''تنقیدی تاریخ''، ڈاکٹر محمد حسن کی ''قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''، عظیم الحق جنیدی کی ''اردو ادب کی تاریخ'' پروفیسر نورالحسن نقوی کی ''تاریخ اردو ادب'' اور گیان چند جین وسیدہ جعفری کی ''تاریخ ادب اردو'' بے حد اہم ہیں۔

''تاریخ ادب اردو'' (تین جلدوں پر مشتمل) ڈاکٹر وہاب اشرفی کا ایک اہم ادبی کارنامہ ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے ''تاریخ ادبیات عالم'' (سات جلدوں پر مشتمل) لکھ کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کوئی ایک شخص دنیا کی ۳۴ زبانوں کے ادب کی مختصر تاریخ بیان کردے یہ تو واقعی حیرت کی بات ہے۔ بے شک یہ ان کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

۱۵ ربرسوں کی محنت اور لگن کے بعد یہ کتاب منظر عام پر آئی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر وہاب اشرفی کے اندر ادبیات عالم کو اردو زبان میں پیش کرنے کا جذبہ کتنا شدید رہا ہوگا۔

تاریخ ادب اردو کی طرف ان کی توجہ کیوں ہوئی جبکہ انہوں نے ''تاریخ ادبیات عالم'' میں اردو کی تاریخ ادب کو بھی شامل کیا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی سوانح عمری ''قصہ بے سمت زندگی کا'' میں لکھا ہے:

> ''مجھے احساس ہوا کہ ''تاریخ ادبیات عالم'' میں اردو کی تاریخ بے حد سرسری ہے۔ پھر یہ کہ اب تک کوئی ایسی تاریخ نہیں جو upto date ہو۔ میں نے اس طرف خصوصی توجہ کی اور عزم کیا کہ اردو ادب کی ایک تفصیلی تاریخ سامنے آنی چاہئے۔ پھر میں اس پروجکٹ ہی کا ہو کر رہ گیا اور شب وروز کی محنت سے اس لائق ہوا کہ ایسی تاریخ قلم بند کردوں۔''

(قصہ بے سمت زندگی کا، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۰۶)

''تاریخ اردو ادب'' میں وہ شاعر وادیب کے ضمن میں اپنی گراں قدر رائے دینے میں کسی تذبذب میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں کیونکہ ان کی تنقیدی نگاہ شروع ہی سے گہری رہی ہے۔ انہوں نے اسے زیادہ سے زیادہ تنقیدی بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر تقابلی ادبیات کے نقاد تھے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ''تاریخ ادب اردو'' میں نئے اور پرانے سارے قلم کاروں کو شامل کرنے کی حتی الامکان

کوشش کی ہے اوران پر اپنی تنقیدی رائے پیش کی ہے۔۱۹۸۰ء کے بعد کے ادباء شعراپر بھی انہوں نے نہ صرف اپنی گہری نگاہ ڈالی ہے بلکہ ان کے اندر پوشیدہ جوہر اوران کے امکانات کوبھی زیر بحث لانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ تاریخ ادب اردو اتنی اپٹوڈیٹ ہوگئی ہے کہ اردو دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔۲۰۰۰ء تک کے قلمکاروں کا احاطہ کرلینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف لکھتے ہیں:

''وہ ادب، تنقید اور تاریخ کے جدید ترین تصورات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔انہوں نے تاریخ ادب اردو میں بعض نئے اور پرانے قلم کاروں کے سلسلے میں جورائے قائم کی ہیں وہ بڑی حد تک ان کے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔وہ اپنی رائے کا اظہار بالکل آزادی سے کرتے ہیں لیکن اسے حرف آخر نہیں سمجھتے بلکہ دوسروں کے اختلاف رائے کا موقع بھی دیتے ہیں۔وہاب اشرفی اگر خود دوسروں سے اختلاف رائے رکھتے ہیں تو اس کا اظہار بھی نہایت شائستگی سے کرتے ہیں۔''

(ڈاکٹر ہمایوں اشرف۔سہ ماہی ''جہان اردو'' دربھنگہ، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص:۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر وہاب اشرفی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ادیب وشاعر کے انتخاب اوران کے جائزے میں جوطریقہ کار اپنایا ہے وہ دوسرے تاریخ نویسوں کے یہاں نہیں ہے۔دراصل وہ دنیا کی ادبی تاریخوں سے اچھی طرح واقف تھے۔انگریزی زبان وادب سے گہری واقفیت ہونے کی وجہ سے انہوں نے دنیا کی بہت سی ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ادبی تاریخ نویسی کے مختلف النوع سلسلے سے ان کی گہری واقفیت نے تاریخ ادب اردو لکھنے میں ان کی مدد کی اور وہ اپنے اس مہم میں اتنے کامیاب ہوئے کہ اس کی مثال اردو میں نہیں ملتی۔وہ تحقیقی امور سے زیادہ تنقیدی پہلو پر زیادہ گہری نظر رکھتے تھے۔انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ مختلف وقتوں میں ہونے والے ادبی رجحانات اور میلانات، ادیب وشاعر پر کتنے گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''محمد نقی احمد ارشاد متنوع ادبی جہات پر کام کرتے رہے ہیں۔شعروشاعری سے ان کا شغف پرانا ہے۔شاد عظیم آبادی کے پوتے ہونے کے رشتے سے انہوں نے دبستان عظیم آباد کی روشنی مدھم نہ ہونے کا عزم کررکھا ہے۔ہرچند کہ ان کے اشعار شاد کی سطح کو نہیں چھوتے لیکن خصائص کے لحاظ سے اس راہ پر گامزن رہے اور یہ عمل فطری بھی ہے۔بحیثیت شاعر انہیں کوئی امتیاز حاصل نہیں لیکن اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ کلام نک سک سے درست اور کلاسیکی پیچ دھجِ رکھتا ہے۔''

(سید نقی احمد ارشاد، تاریخ ادب اردو، وہاب اشرفی، ص:۱۵۳۹)

ڈاکٹر وہاب اشرفی مصنف کے آثار وحیات، ان کے ذہنی میلانات، ان کے ادب پارے کی تخلیقی ساخت اور زمان ومکان کو پیش نظر رکھ کر ہی ان کے فن پر اپنی رائے دیتے ہیں۔ان کے اسلوب میں سادگی، دلکشی اور روانی ہے:

''مظفر حنفی نے ان کی دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دی ہے۔پہلے اور آخری مصرعہ کو ریفرنس کہہ لیجئے تو پھر

کردار کے لیے ساڑھے تین اشعار کہے گئے ہیں۔ اتنے اشعار کی پابندی کے بعد بھی ہر خانہ مکمل ہے۔ پوری تصویر صاف ابھر آئی ہے۔ یعنی شاعر نے کردار تخلیق نہیں کیے ہیں بلکہ چاول پر قل ھو اللہ لکھا ہے۔"

(مظفر حنفی، تاریخ ادب اردو، وہاب اشرفی، ص: ۱۷۱)

آخر میں یہ بھی کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تاریخ ادب اردو میں کچھ بڑی ہستیاں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ بہت سے کمتر اور نئے لوگ تو شامل کر لیے گئے ہیں لیکن بہت سے کہنہ مشق اور پرانے ادیب و شاعر شامل نہیں ہو سکے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ کچھ لوگوں کی کتابوں کے حوالے سے کئی کوٹیشن بھی دیے گئے ہیں لیکن انہیں کتاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ کسی بھی تاریخ ادب کے لیے ایک بڑی کمی قرار دی جا سکتی ہے۔ بہر حال ہر کام میں مزید کام کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ کوئی کام حرف آخر نہیں ہوتا۔

مصنف نے اس سلسلے میں خود ہی فرمایا ہے:

"مجھے احساس ہے کہ میری یہ تاریخ بھی مکمل نہیں ہے۔ نہ مجھے اس کا دعویٰ ہے کہ میں نے جو کام کیا ہے وہ آخری سطح کا ہے۔ بہت سے پہلو ہیں جو شاید نشان زد نہ ہو سکے ہوں۔ ممکن ہے بعض قابل لحاظ شخصیتیں میری نگاہوں سے اوجھل رہی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے بعض امور میں مغالطہ ہوا ہو لیکن ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے طور پر اندراج کے معاملے میں کسی قسم کے تعصب سے کام نہیں لیا ہے۔"

(تاریخ ادب اردو، جلد اول، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷، ص: ۳۱)

بہر حال ڈاکٹر وہاب اشرفی کی "تاریخ ادب اردو" کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی حیثیت دستاویزی ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر وہاب اشرفی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے۔

☆☆☆

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ایل این ایم یو، دربھنگہ

● جناب شکیل احمد (ڈی آئی جی انٹیلیجنس برانچ، مغربی بنگال) کے والد بزرگوار اور معروف استاد محمد شہاب الدین (عمر تقریباً ۸۹ر برس) کا انتقال ۴ر اپریل ۲۰۱۵ء کو ہوگیا۔ مرحوم اپنے فرزند کے ساتھ بیل گھچیا علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس میں گزاری اور پیچھے شاگردوں کی کثیر تعداد چھوڑی ہے۔ وہ مومن ہائی اسکول، رجبہ بازار کے بانی ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۱۹۹۲ء میں ووڈ برن گورنمنٹ اسکول سے سبک دوش ہوئے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ اکلوتے بیٹے شکیل احمد (آئی پی ایس) اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کی نماز جنازہ اسی روز بعد نماز مغرب جامع مسجد بیل گھچیا میں ادا کی گئی جب کہ تدفین شہر بنگلہ قبرستان، کاشی پور میں عمل میں آئی۔

عروسہ یاسمین زیبا

اردو میں خاکہ نگاری

خاکہ نگاری عام طور پر شخصیت نگاری کے مخصوص اطوار کے طور پر وجود رکھتی ہے۔ خاکہ نگاری کے ذریعہ کسی شخص و شخصیت کے ان پہلوؤں کو پیش کیا جاتا ہے، جن سے متعلقہ فرد کے حسن وقبح کی لطیف آئینہ داری ہوتی ہے۔ لغوی طور پر خاکہ اس نقشہ کو کہا جاتا ہے جو حدود کی لکیروں پر مبنی ہو۔ اس کا دوسرا معنی ڈھانچہ اور چربہ ہے:

خاکہ، خاکا (ف۔ ا۔ مذکر) (۱) وہ نقشہ جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے۔ (۲) ڈھانچا، چربہ۔

(فیروز اللغات اردو جدید، الحاج مولوی فیروز الدین، ۱۹۹۷ء، ص: ۳۱۰)

لیکن خاکہ نگاری کا اصطلاحی معنی شخصیت کے مثبت و منفی خصائص کو غیر جانب دارانہ اور لطیفانہ انداز میں تحریر کرنا ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری کے ذریعہ کسی خاص شخص کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالی جاتی ہے کہ اس سے جہاں موضوع خاکہ کی جہتیں ترتیب پاتی ہیں اور لطف وانبساط کے پہلو پیدا ہوتے ہیں وہیں اس سے خاکہ نگار کی وسعت ذہن ونظر اور قوت مشاہدہ وفیصلہ بھی سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی لکھتے ہیں:

''خاکہ نگاری کسی شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔ اس کے ذریعے کسی شخصیت کی تصویر کو چمکایا جاتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں کو شخصیت کے اس خاکے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کو مرقع نگاری اور قلمی تصویر بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں خاکے کو اسکیچ یا پین پورٹریٹ کہتے ہیں۔ خاکہ نگاری ایک حد تک لطیف مزاج سے تعلق رکھتی ہے۔ مزاح کا سہارا لے کر کسی بھی شخصیت کے عیوب اور خوبیوں کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ خاکہ میں خاکہ نگار کی ایمانداری، قوت مشاہدہ، احساس تناسب اور مصورانہ مہارت کا امتحان ہوتا ہے۔''

(نئے تنقیدی زاویے، ڈاکٹر خوشحال زیدی ۲۰۱۳ء، ص: ۳۵۹)

خاکہ نگاری دراصل کسی شخص کی باہری اور اندرونی تصویر کو لفظوں میں پیش کرنے کا ہنر بھی ہے۔ اس کے ذریعہ متعلقہ شخص کی خوبیوں اور بسا اوقات خامیوں کو بھی اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس شخص کی خوبیوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی کمزوریوں سے بھی لطف کا ماحول قائم ہوجاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی تصویر بگاڑ کر پیش کی جائے یا اسے معصوم محض بنا کر پیش کیا جائے تو یہ چیز مستحسن نہیں ہے۔ خاکہ نگاری کی تہذیب یہ ہے کہ اس سے حسد وتعصب یا عقیدہ و چاپلوسی کا شائبہ مس نہ ہو۔ یعنی خاکہ نگاری جہاں دیانت داری پر مبنی ہو وہیں اس کا اسلوب بھی دلنشیں ہو۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے لفظوں میں:

''خاکہ ایک نوع کی متحرک تصویر ہوتا ہے جس کے ذریعہ ہم کسی شخص کو ہنستے بولتے، بنتے بگڑتے، الجھتے سلجھتے، اندر باہر ہر حال میں دیکھ لیتے ہیں۔ خاکہ نگاری کا اسلوب شگفتہ ہونا چاہئے۔''

(ادب نما، ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، ۲۰۱۴ء)

تنقیص نگاری یا قصیدہ خوانی خاکہ نگاری کے اصولوں کے منافی ہے۔ ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی مزید لکھتے ہیں:

''کسی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کرنا یا اس کے برعکس کسی کو فرشتہ بنا کر پیش کرنا مناسب نہیں۔ اسی طرح خاکہ نگاری میں اپنی شخصیت کو بہت زیادہ نمایاں کر کے پیش کرنا خاکہ نگاری کے اصولوں کے منافی ہے۔''

(ادب نما، ایضاً)

خاکہ نگاری کے مذکورہ اصول کے پیش نظر ہی اس صنف کو شگفتہ ولطیف ادب کے ذیل میں رکھا جاتا ہے۔ خاکہ نگاری کے ذریعہ موضوع خاکہ شخص کی زندگی اپنے غالب خصائص اور متنوع جہات کے ساتھ زندہ ومتحرک نظر آتی ہے۔ قدم قدم پر خاکہ نگار کے تخیل اور مشاہدے میں قاری شرکت کرتا اور حظ اٹھاتا ہے۔ کسی شخص پر خاکہ اس شخص کی شخصیت کا آئینہ ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ آئینہ گری آسان کام نہیں ہے۔ خاکہ نگار کو جہاں ایک طرف متعلقہ شخص کے مختلف ومتنوع پہلوؤں پر نظر رکھنی ہوتی ہے وہیں یہ اہتمام بھی کرنا ہوتا ہے کہ ان پہلوؤں کو اس طرح لفظی پیکر دیا جائے کہ پڑھنے والا لطف حاصل کرے اور جس پر خاکہ لکھا گیا ہے اگر وہ زندہ ہے تو وہ بھی کسی حوالے سے شرمندگی کا شکار نہ ہو۔ یعنی لطف کا وجود سبھوں کے لئے معنی رکھتا ہو۔ قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی لکھتے ہیں:

''خاکہ نگار جب کسی شخصیت کو اپنا موضوع بناتا ہے تو صحیح معنوں میں اسے تلوار کی دھار پر چلنا ہوتا ہے، اس لئے کہ اس سے اگر ذرا سی بے توجہی ہوجائے تو تحریر کا لطف غارت ہوسکتا ہے۔ خاکے مزاحیہ بھی ہوتے ہیں اور سنجیدہ بھی، تاہم زیادہ دلچسپ خاکے وہی ہوتے ہیں، جن میں مزاح کی ہلکی سی چاشنی موجود ہوتی ہے۔ البتہ اس میں تناسب نہایت ضروری ہے۔ پھکڑ پن اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی بے تکلفی سے بھی لطف غارت ہوسکتا ہے۔''

(مقدمہ ''قلمی خاکے''، پروفیسر ظفر احمد نظامی، مرتب: ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۷)

اردو میں خاکہ نگاری کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کے آغاز وارتقا پر مختصر روشنی ڈالی جائے۔ جہاں تک قدیم اردو زبان کا معاملہ ہے اس میں خاکہ نگاری کی صنف کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اردو کے قدیم تذکروں اور سوانح عمریوں میں کسی کسی شخص کے خاکوں کے نقوش ضرور ملتے ہیں لیکن ان نقوش کو خاکہ نگاری کا نام دیا جانا درست نہیں ہوگا۔ خاکہ نگاری کا وجود واضح طور پر جدید ادب کے ذریعہ سامنے آیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ خاکہ نگاری نے اپنی شکل بیسویں صدی کے اوائل میں ظاہر کی۔ اردو میں خاکہ نگاری کا ابتدائی حوالہ ڈاکٹر عبدالمغنی یوں دیتے ہیں:

''اردو میں خاکہ نگاری ہوئی تو ضروری ہے مگر معتدبہ نہیں، چند مزاح نگار شاروں نے بالعموم ظریفانہ یا طنزیہ خاکے لکھے ہیں، جو اپنی جگہ یقیناً بہت دلچسپ ہیں لیکن حقیقی شخصیتوں کے ایسے خاکے بہت کم ہیں جن میں ظرافت کی چاشنی کے ساتھ کسی کردار کے خدوخال نمایاں کئے گئے ہوں۔ ان میں سب سے اہم اور مثالی فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''نذیر احمد کی کہانی'' ہے۔ اگر اس معیار کے خاکے معتدبہ تعداد میں ہوتے تو شاید اردو ادب خاکہ نگاری کی دنیا میں دوسرے کسی ادب سے کم نہیں ہوتا۔''

(بہار میں اردو خاکہ نگاری، حسن احمد، جنوری ۱۹۸۷ء)

اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدائی جھلکیاں جیسا کہ کہا گیا تذکروں اور سوانح عمریوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان جھلکیوں کے اشارے اور اولیت کے تعلق سے ناوک حمزہ پوری لکھتے ہیں:

"اردو کی قدیم تاریخ، تذکروں، مثنویوں، سوانح عمریوں میں کہیں کہیں خاکہ نگاری کے اجزائے ترکیبی کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں اور پہلی بار یہ جھلکیاں زیادہ واضح انداز میں مولانا حسین آزاد کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ حضرت علامہ شبلی سیرت نگاری میں یوں الجھے کہ خاکہ نگاری کی طرف کما حقہ توجہ نہ کر سکے لیکن یہ جھلک ان کی تصانیف میں بھی ملتی ہے۔ حالی کی حیات جاوید اور ناصر علی کے انشائیوں میں بھی ان کے اندر کا چھپا ہوا خاکہ نگار کبھی کبھار سر ابھارتا نظر آتا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اس فن کو اس کے تمام تر لوازمات کے ساتھ اردو ادب میں پہلی بار لا کھڑا کیا۔"

(تادیب ادب، ناوک حمزہ پوری، ۲۰۰۱ء، ص: ۶۰)

مذکورہ اقتباسات سے خاکہ نگاروں کے کچھ ایسے نام سامنے آتے ہیں، جن کی تحریروں میں خاکہ نگاری کے واضح خدوخال ملتے ہیں اور خاکہ نگاری اپنی واضح شکل میں رونما ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مرزا فرحت اللہ بیگ اور رشید احمد صدیقی قابل قدر قلم کار کے طور پر اپنی پہچان بناتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ اردو خاکہ نگاری کے پہلے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ اردو میں پہلا باضابطہ خاکہ انہوں نے ہی لکھا۔ یہ خاکہ ۱۹۲۷ء میں لکھا گیا جسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ یہ وہی خاکہ ہے جس کا ذکر اوپر ڈاکٹر عبدالمغنی کی تحریر کے اقتباس میں موجود ہے۔ یعنی "نذیر احمد کی کہانی۔" واضح ہو کہ ڈپٹی نذیر احمد مرزا فرحت اللہ بیگ کے استاد تھے۔ جہاں تک خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کی بات ہے تو اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے نیرنگ خیال اور آب حیات کے ذریعہ کردار نگاری کے وہ نمونے پیش کئے جو آگے چل کر خاکہ نگاری کی صورت میں موسوم و متعارف ہوئے۔ اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش کے بارے میں قاضی عبیدالرحمن ہاشمی لکھتے ہیں:

"اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش شعراء کے بارے میں لکھے گئے اہم تذکروں میں ملتے ہیں چنانچہ میر نے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں بعض شاعروں کی قلمی تصویر جس طرح کھینچی ہے وہ اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی تر و تازہ ہے۔ اس روایت کو سب سے زیادہ مستحکم مولانا محمد حسین آزاد نے کیا جنہوں نے نیرنگ خیال اور آب حیات میں شبیہ سازی کی غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کر کے بعض کرداروں کو لازوال کر دیا۔"

("قلمی خاکے" پروفیسر ظفر احمد نظامی، مرتب ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۸)

نکات الشعراء اور آب حیات کے علاوہ کچھ تذکرہ نگاروں نے بھی شاعروں پر لکھتے وقت کچھ تفصیلات اس انداز میں پیش کی ہیں کہ ان سے خاکہ نگاری کے بعض اجزا اس طرح مترشح ہوتے ہیں کہ انہیں خاکہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس تعلق سے قدرت اللہ قاسم کے "مجموعہ نغز" سعادت خاں ناصر کے "خوش معرکہ زیبا" کا نام لیا جاسکتا

ہے جن میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ اسی طرح انشاء اللہ خاں انشا کی کتاب ''دریائے لطافت'' کا بھی نام لیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں بھی خاکہ نگاری کی جھلکیاں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ مکتوبات غالب میں بھی کئی اشخاص کی تصویریں خاکہ نما انداز رکھتی ہیں۔

جیسا کہ قبل مذکور ہوا اردو میں خاکہ نگاری کا باضابطہ آغاز بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی سے اس وقت ہوتا ہے جب مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' شائع ہوا۔ اس سے قبل اردو میں کسی خاکہ یا خاکہ نگار کا پتہ نہیں چلتا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا یہ مضمون ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے جو پہلی بار سہ ماہی ''اردو'' اورنگ آباد میں ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ مضمون ''مضامین فرحت'' کی پہلی جلد میں شامل ہوا۔ واضح ہو کہ 'مضامین فرحت' سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے چند دوسرے مضامین کے ذریعہ بھی خاکہ نگاری کی مثالیں پیش کیں لیکن وہ اس قدر مقبول نہ ہوسکیں جو ''نذیر احمد کی کہانی...'' کو حاصل ہیں۔

محمد حسین آزاد اور مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد جو قابل ذکر قلم کار خاکہ نگاری کے حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں، ان میں مولوی عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر حسن، رشید احمد صدیقی، سعادت حسن منٹو، محمد طفیل، مالک رام، محمد شفیع دہلوی، بشیر احمد ہاشمی، خواجہ غلام السیدین، عبدالرزاق کانپوری، عبدالماجد دریابادی اور خواجہ احمد فاروقی وغیرہ ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری میں جن کا حصہ ہے ان میں عصمت چغتائی، اشرف صبوحی، دیوان سنگھ مفتوں، شوکت تھانوی، ڈاکٹر سید محمد حسنین، اعجاز حسین، معین الدین دردائی، چراغ حسن حسرت، سہیل عظیم آبادی، تمکین کاظمی، شمیم مظفرپوری، غلام احمد فرقت کاکوروی، رئیس احمد جعفری، قیوم خضر، محمد طفیل، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر نذر امام، ضیاء الدین احمد برنی، شاہد احمد دہلوی، علی جواد زیدی، تخلص بھوپالی، الطاف حسین قریشی، نریش کمار شاد، احمد یوسف اور عبدالصمد وغیرہ کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔

....

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ایل این ایم یو، دربھنگہ

● معروف افسانہ نگار اور شاعر ضیاء الرحمٰن ضیاء (اصل نام ضیاء الرحمٰن انصاری ولادت ۳ راپریل ۱۹۵۳ء بمقام آسنسول) کا انتقال ۲۷ رجنوری ۲۰۱۶ء کو پونے آٹھ بجے شب ان کی رہائش گاہ واقع جہانگیری محلہ میں ہوگیا۔ ۲۸ رجنوری ۲۰۱۶ء کو جہانگیری محلہ قبرستان میں بعد نمازِ عصر تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کینندوا ہائی اسکول کلٹی سے بحیثیت سائنس ٹیچر تین سال قبل سبکدوش ہوچکے تھے۔ انکا ایک افسانوی مجموعہ ''فصیلوں کا قیدی'' شائع ہوچکا ہے۔ شعری مجموعہ ''بوند بوند روشنی'' زیرِ ترتیب ہے۔ مرحوم بے حد نیک اور مخلص انسان تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔

محمد افروز الہدیٰ

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی ادبی خدمات

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی جیسی عظیم وقد آور و یکتائے روزگار شخصیت صدیوں میں جا کر معرض وجود میں آتی ہیں۔ جو اپنے متنوع صفات و کمالات اور گوناں گوں امتیازات و اکتسابات، مومنانہ کردار و گفتار، اسلوب و تحریر کی صلاحیت خداداد فکر و نظر کی بلندی و رفعت علم و حکمت کی وسعت و شمولیت، قلب و جگر کے سوز و گداز، دینی غیرت و حمیت اور جذبہ اصلاح و دعوت میں انفرادی حیثیت کے مالک تھے۔

یوں تو پورا علمی حلقہ حضرت امیر شریعت کو ایک قائد، مدبر اور مصلح کے نام سے جانتی ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں جو دینی وملی خدمات انجام دیئے اور جس طرح انہوں نے ''اتحاد امت'' کے تحت پوری قوم کو ایک اتحاد کی لڑی میں پرونے کی کوشش کی اس کی ایک شاندار تاریخ ہے جس سے انکار کی قطعی گنجائش نہیں۔ چاہے پلیٹ فارم جامعہ رحمانی مونگیر کا ہو یا امارت شرعیہ پٹنہ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا ہر جگہ آپ نے اپنی گرانقدر خدمات کے وہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں جن کی یادیں صدیوں تک باقی رہے گی۔ لیکن ان سب خوبیوں کے ساتھ اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ ان سب کے ساتھ اللہ رب العزت نے ایسا ادیبانہ طرز عطا کیا تھا کہ آپ کی تحریریں پڑھنے کے بعد کوئی بھی عش عش کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بس اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ حضرت امیر شریعت ملی قیادت کے ساتھ تصنیف و تالیف اور علم و تحقیق کے آدمی تھے تو شاید آپ کا یہ خیال غلط نہیں ہوگا۔

یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج مثبت تحریر میں لکھنے والے افراد کی تعداد بہت کم ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ملت کی زبوں حالی اور آپ کا سوز دروں فن تصنیف و تالیف کے اس میدان میں لا کھڑا کیا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے اور شاید یہ بات بھی آپ کو عجب لگے کہ ملی قیادت اور عوامی مسائل کے حل میں شب و روز مشغول رہنے کے باوجود آپ نے اس فن سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ بھلے ہی آپ عوام وخواص میں ایک بلند خطیب کی حیثیت سے معروف و مقبول تھے لیکن آپ کی تقریریں جتنی پر کیف اور شستہ ہوتی تھیں وہی عکس آپ کی تحریروں میں بھی نظر آتا تھا۔

آپ کی تحریروں کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ آپ کی تحریریں جوش وخروش اور درد وسوز کے ساتھ ساتھ بڑی خوبصورتی اور رعنائی کا بھی مظہر ہوتیں اور ان سب کے بیچ آپ کی تحریروں سے ادب کی جو چاشنی محسوس کی جاتی وہ بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہیں۔

آپ حضرت امیر شریعتؒ کی اس ادبی تحریر کو پڑھئے اور بار بار پڑھ کر اس کا لطف لیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضرت امیر شریعتؒ نے ایک بڑے معاملے کو کس طرح پوری سنجیدگی کے ساتھ ادب کے سانچے میں ڈھال کر اپنی تحریر کے حسن کو دوبالا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے ادبی مزاج کا سب سے امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ نے کبھی بھی طوالت کو اپنی تحریر کا حصہ نہیں بنایا بلکہ بڑی سے بڑی بات کو مختصر اور نہایت جامع انداز میں اس کو پیش کرنے کی کوشش کی کہ آپ کی تحریر کو پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں علمی

حلقے نے آپ کی علمی قابلیت فنی مہارت اور قائدانہ صلاحیت کا اعتراف کیا ہے وہیں ادب نواز طبقہ بھی آپ کی تحریروں کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھتا بلکہ اس کو سند کی حیثیت دیتا ہے۔ یہ تو ایک امر مسلم ہے کہ حضرت امیر شریعت کو اللہ رب العزت نے جو ادیبانہ طرز عطا کیا تھا اس کی جھلک آپ کی تحریر کے ہر حصے میں صاف نظر آتی تھی۔ چاہے آپ کسی حساس مسئلہ پر کوئی مقالہ تحریر فرما رہے ہوں یا کسی شخصیت کے تعارف میں آپ کے قلم چل رہے ہوں یا اخبار کیلئے پریس ریلیز جاری کر رہے ہوں پھر آپ اپنے کسی عزیز یا مخلص کو خط تحریر فرما رہے ہوں ہر جگہ آپ کی ادبی صلاحیت کا سنہرا عکس جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر جب آپ کا قلم ایک مرتبہ حضرت مولانا برہان الدین قاضی شریعت اتر پردیش کے نام خط کے لئے چلا تو آپ کے نوک قلم سے جس انداز کے جملے نکلنے شروع ہوئے شاید اسے پڑھ کر آپ بھی ادب کی چاشنی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

حضرت امیر شریعتؒ نے لکھا:

''مکرم بندہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

خط ملا، مونگیر میں سردی بہت زیادہ تھی اس لئے میں نے جنوبی ہند کا سفر کیا۔ مدراس، بنگلور اور بھٹکل گیا، بنگلور میں ہلکی ٹھنڈی تھی، رات کو ایک چادر اوڑھ کر سوتا تھا، مدراس میں ٹھنڈک بالکل نہیں تھی دن کو پنکھا چلتا تھا، رات کو پنکھا بند کر کے کچھ اوڑھے بغیر سوتا تھا، بھٹکل میں تو خالی گرمی تھی، جیسے یہاں مئی کے پہلے ہفتے میں ہوتی ہے۔ دن رات پنکھا چلا کرتا تھا، پسینہ آتا تھا، ہلکی گرم شیروانی لے لیا تھا، جو وہاں پہن نہ سکا۔ ۱۹ر جنوری کو یہاں واپس آیا، یہاں تو ٹھنڈک اب بھی خاصی ہے۔ جی ہاں! میں نے پاٹھک جی کے لئے اپیل دی تھی، ان کے متعلق عام خیال یہی تھا کہ وہ کامیاب نہ ہوں گے اللہ نے لاج رکھ لی اور انہیں ۹۰ ہزار ووٹوں سے کامیاب کیا۔

''مسلم پرسنل لا'' میں تبدیلی کا کام حکومت کے ہاتھوں ہوتا ہے جسے ممبر پارلیمنٹ بناتے ہیں۔ ساتویں پارلیمنٹ میں بھی کانگریس آئی کی دو تہائی اکثریت تھی، یعنی وہ دستور ہند میں ترمیم کر سکتے تھے اور ترمیم کی۔ اس دفعہ تین چوتھائی کی اکثریت ہے۔ دستور میں ترمیم کرنے کی حق دفعہ بھی ہے اور کریں گے۔ اس دفعہ تو کانگریس آئی نے اپنے مینی فیسٹو میں ''مسلم پرسنل لا'' کے تحفظ کا وعدہ کیا ہے، وعدہ کہاں تک پورا کیا جائے گا یہ تو الگ بحث ہے۔ ہمارے لئے گورنمنٹ جیسے پہلے تھی ویسے اب بھی ہے۔ مقابلہ پہلے بھی کرنا تھا اب بھی کرنا ہے۔ ساتویں پارلیمنٹ میں مسلمان ممبران کی تعداد ۷۰ رسے اوپر تھی اس دفعہ پچاس سے بھی کم ہے۔ نئے وزیر اعظم نے اب تک جو اعلانات کئے ہیں اور بیانات دیئے ہیں وہ امید افزا ہیں اور کافی اچھے ہیں، ان پر عمل کہاں تک ہوگا، کس پر ہوگا اس کی خبر نہ مجھے ہے نہ عوام کو ہے اور نہ خود وزیر اعظم کو ہے، کیا حالات رہتے ہیں اور ان حالات میں کیا کرنا ہوگا یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ''مسلم پرسنل لا'' میں تبدیلی دوسرے تو بعد میں کریں گے ہم خود اپنے ہاتھوں اپنے گھر میں کر رہے ہیں، مسلمانوں کے لاکھوں گھرانے ایسے ہیں جہاں روزانہ شریعت وسنت کے خلاف عمل

ہوتا ہے کیا اور یہ کے علاقہ میں ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے میرے عزیز دوسروں پر تبصرہ کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے۔ اگر ہم لوگ ''مسلم پرسنل لا'' پر خود پوری طرح عمل کریں تو حکومت یا ممبران پارلیمنٹ ''مسلم پرسنل لا'' میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔''

(امیر شریعت رابع، مطبوعہ: امارت شرعیہ، پٹنہ، ص: ۷)

یہ تو ہے حضرت امیر شریعتؒ کے ادیبانہ انداز تحریر کا ایک نمونہ۔ آپ پوری باریکی کے ساتھ اس تحریر کے ایک ایک ٹکڑے کو پڑھئے اور غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح سادگی اور سلاست و روانی کے ساتھ انہوں نے ایک اہم مسئلہ کو تحریر کا جامہ پہنایا ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ کی تحریر کی ان ہی خوبیوں کا اثر ہے کہ آپ کی ہر تحریر چاہے وہ کتاب یا کتابچے کی شکل میں ہو یا مقالات و خطوط کی شکل میں ہر طبقہ میں یکساں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ ان کی تحریر میں درد و سوز کے ساتھ امت کو کسی بات کی تلقین کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ کی تحریر کے ایک ایک حصہ دل کی گہرائیوں کو چھو جاتے۔

آیئے ان کی تحریر کا ایک اور ادبی نمونہ دیکھتے چلیں، جو آپ نے ایسے وقت تحریر فرمایا تھا جب حکومت اور ملک کی اکثریت نے مسلمانوں پر فرقہ پرستی کے الزامات کا تیر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ آپ نے اس حساس معاملہ کا نہ صرف بروقت محاسبہ کیا بلکہ آپ نے اپنی تحریر کے ذریعہ نہایت سلیس اور ادیبانہ انداز میں حکومت اور ملک کی اکثریت کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ ملک کا مسلمان کسی بھی طرح فرقہ پرست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی رگوں میں نہ صرف اس ملک میں محبت و وفاداری کا خون دوڑتا ہے بلکہ انہیں ہندوستان کی جمہوریت پر بھلا کون ہوگا جو حضرت کے ادیبانہ انداز تحریر کا دلدادہ نہیں ہو سکے گا، سچ تو یہ ہے کہ حضرت امیر شریعتؒ اپنے دور کے ان صاحب اسلوب ادیبوں میں سرفہرست تھے، جن کی تحریریں آج بھی ادبی حلقوں میں وقار و سند کی حیثیت سے دیکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

....

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ایل این ایم یو، دربھنگہ

''جس زبان کی جڑیں اپنے ملک کے لسانی ذخیرے اور اس کی تہذیبی سرزمین میں اتنی گہری ہوں، جس کا دامن اتنا وسیع ہو، جس کے لہجے میں ایک خاص کشش اور کھنک ہو، جس کے انداز میں ایک خاص شستگی اور شائستگی ہو، جس کی قومی خدمات ایسی وقیع ہوں...... وہ زبان کبھی مٹ نہیں سکتی۔ اس زبان پر ہندوستان کا ایسا حق ہو جو کبھی ٹھکرایا نہیں جا سکتا اور اردو کا بھی ہندوستان پر ایسا حق ہے جو ضرور وصول ہونا چاہیے۔''

''حقوق ملنے سے زبان کو ایک سماجی اور قومی وقار ملتا ہے، وہ اپنے گھر میں بے گھر نہیں بھی جاتی۔ وہ بے چہرہ، برباد اور بے نشان ہونے سے بچ جاتی ہے۔ اپنے چہرے کی شناخت ہو جائے تو پھر دوسرے چہروں کی شناخت کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔ اردو کو حق ملے گا تو ہندی کا احترام بڑھے گا۔ سیکولرزم میں یقین، مشترک تہذیب سے وابستگی اور جمہوریت میں اعتماد بحال ہوگا۔''

(پروفیسر گوپی چند نارنگ)

نزہت جبیں

ڈاکٹر شعیب راہی: حیات اور ادبی خدمات

ڈاکٹر محمد شعیب راہی کا خاندان اعظم گڑھ سے ہجرت کر کے سہسرام آیا۔ آپ کے چوتھے دادا قاضی فرحت حسین کی آٹھ اولادیں ہوئیں جن میں میر راحت حسین آپ کے صاحبزادے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت سہسرام میں ہوئی اور انہیں کے صاحبزادے محمد یعقوب صاحب کا تبادلہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۸ء کے درمیان ڈالٹن گنج پلاموں میں ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں آپ کے صاحبزادے مولانا سید محمد ایوب شمیم ندوی جو سورج پورہ ہائی اسکول میں مولوی تھے۔ ڈالٹن گنج میں گرور ہائی اسکول میں فارسی کے شعبے میں بہ حیثیت ہیڈ مولوی کے تقرری ہوئی۔ جناب راہی صاحب اپنے نانا نانی کی تربیت میں سہسرام میں اس وقت تک رہے جب تک آپ کی والدہ ماجدہ محمودہ بی بی زندہ تھیں۔ لیکن اپنے والد اور دادا کے پاس بھی اکثر و بیشتر ڈالٹن گنج میں رہا کرتے تھے۔ دونوں جگہ کی تربیت کا اثر تاعمر قائم رہا۔ مذہبی رجحان ہمیشہ آپ کی تحریک پر غالب رہا۔

یوں تو اردو زبان و ادب کا دبستان دو اہم مانا جاتا ہے۔ ایک دبستانِ دہلی اور دوسرا دبستانِ لکھنؤ لیکن دکن نے بھی اردو کی خدمات اس وقت انجام دی ہے جس وقت شمالی ہندوستان میں اسے اپنانے سے شعراء گریز کیا کرتے تھے۔ اسی طرح سے پنجاب کا بھی ایک اپنا دعویٰ ہے لیکن وہ اردو کی پیدائش پر مباحث سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح سے بہار نے اردو ادب کی شروع سے خدمت کی ہے اور یہاں پر ہر خطہ اردو ادب کی اپنے اندر تاریخ رکھتا ہے۔ عظیم آباد جو شش اور راسخ نے اردو کو بے بہا نگارشات سے نوازا۔ اسی طرح مگدھ کی بھی بڑی قدیم تاریخ ہے جس میں بڑے بڑے شعراء کرام پیدا ہوئے۔ اسی طرح سہسرام کی بھی اپنی تاریخ اپنے اندر ادب کی تاریخ رکھتی ہے۔ کیوں کہ یہاں افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کا تعلق ہے۔ اردو کی پیدائش میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب ''زبان و ادب'' میں ایک اہم نکتہ سامنے لایا کہ اردو پشتو زبان کی پیداوار ہے اور پشتو افغان کے علاقے اور سرحد میں بولی جاتی ہے۔ تو گویا اس کا تعلق افغان سے ہے۔ لودی خاندان جب حکمراں ہوا تو اس نے فارسی ادب کی سرپرستی نہیں کی بلکہ اس نے ریختہ کو زیادہ ترجیح دیا جو یہاں کی زبان تھی۔ فارسی زبان سے لودی یا سوری خاندان کو نفرت نہیں تھی کیوں کہ لودی خاندان سے جس نے حکومت کو چھینا وہ مغل تھے۔ جن کی مادری زبان ترکی تھی لیکن ان کے ساتھ ایرانی اور افغانی نسل کے لوگ بھی تھے جن کی زبان فارسی تھی۔ یہ دو زبان ترکی اور فارسی مغلوں کے قریب تھی لیکن جب شیر شاہ کی حکومت ہوئی تو اسی ریختی کو انہوں نے ترجیح دیا جو آگے چل کر اردو کہلائی۔ یہی زبان اس سے پہلے بھی اور شیر شاہ کے وقت میں بھی رائج تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سوری خاندان نے ریختی کی باضابطہ سرپرستی کی۔ شیر شاہ کی تعلیم سہسرام میں ہوئی لیکن انہوں نے جونپور جا کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس وقت سہسرام میں اہلِ علم حضرات نہیں تھے بلکہ بڑے بڑے علماء یہاں موجود تھے اور جب حسن خاں سوری نے شیر شاہ کو ایک خط میں لکھا کہ ''کیا سہسرام کو تم عالموں سے خالی سمجھتے ہو اس لئے تم یہاں چلے آؤ''۔ ظاہری بات ہے کہ حسن

خاں کے وقت میں بھی اہلِ علم حضرات تھے اور باضابطہ جاگیردار حسن خاں اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے علاوہ اہلِ علم کے قدرداں بھی تھے۔ شیر شاہ کے زمانے میں بھی سہسرام کے اعتراف علم، ادب سے لوگ قریب تھے اور خود شیر شاہ ریختی زبان کی سرپرستی کیا کرتے تھے اور دلچسپی لیتے تھے۔ اسی طرح ان کے بعد ان کے بیٹے سلیم شاہ جن کا اصل نام جلال الدین خاں تھا جس نے آٹھ سال تک پورے ہندوستان پر حکومت کی اور اپنے والد شیر شاہ کے ادھورے کام کو مکمل کیا۔ اس وقت بھی سہسرام بارونق تھا اور اہلِ علم نہ صرف قرب وجوار بلکہ دوسرے صوبے سے بھی آکر یہاں ہمیشہ کے لئے یہاں اپنا مسکن بنالیا۔ لیکن جب ہمایوں نے سوری خاندان سے حکومت چھینا گو پٹھان قبیلے چاروں طرف بکھر گیا لیکن اہلِ علم کا جو طبقہ تھا وہ سہسرام میں زیادہ رہ گیا۔

ادبی سرگرمی میں اس لئے آپ بہت زیادہ فعال تھے کیوں کہ جہاں اچھے فنکار ہوتے ہیں وہاں ہر فنکار زیادہ اچھی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈالٹن گنج میں بھی نومشق سے لے کر کہنہ مشق شاعر اور شاعرات (حلقۂ نسواں) باضابطہ طور پر کام کرتا تھا اور ہر ماہ شاعر اور شاعرہ اپنے کلام بہتر سے بہتر پیش کیا کرتے تھے۔ آپ خود اس بات سے اندازہ لگائیں کہ جب ایسے فن کے مظاہرے ہر ماہ ہوتے رہیں تو کوئی بھی فنکار اپنے فن کو کس طرح پیش کرتا ہوگا۔

ڈالٹن گنج کا ادبی ماحول اتنا سرگرم تھا کہ ایک ایک مشاعرے میں چالیس سے پچاس تک شعراء اور شاعرات آیا کرتے تھے۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں سہ ماہی ''کونپل'' رسالے کا اجراء ہوا جو قریب تین سال تک نکلتا رہا۔ اس رسالے میں ڈاکٹر شعیب راہی کی چیزیں تو آتی ہی رہتی تھیں لیکن آپ مجلسِ ادارت میں بھی شامل تھے۔ ظاہری بات ہے کہ چاروں طرف ادبی ماحول اور اس وقت ادبی ماحول کا مرکز اردو لائبریری ڈالٹن گنج تھا جو ۱۹۳۴ء میں قائم ہوئی تھی آج بھی موجود ہے۔

۶۱-۱۹۶۰ء میں ایک روحی مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں ہر شاعر نے اپنے بزرگ شاعر کا کردار نبھایا۔ جس میں ڈاکٹر راہی نے بھی نظیر اکبرآبادی کا رول نبھایا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس میں شاعر نظامی، عرش ملسیانی، اختر اور رینوی شریک ہوئے۔ استقبالیہ میں ڈاکٹر شعیب راہی خاص طور سے شامل تھے۔ ۱۹۶۷ء میں بسمل الہ آبادی بھی جی۔ ایل۔ اے کالج میں اور دوسرے شعراء بھی آئے۔ جناب نادم بلخی اور شعیب راہی نے جی۔ ایل۔ اے کالج میں طلبہ وطالبات کے لئے بزم ادب قائم کیا اور اسی بزمِ ادب نے بڑے بڑے سمینار اور مشاعرے کئے اور جو طالب علم اپنے ذوق کا اظہار جب کرتا تو یہ دونوں حضرات بڑی حوصلہ افزائی کرتے۔ سال میں کئی بار حسین آباد اور حیدر نگر بھی جایا کرتے اور مشاعرے میں شریک ہو کر ادب کا فروغ کرتے۔ ۱۹۶۸ء میں جی۔ ایل۔ اے کالج میں حلقۂ شعر وسخن کی جانب سے آل انڈیا مشاعرہ ہوا جس میں شعیب راہی صاحب اور معین ساحر بہت فعال تھے۔

۱۹۶۹ء میں یوم غالب کے موقع پر جب آل انڈیا مشاعرہ ہوا تو بہت سارے شاعر، ڈاکٹر شعیب راہی کی فرمائش پر بلائے گئے۔ یہ مشاعرہ ضلع اسکول کے وسیع میدان میں ہوا۔ شعیب راہی ہمیشہ اپنے اخلاق سے ہندو

مسلم میں مشہور تھے ہی لیکن وہ ہمیشہ جس نظریہ کے مالک تھے اس میں آہستہ آہستہ عملی طور پر سرگرمیاں جب کم ہونے لگیں تو آپ خود کو ادب کی طرف ڈھالنے لگے۔

۱۹۷۳ء میں ایک مقالہ آپ نے لکھا ''ہندو اور اردو''۔ جس کے لئے آپ کو لکھنؤ ہندو اردو کانفرنس میں بلایا گیا جس کے کنوینر رام لعل تھے۔ یہ کانفرنس تین روزہ تھا۔ آپ نے اپنے استاد محترم جناب مجبور شمسی کی ادبی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''بزمِ مجبور'' ۱۹۷۲ء میں قائم کیا جس میں جناب مقیم شاعر جلا الدین خاں اوج اکبر پوری، مجیب نشتر، ذکریا مضطر اور دوسرے حضرات تھے لیکن اس ''بزمِ مجبور'' کو قائم کرنے میں سب سے زیادہ شعیب راہی صاحب کا رول رہا۔ ۱۹۷۳ء میں آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل ہوئی تو آپ پلاموں کے پہلے اردو کے ڈاکٹریٹ ہوئے۔ اس کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مجبور شمسی اور دوسرے حضرات نے آپ کے کارناموں کو بہت سراہا۔ اس میں ڈاکٹر شعیب راہی نے کہا کہ جب تک آپ کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹائیں گے آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ آپ کے پی ایچ ڈی کا موضوع ''آتش کی حیات اور شاعری'' تھا۔ اسی زمانے کی آپ کی نظم ''علم'' بہت ہی مشہور ہوئی تھی۔ یوں تو اشتراکی تحریک کے علم بردار اور بھی دوسرے لوگ تھے لیکن پلاموں کے اردو کے پہلے ترقی پسند شاعر بدر نیازی کو کہا جاتا ہے۔ اس وقت راہی صاحب کی ادبی زندگی کی شروعات ہوئی تھی۔

بعد میں آپ کی شاعری کا رخ اسی تحریک کی طرف ہمیشہ کے لئے مڑ گیا اور انہوں نے جو کچھ بھی کہا وہ ادب کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔ ''بزمِ مجبور'' نے بہت سارے ادبی کارنامے انجام دئے جیسے تلامذہ مجبور میں مجبور شمسی کے شاگردوں سے خط وکتابت کر کے اسے یکجا کیا اور پھر شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ لیکن مجبور شمسی کا ۸/ فروری ۱۹۷۴ء کو اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا تو ڈاکٹر شعیب راہی سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ لیکن آہستہ آہستہ پھر اپنی ادبی دنیا کی طرف اسی طرح سے سرگرم عمل نظر آئے۔ ۱۹۷۶ء میں مجبور شمسی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ضلع اسکول کے ہال میں دو سیشن پر مشتمل سمینار اور مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر شعیب راہی پیش پیش رہے۔ اسی طرح جب ۱۹۸۸ء میں ادارہ ''فکر و ادب'' کو قائم کیا گیا اور اس میں نوجوان شعراء اور ادب نواز لوگ متحرک ہوئے تو ڈاکٹر شعیب راہی نے ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی اور برابر نوجوانوں کو ادب کی رغبت دلاتے رہے۔ باوجود اس کے کہ آپ پروسٹیٹ سے پریشان تھے۔ آپریشن ہونے کے باوجود بیماری میں اضافہ ہی ہوتا رہا لیکن مشاعرے اور دوسری ادبی کانفرنس میں ہمیشہ شریک ہوتے رہے۔ انجمن ترقی اردو میں بھی آپ سرگرم عمل رہے۔ اردو گرلس ہائی اسکول کا جب قیام ہوا تو اس وقت بھی آپ تعلیم نسواں کی اہمیت کے پیش نظر لوگوں کے پاس جایا کرتے اور جو لڑکیاں اپنے گھروں میں بند تھیں انہیں تعلیم کے حصول کی اہمیت بتا کر لایا کرتے۔ ڈاکٹر شعیب راہی جب بالکل معذور ہوگئے تو مشاعرے میں اپنی غزل بھیجنے پر اکتفا کرنے لگے۔ لیکن وہ ادب سے بالکل آخری وقت تک قریب تر رہے اور بالآخر ۱۶/ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو ڈیڑھ بجے شب کو آپ کا انتقال ہوگیا۔

....

ریسرچ اسکالر (اردو)، شعبۂ اردو، ایل این ایم یو، دربھنگہ

عبدالسلام عارف

افسانے کا فن اور خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا اشتراکی نظام

''خواجہ احمد عباس جاہلوں' جذباتیوں اور اعتقاد پرستوں کے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ وہ پڑھے لکھے بالغ اذہان کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ افسانہ نگاروں کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ماضی اور حال سے آگے جاکر مستقبل کی تعبیر کے متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ ان کا ادب صنعتی انقلاب کے فروغ کا ادب ہے۔ اور جوں جوں ہندوستان میں اس انقلاب کو تقویت حاصل ہوگی عباس کی تحریروں کی تابانی بڑھتی جائے گی۔ اور کبھی مخالف انقلاب آیا اور فسطائیت کے اندھیرے نے ہمیں گھیر لیا تو عباس کی تحریریں سب سے پہلے جلائی جائیں گی۔'' (کرشن چندر)

جس طرح نظام حیات وکائنات کے آب وگل میں تغیر وتبدل کی کارفرمائی ہمیشہ سے جاری وساری ہے ٹھیک اسی طرح انسانی فکر وعمل کے تحت ادب وفن میں بھی تغیر وتبدل رونما ہوتا رہتا ہے۔ تاریخ وتہذیب کی ترقی وارتقا کے ساتھ ساتھ ادب وفن کی صورت وہیئت' مواد وموضوعات اور طرز اظہار میں بھی نت نئی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم کی فرصت نے داستانوی ادب اور شعری ادب کو جنم دیا اور جب رفتار زمانہ نے ضروریات زندگی میں وسعت پیدا کی اور فرصت کے اوقات میں قدرے کمی آئی تو ناول اور رزمیہ کا وجود عمل پذیر ہوا۔ اور جب سائنسی اور مشینی دور نے انسان کو حد درجہ مصروف کار بنادیا تو فن افسانہ نے جنم لے کر دل ودماغ کی فرحت وتازگی کا ایک اچھا وسیلہ فراہم کیا۔ آج فن افسانہ اپنی رعنائی ورنگینی اور عصری حالات وکیفیات کی عکاسی کے لحاظ سے ایک عمدہ اور مقبول ترین فن ادب بن گیا۔

اردو میں فن افسانہ عہد تغیر کی پیداوار ہے۔ افسانہ حیات وکائنات کی نیرنگیوں ورعنائیوں اور مسائل ومعاملات زندگی میں سے کسی ایک پہلو کو روشن کرتا ہے۔ لیکن یہ روشنی مکمل حیات وکیفیات کی طرف بلیغ اشارہ کرتی ہے۔ اس صنف ادب میں وہ صفت نہیں جو ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایجاز واختصار اس فن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اس میں غزل کی سی خوبی وخصوصیت کارفرما ہوتی ہے۔ یعنی حالات وخیالات کے دریا کو کوزہ میں بند کر کے غزل کی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ اس طرز عمل کے لیے حسن عمل' فنی ہنرمندی اور فنی صلاحیت وبصیرت درکار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ افسانہ زندگی کی ایک خوبصورت قاش کا نام ہے۔ اس کی صورت ایک تراشیدہ نگینہ کی ہوتی ہے۔ جب کہ ناول کی صورت ایک ہار کی طرح ہوتی ہے۔ دراصل فن افسانہ اپنی ہیئت وصورت کے اعتبار سے انفرادی خصوصیات اور قدر وقیمت کا حامل ہے۔ اس فن کی ترتیب وتہذیب میں اگر ایک طرف پلاٹ' کردار اور فضا بندی کی کارفرمائی ہوتی ہے دوسری طرف وحدت تاثر اور وحدت زمان ومکان کی خوبی کا ہونا بھی لازمی ہے۔ ایڈگر ایلین پو نے مختصر افسانے کے لازمی عناصر وشرائط کو اس طرح بیان کیا ہے:

''(۱) مختصر افسانے میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں آنا چاہیے جس کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ افسانے کے مرکزی خیال سے نہ ہو۔ (۲) افسانے میں صرف ایک ہی تاثر کا بیان ہونا چاہیے' اس افسانہ

میں اختصار ہونا چاہئے لیکن غیر ضروری اختصار نہیں' ساتھ ہی غیر ضروری تفصیل سے احتراز لازمی ہے۔(۳) مختصر افسانے کو ایک نشست میں ختم ہو جانا چاہئے۔(۴) اس میں آغاز سے انجام تک لہجے میں ہم آہنگی ہونا ضروری ہے۔(۵) اس میں ندرت اور جامعیت بھی اعلیٰ درجے کی ہونی چاہئے۔(۶) اس میں محاکات کو مکمل کیا جانا لازمی ہے۔(۷) اس میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہو اصلیت پر مبنی ہو۔''

(دی انسائیکلوپیڈیا۔ بیسویں جلد۔ چودھواں ایڈیشن۔ مطبوعہ ۱۹۳۷ء۔ ص: ۵۸۰ تا ۵۸۲)

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مختصر افسانہ ایک فن ہے جس میں اختصار و ایجاز کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی اس کے پڑھنے میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ وقت صرف نہیں ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی تعمیر و تخلیق میں وحدتِ عمل' تاثر وحدت زمان و مکاں ترکیب عمل میں ارتباط و استحکام کا ہونا لازمی ہے۔ حسن عمل' حسن کاری' برجستگی و ڈرامائیت اور شستگی و صفائی سے افسانے میں جاذبیت کی خوبی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایک کامل فنکار ان ساری خوبیوں کو بروئے کار لانے کی ہر ممکن سعی کرتا ہے۔ ایک چابکدست فنکار انفرادی اجتماعی زندگی اور واقعاتِ زندگی سے کسی ایک پہلو کو منتخب کر لیتا ہے اور پھر اس میں اپنی فنکاری' ہنر مندی' نقطہ نظر یا مقصد کی رنگ سازی کر کے قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ فن پارے کے آئینے میں ہی فنکار کی فنی صلاحیت و قدر اور مقصدِ حیات و نقطہ نظر کی نشاندہی کی جاتی ہے اور اس کے خیال و نظریہ کو پرکھا جاتا ہے۔

افسانوی فکر و فن کے اس تناظر میں جب ہم خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور افسانوی نگارشات کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند خیال و نظریہ اور اصلاحی جذبہ و مقصد کی ساری خوبیاں ان میں بدرجہ احسن موجود ہیں جو اشتراکی نظریات کی دین ہیں۔ وہ ایک کامیاب ترقی پسند ادیب تھے۔ ان کی افسانوی نگارشات ان کی ترقی پسندی کی مکمل طور پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کے افسانے روحِ عصر اور عصری واقعات و حالات کے متحرک مرقعے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان خلوص و محبت اور اصلاحی خیال و مقصد کے تحت ہی انہوں نے حقیقت نگاری کی بساط آرائی کی اور پھر قوم و ملک اور سماج و معاشرے کی خرابیوں اور بدعنوانیوں کی نفس گری شروع کی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا دور کشاکشِ حیات سے لبریز تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں بھی بے چینی و بے قراری اور کرب و اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ سماجی و تہذیبی قدریں پامال ہو رہی تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت و حقارت کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ ایسے ہی کشمکش اور کرب ناک فضا میں خواجہ احمد عباس نے اپنی افسانہ نگاری کی داغ بیل ڈالی اور ہر انسانی فلاح و بہبود اور معاشرتی اصلاح و سدھار کو اپنے فکر و فن کا اصل مقصد اور نصب العین قرار دیا۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے خیال و مقاصد اور نقطہ نظر کی وضاحت قدرے تفصیل سے کی ہے جو درج ذیل ہے:

''اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہی کہ انسان کی اندرونی زندگی اس کی ذہنی نفسیاتی مسائل اور اس کی بیرونی سماجی و اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے۔ جو کچھ دنیا میں اس کے اپنے ملک اور اس کے سماج میں ہوتا ہے اس کا گہرا اثر اس کے اپنے کردار پر اور اس کے افعال پر پڑتا ہے۔ جیسے جیسے دنیا' سماج' ملک کا اقتصادی' سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اسی طرح انسان بدلتے

رہتے ہیں۔ آج کے انسان وہ نہیں ہیں جو آج سے چار پانچ سو سال پہلے تھے۔ پرانے ادبی سانچوں میں وہ فٹ نہیں بیٹھتے۔ ان کو نئے ڈھنگ سے دیکھنے کی دکھانے کی، جانچنے کی، پرکھنے کی ضرورت ہے۔

یہ بدلتا ہوا ہندوستان اور بدلتے ہوئے ہندوستانی میرے افسانوں کا موضوع ہیں۔ مگر سماجی اور نفسیاتی تبدیلیاں یکساں رفتار سے نہیں ہوتیں۔ انسان کے کردار اور افعال پر مختلف سماجی طاقتیں اور نفسیاتی الجھنیں اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ کوئی انسان زیادہ اثر قبول کرتا ہے کوئی کم، کوئی جلدی جلدی بدلتا ہے، کوئی دیر میں۔ کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو بدلنے کو تیار نہیں ہوتا۔ میرے ان افسانوں میں آپ کو ایسے ہر قسم کے ہندوستانی ملیں گے، اچھے، بہت اچھے، ذہین، بہت ذہین، برے، بیوقوف، ظالم، مظلوم، اپنی قسمت آپ بنانے والے، اپنی محرومیوں اور الجھنوں سے رونے والے اور وہ بھی جنہوں نے قسمت کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں جو آج بھی سماج کی ذات پات کے واہموں اور ڈھکوسلوں کے غلام ہیں، ہمدردی رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ میرے ہم وطن ہیں، میرے ہم عصر ہیں۔ اپنے افسانوں میں ان کے چہرے اور کردار دکھانا چاہتا ہوں نہ صرف اوروں کو بلکہ خود ان کو، انسان کو، سماج کو شیشہ دکھانا بھی ایک انقلابی فعل ہوسکتا ہے۔''

(نئی دھرتی نئے انسان۔ از: خواجہ احمد عباس۔ ص: ۵ تا ۷)

بلاشبہ خواجہ احمد عباس کے افسانوں اور ان کی دوسری نگارشات میں ان خیالات و نظریات اور مقاصد کی بوقلمونی بدرجۂ احسن بکھری نظر آتی ہے۔ وہ ایک سچے حقیقت نگار اور محب وطن تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کی قومی وسماجی حالات و واقعات کو پیش کرنے کی بڑی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کا خیال و نظریہ ترقی پسند خیال و مقصد کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ ترقی پسند خیال و نظریہ کے تحت انہوں نے عالمی سطح کے مشہور و مقبول فنکاروں اور دانشوروں کے خیالات و نظریات کا مطالعہ کیا اور ان سے اپنے افکار و خیالات کو جلا بخشی۔ خود رقم طراز ہیں:

''مشہور ترقی پسند فرانسیسی دانشور ژاں پال سارتر کا کہنا ہے کہ ادب میں زندگی کو آئینہ دکھانا بھی ایک انقلابی کام ہوسکتا ہے۔ جو ادیب سماجی حقیقتوں کا انکشاف ان کی پردہ دری کرتا ہے وہ بھی انقلاب لانے کا کام کر رہا ہے۔ تخلیقی ادب کے ذریعہ یہ انقلابی کام جہاں دنیا کے عظیم ترین ادیبوں (جیسے ٹالسٹائی، گورکی، چیخوف، ٹیگور، سرت چندر چٹرجی، منشی پریم چند، اپٹانی، سنکلی، آرٹسٹ، ہیمنگ وے) نے اپنے ادب کے ذریعہ انجام دیا ہے اور دوسرے عظیم ادیب جیسے اسٹائن بیک، ژاں پال سارتر اور کرشن چندر آج کر رہے ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر میں بھی کر رہا ہوں۔ یا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

(نئی دھرتی نئے انسان از: خواجہ احمد عباس دیباچہ ص: ۷)

ان تحریری نقوش سے خواجہ احمد عباس کے ادبی مقاصد و نظریات بالکل صاف طور پر روشن ہوجاتے ہیں۔ انہوں نے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۳۶ء میں افسانہ ''ابابیل'' سے کیا اور انجام بخیر ہوا۔ ''کیپٹن سلمٰی'' پر ان کا افسانہ ۱۹۳۶ء

میں شائع ہوا اور آخری افسانہ بیسویں صدی میں ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے بے شمار افسانے لکھے ہیں۔ ان کے سارے افسانے عصری' سیاسی' سماجی' تہذیبی اور معاشرتی حالات و کیفیات کی متحرک تصویریں ہیں اور جن سے ان کے جذبات و خیالات اور خلوص و ہمدردی کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ یہ عصری آگہی اور ادراک و شعور کے زیر اثر خواجہ احمد عباس رفتار زمانہ کے تحت اپنے فن پاروں کی نقش گری کی اور اپنی شخصیت کو ابھارا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ترقی پسندی اور عصری آگہی کے گہرے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین یوں رقم طراز ہیں:

''خواجہ احمد عباس تو دراصل ۱۹۴۷ء میں ہی میدان میں آئے۔ لیکن گزشتہ پانچ چھ سال میں انہوں نے عصری زندگی کو کھنگال کر بیش قیمت موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ ہلکی سی رمزیت کے پردے میں ان کے وہ افسانے جو قومی اور فرقہ وارانہ اتحاد موجودہ جذباتی اور سماجی انتشار کے متعلق لکھے گئے ہیں وہ انہیں کا دور س ذہن لکھ سکتا ہے۔''

(اعتبار نظر از: احتشام حسین ص: ۱۷۱)

یہاں اس حقیقت کی نقاب کشائی لازمی ہے کہ انہوں نے اپنے افکار و خیالات کی آبیاری کارل مارکس' گاندھی جی اور پنڈت نہرو جی کے خیالات و نظریات سے کی اور قومی جذبہ' وطنی محبت' انسانی خلوص و ہمدردی کو فروغ دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے افسانوں میں ''میری موت''، ''میں کون ہوں''، ''پاؤں میں پھول''، ''زعفران کے پھول''، ''آزادی کا دن''، ''ایک پائیلی چاول''، ''بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں''، ''اجنتا''، ''میرا بیٹا میرا دشمن''، ''گیہوں اور گلاب'' وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان فن پاروں میں انہوں نے اپنے قومی جذبات' سیاسی حالات' فرقہ وارانہ ماحول و فضا اور اصلاحی مشن کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ خواجہ احمد عباس کے نظریہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جعفر عسکری تحریر فرماتے ہیں:

''عباس کے افکار و نظریات کو جلا بخشنے میں کارل مارکس' لینن' گاندھی جی اور نہرو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مذکورہ تمام مفکرین نے اپنے اپنے طور پر معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور انسانی برادری کی فلاح و بہبود کے لئے زندگی بھر جدوجہد کی نیز ایسے اصول اور نظریوں کو وضع کیا جن کے ذریعہ انسانی معاشرے میں عدم تشدد' مساوات' خیر سگالی' سماجی انصاف' معاشی خوشحالی' اور امن و امان کے حالات پیدا ہو سکتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عباس کے زیادہ تر افسانوں میں مذکورہ قومی رہنماؤں اور سماجی مفکروں کے فلسفیانہ افکار و تصورات کی بازگشت صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کے مطالعے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ نظریاتی طور پر وہ مارکسی ضرور ہیں نیز ترقی پسند نظریات سے مکمل طور پر وابستہ بھی ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو گاندھی جی کے عدم تشدد اور اہنسا وغیرہ کے نظریات سے بھی جذباتی طور پر بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔''

(رسالہ ''نیا دور'' مارچ ۱۹۸۸ء ص: ۷۷ تا ۷۸)

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک سنجیدہ قاری کو جس غیر معمولی تنوع کا احساس ہوتا

ہے وہ کرشن چندر کے علاوہ ان کے معاصرین میں کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ تنوع صرف ان کی کہانیوں کے موضوعات تک محدود نہیں۔ یہ تکنیک کی تازگی میں بھی ملتا ہے۔ اُن کے تخلیقی رویوں میں بھی اور اس سے زیادہ ذہنی اور جذباتی ناولوں میں جو وہ موضوع کے تئیں اختیار کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض ناقدین اسے ذہنی عدم استقلال کا نقص قرار دیں یا یہ کہیں کہ گاندھی ازم اور مارکسزم جیسے متضاد نظریوں کا امتزاج ممکن نہیں۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس نے گاندھی ازم اور مارکسزم' قوم پرستی اور انسان دوستی' تصور پرستی اور حقیقت پسندی اور اصلاح پسندی اور انقلابی بصیرت ژون جیسے متضاد تصورات کو اپنی شخصیت کی پنہائی اور گہرائی میں اس طرح جذب کیا تھا کہ ان کا تضاد اور تناقص تقریباً مٹ گیا تھا۔ اس لئے کہ ان تصورات سے ان کا رشتہ کسی سیاست داں' فلسفی' یا سائنس داں کا نہیں بلکہ انسان دوست تخلیق کار کا رشتہ تھا اور اس کا مرکزی نقطہ تھا انسانی دردمندی Compassion انہوں نے کسی ازم یا منشور کے بجائے انسانیت سے پیمانِ وفا باندھا تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ اپنے ضمیر کے علاوہ کسی کی ہدایت یا حکم کو سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔

ان کی ابتدائی کہانیوں میں ''زعفران کے پھول'' اور ''ابابیل'' کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ''زعفران کے پھول'' کی فضا رومانی ہے۔ کشمیری عوام کی بے دریغ قربانیاں اس کا موضوع ہے۔ ''ابابیل'' میں انہوں نے ایک ایسے سفاک اور ظالم انسان کا کردار خلق کیا ہے جو کسی پر رحم نہیں کھاتا اور ظلم تشدد جس کا شیوہ ہے۔ لیکن اس کے وجود میں بھی دردمندی کی چنگاری کہیں سلگ رہی ہے۔ انسانی وجود میں اسی نیکی کی جستجو عباس سے یہ کہانی لکھواتی ہے۔ یہی ظالم رحیم خاں ابابیل کے ننھے منے بچوں کی جان بچانے کے لئے اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے۔ سرسامی حالت میں مرنے سے پہلے وہ ابابیل کے ننھے منے بچوں' بندو اور نورو کو خطاب کرتے ہوئے بڑبڑاتا ہے:

''ارے بندو' ارے نورو کہاں مر گئے' آج تمہیں کھانا کون دے گا''

اور جب وہ مرجاتا ہے تو چار ابابیلیں اس کے پائنتی میں بیٹھے سوگ مناتی ہیں۔

اس کہانی میں جو آدرش واد ہے وہ انسانی قلب کی نیکی اور دردمندی پر انسان کے اعتماد کو مستحکم کرتا ہے۔ اور اس میں گاندھی جی کے اخلاقی نظریات کا عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے مقابلے میں ''بھولی'' جیسی کہانی کو لیجئے جو سماجی رسم و رواج اور عورت پر ہونے والے ظلم کے خلاف بغاوت کرنے والی ایک معصوم لیکن سرکش لڑکی کی حکایت ہے۔ ''بھولی'' جو بدصورت ہے' بے زبان ہے' ہکلاتی ہے' کسی کے سامنے زبان نہیں ہلاتی۔ لیکن اس نے گاؤں کے اسکول میں پڑھا ہے۔ علم نے اسے سچائی اور زندگی کا شعور بخشا ہے۔ اس لئے شادی منڈپ میں جب اس کا بوڑھا منگیتر اس کے غریب باپ سے پانچ ہزار روپے طلب کرتا ہے تو وہ بے زبان لڑکی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح نفرت سے بول پڑتی ہے:

''پتا جی! اٹھا لیجئے اپنے پانچ ہزار۔ مجھے اس سے بیاہ منظور نہیں......''

اس طرح کے مثبت' آبرومند اور باغی کردار عباس کی کہانیوں میں سماجی اونچ نیچ اور ظلم و استحصال کی طاقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک کردار ''بنارس کا ٹھگ'' کا مسافر ہے جو ملاؤں اور بھکشوؤں اور برہمنوں کی ریاکاری اور دین دھرم کے نام پر ہونے والی تجارت کا پردہ چاک کرتا ہے۔ کہانی کے آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ

مسافر جسے سب پاگل سمجھتے ہیں' دراصل کبیر کی بھٹکی ہوئی روح ہے۔ اسی طرح ''لیلیٰ مجنوں'' کی لیلیٰ اپنے نو دولتیے باپ سے بغاوت کر کے ایک مزدور موہن سے شادی کر لیتی ہے۔

اس سلسلے میں ان کی متنازعہ لیکن فنی اعتبار سے دلکش کہانی ''بارہ گھنٹے'' کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ آزادی سے قبل جب یہ کہانی شائع ہوئی تھی تو ترقی پسند اور قدامت پسند دونوں حلقوں سے کڑی نکتہ چینی کا نشانہ بنی تھی۔ بنگال میں قحط کے المیہ پر ''ایک پائیلی چاول'' جیسی حقیقت پسندانہ کہانی لکھنے والا عباس اچانک دو انقلابوں کو جنسی تسکین کے تجربے سے ہمکنار کر رہا ہے۔ حقیقت میں سوشلسٹ رلیزم کے نعروں کے دور میں یہ ایک جرأت آزما تجربہ تھا اور اس میں عباس نے دو انقلابوں کو دو انسانوں کے روپ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی انسانی نفسیات اور انسانی رشتوں کی ساری نزاکت گرمی اور شدت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ بنیا پارٹی کی ہدایت پر ایک ایسے انقلابی وجے سنگھ کو پناہ دیتی ہے جو سولہ سال کی قید کاٹ کر آیا ہے اور اگلی صبح پھر جیل بھیج دیا جائے گا۔ وہ جانتی ہے کہ وجے سنگھ نے اپنی جوانی اور خوبصورتی کا بڑا حصہ انقلابی تحریک کے نام پر جیل کی آہنی دیواروں میں گنوا دیا ہے۔ وہ ایک اہم انسانی جبلت جنس کی آسودگی سے محروم رہا۔ وہ جانتا ہے کہ دوسرے کمرے میں ایک عورت ہے یہ احساس اسے ساری رات بے چین رکھتا ہے اور وہ کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے۔ بنیا بھی اس کی اس حالت کو محسوس کر کے سخت کشمکش میں رات بسر کرتی ہے اور آخر کار صبح ہونے سے پہلے وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی ہے۔

کہانی میں واقعات و جذبات کا تجزیہ اتنا فطری اور دور رس ہے کہ اس کا انجام کہانی کے آغاز اور ارتقاء کا لازمی اور منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہانی بظاہر روایتی اور فیوڈل اخلاقی آدرشوں سے انحراف کی مثال ہے۔ لیکن یہی کہانی ایک دیسی انقلابی اور اخلاقیات کا شرف نامہ ہے جو انسانی جذبات اور گہرے انسانی رشتوں کے احترام کو مقدس جانتی ہے۔

اس سلسلے میں ان کی شاہکار کہانی ''واپسی کا ٹکٹ'' اور ''نیلی ساری'' کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جو جاگیردارانہ اخلاقی قدروں کا تمسخر اڑاتیں اور ان پر ضرب کاری لگاتی ہیں۔ وہ ان میں اخلاق اور انسانیت کے ایک ایسے منشور کو پیش کرتے ہیں جس کا خالق محنت کش انسانوں کا ضمیر ہے۔

میں یہاں عباس کی ایسی کہانیوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جن میں وطن پرستی اور عوام دوستی کے اعلیٰ جذبات کی نقش گری ہوتی ہے۔ نہ ہی فسادات کے موضوع پر ان کی ایسی کہانیوں کا حوالہ دے رہا ہوں جو ان کے سیکولر قوم پرستانہ خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ عباس نے ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں ان کا آزاد قلم صرف ہندوستان نہیں بلکہ سارے ایشیائی عوام کی بیداری کی علامت بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا طویل تمثیلی افسانہ ''سیاہ سورج سفید سائے'' خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ اس کا موضوع سامراجی دہشت گردی کے ہاتھوں افریقی عوام کی آزادی کے مشعل بردار لوممبا کا قتل ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے ایشیائی اور افریقی قوموں پر سامراجی ظلم و تشدد اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

خواجہ احمد عباس کی ترقی پسندی کا تابناک پہلو یہ ہے کہ آزادی اور سماجی انصاف کے لیے اس کرۂ زمین کے تمام مظلوم اور محنت کش انسانوں سے احساس یگانگت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے وطن سے اور اس کے عوام سے بے

پناہ محبت کرتے تھے۔اپنے وطن کی تاریخ' تہذیب اس کے افکار و آثار کو وہ ہر ہندوستانی کے لیئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ان کے ناول ''کل ہمارا ہے'' کی ہیروئن پاروتی ہندوستانی کلاسیکی آرٹ رقص اور موسیقی کا مجسمہ ہے۔اور اسی سے اس کا تشخص ہوتا ہے۔اسی طرح ان کے ناول ''انقلاب'' کا ہیرو انور، جس کے کردار میں عباس نے خود اپنی زندگی کا عکس پیش کیا ہے اپنی ہندوستانی شناخت پر فخر کرتا ہے۔

لیکن اس سچائی کے باوجود خواجہ احمد عباس کی دردمندی اور دلچسپی کا مرکز ہندوستان کا ماضی نہیں اس کا حال اور مستقبل ہے۔وہ حقیقت پسند ہونے کے باوجود پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح ایک ایسے ہندوستان کا خواب دیکھتے ہیں جو افلاس' ظلم و استحصال' ذات پات کی بے رحمانہ تفریق' ہر طرح کی تنگ نظری' اور فرقہ پرستی سے پاک ہو۔لیکن اپنے مجموعہ ''نئی دھرتی نئے انسان'' کی کہانیوں میں انہوں نے ایسے ان گنت کرداروں کی تصویر کشی کی ہے جو ایک بہتر مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں' اپنی زندگی کو بدلنا چاہتے ہیں لیکن مفاد پرست' برسرِ اقتدار قوتیں اس عمل میں سرِ راہ ہوتی ہیں۔

عباس ادب کو انسانی ذہن اور زندگی کو بدلنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر لکھتے تھے۔ وہ کہانی یا ناول کے میڈیم سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔انہوں نے فن اور تکنیک کے نت نئے اور اچھوتے تجربے کیے ہیں لیکن ان کا مقصد اپنی بات کو دوسروں تک موثر ڈھنگ سے پہنچانا تھا۔بلند پایہ اور اعلیٰ ادب کی تخلیق کا مسئلہ نہیں تھا۔وہ جانتے تھے کہ ان کی تحریروں کی فنی اور جمالیاتی قدر و قیمت کا فیصلہ آنے والی نسلیں کریں گی۔اس لیے ''نئی دھرتی نئے انسان'' کے دیباچہ میں انہوں نے اپنے فن کے محرکات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں:

''یہ بدلتا ہوا ہندوستان اور بدلتے ہوئے ہندوستانی میرے افسانوں کا موضوع ہیں۔مگر سماجی اور نفسیاتی تبدیلیاں یکساں رفتار سے نہیں ہوتیں۔انسان کے کردار اور افعال پر مختلف سماجی طاقتیں اور نفسیاتی الجھنیں اپنا اپنا اثر ڈالتی ہیں۔کوئی انسان زیادہ اثر قبول کرتا ہے کوئی کم ...... میرے ان افسانوں میں آپ کو ایسے ہر قسم کے ہندوستانی ملیں گے' اچھے' بہت اچھے' برے' بے وقوف' ظالم' مظلوم' اپنی قسمت آپ بنانے والے' اپنی محرومیوں اور الجھنوں پر رونے والے اور وہ بھی جنھوں نے قسمت کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں جو آج بھی سماج کے ذات پات کے وہموں اور ڈھکوسلوں کے غلام ہیں۔میں ان تمام ہندوستانیوں سے محبت کرتا ہوں' سب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اس لئے کہ وہ میرے ہم وطن ہیں' میرے ہمعصر ہیں' میں اپنے افسانوں میں ان کے چہرے اور کردار دکھانا چاہتا ہوں نہ صرف اوروں کو بلکہ خود ان کو انسان کو' سماج کو' شیشہ دکھانا بھی ایک انقلابی فعل ہو سکتا ہے کیوں کہ خوش فہمی نہیں بلکہ خود فہمی اپنی ذات کو سمجھنا بھی بڑی سماجی اور نفسیاتی تبدیلیوں کو حرکت میں لا سکتا ہے۔''

....

موبائل : 9681024021

مترجم: سیّد ایاز احمد روہوی

احتشام حسین کی ادبی تاریخ میں بہار

پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم اردو کے عظیم ترین ناقدوں میں سے تھے۔ ان کی تحریریں ایک مستقل اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے ہندی میں اردو ادب کی ایک تنقیدی تاریخ "اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس" کے نام سے لکھی ہے جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں صوبہ بہار کے گیارہ شاعروں اور نثر نگاروں کا ذکر ہے۔ شاد عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، اجتبی رضوی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، مظہر امام، انور عظیم اور غیاث احمد گدی۔ ان میں سے تین (یعنی قاضی عبدالودود، پرویز شاہدی اور اجتبی رضوی) کا نام محض بر سبیل تذکرہ آئے ہیں۔ ذیل میں ہم اس ادبی تاریخ کے ان حصوں کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں جو صوبہ بہار کے ادیبوں سے متعلق ہیں۔ (پروفیسر احتشام حسین کے انتقال کے کئی سال بعد ۱۹۸۱ء میں اس تاریخ کا اردو ترجمہ قومی کونسل برائے ترقی اردو زبان، دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔) ہمیں احتشام حسین مرحوم کی تنقیدی بصیرت پر بھی بھروسہ ہے اور ان کی غیر جانبداری پر بھی۔ تاہم ہمارا خیال ہے کہ انہیں بہار کے ادیبوں اور شاعروں کے تذکرے میں کچھ اور فراخ دلی کا ثبوت دینا چاہئے تھا۔ کئی ایسے نام چھوٹ گئے ہیں جو اس وقت ادبی تاریخ کا حصہ بن چکے تھے یا بننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے قارئین کے خیالات شائع کر کے مسرت محسوس کریں گے۔ .... ادارہ

شاد عظیم آبادی: (اردو شاعری کے) نئے دور میں سید علی محمد شاد عظیم آبادی بہار کے بزرگ ترین عالموں اور شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ ۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۷ء تک زندہ رہے۔ انہوں نے نثر اور نظم دونوں میں انمول اضافے کئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ صفیر بلگرامی کو اپنی نظمیں دکھاتے تھے لیکن انہوں نے اپنا استاد الفت حسین فریاد کو مانا ہے۔ شاد نے مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور دوسری اصناف سخن میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں لیکن ادبی نقطۂ نظر سے وہ اپنی غزلوں کے رسیلے پن، گھلاوٹ اور حقیقت پسندی کے باعث مشہور ہوئے۔ مرثیہ لکھنے میں بھی انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ تنقید نگاروں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ غزل کے گھٹتے ہوئے اثر کو سنبھالنے میں شاد عظیم آبادی کا خصوصی حصہ ہے۔ انہوں نے غزل کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اس میں ایسی رنگینی اور مٹھاس بھر دی کہ غزل دوبارہ زندہ ہو اٹھی۔ ان کی کئی کتابیں ان کی زندگی میں بھی شائع ہو چکی تھیں لیکن غزلوں کا مجموعہ "نغمہ الہام" (یہ نام غلط لکھا گیا ہے۔ دراصل اسے "میخانۂ الہام" ہونا چاہئے تھا...... ادارہ) تھا، ان کی موت کے بعد سامنے آیا۔

اب تو ان کی سوانح عمری اور دوسرے کئی مجموعے بھی چھپ گئے ہیں۔ ان کے اکثر دعووں سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی انہیں موجودہ زمانے کا عظیم شاعر مانا گیا ہے۔ یہ خیال لگ بھگ سبھی تنقید نگاروں اور ارباب علم کا ہے۔ ان کی غزل کے کچھ شعر یہ ہیں:

میں اور سر لالہ و گل ہجر یار میں	کیسی بہار ! آگ لگادو بہار میں
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں	کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی	جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
خود چل اس کوچے میں چلنا جو ہے اے پائے طلب	واں کوئی ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جائے گا
جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا	ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

قاضی عبدالودود: تحقیقی ادب کے ماہروں میں حافظ محمود شیرانی کا نام بلند مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے مولانا آزاد اور مولانا شبلی کی نگارشات میں تحقیق کر کے بہت سی غلطیاں نکالیں جن میں سے کچھ کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ عربی، فارسی اور ہندی کے بڑے عالم تھے۔ لیکن ان کا نثری اسلوب بڑا روکھا پھیکا اور بے رس ہوتا تھا۔ اس ڈھنگ کا کام کرنے والوں میں اس وقت بھی کئی محققین کے نام لئے جا سکتے ہیں جیسے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر عبداللہ، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی لیکن یہاں ان کے متعلق تفصیل سے لکھنا نامناسب ہے۔

جمیل مظہری: جمیل مظہری (پیدائش ۱۹۰۵ء) اس زمانے کے ان شاعروں میں گنے جاتے ہیں جنہیں کلاسیکیت کے پرستار اور نئی نسل کے ادب نواز دونوں عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ بہار کے رہنے والے ہیں۔ پہلے بہت دنوں تک کلکتے میں صحافت سے وابستہ رہے اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے تعارف ہوا۔ جس نے ان کے مضامین اور نظموں میں ہندوستان کے جذبات ابھارے۔ کچھ دنوں صوبہ بہار میں سرکاری نوکری کی اور پھر استعفیٰ دے کر پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ اب ریٹائر ہو جانے کے بعد ادبی زندگی گذار رہے ہیں۔

جمیل مظہری کو فلسفے سے خاص دلچسپی ہے۔ اس لئے اپنی شاعری میں حیات و کائنات کے اسرار و رموز غیر معمولی فنکارانہ حسن کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ نثر بھی اچھی لکھتے ہیں لیکن ان کی شہرت شاعر کی حیثیت سے ہی زیادہ ہے۔ انکے کلام کے دو مجموعے "فکرِ جمیل" اور "نقشِ جمیل" شائع ہو چکے ہیں۔ ایک غزل کے کچھ شعر مثال کے طور پر دیکھئے:

کوئی سوال خدا و صنم نہیں اے دوست	میں کیا کروں مری گردن میں خم نہیں اے دوست
اگرچہ سرد اندھیرے ہیں باعثِ تکلیف	مگر یہ گرم اجالے بھی کم نہیں اے دوست
عجب مزاج ہے ان میکدہ نشینوں کا	کہ قدرِ جام تو ہے قدرِ جم نہیں اے دوست
خوشامدوں سے بھی چلتا نہیں ہے کام یہاں	معاملہ ہے خدا سے صنم نہیں اے دوست
کھلا ہے اور کھلے گا جمیل سب کے لئے	یہ میکدہ ہے کنشت و حرم نہیں اے دوست

پرویز شاہدی، اجتبیٰ رضوی: اسی نسل اور اسی درجے کے کئی شاعر ہیں جن کو اہمیت حاصل ہے لیکن اس مختصر تاریخ میں انکا تفصیلی ذکر ممکن نہیں ہے۔ مطالعے کی سہولت کیلئے انکے اور انکے مجموعوں کے کچھ نام دیئے جاتے ہیں جیسے شاد عارفی (سفینہ چاہئے)، اجتبیٰ رضوی (شعلہ نذا)، پرویز شاہدی (رقصِ حیات)، قتیل شفائی (گجر اور ہریالی)، نیاز حیدر (جمال مصر اور قصر لینن)، آل احمد سرور (ذوق جنوں) اور کئی دوسرے۔ یہ بات صاف ہے کہ یہ سب فن اور زندگی کی بابت اپنا خاص نظریہ رکھتے ہیں۔ یہ محض ہیئت پرست نہیں ہیں۔ فن اور زندگی کا کوئی نہ کوئی نظریہ ان کے پاس ضرور ہے۔

اختر اورینوی: اختر اورینوی (پیدائش: ۱۹۱۰ء) بہار کے مشہور ادیب ہیں۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور تنقیدیں بھی۔ ناول اور ڈرامے بھی لیکن انہیں افسانہ نگاری میں جو شہرت ملی وہ تنقید کے علاوہ کسی اور ادبی صنف میں حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جیسے "منظر و پس منظر"، "بھول بھلیاں" اور "انار کلی"، "کلیاں اور کانٹے"، "کیچلیاں اور بال جبرئیل" اور "ایک معمولی سی لڑکی"۔ ان کی کہانیوں میں سماجی شعور انسانی نفسیات کے راستے سے نمایاں ہوتا ہے اس لئے وہ ان مصنفوں میں گنے جاتے ہیں جو زندگی کی عکاسی میں انسانی نفسیات سے کام لیتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی: ان کے برعکس بہار ہی کے ایک اور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی ہیں۔ جو سماجی موضوعات پر لکھتے ہوئے اس روایت کی پابندی کرتے ہیں جو پریم چند نے قائم کی تھی۔ بہار کی دیہی زندگی کی خوبصورت تصویریں ان کی کہانیوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

کلیم الدین احمد: پروفیسر کلیم الدین احمد (پیدائش ۱۹۰۹ء) بہار کے بے حد معروف اور با اثر تنقید نگار ہیں۔ انہوں نے یورپی ادب سے متاثر ہو کر اپنی پہلی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" اس طرح لکھی کہ روایت، ماحول اور سماجی شعور کا کہیں نام ہی نہ آیا۔ صرف اپنے بنائے ہوئے پیمانے سے انہوں نے قدیم اور جدید بھی ادیبوں اور شاعروں کو پرکھا اور سبھوں کی بڑی تنقید کی۔ ان کا خاصا غصہ ترقی پسند ادیبوں پر تھا۔ اسی بنیاد پر انہوں نے "اردو تنقید پر ایک نظر" بھی لکھی اور کتاب اس جملے سے شروع کی۔ "اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔" جب اپنے موجودہ اصولوں سے اردو ادب کی پرکھ میں انہیں کامیابی نہیں ملتی تو وہ جھنجھلا کر بار بار یہی خیال ظاہر کرتے ہیں کہ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ گھاٹے میں ہیں اور جو لوگ جانتے ہیں وہ صرف نقل کرتے ہیں۔ کلیم الدین اس عملی تنقید پر زور دیتے ہیں جو شاعر کے نقطۂ نظر کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ صرف لفظوں اور ان کے مناسب تعلقات سے پیدا ہونے والے معانی کو دیکھتی ہے۔ ان کی دوسری کتابیں "فنِ داستان گوئی"، "سخن ہائے گفتنی" اور "عملی تنقید" بھی اسی طرح کی ہیں۔ کلیم الدین کے ایک پیروکار ڈاکٹر احسن فاروقی ہیں جو اب پاکستان میں ہیں۔

اختر اورینوی: ڈاکٹر اختر اورینوی کا ذکر افسانہ نگاروں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ انہوں نے تنقیدی ادب میں بھی ایک مخصوص جگہ حاصل کر لی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر عموماً جمالیاتی اور تاثراتی ہوتا ہے اس لئے سماجی شعور کو وہ بھی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی قابل ذکر کتابوں میں "بہار میں اردو زبان و ادب"، "تنقید جدید"، "تحقیق و تنقید"، "قدر و نظر" اور "منہاج و سراج" ہیں۔ ڈاکٹر اورینوی اس وقت پٹنہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ہیں۔

مظہر امام: مظہر امام بہار کے مشہور و معروف جدید شاعر ہیں۔ ان کے فن کی جدیدیت سماجی شعور کی تکذیب نہیں کرتی۔ نظموں کا ایک مجموعہ "زخم تمنا" شائع ہو چکا ہے۔

انور عظیم: انور عظیم مشہور افسانہ نگار ہیں۔ معمولی واقعہ کی خوبصورت عکاسی کرنے میں انہیں بڑی مہارت ہے۔ جس میں ان کا خاص نقطۂ نظر بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان کا ایک ناول "دھواں دھواں سویرا" شائع ہو چکا ہے۔

غیاث احمد گدی: غیاث احمد گدی بہار کے اچھے افسانہ نگار ہیں۔ عوامی زندگی سے اپنی کہانیوں کے تانے بانے تیار کرتے ہیں۔ کہانیوں کا مجموعہ "بابا لوگ" چھپ رہا ہے۔ ☆☆☆

(موبائل: 09339150332)

احمد معراج

پروفیسر سیّد منظر امام سے ایک مختصر انٹرویو

احمد معراج : آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

سیّد منظر امام: میری پیدائش ۱۰/اگست ۱۹۳۹ء کو دربھنگہ (بہار) میں ہوئی۔

احمد معراج : اپنے خاندان کے بارے میں کچھ بتائیں۔

سیّد منظر امام: میری دادیہال انبالہ (پنجاب) میں تھی۔ میرے دادا پیر بخش ملٹری میں ڈاکٹر تھے۔ ان کا تبادلہ بکسر (بہار) چھاؤنی میں ہوا جہاں سے وہ واپس پنجاب نہیں لوٹے۔ ان کی شادی سیالکوٹ کے کشمیری خاندان میں ہوئی تھی۔ میرے والد سیّد امیر علی بکسر میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے۔ ہیڈ پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ان کا تبادلہ دربھنگہ ہوا۔ وہیں مولوی سیّد عبدالعلی ناصری کی صاحبزادی سیّدہ کنیز فاطمہ سے ان کا نکاح ہوا۔ ان سے پانچ اولادیں ہوئیں؛ حسن امام درد، مظہر امام، سیّدۃ النساء، خیر النساء اور میں یعنی سیّد منظر امام۔ اب صرف خیر النساء (نسرین شہاب) اور خاکسار بقید حیات ہے۔

احمد معراج : جن اساتذہ کے زیرِ سایہ آپ نے ادبی سفر کی ابتدا کی، ان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

سیّد منظر امام: میرے ادبی سفر کے آغاز میں کسی استاد کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں نے جب آنکھیں کھولیں تو اپنے چاروں طرف رسائل وجرائد اور کتابوں کا ذخیرہ دیکھا۔ لہٰذا مطالعہ کا شوق بچپن سے ہی پروان چڑھنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درسی کتابوں سے کم اور ادبی رسائل وجرائد اور کتابوں سے زیادہ رغبت پیدا ہونے لگی۔ شاید آپ یقین نہ کریں لیکن حقیقت ہے کہ اسکول ہی کے زمانے میں میں نے غالب اور اقبال کو چھوڑ کر ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی بیشتر تخلیقات اپنے ذہن ودماغ میں اتار لی تھیں۔

احمد معراج : سنا ہے ادب کے علاوہ فلموں میں بھی آپ کی دلچسپی ہے۔ اس حوالے سے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

سیّد منظر امام: فلموں سے میری دلچسپی آج بھی دیوانگی کی حد تک ہے۔ اب سینما ہال میں جا کر فلمیں دیکھنے کا اتفاق کم ہی ہوتا ہے لیکن فلمی رسائل وجرائد سے دلچسپی ہنوز برقرار ہے۔ Screen اور Film Fare آج بھی میرے مطالعہ میں رہتے ہیں۔

احمد معراج : اپنی صحافتی زندگی کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں؟

سیّد منظر امام: صحافت سے میری دلچسپی اسکول کے زمانہ سے ہے۔ سہ ماہی "رفتارِ نو" کا اجراء (۱۹۶۰ء) میں نے انٹرمیڈیٹ کے زمانے میں کیا اس کے بعد بی اے (آنرز) کرنے پٹنہ کالج آ گیا۔ اقبال ہوسٹل میں رہ کر میں نے "رفتارِ نو" کے پانچ شمارے نکالے جنھیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو کی پہلی آزاد غزل اس رسالے کی زینت بنی۔ اس کے بعد میں نے ۱۹۷۲ء میں جمشید پور سے "ترسیل" کا

اجراء کیا، جس کا صرف ایک شمارہ منظرِ عام پر آیا، لیکن اس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ میں نے جمشید پور سے اپنے دوست منظر کاظمی کے ساتھ مل کر چینی جارحیت پر لکھے گئے نمائندوں افسانوں کا انتخاب ''ہمالہ کے آنسو'' (اشاعت: ۱۹۶۴ء) کے نام سے ترتیب دیا۔ دھنباد سے میں نے سہ ماہی ''وقت'' کا اجراء (۲۰۰۰ء) کیا جس کے آٹھ شمارے طبع ہوئے۔ ان میں محمد سالم، سید احمد شمیم، سید امین اشرف، اسلم بدر اور علیم صبا نویدی پر خصوصی گوشے شامل ہیں۔

احمد معراج : آپ کا شعری سرمایہ بہت کم ہے لیکن اس میں بڑی توانائی ہے۔ اس لیے ہم جاننا چاہتے ہیں کہ طبیعت میں موزونیت ہونے کے باوجود آپ نے شاعری کی طرف توجہ کیوں نہیں دی؟

سید منظر امام: میں باضابطہ شاعر نہیں ہوں۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے دو چار غزلیں اور دو چار نظمیں کہی ہیں۔ احباب نے انھیں کافی سراہا اور پذیرائی بھی کی۔ ایک بات سچ بتاؤں، میں نے شاعری اس لیے بھی نہیں کی کہ لوگ کہتے کہ بڑے بھائی (مظہر امام) کہہ کر دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی ان سے اصلاح نہیں لی۔ ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہاں اپنے برادر نسبتی جناب منظر شہاب کو کچھ چیزیں دکھائی ہیں۔

احمد معراج : آپ کے افسانوں پر کرشن چندر کے لب و لہجہ کا عکس نمایاں ہے۔ ایسا میرا خیال ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

سید منظر امام: کرشن چندر کو میں آج بھی اردو کا بہت بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں۔ آپ میرے افسانوں پر بھی ان کے اسلوب کی پرچھائیں محسوس کریں گے۔ ایک زمانہ تھا جب کرشن چندر ہر نوجوان لکھنے والوں کے ذہن و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ انھیں میں اردو افسانے کا جادوگر مانتا ہوں۔

احمد معراج : ادب میں آپ کس نظریہ کے قائل ہیں؟

سید منظر امام: میں صحت مند ادبی نظریے کا قائل ہوں۔

احمد معراج : سفر کرنا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ حال ہی میں آپ متحدہ امریکہ بھی گئے تھے۔ آپ کی نظر میں سفر کرنا ایک تخلیق کار کے لیے کتنا اہم ہے؟

سید منظر امام: سفر کا شوق مجھے بچپن سے ہے۔ بارہ سال کی عمر میں پہلی بار کلکتہ گیا تھا۔ تب سے وہ شہر میرے دل میں بسا ہوا ہے۔ ویسے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں کو دیکھ چکا ہوں۔ شہر نشاط (کلکتہ) کے علاوہ دہلی، ممبئی، بنگلور، چنئی، لکھنؤ، اندور، بھوپال، گوا، آگرہ، علی گڑھ، پٹنہ، جے پور، اجمیر، شملہ، چنڈی گڑھ، میسور وغیرہ۔ ابھی اتنے ہی نام ذہن میں ہیں۔ اگر آپ Afford کر سکتے ہیں تو سفر ضرور کیجیے۔ بڑے شہروں کو دیکھیے، وہاں کے لوگوں سے ملیے، ان کے دکھ سکھ بانٹیے، ذہن کے بند دریچے کھلتے جائیں گے۔ علم صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا۔

احمد معراج : افسانہ نگار اور صحافی کے علاوہ ایک اچھے استاد کی حیثیت سے بھی آپ کی شناخت ہے۔ اس لئے ہم آپ کی تدریسی زندگی کے بارے میں بھی جاننا چاہیں گے۔

سیّد منظر امام: یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں ایک اچھا استاد تھا یا نہیں، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے اپنے پیشے کے ساتھ کبھی بھی بے ایمانی نہیں کی۔ میں گرونانک کالج (دھنباد) کے شعبۂ اردو کا صدر تھا۔ کالج روزانہ جاتا تھا اور اپنا کلاس وقت پر لیا کرتا تھا۔ اگر دو طالب علم بھی ہوتے تو بھی میں کلاس ضرور لیتا۔ اللہ کا کرم ہے اور بزرگوں کی دعائیں کہ ایک ایمان دار استاد کی حیثیت سے آج بھی میری شناخت ہے، اگر چہ سبکدوش ہوئے ۱۰ رسال سے زائد ہو چکے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے 'حرام خوری' سے شدید نفرت ہے۔

احمد معراج: آپ کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ؟

سیّد منظر امام: میری زندگی حادثوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس سے بڑا حادثہ کیا ہو سکتا ہے کہ والد کا پیار میں نے پایا ہی نہیں۔ والدہ نے میرے لئے پیار و محبت کے خزانے لٹادئے اور جب میں اس قابل ہوا کہ ان کی خدمت کر سکوں تو وہ اس جہان آب و گل سے رخصت ہو گئیں۔ میں انھیں کاندھا بھی نہیں دے سکا۔ اس وقت میں جمشید پور میں تھا اور ٹاٹا کمپنی میں میری ملازمت کے صرف بیس دن گذرے تھے۔ اس زمانہ میں فون یا موبائل کی سہولت نہیں تھی۔ ٹیلی گرام ہی ایک ذریعہ تھا جو اس وقت ملا جب میری امی کو منوں مٹی کے نیچے ڈالا جا چکا تھا۔

....

E-mail: ahmedmeraj065@gmail.com, Mob. 09681318473

پی ایچ ڈی ایوارڈس

معروف شاعر، ادیب اور صحافی نوشاد مومن (اصل نام نوشاد علی انصاری) مدیر "مژگاں" کو کلکتہ یونیورسٹی میں ان کے تحقیقی مقالے "مغربی بنگال کے اردو شعراء کا سیاسی شعور" کے عنوان پر پی ایچ ڈی کی ڈگری زیر نگرانی پروفیسر شہناز نبی نومبر ۲۰۱۵ء میں تفویض کی گئی۔ موصوف یونین بینک آف انڈیا، ڈانکونی برانچ کے مینیجر ہیں اور علیم الدین اسٹریٹ میں رہائش پذیر ہیں۔

....

نوجوان ادیب فیاض احمد وجیہہ (اصل نام محمد فیاض احمد ساکن موضع عدل پور، موریا، دربھنگہ) کو ان کے تحقیقی مقالہ بہ عنوان 'اردو کی بیانیہ اصناف میں تو تمیت کا تجزیاتی مطالعہ' پر ۲۲ رجنوری ۲۰۱۶ء کو جواہر لعل نہرو، یونیورسٹی دہلی کے شعبۂ اردو سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ ان کے نگراں ڈاکٹر محمد آصف زہری تھے۔ بیرونی ممتحن کی حیثیت سے کلکتہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر یوسف تقی تھے جنھوں نے وائیوا اور عنوان سے متعلق اہم سوالات کئے، جن کا مقالہ نگار نے تشفی بخش جواب دیا۔

بہار اردو اکادمی کی مطبوعات

"اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ 800004 (رابطہ :0612-2678021)

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف و مرتب کا نام	قیمت
01	کلیات شاد حصہ اول	کلیم الدین احمد	300.00
02	کلیات شاد حصہ دوم	کلیم الدین احمد	300.00
03	کلیات شاد حصہ سوم	کلیم الدین احمد	300.00
04	منثورات جمیل مظہری حصہ اول	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد	50.00
05	منثورات جمیل مظہری حصہ دوم	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد	60.00
06	حسرت تعمیر	اختر اورینوی	125.00
07	حقیقت بھی کہانی بھی	سید بدرالدین احمد	300.00
08	بہار میں اردو افسانہ نگاری	ڈاکٹر وہاب اشرفی	85.00
09	مراثی شاد	نقی احمد ارشاد	75.00
10	تحلیل نفسی اور ادبی تنقید	کلیم الدین احمد، ممتاز احمد	35.00
11	عکس جمیل	رضا مظہری	150.00/125.00
12	خطوط جمیل بنام آزاد	سید محمد حسنین	35.00
13	آثار جمیل	رضا مظہری	45.00
14	باقیات شاد	نقی احمد ارشاد	75.00
15	میر انیس	کلیم الدین احمد	40.00
16	فکر جمیل	جمیل مظہری	125.00
17	مضامین گیلانی	مظفر گیلانی	30.00
18	قومی تحریک اور ہندوستانی آئین	عبدالصمد	35.00
19	نقل خانہ	سید سجاد عظیم آبادی	50.00
20	یادگار سلیمان	عبدالقوی دسنوی	50.00
21	علامہ سید سلیمان ندوی	سیمنار کے مقالے	50.00
22	شکیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے	وہاب اشرفی	125.00
23	مقالات سید حسن عسکری	سید محمد حسنین	200.00
24	پدمنی (بنگلہ سے ترجمہ)	سرت چندر چٹرجی	65.00
25	چند تنقیدیں	سید ریاست علی ندوی	25.00
26	بلاچندا (میتھلی ناول کا ترجمہ)	یاتری ناگارجن، ڈاکٹر مشتاق احمد	125.00
27	نقوش سنگ	رمز عظیم آبادی	25.00
28	انتخاب مضامین سرسید	مضامین کا مجموعہ	15.00
29	مقالات نصیر حسین خیال	سید نقی احمد ارشاد	50.00
30	قاضی عبدالودود	سیمنار کے مقالے	85.00
31	کلیم الدین احمد	سیمنار کے مقالے	75.00
33	مثنوی سحرالبیان	میر حسن	15.00

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلہ "زبان و ادب" دیدہ زیب اور نئے آب و تاب کے ساتھ ماہ بہ ماہ شائع ہو رہا ہے۔ -/100 روپے بھیج کر آپ بھی اسے گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔

نوٹ: (1) -/500 روپے سے زائد کی خریداری پر لائبریری اور کتب فروشوں کے لئے 40% کی رعایت دی جائے گی۔

(2) انفرادی طور پر بھی کتابیں منگوائی جا سکتی ہیں۔ کتابوں کا نام اور مطلوبہ رقم بھیج دیں۔ ڈاک خرچ اکادمی کے ذمے ہوگا۔

(مشتاق احمد نوری)
سکریٹری

اقبال انصاری

پتھر لڑکی

چھوری تینے پتا ہے نا کہ مہارے میں دوسری جات برادری میں سادی نا ہوتی ہے۔ نا تو ایک ہی گاؤں کے چھورا چھوری کی سادی ہوتی ہے۔'' چودھری گنیش پرساد کا لہجہ بہت سخت تھا۔ ''اور یہ پریم سریم تو تری بکواد (بکواس) ہے۔ تجھے پالی گاؤں کی کرشنا اور مالتی کی موت یاد ہے نا؟ ابھی پانچ سال پہلے کی ہے تو بات ہے۔ دونوں کو اُنا کے بھائیاں نے گولی ماردی تھی۔ پریم اور برادری باہر سادی کے چکر تینوں بھائی جیل ما تھے۔ ان کے ایک چاچا اور ایک ماما بھی سجا (سزا) کاٹ رہے ہیں۔ بھائیاں نے دونوں بہناں کو گولی ماردی تھی۔ چاچا اور ماما نے اُنا کے اس کام کو جائج (جائز) ٹھہرایا تھا۔ جیل تو جیل، پھانسی بھی لگ جاتی تو بھی کوئی پھکر (فکر) نہیں تھی اور عجت سے سمجھوتہ نہ کوئی۔ عجت بڑی چیج (چیز) ہوئے ہے۔ اور وا کے (اس کے) ایک سال بعد پراگی پور کی سکنتلا کا کسا (قصہ) تنے یاد ہوئے گا بھاگ کے سادی کر لی تھی۔ دوسری برادری کے چھورے سے سکنتلا کے باپ نے تلوار سے کاٹ کے رکھ دیا تھا تو دونوں کو گر یجویٹ ہے پڑھائی میں بڑی ہوسیا (ہوشیار) رہی ہے۔ کھیل کود میں بھی کئی کپ اور دو سونے کے مڈل جیتنے ہو یا کرکے (اس لیے) تینے پہلی اور آکھری بار سمجھائے دو ہوں۔ جندہ (زندہ) نہ چھوڑوں گا جو کوئی ایسی ویسی حرکت سن لی سارے علاکے (علاقے) میں پولس میں بھی سب اپنی برادری کے لوگ ہیں۔۔۔ میرا یا ترے بھائیاں کا ہوئے گا کچھ نا، پر تیرا پریمی بھی جان سے جائے اور تو بھی۔۔۔ گانٹھ باندھ لے۔۔۔''

''ٹھیک ہے باپو۔۔۔ ایسا ویسا کچھ نا کروں گی۔'' نیما کا گورا چٹا کچھ چوڑا سا چہرہ بالکل سپاٹ نظر آرہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بھی کسی جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

''نگندر سے ملوں گی بھی نہیں۔ پکا بول رہی ہوں۔ پر تم لوگ اس کا کچھ برا مت کرنا۔۔۔ وہ بے کسور (بے قصور) ہے۔۔۔ سارا کسور میرا ہے۔ اس نے میرے کو اپنے جال میں نہیں پھنسایا ہے، پہل میں نے ہی کی تھی۔۔۔ میرے کو ماردو، نگندر کو کچھ مت کہنا اب اس سے نا ملوں گی۔۔۔''

''ٹھیک ہے، کچھ نا کہیں گے چھورے کو، پر تو اپنا وائدا (وعدہ) یاد رکھیو۔ دیکھے نا لیوں تو ئے وا کے ساتھ۔''

''نا دیکھو گے، نیما نے مطمئن کرنے والے لہجے میں کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چودھری گنیش پرساد نے حقہ اٹھالیا۔

دیر تک چودھری صاحب حقے کے چھوٹے چھوٹے کش لیتے رہے اور بیٹی کا وعدہ ان کے ذہن میں گونجتا رہا جس پر انہیں رائی برابر بھی یقین نہیں تھا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ قد اور پینسٹھ کلو گرام وزن والی اپنی بیٹی کو چودھری صاحب اچھی طرح جانتے تھے۔ ضدی بچپن سے تھی۔ خودسر جوانی آتے آتے ہوگئی تھی۔ وزنی ارادے اور مضبوط ضد سے ہی گھر والوں کو پست کر کے کالج پہنچی تھی۔ اس بیٹی کا اتنی آسانی سے نگندر سے نہ ملنے کا وعدہ چودھری صاحب کو کھٹک ہی نہیں رہا تھا، مسلسل چبھ رہا تھا۔ ستر سالہ منجھا ہوا ذہن ان سے پیہم کہہ رہا تھا کہ ایسا وعدہ کرنا نیما کی

مجبوری تھی۔ اس معاملے میں ضد کر کے وہ نگندر کی موت کا کارن بن جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی برادری میں کسی کے لیے کسی کو قتل کر دینا کوئی پرابلم نہیں تھی، بلکہ برادری کے اس شخص کو بڑی عجیب اور بڑی میلی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا جس نے کبھی کوئی قتل نہیں کیا ہوتا تھا۔ نیما اپنی برادری کو تو جانتی تھی اپنے باپ، چچا اور دونوں بھائیوں کو زیادہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لیے وہ اپنی بیٹی کے وعدے کو سمجھ سکتے تھے حالانکہ انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ ان کی بیٹی اتنی آسانی سے مان گئی ہوگی اور اب واقعی نگندر سے نہیں ملے گی۔

چودھری صاحب اور ان کے بیٹوں کرم بیر اور دھرم بیر نے بظاہر لاپروائی کا رویہ اپنا لیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے نیما پر نظر رکھنے لگے تھے اور پانچویں دن انہیں علم ہوگیا کہ نیما نے نگندر کے ساتھ بھاگ کر ممبئی جانے اور وہاں نگندر کے ایک دوست علی احمد کے یہاں شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اور پھر وہ رات آگئی۔ گاؤں سے تین کلومیٹر دور رات میں دو بجے نیما اور نگندر نے خود کو نیما کے باپ، چاچا اور دونوں بھائیوں کے نرغے میں نہیں پایا۔ امن پور ریلوے اسٹیشن محض آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

تین بجے ممبئی میل امن پور پہنچی تھی۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر آئی۔ دو منٹ ٹھہری۔ پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ نہ کوئی مسافر ٹرین سے اترا..... نہ سوار ہوا۔

چھ ماہ بعد اپنی برادری میں نیما کی شادی ہوگئی پڑوسی ریاست کے ایک سرحدی گاؤں میں۔ نیما کا شوہر پرم جیت گاؤں کے ہی سینئر سیکنڈری اسکول میں ٹیچر تھا۔ نیما بھی گاؤں کے ہی ایک پرائیوٹ غیر تسلیم شدہ پرائمری اسکول میں پڑھانے لگی۔

شادی کو تین سال ہوگئے پھر چار سال، پھر پانچ سال وہ ایک بار بھی اپنے مائیکے نہیں گئی۔ اس کے باپ اور بھائی تین بار اس سے ملنے آئے لیکن اس نے سامنے آنے سے انکار کر دیا۔ اس کے باپ بھائی اس کے اور پرم جیت کے لئے جو کپڑے اور دوسرا سامان اور تحائف لائے تھے سب کچھ نیما نے بغیر دیکھے ہوئے واپس کروا دیا۔ اس کے ساس سسر کا انتقال ہو چکا تھا وہ پرم جیت اور اپنے چار سال کے بیٹے کے ساتھ مست تھی۔ چودھری گنیش پرساد اور ان کے دونوں بیٹے کرم بیر اور دھرم بیر خاموش ہو بیٹھے۔ کرم بیر اور دھرم بیر کی شادیاں ہوگئی تھیں اور دونوں کے دو دو بچے بھی تھے۔

پرم جیت نیما کو ٹوٹ کر چاہتا تھا خاص کر جب سے نیما نے اسے اپنے اور نگندر کے بارے میں بتایا تھا تب سے پرم جیت اور زیادہ اس کا دیوانہ ہوگیا تھا۔ سب کچھ سن کر اس نے پوچھا تھا کہ کیا وہ اب بھی نگندر سے پیار کرتی ہے تو نیما نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا سنو پرم جیت نگندر میرا بیتا ہوا کل ہے۔ جب تم کہیں نہیں تھے۔ جب سے تم میری زندگی میں آئے ہو میرا کل ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ تم میرا آج ہو اور آنے والا کل بھی۔ اب نگندر ایک کہانی ہے ایک مردہ قصہ۔ تم ایک جیتی جاگتی حقیقت ہو..... مجھے نہیں معلوم نگندر پتی ثابت ہوتا مگر یہ جانتی ہوں کہ تم کیسے پتی ہو۔ اگلے ہر جنم میں...... ہر جنم میں بھگوان سے یہی چاہوں گی کہ تم ہی میرے پتی بنو۔ صرف تم۔

اس طرح پرم جیت لٹ گیا تھا۔ نیما پتنی سے ملکہ ہوگئی تھی۔

نیما نے سنا کہ چوھردی گنیش پرساد کو آرتھرائٹس کی بیمار نے بہت بوڑھا کر دیا ہے۔ عمر نے اسے بہت آگے دھکیل دیا ہے۔ ستر سال کی عمر میں نوے کے لگنے لگے ہیں۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا ہے۔ چلنا پھرنا تقریباً ناممکن۔ ہاتھوں کی دس کی دس انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی ہیں۔ نیما کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پرم جیت سے کہہ کر اس نے علاقے کے پولس اسٹیشن کے ایس ایچ او گوپال چندیل کو رات کے کھانے پر مدعو کروالیا اور اس کی پسندیدہ ڈش تیار کرنے لگی۔ گوپال چند اور پرم جیت دور کے رشتے دار بھی تھے۔ دوست بھی تھے۔ گھریلو تعلقات تھے۔ نیما اسے بھیا جی کہتی تھی۔ گوپال اسے چھٹکی کہہ کر پکارتا تھا اور چھوٹی بہن کی طرح ہی پیار کرتا تھا۔

کھانے کے بعد عام پولس والوں کی طرح انسپکٹر گوپال بھی اپنے کارناموں کا ذکر کرنے لگا۔

رہنے دو، رہنے دو بھیا جی! تم لوگ اور کچھ کر پاؤ یا نہ کر پاؤ ڈینگیں بہت اچھی مار لیتے ہو۔'' نیما چڑانے والے انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' گوپال کے لہجے سے لگا کہ اسے نیما کی بات اچھی نہیں لگی۔

مطلب یہ ہے کہ اصلی مجرم یا تو تم سے پکڑے نہیں جاتے، یا تم لوگ انہیں رشوت لے کر چھوڑ دیتے ہو۔ یا کسی بے گناہ کو پکڑ کر جرم اس کے سر منڈھ دیتے ہو۔ کسی دباؤ میں آکر کیس داخل دفتر کر دیتے ہو۔ فائل بند چھٹی.... لو بھئی اگلا کیس کیا ہے؟''

''اے چھٹکی! سارے پولس والے ایک سے نا ہوئے ہیں۔ تیرے اس بھائی کا ریکارڈ بالکل صاف ہے صرف صاف ہی نہیں بہت اچھا بھی.... پولس سیوا میڈل مل چکا ہے۔'' گوپال بہت سنجیدہ تھا۔

''ہوسکتا ہے'' نیما اس طرح بولی جیسے اسے گوپال کی بات پر یقین نہ آیا۔ ''مگر بھیا جی! مجھے تو یہ پتہ ہے کہ مجرم جرم کرتا ہے اور پھر سانڈ کی طرح دندناتا ہے۔ چھ سال پہلے امن پور کے نگندر کا مرڈر سنا ہوگا۔ چوھری گنیش پرساد، اس کے بھائی چودھری نریش پرساد، چودھری گنیش پرساد کے دونوں بیٹوں کرم بیر اور دھرم بیر نے تلواروں سے نگندر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ تین مہینے تک علاقے کی پولس ادھر ادھر ہاتھ پیٹتی رہی پھر فائل بند کر دی گئی۔ دونوں چودھری اور دونوں چودھری زادے آج بھی علاقے میں مونچھوں پر تاؤ دیئے گھومتے رہتے ہیں۔ نگندر بھی انسان کا بچہ تھا۔ کتا بلی نا تھا۔''

گوپال چندیلا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے علم تھا کہ چودھری گنیش پرساد نیما کے پتا تھے۔ چودھری نریش پرساد اس کے چاچا اور کرم بیر اور دھرم بیر اس کے سگے بھائی تھے۔

امن پور میں وہ رات ان چاروں چودھریوں کی بے فکری سے سونے کی آخری رات ثابت ہوئی۔ دوسرے دن رات ہونے سے پہلے ان چاروں چودھریوں کو نگندر کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

ایک ہفتے کے بعد نیما اپنے بوڑھے، کمزور باپ، قریب قریب سو فیصد باپ سے بیمار چاچا اور اپنے دونوں بھائیوں سے ملنے حوالات گئی۔

''تیں نے اتنا انتجار (انتظار) کیوں کیا چھوری؟'' چودھری گنیش پرساد نے اپنی بیٹی سے پوچھا۔

''تا کہ تم اچھی طرح بوڑھے ہو جاؤ۔ تمہارا شریر دکھ، درد، تکلیف، جھیلنے کے لائق نہ رہے۔ ہر دکھ تمہیں زیادہ دکھ لگے، ہر درد زیادہ درد، ہر تکلیف زیادہ تکلیف۔ دونوں بھائی اچھی طرح اپنے بیوی بچوں میں رچ بس جائیں تا کہ جیل کی زندگی ہزار گنا کٹھن ہو جائے مگر تم لوگ فکر نا کرو..... میں جج کے پیروں میں گر کر ان سے ونتی کروں گی کہ کرم بیر کو تمہاری آنکھوں کے سامنے پھانسی ہو..... تم سب کی آنکھوں کے سامنے...... تمہارا بڑا بیٹا ہے نا۔ سب کا، خاص کر تمہارا چہیتا ہے..... پھر تم دونوں بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے دھرم بیر کو پھانسی پھر آخر میں تمہاری آنکھوں کے سامنے چاچا کو پھانسی ہو۔ تمہارے لئے میں عمر قید کی سزا مانگوں گی تا کہ قدرتی موت سے پہلے تمہیں پل پل اپنے بیٹوں اور بھائی کی پھانسی یاد آتی رہے اور تم پل پل مرتے رہو۔ چودھری گنیش پرساد! نگندر واقعی بے قصور تھا..... میں روتی رہی گڑگڑاتی رہی، بلک بلک کر ونتی کرتی رہی مگر تم چاروں نے بڑی بے رحمی سے میری آنکھوں کے سامنے اس بے گناہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تلواروں سے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے خون میں لت پت مرتے ہوئے نگندر سے میں نے دل ہی دل میں وعدہ کیا تھا میں تیرا بدلہ ضرور لوں گی میرے دوست۔ اسی سے میں پتھر ہو گئی تھی۔ تمہارے لئے پتھر بنی..... بھائیوں کے لئے پتھر بہن۔ بدلے کی شروعات اسی پل ہو گئی تھی جس پل نگندر کی سانسیں ختم ہوئی تھیں۔ تم چاروں نے مل کر ایک نگندر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اب میں اکیلی تم چار کو کاٹ کر رکھ دوں گی۔ مجھے عدالت پہنچنے تو دو۔

....

فاروق راہب

ایک اور سرحد

دور تک پھیلے کربناک سناٹے میں گم ہوتی دردناک چیخوں کا راگ بند ہو چکا تھا۔ اب آگ کی لپٹیں تھیں، نہ دھواں اور نہ سرد راکھ۔ اپنی گردن اور تعاقب میں اپنوں کی تلواریں اور ریگزاروں پر دوڑتے بر فیلے لوگ دوڑ نہیں رہے تھے۔ بس سرابوں کا تھرتھراتا منظر تھا اور تحیر سی پھیلی بے سوال آنکھیں۔

ویسے وہاں اندھیرا پہلے سے ہی بحال تھا۔ اجاڑ اور بے رنگ چہرے دو جون کی روٹی کے جگاڑ میں مشغول رہتے۔ خوشی کے لمحات میں بھی مسکراہٹوں کی لہریں بڑی مشکل سے اٹھتیں۔ اتحاد کے نام پر بکھراؤ پسرا تھا اور اپنی جڑوں سے اکھڑنے کا ڈر سہما رہا تھا۔

خود مختاری کے اعلان کے ساتھ ہی کئی دہکتی لکیروں کا جنم ہوا۔ بنیادی حقوق مضبوط جھولیوں میں چلے گئے اور ناتواں کو پسلے کی طرح ہی پھینکے ہوئے چند ٹکڑے اور وعدوں کے کھوکھلے دعوے۔ ہر بار خوابوں کے مینارے سجتے اور ہر بار زندگی تھوڑا اور نیچے سرکتی اور سانسوں کی گھٹن کے پنجے اور کس جاتے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا سفر اچانک تمام اور زنگ آلود ساعتیں حیرتوں کے جہاں کی سیر کے لئے سکتے میں استحصال کا بھیانک کھیل جاری تھا۔ خوابوں کے تمام پنچھی ایک ایک کر یوں وداع ہوئے کہ خلا میں بس آسمان جھول رہا تھا۔ کھونے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ امیدوں کا دامن چھوٹتے پکڑتے چھوٹ ہی گیا۔ اپنی پہچان سے زیادہ اپنا اور بیوی بچوں کے پیٹ بھرنے کی فکر ستاتی تھی۔ مگر وحشتیں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ امن کی چادر میں ان گنت چھید اور فضا میں ڈولتی لہولہان فاختہ۔

جمہوریت کے نام پر تانا شاہوں کی گھس پیٹھ ہو گئی تھی۔ کرسی بچاؤ کی مہم میں خرید و فروخت کا بازار گرم تھا اور طاقت کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ کنبہ پروری زوروں پر تھی۔ ہر رہنما اپنے خاندان کے اراکین کو آگے بڑھانے کی دھن میں تھا۔ مذہبی قائدین بھی مسلکی الجھنوں میں الجھ کر اپنے حجروں تک محدود تھے۔ مفلسوں کو خط افلاس سے اوپر لانے کے لئے مہیا کرائی گئی سہولتوں کا بھی بندر بانٹ ہوتا۔ اس کی مخالفت میں تھوڑا شور وغل ہوتا، مگر پھر سب معمول پر آجاتا۔ یہاں تک کہ شہیدوں کی بیواؤں کو دیئے جانے والے فلیٹس بھی بڑے افسروں اور نیتاؤں نے اپنے یا اپنے بھی خواہوں کے نام الاٹ کرا لئے۔ دلتوں اور کمزور طبقوں کے بیچ سے آئے رہبر بھی میدانِ سیاست کے کھلاڑی میں تبدیل ہو گئے تھے اور جوڑ توڑ کی راج نیتی میں مصروف تھے۔ کروڑوں کے پارک میں اپنی مورتی نصب کرا کر زندگی میں ہی امر ہونے کا شوق۔ بے روزگاروں کو بیکاری بھتہ یا چند ہزار کی نوکری۔ اور اپنے حقوق کی لڑائی لڑنے والوں کے ہونٹ سلے ہوئے۔ طلباء اور طالبات پڑھائی کے لئے نہیں، وظیفہ، پوشاک، سائیکل یا دوپہر کے کھانا کے لئے سڑک جام کر رہے تھے۔ سرخ انقلاب کے دعویدار تخت و تاج تک سمٹے ہوئے یا اپنے گمشدہ آدھار کی تلاش میں تھے۔ ماتا جی نے حکومت ہاتھ لگتے ہی مسکراہٹوں پر پابندی عائد کر دی تھی۔ مسکرانا منع تھا۔ کیونکہ خود ان کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی سمجھ سے حیات کی کامرانیوں کو تبسم کی نہیں ارادوں کی ضرورت تھی۔

''سر! آپ اوپر سے اریل ہو یا نیچے سے کٹ؟

ٹیکسی ڈرائیور کے عجیب و غریب اور حیرت انگیز سوال نے مجھے بار بار پہلو بدلنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔

زندگی بھی کتنے روپ رنگ میں چہرہ پر چہرہ لگائے خود سے نبرد آزما ہوتی ہے اور خونی تماشا کے تماشائیوں کا مجمع لگتا ہے۔ چند سال پہلے آگ اگلنے والے دہشت ناک اژدھوں نے جب ایک خاص علاقہ پر دھاوا بولا تو سربراہ اعلیٰ کی وحشی قہقہوں کی ہم سفری میں پوری رات انگاروں کی بارش اور شعلوں کا رقص ہوا تھا۔ چیخوں اور کراہوں کے اوپر حیوانیت کے خونی پنجوں کا سایہ منڈلا رہا تھا اور ایک خوفناک آواز بار بار گونج رہی تھی۔ بدلہ بدلہ۔ ان بھکتوں کا بدلہ۔ ٹرین کی ایک باگی میں جنہیں زندہ جلا دیا گیا۔ بدلہ۔ بدلہ۔ نادر شاہی فرمان کی تلوار اس وقت تک میان کے اندر نہیں گئی جب تک اس کی پیاس بجھی نہیں۔ عزت و عصمت لٹی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر معصوموں کو نیزوں پر اچھالا، آگ کی نذر کیا اور راکششی قہقہہ گونجتا رہا۔ شام غریباں کے لٹے اجڑے مسافر لوٹ کر نہ آتے تو سانحہ کربلا کے لہولہان المیہ سے لوگ برسوں بے خبر رہتے۔ میڈیا نے اپنا فرض نبھایا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ رپورٹروں اور فوٹوگرافروں نے اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر آگ اور دھویں کے دردناک مناظر کو تفصیل سے پیش کیا اور قتل عام کے دہشت ناک نظارہ پر دنیا دنگ رہ گئی۔ چاروں طرف سے ہائے توبہ مچی۔ کمیشن، انکواری۔ مگر نتیجہ! سربراہ اعلیٰ کے سپاٹ چہرے پر کوئی شکن نہیں اور دامن بے داغ اور نا تبسم ہونٹوں کی خونی خاموشی کے اوپر چمکیلی آنکھوں سے لپکتی آنچ سامنے والے کو جھلسانے کو ہمیشہ تیار!

''سر! آپ اوپر سے ایریل (Aerial) ہو یا نیچے سے کٹ (Cut)؟''

دراصل وہ میرا مذہب جاننا چاہ رہا تھا۔ میں نے بھی اسے گول مٹول جواب دیا۔

''بھائی! میں رپورٹر ہوں اور رپورٹر کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے بھی میں آیا تھا۔''

''آپ وہ ڈبہ دیکھو گے؟''

''دیکھ چکا ہوں۔ حقیقت کی تہہ تک پہنچے بغیر ہی ایک خاص علاقہ کو نشانہ بنایا گیا اور بے گناہوں کو دہکتے الاؤ میں ڈال دیا گیا۔ انسانیت شرمسار ہوئی۔ دیش کلنکت ہوا۔''

''بالکل صحیح''

گاڑی اسی تباہ برباد علاقے سے گذر رہی تھی جہاں کبھی زندگی دکھوں کے ہمراہ بھی رقصاں تھی۔ محنت کش لوگ اپنی محنت کے بل پر اپنے انتشار کو بچائے ہوئے تھے۔ لیکن ایک دن اچانک ہی قیامت حملہ آور ہوئی اور سب تہس نہس ہو گیا۔ اس آفت ناگہانی سے جو کسی طرح بچ گئے انہیں ایک جگہ کیمپ میں رکھا گیا تھا۔ ان کے حالات اور انہیں ملنے والی امداد کی مجھے رپورٹ تیار کرنی تھی۔

''ادھر کوئی نہیں جاتا سر! ڈرائیور نے کہا۔ صرف ہیومین رائٹس والے، ریڈ کراس کے ممبران یا سماجی کاریہ کرتا کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں۔''

''اور سرکار کی طرف سے؟''

''ہاں، دال میں نمک برابر۔''

حکومت کے اس رویہ پر حیرت نہیں ہوئی

''لو صاحب! کراچی آ گیا۔'' ڈرائیور گاڑی روکتا ہوا بولا۔

''کیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''جی صاحب! اس کیمپ میں رہنے والوں کو رفیوجی اور جگہ کو کراچی کہتے ہیں۔''

اپنا ملک، اپنی زمین، اپنے لوگ اور یہ نئی سرحد۔ لمبی چوڑی کھائی اور دلوں میں بڑی دراڑیں۔ زخم کہاں بھرتا ہے! بھر جائے تو نشان رہ جاتا ہے۔

ڈرائیور کے جاتے ہی میں بھاری من اور پتھر بندھے پاؤں سے اجنبی اداسیوں کی ایک اور سرحد کی اور متحرک ہوا۔ فاصلہ نزدیک ہوتے ہوئے بھی دور لگ رہا تھا اور میں گھائل پرندے کی طرح تڑپتا لنگڑاتا چلا جا رہا تھا۔

....

شانتی پور، موتیہاری۔ 845401 (بہار) موبائل: 9430593512

ایس شمس الحسن گیاوی

آشیانہ

لائنز کلب کے خیراتی عشائیہ سے واپس آتے ہوئے جب ڈاکٹر انصاری اس سڑک پر پہنچے جس کے سرے پران کا مکان تھا تو بیگم انصاری نے یکا یک اپنے شوہر سے موٹر روکنے کو کہا۔ چالیس سال کی رفاقت کے بعد اب انہیں اپنی بیگم کے کسی غیر متوقع فیصلے پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ طویل سانس لے کر انہوں نے گاڑی کچے میں اتار کے ایک طرف کھڑی کر دی۔

چاندنی رات تھی اور ہوا خنک، اردو گرد کے بھی مکان روشنی سے رچے بسے تھے۔ ان کے مکینوں سے ان کے پرانے مراسم تھے۔ ان کے بچے اکھٹے اسکول گئے، پھر جوان ہوئے۔ شادیاں ہوئیں اور اب ان کے بھی بچے ہوگئے تھے۔ دوست واحباب جب کبھی اپنے گھروں میں شوروشغف، بے ترتیب سامان وآرائش اور بدوضع باغ کی شکایت کرتے تو انہیں دفعتاً وہ زمانہ یاد آجاتا، جب ان کے اپنے بچے مہابھارت مچائے رکھتے تھے۔ راہ داریوں میں ٹینس، کرکٹ کے بلے، سائیکلوں اور کتابوں کے انبار لگتے تھے اور مالی کیاریاں روندنے اور کچے پھل ٹوٹنے کی شکایت ہر وقت کیا کرتا تھا۔ انہوں نے اچٹتی نگاہ سامنے ڈالی۔ آشیانہ کے پھاٹک پر روشنیاں جل رہی تھیں۔ نیچے بھی اکا دکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ بالائی منزل البتہ اندھیری تھی اور عرصے سے خالی پڑی تھی۔

انہوں نے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ کس چاؤ سے اس نے مکان بنوایا تھا۔ اس کی تزئین و آرائش کی تھی۔ باغ ترتیب دیا تھا اور بصد شوق اس وقت کا تصور کیا تھا جب بچوں کی شادیاں ہوں گی اور گھر میں ہیرے سے شوخ قہقہے اور بچوں کی کلکاریاں گونجیں گی لیکن جانے کیا ہوا کہ بچے بڑے ہوئے تو تعلیم کے لئے باہر چلے گئے اور جب تعلیم حاصل کر کے لوٹے تو وطن کی ہر شئے انہیں عجیب اور بے ڈھنگی لگنے لگی۔ حتیٰ کہ ایک روز پھر وہ اپنی زندگی بنانے کے خیال سے دنیا کے دوسرے ملکوں کو نکل گئے، کمرے بھائیں بھائیں کرنے لگے۔ باغ سنسانے لگے اور ٹی وی لاؤنج اور بیٹھک یکا یک دو میاں بیوی کے لئے بڑا اور ناموزوں لگنے لگا۔

بیٹے کہتے تھے کہ مکان فروخت کر کے مستقل ان کے ساتھ رہائش اختیار کر لی جائے۔ یا کم از کم فالتو سامان پھینک کر اسے کرایہ پر ہی اٹھا دیا جائے۔ شاید وہ ٹھیک کہتے تھے۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ صبیحہ کو یہ بات قطعی پسند نہ آئے گی۔ وہ ایام گذشتہ کی خوشگوار یادوں کو ابھی تک سینہ سے لگائے ہوئے تھی۔

''ہم نے یہ کارڈ مدرس ڈے پر دیا تھا۔'' اس نے دروازے سے ایک بوسیدہ کاغذ نکال کر دکھایا۔ ڈریسر پر لکیریں رفاقت نے ڈالی تھیں اور اس فائل میں اس کے اسکول کی تمام رپورٹیں ہیں۔ وہ نشانات گڈو کے ننھے قدموں کے ہیں۔ جب وہ گیلے سیمنٹ پر ٹامی کے پیچھے دوڑتا چلا گیا تھا۔ تالاب کے کنارے املی کے پودے مہرو نے لگائے تھے۔ کبھی کبھار چھٹیوں میں جب بچے اپنے اپنے کنبوں سمیت آیا کرتے تو پرانے دن لوٹ آتے۔ دعوتیں ہوتیں، جھولے آباد ہوتے اور تالاب کے کنارے میلہ سا لگ جاتا۔ اکثر وہ اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے

نواسیوں کو اپنی روایت سے روشناس کرانے کی کوشش کرتیں۔ انہیں گود میں بٹھا کر کہانیاں سناتیں۔ لیکن یہ نئی نسل بڑی حقیقت پسند تھی۔ اسے تصورات یا رومانس سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ پیدائش و ہلاکت، مصائب و مسرت، حادثات و واقعات کے معاملے میں ان کا نظریہ بڑا بالغانہ تھا۔ چندا ماما دور کے..... '' والی لوری انہیں مضحکہ خیز لگتی تھی۔ بلکہ وہ بڑے رنج سے آپس میں کہتے تھے کہ دادی اماں تو بالکل ہی سٹھیا گئی ہیں۔ آخر چاند میں رکھا ہی کیا ہے۔ نہ بڑھیا، نہ عفریت، نہ لوگ، ایسے ایسے نہ جانے کتنے چاند موجود ہیں۔ افسوس! دوسری بہت سی دلفریبیوں کی طرح انسان کب کا، اس کے اسرار کا بھی خاتمہ کر چکا ہے۔ چور آنکھوں سے انہوں نے صبیحہ کی طرف دیکھا اور کھلی کتاب کی طرح ان اوراق کو پڑھتے چلے گئے، جو اس وقت ان کے چہرے پر پیدا ہوئے تھے۔ وہ بہت کم شگفتگی کے نقاب اتارتی تھی، جو عموماً دوسرے لوگوں کے سامنے پہنے رہتی تھی۔ بیحد چاق و چوبند، ہر لمحہ سرگرم عمل، کوئی کام ہو تو تندہی سے جٹ جاتی۔ اسکول کے لئے مینا بازار لگایا جا رہا ہے۔ اپاہج بچوں کے مرکز کی تعمیر کا منصوبہ بن رہا ہے۔ شاید یوں وہ خود کو اس قدر مصروف رکھتی تھی کہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی کسی انجانے لمحوں میں غیر متوقع طور پر اور کہیں کہیں سے اس کا مجروح وجود جھانکنے لگتا۔ جو غالباً بچوں کے بغیر بے چین و اداس تھا۔

صبیحہ نے اپنے شوہر کے بازو کو چھوتے ہوئے کہا۔ '' چلتے ہیں بہت دیر ہو گئی۔ '' ڈاکٹر صاحب نے گردن کو خم دیکر اتفاق کیا، اور موٹر اسٹارٹ کر کے سڑک پر لے آئے۔ موٹر ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ ان خیالوں میں گم تھے۔ '' بچوں کے جسم کو گھر کی چہار دیواری میں پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے ذہن اپنے خیالات سے محیط نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے کہ وہ مستقبل کی امانت ہیں۔ ''

صبیحہ نے ٹوکا '' کیا سوچ رہے ہیں؟ ''

'' کچھ نہیں۔ ''

اندھیرے کمرے میں بستر پر لیٹے لیٹے انہیں خیال آیا کہ طالب علم امتحان کی تیاری میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ کھلاڑی مقابلے کے لئے مستقل مشق کرتے رہتے ہیں۔ جنگ کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ پسپائی کی راہیں بھی تجویز کر لی جاتی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ والدین اس امر کے متعلق سوچنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

'' صبیحہ...... '' انہوں نے آہستہ سے پکارا۔

'' آپ کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے نا۔ اصل میں ہم لوگوں کو کافی کا دوسرا کپ پینا ہی نہیں چاہئے تھا۔ '' صبیحہ نے روزمرہ کے لہجے میں کہا۔

'' نہیں۔ کافی کا اس بے خوابی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مکان ہم دونوں کے لئے بہت بڑا ہے۔ ''

'' کیا مطلب؟ ''

'' میرا مطلب یہ ہے کہ کیوں نہ ہم اسے معذور اور غریب بچوں کی اقامت گاہ کے طور پر پیش کر دیں؟ '' انہوں نے بڑی آہستگی کے ساتھ کہا۔

"لیکن......"

صبیحہ نے غالباً روشنی کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ جلدی سے بولے۔

"نہیں، روشنی نہ کرنا۔ یادوں کے جگنو معدوم ہو جائیں گے۔"

انہوں نے صبیحہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "آشیانہ" اجڑنے کے لئے نہیں بنایا جاتا۔ محبت کے اتھاہ جذبہ کو قفس کی بیڑیوں سے آزاد کردو، پھر دیکھو تمہارے گرد کتنے ایسے ہیں جن کی زندگی میں چاہت، محبت اور توجہ کا فقدان ہے۔ یہ خزانہ ان پر نچھاور کردو۔"

کچھ عرصہ بعد کسی کانفرنس میں شرکت کے لئے جب ان کا بڑا بیٹا وطن آیا تو آشیانہ کے باغ میں بہت سے بچوں اور والینٹئر خواتین و حضرات کو دیکھ کر ٹھٹکا گیا کہ کہیں غلط مکان میں تو نہیں آگیا۔ جب وہ اندر پہنچا تو اسے اپنی والدہ نظر آئیں، جو بڑی دلچسپی سے چاند میں بیٹھی ہوئی چرخہ چلاتی بڑھیا کی کہانی سنا رہی تھیں اور بچے معصومیت، تجسس اور حیرت و استعجاب کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

....

بلاک-اے، ۸۲/عنایت کالونی، باری روڈ، گیا-۸۲۳۰۰۱ (بہار) موبائل : 8292413301

ڈاکٹر عالمگیر شبنم

وطن کی مٹی

جاڑے کی سرد ترین رات تھی۔ سارا شہر برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہر جاندار منجمد نظر آتا تھا۔ رہ رہ کر ہوا چل رہی تھی۔ جس سے سردی میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہوائیں سانپ کی طرح ڈس رہی ہیں۔ رگوں میں خون جمتا جارہا تھا۔

ایسی ہی ایک رات کو ایک تنہا سایہ کشمیر کی وادی کے ایک بے کراں برف پوش علاقہ کو پار کررہا تھا۔

ایک جوان ماں اپنا گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہی تھی۔ تیزی سے آگے مشرق کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنے گاؤں سے بھاگ رہی تھی۔ کیونکہ اس کی سرزمین پر گوریلاؤں نے قبضہ کرلیا تھا وہ بھاگ رہی تھی اپنی خودداری اور اپنے بچے کو بچانے کے لئے۔

سامنے دریا تھا جس کے کنارے، کنارے گوریلا محاذ جنگ کی حالت میں اسلحہ سے لیس گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔

نوجوان ماں بھاگتی جارہی تھی۔ اسے ہر قیمت پر اپنے لوگوں کے درمیان پہونچنا تھا۔ اسے بہر صورت اپنے بچہ کو دریا کے اس پار مقدس سرزمین تک لے جانا ہی تھا۔

شدید برف باری کی یہ رات اس کی جان ہی کیوں نہ لے لے اسے ایک مقدس فریضہ انجام دینا ہی تھا۔ اپنی اولین محبت کی اس نشانی کو بہر حال زندہ رکھنا تھا۔

ماں سخت پریشانی کے عالم میں آگے بڑھتی جارہی تھی۔ آگے کچھ اور آگے...... لیکن برف پوش میدان تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ وہ نڈھال ہوچکی تھی۔ برف اس کے جسم پر خنجر کی طرف چبھتی تھی۔ اچانک اسے ایسا لگا کہ اس کا بچہ اس کی گود میں منجمد ہوا جارہا ہے۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اس کی پریشان نگاہیں کسی ایسے گوشے کی، کسی ایسے جاء پناہ کی تلاش کرنے لگیں۔ جہاں وہ اپنے بچے کو گرمی پہنچانے کے لئے جاسکے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اچانک دو کالی، کالی پرچھائی نظر آئیں۔ یہ دو درخت تھے جوان کے سامنے کھڑے تھے وہ ذرا دم لینے کے لئے ان کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی قوت ارادی ختم ہوتی جارہی تھی۔ برف اس کے چہرے کو اپنی سرد اور جلا دینے والی زبان سے چاٹتی جارہی تھی۔ ماں کا دل تڑپنے لگا۔ بچہ منجمد ہوتا جارہا ہے وہ اس برفیلی سردی کی تاب نہ لاسکے گا۔

نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس نے اس ڈراؤنے خیال کو دل سے نکال دینا چاہا۔

جس بچے کو وہ دشمن کے چنگل سے چھین لائی ہے وہ اسے یوں موت کے حوالے نہیں کرسکتی۔ چاہے ساری دنیا برف میں بدل جائے چاہے دنیا کی ساری زندگی ہی منجمد کیوں نہ ہوجائے۔ وہ اپنے۔ وہ اپنے سینے سے ماں کا دل نکال کر اس کی گرمی سے بچے کو حرارت عطا کرے گی۔

اس نے اپنی اونی شال اتار کر بچے کو اس میں لپیٹ لیا چند لمحات گذرے لیکن اسے یہ لمحات مہینوں نہیں، برسوں نہیں صدیوں کے معلوم ہوئے۔

برفیلی ہوا اس کے جسم کو دہکتے ہوئے لوہے کی طرح جلاتی جارہی تھی۔

اور ایک بار اسے ایسا لگا کہ اس کا بچہ منجمد ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا سویٹر اتارا اور اسے بچے کے جسم پر ڈال دیا اب ماں کا جسم کھلا ہوا تھا اور وہ برف کے مقابلے میں اپنے کو بالکل بے بس محسوس کر رہی تھی۔ اس نے موت کو بالکل قریب پایا وہ خود منجمد ہوتی جارہی تھی اب اس کے اندر ذرا بھی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اس نے اپنا بلاؤز اتارا اور بچے کو کچھ اور گرمی پہنچانے کیلئے اس سے ڈھک دیا۔ وہ تو ویسے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے کو تھی۔ لیکن بچے کی زندگی کو ہر حال میں بچانا تھا اس نے اپنی بچی کچی قوت سے بچے کو ساری مادری محبت کے ساتھ سینے سے لگا لیا اور چپکے چپکے دل میں کہنے لگی۔

''میرے لاڈلے اب تمہیں گرمی پہنچانے کے لئے میرے پاس میرے دل کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس دل کی آخری دھڑکن تک تمہاری ہے۔ ماں خاموش ہوگئی۔ لیکن اس کے کانوں میں برفیلی ہواؤں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ نہ اب کچھ دیکھ سکتی تھی اور نہ پورے طور پر سن سکتی تھی......وہ درخت کے قریب ہوتی چلی گئی۔

سردی کی ظالم رات نے اسے ایک نئے لباس سے ڈھک دیا۔ برف کی انگلیوں نے اس کے جسم پر گل بوٹے بُن دیئے۔

صبح آئی، شفاف اور برفیلی صبح فضا میں چمکتی ہوئی تیز برہنہ سورج کی شعاعیں۔

درختوں کے سامنے تین افراد دشمن کو دھوکا دینے والے سفید لباس پہنے کھڑے تھے۔ یہ ہندوستانی سپاہی تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا سماں تھا جسے وہ اپنی زندگیوں میں فراموش نہ کرسکیں گے۔

وہ تینوں اس مقدس قربان گاہ کے سامنے دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ آخر ان میں سے ایک درخت کے پاس برف کے مجسمہ کے قریب گیا۔ اس نے اس بنڈل کے اندر جھانکا جسے منجمد عورت اپنے سینے چمٹائے ہوئے تھی۔ اس نے جذبات کی شدت سے کانپتی ہوئی انگلیوں سے کپڑے کو اوپر سے ہٹایا دیکھا کہ اندر سے بچے کی آنکھیں اسے تک رہی ہیں۔ نوجوان سپاہی غیر اداری طور پر پیچھے ہٹ آیا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دی بچہ زندہ ہے بچہ صبح کی دھوپ سے آنکھیں کھول کر مسکرایا۔ سپاہی کی آنکھوں سے مارے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ اس نے سر کو اٹھا کر ماں کے اس شاندار مجسمہ کو ایک بار پھر دیکھا۔ اور بچے کو گود میں لے کر وہاں سے چلے آئے لیکن برف کا وہ مجسمہ، ایثار کی وہ دیوی اور ممتا کی وہ پیکر اس کے ذہن و دماغ پر چھا گئی اور اس نے اس کو ایک نئے فکر سے روشناس کرادیا تھا جو فکر لافانی ہے ایک شاہکار ہے۔ یہ فکر اس کو ہمیشہ عظمت و بلندی کی طرف گامزن رکھے گا۔

....

محلہ فیض اللہ خاں، لال باغ، دربھنگہ-۸۴۶۰۰۴ (بہار) موبائل : 9470737769

حیدر وارثی

کچی عمر کی دیوانگی

''کیا عمر بھی کبھی کچی ہوتی ہے''؟ تبریز نے استفسار کیا۔

''عمر کچی اور پکی نہیں ہوتی، ذہن کچا اور پکا ہوتا ہے۔ کوئی طویل عمر پا کر بھی کچا ہی رہ جاتا ہے اور کوئی صغر سنی میں ہی پختہ ذہن کی حد میں داخل ہو جاتا ہے''۔

میں نے اس کے سوال کا مختصر جواب دیا۔

''دیوانگی کیا ہے''؟ پھر اس نے مزید سوال کیا۔

''دیوانگی اور فرزانگی تو اہم معاملات ہیں۔ دیوانہ اور فرزانہ بنایا جاتا ہے۔ یعنی دیوانہ بہ کار خود دیوانہ نہیں ہوتا''، میں نے جواب دیا۔

''کون دیوانہ بناتا ہے اور کون دیوانہ بنتا ہے''؟ اس نے پھر سوال کیا۔

''حسنِ معشوق جسے چاہے دیوانہ بنا ڈالے یا فرزانہ ہی رہنے دے۔ یہ اسی کی مرضی ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''حسنِ معشوق کیا ہے اور عاشقی کیا چیز ہے''؟ سوال ذرا تیکھا تھا۔

''حسنِ معشوق حق ہے اور باقی سب مجاز ہے''۔ میں نے سیدھا جواب دیا۔

''کیا حق مجاز میں منعکس ہوتا ہے''؟ اس نے یہ سوال کر کے معرفتی ذہن کا وسیع دروازہ کھول دیا۔

''کیا بات ہے! کیا بات ہے! اب تم اس لائق ہو گئے ہو کہ میں تم سے کچھ گفتگو کر سکوں گا۔ یہی ہے پختگی اور یہی ہے پکی عمر اور یہی ہے پکا ذہن''۔ میں اس کے سوالات کے تیور کو جان کر چونک اٹھا۔

''کیا یہ صحیح ہے؟ عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود'' یہ کہہ کر پھر اس نے دانش مندی کو راہ دی۔ اس لئے کہ میں نے ابھی اس کا حوصلہ بڑھایا تھا، ''یہی حق ہے تم نے صحیح سمجھا''۔

''کیا سب کے لئے اس کے دل میں عشق پیدا ہوتا ہے؟'' پھر وہ سوال کے لئے آمادہ ہوا۔

''Never'' میں نے اپنا لب و لہجہ یکسر بدل ڈالا، جس پر وہ مسرور نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک شعر اس کی سماعت کے حوالے کیا:

محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا

میں نے مدلل دلیل دے کر اس کے ذہن کو صیقل کرنے کی کوشش کی۔ اب تو تمہارا ذہن آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہو چکا ہوگا۔

"I think so" I said to him

"If you think so, I will succeed" he told me

"You are my model" he furhter added.

''جیسی روح ویسا فرشتہ میں نے یاد دلایا۔ اگر تم خود کو ذی روح سمجھتے ہو تو مجھ کو سرِ دست فرشتہ تصور کرلو۔ اس کا کام کبھی نہیں رکتا۔ وہ کسی سے بھی اپنا کام کرالیتا ہے۔ اس کی بہت ساری Agencies ہیں، صرف طلب سچی ہونی چاہئے۔ اگر طالب صادق ہے اور مخلص ہے تو منزل اسے ظرف کے مطابق مل جائے گی۔ ویسے وہ ظرف کو وسعت بھی عطا کرتا ہے۔ وہ بڑا داتا ہے۔ وہ دیتا ہے اور دے کر واپس نہیں لیتا ہے۔ اس کے دینے کے کئی راستے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھو کہ اپنے سے بڑوں کے ارمانوں کا خون نہ کرنا۔ کبھی بھی کسی حالت میں اپنی ماں کی گود میں بندھے چاول کی پوٹلی کو کھول کر اس کے چاول کو ضائع نہ کرنا۔ تمہارے والد نے جو پودا لگایا ہے اس کو وہ پیڑ بنتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر اس شاداب شجر کو تناور دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان باتوں کا خیال رکھنا۔ انہیں نکات پر اپنی زندگی کا راہ عمل تیار کرنا۔ اگر ایسا کروگے تو تم ان کی صالح اور لائق اولاد بن کر دونوں جہان میں ان کا نام روشن کروگے۔ میری یہی دعا ہے۔ باقی وہی جانتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ ہر شخص کو اس کے اعمال کا ثمرہ ملتا ہے۔ میں تو یہی جانتا ہوں۔ تم اپنا عمل کرتے رہو۔ نتیجہ تو مالک کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ تمہاری محنتوں کو کبھی رائیگاں نہیں ہونے دے گا۔ تم کو تمہاری محنت کا صلہ وہ ضرور دے گا۔ مطمئن رہو۔ یہ صحیح ہے کہ پکا ذہن رکھنے کے باوجود تم کچی عمر میں داخل ہو زیادہ اضطراب اور بے چینی ابھی سے تم کو زیب نہیں دیتی ہے۔ سب کچھ اپنے وقت پر صحیح طور پر رونما ہوگا۔ تم نے سنا ہوگا ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات یعنی Morning Shows the Days اور زیادہ میں تم سے کیا باتیں کروں۔ تم میری ان باتوں کو زندگی کے ہر موڑ پر یاد رکھنا۔ اب مجھے تم اجازت دو۔ مجھے اسی کی طرف رہنے دو جس نے ابھی مجھ سے کہا کہ آپ تبریز کو سمجھا دیں کے کچی عمر کیا ہے اور یہ بھی بتادیں کہ دیوانگی کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ کوئی دیوانہ کچی عمر میں ہی بنایا جاتا ہے۔ وہ جب چاہے کسی کو دیوانہ بنا ڈالے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ پختہ عمارت کی تعمیر کے لئے بنیاد کی اینٹ کچی ہی عمر میں ڈالی جاتی ہے اور بس خدا حافظ۔ تمہارا خیر طلب میں شروع سے رہا اور تاحیات رہوں گا۔ یہ تم سے میں پختہ وعدہ کرتا ہوں''۔ یہ کہہ کر میں نے اپنی باتیں ختم کردیں اور تبریز میرے چہرہ میں پتہ نہیں کیا دیکھتے دیکھتے کہیں کھو سا گیا۔

میری باتیں جب قربِ اختتام کو تھیں تو راجو میرے کمرے میں داخل ہوا۔

''السلام علیکم سر!''

نہایت ادب سے مجھ کو سلام کر کے ڈرائنگ روم میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر وہ بیٹھ گیا۔

میں نے کہا ''تم یہاں صوفہ سیٹ پر میرے سامنے آجاؤ''۔ وہ میرا حکم بجالایا۔

وہ ماحول کے سناٹے کو بھانپ چکا تھا۔ اس لئے اس نے خاموشی کو توڑنے کے لئے مجھ سے ایک سوال کیا ''سر آپ تبریز کو دیوانہ کیوں کہتے ہیں؟'' وہ بیٹھتے ہی اچانک مجھ سے یہ سوال کر بیٹھا۔ شاید وہ میری گفتگو کے کچھ حصے کو آتے آتے سن چکا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب یوں دیا:

''تبریز رات بھر جگا رہتا ہے اور اپنے نصاب سے ہٹ کر کچھ ایسی کتابوں کے مطالعہ میں تا صبح غرق رہتا ہے۔ جس کی تفہیم کے لیے ابھی اس کی عمر کی ڈگر وا نہیں ہوئی ہے۔''

راجو مجھ سے بولا: ''لیکن ایک طالب علم کے مطالعہ میں تو ہر طرح کی کتابیں رہنی چاہئے سر''۔

''تم نے یہ بات درست کہی لیکن ہر کام کے لئے موقع و محل درکار ہے۔ کوئی کام اپنے وقت پر زیادہ زیب دیتا ہے۔ وقت سے پہلے تو کوئی کام نہیں ہوتا۔ **کُل امرٌ به اوقاتهٔ**'' یہ کہہ کر میں نے اپنا جملہ پورا کیا۔

''سر آپ نے سو فیصد صحیح فرمایا، تبریز کے والدین اس کے رویہ سے بہت پریشان نظر آتے ہیں اور میں نے ان کی امی کو اکثر گریہ وزاری کرتے ہوئے پایا ہے''۔ راجو نے گویا مجھے کچھ باتوں کی اطلاع دی۔ اس نے جو کچھ کہا وہ میری چھٹی حس کے حصار میں پناہ لینے کے لئے اکثر آتی رہتی تھیں۔

''خداوند کریم تبریز کو یہ سمجھ دے کہ وہ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے صحیح راہ پر گامزن رہے تاکہ وہ اپنے والدین کے خوابوں کی تعبیر کو سچ کر سکے۔'' میں نے راجو کو مطمئن کرنے کے لئے یہ باتیں کہیں۔

''آپ اگر اپنا حکم نافذ کر دیں کہ تبریز تم کو محنت کر کے ایک کامیاب انجینئر بننا ہے تو وہ آپ کے حکم کو ٹال نہیں پائے گا سر''۔ راجو نے مجھ سے التجا کی۔

''تبریز کے مستقبل کا فیصلہ نہ تم کر سکتے ہو اور نہ میں کر سکتا ہوں۔ مالک جسے چاہے، جس راہ پر ڈال دے۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ منصف اعلیٰ اگر کوئی ہے تو وہ صرف مالک حقیقی کی ذات ہے۔ ان کو چھوڑ کر کسی بھی دوسری ہستی کو کسی کے مستقبل کی راہ طے کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہم لوگ اپنے مالک کل سے صرف کسی بات کے لیے التجا کر سکتے ہیں فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' میں یہ کہہ کر راجو سے مزید گفتگو کے لئے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں پا رہا تھا۔ وہ میرے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ وہ کسی بھی حال میں مجھ پر دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کے لئے یہ بات سوئے ادب تھی۔ کیونکہ وہ میرا شاگرد عزیز تھا۔ اس لئے اس نے بھی تبریز کے معاملے میں میرا موقف جان کر حامی بھر لی۔

''پھر تو سر ہم سارے لوگ اپنے ذہنوں کو خواہ مخواہ کسی بات کے لئے پریشان کرتے ہیں جو ہمارے لیے بہتر نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ قدرت کے فیصلے کا انتظار کریں۔ اسی میں ہم سارے لوگوں کی سلامتی ہے اور یہی صوابدید کا تقاضہ بھی ہے۔'' راجو نے یہ کہہ کر مجھ سے جدا ہونے کے لئے مؤدبانہ التماس کیا۔ میں نے اسے واپسی کی اجازت دے دی۔ کیونکہ اتنی باریک باتوں کو سمجھنے کے لئے راجو کا ذہن ابھی پختہ نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں اپنے ڈرائنگ روم میں تنہا رہ گیا۔ تنہائی ایک عرصہ سے میرا مقدر ہے۔ میں اپنے آپ کو تنہائی کی قید میں رہ کر زیادہ محفوظ محسوس کرتا ہوں۔ یہ تنہائی بہت سی ماورائی راہیں میرے لئے وا کرتی ہیں جو میرے حق میں بہت ہی بہتر ثابت ہوتی ہیں۔

مہاتما بدھ کو برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر دھیان لگانے سے معرفت الٰہی کا نور حاصل ہوا تھا جس کی مدد سے ان کو مکتی مل گئی اور وہ بودھ دھرم کے مبلغ اور بانی کہلائے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس ظاہری زندگی کے پردے میں جو باطنی زندگی مخفی ہے اس کی تلاش اور اس کو پانے کے لئے اس عصر میں آج کتنے لوگ جستجو کررہے ہیں۔ تو اس تناسب میں جو افراد میری نظروں کے سامنے گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی تعداد بہت مختصر ہے۔ گویا توکل اور رضائے ایزدی پر گامزن ہونے والے لوگ اب عنقا ہورہے ہیں۔ ایسے لوگ اگر اس جہان فانی میں موجود بھی ہیں تو وہ ہماری ظاہری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ پھر بھی کاروبار حیات جاری وساری ہے۔ ہم سب لوگ اس کون ومکاں میں اپنے اپنے طور پر زندگی گذار رہے ہیں۔ آج کے دور میں مادہ پرستی عروج پر ہے اور روحانی قدریں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ یہ نظام دنیا درہم برہم نہ ہو اس کے لئے معدودے چند افراد متفکر نظر آتے ہیں جو اس نہج پر سوچتے ہیں۔ بہر حال یہ دنیا سالم فکر اور مثبت سوچ رکھنے والوں سے خالی ہوتی جارہی ہے۔ جس دن سارے کے سارے لوگ حق پرستی سے الگ ہوجائیں گے اسی دن اس دنیا کا خاتمہ بالخیر ہوجائے گا۔

یہ سوچتے سوچتے میرا ذہن اب تھک چکا تھا۔ میں بیحد تکان محسوس کرنے لگا اور اب میں شب خوابی کا لباس زیب تن کرکے سونے کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ میں نے بیڈ روم کی ساری بتیاں آف کردی اور اپنے نرم بستر پر دراز ہوگیا۔

مگر نہ جانے کیوں دور سے کوئی مجھ کو صدا دے رہا تھا۔

''اگر تبریز راہِ فقر پر چل کر ایک مکمل فقیر بننا چاہتا ہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ قدرت کے فیصلہ کو چیلنج کرنا ایک عام انسان کے بس سے باہر ہے۔''

پتہ نہیں کیسے اور کیونکر پھر میرے ذہن کے پردوں پر بیدم وارثی کا ایک شعر ابھر کر میرے سامنے آگیا:

بے وجہ نہیں بیدم کعبے کی سیہ پوشی
لیلیٰ دو عالم ہی اس پردے میں مخفی ہے

پھر اس کے بعد مجھ کو صدائے غیبی دینے والا نہ جانے کدھر اور کہاں چل دیا۔ میں بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ میرے کمرے کے باہر مہیب سناٹا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں اپنے سانسوں کی رفتار کو نمایاں طور سے محسوس کررہا تھا۔

....

وارثی کالج تعلیم نگر، بی بی پاکر، دربھنگہ (بہار) موبائل: 7277803486

رفیق جعفر

فلمی کہانی کا نیا فارمولہ

ایک فلم پروڈیوسر کو رومانٹک کہانی کی ضرورت تھی ۔ وہ اپنے ڈائریکٹر کے ساتھ تقریباً ایک مہینے سے دس رائٹرس کی دس کہانیاں سن چکا تھا۔ ساری کہانیاں ماڈرن رومانس سے بھرپور دلچسپ کہانیاں تھیں، لیکن کسی بھی کہانی پر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نہ متفق تھے نہ مطمئن۔

ایک شام پروڈیوسر آفس میں تنہا اداس بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیبل پر وہسکی کی بوتل اور گلاس رکھے ہوئے تھے پلیٹ میں ویفر، چنے اور مونگ پھلی کے دانے تھے۔ وہ پیگ بنانے ہی والا تھا کہ ڈائریکٹر آ گیا اور آتے ہی اس نے کہا:
"سر! کوئی چنتا کی ضرورت نہیں بس پرابلم حل سمجھئے۔"

"کیا مطلب؟" پروڈیوسر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ڈائریکٹر نے ایک ہی سانس میں روانی کے ساتھ کہا۔

"مطلب یہ کہ میری پسند کی کہانی مل گئی۔ اگر یہ کہانی آپ کو بھی پسند آتی ہے تو بات بن سکتی ہے۔"

"ارے بھئی جلدی سناؤ...... جلدی سناؤ کہانی۔"

پروڈیوسر نے بے چینی کا اظہار کیا تو ڈائریکٹر نے اپنے مخصوص انداز میں کہانی شروع کردی۔ اس کا Narration، اس کا انداز اتنا دلچسپ اور پراثر تھا کہ پروڈیوسر ہکا بکا پوری توجہ سے کہانی سننے لگا اور جب کہانی Climex پر پہنچی تو پروڈیوسر اچھل پڑا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

"یہ ہوئی نا کچھ بات" "مزا آ گیا۔ قسم سے...... بات بن گئی بندھو، بن گئی بات......"

پروڈیوسر کو خوش دیکھ کر ڈائریکٹر نے زندہ دلی کا مظاہرہ کیا: "کیسے مزا نہ آتا یہ تو کاکٹیل ہے، کاکٹیل فارمولہ۔"

"کاکٹیل فارمولہ...... میں سمجھا نہیں" پروڈیوسر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پروڈیوسر کی حیرت میں اور اضافہ کرنے کے لئے ڈائریکٹر نے کہا:

"دس رائٹرس کی دس اچھی اچھی، نئی نئی، دلچسپ کہانیاں سننے کے بعد یہ کاکٹیل فارمولہ ہاتھ لگا ہے سر! ہٹ...... سپر ہٹ فارمولہ...... کیوں کیسی رہی؟"

"خوب...... بھئی بہت خوب...... تو ہو جائے اسی بات پر......!" کہہ کر پروڈیوسر نے دو جام بھرے۔ دونوں نے جام اٹھائے...... جام ٹکرائے، مشترکہ قہقہہ ابھرا۔ پروڈیوسر نے بہ آواز بلند کہا۔

"آج کی شام دس رائٹرس کے نام۔"

....

پونے (مہاراشٹر) موبائل:09270916979

حسن رہبر (بھاگلپور)

حکمت عملی

نکسلیوں کا زور توڑنے کے لئے شہر میں جس نئے پولس سپرنٹنڈنٹ کو بھیجا گیا تھا وہ بڑے جانباز اور فرض شناس تھے۔ ان کی پچھلی کارگزاریاں شاندار تھیں۔ وہ جہاں جس شہر میں رہے اپنی حکمت عملی اور سوجھ بوجھ سے وہاں کے ماحول کو خوشگوار بنائے رکھا۔

اب تو جب کہیں دہشت گردی سر اٹھاتی یا کوئی نیا فتنہ پیدا ہوتا۔ ہنگامہ سرد کرنے اور تخریب کاروں پر انگشت لگانے کی ذمہ داری انہیں ہی سونپی جاتی۔

شہر میں پچھلے کئی برسوں سے نکسلیوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ لوٹ کے ساتھ اغوا کی وارداتیں بھی ہو رہی تھیں۔ نکسل وادیوں کی اپنی الگ کچھ مانگیں تھیں۔ جن پر زور دینے کے لئے وہ دہشت گردی کا طریقہ اپنائے ہوئے تھے۔

نکسلی اکثر کسی سرکاری ملازم کو پکڑ کر لے جاتے اور دوسرے دن اس کی لاش شہر کے کسی چوراہے پر پڑی ملتی۔ سینکڑوں لوگ اب تک اپنی جانوں سے ہاتھ دھو چکے تھے۔

حکومت کے لئے ان پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ حالانکہ ان کے خلاف کی جانے والی کاروائیاں بے حد سخت کر دی گئی تھیں۔ بہتوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ ان کے کئی اہم لیڈر پہلے ہی گرفتار کئے جا چکے تھے اور جو روپوش تھے ان کی بھی دھڑ پکڑ شروع ہو چکی تھی۔

پولس سپرنٹنڈنٹ کو شہر میں آئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اچانک ایک صبح ان کا اغوا ہو گیا۔ لاکھ جان توڑ کوششوں کے بعد بھی پولس والے ان کا سراغ نہ لگا سکے۔

ایک بڑے پولس افسر کی زندگی خطرے میں تھی۔ ان کی جان بچانے کے لئے انتظامیہ کو نرم رویہ اپنانے کی ہدایت ملی تو نکسلی بھی انتظامیہ کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کے لئے راضی ہو گئے اور بدلے میں اپنے ان اہم لیڈروں کی رہائی کی مانگ رکھ دی جو برسوں سے جیل کی کالی کوٹھریوں میں بند تھے۔

بڑے ہی خوشگوار ماحول میں معاہدے کی کاروائی انجام پا گئی۔ ادھر نکسلی اپنے قیدی کو لے کر گاؤں لوٹ گئے۔ ادھر اغوا کاروں نے بھی اپنے زیر اثر علاقے سے پولس سپرنٹنڈنٹ کو بخیر و خوبی انتظامیہ کے حوالے کر دیا۔ پولس کی کئی جیپوں کے ساتھ پولس سپرنٹنڈنٹ اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ ان کی گاڑی پل پر سے گزرتی ہوئی اچانک بارودی سرنگوں سے ٹکرائی۔ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ گاڑی کے پرخچے اڑ گئے۔

بڑی مشکلوں سے ان کی لاش پہچان میں آئی۔

....

ابواللیث جاوید، نئی دہلی

جلد نکل لو

یہ کیسا شور بلند ہو رہا ہے
یہاں پر کوئی بازار بھی تو نہیں ہے
بازار نہیں یہاں پر لوک سبھا ہے
لوک سبھا ____؟
وہاں لوک سبھا جہاں پر پہلے فرنگی لڑتے تھے
اور اب/ یہاں دیسی فرنگی مار دھاڑ کرتے ہیں
لوہا، سیمنٹ، کوئلہ، چارا، اسپکٹرم
اور نہ جانے کیا کیا
ہضم کر ڈالتے ہیں
اچھا ____!!
ہاں اس جگہ سے جلد نکل لو!

کیوں

قطب مینار، نشانِ وقار
جامع مسجد، لال قلعہ اور
تاج محل
شاہجہاں کی یادگار
تاج محل
شاہجہاں کی یادگار
پوری دنیا میں ہماری عزت اور
ہمارے وقار کا نقشِ عظیم
پھر
شاہجہاں کی اولاد سے
ہمیں۔ن۔ف۔ر۔ت

انجم عظیم آبادی، کولکاتا

فصیلِ چاہ

میسر کب ہمیں تازہ ہوائیں
روپہلی دھوپ کے منظر سے ناواقف
نمودِ صبح کیسی، اور دھندلکے شام کے کیسے
نہ مرغانِ سحر کی چہچہاہٹ ہے
نہ آوازِ جرس کوئی/ نہ کوئی گنگناہٹ ہے
یہاں تیرہ شبی کا ہی بسیرا ہے
مقدر میں کہاں اپنے سویرا ہے

یہ سن رکھا تھا
دنیا کم نہیں خلدِ بریں سے
یہاں سونا نکلتا ہے زمیں سے
سجی ہے یہ مکانوں سے مکیں سے
مگر حالات کے اندھے کنویں کے
ہم ہیں باشندے
جہاں سے سیر دنیا کی ہے ناممکن
نکلنا بھی نہیں آساں
بنائے جتنے منصوبے
جس قدر زینے
فصیل اٹھائے چاہ
پہلے سے زیادہ ہو گئی اونچی
مگر جہد و عمل کا سلسلہ
ٹوٹا نہیں اب تک
کہ شاید انقلابِ نو
کوئی آئے!

شمس فریدی، جمشید پور

بے چینی

جانے کس کے لئے
در بہ در
رات بھر
ہم بھٹکتے رہے
سو سکے نہ ذرا ایک پل
موند کر اپنی آنکھوں کو
چاہے کہ
کچھ بھی نہیں ہم کو آئے نظر
رائیگاں ساری کوشش ہماری گئی
خوں میں لتھڑے ہوئے
جسم بکھرے ہوئے
چہرے مسلے ہوئے
سینے ترشے ہوئے
ادھ کھلی آنکھ
ننھے فرشتوں کے لب
تھرتھراتے ہوئے
اور ہم
خود اپنے لہو میں
نہائے ہوئے ___!

اختر جاوید، ہوڑہ

پرندہ

جینے کی اس لذت میں ہی اتنے سارے درد ملے
اگلی منزل جب آئے گی اور بھی کچھ مل جائیں گے
دھند میں ڈوبی شام اکیلی
پوچھ رہی ہے ان چڑیوں سے
اڑ اڑ کر جو اپنے گھر کو جاتی ہیں
خوف ہے ان کو تاریکی سے
خوف کی ماری ساری چڑیاں
سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی
کھیتوں سے اڑ جاتی ہیں
کیا معلوم دھماکہ کب ہو؟
کیا معلوم وہ لمبی آگ کے شعلے
تیر کی صورت کس جانب سے/ پھر آ جائیں
انسانوں کی وحشت سے
اب کوئی پرندہ اپنے گھر میں
آسودہ خوش حال نہیں ہے
لمحہ لمحہ جینے والا
لمحہ لمحہ مرتا ہے
موت کھڑی ہے
منہ پھاڑے!

پروفیسر شاکر خلیق، دربھنگہ

آہوان

ستیہ اہنسا کی اس دھرتی کے ہم سب ہیں باشی
مل جل کر ہم رہتے آئے کیا متھرا کیا کاشی

صدیوں سے کھلتے آئے ہیں بھانت بھانت کے پھول
ہرے بھرے کھیتوں میں دیکھو اب اڑتی ہے دھول

ہندو مسلم سکھ عیسائی ہیں بھارت کی شان
اس کو آج بنانا چاہیں وہ مرگھٹ شمشان

آج نئے بھارت کی لے کر آئے ہیں پربھاشا
ہندو راشٹر بنانے کی ہے اب ان کی ابھیلاشا

گاندھی بھی گجراتی تھے اور مودی بھی گجراتی
پوت کپوت کے اس جھگڑے سے بھارت ماں شرماتی

شبد بان لے کر نکلی ہے مودی جی کی سینا
جنتا کے دکھ درد سے اُن کو کیا لینا، کیا دینا

دانشور اور بدھ جیوی کے دھرم پہ اب ہے داؤ
ان کے ہی ہاتھوں اب ہوگا سَرو دھرم سد بھاؤ

نفرت کی دیواروں کو اب نوکِ قلم سے ڈھاؤ
تب ویترنی پار کرے گی بھارت ماں کی ناؤ

شاکر جی کے نازک دل پر ایسا لگا ہے گھاؤ
مل جل کر ہم ساتھ رہیں گے ایسی قسمیں کھاؤ

....

شفیق الدین شایاں، کولکاتا

سیرت

تم اتنی حقارت سے نہ دیکھو اس کو
میں اچھی طرح اس کو پہچانتا ہوں

وہ ہیرو کے جیسا نہیں لگ رہا ہے
بدن کا ہے رنگ اس کے کاجل سا کالا

بجا وہ بہت خوبصورت نہیں ہے
مگر شہر میں وہ تو سب سے الگ ہے

سدا گفتگو میں وہ رس گھولتا ہے
بہت خوبیوں کا وہ مالک ہے تنہا

لٹاتا ہے علم و ہنر کا خزانہ
ہے بھیڑ ایک ہر وقت محفل میں اس کی

کبھی چاند تاروں کا مجمع لگا ہے
کبھی سوسن و موگرا اور چنبیلی

کبھی سنبل و یاسمین اور بیلی
کبھی عطر کے تاجروں کے صفیں ہیں

کبھی ہے ہجوم جواہر فروشاں
کبھی قافلہ ہے طبیبوں کا در پر

کبھی جگنوؤں کے دیئے ہیں صف آرا
یہ لعل و گہر کو بھی کہتے سنا ہے

جو موقع ملے تو قدم چوم لوں میں
میں جنسِ تجارت ہوں میرے رفیقو

وہ انمول ہے اس کی قیمت نہ پوچھو
جو ہے کور بیں اس کو آئے نظر کیا

اسے فرق کیا سونا پیتل کا ہوگا
پرکھنے کا اس کو ہنر ہی کہاں ہے

احسان ثاقب، نوادہ

وہی تاریخ جو روشن ہوئی تھی
وہی تاریخ پھر روشن ہوئی ہے
قلم کا زور مستحکم ہوا ہے
سیاست حاشیے پر آگئی ہے

زباں کی جزویت کو مت سمیٹو
سفر اس کا کبھی رکتا نہیں ہے
ہماری پیش بندی باندھ لینا
انا والے کا سر جھکتا نہیں ہے

سکوت لب پہ ہے طوفانی پیکر
حدِ عرفان کا فکری شناور
فقیرانہ روش بھی شاہ بنی
منور تھا منور ہے منور

شعارِ فن ہے نقشِ انقلابی
غضب ڈھادیتا ہے حرفِ معانی
قلم جب باندھ لیتا ہے ارادہ
ابل اٹھتا ہے چٹانوں سے پانی

جو جذبے آج خونی ہوگئے ہیں
حقیقت میں ہے وہ انسان شناسی
یہ بے معنی اشارے اور کنائے
انھیں مت جانئے رنگِ قیاسی

رعونت خود سہم جائے گی اک دن
نظر والوں کے پاؤں کب رکے ہیں
ہزاروں اجنبی آہٹ اٹھے گی
کبھی اہلِ ستم گر جانتے ہیں

ساحر داؤد نگری، دہلی

زندگی کے نام

(۱)

اکثر و بیشتر ہوتا یوں ہے
زخم سہلاتا ہوں، مر جاتا ہوں
زخم اتنے ہیں، ہزاروں ہیں کہ گننا مشکل
نہ کوئی غیر نہ اپنوں سے شکایت کوئی
میری تقدیر جہاں چاہے گی لے جائے گی
جس طرح گزری ہے، باقی بھی گزر جائے گی
اکثر و بیشتر ہوتا یوں ہے......

(۲)

عمر کے کچے کچے کھیلوں کو چھوڑ کر
اب میں وہاں کھڑا ہوں
جہاں ایک ٹھونٹھ پیڑ ہے
سبز، برقانی پتوں سے آزاد
میں موازنہ کرنے کی حالت میں بھی نہیں ہوں
دیکھ رہا ہوں
بوڑھے کمزور درخت کو گرتے ہوئے
ایک دن سایہ اٹھ جاتا ہے
جڑیں کمزور ہو جاتی ہیں
اور درخت آندھی میں اکھڑ جاتا ہے،
بے نام آندھیوں کی زد میں
گمشدہ زندگی کے اوراق پر دستخط کرنا
ایک مشکل کام ہے

چندر بھان خیال، نئی دہلی

بڑے دن آئے

حیف صد حیف برے دن آئے
ہر طرف جھوٹ کی تاریکی میں ڈوبا ہے بشر
آدمی اپنی شرافت کے اُجالوں کو کہاں لے جائے
جا بہ جا شورِ شر انگیز، گناہوں سے شجر

حیف صد حیف برے دن آئے
جس کو دیکھو وہی تلوار لیے بیٹھا ہے
آدمی اپنی محبت کے فسانوں کو کہاں لے جائے
بے سبب آنکھوں میں انگار لیے بیٹھا ہے

لفظ پتھر کی طرح سینے پہ آگرتے ہیں
لطف کا ذکر نہ چرچا کہیں خوشبوؤں کا
اب تو بچوں کی بھی باتوں سے لرز جاتا ہے دل
بس تشدد ہے جسے دیکھ کے گھبراتا ہے دل

ہر کوئی تنہا بھٹکتا ہے یہاں بے مقصد
سب کی آنکھوں میں تجارت کی چمک ملتی ہے
کوئی ہمدرد کسی کا نہ کوئی ساتھی ہے
اک تعصب کی، سیاست کی چمک ملتی ہے

حیف صد حیف برے دن آئے
کوئی تحریک نہیں حرص کی حرکت کے سوا
آدمی اپنی شجاعت کے نشانوں کو کہاں لے جائے
اب کوئی چاہ نہیں مالِ غنیمت کے سوا

سرخ شعلہ جو تغیر کی علامت تھا کبھی
برف کی سل پہ برہنہ کھڑی عورت کے لیے
آج وہ کھوکھلے سینوں میں سلگتا ہے فقط
کسی معصوم کی عفت سے عداوت کے لیے

ہر جوانی کسی سازش میں پھنسی ہے دیکھو
منتشر رشتوں کا شیرازہ ہے، سب دور ہوئے
ہر قیادت کسی گھوٹالے کی دلدل میں دھنسی ہے دیکھو
سب کے سب اپنے لیے جینے پہ مجبور ہوئے

محفلِ عزم و عمل ڈوب گئی، جل تھل ہے
کاش! یہ منظرِ پُر ہول ہو تبدیل کبھی
اک ہوس ناک سیاہی کی یہاں ہلچل ہے
ان اندھیروں میں جلے پیار کی قندیل کبھی

(اگست 1998)

معراج احمد معراج

رباعیات

افکار بہ دل، خامہ بہ کف آیا ہوں
موتی کے لئے سوئے صدف آیا ہوں
میں حضرتِ عاصم کا اشارہ پا کر
دوہے سے رباعی کی طرف آیا ہوں

☆

ہونٹوں پہ تبسم نہ رہے کیا مطلب
نغموں میں ترنم نہ رہے کیا مطلب
احباب کی محفل میں تکلف کیسا
بادہ نہ رہے،خم نہ رہے کیا مطلب

☆

کچھ حصۂ اوقات نہیں دیتے ہیں
پیسوں کی سوغات نہیں دیتے ہیں
اس شہر میں زردار بہت ہیں لیکن
مسکین کو خیرات نہیں دیتے ہیں

☆

ہونٹوں کا تبسم بھی غضب ڈھاتا ہے
پلکوں کا تصادم بھی غضب ڈھاتا ہے
قدرت نے دیے ہیں تمہیں تحفے کیا کیا
اندازِ تکلم بھی غضب ڈھاتا ہے

☆

جذبات کی تہہ تک نہ پہنچ جاؤں میں
حالات کی تہہ تک نہ پہنچ جاؤں میں
جس بات نے مجروح کیا ہے دل کو
اس بات کی تہہ تک نہ پہنچ جاؤں میں

☆

سانپوں کے درمیاں کبوتر ہے آج
سچ بات ہے بے اماں کبوتر ہے آج
دن رات برستے ہیں جہاں سنگِ ستم
ہائے قسمت وہاں کبوتر ہے آج

☆

ہونٹوں پہ تبسم کو سجا رکھا ہے
اور دل میں تلاطم کو بسا رکھا ہے
کرنے کے لئے قتل ہمارا تم نے
سامانِ خطرناک بنا رکھا ہے

☆

سستا ہو کہ مہنگا نہیں دیکھا جاتا
کیسا بھی ہو سودا نہیں دیکھا جاتا
جب داؤ پہ لگ جائے عزت گھر کی
پھر لوگو پیسا نہیں دیکھا جاتا

☆

موبائل: 09734722994 ای-میل : merajahmad333@yahoo.in

شمس جلیلی، پورنیہ

حضرت اکمل یزدانی

جناب حضرتِ اکمل نے ایسی موت پائی ہے
زمیں پوناس کی روتی مسلسل پھوٹ کر لوگو
وہ ناکارہ کہیں خود کو، ہوئے لعل و گہر آخر
یہاں بابائے اردو تھے یہی کہتا ہے سیمانچل
نہ جانے کب بشر کوئی یہاں ہو دوسرا پیدا
صفیں ماتم کناں ہیں اب جو تھیں اذکار کی مجلس
کہو اے برنگرا والو کیا گذرا ہے تم پر بھی
کہاں یہ برنگر بستی کہاں وہ ذات ذاکر۲ کی
نہ جانے کیسی خوبی تھی گورنر آگئے ملنے
ہوئے تو چار اور چھ کی عدد میں فضلِ رحماں ہیں
دعا دے دے کے روتے ہیں عزیز و اقربا سارے
خدا جنت عطا کردے، غریبوں کے وہ محسن تھے

کہ ان کی زندگانی کی یہی دسویں دہائی ہے
کہ اس کا لعل کھویا ہے چلو آؤ سبھی رولو
وہی تھا ان کا باطن بھی جو ہوتا تھا سدا ظاہر
وہی تحقیق کے ماہر وہی تھے حضرت اکمل
کرے جو مرنے والوں کو سدا تحقیق سے زندہ
سبھی اظہار کی مجلس، سبھی اسرار کی مجلس
اجالا ہوگیا غائب تو ظلمت ہوگئی طاری
چلے آئے تھے کھینچ کر وہ کشش تھی ذات اکمل کی
نئی تدریس کا تحفہ وہ آئے تھے یہاں دینے
پسر فاران و غلماں ہیں کوئی ریّان و نعماں ہیں
بڑی تعداد شاگرداں، مریداں بھی بہت سارے
صحافی تھے، محقق تھے، معلم اور مومن تھے

۱ برنگر ضلع پورنیہ میں ایک گاؤں ہے جہاں ولدار نگر اسکول کو منظوری دلا کر یزدانی صاحب پرنسپل بنے۔
۲ ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) جامعہ ملیہ میں یزدانی صاحب کے استاد محترم تھے۔

قیصر صدیقی، سمستی پور

شہر خدا کی گود میں

(پروفیسر سید شاہ ضیاء الرحمٰن کا سفر عمرہ کے دوران ۵ر اپریل ۲۰۱۴ء، ۲۰ر جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ بروز سنیچر بحالت احرام، بعد نماز ظہر مکۃ المکرمہ میں اچانک حرکت قلب کے بند ہو جانے کے سبب انتقال پر ملال کے سلسلے میں تعزیتی نشست منعقدہ ۱۱ر اپریل ۲۰۱۴ء، بدولت کدہ پروفیسر یونس محمد حکیم سمستی پور میں پیش منظوم تاثرات)

وادیٔ لطف و عنایت میں، عطا کی گود میں
سوگئی شامِ ضیا صبحِ ضیا کی گود میں
جس کی آنکھوں میں بسا تھا کعبۂ اطہر کا خواب
نیند آئی ہے اسے شہرِ خدا کی گود میں
سچ اگر پوچھو تو اس کو کہتے ہیں شادیٔ مرگ
آشنا نے جان دیدی ہے آشنا کی گود میں
رحمتِ مولا کے صدقے جابسی خاکِ ضیاؔ
سر زمینِ مرتضیٰؓ و مصطفیٰؐ کی گود میں
رشک ہو کیسے نہ اس پر ہستیٔ جاوید کو
موت جس عاشق کو آئے دلربا کی گود میں
حضرتِ سیّد ضیا کی موت سے عقدہ کھلا
یوں بقا ملتی ہے اے قیصرؔ فنا کی گود میں

انجم عثمانی، دھنباد (جھارکھنڈ)

''اشعار کی خوشبو زندہ ہے''

(خوش گو جدید شاعر و مدیر ''مفاہیم'' سرور عثمانی کے انتقال پر)

جب تلک دہر میں رہ جائے گی اردو زندہ
تو نہیں تو ترے اشعار کی خوشبو زندہ
تیرا ہی عکس ''مفاہیم'' کے ہر صفحے پر
دیکھ لیتا ہوں تو لگتا ہے کہ ہے تو زندہ
تیری نظریں بھی تھیں معیار پہ واجدؔ[1] کی طرح
جیسے شاگرد میں استاد کی ہو خو زندہ
بزمِ ہستی سے اچانک ترا اٹھ کر جانا
دل میں ہے درد، مری آنکھ میں آنسو زندہ
ایک مدت سے ملاقات کا موقع نہ ملا
اب تو آواز بھی سننے کو ترس جاؤں گا

[1] محمود واجد، سابق مدیر ''آئندہ'' کراچی

....

''اردو زبان دنیا کی چند بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں دوسری زبانوں اور تہذیبوں کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔'' (ادارہ)

ارشد میناگری، مالیگاؤں

تاجدارِ صحافت

(مدیر "روزنامہ" جناب عبدالرشید قادری کی رحلت پر)

وقت کا احساس یوں غم ناک پل پل ہوگیا
آنسوؤں سے چہرہ چہرہ آج جل تھل ہوگیا
معتبر ہر لب پہ تھا عبدالرشیدِ قادری
یک بیک نورِ صحافت ہم سے اوجھل ہوگیا

پہلو پہلو گوشہ گوشہ ہوگیا یہ آشکار
مخلصانہ، غیر متنازعہ رہا جس کا شعار
شہر میں دیکھی نہیں ہم نے کہیں ایسی مثال
بے نیازانہ صحافت کا بنا جو تاج دار

جذبۂ خدمات کی ہر دم رکھی ہے آبرو
آرزو ہر آرزو کو بخشا ظرفِ جستجو
بے تکلف داد، کیوں نہ دے گی دل سے داد بھی
اپنے چھوٹے قد کو، قد آور بنایا چار سو

معترف ہے جا بجا اس کی ضمیری صوت بھی
زندہ ہے کردار گرتو زندگی ہے فوت بھی
کہہ رہی روز ہم سے "روزنامہ" کی زباں
زیست ہے عبدالرشیدِ قادری کی موت بھی

ہے دعاگو، خامۂ ارشد مہربانی رہے
عشق احمد مصطفےٰ اور حسن رحمانی رہے
اے خدا عبدالرشیدِ قادری کی قبر میں
تاقیامت مغفرت کی نور افشانی رہے

زبیر رضوی

(ممتاز شاعر اور نقاد زبیر رضوی کی رحلت پر)

شعر و سخن کی دلکش ندرت زبیر رضوی
الفاظ و معانی کی نکہت زبیر رضوی
تھیٹر کو ڈراموں کو روشن کیا ادب سے
شفاف صحافت کی زینت زبیر رضوی
آساں نہیں ادب میں مقبولِ عام ہونا
ہر دل کی ہر نظر کی چاہت زبیر رضوی
فکرِ ادب میں کاٹی ہر لمحہ زندگانی
ذکرِ سخن میں پائے رحلت زبیر رضوی
مرقد ہو مغفرت کے انوار سے مشرف
ارشدؔ ہو سرفرازِ جنت زبیر رضوی

احسان ثاقب، نوادہ

رہبرِ ملت بھی چل بسے

(مرحوم ایس ایم اجمل فرید، مدیر ''قومی تنظیم'' پٹنہ کو خراج عقیدت)

اردو زباں کی شان تھے اجمل فرید آپ
عظمت کے سائبان تھے اجمل فرید آپ
چھوٹے بڑے کا فرق سمجھ پاتا تھا محال
اس درجہ مہربان تھے اجمل فرید آپ

زورِ قلم تھا آپ کا عالم میں انتخاب
اجمل فرید آپ تھے ہر رخ سے لاجواب
تھی انکسار ذات میں وسعت کی تازگی
جیسے کہ زندگی ہو شگفتہ سا اک گلاب

اک بحرِ بے کنار تھے اجمل فرید آپ
ملت کے پاسدار تھے اجمل فرید آپ
تھا آپ کی نگاہ میں اک پھیلا آسماں
تحریکِ اعتبار تھے اجمل فرید آپ

بیٹھا ہوا تھا نوکِ صحافت پہ افتخار
ہر زاویے سے آپ تھے اک مردِ پروقار
تھا حسنِ ظن کا معاملہ ہر سمت ہر جہت
طرزِ عمل تھا آتشی، فطرت تھی مشک بار

صد حیف! ایسے مردِ صحافت بھی چل بسے
اک دردمند صاحبِ الفت بھی چل بسے
اہلِ قلم کے ساتھ یہ ثاقبؔ بھی ہے اداس
سالارِ قوم، رہبرِ ملت بھی چل بسے

....

آچاریہ جمال احمد جمال، کوکاتا

'علم و فن کے آسماں تھے حضرتِ اجمل فرید'

با عمل تھے متقی تھے حضرتِ اجمل فرید
اور بہاری چاندنی تھے حضرتِ اجمل فرید
خدمتِ اردو بھی کی اور ساتھ ملت کا دیا
ایک اچھے آدمی تھے حضرتِ اجمل فرید

علم و فن کے آسماں تھے حضرتِ اجمل فرید
نیک سیرت خوش بیاں تھے حضرتِ اجمل فرید
وہ غریبوں، مفلسوں کی کرتے تھے امداد بھی
اک انیسِ بے کساں تھے حضرتِ اجمل فرید

محسنِ انسانیت تھے قوم کے رہبر بھی تھے
ان کے چہرے پر کبھی حالات کے منظر بھی تھے
علم و حکمت کا سمندر موجزن تھا ہر طرف
تشنہ لب سیراب ہوجاتے تھے وہ ساغر بھی تھے

اک عجب مردِ مجاہد تھے ادارت میں فرید
پھول پتھر پہ کھلاتے تھے صحافت میں فرید
وہ غلط کو بس غلط کہتے تھے سچائی کے ساتھ
منفرد انداز رکھتے تھے سیاست میں فرید

وہ تھے دانش مند رکھتے تھے محبت کا چراغ
اور جلاتے تھے ہمیشہ دیں کی دعوت کا چراغ
گھور اندھیرا جب ہوا کرتا تھا راہوں میں جمالؔ
تب کیا کرتے تھے روشن علم و حکمت کا چراغ

....

پروفیسر شاکر خلیق، دربھنگہ

تربت کے پھول

(بہ موقع سانحۂ ارتحال امیر شریعت سادس بہار، اڑیسہ، وجھارکھنڈ حضرت مولانا سید نظام الدین بروز سنیچر بتاریخ ۱۷/اکتوبر ۲۰۱۵ء مطابق ۳/محرم الحرام ۱۴۳۷ھ بہ مقام پٹنہ)

بہ قید صنعت توشیح

س۔ سن کے رحلت کی خبر حضرت امیر شرع کی
ہوک سی سینے میں اٹھی ہر اسیر شرع کی

ی۔ یا خدا ملت پہ یہ کیسی مصیبت آ گئی
ہر طرف مایوسیوں کی اک گھٹا سی چھا گئی

د۔ دل ہمارے غم زدہ ہیں آہ اُن کی یاد میں
آج پیوند زمیں ہیں وہ عظیم آباد میں

ن۔ نعمت حق کی فراوانی میں گذری زندگی
ہے مقدر جنت الفردوس اجرِ بندگی

ظ۔ ظلمت شب میں ہمارے واسطے تھے روشنی
خلق کی خدمت میں گذری آپ کی یہ زندگی

ا۔ اے امیرِ کارواں تو تھا سراپا سوز و ساز
قوم کی شیرازہ بندی تیری شکرانہ نماز

م۔ ملت مظلوم کے ہر درد کا درماں تھا تُو
بے سر و ساماں جو تھے اُن کے لئے ساماں تھا تُو

ا۔ آدمیت جب سسکتی تھی تو رو دیتا تھا تُو
ظلم کے دریا کی ہر کشتی ڈبو دیتا تھا تُو

ل۔ لب کشائی تھی تری ہر فتنہ و شر کے خلاف
دشمنِ دیں کو کیا تونے نہیں ہرگز معاف

د۔ دین حق کے واسطے کی وقف ساری زندگی
مانتے تھے اس کو حضرت جان و روحِ بندگی

ی۔ یا الٰہی مغفرت ہو اُن کی، دے ہم سب کو صبر
جنت الفردوس کا ہو ایک گوشہ اُن کی قبر

ن۔ نعت کے اشعار بھی حضرت کے ہوجائیں قبول
حمد کے اشعار کی خوشبو ہوئے تربت کے پھول

....

Mobile No. 8544045092

منظوم تعزیت برائے ایم اے مجید

(ولادت: ۲۱رنومبر ۱۹۲۱ء وفات: ۳رجنوری ۲۰۱۶ء)

حلیم صابر، کولکاتا

مردِ نیک اطوار تھے ایم اے مجید
علم کے مینار تھے ایم اے مجید
شخصیت بھی ان کی تھی باغ و بہار
مطلعِ انوار تھے ایم اے مجید
انجمن اک تھے وہ اپنی ذات میں
صاحبِ کردار تھے ایم اے مجید
موہ لیتے تھے دل اپنی بات سے
ایسے خوش گفتار تھے ایم اے مجید
مائل ان کا ذہن تھا تعمیر پر
قوم کے معمار تھے ایم اے مجید
علم داں بن کر جہالت کے خلاف
برسرِ پیکار تھے ایم اے مجید
خوابِ غفلت میں پڑے رہتے نہ تھے
بندۂ بیدار تھے ایم اے مجید
پیکرِ دستِ طلب وہ بن نہ پائے
اس قدر خود دار تھے ایم اے مجید
ہم انھیں صابر بھلا سکتے نہیں
جو کہ فیض آثار تھے ایم اے مجید

ڈاکٹر محمد امین عامر، ہوڑہ

حیف ہم سے ہوگئے رخصت مجید
دے گئے سب کو غمِ فرقت مجید
بزمِ ایراں میں کہاں وہ حسن ہے
لے گئے سب رونق و زینت مجید
محسن وخادم سدا تھے بزم کے
کر گئے بے لوث کیا خدمت مجید
ہر فلاحی انجمن کے رکن تھے
ہر کسی کے حق میں تھے نعمت مجید
نیک انساں ، پیکرِ اخلاق تھے
خوش خصال و حاملِ سیرت مجید
مشرقی تہذیب کے آئینہ دار
تھے مہذب اور باعزت مجید
صاحبِ علم وادب ، اہلِ ہنر
تھے ہمارے درمیاں حضرت مجید

....

ڈاکٹر امام اعظم

بیادِ اجمل فرید!

(ایس ایم اجمل فرید مدیر روزنامہ ''قومی تنظیم'' پٹنہ ولادت: ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۹ء وفات : ۱۵ر جولائی ۲۰۱۵ء)

آئی خبر کہ جو تھا دلاور وہ اٹھ گیا — یعنی قلم کا جو تھا شناور وہ اٹھ گیا
نہ جانے وقت اب کہاں لے جائے گا ہمیں — قطرہ میں جو بسا تھا سمندر وہ اٹھ گیا

اے دل بتا کہ لائیں کہاں سے قرار ہم
اشکوں کے بیچ کتنے بنائیں مزار ہم

اجمل فرید آپ سا لائیں کہاں سے ہم — وہ رنگ باوقار سا پائیں کہاں سے ہم
جینے کا جو اصول سکھایا تھا آپ نے — وہ طرزِ خوش کمال دکھائیں کہاں سے ہم

رستہ دکھا کے آپ نے منہ موڑ کیوں لیا
دشتِ جنوں میں آپ نے یوں چھوڑ کیوں دیا

جانا تو ہے سبھی کو مگر اس طرح جناب — جاگے نہ پھر کبھی کہ ہوئے ایسے محوِ خواب
دو چار دن ہی اور کہ بڑھ جاتی دلکشی — آئی ہے عید لے کے مگر درد بے حساب

یہ حادثہ گرا گیا بجلی ، یقین پر
حسرت کا سایہ چھا گیا روئے زمین پر

اس قدرتِ جہاں کا تقاضہ کچھ اور تھا — اسرارِ زندگی کا یہ نکتہ کچھ اور تھا
عرفان و معرفت کے پسِ پردہ اے اعظم — اس پیکرِ شعور کا جلوہ کچھ اور تھا

کہ روزہ دار اٹھ گئے افطار کے لیے
رحمت ہے رب کی بندۂ غفار کے لیے

☆☆☆

سفیر الدین کمال، کولکاتا

تاریخِ وفات انتظار حسین

تھے فسانہ نگار و شاعرِ خوب — مردِ ذی جاہ انتظار حسین
پڑھیے تاریخ بے سرِ ابجد — گزرے صد آہ انتظار حسین

۲۰۱۶ء

غزلیں

قیصر صدیقی، سمستی پور

لب پہ دھوپ کا صحرا، عکس آب آنکھوں میں
تشنگی کا موسم ہے خواب خواب آنکھوں میں
پیاس آرزوؤں کی کس طرح بجھے آخر
ہر سوال بے معنی لاجواب آنکھوں میں
دیدۂ تصور میں منجمد ہے یہ منظر
کچھ گلاب چہرے پر کچھ گلاب آنکھوں میں
تشنہ کام نظروں کی منتظر ہے مدت سے
اک جہانِ سرمستی ہم شراب آنکھوں میں
کوئی کچھ کہے لیکن تہہ نشین ہوتی ہیں
کچھ حجاب کی لہریں بے حجاب آنکھوں میں
ایسا بھی تو ممکن ہے کل شمار کی جائیں
میری بے چراغ آنکھیں کامیاب آنکھوں میں
روشنی اندھیروں میں غرق ہونے والی ہے
بے سبب نہیں قیصر اضطراب آنکھوں میں

امان خاں دلؔ، نیویارک (امریکہ)

سخن کی خوشبو ہے بھینی بھینی، غزل کا لہجہ کمال کا ہے
اثر ہے تیری صباحتوں کا یہ رنگ تیرے جمال کا ہے
چلو یہ نکتہ بھی مانتا ہوں، اسے بھی تمثیل جانتا ہوں
مری نظر میں کمال لیکن، تمہارے حسنِ خیال کا ہے
میں ایک دستِ نگر ہوں لیکن یہ میری غیرت کی بات بھی ہے
بڑھاؤں دستِ سوال کیسے، بھرم یہ دستِ سوال کا ہے
پتا ہے، مجھ کو رئیس ہے وہ، بس اپنی حد تک نفیس ہے وہ
روِش کا لیکن دھنی نہیں ہے، معاملہ چال ڈھال کا ہے
خدا نے اُس کو عروج بخشا، تو اس عطا پر ہوا وہ نازاں
تنزلی کا شکار ہے اب، یہ وقت اُس کے زوال کا ہے
ستم اٹھا کر رہِ خدا میں وفا کا محکم جو نقش چھوڑا
اُسے بھلا کیا مٹائے دنیا، وہ نقش حضرت بلالؓ کا ہے
ہے اُس کے جیسا حسین کوئی، نہ اس کے جیسا متین کوئی
مرا جو ہے رازدار اے دلؔ وہ آپ اپنی مثال کا ہے

بدر محمدی، ویشالی

رکتی ہے کب یہ مختلف اقسام کی ہوا
چلتی ہے صبح و شام کئی نام کی ہوا
بجھنا چراغِ مہر کا بے وجہ تو نہیں
نقصان کر گئی ہے اسے شام کی ہوا
مت آمدِ خمار کا در بند کر ابھی
آنے دے میکدہ سے مے و جام کی ہوا
بازار مصر دیکھ کہ بُڑھیا بھی ہے جواں
تو نے چلائی کیسی یہ نیلام کی ہوا
دیوار اپنے آگے کھڑی کون سی کروں
میری طرف لپکتی ہے الزام کی ہوا
رکھنے کو باقی جان گنواتے ہیں عمر لوگ
کہتے ہیں جس کو سانس ہے وہ دام کی ہوا
شعروں سے اپنے بدرؔ زمانے کا رخ بدل
موسم نہ بدلے جس سے وہ کس کام کی ہوا

ڈاکٹر لطیف سبحانی، امراوتی (مہاراشٹر)

جو بجھ گئے انہیں کو چراغوں کا نام دو
بے چہرگی کو اپنی گلابوں کا نام دو

جو ہے حقیقی اس کو تو اب بھول جاؤ تم
بے جان پتھروں کو خداؤں کا نام دو

ہمدردیاں ، خلوص و محبت کہ دوستی
اس دور میں انہیں بھی گناہوں کا نام دو

دہشت گری جہاں پہ پنپتی ہے رات دن
سنتوں کا مٹھ کہو کہ گپھاؤں کا نام دو

اس میں گھٹن ہے زہر ہے گرد و غبار ہے
پھر بھی اُسے شگفتہ فضاؤں کا نام دو

ڈوبے تھے پھر بھی صاف نکل آئے اے لطیف
اس کو ادا کہو کہ دعاؤں کا نام دو

سعید رحمانی (کٹک)

تباہ اس طرح خود اپنی زندگی کر لی
جو بھائی بھائی نے آپس میں دشمنی کرلی

اکیلا میں ہی مخالف کھڑا رہا لیکن
یزید شہر سے لوگوں نے دوستی کرلی

مرے پڑوسی کا تاریک ہوگیا چہرہ
جو میں نے کمرے میں اک بوند روشنی کر لی

کسی غریب کی آنکھوں سے پونچھ کر آنسو
ادا کبھی میں نے بھی بندگی کرلی

اگا کے چاند خیالوں کا اپنے کمرے میں
محیط چاروں طرف میں نے چاندنی کرلی

اچھالے لوگوں نے پتھر سعید میری طرف
مثالِ آئینہ جب میں نے شاعری کرلی

ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر، الہ آباد

یوں لے رہا ہے اس بت کافرادا کا نام
جیسے زمانہ بھول گیا ہو خدا کا نام

جب سے ہوئے ہیں اہل جنوں عافیت پسند
مٹنے لگا ہے لوحِ جہاں سے وفا کا نام

مہر مبیں جو آپ کے چہرے کا نام ہے
کالی گھٹا ہے آپ کی زلفِ رسا کا نام

میری متاع دل تو اسی گل کی یاد ہے
جس کے وجود سے ہے سلامت حیا کا نام

کیا سب مریضِ عشق شفایاب ہوگئے
لیتا نہیں ہے کوئی بھی اب کیوں دوا کا نام

معصومیت پہ ان کی نہ آئے گا کوئی حرف
وہ ظلم بھی کریں گے تو ہوگا ادا کا نام

کیوں سرخرو ہیں اہلِ ہوس تیرے شہر میں
بدنام کیوں ہے بندۂ صبر و رضا کا نام

افشائے رازِ عشق بھی توہینِ عشق ہے
یہ جان کر لیا نہ کبھی آشنا کا نام

آشوبِ شہرِ عشق نہ بن جائے وہ کہیں
آرامِ جاں ہے جس گلِ رنگیں قبا کا نام

کیوں اہلِ دل کریں نہ بھلا اس کی پیروی
آئینۂ وفا ہے ترے نقشِ پا کا نام

یہ میری آرزو ہے ظفر راہِ عشق میں
رخشندہ تا ابد رہے میری وفا کا نام

ڈاکٹر منصور عمر (مرحوم) دربھنگہ

لوگ کہتے ہیں تو آسمانوں میں ہے
یہ جہاں بھی تو تیری پناہوں میں ہے
تو نے عشرت کدہ کیوں بنایا اسے؟
اور کیوں ساری لذت گناہوں میں ہے؟
اپنے گھر میں بھی جاتے وہ ڈرتا ہے کیوں
چھپ کے بیٹھا کوئی ان مکانوں میں ہے
کس سے پوچھوں کہ ان کی خطائیں تھیں کیا؟
لاش جن کی پڑی شاہراہوں میں ہے
اس چمن پر مرا حق ہے، تم کون ہو؟
یہ تنازع کئی باغ بانوں میں ہے
پر سمیٹے ہوئے بیٹھنے والے سن!
زندگی کا لہو بس اڑانوں میں ہے
اس پہ منصور تہہ جم گئی گرد کی
ذکر جس کا فقط داستانوں میں ہے

ڈاکٹر ایم اے ضیاء (مرحوم) گیا

آنکھ کی طنابوں کو نیند کیوں نہیں آتی
بن پڑھے کتابوں کو نیند کیوں نہیں آتی
رات کے اندھیرے میں آکے کیوں ڈراتے ہیں
ان حسین خوابوں کو نیند کیوں نہیں آتی
پھول جب ہیں دامن میں آنکھ میں ہے آنسو کیوں
دلنشیں عذابوں کو نیند کیوں نہیں آتی
جوڑنے گھٹانے کا سلسلہ ہے روز و شب
کوئی پل حسابوں کو نیند کیوں نہیں آتی
بارشوں کے موسم میں اور تیز جلتے ہیں
جلتے آفتابوں کو نیند کیوں نہیں آتی
پیاس سے تو صحرا میں موت روز ہوتی ہے
پھر بھی ان سرابوں کو نیند کیوں نہیں آتی
اے ضیاء نہ جانے کب ہم تو سو گئے لیکن
فکر کے عقابوں کو نیند کیوں نہیں آتی

حسن رہبر، بھاگل پور

تو نے مری حیات کو پتھر بنا دیا
سارے جہاں کے غم کو مقدر بنا دیا
ایٹم بموں کے تجربے کچھ اس قدر ہوئے
شاداب سرزمین کو بنجر بنا دیا
اشکوں نے میرے حال پہ اتنا کرم کیا
دریائے دل کو میرے سمندر بنا دیا
آتا ہے مجھ کو موج حوادث سے کھیلنا
ہر غم کو ہم نے پیار کا ساگر بنا دیا
عاجز تھا زندگی کے نشیب و فراز سے
یہ کون آیا، حال کو بہتر بنا دیا
اندازِ بے کشی کا تماشہ تو دیکھئے
پیمانہ لب کو، آنکھوں کو ساغر بنا دیا
حالاتِ زندگی کو بدلنے کے واسطے
میں نے قلم کو ہاتھ کا خنجر بنا دیا

بکھرا ہوا تھا حرف کی صورت جہان میں
کس نے مجھے سمیٹ کے رہبر بنا دیا

حلیم صابر، کولکاتا

وہ زندگی سے کبھی دور ہم کو کر دے گا
کبھی وہ جینے پہ مجبور ہم کو کر دے گا
چراغِ شام بنا کر جلائے گا ہم کو
بوقتِ صبح وہ بے نور ہم کو کر دے گا
مسرتوں کا نہ کر پائیں گے ہم استقبال
وہ ہر خوشی سے بہت ہم کو دور کر دے گا
گرائے گا کبھی ہم کو جہاں کی نظروں سے
کبھی اچھال کے مغرور ہم کو کر دے گا
بنائے گا نئے دار و رسن ہمارے لیے
کہ جب وہ باغیِ دستور ہم کو کر دے گا
ہم اس کے ظلم و ستم سارے بھول جائیں گے
وہ اس قدر کبھی مسرور ہم کو کر دے گا
خطاب بخش کے دہشت پسند کا صابرؔ
زمانے بھر میں وہ مشہور ہم کو کر دے گا

شمس فریدی، جمشید پور

گم ہو نہ جائے ہے رونقِ بازار دیکھنا
پھر ہو رہا ہے شورِ شرر بار دیکھنا
ہے مجھ کو تم سے کتنا سروکار دیکھنا
آیا کبھی جو وقت تو دلدار دیکھنا
ہو جان بھی اگر کبھی درکار دیکھنا
گردن پہ رکھ کے تو مری تلوار دیکھنا
لے کر کس کا نام تڑپتا تھا رات بھر
سویا ہے اب سکون سے دلدار دیکھنا
سونا جہاں پہ بکتا تھا مٹی کے بھاؤ میں
اجڑا ہوا ہے آج وہ بازار دیکھنا
بکھرے پڑے ہیں جسم مکینوں کے فرش پر
ماتم کناں ہیں اب در و دیوار دیکھنا

عشرت معین سیما، برلن (جرمنی)

گرچہ خزینہ غم میں ذرا بھی کمی نہ تھی
پھر بھی ہماری آنکھ میں کوئی نمی نہ تھی
تیرہ شبی کا شکوہ انہیں رات بھر رہا
سوچا نہیں چراغوں میں کیوں روشنی نہ تھی
بس دو قدم کا ساتھ حاصلِ سفر
پھر اس کے بعد کوئی بھی منزل ملی نہ تھی
کیوں وحشت سراب نے بے محل ڈس لیا
صحرائے دل پہ پیار کی بارش تھمی نہ تھی
کرتی بھلا کیوں صدمہ و شکوہ وہ آپ سے
سیما وہ بازی ہاری ہے جو کہ جمی نہ تھی

رفیق جعفر (پونہ)

کیا کیا جلوے دکھلاتا ہے موسم سوچ نگر کا
مجھ کو اکثر اُکساتا ہے موسم سوچ نگر کا
میں پاگل ہوں، دیوانہ ہوں اس کی ہی سنتا ہوں
ہر دم مجھ کو بہکاتا ہے موسم سوچ نگر کا
پیار کا بندھن پیارا بندھن جس کا میں بندی ہوں
اس بندھن کو الجھاتا ہے موسم سوچ نگر کا
دھوکا دینا عادت اس کی میں جس کا عادی ہوں
زخموں کو بھی سہلاتا ہے، موسم سوچ نگر کا!
اس کی عادت جیسی بھی ہے اچھی ہی لگتی ہے
مجھ کو یارو بہلاتا ہے موسم سوچ نگر کا
شعر و ادب کا فن اے جعفر مجھ کو اچھا لگتا ہے
میری غزل کو مہکاتا ہے موسم سوچ نگر کا

ڈاکٹر نریش، پنچ کولہ

ہمارا خدشہ بہرحال خوامخواہ نہ تھا
یہ ایسا رشتہ تھا جو قابلِ نباہ نہ تھا
وہ میری لغزشِ پا پر سہارا کیوں دیتا
وہ ہم سفر تھا مگر میرا خیر خواہ نہ تھا
وہ میرے حلقۂ احباب میں تو شامل تھا
مگر وہ دل نہ تھا میرا مری نگاہ نہ تھا
بری ضرور اسے کر دیا عدالت نے
ثبوت جو بھی رہے ہوں وہ بے گناہ نہ تھا
گلے کی داد ضروری تھی آپ دے دیتے
مگر وہ شعر تو حقدارِ واہ واہ نہ تھا
ہمارا عزم ہی کمزور تھا وگر نہ نریشؔ
کہیں پہ کچھ بھی کسی طرح سدِ راہ نہ تھا

سیما عابدی، امریکہ

بات کہنے سے پہلے تولتا ہے
لہجہ عالم کا منہ سے بولتا ہے
گفتگو ایسی جیسے اک شاعر
اپنے شعروں میں موتی رولتا ہے
عشق خود اپنی روشنی دے کر
حسنِ سادہ میں نور گھولتا ہے
یہ سلیقہ ہے آنکھ والے کا
آدمی دیکھ لب کو کھولتا ہے
پھول بکھرے مگر ہواؤں میں
خوشبوؤں کا خمار ڈولتا ہے
دھیے کاجل کے منہ سے بولتے ہیں
حال دل کا دوپٹہ کھولتا ہے
وہ محبت کو بانٹ کر سب کی
زندگی میں مٹھاس گھولتا ہے
اپنے کردار و عمل میں سیماؔ
اپنی نیت کا عکس ڈولتا ہے

احسان ثاقب، نوادہ

فکر جب ہوش کے ناخن پہ لہو روتی ہے
تب کہیں جا کے میاں ایک غزل ہوتی ہے
موت بس اپنی سی کردار ادا کرتی ہے
زندگی دیکھئے کتنوں کا بھرم ڈھوتی ہے
جانتی ہے تو فقط صبح کی شبنم اس کو
کس طرح کانٹوں کے بستر پہ کلی سوتی ہے
اوڑھ لیتی ہے سیاہی کو وہ چادر کی طرح
رات اٹھ اٹھ کے جب بے تار بدن دھوتی ہے
یہ جنوں ساز حقیقت ہے اسے مت چھیڑو
حکمتِ فن کا ہر اک ذرہ یہاں موتی ہے
صوتی لہروں کی کوئی حد نہیں ہوتی ثاقب
کب زباں شہرتِ معیار یہاں کھوتی ہے

محسن باعشنِ حسرت، کولکاتا

ہمارے پاس دو پل کے لیے کیا آپ آ بیٹھے
ہوئے مدہوش ہم اتنا کہ خود کو بھی بھلا بیٹھے
دیا تھا ہم سبھوں کو رب نے تو بس ایک ہی چہرہ
تھی کیسی مصلحت چہرے پہ ہم چہرہ لگا بیٹھے
سزا ہم کو نہیں ملتی کبھی دنیا میں آنے کی
خدا کرتا بھی کیا آدم ہی جب کر کے خطا بیٹھے
دکھائی رب نے جنت کی جھلک تھوڑی سی کیا ہم کو
نہ جانے خواب کتنے ہم ان آنکھوں میں سجا بیٹھے
بھلا دیں ہم انہیں اے دوست یہ ممکن نہیں لیکن
سنا ہے وہ مگر دل سے ہمیں یکسر بھلا بیٹھے
خزاں ہر سمت ہے چھائی تو کوئی غم نہیں حسرت
کھلیں گے پھول گلشن میں اگر وہ مسکرا بیٹھے

مدہوش بلگرامی

ترا خیال بھی اب اجنبی لگے ہے مجھے
یہ زندگی تو عجب زندگی لگے ہے مجھے
ترے بغیر ہر اک لمحہ خوں کا پیاسا ہے
کہ دوستی بھی تری دشمنی لگے ہے مجھے
کسی بھی شخص کو اپنا کہوں تو کیسے کہوں
کہ چہرہ چہرہ یہاں اجنبی لگے ہے مجھے
بکھرتے ٹوٹتے ان منظروں کا ذکر ہی کیا
سرابِ جاں میں عجب روشنی لگے ہے مجھے
میں اپنی پیاس کو لے کر کہاں کہاں جاؤں
کہ دشت دشت فقط تشنگی لگے ہے مجھے
یہ کرب کیا یہ اذیت کے لمحے کیا شئے ہیں
کہ تیری یاد تو بس چاندنی لگے ہے مجھے
دہکتے شعلوں میں تنہا چلا ہوں میں مدہوش
جو سوچتا ہوں تو تیری کمی لگے ہے مجھے

سلطان شمسی، بردابا (مدھوبنی)

نہ جانے کون سی منزل مجھے بتا کے چلے
وہ ہر قدم پہ نیا راستہ دکھا کے چلے
ہماری بندگی مقبول بھی ہوئی کہ نہیں
جبین شوق ترے در پہ ہم جھکا کے چلے
وہ اپنی منزلِ مقصود کو پہونچ ہی گئے
جو راہرو کی طرح ساتھ رہنما کے چلے
یہ ظلم دیکھیے گل چیں کا جو یہ کہتا ہے
چمن میں باغباں اپنی نظر جھکا کے چلے
یہ کس کے سایۂ گیسو کی آرزو تھی ہمیں
جو غم کی دھوپ میں ہم جسم و جاں جلا کے چلے
پڑا ہوا ہوں سرِ راہ مثلِ گرد سفر
مجھے بھی کاش کوئی ہم سفر بنا کے چلے

فراغ روہوی، کولکاتا

رہ رہ کے بارشوں میں نہانے لگی ہے دھوپ
شاید بدن کی آگ بجھانے لگی ہے دھوپ
کمبخت کا دماغ ہے اب آسمان پر
سردی کی رُت میں جسم جلانے لگی ہے دھوپ
اُتری ہے آگ اوڑھ کے شاید زمین پر
پہلے پہر ہی ہوش اُڑانے لگی ہے دھوپ
اختر شماری کرتے ہوئے شب گزار دی
جب آئی نیند' آنکھ دکھانے لگی ہے دھوپ
تیور کہاں تھے اس کے کبھی اس طرح خدا!
اب جنوری میں رعب جمانے لگی ہے دھوپ
ہوگی نصیب جسم کو پھر راحتوں کی شام
سورج کے ساتھ ساتھ ٹھکانے لگی ہے دھوپ
ہونے کو ہے فراغؔ یقیناً نئی غزل
کاغذ پہ چھن کے فکر کی آنے لگی ہے دھوپ

اشرف یعقوبی، کولکاتا

ختم بیداری کا جس وقت سفر ہوتا ہے
خواب آوارہ کا آنکھوں سے گزر ہوتا ہے
ایسا ہوتا ہے بہت کم ہے مگر ہوتا ہے
بارِ الزام تو حاکم کے بھی سر ہوتا ہے
نذرِ آتش جہاں فولاد کا گھر ہوتا ہے
"یہ نہ بھولو کہ فصیلوں میں بھی در ہوتا ہے"
ریت کی ڈھیر سے ہم نے تو نکالے موتی
سنتے آئے تھے سمندر میں گہر ہوتا ہے
مارتی رہتی ہے موت اس کو سدا قسطوں میں
وہ پرندہ جسے شاہین سے ڈر ہوتا ہے
اس سے امیدِ وفا کوئی کیوں کر رکھے
جس کے کاندھے پہ خریدا ہوا سر ہوتا ہے
جب سے مجروح یقیں ہوگیا بیماروں کا
نہ دواؤں نہ دعاؤں میں اثر ہوتا ہے
ہم کو تو سن کے ہوا کرتی ہے حیرت اشرف
بے ہنر لوگوں کا جب ذکرِ ہنر ہوتا ہے

ہارون شامی، لکھنؤ

سفر طویل سہی، مختصر تو ہوگا ہی
کسی مقام پہ ختمِ سفر تو ہوگا ہی
وہ اک سوال جو ہونٹوں پہ آکے ٹھہر گیا
جواب اس کا بھی زیرِ نظر تو ہوگا ہی
کوئی سنے نہ سنے، کوئی داد دے کہ نہ دے
کلام میں ہے اثر، معتبر تو ہوگا ہی
یہ اک پڑاؤ ہے، منزل ہنوز آگے ہے
کہ اس کے بعد بھی جاری سفر تو ہوگا ہی
تمام سنگ ملامت اسی کے نام ہوئے
وفا شعار ہے آشفتہ سر تو ہو گا ہی
تمام عمر کھلے آسماں کے نیچے کٹی
اس آس پر کہ کبھی کوئی گھر تو ہوگا ہی
کوئی تو ہوگا جسے ہوگی رنگ و بو کی پرکھ
کبھی چمن میں کوئی دیدہ ور تو ہو گا ہی
ہے کم نظر جو کرے دعویِٔ نظر شامی
ہے اہلِ علم اگر خوش نظر تو ہوگا ہی

صابر فخر الدین، یادگیر

فاصلہ دیوار و در کا ہے وہی
سلسلہ زیر و زبر کا ہے وہی
سارا منظر کجروی کا ہے شکار
اور دھوکہ بھی نظر کا ہے وہی
روشنی پھیلی ہوئی ہے ہر طرف
اور اندھیرا اپنے گھر کا ہے وہی
خوف کا حاصل نہیں کچھ خوف کے
اور خمیازہ بھی ڈر کا ہے وہی
ہر طرف حسن عمل کے باوجود
رونا دھونا کیوں ہنر کا ہے وہی
جان و دل قربان ہیں صابر مگر
سامنے آوازہ سر کا ہے وہی

آچاریہ جمال احمد جمال (مروئی والا)، کولکاتا

پیار کرو تم نفرت کے اس گلشن میں کیا رکھا ہے
ایک دوجے کے کام آجاؤ جیون میں کیا رکھا ہے
ہندو مسلم سکھ عیسائی کو مت بانٹو بھارت میں
بندھن میں ایکتا باندھو کھنڈن میں کیا رکھا ہے
چہرے کی سندرتا کیا ہے ہردے سے تم پریم کرو
ہردے میں ایشور بیٹھا ہے نینن میں کیا رکھا ہے
راون بدھی مان بہت ہے لیکن اس کا کام غلط
سب خوبی ہے رام لکھن میں راون میں کیا رکھا ہے
کنگن راون نے سیتا کو پیش کیا تو بولی وہ
من میں پاپ بھرا ہے تیرے کنگن میں کیا رکھا ہے
کاشی متھرا کعبہ جاکر پریم کی پیاس بجھاتے ہیں
کہتے ہیں کچھ لوگ یہاں پر درشن میں کیا رکھا ہے
کوئی نہیں سنسار میں اپنا پریم کرو ایشور سے جمالؔ
سب کو اک دن مرجانا ہے جیون میں کیا رکھا ہے

فصیح احمد ساحر، کولکاتا

ماں سی ممتا اور مروت اس کے اندر ہوتا ہے
گود میں سب کو رکھنے والا ایک سمندر ہوتا ہے
خوش حالی دنیا کی غافل کر دیتی ہے سب کو مگر
وہ جس کو ٹھوکر لگتی ہے تیرے در پر ہوتا ہے
رنج و غم کا، خشک و تر کا ہوتا ہے احساس اسے
بوجھ اٹھائے دنیا کا جو اپنے سر پر ہوتا ہے
حیوانوں میں انسانوں کی بستی کیسے قائم ہو
جنگل میں بھی مقتل جیسا خونی منظر ہوتا ہے
دنیا کے پیمانے پر تم سب کو کیسے پالو گے؟
جس کو یہ بہتر کہتی ہے ہم سے بدتر ہوتا ہے
روح تڑپ جاتی ہے جس کے وار سے اسکی کاٹ نہیں
زخمی کرنے والا وہ احساس کا خنجر ہوتا ہے
سطح دریا سے ساحر اندازہ کیسے کرلو گے
طوفانوں کا شور سنا ہے اس کے اندر ہوتا ہے

غزل مع انگریزی ترجمہ

شاعر: ڈاکٹر امام اعظم
مترجم: سید محمود احمد کریمی (ایڈووکیٹ) دربھنگہ

غلط الزام مجھ پر ہے وفاداری نہیں کرتا
وفاداری تو کرتا ہوں، اداکاری نہیں کرتا

This is wrong to allege I don't act faithfully
I do act faithfully but don't play an actor's part

متاعِ زندگی میری لٹی ہے حق بیانی میں
مری فطرت میں داخل ہے کہ عیاری نہیں کرتا

The capital of my life is ruined in being truthful
Truthfulness forms part of my nature which prohibits treachery

کسی عہدے کسی کرسی کے آگے میں نہیں جھکتا
کسی دربار میں جاکر میں درباری نہیں کرتا

I don't make obeisance to any post holder or a chair person
I don't reach higher echelon to dance attendance upon

محبت میں فقط جھوٹی تسلی جان لیوا ہے
دکھاوے کے لیے اپنوں سے دلداری نہیں کرتا

False reassurance in love could be hazardous
I don't indulge in such a show-off with my kith and kin

فرازِ زندگی کا یہ بھی اک دستور ہے شاید
نشیبِ عشق پر اظہارِ بیزاری نہیں کرتا

Perhaps this is the usualness of life's sublimity
I don't feel fed up with low profile of love

سفر کی دھوپ میں خوابوں کے گل بوٹے ہی کافی ہیں
کبھی صحرا نوردی میں شجرکاری نہیں کرتا

During embroiled journey of life wishful thinking is solacing
Embattling through life I did never get swayed into illusion

اے اعظم زندگی مانوس ہے میری اُداسی سے
خوشی چہرہ پہ چپکا کر گل کاری نہیں کرتا

O' Azam! my life happens to be attached with sadness
I did never masquerade having a false ecstasy on my face

....

موبائل: 9631355367

نظر اپنی اپنی

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا لازمی ہے۔)

● کتاب کا نام: شیشۂ افکار مصنفہ: ڈاکٹر کہکشاں پروین ص:۱۷۶ قیمت: ۲۳۰روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

کہکشاں پروین کی اس تنقیدی کتاب سے مختلف موضوعات کی معنویت سامنے آتی ہے اور نئی جہتوں اور نئے گوشے سے واقفیت ملتی ہے۔

''ناخدا جسے کہئے''، ''اردو فکشن اور تیسری آنکھ''، ''وہاب اشرفی''، ''ایک ابر کا ٹکڑا تھا بہت دور تک برسا''، ''خواتین افسانہ نگار اور اخلاقی اقدار''، ''سماجی قدروں کا محافظ: پریم چند''، ''جدید رجحان اور نسائیت''، ''صالحہ عابد حسین کے ناولوں میں سماجی اور اخلاقی قدریں''، ''قمر جہاں: ایک مطالعہ''، ''منٹو: ایک جائزہ''، ''کرشن چندر کی افسانہ نگاری''، ''لینڈما: ایک جائزہ''، ''ننگی آوازیں''، ''اظہار: ایک جائزہ''، ''افعی: ایک جائزہ''، ''لیمی نیلڈ گرل ایک جائزہ''، ''واجدہ تبسم: ایک مطالعہ''، ''تحقیق کے طریقہ کار: ایک نظر''، ''عورت: کل اور آج''، ''اردو اور جدید رجحانات''، ''فیملی پلاننگ: ایک سماجی مسئلہ''، ''یادوں میں شامل شان احمد صدیقی''، ''صدیق مجیبی: ایک والہانہ شخصیت'' اور ''رانی ایک شہر خوابوں کا'' جیسے مضامین میں کہکشاں پروین کی اپنی سوچ کی توانائی ہے، حالاں کہ جذبات کے مختلف مراحل سے وہ گذرتی ہیں لیکن نمود کی ذہنی کسک کی تلاش کے استحکام کو ناقدانہ برتری دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انداز نظر کا محور وجودی ہے جس میں احساسات کی آنچ تحریری مسافت کو سمیٹتی ہے اور تخلیق اور شخصیت کا جائزہ لیتے وقت خیالات ونظریات کی سنجیدگی کو سامنے لاتی ہے۔ ''ناخدا جسے کہئے'' میں لکھتی ہیں:

> ''انسان کے اچھے اور برے دونوں افعال کے پس پردہ یادیں بھی اہم رول ادا کرتی ہیں۔ افعال، حرکات وسکنات جذبات کے دخیل ہوتے ہیں۔ یہ جذبات تمام حیاتی وجود کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ان کے تحت نئے نئے فسانے تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔''

وہاب اشرفی کی کتاب ''اردو فکشن اور تیسری آنکھ'' کا جائزہ لیتے وقت کہکشاں پروین نے فکری ہیئت پر توجہ دی ہے اور افسانہ کے نئے رویے پر وہاب اشرفی کی دروں بینی کی تلاش کی ہے۔

''ایک ابر کا ٹکڑا تھا بہت دور تک برسا'' میں وہاب اشرفی کی شخصیت کی جلوہ نمائی کی گئی ہے اور وابستگی کی پاسداری کی گئی ہے۔ ''خواتین افسانہ نگار اور اخلاقی اقدار'' میں چند افسانہ نگار کے یہاں اخلاق کے روشن پہلو تلاشنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دراصل اس مضمون سے حقیقت نگاری کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور مسائل اور اصولوں کے تصادم سے جو درس سامنے آتا ہے اس وصف کو بیان کیا گیا ہے۔

''سماجی قدروں کا محافظ: پریم چند''، افروز اشرفی کے مضمون کو بنیاد بنا کر کہکشاں پروین نے پریم چند کے یہاں سماجی وتہذیبی قدروں کی پاسبانی کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اہم نکتہ پیش کیا ہے:

''طرزِ رہائش، اندازِ گفتگو اور آداب زندگی تبدیل ہوتے آئے ہیں، ہوتے رہیں گے۔ یعنی اخلاقی قدروں کو بدلا نہیں جا سکتا۔ سماجی تقاضے میں جو بھی تبدیلیاں ہوں لیکن مساوات، ہم آہنگی، انصاف، ایمان اور توازن کی اہمیت اور فوقیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔''

آج نسائی ادب پر خصوصیت سے توجہ دی جارہی ہے۔ ادب میں کلچر کا ایک طرح سے نیا رجحان سامنے آیا ہے۔ کہکشاں پروین کے مضمون ''جدید رجحانات اور نسائیت'' میں ذہنی کشادگی اور بدلتے چہرے کے اوٹ میں جانے کی کوشش ملتی ہے تاکہ خوشگوار حدت کو محسوس کیا جاسکے۔

''صالحہ عابد حسین کے ناولوں میں سماجی اور اخلاقی قدریں'' میں پرانی قدروں کی پامالی اور جدید قدروں کی سطحیت کے نتیجے میں ذہنوں کے جو تصادم سامنے آرہے ہیں ان کی جھلکیاں صالحہ عابد حسین کے ناولوں سے پیش کی گئی ہیں۔ لیکن یہ مضمون بیحد تشنہ ہے۔

کہکشاں پروین نے دیگر مضامین میں بھی تہذیب و تمدن کے سمٹتے پہلو اور امکانات کے نقوش ابھارے ہیں اور سماجی حالات کی آئینہ داری کے عکس کو شناخت کے شعور کی بالیدگی عطا کی ہے۔ ان کی تنقید میں مقصد کی اہمیت پر زور ملتا ہے اور مثبت تبدیلی کے جلوے نمایاں ہوتے ہیں۔ احتساب کا دائرہ اگرچہ مختصر ہوتا ہے لیکن تجزیے کی گہرائی ضرور سامنے آتی ہے۔

....

● رسالہ کا نام: ''تکمیل'' (شوکت حیات نمبر) مدیران: اصغر حسین قریشی/مظہر سلیم ص: ۲۴۲ قیمت: ۲۵۰/روپے
رابطہ: کوہسار ٹیچرس کالونی، شانتی نگر واٹر ٹینک، بھیونڈی مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

ہمعصر افسانہ نگاروں میں شوکت حیات کی خدمات غیر معمولی ہیں۔ انہوں نے نامیاتی، امکانی، انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی سے مملو افسانے لکھے ہیں جن میں ان کا اپنا لہجہ ہے، اپنا تیور ہے اور اپنی فکری بصیرت ہے۔ واقعات کو باریک بیں پرتوں سے کھولنے اور جزیات نگاری سے درد و غم کو جمع کرنے کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ انہوں نے مفلوج سماج کو نشانہ بنایا ہے اور ہمیشہ سچائی سے پردہ اٹھایا ہے۔ نفسیاتی لذت خیزی کے عناصر بھی ملتے ہیں اور سائنسی وجودیت کو فلسفیانہ وجودیت میں گم کرتے نظر آتے ہیں۔

شوکت حیات پر یوں تو بہت لکھا گیا ہے لیکن جس طرح ان کا افسانوی مجموعہ بیحد تاخیر سے منظر عام پر آیا۔ اسی طرح ان پر کسی رسالے نے اب جا کر نمبر شائع کیا ہے۔ حالاں کہ کئی مدیران قبل اعلان کرتے رہے لیکن عملی شکل دینے میں ناکام رہے۔ شاید شوکت حیات کی بے نیازی کو اس میں دخل ہے۔ لیکن ان کی خود اعتمادی کام آئی اور بالآخر اصغر حسین قریشی اور مظہر سلیم نے یہ کارنامہ انجام دے ہی ڈالا۔ ایک طرح سے ''تکمیل'' کا یہ نمبر شناخت نامہ اور اعتراف نامہ ہے، جس میں صورت پذیری ہے، جہاں شناسی ہے اور جینوئن اظہار کے کثیر الجہتی ستارے ہیں۔

''شوکت حیات نمبر'' میں ان کا تعارف ہے۔ اپنی تھیوری سازی اور اپنے افسانوں پر شوکت حیات کی مختصر آرا ہے کہ میں کیوں لکھتا ہوں۔ ان کی افسانہ نگاری پر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، جوگندر پال،

اقبال مجید، قمر رئیس، مہدی جعفر، وہاب اشرفی، نظام صدیقی، دیویندر اسر، نورالحسن نقوی، رام لعل، مظہر امام، حامدی کاشمیری، زبیر رضوی، شہنشاہ مرزا، سلیمان اطہر جاوید، نکہت ریحانہ خان، کمار پاشی، طارق سعید، سید احمد قادری، ابرار رحمانی، نسیم احمد نسیم اور قیصر علی کے تاثرات ہیں۔ مضامین لکھنے والوں میں وارث علوی، مہدی جعفر، عبدالصمد، سلام بن رزاق، ابرار رحمانی، حامد علی خان اور نورالحسنین جیسے اہم نام شامل ہیں۔ شوکت حیات سے غضنفر اقبال، محمد غالب نشتر اور ظہیر انصاری نے انٹرویو لئے ہیں۔ ساتھ ہی شوکت حیات کے ایک درجن افسانوں کا تجزیہ علی احمد فاطمی، ایم مبین، انیس اشفاق، اسلم جمشید پوری، احمد صغیر، عارف خورشید، رؤف صادق، محمد کلیم ضیا، شجاعت علی، اسد اللہ، عظیم راہی، معین الدین عثمانی، مظہر سلیم اور وقار قادری نے کیا ہے۔ مظہر سلیم کے نام شوکت حیات کے چار خطوط اور محمد حامد علی خاں، ایم مبین اور وقار قادری کا ایک ایک خط "شوکت حیات نمبر" کے سلسلے میں ہیں۔ اس نمبر کا اہم حصہ بولتی تصویریں بھی ہیں۔ اڑتالیس رنگین تصویریں الگ افسانہ بیان کر رہی ہیں اور مشاہیر سے شوکت حیات کے تعلقات کو جاگر کر رہی ہیں۔

یہ نمبر بیحد سلیقے سے اور شوکت حیات کے شایان شان شائع ہوا ہے۔ مدیر مظہر سلیم لکھتے ہیں "شوکت حیات کے ہاں اپنے آس پاس کی زندگی سے کہانیاں بننے کا ہنر دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عصری حسیت اور سماجی سروکار سے بھی کام لیا ہے۔ ان کی یہ حسیت اپنے عہد سے بخوبی لگا کھاتی ہے۔ وہ اپنی فکر اور رویے کے باعث ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو اپنے عہد میں خاصے ممتاز ہیں۔"

شوکت حیات یقیناً منفرد ہیں کہ مزاحمت اور احتجاج کو نئی تخلیقیت کے ساتھ رمز وایما کے پردے میں سادگی کی رنگ آمیزی سے ترسیل کی فنکارانہ خوبی عطا کرتے ہیں جس میں اکیسویں صدی کی بشارت ہے اور استغراق بھی ہے۔

....

● **نام کتاب: احتشام حسین کا تنقیدی شعور مصنفہ: ڈاکٹر شائستہ انجم نوری ص: ۱۴۴ قیمت: ۲۵۰ روپے**
رابطہ: A/1-3، دوسری منزل، علی نگر، انیس آباد، پونے - ۲ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگل پور)

سماجی عمرانی اور مارکسی تنقید کے صف اول کے ناقد احتشام حسین تھے۔ وہ ادب پارے کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے تھے۔ کسی ادب پارے کا تجزیہ کرتے وقت جہاں ایک قلم کار کے انفرادی، جمالیاتی، ذوقی اور نفسیاتی الجھنوں، پیچیدگیوں اور رویوں کا وہ تجزیہ کرتے تھے وہیں یہ بھی دیکھتے تھے کہ مصنف نے جن خیالات و احساسات کا اظہار کیا ہے ان کے خارجی محرکات کیا تھے اور ان کا سماجی اور تاریخی تناظر کیا تھا۔

داخلی اور خارجی دونوں عناصر کا تجزیہ کرنے والے ناقد احتشام حسین کے تنقیدی شعور پر ڈاکٹر شائستہ انجم نوری نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور تعبیر وتشریح کی نقش گری کی ہے۔ ان کی کتاب پانچ حصے میں منقسم ہے۔ تنقید نگاری کا فن، اردو ادب میں تنقید کی روایت، احتشام حسین کی تنقید نگاری کا تنقیدی جائزہ، احتشام حسین کے چند معاصر نقاد، محاکمہ و نتائج یہ بھی ابواب مربوط ہیں اور فکری گہرائی کا پتہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شائستہ انجم نے بتایا ہے کہ احتشام حسین کی زندگی میں تنقید کے آٹھ اور ان کے انتقال کے بعد نو اس مجموعہ

شائع ہوکر مقبول عام ہوا کہ ''تنقیدی جائزے'' (۱۹۴۴ء)، ''روایت اور بغاوت'' (۱۹۴۷ء)، ''ادب اور سماج'' (۱۹۴۸ء)، ''تنقید اور عملی تنقید'' (۱۹۵۲ء)، ''ذوق ادب اور شعور'' (۱۹۵۵ء)، ''عکس اور آئینے'' (۱۹۶۲ء)، ''افکار و مسائل'' (۱۹۶۳ء)، ''اعتبار نظر'' (۱۹۶۴ء) اور ''جدید ادب: منظر و پس منظر'' (۱۹۷۸ء) ایسی کتابیں ہیں جن میں تنقیدی عمل اور تنقیدی مسائل پر جانب داری کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے نظریئے کے مطابق ان میں شعر و ادب کا اجتماعی اور سماجی پس منظر نمایاں ہے۔ شائستہ انجم حتمی رائے دیتی ہیں:

> ''احتشام حسین اردو کے وہ جلیل القدر اور تاریخ ساز نقاد تھے جنہوں نے پہلی بار مغربی ناقدین سے نہ صرف آنکھیں ملا کر باتیں کیں بلکہ اردو تنقید کو ایک ایسی ڈگر پر لا کھڑا کیا جہاں سے نئی راہیں کھلتی ہیں۔''

ادبی تنقید کو وسیع تناظر میں پرکھتے ہوئے شائستہ انجم نوری نے اس کی تعریف، ابتدا، نظام، تفہیم اور تعین پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے لئے ایلیٹ، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، نورالحسن نقوی، جمیل جالبی، خلیل الرحمٰن اعظمی، آئی اے رچرڈس، آر پی بلیک، حامد اللہ افسر، انسائیکلو پیڈیا امریکا، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، عبادت بریلوی، کلیم الدین احمد، محی الدین قادری زور، ابو محمد سحر، ابوالفیض سحر، شارب ردولوی، احسن فاروقی، رضا نقوی واہی، سید عبداللہ، خورشید جہاں، سلیم اختر، میتھو آرنالڈ، ورڈس ورتھ اور خود احتشام حسین کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے اور مثال دی ہے۔

''اردو ادب میں تنقید کی روایت'' پر بحث کرتے ہوئے شائستہ انجم نے حالی، امداد امام اثر اور شبلی سے ابتدا مانتے ہوئے محمد حسن اور اختر انصاری کے خیالات پر روشنی ڈالی ہے۔ مارکس کے نظریات کی بھی وضاحت کرتی ہیں اور احتشام حسین کا بھی بہ غائر مطالعہ کرتی ہیں۔

''احتشام حسین کی تنقید نگاری کا تنقیدی جائزہ'' میں احتشام حسین کے غیر معمولی ذہن و فکر کی دلیل پیش کر گئی ہے اور ان کے فلسفیانہ استدلال سے دیدہ وری اور حق شناسی نیز تنقیدی بصیرت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ شائستہ انجم نے تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ احتشام حسین اپنی تنقید سے نئی جہتیں کھولتے تھے اور صالح ادبی و تنقیدی روایات کو ملحوظ رکھ کر نظریاتی تنقید میں ندرت پیدا کرتے تھے وہ یہ بھی لکھتی ہیں:

> ''حالی کے بعد اردو تنقید میں احتشام حسین ہی تنقید اور اس کا فن اس کے اجزائے ترکیبی وغیرہ سے متعلق مختلف سوالات اٹھانے والے نقاد ہیں۔ ان کا غیر معمولی ذہن ان کے مطالعے کی وسعت اور ان کے توانا شعور نے تنقید کے میدان میں انہیں اعتبار بخشا ہے۔''

''احتشام حسین کے چند معاصر نقاد'' میں مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، ممتاز حسین، اختر اورینوی اور محمد حسن کی ناقدانہ صلاحیت اور اسلوب کی انفرادیت کو شائستہ انجم نوری نے تلاش کیا ہے اور سماجی زندگی کے پس منظر میں ان سب کے نکات و خیالات سے نتائج برآمد کر کے اپنے احتساب کو سائنٹفک بنایا ہے۔

''محاکمہ اور نتائج'' میں احتشام حسین کے تنقیدی مزاج و معیار کو عکس کا آئینہ بنایا ہے۔

ڈاکٹر شائستہ انجم نوری کی یہ کتاب ان کی تنقیدی بصیرت کو خیرہ کرتی ہے اور کنہیات سے آگاہ کراتی ہوئی تقابلی مطالعے کو ہم آہنگی عطا کرتی ہے۔

• نام کتاب: اردو صحافی بہار کے مصنف: ڈاکٹر سید احمد قادری ص: ۲۷۲ قیمت: ۳۰۰ روپے
رابطہ: ۷/ ریئو کریم گنج، گیا-۸۲۳۰۰۱ (بہار) مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگل پور)

بہار کے حوالے سے اردو صحافت کے ایک اہم ناقد اور محقق سید احمد قادری بھی ہیں۔ یہ دوسرے ناقدوں سے الگ اس طرح ہیں کہ بہار کی صحافت پر سائنٹفک زاویے سے انہوں نے دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پہلی کتاب ''اردو صحافت بہار میں'' اپنے موضوع کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ اسی لئے حوالہ جاتی کتاب شمار ہوتی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب ''اردو صحافی بہار کے'' (بشمول جھارکھنڈ) اس لحاظ سے بیحد اہم ہے کہ اس میں بالترتیب انجم مانپوری، اختر پیامی، ادریس سہنساروی، انور عظیم، اصغر حسین اعجازی، اشہر ہاشمی، امام اعظم، ابرار رحمانی، اسرار جامعی، اشرف استھانوی، اختر کاظمی، افضل مصباحی، احمد جاوید، انوراللہ، انظر اللہ، ابوالکلام عارف، انصاری اطہر حسین، اظہر زماں، بدر اورنگ آبادی، بیتاب صدیقی، تاج انور، توحید خاں، تسنیم نجمی، جابر حسین، جاوید محمود، جگیشر پرشاد خلش، حسن علی (مولوی)، حقانی القاسمی، خورشید انور عارفی، خورشید پرویز صدیقی، خورشید ہاشمی، خواجہ شبیر الزماں، خیر در بھنگوی، راشد احمد، رضوان احمد، ریاست علی ندوی، ریاض عظیم آبادی، ریحان غنی، زاہدہ حنا، زین شمسی، سید سلیمان ندوی، سید عروج احمد قادری، سید عثمان غنی مولانا، سید عمر فرید، سید مسعود الرب، سید فیصل علی، سید شہباز، سید احمد قادری، سید فضل اللہ قادری، سید محمد اشرف فرید، سید محمد عبدالغفور شہباز، سید محمد جلیل، سید محمد مصطفیٰ کمال، سید ذاکر حسین، سہیل عظیم آبادی، سلطان احمد، سراج انور، شاہد رام نگری، شاہد الاسلام، شاہد مظفر پوری، شبیر احمد، شفق عماد پوری، شمس الہدیٰ استھانوی، شاہین محسن، شمس گیاوی، شہباز حسین، شارق اجئے پوری، شاہین نظر، شوکت فرید، شین مظفر پوری، ضیاء الرحمٰن غوثی، طہٰ کمال ندوی، طیب عثمانی، ظفر عدیم، عابد حسین عابد (مولوی)، عبدالمغنی، عبدالقیوم انصاری، عتیق مظفر پوری، عبدالحئی، عطا عابدی، غلام سرور، فاروق الحسینی (مولانا)، قیوم خضر، محمد مرغوب، محمود ایوبی، معین شاہد، مناظر احسن گیلانی، مناظر عاشق ہرگانوی، محمد نثار، مشتاق در بھنگوی، مشتاق احمد نوری، مشتاق احمد، محمد غلام سرور، محمد جسیم الدین قاسمی، کلام حیدری، منصور خوشتر، وفا ملک پوری، وہاب اشرفی اور ہوش عظیم آبادی جیسے ایک سو ایک صحافیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بھی صحافیوں کے اصل نام، والد کا نام، تاریخ پیدائش، جائے پیدائش، وفات کی تاریخ اور جگہ و تصاویر کے ساتھ ان کے صحافتی کارنامے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان صحافیوں میں نئے پرانے بھی نام شامل ہیں جنھوں نے اپنے عصر میں اپنی شناخت بنائی ہے اور سید احمد قادری کے زیر قلم سانس لے رہے ہیں۔ صحافتی تحقیق کی ایسی کتاب لکھنے کے لئے بیحد محنت درکار ہے۔ قادری صاحب کی محنت ہر صفحہ سے عیاں ہے۔ ان کے اظہار میں ذوق، شوق، جستجو اور اظہار کا حوصلہ ہے۔ نظر اور نظریہ بھی ہے۔ معانی، تفہیم، معلومات اور قرأت کی وضاحت بھی ہے۔ تدوین اور تحریر سے جتنے کردار نمایاں ہوئے ہیں وہ مشعل بردار ہیں جن سے استفادہ کیا جائے گا۔ برگ و بار سے بھری یہ کتاب جانکاری کے در وا کرتی ہے اور آڑے ترچھے صحافتی نقطے کو سمندر کا پھیلاؤ عطا کرتی ہے۔ اس کتاب کے بین السطور میں حیات اور کارنامے کے جو نکتے ہیں وہ معنویت کی گہرائی لئے ہوئے ہیں اور گیرائی کا پتہ دیتے ہیں۔ سید احمد قادری یوگ سادھنا میں بیٹھ کر دانشورانہ خاموشی سے ایک اور چمکدار کتاب لے

آئے ہیں جس میں صحافت کی بصیرتیں رقص کناں ہیں۔اس میں عہد اور شخصیت کے ساتھ استحکام کا چہرہ آب و تاب کے ساتھ کتنے ہی اشکال کو نمایاں کر رہا ہے۔اس کتاب کی اہمیت ہمیشہ رہے گی اس کا یقین ہے۔

....

● نام کتاب: ارج مصنفہ: ڈاکٹر حلیمہ فردوس ص: ۲۳۰ قیمت: ۱۱۵؍ روپے
رابطہ: A1-414، گنگا بلاک نیشنل گیمز ولیج، کورا منگلا، بنگلور-۵۶۰۰۴۷ مبصر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

حلیمہ فردوس بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار ہیں لیکن انہوں نے وقتاً فوقتاً تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ایسے ہی ۲۴؍ مضامین کا مجموعہ ''ارج'' ہے جسے ''احقاق''، ''ارتکاز''، ''اختصاص'' اور ''احیاء'' کے عنوان کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے شق میں تانیثی رجحان پر چھ مضامین ہیں۔نسائی غزل میں تصور محبوب، نسائی مکتوبات کا گراں قدر سرمایہ، اردو کی نئی بستیوں کا نسائی افسانوی ادب، نسائی شاعری اور صنفی مساوات، تحریک آزادی کی گم نام شعری نسائی آوازیں، گھر آنگن کی رباعیوں کی محرک: صفیہ اختر۔حلیمہ فردوس کی تنقید کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تحقیق کو بھی ساتھ لے کر چلتی ہیں اور تشکیلی (Constitute) اور جزو (Constituent) سے ربط پیدا کرتی ہیں تاکہ جذب دروں کی عکاسی ہو سکے اور شناخت کو اعتبار مل سکے۔مثلاً نسائی غزلیہ شاعری کی ابتدا ماہ لقابائی چندا اور زیب النساء (مخفی) سے مانی جاتی ہے۔حلیمہ فردوس نے ثابت کیا ہے کہ موجودہ تحقیق کے مطابق پہلی شاعرہ بی بی فتح ملک ہیں۔وہ معلومات فراہم کرتی ہیں:

> ''گجرات کے مشہور صوفی بزرگ قاضی محمود دریائی کی زوجہ بی بی فتح ملک صاحب دیوان شاعرہ تو نہیں تھیں مگر ان میں شاعرانہ صلاحیت موجود تھی۔شادی کے بعد بھی زوجین ایک دوسرے سے الگ رہے۔ایک طویل انتظار کے بعد شوہر سے وصال کی گھڑی آئی تو یہ خاتون بے محابا اپنے شاہ (شوہر) کے احسان کا ذکر اور ان لمحوں کی سرشاری کے بیان پر مجبور ہوگئی۔سرشاری کا رنگ ملاحظہ ہو:
>
> راتا مکھ، تنبو کا کھاؤں، راتا پہنوں چوڑا
> راتی مانگ سیندور بھروں، پھولوں راتا چوڑا
> (پان کھا کر مکھ لال کروں اور لال چوڑیاں پہنوں
> سیندور بھر کر مانگ کو سرخ کروں اور جوڑے کو سرخ پھولوں سے لال کروں)
> جیوں ملا جن عقد بناھایا تو ہوں تخت چڑھائی
> کھول انکھیاں شہ مکھ دیکھا ہب ہوں کروں بدھائی
> (وہ مولوی ملا جیتا رہے جس نے عقد پڑھایا تب میں تخت چڑھی
> آنکھیں کھول کر محبوب کا چہرہ دیکھا، اب میں مبارک باد دیتی ہوں۔)

حلیمہ فردوس نے خواتین کی مکتوب نگاری پر سوال اٹھایا ہے کہ مشاہیر ادب کے ایسے خطوط منظر عام پر نہیں آئے یا انہیں اہمیت نہیں دی گئی جبکہ نثری اصناف میں مکتوب نگاری کی اہمیت رہی ہے۔انہوں نے تحقیق کو اپنے

اس مضمون میں بھی راہ دی ہے اور مختلف زمانے کے خطوط پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے:

''انتظام اللہ شہابی کے مرتب شاہ خطوط کے مجموعے میں شامل اقتباس میں عبدالحلیم شرر نے محلات عالیات کے سرخ اور پرفشاں کاغذ پر لکھنے جانے والے تقریباً ڈیڑھ سو خطوط کا ذکر کیا ہے جو بادشاہ کے ملاحظے کے بعد دفتر ''بیت الاجراء'' میں محفوظ کیے جاتے تھے جو ''تودے نامے'' کہلاتے تھے۔''

''ارتکاز'' کے تحت ''آزادی کے بعد ظریفانہ شاعری کا اسلوب'' اردو افسانے کے اہم نشان ۱۹۸۵ء تا حال سوغات کے اداریے، اردو غزل کے مقطعے، ہندی فلموں کو اردو کی دین، اور امتزاج نگاروں کا محبوب کردار''؛ ''اختصاص'' کے عنوان سے ''علامہ اقبال: شاعر شعلہ نوا''، ''مولانا ابوالکلام آزاد کا ادبی سرمایہ'' اور ''خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری: زندگی کا پرسوز نغمہ'' اور ''احیاء'' کے تحت ''عہد ٹیپو سلطان میں دکنی شعر و ادب کا فروغ''، ''جنوبی ہند کی نمائندہ ناول نگار خواتین''، ''شاذ تمکنت کے کلام کی خوابناک فضا''، ''آخری ساعت سے پہلے: ایک تاثر''، ''دکھن کے تمن کا ایک انمول ہیرا: سلیمان خطیب''، ''وہاب عندلیب: قافیوں کا کوہِ گراں'' اور ''اصغر ویلوری کا شعری سفر'' جیسے مضامین میں عمق ہے۔ باضابطہ مطالعہ ہے اور تنقید کی خود اعتمادی ہے۔ ساتھ ہی گہری نظر، مطالعہ کی وسعت اور ناقدانہ بصیرت ہے۔

....

● نام کتاب: زندگی نامہ گوپی چند نارنگ مصنف: جمیل اختر ص: ۴۰۰ قیمت: ۴۰۰ روپے
رابطہ: ۱۸/جی، ڈی پی ڈبلیوڈی کالونی، وسنت وِہار، نئی دہلی-۵۷ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

پروفیسر گوپی چند نارنگ تنقید نگار، محقق اور ماہر لسانیات ہیں۔ انہوں نے نئی فکر کی تازہ ہواؤں سے اردو کو مالا مال کیا ہے۔ ان کی خصوصی تنقیدی پیش رفت، سنسکرت شعریات اور ساختیاتی فکر، عربی فارسی شعریات کی بین تہذیبی، بین ادبی، بین جمالیاتی غواصی، بین قدر رنجی اور بین امتزاجیت پسندی اردو ادب کی نئی شعریات کے لئے منبع نور ہے جس کے فیضان سے ہر سطح پر فکر و فن کا نیا پن، موضوع اور معنی کا نیا پن اور الفاظ و اظہار کا نیا پن منفرد تخلیقی شان کے ساتھ رونما ہوا ہے جو زندہ نامیاتی اور متحرک ادب کی روح ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کا امتزاجیت جو رویہ وسیع تر سطح پر بہت ہی معنی خیز ہے جس کی دوسری نظیر کمیاب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نارنگ صاحب اردو ادب کی حرکت اور حرارت ہیں اور تہذیبی پہچان کی اکسرائی روشنی ہیں۔

کشادہ نظر اور کشادہ فکر گوپی چند نارنگ جیسے دانشور کو مکمل طور پر ایک نظر میں آئینہ بنانے کے لئے جمیل اختر نے ''زندگی نامہ'' ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں گوپی چند نارنگ کی زندگی اور تحریروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ''زندگی'' کے تحت آغاز، شادی، اولاد، والدین، اجداد، تعلیم، اساتذہ، رفقائے کار، خاص کرم فرما اور احباب، عزیزان قدر، نارنگ کی جہتیں، زبانوں سے واقفیت، فیلوشپ، مشمولات (ملازمت)، نقش اول، زندگی کے اہم واقعات، اعزازات وانعامات (ملکی، بیرونی) بیرون ملک کا سفر، اداروں سے وابستگی، انتظامی امور کی ذمہ داری، ریڈیو پروگرام، ریڈیو ٹائمس، ٹی وی پروگرام، استقبالیہ جلسے، ادبی وثقافتی جلسوں سے خطاب، علمی وادبی مشاغل لیکچرز/

خطبات، مذاکرے/مباحثے، نگرانی میں تحقیق، تعزیتی تحریر اور اقوال زرّیں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''تحریریں'' کے تحت تصنیفات، تالیفات اور مرتبات کا گوشوارہ ہے۔ تاریخی ترتیب سے مکمل فہرست، موضوعی ترتیب، تحقیق وتنقید، اردو زبان اور لسانیات، سفرنامہ، درسیات، ڈکشنری انسائیکلوپیڈیا (انگریزی میں)، ڈائریکٹری/وضاحتی کتابیات اور کتابوں کے مندرجات کی فہرست دی گئی ہے۔ ''مضامین'' کے عنوان سے مضامین، مقالات اردو کی تقویمی ترتیب/اخبارات ورسائل، ساختیات سیریز کے مقالات، مضامین (بہ اعتبار موضوع)، مضامین دوسری زبانوں میں ہندی میں، انگریزی میں کی تفصیل ہے۔ دیگر تحریریں کے تحت تبصرے، مقدمے، پیش لفظ، تعارف، پیش لفظ انگریزی میں، دیباچہ/حرف چند، انتسابات، تالیفات، اور کتابوں کے مندرجات کی فہرست ہے۔ ''مکالمے'' کے تحت نارنگ سے انٹرویو، مجموعہ انٹرویو، اخبارات وجرائد میں شائع انٹرویوز (اردو ہندی، انگریزی میں ریڈیو/ٹی وی پر)، گوپی چند نارنگ کے ذریعے لئے گئے انٹرویوز ریڈیو پر، ٹی وی پر، ترجمے کے تحت گوپی چند نارنگ کے کتابوں کے اردو سے ہندی، مشاہیر کی تخلیقات کے (اردو سے انگریزی)، کتابوں کے ترجمے دیگر زبانوں میں (ہندی، انگریزی، پنجابی، کنڑ، مراٹھی، تامل، فیلی، بنگالی، نیپالی، ملیالم، گجراتی، اڑیا اور کشمیری)، مکتوبات، کے تحت کچھ نمائندہ مشاہیر کے خطوط، مجموعہ خطوط، غیر شائع شدہ خطوط، ادبی اور علمی تقریبات کے تحت سیمینار، کانفرنس، ورک شاپ، قدرشناسی کے تحت گوپی چند نارنگ پر مضامین اردو ورسائل، کتابوں، ہندی اور انگریزی میں، خاکے، معنون کتابیں، شخصی تاثرات'' کتابوں پر تبصرے (اردو، انگریزی، ہندی میں) ''منظوم خراج تحسین'' تحقیقی مقالے، رسائل کے خاص نمبر'' فکر و فن پر کتابیں'' کتابوں کے مندرجات رسائل وجرائد (جن میں تحریریں شائع ہوئیں)'' ممتاز ادبی شخصیات: نارنگ کی نظر میں'' متاع لوح وقلم'' پاکستان سے شائع کتابیں'' برقیاتی میڈیا میں'' دستاویزی فلم'' یوٹیوب اور'' ویب سائٹ'' ای میل، پتہ کے عنوان سے گوپی چند نارنگ کی خوب سے خوب تر تلاش کی گئی ہے اور ادبی سفر کی تفصیل کو مشعل راہ بنایا گیا ہے۔ جمیل اختر کی محنت کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔ ''عرض مرتب'' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب کسی بھی مصنف سے متعلق گنجینۂ معلومات کا وہ خزانہ ہے جو چھپی ہوئی حالت میں'' گوگل'' سرچ کا کام دے گی یعنی اتنی معلومات کسی بھی مصنف سے متعلق نہ کسی ویب سائٹ پر ملے گی نہ گوگل سرچ میں ہی نیٹ پر دستیاب ہو سکے گی۔ یہ ''مصنف انجمن'' اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔''

جمیل اختر کی اس کتاب میں بعض مندرجات درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً نارنگ صاحب پر میں نے دس مضامین نئی تنقید کے حوالے سے لکھے ہیں جو ہندوپاک کے بیسوں رسائل میں شائع ہوئے۔ لیکن اس کتاب میں ایک آدھ کا ہی ذکر ہے۔ ''کوہسار'' میں بھی نارنگ صاحب سے متعلق بہت چھپا ہے لیکن ان کا ذکر نہیں ہے۔ وغیرہ۔ بہرحال یہ کتاب نارنگ صاحب پر دستاویز ہے۔

....

نام کتاب: نئی فکریاتی جہات مصنف: ڈاکٹر اے جے مالوی صفحات: ۲۲۴ قیمت: ۳۰۰ روپے
پتہ: ۱/۱۲۷۸، مالویہ نگر، الہ آباد-۲۱۱۰۰۳ (اتر پردیش) مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

اجے مالوی کی تنقیدی جدت میں وسعت اور ندرت ہے۔ وہ اپنی سوچ کو زبان کے افقی رشتوں کے نظام سے گذارتے ہیں اور ارتباط و انسلاک سے کام لے کر شناخت اور معنویت کے بہجت دال کرتے ہیں۔ وہ متون میں موجود معانی تک سے فکریاتی پیش منظر سے پہنچتے ہیں اور اظہار کے شفاف میڈیم سے نظریات کو قبول کرتے ہیں۔ اس قبولیت میں معنوی صورت کی تہہ داری ہے اور املائی مظاہر کی حکومت کا عمل ہے۔ ان کے متعین حدود ساختیاتی تنقید تک پہنچتے ہیں اور مافی الضمیر کو قابل فہم بناتے ہیں۔

کتاب ''نئی فکریاتی جہات'' میں تنقیدی اور تحقیقی نو مقالے ہیں۔ مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ، اردو زبان و ادب کا خدمت گزار اور تاجدار گوپی چند نارنگ، معاصر اردو غزل کے امتیازات، دلت نظمیہ تخلیقیت کے آتش فشاں کا پھول جینت پرمار، نظمیہ شاعری کا آفتاب چندر بھان خیال، سیفی سرونجی کا نظمیہ رنگ و آہنگ، عذرا پروین کی تانیثی شاعری کا فکری اور فنی انفراد، ویدک ادب اور اردو، ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز۔

اجے مالوی نے ان سبھی مضامین کے وسیع دائرہ میں معنی و مطلب کی ناگزیری سے مکاشفہ کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت کے امام ہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت جب دم توڑنے لگے تو انہوں نے کشادہ اور تکثیری ذہن سے کام لیتے ہوئے آزادانہ تخلیقیت کے لئے مابعد جدید رجحان کی نئی بصیرت سے آشنا کرایا اور وافر مواد فراہم کر کے اردو ادب کو جہاں مالا مال کیا وہیں اظہار کی اہمیت، افادیت اور معنویت کو نئی نظریہ سازی عطا کی۔ مابعد جدیدیت کی نئی تخلیقیت اور آزادی و کشادگی پر اجے مالوی اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''مابعد جدیدیت موجودہ صورت حال میں تخلیقیت کی رنگا رنگی اور ادب کی آزادی کی نقیب ہے۔ مظلوم حاشیاتی طبقوں کا ادب، اقلیتی مسائل کا ادب، تانیثیت کا ادب، دلت ومرش، ردتشکیل، ثقافتی مطالعات اور مابعد نوآبادیاتی مسائل جو نئی تخلیقی، نئی فکریات، ثقافتی جڑوں اور آزادانہ سماجی سروکار پر زور دیتے ہیں، یہ سب ادبی رویے مابعد جدید فکر کا حصہ تصور کئے جاسکتے ہیں؟''

مابعد جدیدیت کی اس مکمل تعریف کی کسوٹی پر اجے مالوی نے گوپی چند نارنگ کے تخلیقیت افروز منظرنامے کو تفصیل سے آنکا پرکھا ہے۔ وہ بتاتے ہیں:

> ''گوپی چند نارنگ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بے لوث ذہنی آزادی کی طرف توجہ دلائی اور فکری طور پر نئی بصیرتوں کے در وا کئے جس کا نئی نسل کے افسانہ نگاروں، ناول نگاروں اور شاعروں پر گہرا اثر پڑا اور ۱۹۸۰ء کے بعد انہوں نے اس بات کو صاف طور پر کہنا شروع کر دیا۔ اب ان کا تعلق نہ سکہ بند ترقی پسندی سے ہے اور نہ ہی آسیب زدہ اور بیگانگی زدہ جدیدیت سے ہے اور پھر یہیں سے اردو میں ایک خاموش انقلاب پرور اور انقلاب آفریں مابعد جدید دور کی شروع ہوتی ہے۔''

گوپی چند نارنگ کے بارے میں اجے مالوی بعض انکشافی باتیں بھی بتاتے ہیں:

> ''اردو زبان میں گوپی چند نارنگ کے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ کوئٹہ شہر کے ہفتہ وار اخبار ''بلوچستان سماچار'' میں اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ اسکول میں زیر تعلیم تھے...

جب ۱۹۴۷ء میں وہ دہلی آئے تو یہاں پر بھی ان کے متعدد افسانے ''بیسویں صدی اور ریاست جیسے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔''

معاصر اردو غزل کے امتیازات کو نشان زد کرتے ہوئے اجے مالوی لکھتے ہیں:

''معاصر اردو ادب کے غزل گو شعرا کے یہاں ہمیں تیزی سے بدلتا ہوا شعری و ادبی تخلیقیت افروز منظر نامہ، عالمی، قومی اور مقامی و علاقائی تہذیب و ثقافت کا شدید احساس جاگیر دارانہ عہد کے وضع کردہ ادبی اور جمالیاتی پیمانوں سے انکار، ہندوستانی ثقافت کے مشترکہ عناصر و اقدار، غیر مشروط روحانیت ، بے مرکزیت، تاثیریت، رنگا رنگی، کثیر المعنویت اور حقیقی آزادی فکر و نظر ملتی ہے۔''

جینت پرمار کی دلت نظمیہ شاعری کے نئے فنی اور جمالیاتی نظام کی تخلیقیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جینت پرمار سے قبل اردو نظمیہ شاعری میں دلت مخاطبہ (Discourse) کی نشاندہی نہیں ہوتی ہے....قدیم دور میں دلت سماج کے اوپر برتر طبقہ نے جو ظلم و ستم ڈھاتے ہیں وہ سارے ظلم و ستم اور ان کے نشانات آج بھی ان کے جسم کے اندر نقش ہیں۔

اس طرح ''چندر بھان خیال''، ''سیفی سرونجی''، ''عذرا پروین''، ''ویدک ادب اور اردو'' اور ''ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز'' جیسے تحقیقی و تنقیدی مضامین فکری کیفیات کو محسوس کراتے ہیں۔ یہ کتاب مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔

....

● نام کتاب: چنیدہ مصنف: مظفر حنفی ص: ۳۶۶ قیمت: ۳۵۰ روپے

رابطہ: ڈی-۴۰، باٹلا ہاؤس، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

اردو کے زود گو شاعروں میں پروفیسر مظفر حنفی کی مثال دی جاتی ہے۔ ان کی قادر الکلامی اظہر من الشمس ہے۔ ان کی شناختی تفہیم ہر پل عمل آرا رہتی ہے۔ اور وہ عہد حاضر کی قرأت تسخیر معنی اور سائنسی حقائق سے کرتے ہیں۔ لسانیاتی عہد حاضر کی قرأت معنی اور سائنسی حقائق سے کرتے ہیں۔ لسانیاتی فکر سے ان کا رشتہ ابتدا سے رہا ہے اسی لئے الفاظ کا منبع ان کے پاس ہے۔ وہ چونکہ تنقید نگار بھی ہیں اس لئے خود احتسابی اور خود تنقیدی رویہ کو اپنی شاعری میں راہ دیتے ہیں اور باشعور موضوعیت یا موضوع انسانی کی مرکزیت کی تشریح و توضیح ادبی اقدار کی معنویت کے ساتھ کرتے ہیں۔

''چنیدہ'' میں ۲۳ رباعیات، ایک حمد اور ایک نعت کے ساتھ سات سو تین غزلیں شامل ہیں۔ ان میں کتنے ہی رنگ و روپ، شکل و صورت اور ہیئت و انداز ہیں۔ بے بسی کے المیہ احساس اور سماجی طنز کی عکاسی بھی ہے۔ تکنیکوں، طریقوں اور میلان کے امتزاج کے ساتھ اشتراک، وانجذاب کے اثرات ان کی غزلوں میں نمایاں ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ذہن اور عقل کی کارفرمائی دل سے قطعی مختلف ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی ذہن اور دل کے متضاد رویے مشترک محسوسات میں تبدیل ہو جاتے ہیں جن سے مشترکہ راستے کا سفر شروع ہوتا ہے جو زندگی کا نیا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اور ہاں اور نہیں کی وادی میں موج خوں پایاں شوق بنتی ہے:

دل نہیں کہتا کہ اس کا بھی کنارا ہے کوئی — ہم نہ مانیں گے سمندر لاکھ سمجھائے کوئی
دل کا یہ حال کہ ہر قطرۂ خوں مصرعہ ہے — اور کاغذ کو یہ انکار کہ نم ہے وہ بھی
جب خاکدان دل سے رہا کر دیا گیا — سب کائنات آتش غم نے سمیٹ لی
دل نہ کیسے ڈوبتا، آنکھوں پہ قابو ہی نہ تھا — دل ہی باغی ہو رہا تھا، کس طرح تھمتا لہو

مظفر حنفی کے تجربے اور مشاہدے وسیع ہیں اس لئے بعض مخصوص نفسیات کو عمدگی کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں۔ لمحہ موجود کی تلخیوں کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں جو انسانی سلوک اور برتاؤ کو انڈر لائن کرتی ہے:

بعینہٖ جیسے قصر دریا سے لعل و گوہر نکالتا تھا — وہ شعبدہ باز اپنی ٹوپی سے جب کبوتر نکالتا تھا
چھوٹی سی اک دکان، خریدار بے شمار — لمبی قطار، مائل پیکار لڑکیاں
ہمارے گھر کے سلگنے پہ تالیاں نہ بجاؤ — تمہارے گھر میں بھی ہوگا یہی، رہو تو سہی
لوگ تو پھول بچھاتے تھے تیری راہوں میں — پھر ترے ہاتھ میں شمشیر کہاں سے آئی

مظفر حنفی کی سات سو غزلوں میں موضوعات الگ الگ ہیں۔ کہیں پسندیدہ شجر انصاف چاہتے ہوئے جڑوں کی تلاش کرتا ہے، کہیں حساس آنکھیں خاموش تماشائی بنی رہتی ہیں اور کہیں وجود کا عمل چڑھتے سورج کی حمایت کرتا نظر آتا ہے۔ منطقی اور سائنسی طور پر معنی کے ادراک اور اس کی تعبیر سے وہ دروبست کی افزائش کرتے ہیں اور مختلف عناصر سے ہم رشتگی کی ترسیل کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی کہ وضاحت طلب عنصر سے تفہیم سامنے آتی ہے۔ سماجی رسمیات اور ثقافتی ضابطے کی بنیادی سچائی سے تجسیمی اور مادی پہلو کی انفرادیت تک رسائی کا حل کیا جاسکتا ہے۔ اور مانوس قسم کے عملی امکانات کی خوشبوؤں کی حیاتی شدت سے آشنائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

....

● **نام کتاب:** سخن سرمایہ **مصنف:** رفیع الدین راز **ص:** ۱۲۰۰ **قیمت:** ۱۲۰۰ روپے
رابطہ: اے-۳/۲، عثمان ٹیرس، ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی **مبصر:** ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

تین ملکوں کے دعوے، اردو کے زود گو شاعر، اظہار بیان کو گرفت میں رکھنے والے، سادگی و برجستہ گوئی کے امین، سچائی کی خوشبو سے تخلیقی آگہی کو عرفان بخشنے والے رفیع الدین راز کی کلیات 'سخن سرمایہ' میں ان کے سات مجموعۂ کلام "دیدۂ خوش نواب (1988)" "بینائی (1997)، پیراہن فکر (2002)، اتنی تمازت کس لئے (2007)، اک کون و مکاں روڈ (2013)، کہسار خوش جمال (غیر مطبوعہ) اور "پیراہن بدلتا لہو (غیر مطبوعہ)" شامل ہیں۔

راز صاحب ہندوستان میں پیدا ہوئے (۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء)، پاکستان میں انہوں نے تعلیم حاصل کی اور امریکہ میں بود و باش اختیار کی۔ شاعری ان کے لئے احساس جمال کی وجدانی کیفیت ہے۔ انشائیہ بھی لکھتے رہے ہیں۔ "بات سے بات" انشائیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

زیر تبصرہ کلیات میں زندگی بخش غزلوں کا سرمایہ ہے۔ ان میں تجربے کا انوکھا لالہ و گل ہے۔ تخلیقی اظہار کی نئی

شناخت ہے اور سانس لیتے ہوئے عصری تقاضے کا روشن چراغ ہے:

میں آج اپنے پیش نظر دیر تک رہا
آنکھوں پہ آئینے کا اثر دیر تک رہا

ایک ادنیٰ پیڑ اور سورج کی ایسی بے بسی
چھاؤں کو حسرت سے تکتی ہے تمازت دھوپ کی

اندھیرے کو فزوں تر لکھ رہا ہوں
میں شاید عہد کا ڈر لکھ رہا ہوں

برسا رہا ہے آگ زمینِ وطن پہ آج
ذہنوں میں پل رہا تھا جو خود ساختہ عذاب

رفیع الدین راز نے عہد کے تناظر میں انسانیت پرستی کی ترجمانی کی ہے۔ داخلی صداقت کا اضطراب آمیز دائرہ وسیع کیا ہے اور آشوب سفر اور بدن پناہ کی انفرادیت کو نظم میں رکھا ہے:

توڑ ڈالا اشک کے قطرے نے پتھر کا غرور
یہ گماں ہرگز نہ تھا ٹوٹے کا اندر کا غرور

مسافران وفا کو سلگتے صحرا میں
شعور تشنہ لبی نے امان میں رکھا

ہم پر یہ حشر گزرا ہے، یہ ہم سے پوچھئے
ٹوٹے بغیر آئینہ کیسے بکھر گیا

میرے جذبات کی خوشبو مرے احساس کا لمس
اٹھ کے وہ بھول گیا ہے کہیں سامانوں میں

رفیع الدین راز کی غزلوں میں کہیں کہیں بے چہرگی کے تجربات کا اظہار ملتا ہے اور داخلی سچائیوں کی لطافت بھری گہری سنجیدگی ملتی ہے۔ انہوں نے تر دامنی کے لئے منطق کو بھی راہ دی ہے اور آنگن کی دھوپ کی بے پناہ لذت سے بھی نبرد آزما کی ہے۔ تخلیقیت سے بھرپور ان کی غزلوں میں زبان کا زور آراستہ ہے اور سادگی کا سحر جلوہ سامانی سے عبارت ہے۔

اس کلیات میں مشاہیر کی تفصیلی اور مختصر آرا بھی ہیں۔ شان الحق حقی، مشفق خواجہ، احمد ندیم قاسمی، محسن بھوپالی، امجد اسلام امجد، انجم اعظمی، خالد علیگ، کریم بخش خالد، پیرزادہ قاسم، سحر انصاری، امتیاز ساغر، رشید نگار، منصور ؔ ر، شاداب احسانی، جاذب قریشی، جاوید رسول جوہر اشرفی، شاعر علی شاعر، احمد زین الدین، اسلم فرخی، ظفر حبیب اور محسن ملیح آبادی نے رفیع الدین راز کی فکر انگیزی، ہمہ گیریت، وسیع النظر، معنی خیز شعریت اور مشاہدات کے ابلاغ کو عظمت بخشی ہے۔

....

● نام کتاب: کویت میں ادبی پیش رفت مصنف: افروز عالم ص: ۳۹۹ قیمت: ۵۰۰ روپے
رابطہ: پوسٹ بکس نمبر ۴۵۱، فروانیہ-۸۱۰۱۵ (کویت) مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

افروز عالم بیحد فعال شخصیت کا نام ہے۔ بحیثیت شاعر ان کی پہچان ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں وہ کویت میں رہتے ہیں اور دنیا گھومتے رہتے ہیں۔ ہوائی جہاز کی اڑان کی طرح ان کی سوچ پروان چڑھتی رہتی ہے اور نیا کچھ دینے میں لگے رہتے ہیں۔ تین شعری مجموعے اور چار مرتب کردہ کتابیں شائع کرنے کے بعد کویت میں نثری ادب کے حوالے سے ضخیم کتاب اردو کو دی ہے۔ گذشتہ ساٹھ سال سے کویت میں مقیم تقریباً دو سو اقامت پذیر اہلِ قلم کی ڈیڑھ سو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے نثری کارنامے کا جائزہ لیتے ہوئے افروز عالم ''عرض مرتب'' میں لکھتے ہیں:

''نثر کا میدان کویت میں بہت ہی تنگ دامن رہا ہے۔ محض چند کتابیں ہی منصۂ شہود پر رونق افروز ہوئیں جن کی فہرست اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔ اخبارات ورسائل کے حوالے سے بھی مضامین شامل اشاعت ہیں۔''

یہ کتاب کئی حصے میں منقسم ہے۔ کویت میں اردو کی صورت حال پر کئی مضامین ہیں۔ شخصیات پر لکھنے والوں کے مضامین کا انتخاب ہے۔ تعارف کے ساتھ افسانے ہیں۔ کالم نگاروں، مزاح نگاروں اور خاکہ نویسوں کے نمونے ہیں۔ ساتھ ہی ''رفتگانِ کویت'' کے تحت کویت سے بچھڑنے والوں پر تاثراتی اظہار خیال ہے۔ کویت کے شعراء و ادباء کی تصانیف کی تفصیل اصناف کے لحاظ سے ہے۔ صاحب قلم کا نام کتاب کا نام اور سن اشاعت بھی دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح کویت کی نثری کتابوں کا شمار ہے۔ ایک دوسری تفصیل اس طرح ہے کہ ۱۹۵۰ء، ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۰ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۹۰ء، ۲۰۰۰ء، ۲۰۰۵ء، اور ۲۰۱۰ء کے بعد کے شعراء کے نام دیئے گئے ہیں۔ کویت کی شاعرات کی فہرست بھی ہے۔ سترہ اہم خبریں شامل کر کے وہاں زبان وادب کی پیش رفت اور تہذیب وثقافت سے آگاہ کرایا گیا ہے۔ سولہ صفحے میں رنگین تصویریں بھی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اردو کی کوشش کا اندازہ ہوتا ہے۔ محبوبیت پر فدا ہونے والوں کا چہرہ سامنے آتا ہے اور اردو کی خوش آئند گرفت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ افروز عالم نے جس عمدگی، تلاش بسیار اور روشن چراغ کے ذریعہ اردو کے نقوش کو واضح اور نمایاں کیا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کی تیسری بستی کویت بھی ہے جہاں زبان کو پھیلاؤ مل رہا ہے اور ادب کی گل کاری ہو رہی ہے۔

''کویت میں اردو کی صورت حال'' کویت کے نثری ادب کا مختصر جائزہ'' ریڈیو کویت اردو سروس، ریاست کویت کا تعارف، کویت سے شائع ہونے والے اردو اخبارات ورسائل، کویت کی ادبی انجمنیں وغیرہ مضامین ذہن کشا ہیں۔

اسلم عمادی، حاجی اشفاق حسین جعفری، رانا اعجاز حسین، تسلیم اکبر شاہ، سعید نظر، شاہد حنائی، ماہر عمر، پروفیسر مرزا عبدالقدوس، تسلیم حبیں زیبا، مسعود حساس، میمونہ علی چوگلے اور افروز عالم کے تنقیدی مضامین ہمہ گیریت رکھتے ہیں۔

افسانہ نگاروں میں زیبا صدیقی، شاہجہاں جعفری حجاب، شاہین رضوی، ڈاکٹر مرزا عمر بیگ، نظر بریلوی، ڈاکٹر وسیم صدیقی اور ڈاکٹر رسول میمن کے افسانے زندگی کے عکاس ہیں جن میں معاشرے کی ناہمواریوں کا ذکر زیادہ ہے۔ حسن وعشق کم ہے۔ البتہ جو موضوعات پیش کیے گئے ہیں ان میں گہرائی ہے۔

شاہد حنائی نے ''تلخ تصویر، شیریں تاثر'' کے عنوان سے عیسیٰ بلوچ کا بہت اچھا خاکہ پیش کیا ہے، شناخت کی یہ خوشبو محبت آمیز ہے۔

افروز عالم کی اس کتاب میں شاہد حنائی، محمد عمر اور منیر فراز کے کالم کے نمونے دیئے گئے ہیں۔

خالد اکبر کے مزاح پارے شدت احساس سے بھرپور ہیں۔

سعید روشن کی خودنوشت میں آن بان ہے۔

نور پرکار، کرامت غوری، زینت صلاح الدین اور سعید صفدر پر مضامین مثبت کشش رکھتے ہیں۔

افروز عالم نے کویت کے نثر نگاروں کے حوالے سے قربت کا حق ادا کیا ہے جس میں تاثیر ہے، کشش ہے اور قلم کا جادو ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ میں یہ تر و تازہ کتاب اضافہ ہے۔

....

● نام کتاب: اردو میں مرصع نگاری کی روایت مصنف: ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ص: ۲۵۶ قیمت: ۱۶۱ روپے رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱، وکیل اسٹریٹ، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صرف تنقید لکھتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں تحقیق بھی ہے۔ اردو میں مرصع نثر پر لکھتے وقت انہوں نے اپنی نثر پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ اس کتاب کو تحریر کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

''میں انگریزی مصنف ایلن وارنر (Alan Warner) کی کتاب A short guide to English Style پڑھ رہا تھا تو مجھے Ornate Prose یعنی ''مرصع نثر'' کا شعور ہوا۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں مصنف نے انگریزی نثر نگاری کے عہد بہ عہد ارتقا کا بہت عالمانہ جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب سے تحریک پا کر میں نے منصوبہ بنایا کہ میں اردو نثر کے اسالیب کا جائزہ لوں اور مرصع نگاری کی روایت اور اس کے اثرات کی جستجو کروں اور دیکھوں کہ پر تکلف اور مقفیٰ و مسجع نگاری نے اردو کی نثری تحریرات پر کیا اثرات مرتب کیے اور کیسے نقوش چھوڑے۔''

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول کو انہوں نے عہد قدیم قرار دیا ہے اور ''مرصع نثر'' ملا وجہی سے تحسین تک کا جائزہ لیا ہے جس کے تحت ''سب رس'' کربل کتھا، دیباچہ سودا، نوطرز مرصع، دیباچہ عشرت بریلوی، داستان جذب عشق جیسی کتابوں کے اظہار و بیان پر روشنی ڈالی ہے اور اسلوب کی خوبی بیان کی ہے۔ باب دوم ''عہد متوسط'' ہے۔ میر امن سے مرزا غالب تک کی پر تکلف اور آراستہ و پیراستہ نثر کا جائزہ ہے۔ ''فورٹ ولیم کالج'' ''فورٹ ولیم کالج سے باہر'' داستانیں، رانی کیتکی کی کہانی، چند اور داستانیں، فسانۂ عجائب، اور امام بخش صہبائی، آغا ز امانت علی، مرزا غالب وغیرہ کے دیباچے و تقاریظ، ساتھ ہی مرزا رجب علی بیگ سرور، غلام امام شہید، بیگمات اودھ اور مرزا غالب کے خطوط میں نثر کی سادگی اور اس وقت کے دو ایک اخبار سے اقتباس دے کر رنگینی و رعنائی کو اجاگر کیا ہے۔ باب سوم عہد سرسید ہے۔ آثار الصنادید: سرسید احمد خاں دیباچہ توبتہ النصوح، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، رتن ناتھ سرشار، اور خواجہ حسن نظامی، کے ساتھ طالب بنارسی، احسن لکھنوی اور آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے میں مقفیٰ نگاری کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ باب چہارم، عہد جدید ہے۔ ابوالکلام آزاد کی تحریروں پر مرکوز اس باب میں ان کی عالمانہ زبان پر گفتگو ہے۔ باب پنجم میں عہد جدید ہے جس میں ادب لطیف لکھنے والے سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، نیاز فتح پوری اور سجاد انصاری کے یہاں نئے اور معنی خیز الفاظ و تراکیب کا احتساب ہے۔ باب ششم کو بھی عہد جدید میں شمار کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، جوش ملیح آبادی، ثوبان فاروقی، سید حامد اور کلیم احمد عاجز کی آرائش و زیبائش اور پرکاری پر تبصرہ ہے۔ باب ہفتم ماحصل ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے دیدہ وری سے کام لے کر اردو نثر کے مطالعے اور جائزے سے ثابت کیا ہے کہ اردو

ادب کی پیش رفت میں جہاں پر تکلف اور مقفیٰ نثر سے مرصع نگاری کی گئی ہے وہیں سادہ و پرکار نثر سے نفیس اور دلکش عبارتیں لکھی گئی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ابتدا سے ہی اردو نثر متمول اور متنوع رہی ہے۔ ممتاز احمد خاں لکھتے ہیں:

''اس سے ہماری نثر کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوا اور ہماری زبان میں ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ میں بیان کرنے کی قوت وصلاحیت پیدا ہوئی۔ اس اسلوب کے زیر اثر ہماری نثر کے اسالیب میں کتنے ہی تجربے ہوئے اور اظہار کے متنوع اور رنگا رنگ پیرایے سامنے آئے۔''

اردو ادب پر تکلف، خوش آہنگ اور شاعرانہ نثر سے مالا مال ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے جی داری سے کتاب لکھ کر اسلوب کے وجود کو اظہار عطا کیا ہے اور عہد بہ عہد کی موزوں زبان پر روشنی ڈال کر نئی تاریخ رقم کی ہے۔

....

● **نام کتاب: ساجد رشید، فن اور شخصیت مصنف: اشتیاق سعید ص: ۲۴۸ قیمت: ۲۰۰ روپے**
رابطہ: نیوٹاؤن پبلشر، عبداللہ مینشن، ہریانہ والا لین، ممبئی - ۰۷ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

ساجد رشید افسانہ نگار تھے اور صحافی بھی تھے۔ ان کے افسانے میں زندگی کی آئیڈیولوجی کی کئی سطحیں ملتی ہیں۔ بیانیہ اور ڈرامائیت کے بیچ وہ اشاریت اور رمزیت کے ساتھ سریت کی سرگوشی بھی بکھیرتے رہے۔ رسالہ ''نیا ورق'' کے ذریعہ بھی واشگاف کرنے کا فن کارانہ منظر نامہ پیش کرتے رہے۔ اس طرح ان کی شخصیت قابل توجہ تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ضرورت تھی کہ ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے اور ان کے وجود کی بازیافت کی جائے۔ اشتیاق سعید نے جانفشانی کے بعد مطالعاتی وصف کو واضح اور روشن کیا ہے۔ ''ٹھیس نہ لگ جائے ان آبگینوں کو'' کے عنوان سے پیش لفظ میں انہوں نے بڑے تلخ لہجے میں سچائی بیان کی ہے کہ ساجد رشید پر مضامین لکھوانے میں کیسے کیسے چہرے نے اپنا رخ بدلا اور کتنوں نے وعدہ وفا نہیں کیا۔ لیکن دوستوں کے جہنم کدے میں رہ کر بھی انہوں نے گوپی چند نارنگ، سلام بن رزاق، ایم نسیم اعظمی، وارث علوی، ایس ایم عباسی، راشد انور راشد، نثار احمد صدیقی، مقدر حمید ندوی، شوکت حیات، م ناگ، احمد عثمانی، عنبر بہرائچی، اطہر عزیز، عبدالمغنی خاں، عالم ندوی، انور مرزا ایم کاویانی، سیفی سرونجی، فیروز شوکت، کامریڈ اسرار احمد، مظہر سلیم، فاروق سید، جمال الدین جاوید، رام ساگر پانڈے، رونق جمال، اشتیاق سعید، شیریں دلوی، انور حسین، عبدالباری ایم کے، رونق افروز، خان حسنین عاقب اور وقار قادری سے مضامین لکھوانے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ۳۳ مضامین، شخصیت، فن اور مقصد کو اجاگر کرتے ہیں جن سے رجحانات، میلانات اور ترجیحات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قلمی جہاد کی سچی تصویر کی عکاسی ان سارے مضامین سے ہوتی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں:

''ساجد رشید کا تعلق اردو افسانہ نگاروں کی اس کھیپ سے ہے جنہوں نے اپنی تخلیقی شناخت بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں بنائی ہے اور جن کا ذہن ختم صدی کے آخری عشروں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو شدت سے انگیز کرتا رہا ہے۔ ان کے تین مجموعے ریت گھڑی (۱۹۹۰ء) نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی، اور ایک چھوٹا سا جہنم (۲۰۰۴ء) پر آ چکے ہیں۔''

سلام بن رزاق نے ساجد رشید کے اردو گرد کے واقعات اور حادثات میں جذب ہوتے ہوئے لہو کی مصوری دیکھی ہے:

''ان کا بیانیہ محض اکہری حقیقت نگاری کی تصویر کشی نہیں کرتا بلکہ ذرا غور کرنے پر اس کے وفیاتی ابعاد بھی روشن ہوتے نظر آتے ہیں۔ موضوع کی شعلگی اور جملوں کی نشتریت ان کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ان کے افسانوں کا اختتام قاری کو چونکاتا نہیں بلکہ دل و دماغ کو چند سلگتے سوالوں سے بھر دیتا ہے۔''

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے ساجد رشید کے بارے میں چند انکشافی باتیں لکھی ہیں۔

''اٹھارہ سال کی عمر میں انہوں نے اپنی پہلی کہانی لکھی تھی جو ماہنامہ ''واقعات'' دہلی میں ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۷۶ء میں انہوں نے صحافت سے وابستگی اختیار کی تھی اور دنیا کے بیشتر مایہ ناز فکشن نگاروں کی طرح انہوں نے بھی بیک وقت افسانہ نگاری اور صحافت کی خدمات انجام دیں۔ وہ ایک اچھے سماجی خدمت گار بھی تھے۔ انہوں نے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، قومی یکجہتی، آپسی اتحاد و اتفاق اور اعلیٰ انسانی قدروں کی بحالی کی غرض سے ایک سماجی تنظیم کی بھی تشکیل کی تھی جو ''ناگرک نیائے منچ'' کے نام سے جانی جاتی تھی۔''

ساجد رشید کے افسانہ ''بانکا'' کا تجزیہ کرتے ہوئے وارث علوی جمالیاتی اشتعال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بانکا، کہانی میں اخلاقی حکایت کی سادگی ہے اور طریقہ کار میں فنتاسی کی بخشی ہوئی وہ آزادروی ہے جو حقیقت نگاری کا ڈسپلن اور اس کی نفسیاتی تقاضوں کو پورا کرنے میں مانع ہے۔''

ساجد رشید کی دور ایک کمزوریوں کو شوکت حیات نے اجاگر کیا ہے:

''ساجد رشید نے دہشت پسندی پر خصوصی گوشہ والا کو شمارہ ۳۱ نکالا تو اس میں امریکی دہشت گردی اور اسلامی گردی کو تو بے نقاب کیا لیکن ہندو دہشت گردی کے تئیں چشم پوشی کا رویہ اختیار کیا۔''

سبھی لکھنے والوں نے ساجد رشید کو الگ الگ زاویے سے دیکھا ہے۔ اسلئے یہ کتاب ساجد رشید شناسی میں مددگار ہے۔ اشتیاق سعید نے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ ممکن ہے دوسرے بھی بعض چھپے ہوئے گوشے کی طرف توجہ دیں۔

....

● نام رسالہ: سہیل، عصمت چغتائی نمبر مدیر: جمیل منظر ص: ۲۹۰ قیمت: ۱۰۰ روپے زر سالانہ: ۲۵۰ روپے
رابطہ: چھایا گھیرا، ۲/۱۳ اے، اورینٹ رو، کولکاتا - ۷۰۰۰۱۷ مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

''سہیل'' کی اشاعت کا یہ ۴۷واں سال ہے۔ اگست ۲۰۱۵ء کا شمارہ ''عصمت چغتائی'' نمبر مشمولات کے لحاظ سے بیجد وقیع ہے۔ ۲۱/اگست ۲۰۱۵ء کو عصمت کی پیدائش کے ۱۰۰/سال مکمل ہوئے ہیں۔ عصمت چغتائی افسانہ نگار اور ناول نویس کی حیثیت سے اردو میں اپنا ایک مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے۔ فلموں کے لئے بھی لکھا اور فلم بھی بنائی۔ مضامین اور خاکے بھی لکھے ہیں۔ وہ روشن خیال اور روایت شکن تھیں۔ صداقت بیانی

سے کام لیتی تھیں اور منفرد اسلوب کی مالک تھیں۔ اداریہ میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''عجیب بات ہے کہ اس قدر صداقت پسندی اور ترقی پسندی کے باوجود ترقی پسند نقادوں نے ان کے بارے میں کم سے کم لکھا۔ احتشام حسین، ممتاز حسین سے لے کر قمر رئیس تک کسی نے ان کے فکر و فن پر قلم نہیں اٹھایا۔''

ڈاکٹر شاہد ساز ''نمود'' کے تحت بتاتے ہیں:

''عصمت نے ۸؍ناول، ۳؍ناولٹ، ۷؍افسانوی مجموعے، ۱۲؍ڈرامے، ۱۱؍خاکے، ۲؍رپورتاژ، ایک خودنوشت، ۱۸؍مضامین، ۵؍فلمی اسکرپٹس اور متعدد خطوط لکھے۔''

''سہیل'' کے اس نمبر میں'' سوانحی کوائف '' جمیل اختر نے لکھے ہیں۔ ''شخصیت'' پر سعادت حسن منٹو، نگار عظیم، اقبال مجید، خالد اشرف اور محمد اشرف کے مضامین ہیں۔ فیاض رفعت اور مناظر عاشق ہرگانوی کے انٹرویو، کرشن چندر، فیض احمد فیض، مجنوں گورکھپوری، سید محمد عقیل، علی احمد فاطمی، شمیم نکہت، دیپک بدکی، ابوبکر عباد، کہکشاں عرفان، محمد مستمر، طاہرہ پروین، عاصم شہنواز شبلی، روبی نکہت، محمد عرفان، سعدیہ پروین، ناظمہ پروین اور انجم پروین کے مقالے افسانہ نگاری پر ہیں۔ عصمت کی ناول نگاری پر سیما صغیر، فخر الکریم، سعید احمد، شبنم رضوی، سلمیٰ خاتون، صالحہ زریں، سفینہ بیگم، تمنا شاہین، روبیہ تبسم، فرحین صالحہ، اور نیلوفر فردوس نے مضامین لکھے ہیں۔ رپورتاژ نگاری پر عبدالحیٔ کا مضمون اور ڈراما نگاری پر عارفہ بیگم، خاکہ نگاری پر محمد جابر زماں کے مضامین شامل ہیں۔ عصمت کے بعض اہم افسانوں کے تجزیے خواجہ احمد عباس، شارب ردولوی، تسلیم عارف، ثروت خان، رضوانہ شمسی اور ندا سعید نے کیے ہیں۔ خود نوشت کا جائزہ نعیم السحر صدیقی اور آفرین سرور نے کیا ہے۔ عصمت کی فلمی خدمات پر غزالہ بی نے روشنی ڈالی ہے اور عصمت کتب و رسائل میں کے عنوان سے اطہر مسعود خاں نے تحقیق کی ہے۔ مشاہیر ادب کی نظر میں عصمت پر آرا محمد شمیم عالم نے ترتیب دی ہے۔ نگارشات عصمت چغتائی کے تحت '' آپ بیتی'' مجھے کہنا ہے کچھ'' ترقی پسند ادب اور میں اور کیا ترقی پسند ادبی تحریک سے ادب کو نقصان پہنچا ہے۔ جس میں تحریریں شامل ہیں۔ اور الگ الگ موقعے کی چھ تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

عصمت چغتائی کی مکمل تفہیم کے لئے ''سہیل'' کا یہ نمبر دستاویزی ہے۔ اگر چہ عصمت کے موضوعات الگ الگ ہوتے ہیں لیکن طبقۂ نسواں کو نئی معنویت کے ساتھ انہوں نے موضوع بنایا ہے۔ معاشرتی فرسودگی، استحصال نظام اور تفریق کو بھی سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور روزمرہ کی حقیقت کو بھی بدعنوانیوں اور بداخلاقیوں سے بھرے ماحول میں دیکھا ہے اور برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ادب کی ایسی نباضی پر ایسے ہی نمبر کی ضرورت تھی۔

....

- کتاب: ''اردو میڈیا۔ کل آج کل'' مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ص: ۴۸ قیمت: ۸۰؍روپے
  ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی۔۲۵

زیرِ تبصرہ کتاب ''اردو میڈیا۔ کل آج کل'' ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کی کتاب ''اردو میڈیا'' پر مناظر عاشق

ہرگانوی کا اضافی مضمون ہے۔ ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز ہندوستان میں اردو صحافت کے ایک مضبوط ستون ہیں۔ ان کا اردو صحافتی سفر ۱۹۸۰ء میں ایک اسپورٹس رپورٹر کی حیثیت سے شروع ہوا۔ روز نامہ ''عوام'' حیدرآباد کی نیوز ادارت سے ہوتے ہوئے ان کی صحافتی صلاحیت ہفتہ وار ''گواہ'' حیدرآباد کی ادارت تک پہنچ چکی ہے۔ اتنی لمبی مدت کی ادارت سے وابستگی بہت ساری کہانیاں کہہ ڈالتی ہیں۔ سائنس، ادب، فلم، اخلاقیات، اسلامیات، انٹرویو، سوانحی خاکے، اداریے پر ان کی بے شمار تخلیقات ان کے حصے میں آتی ہیں۔ فی زمانہ اردو کا کوئی دوسرا صحافی اتنا مصروف اور اتنا فعال دور دور تک نظر نہیں آتا۔ امریکہ، برطانیہ، ایران، عراق، اردن اور سعودی عرب کا سرکاری دورہ کر چکے ہیں جس نے ان کی صحافتی صلاحیتوں کو اور جلا بخش دی ہے۔

اس کتاب سے ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کی کتاب 'اردو میڈیا' میں صحافت کے تعلق سے کی گئی بحث کی پوری جانکاری ملتی ہے۔ صحافت کی تعریف و تشریح جس طرح قرآن پاک کے حوالے سے کی گئی ہے وہ نہایت مدلل اور Convincing ہے۔ ڈاکٹر پرویز نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ اردو قارئین تک صحافت کی دنیا سے جس طرح روشناس کرانے کی کوشش کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے اور یقیناً وہ مبارکباد کے مستحق بھی ہیں۔ صحافت کی قدیم ترین روایات کا ذکر کر کے انہوں نے یقیناً چونکایا ہے۔ ۶۰۰۰ برس ق م سے موجودہ الیکٹرانک دور تک کے تمام مواصلاتی ذرائع کی حقیقت پر گہری نظر رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بڑا اہم کام ڈاکٹر پرویز نے کر دکھایا ہے۔ یہ کتاب اپنے مصنف کی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس کا مطالعہ صحافیوں، طالب علموں اور اردو کے عام قاری کے لئے نہایت فائدہ مند ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی یہ تبصراتی کتاب اس لئے اہم ہو جاتی ہے کہ اگر ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کی کتاب تک رسائی نہ ہو سکے تو یہ کتاب قاری کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔

....

- **کتاب: پشاور کی کہانیاں اور نذیر فتح پوری مصنف: مناظر عاشق ہرگانوی ص: ۳۲ قیمت: ۵۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۲۵**

۱۶ ردسمبر ۲۰۱۴ء کو پاکستان کے شہر پشاور میں طالبان کے ہوئے دہشت گردانہ حملہ سے متاثر ہو کر نذیر فتح پوری نے آرمی اسکول کے بچوں کے تعلق سے دو کہانیوں کا مجموعہ ''پشاور حملہ'' شائع کیا ہے۔ زیر نظر کتابچہ اسی کہانیوں کے مجموعہ پر ایک تبصراتی تحریر ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے ''پشاور حملہ'' میں شامل سبھی سترہ کہانیوں پر مختصراً اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ ان تمام سترہ کہانیوں میں دہشت گردوں کے ظلم اور بربریت کا ذکر ہے اور ساتھ ہی کبھی کسی بچے کی ہمت اور بہادری کی تفصیلات ہیں۔ کبھی کسی تجربہ کار خاتون ٹیچر کی حکمت عملی کا ذکر ہے تو کسی کہانی میں کسی نوعمر خاتون ٹیچر کی عقل مندی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ہر ایک کہانی نذیر فتح پوری کی دہشت گردی سے نفرت اور ان کے احتجاجی رویے کا مظہر ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی نے اس میں شامل تمام سترہ کہانیوں کی ایک طرح سے تلخیص پیش کر کے پڑھنے والوں کے لئے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔

ان کہانیوں کے علاوہ پاکستانی شاعروں تنویر قاضی، یونس صابر، اسلام اعظمی اور شاہد شیدائی کی نظمیں بھی شریک کی گئی ہیں۔ یہ تمام نظمیں اسی پشاور کے آرمی اسکول پر دہشت گردانہ حملے سے متعلق ہیں۔ ان نظموں سے عوام کے رنج وغم اور شاعروں کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اخیر میں مناظر عاشق ہرگانوی نے اس سلسلہ کی اپنی ایک نظم کا بھی ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے، جس وحشیانہ ماحول کی عکاسی تمام کی تمام کہانیاں کرتی ہیں، شعراء کی نظمیں بھی انہیں جذبات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی نے نذیر فتح پوری کی دہشت گردی کے تعلق سے ان کی کہانیوں پر اپنے خیالات اور تاثرات کا جس طرح اظہار کیا ہے اسے تنقید یا تبصرہ قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا ہے۔ یہ محض ان کا اپنا تاثر ہے، جو کتابچہ کی شکل میں قارئین کے سامنے ہوگا۔ اسے ایک اچھی کوشش صرف اس لئے کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے نذیر فتح پوری کی تمام تر کہانیوں کا اختصار بیان کر کے کہانی پڑھنے والے شائقین کی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔

طباعت، کمپوزنگ اور گٹ اپ بہتر ہے۔ ۳۲ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۵۰/روپے قدرے گراں گذرتی ہے۔

....

● **نام کتاب: ارشد میناگری کی شاعری کے نئے اُفق مصنف: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی ص: ۱۲۸ سال: ۲۰۱۵ء قیمت: ۱۵۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۲۵**

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے قادر الکلام شاعر جناب ارشد میناگری کی شاعرانہ عظمتوں کا احاطہ کرتے ہوئے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ارشد میناگری کی مختلف شعری اصناف مثلاً نعت، قطعات، سہرا، ماں اور عید کے تعلق کی نظموں وغیرہ پر الگ الگ مضامین لکھ کر ان کی فنی و علمی افادیت پر بحث کی ہے۔ نعت گوئی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ارشد میناگری کی نعتیہ نظم، نعتیہ رباعیاں، نعتیہ قطعات، نعتیہ دوہے، نعتیہ دوہا گیت وغیرہ کو جدت طرازی قرار دیا گیا ہے۔ ارشد میناگری نے ہر صنف سخن میں نعت کہی ہے حتیٰ کہ کئی جاپانی اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اسی طرح قطعات کی معنویت اور مفاہیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر موصوف رقم طراز ہیں کہ ارشد میناگری نے شعری موقف سے واقف کرانے اور فکر واحساس کی نئی دنیا آباد کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔'' ارشد میناگری نے جن موضوعات کو قطعات کے فارم میں برتنے کی کوششیں کی ہیں اس کی مکمل تفصیل بیان کی گئی ہے۔ حمدیہ، نعتیہ، منقبتی و دیگر موضوع کے قطعات ارشد میناگری کے شاعرانہ عظمت کا حصہ بنے ہیں۔ قومی یکجہتی کے حوالے سے ارشد میناگری کی نظموں، یکجہتی غزلوں، گیت، رباعیات، قطعات دوہے وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح عید اور ماں کے تعلق سے ارشد میناگری کے شعری اظہار کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے اور جا بجا حیرت کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ ارشد میناگری نے ان تمام موضوعات کو شاعری کے مختلف فارم میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے حتیٰ کہ ہائیکو، ترائلے، چوبولے، تروینی، کنڈلی، دوہکا، دوپدے، تکونی، کجری، واکا، پنج بھجی، کاتا اوتا، تنکا اور میڈوکا جیسی نامانوس اصناف سخن میں بھی اپنی پوری شاعرانہ اور فنی بصیرت کے ساتھ برتا ہے۔

اردو میں سہرا اور تہنیتی نظموں کا رواج بہت قدیم نہیں ہے۔ کتاب کے آخری مضمون ''اردو میں سہرے کی معنویت اور ارشد مینا نگری کے سہرے'' میں سہرا کے تعلق سے اس کے آغاز کی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''فیروز اللغات'' ''نور اللغات'' اور ''فرہنگ آصفیہ'' کے حوالے سے لفظ سہرا کے معنی تلاش کیے گئے ہیں۔ یہ بھی قیاس آرائی کی گئی ہے کہ لفظ ''شوہرہ'' یعنی خاوند کی نسبت رکھنے والا لفظ ''شہرہ'' آیا اور پھر وہ کثرت استعمال سے سہرا ہوگیا۔ مختار ٹونکی کے حوالے سے کہا گیا کہ عرب اور عجم میں سہرے کا رواج نہیں تھا اس لئے عربی اور فارسی کی قدیم لغات میں یہ لفظ نہیں ملتا۔ یہ بھی انکشاف دلچسپ ہے کہ غالب اور ذوق کے سہروں سے قبل سہرے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان کے مطابق آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دور میں سہرا نویسی کو زیادہ فروغ ملا۔ شہزادہ مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر غالب اور ذوق کے سہروں کا بھی ذکر کرتے ہوئے ان کے مابین شعری نوک جھونک بھی بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق سہرا اور تہنیتی نظموں کا چلن اس زمانے کے بعد ہی زیادہ دیکھنے کو ملا۔ جہاں اسلامی شریعت نے نکاح کو ایک متبرک اور پاکیزہ عمل قرار دیا وہیں شعرائے کرام نے اس کی پاکیزگی کو اشعار میں ڈھال کر سماج کے سامنے پیش کرنے کا کام کیا اور اس طرح یہ ایک شعری صنف بھی قرار پائی۔ اس سلسلہ میں ناسخ، ذوق، غالب، ریاض، بیخود دہلوی، انور صابری، جمیل مظہری، فیض، احمد فراز، مظہر امام، اعجاز صدیقی، مظفر حنفی، اعزاز افضل وغیرہ جیسے معروف شعرائے کرام کے کہے گئے سہرا کے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ ارشد مینا نگری نے سہرا غزل، سہرا گیت، سہرا قطعہ، سہرا ثلاثی میں طبع آزمائی کر کے سہرا گوئی میں سبقت حاصل کر لی ہے۔ یقیناً شادی کے موقع پر چھپنے والے کتابچوں کے مقابلے میں ارشد مینا نگری کے باضابطہ اس فن کو ایک فنی درجہ عطا کرنے میں اولیت حاصل ہوگئی ہے۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے زیر تبصرہ کتاب لکھ کر ارشد مینا نگری کی شاعرانہ عظمت کی تفہیم کا ذریعہ پیدا کر دیا ہے اس کتاب کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

....

● نام کتاب: جنوں خواب شاعر: فراغ روہوی ص: ۱۷۶ قیمت: ۱۰۰ روپے سال: ۲۰۱۳ء
ناشر: گلستاں پبلی کیشنز، ۶۷، مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کلکتہ-۷۳ مبصر: ابو اللیث جاوید، نئی دہلی-۲۵

فراغ روہوی اردو کی نئی نسل کے ایک اہم شاعر ہیں۔ اردو شاعری سے ان کی وابستگی والہانہ ہے۔ یہ بات اس طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۸۵ء میں ہوئی اور ۲۰۱۳ء تک ان کے چھ مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آگئے۔ زیر نظر مجموعہ ''جنوں خواب'' ان کی خوبصورت رباعیوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ محترم ناوک حمزہ پوری نے بھی انہیں اپنے ان قیمتی الفاظ سے متعارف کرایا ہے۔ ''جناب فراغ جواں سال شاعر ہیں اور ان کی شاعری کی عمر بھی کچھ بہت زیادہ نہیں لیکن قلیل مدت میں متعدد اصناف سخن پر انہوں نے جیسی اور جتنی دسترس حاصل کر لی ہے وہ قابل تعریف اور لائق ستائش ہے۔ ان کے کلام کے جو نمونے میرے مطالعے میں آئے ہیں ان کے پیش نظر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زبان و بیان کی باریکیوں اور نزاکتوں اور اظہار کی نفاست و شائستگی کا انہیں بخوبی عرفان حاصل ہے۔'' فراغ روہوی کے متعلق مراق مرزا یوں رقم طراز ہیں۔ ''عصر حاضر میں افق ادب پر اپنی

ایک منفرد اور پروقار شناخت رکھنے والے مثبت فکر شاعر فروغ روہوی بھی چراغ باطن کی روشنی میں گذشتہ کئی دہائیوں سے مصروفِ سفر ہیں۔" یہ طے شدہ امر ہے کہ فراغ روہوی کا ذہنی سفر اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اپنی ذہنی اور فنی پختگی کا ثبوت یقیناً وہ اپنی رباعیوں کے اس مجموعہ کے ذریعہ دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

قدیم ادبی روایت اور تہذیب کے تحت اس مجموعہ کی ابتدا حمدیہ اور نعتیہ رباعیوں سے ہوئی ہے۔ ان دونوں قسم کی رباعیوں سے ان کی ایمانی پختگی اور دینی استحکام کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اشعار ان کے عقیدے اور عقیدت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس مجموعہ میں شریک تمام رباعیوں کو دیارِ جاہ وجلال، دیارِ خوش خصال، دیارِ کمال، دیارِ جمال اور دیارِ بے مثال کے عنوانات کے تحت درج کیا گیا ہے۔

دیارِ جاہ وجلال کے تحت ۴۶ رحمدیہ رباعیاں، دیارِ خوش خصال کے تحت ۳۸ رنعتیہ رباعیاں، دیارِ کمال کے تحت ۲۸۳ رر باعیاں، دیارِ جمال کے تحت ۲۳ رر باعیاں اور دیارِ بے مثال کے تحت ۱۲ رر باعیاں یعنی کل ۴۱۲ رر باعیاں اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ان تمام رباعیوں کے مطالعہ سے فراغ روہوی کی فنی مہارت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ یقینی طور پر ان کی تخلیقی صلاحیت انہیں عالمی شہرت یافتہ رباعی گو شعراء کے صف میں کھڑا کردیتی ہے۔ دیارِ جاہ وجلال اور دیارِ خوش خصال کے زمرے میں لکھی گئی ان کی رباعیاں ان کی دلی کیفیتوں (ایمانی پختگی اور عقیدت کی سرشاری) کی غمازی کرتی ہیں۔ چند مثالیں:

دیارجاہ وجلال:

اک مرکزِ توصیف وثنا ہے صاحب — موجود کوئی راہ نما ہے صاحب
اللہ رے خورشید و قمر کی گردش — یہ ہم پہ عیاں ہے کہ خدا ہے صاحب

دیارخوش خصال:

اک مصحفِ کامل ہے رُخِ شاہِ اُممؐ — توصیف کے قابل ہے رخِ شاہِ اُممؐ
جس نور پہ ٹھہری نہیں موسیٰ کی نظر — اس نور کا حامل ہے رخِ شاہ اُممؐ

'دیارِ کمال' کے تحت آدمؑ، حواؑ، حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے بیانات کے ساتھ ساتھ دنیا کی تخلیق اور دنیاوی زندگی کے مصائب وآلام، جنت، دوزخ، اچھے عمل، انجام وغیرہ کا نہایت خوبصورتی سے شعری اظہار کیا گیا ہے۔ ساری رباعیاں انہیں موضوعات کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ 'دیارِ جمال' میں حسن وعشق، زندگی کی بہت ساری تلخ و شیریں یادیں، محویت، سرشاری وغیرہ کا بیان ہے۔ اس طرح 'دیارِ بے مثال' میں زبان اردو، میر تقی میر، غالب، اقبال، شہر کلکتہ اور تاج محل کے حوالے سے رباعیاں شامل ہیں۔ چند مثالیں:

کہنے کو یہاں کون سخنور نہ ہوا — شاعر تو ہوا، صاحب گوہر نہ ہوا
چھوٹا تو بڑی بات ہے تجھ کو غالب — ایک بھی ترے سائے کے برابر نہ ہوا

ہے یا کہ نہیں شہر خوش کلکتہ — دیکھے تو ذرا آکے کوئی کلکتہ

ہرگز نہ اسے کوئی بھلا پائے گا　　دکھلائے گا وہ زندہ دلی کلکتہ

فراغ روہوی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے رباعیوں کے ذریعہ اپنے تمام تر زندگی کے تجربات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ یہ ساری کاوشیں ان کی تابناک مستقبل کی خوش آئند خبریں دیتی ہیں۔ انہوں نے اپنی بھرپور تخلیقی توانائی کے ساتھ ان رباعیوں کی تخلیق کی ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق بھی ہیں۔ اس مجموعہ سے قبل انہوں نے ماہیئے، غزلوں، نعتیہ کلام اور بچوں کے لئے نظموں کے مجموعے منظر عام پر لائے ہیں۔ ان کے پچھلے تمام مجموعہ ہائے کلام کے مقابلے میں زیر تبصرہ ان کی رباعیوں کا مجموعہ زیادہ عمدہ اور زیادہ اہم ہے۔ ان کی رباعیوں سے ان کی بھرپور شعر کہنے کی صلاحیت عیاں ہوتی ہے اور انہیں اردو کا ایک معتبر شاعر ہونے کا شرف بھی عطا ہوتا ہے۔

مجموعہ کا سرورق نہایت خوبصورت ہے جس پر جام و مینا، کتابیں اور یک تارا ساز کا نقش ابھرتا ہے۔ ساتھ میں جس شاعر نما شخص کی تصویر ابھرتی ہے اس پر عمر خیام کے ہونے کا گمان ہوتا ہے جو رباعیوں کے مجموعہ کے مناسب ہے۔ بہت مناسب ہے کتاب کی کمپوزنگ، طباعت اور گٹ اپ بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ اس کتاب کی پذیرائی اردو ادبی حلقوں میں یقینی ہوگی۔

....

● **نام کتاب: کوئی چاند نہیں تھا سرآسماں (افسانوی مجموعہ) افسانہ نگار: فاروق راہب اشاعت: ۲۰۱۴ء ص: ۸۸ قیمت: ۱۵۰ ؍روپے ناشر: اردو فاؤنڈیشن کرلا ممبئی -۷۰ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی -۲۵**

فاروق راہب اردو کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔ اب تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ ان کے اٹھارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ہمیشہ کی طرح ان کے افسانے زندگی کی معنویت سے لبریز ہیں۔ ان کا نظریۂ حیات ان کی تحریروں کی طرح صاف وشفاف ہے۔ جس زمانے میں انہوں نے افسانہ نگاری کی ابتدا کی وہ زمانہ علامت نگاری کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان کے تقریباً تمام افسانے اسی علامت نگاری کے عکاس تھے۔ اس طرز نگارش میں انہیں اسی وقت کامیابی مل گئی تھی۔ انہوں نے جس قدر بھی زندگی کے دکھ سکھ کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے علامت نگاری کا ہی سہارا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ماجرہ سازی یا کہانی پن کی تلاش محض عبث ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ جدیدیت کی تحریک نے اردو شاعری اور افسانہ نگاری میں ایک قسم کی بے راہ روی پیدا کردی تھی۔ دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں اس کی آندھی سو سال قبل ہی ختم ہوگئی تھی مگر اس کے بے ہنگم جھونکے اردو ادب میں دیر سے محسوس کیے گئے۔ جو بھی اس تحریک نے شاعری کو ضرور فائدہ پہنچایا اور ایک نئی شاعری کی زبان وجود میں آگئی۔ جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے افسانوں کی ہیئت میں ضرور تبدیلی رونما ہوگئی۔ کچھ موثر انداز بھی اپنائے گئے مگر ناقدوں کے ایک بڑے طبقے نے اس دور کے افسانوں کو ادبی تخلیق ماننے سے ہی انکار کردیا۔ افسانوی ادب میں کچھ بڑے کارنامے رونما ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں اردو شاعری کا عروج ضرور ہوا۔

جدیدیت کا زور زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور آخر کار افسانوں کا بیانیہ انداز واپس لوٹ آیا اور افسانہ نگاروں کا ایک قابل لحاظ طبقہ اس سے وابستہ ہوگیا۔ فاروق راہب کے زیر نظر مجموعہ میں اس بات کی صاف جھلک نوٹس کی جاسکتی ہے۔ اس مجموعہ کے چند افسانوں جیسے ''بلندیوں سے نیچے''، ''ڈھلان پر ٹھہرے ہوئے لوگ''، ''کرم جلی''، ''پرندے'' اور ''انتہا سے پہلے'' میں جنسی تشنگی کا ضرور ذکر ملتا ہے لیکن فحش نگاری قطعی نہیں ہے۔ افسانوں میں انسانی زندگی میں پائے جانے والے نشیب وفراز کا اکثر تذکرہ ہے اور ذہنی الجھنوں کی حکمرانی کا نوحہ بھی۔ یہ افسانے سماج میں چل رہے رسم ورواج، افراتفری، خوف وہراس، لاقانونیت اور عدم تحفظ کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ زبان ان افسانوں کی خوبصورت اور رواں دواں ہے۔ اس مجموعہ کا فاروق راہب اپنی نئی توانائی کے ساتھ زبان وادب کے معیار کو بلند کرتا نظر آتا ہے۔

مجموعہ نہایت خوبصورت ہے۔ ہر اعتبار سے اردو فاؤنڈیشن ممبئی نے ہر بار کی طرح یہ مجموعہ بھی اپنی پوری توجہ سے شائع کیا ہے۔ مجموعہ کی قیمت واجبی ہے اور اردو قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں مانع نہیں ہوگی۔ اس مجموعہ کی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہئے۔

....

● نام کتاب: تحریر (شعری مجموعہ) شاعر: ڈاکٹر عبدالحق امام ص: ۱۲۸ قیمت: ۱۲۰ روپے
اشاعت: ۲۰۱۵ء رابطہ: محلہ مرزاپور، پوسٹ گیتا پریس، گورکھپور-۲۷۳۰۰۵ مبصر: ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

زیر تبصرہ شعری مجموعہ ''تحریر'' ڈاکٹر عبدالحق امام کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ''آہنگ رباعی''، ''تمثیل''، ''بزم عرفان'' اور ''نیرنگ رباعی'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے مطابق آہنگ رباعی میں ۳۰۰ اور نیرنگ رباعی میں ۷۸۰ رباعیاں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ۹۰۰ سے زائد رباعیوں پر مشتمل چھٹا مجموعہ کلام ''گلرنگ رباعی'' کے نام سے مجوزہ ہے۔ اس طرح تقریباً تین ہزار رباعیاں انہوں نے کہیں ہیں جو فی الوقت یقیناً ایک ریکارڈ ہے۔ زیر نظر مجموعہ کے پیش لفظ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' میں انہوں نے اپنی زود گوئی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''میری کوئی غزل ۳۵ اشعار سے کم نہیں ہوتی تھیں۔ اور زیادہ سے زیادہ ۵۰، ۸۰ اور ۱۰۰ اشعار سے اوپر تک پہنچ جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۷ء تک چلتا رہا۔ میرے پاس طویل غزلوں کا مجموعہ ہوگیا تھا لیکن میں اسے کچھ بانٹ دیا اور کچھ فروخت کردیا اور جو ابتدائی دور کی غزلیں تھیں اس میں سے کچھ چھانٹ کر رکھ لیا باقی سب ضائع کردیا۔ میرا خیال ہے کہ کسی شاعر نے اپنی شعرگوئی کے حوالہ سے ایسے دعوے نہیں کئے ہوں گے۔ اساتذہ شعراء کرام نے بھی شاید اپنی زود گوئی کے تعلق سے ایسا برملا تحریری دعویٰ کبھی نہیں کیا ہوگا۔ کسی بھی تخلیق کار کے لئے اپنی ہی تخلیق کو کاٹنے، چھانٹنے، فروخت کرنے اور بانٹنے کی بات کرنا بڑا ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ یہی نہیں اس مجموعہ میں تعلّی کے بے شمار اشعار شامل ہیں۔ چند مثالیں:

قدم ہم نے جو راہِ فکر میں اپنا سنبھالا ہے — امامِ فن ہمیں کہتے ہیں سب نقدو نظر والے

جو ناواقف ہیں فن شاعری سے — امام اب اہل فن بنتے وہی ہیں

کوئی پڑھ کر نکل جائے تو جانیں — امام فن یہاں بیٹھے ہوئے ہیں

روایت کی پاسداری کرتے ہوئے مجموعہ کی ابتدا حمد اور نعت شریف سے کی گئی ہے۔ حمد کے اشعار شاعر کے خانہ کعبہ کی حاضری سے متعلق ہے۔ جو مجموعہ کی ابتدا کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ یہ مجموعہ کل ۰ ۷ رغزلوں اور متعدد متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ چند غزلیں طویل ہیں۔ لب ولہجہ میں روایتی انداز اور مضامین فرسودہ ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں فرماتے ہیں شاعری قدیم اور جدید نہیں ہوتی مگر شاید وہ بھول گئے ہیں کہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت نے اردو ادب کو کیا کیا عطا کیا ہے۔ اسی لئے تو روایتی اور جدید الفاظ کی اصطلاحیں ہر جگہ لکھی جاتی ہے۔ آج کا ادب قدیم ادب سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ یقیناً شاعری قدیم اور جدید ہوتی ہے۔ آج نئے لفظیات اور نئے استعاروں، نئے اشارے کنایوں کے ساتھ شاعری کی جارہی ہے اور اکثر لکھنے کا بھی انداز بالکل الگ ہوگیا ہے۔ شاعری ایک فطری عمل ہے جسے کسی علم کی طرح نہیں سیکھا جاسکتا ہے۔ شاعر سماج کا ایک نہایت ہی حساس فرد ہوتا ہے۔ جس کی نظر صرف انسان کی زندگی پر ہی نہیں ہوتی بلکہ قدرت کی تمام نیرنگیوں کا اسے ادراک ہوتا ہے۔ اپنے جذبات کا اظہار وہ اپنے اشعار کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس لئے جتنے خوبصورت اس کے جذبات واحساسات ہوں گے اتنے ہی خوبصورت اس کی شعری تخلیقات بھی ہوں گی۔ شاعری قافیہ پیمائی یا تک بندی کا نام بالکل نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر کا خون جگر شامل ہوتا ہے تب جاکر موثر شاعری ہوتی ہے۔

اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوتی ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق امام میں شعر کہنے کی صلاحیت موجود ہے مگر ایک اچھے رہنما کی رہنمائی شاید حاصل نہیں ہے۔ ساتھ ہی ادب کے Modern Trend پر ان کی نظر نہیں ہے۔ اگر یہ دونوں کارنامے انجام دے سکیں تو ان کے اندر کا فنکار ایک اچھا شاعر بن سکتا ہے۔ مجموعوں کی اشاعت میں عجلت سے کام لینا بھی کبھی کبھی بہت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق امام کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ان کے پانچ مجموعوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ انہیں اپنی شاعری میں عصری حسیت، نئی لفظیات، نئے استعاروں کے استعمال پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ لفظوں کے نئے معنی تلاش کرنا آج کی شاعری کا مزاج ہوگیا ہے اس ضرورت کو مدنظر رکھ کر انہیں شعر تخلیق کرنا چاہئے۔ ''تحریر'' عوامی سطح پر مقبول ہوگا لیکن ان کی کوشش خاصی سطح کو متاثر کرنے کی ہو نا ان کے لئے سودمند ثابت ہوگا۔ یہ مجموعہ کمپوزنگ، طباعت، سرورق کے اعتبار سے بہت خوبصورت ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ اس کی پذیرائی ہونا یقینی ہے۔

....

● **نام کتاب: ذرے کا تکون (ہائیکو) شاعر: اکبر حسین اکبر ص: ۱۲۴ قیمت: ۸۱روپے**
اشاعت: ۲۰۱۵ء ناشر: گلستاں پبلی کیشنز، کلکتہ-۷۳ مبصر: ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

زیر تبصرہ کتاب ''ذرے کا تکون'' اکبر حسین اکبر کے ۳۴۹ ر ہائیکو کا مجموعہ ہے۔ ہائیکو جاپانی صنف سخن ہے جس میں عموماً قدرت کی دلفریبیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کے اصناف کی طرح سے جاپانی صنف سخن ہائیکو بھی اردو میں داخل ہوتی۔ اسے اردو کے قالب میں ڈھالنے کا سحر اٹوکیو یونیورسٹی کے دو اساتذہ قاری سرفراز حسین اور پروفیسر نورالحسن برلاس کے سر جاتا ہے۔ جن کے تعاون سے شاید احمد دہلوی نے پہلی دفعہ ۱۹۳۲ء

میں اپنے رسالہ ''ساتھی'' کے جاپان نمبر میں اسے اردو قارئین کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس کے بعد متعدد شعراء کرام نے اس صنف پر طبع آزمائی کی۔ علیم صبا نویدی پہلے اردو کے شاعر ہیں جن کا ہائیکو کا مجموعہ ''ترسیلے'' ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے بعد یکے بعد دیگرے کئی شعرا کرام کے مجموعے منظر عام پر آئے۔ اور اس طرح یہ صنف سخن اردو شعری ادب کا ایک اہم حصہ بن گئی۔

اکبر حسین اکبر ایک کہنہ مشق غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے غزلوں کے دو اور قصائد کا ایک مجموعہ قبل ہی منظر عام پر آچکا ہے جس کی ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی ہوئی ہے۔ فن ہائیکو گوئی کی طرف مائل ہونے کی وجہ انہوں نے معروف شاعر فراغ روہوی کی حوصلہ افزائی بتایا ہے۔ زیر تبصرہ مجموعہ میں جاپانی ہائیکو کی روایت کے بموجب صرف قدرتی مناظر، موسم کی دلکشی کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ اردو شاعری کے مزاج کے مطابق ادبی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی موضوعات کو بھی سمویا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی بائیس ہائیکو حمد یہ ہیں:

سب میرا ہے سب
جس نے کہا ہے خلق مجھے
اس کا نام ہے رب

اس کے بعد نعتیہ اور تہنیتی ہائیکو ہیں:

نجار ہے نکلا نور	چل بھیا، اس گاؤں
اسی کو اک دن ہونا تھا	عربی سمندر دھوتا ہے
دنیا کا دستور	حاجی علیؒ کا پاؤں

اکبر حسین اکبر نے میرؔ، غالبؔ، کبیر داسؔ، منٹوؔ، عصمتؔ چغتائی، منشی پریم چند، ابن صفی، کالی داس اور ناقدین نے بھی اپنی عقیدت احترام کا اظہار کیا ہے۔ ان ہائیکو کے ذریعہ زندگی کی مختلف بنتی بگڑتی تصویروں کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ زندگی کے مسائل، انسان کی طرح طرح کی سوچ، اور دعووں کے کھوکھلے پن کا بیان ان میں صاف طور پر نظر آتا ہے:

کیا شہ زوری ہے	دل تو بلکتا ہے
جاں پانی ڈوبی ہوئی	جب تہذیب کے زخموں سے
نمک کی بوری ہے	خون ٹپکتا ہے

اکبر حسین اکبر قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے ہائیکو کے آئینہ سے زندگی کو دیکھنے کی بلیغ کوشش کی ہے جس میں وہ بے حد کامیاب بھی ہیں۔ ان کی اس تخلیقی کوشش دیکھ کر یہ امید بندھتی نظر آتی ہے کہ اردو کے دوسرے شعراء بھی قطعات اور رباعیات کی طرح اس میں طبع آزمائی ضرور کریں گے اور میرے خیال میں ہائیکو بہت حد تک موثر بھی ثابت ہوگی۔ اس مجموعے کے لئے میں ذاتی طور پر اکبر حسین اکبر کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجموعہ نہایت خوبصورت ہے۔ اس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

● نام کتاب: مباحث ومحاکے مصنف: ابوذر ہاشمی ص: ۳۵۰ قیمت: ۱۸۸ روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی-۱۱۰۰۹۵ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۲۵

''مباحث ومحاکے'' ابوذر ہاشمی کے اردو شاعری کے حوالے سے تیس مقالوں پر مشتمل ایک نہایت خوبصورت ادبی وعلمی ذخیروں کا مجموعہ ہے۔ تمام مقالے اردو نظم گوئی سے متعلق ہیں۔ سب سے زیادہ اہم بات اس مجموعہ کی یہ ہے کہ اس میں کبیر داس سے لے کر جدید شعراء کرام تک کی نظم گوئی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دیگر غزل گو شعراء میں مرزا جان طپش، غالب، حسرت موہانی، وحشت لکھنوی، عبدالعلیم آسی، فیض، لطف الرحمن، رونق نعیم، اعزاز افضل، نصر غزالی، قیصر شمیم، محمد سالم اور سالک لکھنوی کے فن غزل گوئی پر بہت ہی باریک بینی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مجموعہ کا اہم موضوع اردو نظم ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اقبال، فیض، میراجی، پرویز شاہدی، کیفی اعظمی، اسلم بدر، علقمہ شبلی کی نظموں کے تعلق سے نہایت فکری، علمی وتحقیقی بحثیں کی گئی ہیں۔ ان بحثوں میں ابوذر ہاشمی کی ژرف نگاہی، محققانہ صلاحیتوں اور فنی پیچیدگیوں کے ادراک کا علم ہوتا ہے۔ مغربی بنگال کا ادبی منظر نامہ ہمیشہ ان بحثوں کے پس منظر میں رہا ہے۔ غالب کی غزلوں پر باتیں کرتے ہوئے نساخ اور وحشت کا ذکر ناگزیر ہو گیا ہے اور عہد غالب اور غالب کے قیام کلکتہ میں رونما ہونے والے حالات کا بہت خوبصورتی سے ذکر کیا گیا ہے۔ ان تمام تر تفصیلات سے آج کی نسل شاید بے بہرہ ہے اور غالب کی شاعری ان کے اس قیام سے کس قدر متاثر ہوئی ہے۔ یہ امر بہت اہم ہے۔ غالب، نساخ اور وحشت کے حوالے سے جتنی بھی حقیقتوں کا انکشاف کیا گیا ہے وہ ایک ادبی سرمایہ ہے جس کی قدر کی جانی چاہئے۔ اس سلسلہ کے مضامین میں مرزا جان طپش، غالب اور اہل بنگالہ اور غالب شناسی، تضادات کے پس منظر میں، قابل ذکر ہیں جس کا مطالعہ بے حد معلوماتی اور سودمند ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کا اردو ادب کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے ابوذر ہاشمی کا یہ بیان کہ ٹیگور کا خاندان وحدانیت کا قائل تھا ان کے دادا اور والد فارسی داں تھے سو فیصد سچ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ٹیگور کے کانوں میں حافظ اور رومی کے کلام بچپن سے رس گھولتے رہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بالغ النظری عطا کی۔ حافظ سے ان کی ذہنی وابستگی کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ٹیگور حافظ کے مزار تک کھنچے ہوئے ایران چلے گئے اور اپنی عقیدتوں کے پھول چڑھا آئے۔ اردو ادب میں ٹیگور کو نہایت ادب واحترام سے تسلیم کیا گیا اور ان کے تمام فنون بشمول شاعری، ناول نگاری، افسانہ نگاری، ڈراما نگاری، اداکاری، گیت کاری، موسیقی، مصوری وغیرہ پر خصوصی سیمینار، سمپوزیم اور تحقیق کئے گئے۔ ان کی بنگلہ نظموں میں خصوصیت کے ساتھ گیتانجلی کا اردو ترجمہ سب سے پہلے نیاز فتح پوری نے 1914 میں کیا۔ ان کے بعد عبدالرحمن بجنوری، عبدالعزیز خالد، ایم ضیاالدین، فراق گورکھپوری، مالک رام، شاہنواز زیدی نے بھی ٹیگور کی بیشتر نظموں اور گیتانجلی کا ترجمہ کیا۔ کچھ براہ راست بنگلہ زبان سے ترجمے کئے گئے لیکن زیادہ تر انگریزی ترجموں سے اردو میں منتقل کئے گئے۔ ٹیگور کی عظمت اردو میں بھی مسلم ہے۔ اقبال اور ٹیگور کی شاعری میں مماثلت کے چند پہلو اور دونوں کے تقابلی مطالعے بھی نہایت عالمانہ انداز میں کئے گئے ہیں۔ یہ مطالعہ اور یہ سارے ادبی ماجرات کی بازیافت بھی ابوذر ہاشمی نے بہت خوبی کے ساتھ کی ہے۔ جس کے لئے میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

''مباحث ومحاکے'' ایک نہایت دقیق ادبی تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو کے طلباء کو مصنف کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اتنی گہری حقیقتوں کو کتنی آسانی سے ان کے لئے مہیا کر دیا ہے۔ کتاب خوبصورت اور قیمت بھی واجبی ہے۔ اس کتاب کو ہر حلقہ میں گرم جوشی سے ویلکم ملنا چاہئے۔ قیمت واجب ہے۔

☆☆☆

● **نام کتاب: فکر و نظر (تنقیدی مضامین) مصنف: شاہد اقبال ص: ۱۴۴ قیمت: ۷۰ر روپے**
اشاعت: ۲۰۱۵ء ناشر: مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ-۱۶ مبصر: ابواللیث جاوید (نئی دہلی)

''فکر و نظر'' شاہد اقبال کے بارہ تنقیدی مضامین کا ۱۴۴ ر صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت مجموعہ ہے جسے مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے شائع کیا ہے۔ مصنف کے مطابق یہ تمام مضامین کسی نہ کسی سیمینار میں پڑھے گئے ہیں اور کسی کتاب میں بھی شامل ہیں۔ مصنف نے نہایت انکساری سے کام لیتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے یہ وہ ابھی ادب کے ادنیٰ طالب علم ہیں اور اس لئے یہ مضامین لکھے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعہ میں شامل تمام مضامین بہت محنت اور تنقیدی سوجھ بوجھ کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اس لئے ہمیں مصنف میں صحیح ادبی تشنگی اور تلاش و جستجو کا مادہ بدرجہ اتم نظر آتا ہے اور یہ توقع بندھتی ہے کہ مستقبل قریب میں ایک روشن ستارہ افق ادب پر نمودار ہونے والا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل مضامین ادب کی مختلف اصناف جیسے شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، قصیدہ نگاری اور فلم کی نغمہ نگاری کا احاطہ کرتے ہوئے قاری تک بہت اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ''اقبال اور فلسفۂ عشق'' میں علامہ اقبال کی شاعری کے بہت ہی اہم گوشہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ عشق دراصل بندے کو خدا سے ملا دینے کا فلسفہ ہے اور اسلامی نظریۂ حیات سے قریب تر ہے۔ یہ مضمون اس امر کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اسی طرح منشی پریم چند، صغریٰ سبزواری، فراغ روہوی، ڈاکٹر دبیر احمد، اصغر انیس اور ہندوستانی فلموں میں اردو کے حوالے سے ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب کی نثر نگاری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا تمام تخلیق کار اپنے اپنے میدان کے شہرت یافتہ لوگ ہیں۔ جہاں افسانوی ادب میں منشی پریم چند کا اعلیٰ ترین مقام ہے وہیں صغریٰ سبزواری مغربی بنگال کی ایک نامور اور قابلِ قدر افسانہ نگار تھیں۔ صغریٰ سبزواری کے حوالے سے ایک مضمون اس مجموعہ میں شامل ہے جو بہت معلوماتی ہے۔ ان کی ادبی خدمات اور قیمت سے بیرون بنگال میں زیادہ سے زیادہ متعارف کرانے کی ضرورت ہے جو کچھ حد تک شاہد اقبال نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ منٹو کی ڈرامہ نگاری پر زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا ہے اور نہ ہی ناقدین ادب اس طرح زیادہ متوجہ بھی ہوئے مگر حقیقت یہ ہے کہ منٹو نے اپنی آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۳ء) کے دوران تقریباً سو سے زاید ہی ڈرامے لکھے ہیں جن کی کتابی شکل کے مجموعوں کی تعداد سات تک پہنچتی ہے۔ قصیدہ نگاری کے حوالے سے کیف الاثر جن کا تعلق مٹیابرج سے تھا کا ذکر بھی ناگریز ہے۔ قصیدہ گوئی کا فن سلاطین کے دور میں بے حد پروان چڑھا مگر ان کے زوال کے بعد شعراء کرام کی توجہ قدرے کم ہوگئی۔ نواب واجد علی شاہ جب کلکتہ میں وارد ہوئے تو مٹیابرج میں لکھنؤ کی قابل لحاظ آبادی ان کے ساتھ

منتقل ہوگئی۔ مٹیا برج کی حیثیت لکھنؤ ثانی جیسی ہوگئی اور لکھنؤ کی وہی بارونق محفلیں یہاں بھی سجنے لگیں۔ اور یہاں آنے والے شعراء کرام نے نعتیہ قصیدہ خوانی کا آغاز کردیا۔ انہیں شعراء میں کیف الاثر بھی شامل تھے جنہوں نے علامہ اثر رودلوی تلمذ امیر مینائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ کیف الاثر نے صرف ۲۲ برس کی عمر میں ہی قصیدہ خوانی کی محفلوں میں دھوم مچادی۔ نعتیہ قصیدوں کا ان کا واحد مجموعہ ''ارمغان لطیف'' ملتا ہے۔ ان پر مضمون لکھ کر شاہد اقبال نے بڑا کام کیا ہے۔

ہندوستانی فلموں میں اردو زبان کے حوالے سے شہر یار کے فلمی نغموں میں ادبیت تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب ''ہندوستانی فلمیں اور اردو'' کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شامل اکثر مضامین پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ فلم اور اردو کے تعلق سے نظمیں بھی شامل ہیں جس سے کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی بے لوث اردو ادب کی خدمت کے جذبہ کے ہی نتیجہ میں فلموں میں اردو ادب کی تلاش وجستجو کا یہ سلسلہ شروع ہوا اور بہت سے اہل قلم حضرات نے اپنے نادرو نایاب خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فلم نے اردو زبان کو سرکاری تعصب کے باوجود زندہ ضرور رکھا ہے اور یہ زبان فلم والوں کی بہت بڑی مجبوری بھی بن گئی ہے۔ اس زبان کے بغیر کوئی فلم باکس آفس پر ہٹ نہیں ہوسکتی مگر افسوس ہے کہ امراؤ جان اور رضیہ سلطان جیسی فلموں کو بھی سرٹیفکیٹ ہندی زبان کا دیا جاتا ہے۔ اس ملک میں اردو زبان کبھی ختم نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ لاکھوں دلوں پر راج کرتی ہے اور کروڑوں زبان کا ذائقہ بن چکی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کے اس جذبۂ محبت (زبان کے لئے) کو میں سلام پیش کرتا ہوں۔

''فکر ونظر'' تنقیدی مضامین کا ایک خوبصورت اور قابل مطالعہ مجموعہ ہے۔ شاہد اقبال اسی طرح اپنی ادبی کاوشیں جاری رکھیں تو ان سے اور بہت بہتر ادبی شہ پاروں کی امید کی جاسکتی ہے۔ مجموعہ کا مطالعہ اردو ادب کے طلباء کے لئے نہایت فائدہ مند ثابت ہوگا۔ مجموعہ کی طباعت، گٹ اپ اور کمپوزنگ بہتر ہے اور قیمت واجب ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

....

- **نام کتاب: نامۂ نظیر (پروفیسر نظیر صدیقی کے خطوط) مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ص: ۹۶ قیمت: ۱۵۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۳ء ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۲۵**

''نامۂ نظیر'' اردو کے ایک معتبر شاعر، انشائیہ نگار، ناقد اور انگریزی کے کالم نگار پروفیسر نظیر صدیقی کے ۵۴ خطوط بنام ڈاکٹر امام اعظم کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر امام اعظم نے ترتیب دیا ہے۔ اس سے قبل بھی ڈاکٹر امام اعظم نے مظہر امام کے نام آئے ہوئے مرحوم مشاہیر کے خطوط کے۔ بعنوان ''نصف ملاقات'' کو ۱۹۹۴ء میں ترتیب دے کر منظر عام پر لایا ہے۔ ڈاکٹر موصوف خطوط نگاری کی اہمیت وافادیت کو خوب سمجھتے ہیں اس لئے اسے محفوظ رکھ کر آنے والی نسل کو ایک ادبی تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ آج جس طرح الیکٹرونک ذرائع ابلاغ کا استعمال عام ہوگیا ہے اور پیغام رسانی کا کام SMS، انٹرنٹ اور دیگر ذرائع انجام دے رہے ہیں یہ پختہ خیال ہے کہ آنے والے دنوں میں مکتوب

نگاری کے فن سے بھی لوگ بے بہرہ ہو جائیں گے اور حسب مراتب القابات کا بھی علم ان میں باقی نہیں رہے گا۔ الیکٹرانک ذرائع کے کثرت سے استعمال ہونے کی وجہ سے محکمہ ڈاک کی خدمات بھی متاثر ہوئی ہے اور اب محکمے پر سے عوام کا اعتماد بھی کم ہو گیا ہے اسی سبب کوریئر سروسز کا فروغ ہوتا جارہا ہے۔

مجموعہ میں شامل ۵۴ خطوط مئی ۱۹۹۵ء سے فروری ۲۰۰۱ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے ادبی سرگرمیوں کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ نظیر صدیقی کے تعلقات ہندوستان کے کن کن اہل قلم حضرات سے تھے اس کی پوری جانکاری ہو جاتی ہے اور پاکستان میں اردو ادب کے حوالے سے کیا کچھ کیا جارہا ہے اس کی تفصیل بھی مل جاتی ہے۔ کہیں کہیں نظیر صدیقی نے اپنی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ان کرم فرماؤں کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے ان کی کتابوں پر نہ تو کچھ اظہار خیال کیا ہے اور نہ ہی اس کی رسید بھی بھیجی ہے۔ یہ رویہ تو شاید ہر زمانہ میں تخلیق کاروں کے ساتھ روا رہا ہے۔ عام طور پر خطوط میں جن باتوں کا ذکر ہوتا ہے مثلاً مکتوب نگار کی صحت، ان کے رشتہ داروں میں کسی کی موت، مکتوب الیہ کی مزاج پرسی وغیرہ وہ ان خطوط میں قابل لحاظ طور پر ملتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب "نامہ نظیر" سے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی ادبی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ خطوط پر مشتمل اس طرح کے مجموعے نہایت کارآمد ہیں۔ ان کی اشاعت ہونی چاہئے۔ ڈاکٹر امام اعظم داد و تحسین کے یقیناً مستحق ہیں کہ انہوں نے خطوط نویسی کو اتنی اہمیت دے کر یہ مجموعہ شائع کرایا۔

مجموعہ خوبصورت چھپا ہے۔ قیمت واجبی ہے۔ اس کا خیر مقدم اردو حلقوں میں یقیناً ہونا چاہئے۔

● **نام کتاب: چینی ادب پر ہندوستانی ادب کے اثرات مصنف: ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی ص: ۲۰۰ اشاعت: ۲۰۱۲ء قیمت: ۱۴۰ روپے ناشر: اردو بک ریویو پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی-۲ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۲۵**

ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی اردو ادب کے واحد ادیب ہیں جنہیں چینی زبان و ادب پر شغف حاصل ہے۔ ان کی اب تک چینی ادب کے حوالے سے پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ ان کی اس کڑی کی چھٹی کتاب ہے جس میں انہوں نے چینی ادب کو ہندوستانی ادب کے اثرات کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے جس میں اول کے چار ابواب میں قدیم چینی ثقافت، چینی مذاہب اور بودھ مت، کلاسیکی چینی فکشن اور بیسویں صدی کے آغاز میں چینی دانشوری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ پانچویں صدی قبل مسیح سے ۲۲۰ء تک کی ثقافت کا اندازہ تفصیل کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ چینی مذاہب اور بودھ کی نشر و اشاعت کی وضاحت بھی بے حد موثر انداز میں کی گئی ہے۔ ساتھ ہی بودھ مت کی مختلف روایات اور عقائد کا بھی بیان بہت تفصیلی طور پر کیا گیا ہے۔ کلاسیکی چینی فکشن پر بودھی حکایتوں اور ہندوستانی رمزیوں کے اثرات پر واضح مثالوں کے ذریعہ نہایت عالمانہ طور پر گفتگو کی گئی ہے۔ آخر کے دو ابواب رابندر ناتھ ٹیگور اور چینی دانشور اور چینی شاعری کے حوالے سے ہیں۔ ٹیگور کی قدر و منزلت چین میں مسلم ہے۔ ٹیگور کی تخلیقات کے چینی زبان میں تراجم اور چینی شاعری میں ٹیگور کے اثرات بہت ہی نمایاں ہیں۔ دونوں مضامین کارآمد ہیں اور ٹیگور کی اہمیت اور چینی ادب میں افادیت بتاتے ہیں۔ ٹیگور کی

مقبولیت اس قدر ہے کہ تعلیمی اداروں میں شیکسپیئر کی تصویر کے ساتھ ٹیگور کی بھی تصویریں آویزاں کی جاتی ہے۔ چینی ادب ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی اثرات سے معمور ہے اور سنسکرت سے بھی مالا مال ہوا ہے۔ قدیم نالندہ کی درس گاہ میں چین سے بھی کثیر تعداد میں طالب علموں کی آمد کا ثبوت ملتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب چینی ادب کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی نے چینی ادب کے حوالے سے اردو قارئین کو بہت کچھ علمی ذخیرہ فراہم کرایا ہے۔ ان کی یہ علمی ادبی کاوش قابل صد ستائش ہے۔ ان سے مستقبل میں ابھی اور بہت کچھ کی توقع کرنی چاہئے۔ کتاب خوبصورت اور جاذب نظر ہے۔ اس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

....

● **نام کتاب: شعور وسرور مصنف: ظہیر انور ص: ۲۴۰ قیمت: ۱۲۰/روپے اشاعت: ۲۰۱۳ء**
ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی-۲ مبصر: ابواللیث جاوید، نئی دہلی-۲۵

''شعور وسرور'' ظہیر انور کے تنقیدی مضامین کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ ظہیر انور کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ انہوں نے اردو ادب کی چند مخصوص اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں مقالہ نگاری، افسانہ نگاری، شاعری، ترجمہ نگاری ڈراما نگاری قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان میں بھی مضمون نگاری کی ہے اور ایک مجموعہ The Lasting Impression کے عنوان سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ موصوف درس تدریس کے شغل سے وابستہ ہیں۔ انہیں ڈراما نگاری اور اداکاری میں خاص شغف حاصل ہے۔ اردو ڈراموں کی دنیا میں ان کا نام اعتبار حاصل کر چکا ہے اور بہت ہی عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ یوں تو ۱۹۹۴ء میں ''ڈراما فن اور تکنیک'' اور ۲۰۱۱ میں ''ڈراما: منظر پس منظر'' ان کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں مگر زیر تبصرہ مجموعہ ''شعور وسرور'' کو اپنے مضامین کا پہلا مجموعہ تصور کرتے ہیں۔ اپنے ادبی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اس کتاب کے پیش لفظ بس ''یہی کچھ ہے...'' میں رقم طراز ہیں:

> ''....ڈراما کے علاوہ شاعری اور فکشن سے مجھے بطور خاص رغبت رہی ہے۔ لہٰذا تفہیم وتجزیہ کی جستجو نے مجھ سے یہ سارے مضامین لکھوائے ہیں۔ میرا تنقیدی سروکار یا موقف کبھی بھی کسی خاص دبستان تنقید کے تابع نہیں رہا بلکہ جب کسی تخلیق کے بطن میں اتر کر تخلیق کار کے تجربے اور واردات میں شراکت نصیب ہوئی تبھی مجھے ان کی تفہیم وتعبیر کا خیال آیا...''

اس طرح ان کی تنقیدی نگاہ خود ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی مرہون منت ہے۔ اپنے تنقیدی شعور اور رویوں کے نشوونما کی پوری روداد اپنے پیش لفظ میں رقم کی ہے۔ تنقید کے ہر گوشے کے ادراک کا بیان بھی قابل تقلید ہے۔ اور شاید ان کے ذہنی سفر کی کامیابیوں کا بھی راز انہیں سطور میں پنہاں ہے۔

ڈراما اور اسٹیج کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ ریمارک کہ ''ڈراما اور اسٹیج کے فن پر جتنی اچھی نظر ہمارے یہاں ظہیر انور نے پائی ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں'' یقیناً ایک سند کا درجہ رکھتا ہے۔

ٹیگور کے حوالے سے دو مضامین ''ٹیگور کی شاعری کے محرکات'' اور ''سجاد ظہیر اور ٹیگور'' ٹیگور شناسی کے اہم

مضامین ہیں۔ ٹیگور کی شاعرانہ عظمت اور سماجی وعوامی سروکار کو سمجھنے میں یہ دونوں مضامین معاون ثابت ہوں گے۔ سجاد ظہیر اور ٹیگور دو مختلف سمتوں میں بہنے والی نظریاتی ندیاں ہیں مگر ان دونوں کی خیالی دھاراؤں میں کیسے ہم آہنگی کی لہریں دوڑ گئیں، ان مضامین کے ذریعہ منکشف ہو پایا ہے۔ یہ دونوں مضامین غور طلب ہیں۔

اردو شعراء کرام میں اختر الایمان، عین رشید، منور رانا، نصر غزالی، حسن اثر اور شہناز نبی کی شعری جہتوں کی تلاش کی گئی ہے۔ اسی طرح افسانوی ادب میں منشی پریم چند، جوگندر پال، ظفر اوگانوی، صدیق عالم، فیروز عابد اور جاوید صدیقی کو ان کی کہانیوں میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا شعراء و ادباء کے فن کے کچھ ان دیکھے ان چھوئے گوشوں کو منظر عام پر لانے کی بہت ہی کامیاب کوشش مختلف مضامین کے ذریعہ کی گئی ہے۔ ان تخلیق کاروں پر مادوں کی تخلیقات اور فن پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ایک نہایت عمدہ مضمون، سیاہ فام افریقی قوموں کا ادبی شعور' اس مجموعہ میں شامل ہے۔ افریقہ کے سیاسی پس منظر اور اس سے پیدا ہونے والے ادبی شعور کا مکمل بیان اس مضمون میں ملتا ہے۔ سیاہ فام قوم پر ڈھائے گئے مظالم، سیاسی جبر، فاتح قوموں کے گھناؤنے ظلم اور ان حالات سے پنپنے والی سوچ کا ذکر پوری دیانت داری سے کیا گیا ہے۔ اسی حوالے سے جاوید دانش اور خالد سہیل کی تخلیقات بالترتیب ''دل دل کے باسی'' اور ''کالے جسموں کی ریاضت'' کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے جس سے سیاہ فام قوم کی تخلیقات کا علم ہوتا ہے۔ ایسے مضامین اردو والوں کے لئے سودمند ثابت ہوں گے۔ مصنف موصوف کی یہ ایک نہایت اہم ادبی کاوش ہے۔

''شعور و سرور'' یقیناً اردو تنقید میں ایک خوبصورت اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب خوبصورت، کمپوزنگ، طباعت اور گٹ اپ سے آراستہ ہے۔ قیمت بھی واجبی ہے۔ اردو تنقید سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ ایک انمول تحفہ ہے، جس کی پذیرائی خوش دلی سے ہونی چاہئے۔

● نام کتاب: شکست کی آواز ناول نگار: عبدالصمد ص: ۲۸۳ اشاعت: ۲۰۱۳ء

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی مبصر: ڈاکٹر ایم صلاح الدین (دربھنگہ)

انسان کی زندگی گوناگوں رنگ وروپ اور کیفیتوں میں گزرتی ہے۔ ان مراحل کی فنکارانہ صورت گری کا فن ناول ہے۔ ایسی ہی فنکارانہ کاوش کا نتیجہ ''شکست کی آواز'' ہے جو عبدالصمد کی ساتویں تخلیق ہے۔ ان کی پہلی ہی تخلیق (ناول) ''دوگز زمین'' ۱۹۸۸ء منظر عام پر آئی تو فکر وفن کے لحاظ سے اتنی کامیاب ٹھہری کہ ۱۹۹۰ء میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازی گئی۔ اسے پیش نظر رکھیں تو ناول ''شکست کی آواز'' آپ کی توجہ ضرور کھینچے گا۔

اس کا مرکزی خیال جنسی بے راہ روی پر منتج ہلاکت خیز مرض کے حملہ سے شکست کے ندامت آمیز احساس پر مبنی ہے۔ اس کا پلاٹ دیہات کے سادہ اور ٹھہری ہوئی زندگی سے لے کر متمدن شہر کے ماڈرن اور صارفیت زدہ طرز زندگی کو محیط ہے۔ اس لئے پلاٹ کے تانے بانے دونوں تہذیبی بساط کے مہروں کے حرکت وعمل سے بنے گئے ہیں اور دونوں مکان و ماحول کی فضابندی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے انسان کی زندگی تو سیدھی راہ گزرتی نہیں۔ لہٰذا اس

کے راہ کی ہر پیچیدگی ایک کہانی کو جنم دیتی ہے۔ یہ کہانیاں کہیں دلچسپ، کہیں عبرت ناک، کہیں نشاط انگیز تو کہیں فکر مہمیز، کہیں تلذذ اندوز تو کہیں تنفر آمیز تاثر پیدا کرتی پلاٹ کو انجام تک پہنچاتی ہیں۔ جن میں معاشرت، سیاست مذہب اور اخلاق کے آفاقی اقدار کو پامال کرتے اور خود پسند اقدار کی افزائش کا رجحان خوب ملتا ہے جس سے تعلیم گاہ اور دانش گاہ بھی اچھوتا نہیں رہا۔ یوں اس کا پلاٹ ہمارے عہد کا آئینہ ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار یعنی ہیرو، ایک دبنگ، عیاش اور لٹے پٹے زمیندار باپ اور شریف النفس، سلیم الطبع، باکردار، مخیر و خوش اخلاق مگر خاوند کے ڈنکٔی کی ساری ماں کی اکلوتی اولاد ہے۔ ظاہر ہے متضاد جبلت و سرشت کے حامل جرثومے کے امتزاج سے تشکیل پانے والے کردار کا عمل وردیہ دلچسپ اور پیچیدہ ہونا فطری ہے۔ سو ناول نگار نے اس کی فطری کردار سازی پر خاصی توجہ دی ہے۔ یہ کاوش کتنی باریاب و کامیاب ہوئی، مرکزی کردار کی نفسیاتی کشمکش پر لاشعور حاوی رہا یا اس کا شعور، اس کی تحلیل نفسی کا عمل دعوت مطالعہ دیتا ہے اور یہ کہ اس کے ذریعہ ناول نگار جو پیغام دینا چاہتا ہے وہ کتنا متاثر کن ہے یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس ناول کا موضوع موجودہ حالات کا متقاضی ہے۔ انداز پیشکش دلچسپ اور طربیہ ہے۔ انجام المیہ ہے۔ کردار نگاری غنیمت ہے۔ مکالمے کردار کے حسب حال ہیں۔ پھر یہ کہ ''دو گز زمین'' والے فنکار کا فنی رچاؤ، ارتقاء کے کس پر اؤ پڑ ہے۔ یہ دیکھنا ہو تو اس ناول کو ضرور پڑھیں۔ امید ہے آپ کی سوچ کو مہمیز کرے گا۔

....

● **نام کتاب: تذکرہ مسلم مشاہیر ویشالی مصنف: مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ص: ۱۶۰ قیمت: ۶۰ روپے**
ناشر: جامعۃ العربیہ نصیر چک پاتے پور، ویشالی مبصر: ڈاکٹر ایم صلاح الدین (دربھنگہ)

تاریکی میں سامنے سے آنے والی روشنی نظر خیرہ کرتی ہے اور موجب گمرہی بھی بن جاتی ہے۔ جب کہ پیچھے کی روشنی صحیح راہ نما بنتی ہے اور خطرات سے بچ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ بھی کا تجربہ ہے۔ ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ ماضی کی کھوج اور تجربے کی بنیاد پر ہی نت نئے سائنسی ایجادات و ترقیات کا عمل جاری و ساری ہے۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ ماضی کے تابندہ پائندہ نقوش، حال اور مستقبل دونوں کو سنوارنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ معاشرے کی تہذیب و تنظیم کرنے والی، فکر و عمل کو سنوارنے والی اور انسانیت نواز ہستیاں ہر دور اور ہر خطہ ارض میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ ان کے عملی و فکری، علمی و ادبی کارناموں سے آنے والی نسلوں کے فکر و عمل کو آنچ ''تواریخ و تذکرے'' سے ہی ملا کرتی ہے۔ یہی سوچ، دانشوروں کے قلم کو تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کیلئے جنبش و توانائی دیتی ہے۔ ان ہی محرکات کا ثمرہ ''تذکرہ مسلم مشاہیر ویشالی'' بھی ہے جو مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ویشالی، قدیم ترین ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کے حامل لچھوی گھرانوں کی ریاست، جینیوں کے آخری تیرتھانکر مہاویر کی جنم اور کرم بھومی کے ناطے، مہاتما گوتم بدھ کی آماجگاہ اور خانوادہ حضرت تاج فقیہؒ کے دعوتی مراکز کی حیثیت سے عالمی شہرت رکھتا ہے۔ ریاست ویشالی، بالمیکی رامائن اور ویشنو پران کے مطابق لچھوی ریاست کے بنیاد گزار

راجاؤں میں راجا وشال کے نام سے موسوم ہوئی جس کا وجود ۴۹۰ سال قبل مسیح مگدھ سلطنت میں جبراً ضم ہو گیا اور اپنی عظمت کھو گیا۔ پھر متھلا اور ترہت ریاستوں کا حصہ بنا۔ چودھویں صدی عیسوی حاجی پور ریاست کے طور پر ابھری اور مٹ گئی۔ ۱۹۷۲ء میں اس کے قدیم نام کی بازیافت کر کے ریاست بہار کے ایک ضلع کی حیثیت بخش دی گئی۔

متذکرہ تمام پہلوؤں کا تاریخی تناظر، آثار قدیمہ کا تعارف، تہذیبی وثقافتی، علمی وادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا اجمال اور ویشالی ضلع کا جغرافیہ اس کی گوناگونیت کے ساتھ مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے اس تذکرہ کے پہلے باب میں ویشالی کی تاریخی وتہذیبی اہمیت، کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ دوسرا باب، حاجی پور کا تاریخی وسیاسی منظرنامہ ہے۔ تیسرے باب میں علما، اصلحاء اور صوفیا کا تذکرہ ہے۔ چوتھے باب میں حکمراں، سیاستداں اور مجاہدین آزادی سے روشناس کرایا ہے۔ پانچواں باب شعراء، ادباء اور نقاد کی شخصیت اور فکروفن سے آگاہ کراتا ہے۔ چھٹا باب ناموروکلا، اساتذہ ومعالجین اور ساتواں باب مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ قابلِ تقلید حضرات کے تعارف پر مشتمل ہے۔

یہ سب ماضی کے تابندہ وپائندہ نقوش ہیں۔ اس لئے یہ تذکرہ جلد اول کی حیثیت رکھتا ہے اور موصوف کی تذکرہ نگاری کے نقش اول کو بھی۔ سوممکن ہے بسبب نقش اول تسامحاتی نقص، بعد کی تحقیق سے کچھ نکل آئے۔

لیکن فی الواقع، مفتی صاحب کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت، اپنی وراثت کے تحفظ کا مخلصانہ جذبہ اور اسلوب بیان کی طرفگی وجامعیت، ہم آہنگ ہو کر صدیوں کے تاریخی تناظر کو ایک چھوٹے سے جام میں انڈیل گئی ہے جو "جام جم" کی مثل ہے۔ قدیم وجدید تواریخ وتذکروں کے حوالے اسے مستند بناتے اور اس کی وقعت دوبالا کرتے ہیں۔ تواریخ وروایات کے دفینے کرید کرید کر بکھری کرچیاں چننا، ان کی چھان پھٹک کرنا اور انہیں جوڑ کر دلکش صورت عطا کرنا، سخت عرق ریزی اور پتاماری کی اہلیت اور تخلیقی مہارت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ مفتی صاحب نے یہ تمام معرکے کسی خوبی سے سر کئے ہیں یہ تو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر بھی بقلم تذکرہ نگار:

> "مجھے امید ہے کہ آئندہ کوئی مورخ اس موضوع پر کام کرنا چاہے گا تو اسے چیونٹیوں کے منہ سے دانہ دانہ جمع کرنے کے مراحل سے نہیں گزرنا ہوگا۔"

خیال ناچیز میں اس کی تردید مشکل ہوگی۔ یوں مفتی صاحب نے تذکرہ نگاری کا حق اپنی مٹی کا قرض ادا کیا ہے کہ رشک آتا ہے۔ ایسی ہی دوسری جلد بھی خدا انہیں جلد پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

....

- کتاب کا نام: "منور رانا: مقدس رشتوں کا علم بردار" مصنف: ڈاکٹر عرش منیر اشاعت: ۲۰۱۵ء
قیمت: ۵۴ روپے رابطہ: مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتا مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

منور رانا محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کی شاعری عالمی اردو آبادی میں ذوق وشوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہے۔ اردو شعروادب کے حوالے سے ان کا شمار ان فن کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے تہذیب وثقافت، سالمیت، اتحاد واتفاق نیز بین مذاہب ایکتا اور رشتوں کے تقدس کو اپنے فن کی معراج بنایا ہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے ایک خاص سلسلۂ اشاعت کے تحت اس صوبہ کے قلم کاروں کی تحریروں کو ادبی منظرنامے میں شمولیت اور اس کی محافظت کے

غرض سے کتابیں شائع کرنا شروع کی ہیں۔اس کڑی میں ایک اہم نام منور رانا کا آتا ہے۔منور رانا ''مقدس رشتوں کا علم بردار'' کی مصنفہ ڈاکٹر عرش منیر ہیں۔ یہ کاوش مونو گراف کے طرز کی ہے۔

اس کتاب کو پانچ حصوں میں بانٹا گیا ہے اور مختلف عنوانات کے تحت منور رانا کی شخصیت اور شاعری کو قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ پہلا عنوان منور رانا مختصر سوانحی کوائف ہے۔اس کے تحت منور رانا کو ماہ و سال کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے۔اس میں ان کی تعلیم، ادارات، ان کی نثری تصانیف، شعری تصانیف، انعامات و اعزازات اور سکونت و رابطہ کے سلسلے کی معلومات درج ہے۔ دوسرا عنوان ''منور رانا کے حالات زندگی: ایک اجمالی جائزہ'' ہے۔اس میں ممدوح کی زندگی کے حالات بڑے ہی سلیقے سے بیان ہوئے ہیں۔حوالے بھی برمحل ہیں۔خود شاعر کی زبانی حالات کی شمولیت نے اسے معیار عطا کیا ہے۔اس طرح ان کی شخصیت پوری طرح روشن ہوگئی ہے۔تیسرا حصہ یا عنوان ''منور رانا کی شاعری کے مختلف النوع موضوعات'' ہے۔اس میں منور رانا کی شاعری کے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ان کے شعری مجموعوں کو نگارہ میں رکھتے ہوئے اس حقیقت کو بآسانی بیان کیا جاسکتا کہ موضوعات میں تنوع ہے اور افکار تازہ کے رسیا ہونے کے سبب موضوعات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے حساس طبیعت پائی ہے۔اس حصہ کو دل نشیں اشعار سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔منور رانا کی شاعری کا ذکر ہو اور ماں کا بیان نہ آئے ایسا ممکن کہاں۔اس کتاب کا ایک باب ''منور رانا کی شاعری میں ماں کا تصور'' ہے۔یہاں ماں کے تعلق سے وہ بیشتر باتیں آگئی ہیں جن کو دنیا کے مشاہیر اہل قلم نے لکھا ہے۔بظاہر یہ عنوان منور رانا کی شاعری میں ماں کے تصور کی تلاش و جستجو سے عبارت ہے مگر مصنفہ نے ماں سے وابستہ افکار کو اور بھی وسیع تر کردیا ہے اور انہیں کے اس شعر کو مدعا بنالیا ہے:

محبت کرتے جایئے بس یہی سچی عبادت ہے
محبت ماں کو بھی مکہ مدینہ مان لیتی ہے

اس کتاب کا آخری باب ''منور رانا کی شاعری میں دیگر رشتوں کا احساس'' ہے۔منور رانا نے سماجی حقیقت کو حسین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ان کے یہاں رشتوں کا تقدس انسانیت کی بنیاد ہے۔ڈاکٹر عرش منیر نے ان رشتوں کی نشاندہی کی ہے اور مثالوں کے ذریعے اپنی گفتگو کو مدلل بنایا ہے۔

یہ کتاب منور رانا شناسی میں معاون ہے اور ڈاکٹر عرش منیر کی یہ کاوش ان کی تحقیقی صلاحیت کا نمائندہ باب ہے۔یہ کاوش ضرور سراہی جائے گی۔

....

- **کتاب کا نام: ''اردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات'' مصنفہ: ڈاکٹر نصرت جہاں اشاعت: ۲۰۱۲ء قیمت: تین سو روپے رابطہ: ۵۰۔۷، فیرس لین، کولکاتا۔۳۔۷ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)**

ڈاکٹر نصرت جہاں ایک ذہین قلم کار ہیں۔وہ کم لکھنے اور اچھا لکھنے پر یقین رکھتی ہیں۔''اردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات'' ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر ان کو پی ایچ ڈی ڈگری ملی ہے۔اس مقالے کی کتابی صورت ہمارے

سامنے ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں چار عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ ''ترقی پسند ادبی تحریک اور ترقی پسند شعراء'' کے تحت غزل کی معنویت کی تعریف، غزل کی ہیئت، موزونیت، قافیہ ردیف، مطلع و مقطع، غزل کی زبان، غزل کے موضوعات مثلاً خمریات، تصوف، منظر فطرت، سماجی و سیاسی مسائل، غزل کی مقبولیت کے اسباب پر بحث کی گئی ہے۔ مذکورہ عناوین کے ذریعہ اردو غزل کی بنیادی باتوں کی معلومات ہو جاتی ہے۔ اس کے محتویات پر گفتگو کرتے ہوئے محقق نے ایک سو بائیس حوالے دیئے ہیں جن سے ان کی مطالعہ پسندی اور شوق جستجو کا علم ہوتا ہے۔ پہلے حصے کا دوسرا عنوان ''غزل کے ارتقا کا اجمالی جائزہ'' ہے۔ اس عنوان کے تحت دکن کے شاعر مشتاق بیدری سے علامہ اقبال کی غزلوں تک کا جائزہ اور ان کے اثرات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں سرسید احمد خاں کی تحریک کے اثرات، حالی کے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کا محاسبہ، اصلاح معاشرہ میں غزل کے حدود و امکانات کا اور حالی و اقبال کی غزلوں کا جائزہ شامل ہے۔ اس بحث کو مدلل بنانے کے لئے مصنفہ نے حوالہ جات بھی دیئے ہیں۔ تیسرا عنوان ''ترقی پسند تحریک، پس منظر، مکالمہ اور اردو ادب کی مختلف اصناف پر اس کے اثرات'' ہے۔ یہ حصہ کتاب کا کلیدی حصہ ہے۔ اس میں تحریک کی تاریخ، وابستہ اذہان اور نمائندہ قلم کاروں کی شمولیت کے ذکر کے ساتھ ترقی پسند تحریک کی مخالفت، ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ، ترقی پسند تحریک اور ناول، اردو ڈرامہ، رپورتاژ، طنز و مزاح، اردو تنقید، اردو نظم، اردو گیت، اردو رباعی، اردو مثنوی، اردو مرثیہ اور قصیدہ پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں حوالہ جات کی تعداد ایک سو اکتالیس ہے۔ پہلے حصہ کا آخری عنوان ''اردو غزل پر ترقی پسند ادبی تحریک کے اثرات ایک جائزہ'' ہے۔ عنوان کے مطابق اردو غزل میں اس تحریک کے نمایاں اثرات کا جائزہ اس کا مقصد ہے اور مصنفہ نے کامیابی کے ساتھ اس کو پورا کیا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصہ میں فیض، شاد عارفی، مخدوم، ندیم، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، مجاز، مجروح، تاباں اور پرویز شاہدی کی شاعری کا ترقی پسند تحریک کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ حصہ بھی وقیع ہے۔ ماحصل کے طور پر مصنفہ کی تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے نمایاں کارنامے کا احاطہ کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اردو شعر و ادب پر اس تحریک کے نمایاں اثرات ہیں۔ انہوں نے یہاں اس تحریک سے وابستہ فن کاروں کی شخصیت پر اس تحریک کے اثرات کا معنی خیزی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ اس کتاب پر تقریظ پروفیسر مظفر حنفی نے لکھی ہے جو دوران تحقیق نصرت جہاں کے سپروائزر رہے ہیں۔

یہ کتاب ترقی پسندی تحریک کے حوالے سے پسند کی جارہی ہے۔ ہمیں یقین ہے ڈاکٹر نصرت جہاں کا تجزیاتی ذہن اردو شعر و ادب کے لئے سودمند ہوگا۔

....

● **کتاب کا نام: ''کرب حیات'' شاعر: نصیر احمد بٹ ناصر اشاعت: ۲۰۱۳ء قیمت: ۵۰۰ روپے**

رابطہ: N11 2TE 36, York Road, New Southgate, London, (England UK) **مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد**

نصیر احمد بٹ کا پہلا شعری مجموعہ ''خزاں کے پھول'' کی پذیرائی ہوئی تھی۔ انہوں نے اردو شاعری کی روایت

سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ان کی شاعری کا رنگ کلاسیکی شاعری سے جا ملتا ہے۔ زیر مطالعہ شعری مجموعے میں نظمیں، غزلیں اور قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ انکی شاعری کے براہ راست مطالعہ سے قبل تعارفات کے ضمن میں اس کتاب کے پبلشر محمد صدیق ناز کی چھوٹی سی تحریر سے معلوم ہوا کہ برطانیہ میں بھی اردو کتابوں عمدہ طباعت کا نظم ہے اور یہ بات اس شعری مجموعہ کو دیکھ کر بھی کہی جا سکتی ہے۔ تعارفات کے تحت ہی جناب فیاض عادل فاروقی لندن نے ''ناصر بٹ: شاعر آہن وریشم'' کے عنوان سے ان کی شاعری کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ انہوں نے شعری مجموعہ ''کرب حیات'' کو ''طرب حیات'' کا تکملہ مانا ہے۔ انہوں نے نصیر احمد بٹ کو منظوم خراج بھی پیش کیا ہے۔ اس حصہ میں شاعر نے ''میرا کرب حیات'' کے عنوان سے اپنی مختصر گفتگو میں یہ بتایا ہے کہ ان کی شاعری سماج کا درپن ہے۔

اس مجموعہ میں ۲۷ رنظمیں ہیں۔ ان میں حمد و نعت کے علاوہ منقبت، شخصیاتی نظمیں اور حالات و واقعات نیز سماجی و سیاسی اور ملی مسائل پر نظمیں موجود ہیں۔ فکر فردا، حاکم وقت، نشتر احساس، نوشتہ دیوار اور کرب حیات پر اثر نظمیں ہیں۔ جن سے شاعر کے افکار کا پتہ چلتا ہے۔ اس مجموعے میں کل ساٹھ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ ان غزلوں میں رنگ ہائے چمن جیسی کیفیت ہے۔ دل کا حال بھی ہے تو دنیا کی روداد بھی ہے۔ انداز بیان سادہ ہے۔ ان کی غزلوں سے اپنی پسند کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن سے ان کے فکر و فن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

بھول جانا نہیں ہے اب ممکن
دل کے رستے سے آ رہا ہے وہ

پیار کی خواہش پہ ہم کو بے قراری مل گئی
سنگدل سے دوستی میں دل فگاری مل گئی

سمجھے تھے خود کو نشہ دولت میں جو خدا
ان کو خدا کے خوف نے لرزاں کیا تو ہے

اس کو اتنا ہی رزق ملتا ہے
جس کا جتنا نصیب ہے یارو

وہ اپنی ہی پہچان سے محروم رہے ہیں
مشکل میں جو لمحوں کے تقاضوں کو نہ سمجھے

جناب نصیر احمد بٹ ناصر نے منظومات اور غزلیات کے خالی جگہوں میں قطعات کی شمولیت کی ہے۔ ان کے قطعات فطری ذہانت کے آئینہ دار ہیں۔ اس مجموعہ کی شاعری سے ناصر کو ایک اچھے شاعر کے طور پر پہچان ملنی چاہئے ایسی مجھے امید ہے۔ کتاب کا سرورق خوبصورت اور بامعنی آرٹ کا نمونہ ہے۔ البتہ کتاب کی قیمت کچھ زیادہ ہے۔ عام قارئین اس کا استفادہ تب کریں گے جب اس کی قیمت مناسب ہوگی۔

....

- **کتاب کا نام: فلک آہو (شعری مجموعہ) شاعر: اسرار دانش اشاعت: بار دوم ۲۰۱۴ء قیمت: ۱۵۰ روپے رابطہ: بزم اہل قلم، مسری گھراری، سستی پور (بہار) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)**

اسرار دانش کا محبوب صنف سخن غزل ہے۔ وہ اپنے جذبات غزلوں میں پرونے کے فن سے پوری طرح واقف ہیں ساتھ ہی ساتھ غزل کی روایت کو پوری توانائی کے ساتھ برتنے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''فلک آہو'' میرے روبرو ہے۔ اس کا مطالعہ ہمیں خوشگوار لمحوں سے آشنا کراتا ہے۔ عام طور سے غزلیہ شاعری میں حالات حاضرہ کی پیش کاری کرنے میں خوبصورتی ضائع ہو جاتی ہے لیکن جن شعراء نے لفظ و معنی کے دریا کو عبور

گرلیا ہے ان کے یہاں یہ معاملے بھی حسن رکھتے ہیں اور قاری پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔

''فلک آہو'' کی غزلوں کے مطالعے سے قبل ڈاکٹر جمال اویسی کے مضمون ''فلک آہو کی غزلیں'' کی قرأت سے ان کی یہ ہنر مندیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے ان کو نئی نسل کا پختہ کار شاعر مانا ہے۔ جن کی غزلیں ذہنی کیفیت کی غمازی کرتی ہیں۔ انہوں نے بجا طور پر ان کی شاعری کے اوصاف سے روبرو ہونے میں قاری کی مدد کی ہے۔ اس مجموعہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ہوا خوشبو سے بھر جائے فضا تبدیل ہو جائے
اگر تشکیک کا سنگ گراں تحلیل ہو جائے

بھلا بیٹھا ہے جا کر شہر میں ماں باپ کو یکسر
خدا جانے وہاں کیسی کمائی کرتا رہتا ہے

ہمیشہ وقت کی قلت تمہارے پاس رہتی ہے
سنائیں حال دل اپنا کبھی آؤ تو فرصت میں

عداوت میں زیاں ہے جان کا معلوم ہے لیکن
محبت بھی جہاں میں صورت آزار چلتی ہے

جہاں میں رونما ہوتا ہے جب بھی حادثہ کوئی
تری انگلی مری جانب ہی کیوں ہر بار اٹھتی ہے

ہمیں ہشیار رہنے کی ضرورت ہر قدم پر ہے
جنوں کیا اب خرد بھی چاک دامانی میں رہتا ہے

اسی کے حکم سے ہر کام ہونا اگر طے ہے
ہماری کوششیں ساری تو پھر بے کار ہو جائیں

مذکورہ اشعار صرف بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ اسرار دانش کے اس مجموعہ غزل کے اشعار کا تیور کچھ اسی انداز کا ہے۔ شاعری کا لہجہ اگر توانا ہو تو قاری اس کی ابدیت کی ضمانت دے جاتا ہے۔ بڑی ہی خاموشی و روانی کے ساتھ دانش نے شعر و ادب کا یہ سفر طے کیا ہے۔ ان کے اشعار بولتے ہیں اور ہمیں کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اگر جدید شاعری کی اصطلاح رائج ہو چکی ہے تو اس شاعر کو اسی صف میں کھڑا پاتا ہوں۔ ڈاکٹر جمال اویسی کا کہنا مجھے بہت بھایا کہ ''اسرار دانش کے لب ولہجہ میں وہ بے ساختگی اور روانی پائی جاتی ہے جسے دیکھ کر اندازہ کرنا بے جا نہیں کہ وہ اگلے پڑاؤ پر ایک نہایت دھلا دھلایا لب ولہجہ لے کر آئیں گے جس کے اندر جاذبیت اور معنویت دونوں ہوگی۔'' اس شعری مجموعے میں بھی اسرار دانش نے اپنی شاعری سے چونکایا ہے۔ اور یہ باور کرانے کی سعی کی ہے کہ اگر غزل کا دامن وسیع ہے تو اس کے اندر رنگارنگ کیفیات پائے جانے چاہئے۔ اس مجموعے کے شروع کے اوراق پر دو اشعار درج ہیں میں اسے آپ کے روبرو کرتا ہوں جن سے شاعر کی ذات و کائنات سے وابستگی کا علم ہو سکے گا۔

تجسس ہے، طلب ہے آرزو ہے میری فطرت میں
میں رہ سکتا نہیں ہرگز کبھی شہر قناعت میں

یقیں کا جب تلک اک دائرہ موجود رہتا ہے
نظر آتا نہیں لیکن خدا موجود رہتا ہے

ہمیں یقین ہے کہ اسرار و دانش کا مجموعہ غزل ''فلک آہو'' بہت پسند کیا جائے گا اور وہ خوب سے خوب کی تلاش میں سرگرداں رہیں گے۔

....

- کتاب کا نام: مثبت و منفی (شعری مجموعہ) شاعر: ساغر مستی پوری اشاعت: ۲۰۱۴ء قیمت: ۲۰۰ روپے
رابطہ: مسری گھراری، مستی پور بہار مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

محمد نظیر احسن نام اور تخلص ساغر ہے۔ ساغر سمتی پوری کے نام و پہچان سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ رہبر جونپوری سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی شاعری سے شغف ہے جبکہ بیسویں صدی کی آخری دہائی سے چھپنے چھپانے کا سلسلہ قائم ہے۔ مثبت و منفی ان کی غزلوں کا اولین مجموعہ ہے۔ اس کے شعری مجموعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے خالد عبادی انہیں ایک فطری شاعر قرار دیا ہے اور ان کے یہاں فنی اور فکری سطح پر پختگی اور اپیل پائے جانے کی بات کہی ہے۔ بلاشبہ خالد عبادی کا قول ساغر سمتی پوری کی شاعری کے بارے میں حقیقت پر مبنی ہے۔ اس مجموعہ غزل میں اشعار دامن کھینچتے ہیں۔ فکری تازگی اور فنی حسن کے سبب ان کی شاعری دلوں کو سکون دینے والی جان پڑتی ہے۔ غزل گو شعرا کی بھیڑ بھاڑ سے الگ ساغر نے اپنی الگ دنیا آباد کر رکھی ہے۔ ان کی شعری کائنات کے حسن سے محظوظ ہونے کے لئے چند اشعار پیش کرتا ہوں:

حصول عیش و عشرت کے لیے مت آہ و زاری کر
حیات گل نمائی صدق دل سے آبیاری کر

گفتگو مجھ سے کریں ارکان گردوں یا نہیں
اپنی بیتابی لئے افلاک تک جاؤں گا میں

نگاہیں جب لگی اٹھنے مرے چاک گریباں پر
تری محفل میں سے ہم اے رونق محفل چلے آئے

جنوں کہئے اسے میرا کہ اس کو حوصلہ کہئے
میں شہر سنگ میں شیشے کا پیہم گھر بناتا ہوں

کیا ہوا جو ہے زمانہ ہاتھ میں خنجر لئے
پھر رہے ہیں ہم بھی اپنا سر ہتھیلی پر لیے

حقیقت کو جتنا دبایا گیا ہے
اچھال اس میں اتنا پایا گیا ہے

آئینہ میں لے کے خودداری کا ہوں گرم سفر
منتظر ہے شہر سارا ہاتھ میں پتھر لیے

مذکورہ اشعار کے ذریعہ یہ بتانا مقصود تھا کہ ساغر سمتی پوری کی شاعری میں جن خیالات کی ترسیل ہوئی ہے ان میں تجربات زندگی کو زیادہ دخل عمل ہے۔ اس طرح کے متعدد اشعار آپ کو اس مجموعہ غزل میں مل جائیں گے۔

ریاض قاسمی نے ان کی شاعری کا مختصر تعارف کراتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ یہاں جگ بیتی آپ بیتی کی کیفیت لئے ہوئی ہے۔ ریاض قاسمی اور خالد عبادی کی مشمولہ تحریروں سے ساغر سمتی پوری کے فکر و فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس کتاب کا گیٹ اپ سادہ مگر دلکش ہے۔ کاغذ اوسط اور چھپائی اچھی ہے۔ ''مثبت و منفی'' کی شاعری ساغر سمتی پوری کو پہچان عطا کرنے میں معاون ہوگی ایسا میرا ماننا ہے۔ ہاں کتاب کی قیمت تھوڑی زیادہ ہے۔ یقین ہے اگلے ایڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے گا تاکہ اس کی رسائی قاری تک آسانی سے ہو سکے۔

....

- **کتاب کا نام: تتلیوں بھرا آسمان (غزلیات) شاعر: نذیر فتح پوری اشاعت: ۲۰۱۲ء قیمت: ۱۷۰ روپے رابطہ: اسباق پبلی کیشنز، پونہ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)**

نذیر فتح پوری کہنہ مشق شاعر اور کثیر التصانیف ادیب و فن کار ہیں۔ ان کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ انہوں نے ناول لکھے، افسانہ نگاری کی، سفرنامے تحریر کیے، ترتیب و تدوین کے میدان میں بھی پرچم لہرائے لیکن شاعری

کو اپنی جان سے قریب رکھا ہے۔ شاعری میں بھی ان کو غزل عزیز ہے۔ لمحوں کا سفر، سفر تا سفر، تیسرا سفر کی غزلیں متاثر کرتی ہیں اور شاعر کی فطری صلاحیت کا نمائندہ بن کر شعروادب کی دنیا میں ان کو اعتبار بخشتی ہیں۔ زیرِ مطالعہ مجموعہ غزل ''تتلیوں بھرا آسمان'' ان کی حسین مصوری صفت اظہاریہ کی تمثال ہے۔ تتلیوں کو انہوں نے بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ اس مجموعہ میں گفت باہمی کے عنوان سے انہوں نے اس بارے میں لکھا ہے کہ ''تتلی کے استعارے سے مجھے آج بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا پیار بچپن میں تتلی سے تھا۔ تتلی اب بھی میرے تعاقب میں ہے۔ اپنے نیتا پارک کے فلیٹ میں ایک بار لکھتے لکھتے تتلی میرے قلم پر براجمان ہوگئی۔ جب تک تتلی قلم پر جھولتی رہی میں نے قلم روکے رکھا۔ وہاں بالکنی میں پیچھے کی طرف پودے لگے تھے وہاں سے اکثر تتلی میرے فلیٹ میں آجایا کرتی اور اپنے دل فریب رنگوں سے لبھا کر مجھے اپنا بچپن یاد دلاتی رہتی۔ تتلیوں کا میرے ساتھ عجیب وغریب انسلاک وانہماک رہا ہے۔ اکثر سڑک پر گاڑی چلاتے وقت کوئی تتلی ہینڈل پر آکر بیٹھ جاتی اور مجھے گاڑی کی رفتار کم کرنی پڑتی۔'' اس اظہاریہ کے بعد اس شعری مجموعہ سے شاعر کے وژن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ نذیر فتح پوری ایک منجھے ہوئے شاعر وادیب ہیں اس لئے ان کی شاعری کے موضوعات بھی وسیع پذیر ہیں۔ داستان دل سے لے کر افسانہ حیات کی رنگ برنگی تتلیاں ان کے چمن شاعری میں خوش نمائی پیدا کرتی ہیں اور اس چمن کی سیر کرنے والوں کو مایوسی نہیں ہوتی بلکہ تازگی احساس سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس مجموعے سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

تتلیاں دیکھ کے رنگوں سے بہل جائے گا دل
پھول کو دیکھ کے ہر آنکھ معطر ہوگی

مطلوب تیرگی کو جہاں ہو لہو کی دھار
تم سے وہاں چراغ جلایا نہ جائے گا

میں کب سے خود کو چھپانے کی جستجو میں ہوں
میری تلاش میں پھرتا ہے آئینہ کب سے

نہ رفعتوں پہ نظر ہے نہ خوف پستی کا
یوں جی رہا ہے ہر اک شخص میری بستی کا

خواب کی کتابوں میں
تتلیوں کے پر رکھنا

اجالے بدل جائیں گے تیرگی میں
کسی روز گھر سے نکل اے محبت

یہ شاعری نذیر فتح پوری کے فکر وخیالات کا آئینہ ہے۔ غزل کے حسین دامن میں سماجی اور سیاسی افکار کی پیش کاری سے قارئین کا ایک بڑا حلقہ محظوظ ہوتا ہے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ہے کہ غزل صرف حسن وعشق کے جذبے سے آراستہ ہوتی ہیں بلکہ اس کے دامن میں حیات وکائنات کے رموز سموئے جا سکتے ہیں۔

''تتلیوں سے بھرا آسمان'' کا پیش لفظ وزیر آغا نے لکھا ہے جس کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ نذیر فتح پوری کی شاعری کے وہ مداح ہیں اور جدید غزل گو شاعر کی حیثیت سے ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ تتلیوں بھرا آسمان سے ان کی شاعری کا حسن اور نکھرے گا۔ ہمیں یقین ہے۔

- کتاب کا نام: بہار کے چند نامور شعرا (جلد سوم)، مؤلفین: ڈاکٹر مظفر مہدی، ڈاکٹر منصور عمر اشاعت: ۲۰۱۴ء قیمت: ۳۰۰ روپے رابطہ: کاشانہ مہدی، محلہ چک رحمت (بھیگو)، دربھنگہ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

بہار کے چند نامور شعرا کے حوالے سے تنقیدی مضامین کی یکجائی کا جو سلسلہ ۱۹۸۸ء میں شروع ہوا تھا اس کی تیسری جلد شائع ہوئی ہے۔ بہار کے چند نامور شعرا جلد اول (۱۹۸۸ء)، اور جلد دوم (۲۰۱۴ء) کی پذیرائی کے بعد تیسری جلد کی پیش کاری اس کی افادیت کا ظاہر کرتی ہے۔ اس کے مرتبین کا گہرا تعلق شعر و ادب سے رہا ہے۔ پروفیسر منصور عمر مرحوم ایک معتبر شاعر اور عمدہ نثر نگار تھے۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ تحقیق، تنقید اور شاعری کے حوالے سے ان کے مضامین کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ماہر عروض کے طور پر بھی ان کی شناخت تھی۔ ڈاکٹر مظفر مہدی ترتیب و تنقید کے سبب ادبی حلقے میں روشناس رہے ہیں۔ درس و تدریس سے وابستگی رہی ہے اور ادب شناسی میں مہارت حاصل ہے۔ دونوں حضرات نے مشترکہ طور پر اختر اورینوی پر تحریر کردہ مضامین کو ترتیب دیا تھا اور اس کے بعد مذکورہ کتابوں کے مولفین رہے ہیں۔ ''بہار کے چند نامور شعرا'' سیریز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ادب کے تقریباً سبھی میدانوں میں یہاں کے فن کار اور اہل قلم بے حد فعال اور سرگرم رہے ہیں مگر اس سچائی کے باوجود ہوتا یہ رہا ہے کہ یہاں لوگوں کی خدمات سے چشم پوشی کی جاتی رہی ہے حتیٰ کہ اس کے معاملے میں خود بہار کے ناقدین نے بھی چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر کچھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ ہمیں شروع سے ہی اس کا احساس رہا ہے چنانچہ ہم نے پہلی بار باضابطہ طور پر شعرائے بہار سے چند ناموران کو منتخب کر کے ان کی خدمات کو تین جلدوں میں پیش کرنے کی ایک حقیری کوشش کی ہے۔ اگر چہ ہمیں اس کام کا کوئی دعویٰ ہے اور نہ ہی ہم کسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں البتہ صرف اس حد تک کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ تین جلدوں کی یہ سریز ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے اور یقین ہے کہ ہماری کوشش ادب کے طالب علموں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔''

اس عجز بیانی کی روشنی میں اس کتاب کا مطالعہ برعکس معلوم پڑتا ہے۔ یہ سریز صرف طالب علموں کے لئے ہی مفید نہیں ہے بلکہ بہار کے نامور شعراء کی خدمات کو جاننے کے لئے ناگزیر ہے۔

بہار کے نامور شعراء جلد سوم میں کل ۲۲ مضامین شامل ہیں۔ منیر سیفی، ظفر عدیم، شاہد کلیم، رونق شہری، انور شمیم، رہبر چندن پٹوی، رمیش کنول، منظر اعجاز، شمیم قاسمی، منصور عمر، شاہد جمیل، عالم خورشید، ابھے کمار بیباک، عین تابش، خورشید اکرم، امام اعظم، عبید الرحمٰن، جمال اویسی، عطا عابدی، کوثر مظہری، خالد عبادی اور راشد طراز کے فکر وفن پر مضامین سے بہار کا عصری شعری منظر نامہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مضامین کی کتابی صورت گری سے صوبہ بہار کے مشاہیر شعراء کی شاعری پر تنقید سے شعری رویوں اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں شامل سبھی مضامین وقیع ہیں اور قائم کردہ عنوانات کے تحت بہترین معلومات اور معیاری تنقیدی رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان سے شاعر کی فن کاری اور ان کے برتاؤ نیز شعر و ادب میں مراتب کا بھی علم ہوتا ہے۔ مشمولہ شعراء کا تقابلی مطالعہ یوں بھی ممکن نہیں کہ ہر شاعر اپنی ذات کے نہاں خانے سے آواز لگاتا ہوا قاری کے دل تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے ایک سے موضوعات پر بھی اشعار کی کیفیت اور اثر پذیری الگ الگ ہوتی ہے۔

بہار کے چند نامور شعرا جلد سوم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولفین نے کڑی محنت کی ہے اور مضامین

کے انتخاب میں بھی معیار کو بحال رکھا ہے۔ مضمون نگار میں بھی زیادہ تر بہار کے قلم کار ہی ہیں اور شعر وادب میں شناسا بھی ہیں۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو اس کتاب میں بائیس گنا دو کی تعداد کا انتخاب واحتساب موجود ہے۔

کتاب اچھی شائع ہوئی ہے۔ اس کا گیٹ اپ اچھا ہے۔ اگر یہ کتاب ایک مشن کے تحت اردو کے علماء وفضلاء تک رسائی پالے اور تقابلی مطالعے کا موقع میسر آ جائے تو یقیناً بہار کی شاعری کا منظر نامہ دوسرے صوبے کے مقابلے میں زیادہ روشن وواضح ہو کر ابھرے گا اور اس کا اعتراف کیا جائے گا۔

....

● **کتاب: بہار میں تخلیقی نثر (آزادی کے بعد) مصنف: ڈاکٹر قیام نیر، اشاعت: ۲۰۱۴ء قیمت: ۴۵۰روپے (جلد اول) ۴۰۰روپے (جلد دوم) رابطہ: مقام وپوسٹ: برداہا، ضلع مدھوبنی مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)**

ڈاکٹر قیام نیر فکشن لکھتے ہیں اور تحقیق سے ان کو خاص شغف ہے۔ انہوں نے انشائیہ بھی لکھا ہے۔ محقق کے طور پر ان کی کتاب "بہار میں اردو افسانہ نگاری ابتدا تا حال" کو کافی مقبولیت ملی اور اس سے استفادہ بھی کیا گیا۔ "تنہائی کا کرب" (افسانوی مجموعہ)، "میری جو شامت آئی"، (انشائیے)، "بچھڑی دلہن" (ناول)، "تحفہ" (افسانوی مجموعہ) اور "دھند" (افسانوی مجموعہ) ان کی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ مذکورہ کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فکشن کی تخلیق اور تنقید پر خاص توجہ دی ہے۔ بہار میں تخلیقی نثر (دو جلدوں) میں ان کی تازہ تحقیقی کاوش ہے۔

زیر مطالعہ کتاب جلد اول میں بہار میں اردو ناول اور افسانہ نگاری کا مربوط جائزہ لیا گیا ہے۔ بہار میں اردو ناول نگاری کے سمت ورفتار کا جائزہ لیتے ہوئے محقق نے اختر اورینوی، شفق، عبدالصمد، حسین الحق، غضنفر، پیغام آفاقی، الیاس احمد گدی، مشرف عالم ذوقی، شموئل احمد جیسے مایہ ناز ناول نگاروں کی کاوشوں کا احاطہ کیا ہے۔ محقق نے ناول نگاران کی شخصیت کو جاننے کے لئے سوانحی کوائف اور ناولوں کی خصوصیات وموضوعات کو اپنے مطالعے میں رکھا ہے اور اردو ناول نگاری میں ان کے مقام ومرتبہ کے تعین کی کوشش کی ہے۔ مشہور ناول نگاروں کے علاوہ قدرے کم شہرت یافتہ ناول نگاروں کا تعارف بھی ڈاکٹر قیام نیر نے کروایا ہے۔ ناول نگاری کے سمت ورفتار کے بعد بہار میں اردو افسانہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ باب کافی طویل ہے اسے طویل ہونا بھی چاہیے تھا کہ اردو افسانہ نگاری میں بہار کے افسانہ نگاروں کی قابل قدر حصہ داری ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ افسانہ نگاری میں یہاں کے باکمال افسانہ نویسوں نے اپنا سکہ جمایا ہوا ہے۔ محقق نے باضابطہ طور پر تقریباً سو افسانہ نگاروں کے سلسلے میں کم وبیش معلومات فراہم کی ہیں۔ اختر اورینوی سے مجیر احمد آزاد تک، شہاب عظیم آبادی سے اقبال حسن آزاد تک، اور سید تقی ارشاد سے جعفر امام راہی تک افسانہ لکھنے والے تخلیق کاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا دشوار گذار کام تھا۔ لیکن قیام نیر صاحب دھن کے پکے ہیں۔ اس لئے چھوٹے بڑے افسانہ نگاروں کو اس کتاب کے ذریعے متعارف کرانے میں ان کو کامیابی ملی ہے۔ اگلا باب خواتین افسانہ نگاروں کی خدمات پر محیط ہے۔ یہاں بھی بہار پیچھے نہیں ہے۔ محقق نے ۲۷/خاتون افسانہ نگاران کو اس کتاب میں جگہ دی ہے اور ان کے علاوہ چند خواتین افسانہ نگاروں کے سلسلے میں تھوڑی سی معلومات پیش کر کے یہاں کے افسانوی منظر نامے کو مکمل طور پر اجالا کیا ہے۔

جلد اول میں ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے تعلق سے ڈاکٹر قیام نیر کی تحقیق کی بنیاد یا تو شخصی رابطے ہیں یا پھر اخبارات و رسائل اور کتابیں۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ سوال نامے تیار کر کے بھی انہوں نے ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں سے ان کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ بڑا ہی صبر آزما مرحلہ رہا ہوگا۔ لیکن جب ان کی کاوش کا یہ روپ سامنے آیا ہے تو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کا نقش ثانی یعنی یہ کتاب ان کے نقش اول یعنی بہار میں اردو افسانہ نگاری ابتدا تا حال سے بہت بہتر اور معیاری ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کتاب کے ظاہری حسن کا بھی خیال رکھا ہے۔ جلد اول چار سو بیس صفحات پر محیط ہے۔ اس سے اس کی مشمولات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بہار میں اردو ناول اور افسانہ نگاری پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب مشعل راہ ہوگی۔

بہار میں تخلیقی نثر آزادی کے بعد جلد دوم میں انشایئے اور ڈراما اصناف کے حوالے سے تحقیقی گفتگو کی گئی ہے۔ انہوں نے بہار میں اردو انشائیہ: رنگ و آہنگ کا جائزہ لیتے ہوئے ۲۳ راہم انشائیہ نگاروں کی خدمات کو مرکز میں رکھا ہے۔ اس باب میں انجم مانپوری سے لے کر مجتبیٰ احمد تک نامور انشائیہ نگاروں کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مطبوعہ انشائیوں سے استفادہ کرتے ہوئے حوالے بھی دیئے ہیں جن سے ان کی تحقیق کو معیار حاصل ہوا ہے۔ چونکہ محقق نے خود بھی انشایئے لکھے ہیں اس لئے اس صنف کے وابستگان کا جائزہ تخلیقی وفور کے ساتھ لیا گیا ہے۔ انشائیہ کے بعد بہار میں اردو ڈراما نگاری پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ محقق نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد اردو ڈراما نگاری کے اختصاص کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے نمائندہ ڈراما نگاروں کے ڈراموں سے بحث کی ہے اور ان ڈراموں کے معیار اور پسندیدگی کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں بھی کم و بیش تقریباً سبھی اہم ڈراما نگار کی شمولیت ہوگئی ہے۔ مذکورہ ابواب سے یہ جلد مکمل معلوم پڑتی ہے لیکن اس کا اگلا حصہ اور بھی کارآمد ہے۔ ایک سو تین تخلیق کاروں کے تعارفی سوانحی خاکے سے مزین یہ حصے معلومات کا خزینہ لگتے ہیں۔ بہار کے ایک سو تین تخلیقی فن کاروں کے سوانح ایک جگہ مل جانا تعجب کی بات تو ہے ہی اس حیرانی کو قیام نیر نے بحسن و خوبی حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں کتابیات کے تحت الگ الگ ذیلی سرخیوں سے کتابوں کی فہرست لگائی گئی ہے اور سب سے آخر میں فرزندار جمند علام الدین (ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی چھوٹی سی تحریر بعنوان والد محترم، شریک اشاعت ہے۔ یہ تحریر اپنے والد کے تئیں ہونہار بیٹے کا اظہار، اعتراف اور خراج ہے۔

ڈاکٹر قیام نیر کی یہ تحقیقی کاوش سراہنے کے قابل ہے۔ طلبا اور اسکالروں کے لئے یہ کارآمد تحفہ ہے۔ اس کتاب کا پیپر بیک ایڈیشن شائع کرانے کی سبیل مصنف کو نکالنی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ قاری کم قیمت میں اس سے استفادہ کر سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کے سال اشاعت تک اس کو حتمی (اپ ٹو ڈیٹ) ہو جانا چاہئے۔ ہمیں یقین ہے اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

....

- **کتاب کا نام: اکیلا نفس (افسانوی مجموعہ) افسانہ نگار: شرافت حسین اشاعت: ۲۰۱۵ء قیمت: ۲۰۰ روپے رابطہ: قاضی پورہ، ٹانڈہ، امبیڈکر نگر (یوپی) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)**

شرافت حسین افسانہ نویس کے طور پر اردو ادب میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے شاعری بھی کی ہے مگر افسانہ نگاری سے ان کو گہری اور جنون کی حد تک محبت ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کنوئیں کے باسی'' ہے۔ اس نے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ سچائی اور بے باکی ان کے افسانوں کی پہچان ہے۔ زیر مطالعہ مجموعہ ''اکیلا ہنس'' ان کی سعی جمیلہ کا دوسرا ٹھوس قدم ہے۔

اس افسانوی مجموعے میں کل اڑتیس افسانے شامل ہیں۔ افسانوں میں موضوعاتی تنوع فطری بات ہے۔ لیکن تمام میں جو قدر مشترک ہے وہ ہے انسانیت کی سربلندی اور معاشرتی کج رویاں۔ ان کے موضوعات غریبی، مفلسی، تنگ حالی، سماجی نابرابری، خاندانی و ذاتی دشمنی اور اس کے اثرات وغیرہ ہیں۔ جیٹھ کی ایک دوپہر، تھوڑی سی خوشی، اکیلا ہنس دل اور دنیا، جھنگو چاچا، شیطان، حق دار، اکیسویں صدی کا انسان، گھاٹ، اندھیری گلی کی لڑکی، دھندا، روایت کی فصیل، مالدار، جو کھن، اچھے دنوں کی آس، روگ، دنیا پوچھے گی، بدلتے موسم، گھر واپسی افسانوں کو پڑھتے جائیے اور کہانی کا مزہ لیجیے۔ ان کہانیوں کے کردار سے ملئے اور محسوس کیجئے کہ یہ تو ہمارے ارد گرد کے فلاں ہیں یا فلنما ہے۔ فضا بندی بھی اپنے معاشرے کی لگے گی، زبان کا چٹخارہ بھی خوب ہے۔ بنکروں کی باتیں بھی ہیں۔ اس کے بارے میں شرافت حسین نے خود لکھا ہے کہ ''نقادوں نے کہا، بنکروں پر میں نے بہت لکھا ہے لیکن مجھے لگتا ہے ابھی کم، بہت کم لکھا ہے۔ میرے افسانوں میں صرف بنکروں کا ماحول اور معاشرہ ہے۔ بنکر برادری کے مسائل بہت ہیں۔ ان کی زندگی پر ادب لکھاریوں نے توجہ ہی نہیں دی جب کہ یوپی سے لے کر مہاراشٹر تک لاکھوں بنکر خاندان پھیلے ہوئے ہیں اور کروڑوں لوگ ان کے پیشے سے جڑے ہیں۔ ان کی غربت، ان کی محنت، ان کی اذیت اور سماجی نوعیت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ طبقہ اپنی انتہائی پریشانیوں کے باوجود ہمیشہ ہی حلال روزی کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔'' اس طرح انہوں نے بنکروں کے حالات اور مسائل کو بھی ترجیحی طور پر افسانے میں جگہ دی ہے۔

افسانہ نگار شرافت حسین کے فکر وفن کے حوالے سے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا مضمون بعنوان ''شرافت حسین ایک بنکر نمائندہ افسانہ نگار'' اس مجموعے میں شامل ہے۔ وصل خاں اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کی آراء کی شمولیت سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانوں میں متاثر کرنے والی خوبیاں موجود ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ شرافت حسین پر کسی طرح کا لیبل (بنکر افسانہ نگار) چسپاں کرنا ان کے اور فنکار کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ ایک حساس اور زمین سے جڑے ہوئے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔

کتاب کی چھپائی عمدہ ہے اور سرورق پر تلاش وسرگرداں اکیلا ہنس پرواز کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ میں اس مجموعے کی اشاعت پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ افسانوی مجموعہ اعتبار پائے گا۔

....

● **کتاب کا نام: حدیث دل (شعری مجموعہ) شاعر: انجم رام نگری مرتب: ڈاکٹر ایم صلاح الدین اشاعت: ۲۰۱۵ء قیمت: ۱۰۰ روپے رابطہ: شہادت ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ رام نگر، دھونی، ضلع دربھنگہ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد**

ڈاکٹر ایم صلاح الدین کئی خوبیوں کے مالک ہیں۔ ادیب تو ہیں ہی، ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ ان کی شخصیت

کی حلاوت سے متاثر ہو جانا فطری ہے۔ ان کے تبصرے اور مضامین رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تازگی فکر کی خوبی پائی جاتی ہے۔ حدیث دل انجم رام نگری کا شعری مجموعہ ہے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ شعر برجستہ موزوں کیا کرتے تھے۔ تخلیقات کی تعداد بھی وافر تھی مگر ان کے اندر نمائش کرنے یا خود کو پیش کرنے کی للک نہیں تھی۔ اس لئے ان کی شعری تخلیقات کا زیادہ حصہ ادھر ادھر ہو گیا۔ ایسے مردم کش دور میں جناب صلاح الدین رام نگری کی کاوش قابل تحسین اور قابل اقتدا ہے کہ انہوں نے اپنے ہم وطن شاعر انجم رام نگری (۱۹۴۰ء۔ ۲۰۰۰ء) کے شعری سرمایہ کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

انجم رام نگری کے اس مجموعہ کلام میں حمد و مناجات، نعت، سلام، منقبت، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری میں حسن و عشق کا بیان خاص توجہ کا حامل ہے۔ تجربات زندگی کو بھی خوبصورت الفاظ کا خاکہ عطا کرتے ہیں۔ انسانی جذبات و کیفیات کی بھرپور نمائندگی ان کی غزلوں کی خوبیاں ہیں۔ مرتب کا ماننا ہے کہ ''انجم تفکرات کی مینا میں تجربات کی مئے، نگاہ ساقی مہوش سے بھر کے لائے ہیں۔ اور یہ حصہ بڑا وقیع و متنوع ہے'' تو مطالعہ کے بعد یہ سچ ثابت ہوتا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری سے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

تصور میں خیالوں کا محل تعمیر کر لیا ۔۔۔ صداقت کی زمیں پر منحصر ہوتا تو کیا ہوتا

مرا ربط محبت بھی عجب ربط محبت ہے ۔۔۔ پلک جب بھی میرا جھپکا در جاناں نظر آیا

کبھی بھی جب تمہیں تنہائیاں ستائے گی ۔۔۔ تمہیں ضرور ہماری بھی یاد آئے گی

شعور ذات رہے، حسن زندگی کے لئے ۔۔۔ ہے جزو زیست یہ، ہر ایک آدمی کے لئے

انجام سفر سوچ ، نہ ساحل کی طرف دیکھ ۔۔۔ تو بحر حوادث میں بھی منزل کی طرف دیکھ

جہاں جلتی ہے شمع گرد پروانے بھی دیکھے ہیں ۔۔۔ حقیقت آشنا کیا کتنے انجانے بھی دیکھے ہیں

انجم صاحب نے نظمیہ شاعری میں بھی کمال دکھایا ہے۔ کسی سے پوچھنا ہوگا، شجر سایہ دار اور خلق کا محور پر تاثیر نظمیں ہیں۔ رثائی نظموں میں بھی انہوں نے تسلسل اور سوز قائم رکھا ہوا ہے۔ رباعیوں میں پختہ شاعری کا درک موجود ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ کیجئے :

حسرت ناتمام ہے دنیا ۔۔۔ چند الجھن کا نام ہے دنیا

ابن آدم الجھ کے رہ جائے ۔۔۔ ایک ایسا مقام ہے دنیا

شعری مجموعہ کے آغاز میں مرتب کا مقدمہ بعنوان ''میری تمام آرزو کھوئے ہوؤں کی جستجو''، ''حیات انجم'' اور ''انجم کی شاعری'' تحریریں معلوماتی ہیں۔ ان کے ذریعہ دربھنگہ اور گرد و نواح کی تاریخی اور ادبی حیثیت کا اشارہ مل جاتا ہے۔ مذکورہ دونوں تحریریں ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی مطالعہ پسندی اور اپنی تاریخی وراثت کو بجوئے رکھنے کی خواہش کا روشن مینارہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب جہاں انجم رام نگری کی شاعری سے محظوظ ہونے کا موقع دیں گی وہیں ڈاکٹر موصوف کی کاوش کا ہر سو اعتراف ہوگا۔

....

● کتاب کا نام: افہام ادب (تحقیقی و تاثراتی مضامین) مصنف: ایم نصر اللہ نصر طباعت: ۲۰۱۴ء قیمت: ۲۵۰ روپے
رابطہ: شالیمار اپارٹمنٹ، ستین بوس روڈ، دانش شیخ لین، باکل تلا، ہوڑہ-۶۹ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

افہام ادب کے فلیپ پر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کی تحریر کے چند جملوں سے اپنی گفتگو شروع کرتا ہوں کہ ''بنگال کی ادبی کہکشاں میں نصر اللہ نصر کا ایک خاص مقام ہے۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید نگار بھی ہیں۔ ان کے مضامین پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ایک مضمون لکھنے کے لئے انہوں نے ڈھیر ساری کتابوں اور مضامین کا مطالعہ کیا ہوگا۔'' اس روشنی میں مذکورہ کتاب کا مطالعہ نصر اللہ نصر کی جملہ کارکردگیوں کے اعتراف و اقرار کی سبیل دے جاتا ہے۔ نصر اللہ نصر شاعر ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''امکاں سے آگے'' ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کی پذیرائی بھی ہوئی اور شاعر کو اپنی تخلیقی ہنر مندری کی داد بھی خوب ملی۔ نثر نگاری کے میدان میں اترے تو مضامین کے دو مجموعے شائع کئے اور زبان و ادب سے گہری وابستگی کا ثبوت فراہم کیا۔ نصر صاحب کا ادب سے شغف طالب علمی کے زمانے سے رہا۔ سو اب بھی ہے۔ ادبی رسائل برسوں زیر مطالعہ رہے۔ آج بھی یہ شوق جنون کی حد تک ہے۔ پہلے یہ شوق صرف مطالعے تک محدود رہا بعد ازاں سخن گوئی کے ساتھ ساتھ ادبی مضامین بھی لکھنے لگے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ظاہر ہے مضامین کی اشاعت سے لے کر کتابی صورت گری تک کا سفر کسی بھی فنکار کے لئے بے حد اہم ہوتا ہے۔ اس اہم کام کو خاص اور پر کشش بنایا ہے مصنف نے۔

اس کتاب کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر کے گفتگو کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ مصنف و ناقد کے حرف مدعا، پروفیسر علیم اللہ حالی کی مختصر تحریر بعنوان ''نقد و نظر کا نقیب'' اور شمس افتخار کی تقریظ سے آراستہ ہے۔ آخر الذکر دونوں تحریروں سے نصر اللہ نصر کی تنقیدی صلاحیت کی گرہیں کھلتی ہیں۔ دونوں حضرات نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کیا ہے کہ مصنف کے اندر تنقید کی صلاحیت موجود ہے اور تحقیق کی راہ میں بھی وہ ثابت قدم ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ ''شہر سخنوراں'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اقبال، جگر، علیم صبا نویدی، کوثر مظہری، حامی گورکھپوری، سوہن راہی، معصوم شرقی، عتیق الہ آبادی، عادل اسیری، مضطرب بلیاوی، ساگر چاپدانوی، عین رشید، ڈاکٹر شبیر ابروی، نور قریشی اور سید نفیس دسنوی کی شاعری کے حوالے سے مختلف عنوانات کے تحت مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ شاعری کے مطالعہ پر منحصر یہ حصہ تنقید نگار نصر اللہ نصر کی محنت و ریاضت کا ثمرہ کہا جانا چاہئے۔ اس میں اقبال اور جگر کے علاوہ جن شعرائے کرام کی سخن سازی کو موضوع بنایا گیا ہے وہ حالیہ منظر نامے کے دستخط ہیں۔ یہاں نہ بے جا ستائش ہے اور نہ ہی بلاوجہ نکتہ چینی۔ تبصراتی انداز کی وجہ سے بہت سی کام کی باتیں بین سطور آ گئی ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کرتا چلوں کہ انہوں نے مطالعہ کے بعد جو کچھ محسوس کیا اسے ضبط تحریر میں لانے سے گریز نہیں کیا ہے اس لئے ان مضامین میں نیا پن ہے اور کہیں کہیں کھر دری سچائی بھی ہے۔ اس حصہ کا پہلا مضمون حمد اور اس کی روایت بہت عمدہ اور معلوماتی ہے۔

اس کتاب کا اگلا حصہ ''شہر نثر نگاراں'' ہے۔ اس میں منٹو، قیصر شمیم، شمس صابری، کمال احمد، ڈاکٹر الف انصاری، شمس افتخاری، خورشید اقبال اور نور الہدیٰ کے نثر کارناموں کے حوالے سے مضامین شامل ہیں۔ یہاں بھی انداز توضیحاتی اور تبصراتی ہے۔ ''منٹو سے مکالمہ بعد از مرگ'' دلچسپ تحریر ہے۔ یہ تحریر نصر اللہ نصر کی فکر آسمان کا نمائندہ

ہے۔ اس حصے میں ''دلی جو ایک شہر ہے'' سفرنامہ بہت خوب ہے۔ انہوں نے دلی کے سفر کو یادگار بنادیا ہے۔ اس سفرنامے میں جذبات بھی ہیں اور سفر کی رنگینیاں بھی۔ ''اردو زبان کی تولید وتشکیل'' کے عنوان سے شامل مضمون میں زبان کی تشکیل وہ اس کے آغاز سے بحث کی گئی ہے۔

آخری حصہ ایک طویل تحقیقی مضمون ''بنگال کے نظم گو شعراء'' پر محیط ہے۔ یہ طویل مضمون صفحہ ۲۲۸ سے لے کر ۲۷۷ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بنگال کے نظم نگار شعرا اور ان کے کلام کی پیش کاری نیز ان پر نقد وتبصرے شامل ہیں۔ نصر اللہ نصر نے اسے پہلی قسط بتایا ہے اس لئے یہ مضمون اور بھی سفر طے کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

نصر اللہ نصر کی اس کتاب کے بارے میں یہ کہا جانا بہتر ہے کہ انہوں نے شاعری اور نثر کے حوالے سے چند شخصیات کو مرکز میں رکھ کر مضامین تحریر کیے ہیں اور اس کو کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش ادب پسند اذہان کے درمیان ضرور پسند کی جائے گی۔ کتاب کی طباعت اچھی ہے اور سرورق بھی جاذب نظر ہے۔ لائبریری ایڈیشن کے لئے یہ قیمت مناسب ہے مگر قارئین کے لئے اسے کم ہونا چاہئے۔ بھلے ہی اس کا پیپر بیک ایڈیشن ہی کیوں نہ لانا پڑے۔

....

- **کتاب کا نام:** پھول خوشبو دعا (افسانے) **مصنف:** الیاس فرحت **اشاعت:** ۲۰۱۴ء **قیمت:** دوسو روپے **رابطہ:** نوائے دکن پبلی کیشنز، بیت العنکبوت، رشیدہ پورہ، اورنگ آباد، دکن (مہاراشٹر) **مبصر:** ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

الیاس فرحت افسانہ نگار ہیں بلکہ جنوئین افسانہ نگار ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''لمس کا المیہ'' تقریباً بیس سال قبل شائع ہوا تھا۔ اور اسے فاضل قارئین وناقدین نے پسند کیا تھا۔ ان کے افسانے رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ نام افسانوں کے حوالوں سے شناسا ہے۔

زیر مطالعہ افسانوی مجموعے میں کل تیس افسانے شامل ہیں۔ ان تیس افسانوں میں مجھے جرأت، معصوم، بے یقینی کا عذاب، نوکری، گریز، فساد کی جڑ، گم شدہ کڑی، تیور، اعتبار اور نہیں افسانے زیادہ پسند آئے۔ ان افسانوں میں موضوع کو برتنے کا اندازہ نہایت عمدہ ہے۔ سادگی سے ماجرا کو اختتام تک پہنچانے میں الیاس فرحت نے کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ ان کے کردار مانوس لگتے ہیں اور ان کی نفسیات اور افعال متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ افسانہ ''پھول خوشبو دعا'' جو اس مجموعے کا نام بھی ہے مثبت افکار کا وہ آئینہ ہے۔ جس میں ماں بیٹی کی نئی اور پر قوت تصویر صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس افسانے میں بیٹی کا کردار ہمارے معاشرے کی دقیانوسی سوچ کے خلاف سینہ سپر نظر آرہا ہے۔ اپنی ماں کی شادی کرانے کا جذبہ اس افسانے کی وہ خوبی ہے جس پر جتنا رشک کیا جائے وہ کم ہے۔ ٹھیک اس افسانے کے برخلاف ایک افسانہ ''تیور'' ہے۔ اپنی بیوی کو غلط لوگوں سے بچانے کے بجائے وہ ہر قیمت ادا کرکے نوکری کرنے پر مجبور کرنے والے شخص کی کہانی دراصل آج کی زندگی کا وہ المیہ ہے جو حیرت زدہ کرتا ہے۔ پست ہورہی انسانیت اور مٹتی ہوئی اقدار پر افسوس صد افسوس کرنے کا جی چاہتا ہے۔ روی اور رما (میاں بیوی) کے درمیان رونما ہونے والے اس سفاک واقعہ کو الیاس فرحت نے ہمارے سامنے رکھ

کر انسان کی پستی کو پیش کیا ہے۔ یہ بھی عمدہ کہانی ہے۔ اسی طرح دوسری کہانیاں بھی کسی نہ کسی اہم موضوع پر محیط ہے۔

الیاس فرحت کی افسانہ نگاری روایت کی پاسدار ہے۔ بیان بھی روایت کا مضبوط حصہ ہے۔ معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات ان کا سرمایہ ہیں۔ ایک سوچہتر صفحات کا یہ افسانوی مجموعہ کہیں بھی مایوس نہیں کرتا ہے بلکہ ہر افسانہ ذہن میں کوند جانے کے قابل ہیں۔ افسانہ نگار نے حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے سماجی مسائل کو بیان کیا ہے۔ ان کی حقیقت پسندی پیش لفظ سے بھی عیاں ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''.....میرے افسانے، انشائیے، افسانچے اور ریڈیائی ڈرامے کے مسودے صندوقوں اور الماریوں میں بند پڑے رہتے اور کوئی نام لیوا بھی نہیں رہتا، چونکہ میرے بچے سب انگریزی میڈیم سے پڑھے ہوئے ہیں اور ان کو اردو ادب کیا انگریزی ادب سے بھی کوئی دلچسپی نہیں البتہ موبائل فون سے مشغلہ ان کا چوبیس گھنٹے قائم ہے۔ اللہ خیر کا معاملہ ان کے ساتھ رکھے۔ اب یہی دعا ہے۔''

بے شک بیشتر اردو ادیبوں کے یہاں یہی صورت حال ہے۔ اردو زبان ہمارے گھروں میں بستر مرگ پر ہے۔ ہمارے بعد اس سرمایہ کی حفاظت پتہ نہیں کون کرے۔

یہ مجموعہ مقبول ہوگا ایسا میرا ماننا ہے۔ اس مجموعے کے افسانے قارئین پہلے بھی پڑھ چکے ہیں چونکہ تمام افسانے رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ پیپر بیک والی یہ کتاب عمدہ چھپی ہے۔

....

● **کتاب کا نام:** اور کیا ہے نیا کہانی میں (نثری کاوشیں) **مصنف:** عارف خورشید **اشاعت:** ۲۰۱۵ء **قیمت:** ۳۰۰ روپے **ناشر:** نوائے دکن پبلی کیشنز، بیت العنکبوت، مجنوں ہلز، رشید پورہ، اورنگ آباد (مہاراشٹر) **مبصر:** ڈاکٹر مجیر احمد آزاد

عارف خورشید ایک اچھے اور سلجھے ہوئے نثر نگار ہیں۔ حالانکہ ان کی پہلی تصنیف شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا آئینہ'' (۱۹۹۵ء) شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے اب تک ان کی کاوشوں میں نثر کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔ انہوں نے خاص طور سے افسانے اور افسانچے تخلیق کیے ہیں، خاکے اور تبصرے بھی ان کے قلم سے قارئین تک آئے ہیں۔ ''سنہری رات کا فریب''، ''احساس کا زخمی مجموعہ''، قافلے والوں کا سچ کہنا'' افسانوی مجموعے میری نگاہ سے گذرے ہیں۔ ان کی ایک اہم کتاب ''وقت کی چاک پر'' بھی پڑھنے کا موقع مجھے ملا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد تقریباً ۱۷ ہے۔ زیر نظر کتاب ان کی نثری کاوشوں کا مجموعہ ہے۔

''اور کیا ہے نیا کہانی میں'' چھ طرح کی نثری کاوشیں ہیں۔ اس میں افسانے بھی ہیں اور افسانچے بھی۔ تبصرے اور تجزیے ہیں تو خاکے بھی ہیں اور ایک مضمون بھی ہے۔ عارف خورشید صاحب نے اپنے پانچ افسانوں سے اس کتاب کا آغاز کیا۔ ان میں سے ''دل ہوا ہے چراغ'' اور ''آگ رکھی ہے سر پر'' کی فضا بندی اور کہانی بہت عمدہ ہے۔ باقی تینوں کہانیاں ان سے کم تو نہیں مگر موضوع کو پیش کرنے کا جو ہر اول الذکر دو افسانوں میں ہے اس سے افسانہ قاری کے دل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر سحر سعیدی اور رؤف انجم پر تحریر کردہ خاکے مزیدار ہیں اور شخصیت کے شایان شان ہیں۔ اس کتاب میں شامل آٹھ کتابوں پر تبصرے کی خاص بات یہ ہے کہ سات کتابوں

کا تعلق فکشن سے ہے اور عارف خورشید خود ایک عمدہ افسانہ نویس ہیں۔ اس لئے ان کا تبصرہ متن کے اندرون تک رسائی کا ذریعہ بنا ہے۔ یہ بھی خاص بات ہے کہ تمام تبصروں پر عنوان لگائے گئے ہیں۔ آتش دان (ناول)، شیشہ ٹوٹ جائے گا (ناولٹ)، کل یگ کا بجوکا (افسانچے)، ''آئینے مر گئے''، ''غلط پتہ'' اور ''قفس'' افسانوی مجموعوں پر تبصرے میں انہوں نے فن کار کے فکر اور فن پارہ میں موجود حسن کو خوب سراہا ہے۔ تجزیے کے طور پر انہوں نے انور قمر کا افسانہ ''ہاتھیوں کی قطار'' اور شوکت حیات کا افسانہ ''کہ'' کو چنا ہے۔ تجزیہ جس انداز کے مطالعہ کا متقاضی ہے اس کا خاص خیال عارف خورشید نے رکھا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مذکورہ دونوں افسانے معیار و مقام پر کھڑے اترتے ہیں۔ ''ثلاثی؟'' کے عنوان سے ان کا مضمون اس صنف کے موجد اور اس کی ارتقاء پر محیط ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس بحث میں اس صنف کا خالق اور اس کے نام داتا کی تلاش و جستجو پر زیادہ محنت کی گئی ہے اور حوالے بھی لگائے گئے ہیں۔ یہ مضمون ثلاثی کو واجب حق دلانے کی کوشش کہی جائے گی۔

اس کتاب کا آغاز افسانوں سے ہوا ہے تو آخری حصے میں ایک سو اکتالیس افسانچے شامل کیے گئے ہیں۔ ان افسانچوں میں بہت اچھے افسانچے بھی ہیں جن میں ماجرا بھی ہے اور اختصار کا حسن بھی۔ مگر یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ بہت سے افسانچے ہرگز متاثر نہیں کرتے بلکہ چند نثری جملے معلوم پڑتے ہیں۔ جناب عارف خورشید صاحب کی طرح اور دوسرے افسانچہ نگاروں کو اس جانب توجہ دینی چاہئے کہ اس طرح کی تخلیق میں حسن تب آئے گا جب اس میں کہانی پن اور آغاز و انجام میں چابکدستی دکھائی جائے گی۔ صرف اختصار سے بات بہت نہیں بنتی ہے۔

اس کتاب کی قیمت تین سو روپے رکھی گئی ہے جو زیادہ ہے۔ عام قارئین کی خریداری کے لئے قیمت کا مناسب ہونا ضروری ہے۔ ان نثری کاوشوں کے ذریعے عارف خورشید کے ادبی سروکار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

....

● کتاب کا نام: پروین شاکر: حیات اور کارنامے مصنفہ: ڈاکٹر خالدہ ناز اشاعت: ۲۰۱۵ء
قیمت: تین سو روپے رابطہ: نیو کالونی، اسلام نگر بھاگلپور (بہار) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

ڈاکٹر خالدہ ناز کے افسانے اور مضامین اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کا نام ادب کے لئے نیا نہیں ہے۔ ان کا ذوق و شوق ادب سے ان کی گہری وابستگی کا غماز ہے۔ یہ نکتہ اور بھی اہم ہے کہ انہوں نے تحقیق و تنقید کے لئے پروین شاکر کا انتخاب کیا ہے۔

پروین شاکر: حیات و کارنامے'' چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ حرف آغاز کے بعد باب اول میں پروین شاکر کا تعارف اختصار سے کیا گیا ہے۔ اس میں ان کی پیدائش، تعلیم، ملازمت، شعر گوئی، شعری مجموعے، اعزازات اور ازدواجی زندگی کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ دوسرا باب پروین شاکر حیات اور کارنامے کے مختصر جائزے پر محیط ہے۔ اگلا باب پروین شاکر بحیثیت شاعرہ ایک مجموعی جائزہ ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر ناز نے ان کو اردو کی ایک عظیم شاعرہ قرار دیتے ہوئے ان کے نمائندہ اشعار کوڈ کیے ہیں۔ متعدد اہل علم کی آراء سے اس باب کو مدلل کیا گیا ہے۔ چوتھا

باب پروین شاکر کی غزل نگاری کے لئے مختص ہے۔ اس میں جامعیت کے ساتھ شاعرہ کی غزلوں کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں بھی چندہ اور نمائندہ اشعار حوالے کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ پانچواں باب ہم عصر شاعرات سے پروین شاکر کی شاعری کا تقابلی مطالعے پر محیط ہے۔ ہم عصر مشاہیر شاعرات کے درمیان ان کی حیثیت مسلم رہی ہے اور بعض معاملات میں وہ ممتاز و منفرد بھی تھیں۔ سب سے آخر میں پروین شاکر کے مقام کا تعین اس کتاب کا خاصہ ہے۔ کتابیات کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ناز نے معیاری کتب و رسائل سے سروکار رکھا ہے۔

پروین شاکر کی شاعری پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ وہ ایک منفرد آواز تھیں۔ ان کی شاعری میں تازگی ہنوز محسوس کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر خالدہ ناز نے دلجمعی سے اس اہم کام کو انجام دیا ہے۔ اس کتاب میں شامل پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر میں پروین شاکر کی تخلیقی ہنرمندی کا اجالا ہے تو مصنفہ کو عرق ریزی کی داد بھی ہے۔ فلیپ پر ایک جانب پروفیسر علیم اللہ حالی اور دوسری جانب قمر جہاں کی آراء سے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ دو سو چالیس صفحے کی اس کتاب کا گٹ اپ اچھا اور متاثر کرنے والے ہے۔ سرورق پر پروین شاکر اور پشت پر ڈاکٹر خالدہ ناز کی تصویریں شامل اشاعت ہیں۔

پروین شاکر کو پسند کرنے والے اور ان کے تعلق سے کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک عمدہ تحفہ ہے۔ یقین ہے یہ کتاب پسند کی جائیگی۔

....

- **کتاب کا نام: دکن کی چند ہستیاں (تنقیدی مضامین) مصنف: رؤف خیر اشاعت: ۲۰۱۴ء**
قیمت: ۲۰۰ روپے رابطہ: 9-11-137/1 موتی محل، گولکنڈا، حیدرآباد-۸ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

''دکن کی چند ہستیاں'' رؤف خیر کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے محتویات کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''یہاں چند ایسی شخصیتیں ضرور ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو منوا کر چھوڑا۔ ان میں سے بھی چند منتخب ہستیوں کا میں نے کہیں تفصیلی کہیں اجمالی تذکرہ کیا ہے۔'' اس اظہاریے کی روشنی میں اس کتاب کا حدود دکن قرار پاتا ہے۔

اس کتاب میں جن شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے اور جن کی ادبی کارگذاریوں کو سپرد قلم کیا گیا ہے ان میں چند اہم ہیں جن کو شہرت دوام حاصل ہے۔ کچھ ایسے فنکار بھی ہیں جن کی تھوڑی کم شناسائی مملکت ادب میں ہے۔ ولی دکنی، خورشید احمد جامی، مخدوم محی الدین، سلمان اریب، شاذ تمکنت، اوج یعقوبی، یوسف قادری، اقبال متین، مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر محمد علی اثر، اعظم راہی، انل ٹھکر وغیرہ کی ادبی و عملی شخصیات سے اہل اردو واقف ہیں۔ ان پر کتابیں آنی چاہئے۔ جناب رؤف خیر کے یہ مضامین ان حضرات کی شخصی خدمات کے ساتھ دکن میں زبان و ادب کی ترویج و مقبولیت کا پتہ دیتے ہیں۔ دکن کے اہم قلم کی تاریخ لکھتے ہوئے فطری طور پر اردو ادب میں اضافہ کر رہے ہیں۔

اس تصنیف میں چند مضامین کا ذکر میں بطور خاص کرنا چاہتا ہوں جن کے مطالعے سے مصنف و محقق و ناقد کے طور پر رؤف خیر کی اہمیت فزوں تر ہو جاتی ہے۔ آج کے منظر نامے میں نظم ''حیدرآباد میں اردو شاعری کی پون صدی''

اور ''حیدر آباد میں بچوں کا ادب'' ایسے مضامین ہیں جن میں شخصیات کے حوالے سے حیدر آباد کی ادبی فضا کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ حیدر آباد قدیم زمانے سے گیسوئے اردو کی مشاطگی میں لگا ہوا ہے۔ یہاں کی اہم شخصیات کے کارنامے روز روشن کی طرح واضح ہے۔ یہ کتاب اس کڑی کا ایک حصہ ہے۔ دکنی ادب اور خاص طور سے حیدر آباد کی ادبی وعملی کارگذاریوں کو جاننے کے لئے یہ کتاب معاون ہوگی۔

اس کاوش کو سراہا جانا چاہئے اور اس کو اہمیت دینی چاہئے۔ علاقائی ادبی تاریخوں کی یکجائی سے تاریخ ادب کا ایک بسیط منظرنامہ تیار کیا جاسکتا ہے۔

....

● **کتاب کا نام: ہر بوند سمندر (افسانچوں کا مجموعہ) افسانچہ نگار: حسن رہبر اشاعت: ۲۰۱۵ء**
قیمت: ایک سو روپے رابطہ: اشرف بلڈنگ، حسین آباد بھاگلپور (بہار) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

حسن رہبر بزرگ ادیب وفن کار ہیں۔ افسانہ نگاری سے ان کو خاص شغف ہے۔ ''ایک پل کا فاصلہ'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ ابھی گذشتہ سال ۲۰۱۴ء میں ''چسکا'' کے نام سے دوسرا افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔ دونوں کو سنجیدہ ادبی حلقے میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کے یہاں سفاک حقیقت جب فسانہ بنتا ہے تو دل میں جا بستا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں خیالی پلاؤ پکانے اور بے معنی موضوعات گڑھنے کے بجائے آج کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا واضح رنگ ان کے افسانچے میں بھی موجود ہے۔

''ہر بوند سمندر'' میں کل پینسٹھ افسانچے ہیں۔ ان میں زیادہ تر افسانے آپ کو رکنے، سوچنے اور آئینہ بر ہونے کو ضرور مجبور کریں گے۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانچے میں افسانوں کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔ میں (ذاتی طور پر) افسانہ نگاری کی روایت کا پاسدار رہا ہوں۔ فنی اعتبار سے افسانہ کو جن معیار ومیزان پر کھرا اترنا چاہئے یا یوں کہئے کہ افسانے کا جو میزان مروجہ ہے اس پر مذکورہ افسانوی مجموعے کے بیشتر افسانچے کھرے اترتے ہیں۔ اس لئے حسن رہبر ان افسانچہ نگاروں کے لئے رہبر ہونے چاہئے جو کچھ بھی لکھی تحریر کو افسانچہ کہنے پر آمادہ ہیں۔ افسانچہ نگاری کے حوالے سے معتبر قلمکار کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں اور اس صنف کے تعلق سے ملک گیر پیمانے پر فورم کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اس کے باوجود آجکل رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے افسانچے شاذ ونادر ہی متاثر کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی ایک بڑی وجہ اس صنف کے تقاضے کو پورا نہیں کرتے ہوئے صرف جملے بازی پر اکتفا کرنا ہے۔ خیر یہ ایک ضمنی بات تھی۔ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اس بھیڑ بھاڑ میں حسن رہبر کا یہ مجموعہ ''ہر بوند سمندر'' ہماری پیاس کو سیراب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں نسیم محمد جان کے افسانوں کا مجموعہ ''پل دو پل'' بھی اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ منظر عام پر آیا تھا۔ انہوں نے تو اپنے پیش لفظ میں افسانچے کے لئے کہانی پن کو ضرور قرار دیا تھا۔

''ہر بوند سمندر'' کے کسی ایک دو افسانچے کا ذکر کرنا دوسرے کی اہمیت کو کم کرنے کے برابر ہے۔ البتہ مجھے ''ایک ان کہی کہانی''، ''گنہگار''، ''ڈرامہ نگار''، ''تجویز'' اور ''عمل'' افسانچے باقی افسانچوں سے انیس لگے۔ رہبر صاحب پختہ ذہن اور تجربہ کار افسانہ نگار ہیں۔ ان سے ہمیں اور بھی بہت سارے اچھے افسانوں کی امید ہے جن

میں معاشرتی کج رویاں اور انسانی سر بلندی کی گاتھائیں ہوں۔ یہ مجموعہ افسانچے کی دنیا میں اہم مقام حاصل کرے گا، مجھے ایسی توقع ہے۔

....

● کتاب کا نام: ہر سانس محمد پڑھتی ہے شاعر: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اشاعت: ۲۰۱۵ء
قیمت: ۱۰۰ روپے رابطہ: کوہسار، بھیکن پور-۳، بھاگلپور (بہار) مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی شخصیت مختلف الجہات ہے۔ ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی خوبی محبت ورواداری ہے۔ یہ محبت ''سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ'' کے مصداق ہے۔ وہ ایک کثیر التصانیف ادیب وفنکار ہیں۔ ادب کا شاید ہی کوئی صنف ان کے ذوق وشوق کا نمائندہ نہ بن سکی ہو بلکہ بیشتر اصناف میں انہوں نے طبع آزمائی کی اور قارئین سے داد وتحسین بٹورے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ان کا شیوہ ہے۔ شاعری میں مقدس ترین سخن شاعری حمد ونعت میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ زیر مطالعہ شعری مجموعہ ''ہر سانس محمد پڑھتی ہے'' ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے۔

ثنائے جلیل کے بعد اگر کوئی گفتگو مقدس ہو سکتی ہے تو وہ ہمارے پیارے نبی محمد کی توصیف ہے۔ ان کی توصیف میں زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ، ہر صدا باعث رحمت اور اطمینان وسکون قلب ہے۔ نبی کی تعریف میں جتنا گنگنایا جائے کم ہے۔ نبی پاک کی ذات بابرکت کے تمام لمحے قابل تقلید ہیں اور ان سے انسانی زندگی کی فلاح یقینی ہے۔ گفتنی کے عنوان سے انہوں نے اس مجموعے کے پیش لفظ میں قرآن میں رسول کی اطاعت وفرماں برداری کے احکام و بیان کو سلیقے سے قارئین کے روبرو کیا ہے۔ سورۃ آل عمران، سورۃ النساء، سورۃ الاعراف، سورۃ الجدید، سورۃ التحریم وغیرہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول عربی محمدؐ سے وابستگی کے آیات کا مفہومی ترجمہ کرتے ہوئے پروفیسر مناظر ہرگانوی نے یہ واضح کیا ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی ذات ہے جس کی تعریف وتوصیف سے دلوں کو روشن کیا جاسکتا ہے۔ اسی نثری تحریر میں انہوں نے اپنی نعت خوانی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''میں نے ازل سے ابد تک محیط رسول ﷺ کے حرف وصوت کی حکایت کو متاع قرار دیا ہے۔ میری نعت گوئی میں جذب دروں ہے، ہر نقش بصیرت ہے اور سوز دروں بھی ہے۔ شاید گناہ معاف ہو سکے اور بارگاہ الٰہی میں محبوبیت کا مقام مل سکے۔'' (ص:۴)

اس مجموعے کی باضابطہ ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ اس حمد میں سورہ مریم اور سورہ کہف کے اقوال سے بصیرت حاصل کی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا انسان کے لئے ممکن نہیں جیسے ابدی حقیقت لیے خیالات موزوں کیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں اس حمد کے آخری چند اشعار:

انسان کا علم معتبر   یارب شناسی کے گہر
سب مل کے بھی کردیں ادا   تعریف و توصیف خدا
وصف و ثنائے کبریا   ممکن نہیں ممکن نہیں

مشمولہ چاروں حمد پاک کا لفظ لفظ اللہ تعالی کی تعریف وتوصیف سے مزین ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اللہ تعالی کی توصیف کا جو لہجہ اختیار کیا ہوا ہے اس میں بندگی کا حسن ہے۔ اطاعت اور معبودیت سے لبریز جذبات شعر کے پیکر میں باادب سربہ سجود ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کائنات یہ رنگ بہار تیرا ہے　　فلک کا روپ زمیں کا نکھار تیرا ہے
صبا میں رقص گلوں میں خمار تیرا ہے　　چمن چمن میں شجر نغمہ بار تیرا ہے

حمد پاک کے بعد نعتیہ شاعری کا رنگ اطاعت رسول اور سیرت پاک کے محبت سے لبریز ہے۔ اس مجموعہ کے نعت پاک کا آغاز اس طرح سے ہوا ہے:

جب بھی کبھی پڑھا ہے صلے علی محمدؐ　　ہر درد مٹ گیا ہے صلے علی محمدؐ
اپنا تو تجربہ ہے اب تک کا مناظر　　اک نسخہ کیمیا ہے صلے علی محمدؐ

نعت کی تخلیق بڑے ہی احتیاط کی متقاضی ہوتی ہے۔ فکر میں ذرا سی لغزش ثواب کے بجائے ایمان اور مذہب پر سوال کھڑے کر دیتی ہے۔ جذبات میں ذرا سی بداحتیاطی شرک وکفر کے سرحد کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ رسول کا مرتبہ ان کے شایان شان بیان نہ ہونے سے سبکی ہو جاتی ہے اور حق رسول ادا نہیں ہو پاتا ہے۔ صرف الفاظ کی بندش سے محبت رسول کا عظیم و معتبر جذبہ پورا نہیں ہوتا ہے بلکہ اس میں طہارت خیال، دل کی پاکیزگی اور سب سے بڑھ کر سیرت پاک کا مطالعہ اور ایمان جذبہ درکار ہے۔ نعتیہ شاعری کرنے والوں میں مذکورہ خیالات کی پاسداری کرنے والے شاعر نہ صرف پسند کیے جاتے ہیں بلکہ ان کا دل ان نغموں سے مسرت حاصل کر لیتا ہے اور قرب الٰہی اور حب رسول کا شیدائی کہلانے کا حقدار بن جاتا ہے۔ شاعر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان تمام باتوں کا خیال رکھا ہے جن میں عظمت رسول اور سیرت پاک سے انس کا جذبہ موجود ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

محمد سر لفظ کن، محمد راز یزدانی　　بنائے بزم دو عالم بقائے نظم حقانی
جہان فکر پر چھائی ہوئی ہیں ظلمتیں ہر سو　　محمد عالم افکار میں قندیل نورانی
شاہد قرآن پاک ہے خلق عظیم کا　　اسلام کے فروغ کا امکان رسول ہیں
محمد کی محبت شرط ٹھہری دین و ایماں کی　　بجز اس کے نہیں کوئی بھی صورت کام آئے گی
لبوں پہ اپنے حلاوت صور پھیل جاتی ہے　　کہ جیسے شیریں ثمر ہے رسول پاک کا نام

اس نعتیہ مجموعہ کے آخر میں ایک اہم نکتہ کا انکشاف شاعر نے کیا ہے۔ کبیر کی ایک چوپائی پیش کرتے ہوئے انہوں نے یہ بتایا ہے کہ کبیر کے فارمولے کے مطابق ابجد کی رو سے حساب کرنے پر محمدؐ کا نام آتا ہے۔ میں یہ ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں کہ مناظر عاشق ہرگانوی کا ذہن ہر دم کچھ نیا سوچتا رہتا ہے اور وہ صرف سوچنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کو عملی طور پر بھی اپناتے ہیں۔

جیسا کہ انہوں نے گفتنی میں لکھا ہے کہ اللہ تعالی اسے قبول کرنے والے ہیں اس کو پڑھنے والوں کو بھی خدا اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ یہ مجموعہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے دلکش ہے۔

....

● کتاب کا نام: جہان آرزو (شعری مجموعہ) شاعر: محمد نجم الثاقب آرزو اشاعت: ۲۰۱۵ء قیمت: ۲۰۰ روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

نجم الثاقب آرزو کا پہلا شعری مجموعہ "جہان آرزو" میرے مطالعے میں ہے۔ اس کتاب میں شامل تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعبۂ حیوانیات، قاضی احمد ڈگری کالج جالے دربھنگہ میں لکچرار ہیں۔ شاعری سے شغف ہے جیسا کہ شعری مجموعہ کی اشاعت سے یہ ثابت ہے۔ انہوں نے اپنی بات میں شاعری اور شعری مجموعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "...... گرچہ میں شاعری کے قواعد او ضوابط سے کچھ نابلد سا ہوں پھر بھی اپنی کوشش جاری رکھے ہوا ہوں۔" آگے لکھتے ہیں کہ "...... چلتے چلتے ایسے علم کے سمندر کے پاس پہنچ گیا جسے دنیائے ادب جناب حافظ عبدالمنان طرزی کے نام سے جانتی ہے۔ ان سے میری پہلی ملاقات نہیں تھی۔ اپنی شدید مصروفیت کے باوجود بھی اصلاح کی حامی بھر لی۔ یہ ان کی محبت اور دعا کا ثمرہ ہے کہ میرا یہ مجموعہ آپ کے سامنے حاضر ہے۔" اس حلفیہ کے بعد ان کی شاعری کا مطالعہ خوشگوار لمحوں سے سرشار کرتا ہے۔ بطور خاص غزل کے اشعار حسن معنی کے سبب دل لبھاتے ہیں۔ سماجی، ملکی اور بین الاقوامی عصری مسائل ان کی غزلوں کے اشعار میں جابجا مل جاتے ہیں۔ سادگی کا خاص خیال رکھا ہے انہوں نے۔ نہ فکری پیچیدگی میں الجھتے ہیں اور نہ ہی فلسفیانہ مزاج پایا جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں آرزو کا رنگ واضح دکھائی پڑتا ہے:

اپنے اسلاف کی عظمت کو تو ہے بھول گیا
ہاں مگر یاد انہیں سارا جہاں کرتا ہے

تم کو آتا نہیں کچھ کرنا برائی کے سوا
ہم کو آتا ہے بھلا کرنا بھلا کرتے ہیں

قریب آؤ تو آپس میں کچھ بات ہو
نہ جانے کہاں پھر ملاقات ہو

دشمن میں اور دوست میں اب فرق کچھ نہیں
گویا کسی کا کچھ نہیں اب اعتبار ہے

دل میں اس بات کو تم بسائے رکھنا
خود کو آرام و سکوں سے ہی بچائے رکھنا

ایک مدت سے سمجھتے رہے جس کو اپنا
ایسا بدلا کہ ترا چاہنے والا نکلا

اپنے منزل پہ پہنچتے بھی یقیناً ہیں وہی
حوصلے والے ہیں اور عزم کے جو پکے ہیں

غزلوں کے بعد پندرہ نظمیں کتاب میں شامل ہیں۔ ان میں سے سانحہ گجرات، پیغام عمل، علمائے حق اور سبب شاعری متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ نظم نگاری سے زیادہ غزل گوئی میں نجم الثاقب آرزو کا رنگ نکھرا ہوا ہے۔ ان کی شاعری کے تعلق سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (نجم الثاقب آرزو کی غزلوں میں اظہار کی صورتیں) اور پروفیسر عبدالمنان طرزی (واردات دل کا شاعر: آرزو) کی تحریریں اس مجموعے کی زینت بنی ہیں۔ دونوں تحریروں میں آرزو کی شاعری کا اختصاصی پہلو اجاگر ہوا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ "جہان آرزو" سے نجم الثاقب آرزو کا سفر اور تابناک ہوگا۔

....

- کتاب کا نام: ”اردو کا ترقیاتی منظرنامہ اور فاصلاتی نظام تعلیم“ مصنف: ڈاکٹر محمد احسن اشاعت:: ۲۰۱۵ء قیمت: ۲۹ روپے رابطہ: ریجنل سنٹر مانو، ۱۲؍ احمد آباد پیلس روڈ، کوہ فضا، بھوپال مبصر: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

ڈاکٹر محمد احسن کا شمار ان قلم کاروں میں ہوتا ہے جن کی تحریروں میں تعلیم اور فروغ تعلیم کو مرکزیت حاصل ہے۔ آپ اردو زبان و ادب سے بے حد لگاؤ رکھتے ہیں بطور خاص اردو ذریعہ تعلیم پر آپ کی گہری نگاہ ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے مسائل سے آگاہ ہیں۔ نظام تعلیم کے صورت حال اور نت نئی تبدیلیوں کے شاہد ہیں۔ زیر نظر کتاب ”اردو کا ترقیاتی منظرنامہ اور فاصلاتی نظام تعلیم“ ان کے افکار کا آئینہ ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ الگ الگ حصے موضوعاتی اعتبار سے مضامین کی شمولیت کے لئے مختص ہیں۔

پہلے باب میں 'اردو کا منظرنامہ' شہ سرخی کے تحت چار مضامین شامل اشاعت ہیں۔ مصنف نے مولانا آزاد کے حوالے سے مشمولہ تحریر میں ان کی تعلیمی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کو قومی تعلیمی پالیسی کے معمار اول سے تعبیر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی تعلیمی نظام مولانا آزاد کے کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ جب بھی ہندوستان میں تعلیمی پالیسیوں کی تاریخ رقم کی جائے گی مولانا آزاد کے افکار کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا مشکل ہوگا۔ اس مضمون میں مولانا آزاد کے دور وزارت میں قائم اداروں کی فہرست سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی نگاہ کتنی بسیط اور دور بیں تھی اور وہ ہندوستان میں تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے بارے میں کتنے فکرمند اور فعال تھے۔ وہ تعلیم اور تکنیک کے حوالے سے نیا ہندوستان کا خواب سجائے ہوئے تھے۔ یہ مضمون مولانا آزاد کی خدمات کا اعترافیہ ہے۔ دوسرے مضمون میں فاطمی کمیٹی رپورٹ اور مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے باطن میں قوم و ملت سے ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔ اس میں عوامی بیداری کی ضرورت پر بطور خاص زور دیا گیا ہے۔ 'عہد حاضر کا ترقیاتی منظرنامہ اور اردو زبان' مضمون میں اس پیاری زبان کے عصری تقاضوں پر بھرپور گفتگو کی گئی ہے۔ اس تحریر میں اردو کس کی زبان ہے، اردو کا لسانی علاقہ اور اس کے اثرات، اردو رسم الخط کے عصری تقاضے، نصاب اور طریقہ تدریس کی جدید کاری، مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے حق کا مطالبہ، اردو اخبارات و رسائل پر ایک نظر وغیرہ ایسے ضمنی نکات ہیں جس پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہاں مصنف کی رائے سے کئی سوالات قائم ہوتے ہیں اور اختلاف کی گنجائش بنتی ہے نیز بحث و مباحثہ کے دریچے کھلتے ہیں۔ اردو کا منظرنامہ کے تحت آخری مضمون میں اردو صحافت کے معیار و اقدار کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اردو اخبارات کے تابناک مستقبل کی بشارت دی گئی ہے۔ دوسری سرخی 'فاصلاتی تعلیم اور اردو' کے تحت پانچ مضامین میں مختلف زاویے سے اس نظام تعلیم کی سرگرمیاں، مسائل، بہتری کے امکانات کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے اور اردو کونسل کی لینگویج ٹیچنگ کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ 'مسائل اور تدارک' کے تحت ابتدائی نظام تعلیم کا جائزہ لیا گیا ہے اور تعلیم کے ذریعے مقتدریت کی تلاش و جستجو کرتے ہوئے مسلمانوں کی تعلیمی سطح اور سروکار پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس مضمون میں ڈاٹا بیس معلومات سے صحیح صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت اصطلاحات کی شمولیت ہے۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کی تحریر میں ان مضامین کی افادیت کا ذکر ہے۔ ۱۴۹؍

صفحات پر محیط یہ کتاب خوبصورت شائع ہوئی ہے۔ سرورق بھی عمدہ ہے۔ توقع ہے اہل علم و دانش اس سے استفادہ کرتے ہوئے پسند کریں گے اور ڈاکٹر محمد احسن کی اس کاوش کو ضرور سراہیں گے۔

....

● **نام رسالہ: ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ (جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء) مدیر اعزازی: ڈاکٹر امام اعظم ص: ۳۷۶ قیمت: ۱۰۰ / روپے رابطہ: ادبستان، محلّہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، دربھنگہ-۴ مبصر: اسلم چشتی (پونے)**

اکیسویں صدی کی شروعات میں ادبی افق پر ''تمثیلِ نو'' کا طلوع ہونا فالِ نیک ہے۔ تب سے اب تک اس کی تواناشعائیں ادبی ماحول کو زندگی بخش رہی ہیں۔ اشاعت کے چودھویں سال میں اس جریدے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے کیوں کہ ادب کے ہر حلقے میں اسے اعتبار کا درجہ ملا ہے۔ اس کا معیار منزل بہ منزل سفر کرتا ہوا ۱۴ ویں منزل پر پہنچ کر اپنے آپ کو منوا چکا ہے۔ اس ادبی صحافتی سفر کے میر کارواں ڈاکٹر امام اعظم ہیں جو تعلیمی تہذیبی اور ادبی دُنیا میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ ان کی فعالیت تمام ادبی حلقوں کو گرمائے رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر امام اعظم کسی ادبی گروپ کے آدمی نہیں لیکن ہر گروپ والوں کے وہ قریب ہیں۔ اپنے جریدے کو جو کردار جو معیار انہوں نے بخشا ہے وہ قابلِ توجہ اور قابلِ قدر ہے۔

''تمثیلِ نو'' کا ۲۸ واں شمارہ بھی سابقہ شماروں کی طرح ادب کے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہے۔ ضخامت، طباعت اور مواد کے لحاظ سے بھی اور ادبی صحافتی معیار کے اعتبار سے بھی یہ جریدہ دیدہ زیب ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے ہمیشہ کی طرح اداریہ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' میں کام کی باتیں لکھی ہیں۔ مختصر اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''مارچ ۲۰۰۱ء سے اُردو جریدہ ''تمثیلِ نو'' دربھنگہ سے پورے آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اسے قارئین کی اچھی تعداد میسر ہے۔ ادھر کئی برسوں سے اس کے موضوعاتی شمارے شائع ہو رہے ہیں۔ جہاں جہاں اُردو پڑھی، لکھی اور بولی جاتی ہے، وہاں وہاں یہ رسالہ پہنچتا ہے۔ نئی نسل میں اُردو کا چلن کم ہو گیا ہے۔ گھروں میں اُردو اور فارسی کم پڑھائی جا رہی ہے جس سے تلفظ کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے نیز اُردو داں طبقہ سمٹتا جا رہا ہے۔ ایسے پُر آشوب دور میں مدارس سے اُردو کو استحکام اور فروغ مل رہا ہے، جو خوش آئند ہے۔ حکومت کے سیاسی فکر و عمل سے ہم آگاہ ہیں پھر بھی حکومت اُردو کے بعض اداروں کو تقریباً ہر ریاست میں خاصی رقم دے کر اُردو والوں کو آزماتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی غور طلب ہے کہ کیا یہ خطیر رقم صد فیصد مناسب جگہ خرچ کی جا رہی ہے؟ اُردو والوں کو دوسری زبانوں کے اربابِ حل و عقد سے سبق لینا چاہئے کہ بنگلہ، اڑیا، گجراتی، مراٹھی، تمل، تیلگو اور بہت ساری زبانوں کے لئے ایک مہم کے تحت لوگ کام کرتے ہیں اور زبان کو زندہ اور توانا رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اُردو والے نہ جانے کیوں احساسِ کمتری کے شکار نظر آتے ہیں حالاں کہ سرکاری مراعات کی وجہ سے اُردو والوں کو بولڈ اور فعال ہونا چاہئے......'' (ص: ۴)

اس اقتباس میں موجودہ صورتِ حال کا اظہار بیباکی سے کیا گیا ہے، آئینہ دکھایا گیا ہے، تحریک دلائی گئی ہے، اندھیرے میں روشنی کی کرنوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم جو علمی و ادبی سرگرمیوں میں عملی طور پر مصروف رہتے ہیں یہ ان کی اُردو دوستی اور ادب نوازی ہے۔ ایک ایسے شخص کا ''تمثیلِ نو'' نام کا جریدہ نکالنا معنی رکھتا ہے۔

''تمثیلِ نو'' کا ہر شمارہ کچھ نہ کچھ خصوصیت رکھتا ہے اور اتنا سیر حاصل مواد اس جریدے میں رہتا ہے کہ قاری ایک نشست میں پڑھ نہیں سکتا، کئی نشستوں میں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس جریدے کو محفوظ کر لینا چاہئے تاکہ مشمولات میں شامل مواد حوالوں اور مثالوں کے لئے کام آئے۔ زیرِ نظر شمارہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس میں ''خصوصی مطالعہ: شہر کولکاتا'' کے علاوہ گوشۂ ڈاکٹر سید تقی عابدی اور گوشۂ پروفیسر منصور عمر (مرحوم) اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصی مطالعہ اور گوشوں پر گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن تفصیل کے بغیر بات ادھوری رہ جائے گی۔ اس لئے مختصراً عرض ہے کہ ''خصوصی مطالعہ: شہر کولکاتا'' میں شمس جلیلی کی نظم ''روداد کولکاتا'' بھرپور اور پر اثر نظم ہے۔ ڈاکٹر عرش منیر نے منور رانا سے خوب بات کی ہے۔ اس انٹرویو سے کئی انکشافات ہوئے ہیں۔ انجم عظیم آبادی اور کاملہ پرشاد کے مضامین معلومات افزا ہیں اور اس خصوصی مطالعہ میں ڈاکٹر امام اعظم نے ''کولکاتا کی مختصر ادبی تاریخ'' لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اختصار کے فن پر عبور رکھتے ہیں۔ برس ہا برس کی ادبی تاریخ کو انہوں نے چند صفحات پر مقید کر دیا ہے۔ یہ ان کے تحریری فن کا کمال ہے، اسی باب میں ڈاکٹر امام اعظم کی شاہکار نظم ''یہی کولکاتا ہے'' منظوم مختصر تاریخ بھی شامل ہے، جو خود اپنی مثال آپ ہے۔

گوشۂ ڈاکٹر سید تقی عابدی میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ڈاکٹر رشید گل، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر امام اعظم، احسان ثاقب نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کے فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے اور تین مضامین خود ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ہیں جو معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

گوشۂ پروفیسر منصور عمر (مرحوم) مختصر ہونے کے باوجود پر مغز اور معیاری ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کے دو مضامین منصور عمر کے فنِ تحریر کا مکمل تعارف کرواتے ہیں اس کے علاوہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر عبد المنان، پروفیسر رئیس انور، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کے مضامین قابلِ مطالعہ ہیں کیوں کہ وہ منصور عمر کی تحریروں کے پکے رنگ پیش کرتے ہیں۔ اس گوشے میں کچھ اہم شعراء نے منصور عمر کو منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔

۳۷۶ رصفحات کے اس جریدے میں نثر اور نظم کا ایک جہاں آباد ہے انٹرویو، افسانے، نظمیں، غزلیں، قطعات، تبصرے، تجزیئے وغیرہ تمام مشمولات پر اظہار ضروری بھی نہیں اور فی الحال ممکن بھی نہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم میری نظر میں عصرِ حاضر کے فعّال اُردو دوست، ہمدرد قلم کار اور ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ بحیثیت ایڈیٹر بھی یہ کامیاب ہیں۔ آخر میں ان کے اداریہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں کہ ناچیز ان کے لفظ لفظ سے متفق ہے:

''موجودہ نسل میں اُردو فہمی کی کوشش ہونی چاہئے جس کی ابتداء گھر سے ہو تو سب سے بہتر ہے۔ اسکول سے ہو تو بہتر ہے۔ یونیورسٹی سے ہو تو اچھا ہے کیوں کہ اُردو کسی ایک علاقے کی کسی ایک صوبے کی کسی ایک ملک کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ عالمگیر زبان ہے اور ہند و پاک کے علاوہ تیسری

بستیوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے، بولی اور لکھی جاتی ہے۔ اُردو کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، رسالے نکل رہے ہیں اور اُردو رابطے کی زبان بنی ہوئی ہے۔ ایسے میں سچے اور مخلص اُردو داں کی ضرورت ہے تاکہ یہ اپنے نام ونشان کے ساتھ توانا اور مستحکم ہوتی رہے۔" (ص:۴-۵)

....

● **نام کتاب: مناظر عاشق ہرگانوی سے انٹرویوز مرتب: ترنم جمال ص: ۲۱۲ قیمت: ۲۲۵ روپے**
رابطہ: معرفت ایس ایم پرویز کریم، ۲۶ر زکریا اسٹریٹ، بالائی منزل، کولکاتا-۷۳ مبصر: ایم نصر اللہ نصر (ہوڑہ)

ترنم جمال ایک خاتونِ خانہ ہیں مگر ادبی ذوق ان کے قلب وجگر میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مطالعے کا شوق بھی بلا کا ہے نیز مشقِ ادب بھی جاری ہے۔ ان کی تخلیقات گاہے گاہے اخبارات ورسائل میں آتی رہتی ہیں۔ اب تک دو درجن سے زیادہ افسانے لکھ چکی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ یوں تو وہ خاموش طبیعت کی خاتون ہیں مگر ان کا یہ کام (مناظر عاشق ہرگانوی سے انٹرویوز) ایک نہایت ہی اہم کام ہے۔ جس کی جتنی بھی سراہنا کی جائے کم ہے۔ ڈاکٹر مناظر صاحب سے ان کی انسیت اور شناسائی ایک عرصے سے نہیں بلکہ طالب علمی کے زمانے سے ہے۔ وہ عقیدت کی حد تک ان سے انسیت رکھتی ہیں۔ انھیں خوب پڑھا بھی ہے اور آج بھی پڑھ رہی ہیں۔ نیز ان پر لکھے گئے تمام مضامین اور خود مناظر صاحب کی تخلیقات کی محافظ بھی ہیں۔ جو عقیدت ومحبت کی دلیلیں ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

> "پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ بحیثیت ادیب وشاعر ان کی شہرت دور دور تک ہے۔ بحیثیت استاد بھی تعلیمی حلقے میں ان کا احترام اور ان کی عزت بہت زیادہ ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کی ایک فین میں بھی ہوں۔ میری ان سے خط وکتابت اس وقت سے ہے جب میں بی۔اے۔ آنرز کی طالبہ تھی اور میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔"

مذکورہ بیان سے ان کی مناظر پسندی اور ادب دوستی کا کھلا اظہار ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہر شاعر یا ادیب یا کسی بھی فنکار کا ایک آئڈیل ہوتا ہے (آج کل یہ رجحان کم ہو گیا ہے) موصوفہ کا بھی آئڈیل مناظر عاشق ہرگانوی رہے ہیں بلکہ آج بھی ہیں۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں مناظر صاحب پر جتنے انٹرویوز لکھے گئے ہیں ان کا ایک انتخاب ترنم صاحبہ نے کتابی شکل میں منظرِ عام پر لا دیا ہے جس کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ ایسے کام بہت کم ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی اتنے انٹرویوز کسی اردو ادیب وشاعر سے شاذ ونادر ہی لئے گئے ہوں گے۔ اس کتاب میں کل ۳۶ انٹرویوز شامل ہیں جس میں پاکستان، بنگلہ دیش، بلوچستان اور ہندستان کے مختلف علاقوں کے انٹرویوز شامل ہیں۔ اہم شخصیات میں فہیم اعظمی (پاکستان)، کیول دھیر (لدھیانہ)، افتخار امام صدیقی (ممبئی)، کوثر صدیقی (بھوپال)، ایوب جوہر (بنگلہ دیش)، ڈاکٹر امام اعظم (کولکاتا)، محسن جلگانوی (حیدرآباد)، نقوش نقوی (پاکستان)، قمر جہاں (بھاگلپور)، اکمل شاکر (بلوچستان)، سرفراز تبسم (پاکستان)، افضل خان (ہوڑہ)، احمد معراج (کولکاتا)، حسن فیضی (علی گڑھ) کے علاوہ ڈھیر سارے لوگوں کے انٹرویوز اکٹھا کر دیئے گئے ہیں جو نہ صرف مناظر صاحب کی شخصیت اور ادبی حیثیت

کا کھلا اظہار یہ ہیں بلکہ شعروادب کے حوالے سے بڑی اچھی گفتگو بھی شامل ہے۔ ذاتی سوالات کے علاوہ فن پر بھی مخلصانہ بحث موجود ہے۔ چند سے آپ بھی مستفید ہوں۔ (سوالات سے پرے ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں):

☆ مناظر عاشق ہرگانوی: یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی دادا خان بہادر حاجی عبدالرحیم وکیل کی نگرانی میں ہوئی جہاں صحیح معنوں میں ذہنی تربیت ہوئی۔ بی۔ اے۔ آنرز میں پوری یونیورسٹی میں اول آیا۔ اردو اور فارسی میں ایم۔ اے۔ کیا اور پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری لی۔ لاء کا ایک پارٹ بھی پاس کیا۔

☆ سات ماہ کو آپریٹیو بینک بہار شریف میں ہیڈ منیجر رہا۔ نو ماہ تک آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں پروڈکشن اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ 1978 سے 1981 تک مارکھم کالج ہزاری باغ میں صدر شعبۂ اردو رہا۔ مارواڑی کالج بھاگلپور میں لکچرر اور ریڈر رہا۔ پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ آف اردو بھاگلپور یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے طالب علموں کو پڑھایا اور اب تک تقریباً ۲۲ طلبا و طالبات کو پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری سے سرفراز کرا چکا ہوں۔

☆ میں 1963 سے رسائل میں چھپ رہا ہوں۔ ابھی تک ڈھائی ہزار سے زائد تخلیقات نظم و نثر شائع ہو چکی ہیں۔ ۶۰ (ساٹھ) کتابیں طبع ہو چکی ہیں آٹھ کتابیں پریس میں ہیں (2001 تک- اب یہ تعداد دو سو تک پہنچ چکی ہے) میں نے آزاد غزل، ہائیکو، ماہیا، کہہ مکرنیاں، تربینی، تکونی، دوبیتی، دوہا غزل، کہمن، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی اصناف اور رجحان کو خصوصی طور پر فروغ دیا ہے اور ان سب میں تجربے کیے ہیں۔ مندرجہ بالا اصناف کے فروغ میں اپنے رسالہ 'کوہسار' کو وقف کر دیا ہے۔

☆ میرے افسانوں کی تعداد سو کے آس پاس ہوگی۔ جدید افسانے تو لکھے ہی تصویری کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ شعور اور لاشعور کی کشمکش میں میرے افسانوں کے کردار جیتے ہیں۔ میں لفظوں کی جذباتی و احساساتی سطح کو چھونے کی کوشش کرتا ہوں اور لفظوں کی داخلی و حسی کیفیت کا عرفان حاصل کرنے کی ریاضت سے گزرتا ہوں۔ عصری میکانکی، صنعتی، تہذیبی اور مشینی ماحول میں حقیقی زندگی کا تصور میرے افسانوں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

☆ اسمیت زدگی، روایت برائے روایت اور فنی اظہار میں بلا واسطگی سے احتراز میری تنقید کی انفرادیت ہے۔ ناول افسانہ ڈرامہ اور شاعری و صحافت پر میں نے اپنی تنقید میں خصوصی توجہ دی ہے۔ جدیدیت، جدید حسیت، مابعد جدیدیت، تخلیقیت، ساختیات، پس ساختیات اور ردتشکیل پر بھی میں نے لکھا ہے۔

☆ میں عروض نہیں جانتا ہوں۔ بس شد بد رکھتا ہوں کہ شاعری کرتا ہوں۔ ویسے آزاد غزل، ہائیکو، کہہ مکرنیاں اور تربینی جیسی اصناف کے ساتھ ساتھ ماہیا کے عروضی نظام پر میں نے کام کیا ہے اور صحیح سمت کے تعین میں مدد پہنچائی ہے۔ غزلوں میں بھی نئے اوزان اختراع کئے ہیں۔

ان چند بیانات سے موصوف کی علمیت اور خاکساری کا اظہار ہوتا ہے۔ نیز ان کے ادبی قد کی شناخت میں کافی معاون و مددگار ہیں۔ ایسے بے شمار سوالات کے جوابات اس کتاب میں شامل ہیں جو ادبا و شعرا کے علم و واقفیت میں اضافے کے اسباب ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے ترنم جمال کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں اور پذیرائی کریں کم ہے۔

موصوف کی ہمت اور حوصلے کی داد دیں کہ صرف پسندیدگی اور انسیت کی بنیاد پر انھوں نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کا شاید ان کو بھی احساس نہیں۔ مگر مناظر عاشق ہرگانوی پر تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ ایک غیبی امداد اور تحفۂ عالیہ سے کم نہیں۔ اللہ انھیں ایسے کام میں تعاون کرے اور ان کے حوصلے کو دوبالا کرے۔ آمین۔ وہ لکھتی ہیں:

''آج ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا شمار بسیار نویسوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی' تنقید لکھی' افسانے لکھے' ناول لکھا' بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں اور بہت سی نئی اصناف کے فروغ میں حصہ لیا۔ ہمہ وقت یہ سلسلہ جاری ہے۔ اپنے رسالہ ''کوہسار'' کے ذریعے نئے ذائقے کی ادبی صحافت بھی کر رہے ہیں۔ 188 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کریڈٹ ہے جس کا مدِ مقابل کوئی نہیں ہے۔''

مذکورہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو جنون کی حد تک پڑھا ہے اور سمجھا بھی ہے۔ اس لئے کہ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ موصوف کے بیشتر اشعار انھیں زبانِ زد ہیں۔ ان کی نظر میں مناظر صاحب سچے اور کھرے شاعر ہیں۔ درج ذیل اقتباس سے ان کی ادبی صلاحیت' علمی قابلیت اور اسلوب کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو جملے گڑھنے کا ہنر آتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

''الگ الگ ماہ و سال میں لئے گئے اخبار میں شائع شدہ یہ انٹرویوز ادب کی نئی تاریخ مرتب کرتے ہیں' لفظ و معنی کے راز کھولتے ہیں اور فکر انگیز شعور و آگہی کا زندہ لہو بکھیرتے ہیں۔ ان میں جہاں قرأت کی سرگرمی ہے وہیں رنگارنگی اور کثیر المعنویت بھی ہے۔ جمالیاتی اور اقداری بصیرت سے بھرپور ان انٹرویوز میں اردو ادب کی زمینی حقیقت کی سچائی بھی ہے۔'' اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

....

● نام کتاب: رموزِ تحقیق مصنف: ڈاکٹر سید شاہد اقبال ص: ۲۶۴ قیمت: ۱۳۶روپے
رابطہ: روڈ نمبر ۱۰ ویسٹ بلاک' نیو کریم گنج' گیا- ۸۲۳۰۰۱ مبصر: ایم نصر اللہ نصر (ہوڑہ)

''رموزِ تحقیق'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۲۹ مضامین شامل ہیں جو ادباء و شعراء کی حیات و خدمات کا خوبصورت تجزیہ و تحقیق پر معمور مبنی ہے۔ جس میں آغا حشر کاشمیری' علامہ اقبال' محمد معین الدین دردائی' ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی' ولی عظیم آبادی' وحید الدین سلیم پانی پتی' مولانا فضل حسین مظفر پوری' سید عابد علی کوثر خیر آبادی' شانتی رنجن بھٹاچاریہ' امیر چند' کالی داس گپتا رضا' قاضی عبدالودود کے علاوہ دیگر تحقیقی و معلوماتی مضامین کی شمولیت سے کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر شاہد اقبال ایک اچھے مضمون نگار' محقق' ناقد اور مبصر بھی ہیں۔ کافی مطالعہ رکھتے ہیں اس لئے کہ وہ کافی دنوں تک خدا بخش لائبریری سے منسلک رہے ہیں اس میں ملازمت کی ہے اس کے ریسرچ اسسٹنٹ بھی رہے ہیں۔ وہ درس و تدریس سے منسلک ہیں اور فرصت کے اوقات میں پڑھنا لکھنا ان کا شغل خاص ہے۔ ان کی تصانیف میں وفیاتِ مشاہیر بہار' تذکرہ مہدوانواں' متاعِ حیات' رموزِ تحقیق اور نشرِ تحقیق شامل ہیں۔ ان کے علاوہ سیکڑوں تحقیقی اور اشاریاتی و حوالہ جاتی فہرست و مقالات ہندستان و پاکستان کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہو کر داد و تحسین

حاصل کر چکے ہیں۔

زیرِ مطالعہ کتاب میں ایک ایک مضمون کافی دیدہ ریزی اور ورق گردانی کے بعد ہی لکھے گئے ہیں۔ لفظیات کی برسات سے گریز کیا گیا ہے۔ نیز فضول گوئی سے بھی احتراز کا سلوک برتا گیا ہے۔ کام سے کام رکھا گیا ہے قاری کے ذوق اور تضیع اوقات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ معلومات کی جھڑی لگا دی گئی ہے۔ صرف ایک مضمون کے مطالعے سے ان کی علمیت اور قابلیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''آغا حشر کاشمیری کا ورود عظیم آباد''

''آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۳۵ء) کا نام اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انھوں نے اردو ڈراما نگاری کے فن میں چار چاند لگائے اور اردو کا شیکسپیئر کہلائے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی (۱۹۲۸ء۔ ۳۰) میں آغا حشر جب تھیٹریکل کمپنی کے ساتھ ملک کے مختلف اہم شہروں میں گھومتے پھرتے وارد عظیم آباد ہوتے تو محلّہ بھنور پوکھر' پٹنہ کی ایک افتادہ زمین پر اس کمپنی کے اسٹیج اور خیمے وغیرہ نصب کئے جاتے۔ یہ وہی زمین ہے جو انگریزوں کے دور میں Sifton Park کے نام سے موسوم تھی۔ اب یہ زمین بے رونق چمن اور بارونق چراگاہ ہے۔''

پٹنہ کا مشہور اور بہار کا دوسرا قدیم ترین سنیما گھر ایلفنسٹن پکچر پیلس ہے۔ اُن دنوں بولتی فلمیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس جگہ آغا حشر کے کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے۔ ان اسٹیج ڈراموں میں 'ایک دن کی بادشاہت' اور 'لیلا مجنوں' بہت مقبول ہوئے۔''

مذکورہ بیان سے موصوف کی تحقیقی بصارت اور علمی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آغا حشر سے متعلق اس طرح کی معلومات شاید کم دی گئی ہے۔ انھوں نے ایک ایک دعوے کے لئے کئی کئی دلیلیں پیش کی ہیں۔ شواہد کے طور پر بھی ڈھیر سارے تراشے جمع کر دیے ہیں۔ لہٰذا اختصار میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر شاہد اقبال کے یہاں تحقیق کا رجحان کافی ہے۔ وہ ہوا میں بات کرنے کے عادی نہیں۔ جب تک کوئی ٹھوس ثبوت یا دلیل فراہم نہ ہو جائے وہ موضوع کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ ان سے ڈھیر ساری امیدیں ہیں۔ یوں تو کتابوں کی سیلابی صورت حال سے ادبی حلقوں میں بے چینی کا عالم پیدا ہو گیا ہے۔ اہلِ اردو کے پاس پڑھنے کا وقت ہے اور نہ کتابوں کو رکھنے کی جگہ ان کے گھروں میں ہے۔ کتابوں کی خریداری سے تو شاید ان کو ازلی بیر ہے۔ تحفتاً بھی قبول کرنے میں تامل ہے۔ اردو داں کہلانے کا شوق بہت ہے مگر مطالعے سے گریز بھی ہے۔ بہر حال کتابوں کی آمد کا سلسلہ تھمنے والا نہیں۔ کام کرنے والے اپنا کام کرتے ہی رہیں گے۔ قیمتی سے قیمتی اور معلوماتی کتابیں بھی بے توجہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود اردو کے قلمکاروں کا سفر جاری رہے گا۔ مجھے قوی امید ہے۔

....

- نام کتاب: سلسلے اجالوں کے شعراء: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور احسان ثاقب ص: ۶۴
قیمت: ۸۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ایم نصر اللہ نصر (ہوڑہ)

'سلسلے اجالوں کے' جاپانی صنف سخن ''رینگا'' کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور احسان ثاقب کی مشترکہ کوششوں اور کاوشوں کے نتیجے میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ مناظر صاحب ایک عرصہ سے شعر و ادب میں نئے نئے اصناف کو شامل کرتے رہے ہیں اور اردو کے شعراء کو ان کی طرف نہ صرف راغب کیا ہے بلکہ ان کو ان اصناف پر طبع آزمائی کا جذبہ بھی پیدا کیا ہے۔ متعدد شعراء نے ان کی تحریک پر خود کو ان اصناف سے منسلک کیا ہے اور اچھی تخلیقات بھی پیش کی ہیں۔ رینگا سے متعلق موصوف رقم طراز ہیں:

''جاپانی صنف سخن رینگا میں دو شاعر مل کر اپنی بات کہتے ہیں۔ پہلا شاعر تین مصرعے میں اپنے جذبات اور خیالات پیش کرتا ہے اور دوسرا شاعر دو مصرعے میں اسے مکمل کرتا ہے۔ جاپانی شاعری کی اس صنف میں ابہام' فطرت کی پاسداری اور بیانیہ انداز کو بڑا دخل ہے''

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی یہ دوسری کوشش ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے ڈاکٹر فراز حامدی کے ساتھ مل کر رینگا کی پہلی کتاب ۲۰۱۲ء میں شائع کرائی تھی جس کی مقبولیت اس قدر ہوئی کہ بہت سے موقر و معتبر شعراء اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور کئی کتابیں منظرِ عام پر آگئیں۔ جن میں ''تنہائی کے رنگ'' (فراز حامدی اور کوثر صدیقی) 'متھیاس' (وقیع منظر اور رہبر حمیدی) 'خاموشی کی چیخ' (فراز حامدی اور حلیم صابر' سایہ چلتا ہے' (فراز حامدی اور ڈاکٹر شاداب قدیر) وغیرہ شامل ہیں۔ اس سے اس صنف سخن کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ بھی دو ڈھائی سال کے عرصے میں۔ اس کے اسباب شاید کچھ یہ ہیں:

باہمی رشتے کی ہم آہنگی' خیال انگیز آشنائی' رویے اور ہیئت میں تبدیلی کی وجہ سے اس صنف سخن کی طرف شعراء کا رجحان مائل ہوا ہے۔ اردو چونکہ ایک وسیع القلب اور کشادہ ذہن و افکار رکھتی ہے اس لئے اس میں نئے نئے تجربے کئے جاتے ہیں جو مقبول بھی ہوتے ہیں۔ ماہیے اور ہائیکو اس کی دوسری مثالیں ہیں۔ کہمن اور کہہ مکرنیاں بھی خوب شہرت کمائی ہیں۔ اردو کو اپنے بدلتے رجحان سے کبھی بیر نہیں رہا۔ نیاپن اس کی ازلی خواہش ہوتی ہے۔ نئے نئے اضافے سے اس کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

رینگا ہر چند کہ ایک جاپانی صنف سخن ہے مگر موصوف شعراء نے جس انداز سے اس کی پاسداری کی ہے اور اسے حسن عطا کیا ہے اس سے ذرا بھی اس کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا لیکن اس کے لئے دونو شعراء کے مزاج کا ملنا ضروری ہے تا کہ وہ ایک دوسرے کے خیالات و افکار سے ہم آہنگ ہو سکیں اور دونوں کی مشترکہ تخلیق میں یکسانیت، ربط اور خوش اسلوبی قائم رہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

قیدی کی تقدیر	صدیوں سے ویراں
راہ تو ہے ٹیڑھی میڑھی	یہ کیسا ہے گاؤں تیرا
سوئی ہے تعبیر	سب آنکھیں حیراں
''کب تک ٹوٹے گا یہ جال	''قریہ قریہ ویرانی
ہر لب پر ہے یہی سوال''	ہے خود کی ہی شیطانی''

مذکورہ رینگا کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے شاعر کے تین مصرعوں میں سے پہلا اور تیسرا ہم قافیہ اور ہم وزن ہوتے ہیں دوسرا آزاد ہوتا ہے اور دوسرے شاعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم وزن ہوتے ہیں۔ اس کے پانچ مصرعوں کی تشکیل شاید کچھ اس طرح ہوتی ہے:

فعلن فعلن فاع/ فع — قیدی کی تقدیر
فعلن فعلن فعلن فع — راہ تو ہے ٹیڑھی میڑھی
فعلن فعلن فاع/ فع — سوئی ہے تعبیر
فعلن فعلن فعلن فاع — کب تک ٹوٹے گا یہ جال
فعلن فعلن فعلن فاع — ہر لب پر ہے یہی سوال

یہ تقطیع غلط بھی ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے درست اوزان سے مجھے واقفیت نہیں۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو مگر شعراء کی توجہ ادھر مبذول ہوئی تو اس کی دلکشی میں اور اضافہ ہوسکتا ہے۔

....

- **کتاب کا نام: میں اور میری صحافتی زندگی مصنف: سلطان شاہد ص: ۱۴۴ قیمت: ۲۰۰ روپے**
رابطہ: 2-B/H-6، اقبال پور لین، کولکاتا-۷۰۰۰۲۳ مبصر: اشرف احمد جعفری (کولکاتا)

''میں اور میری صحافتی زندگی'' بنگال کے کہنہ مشق صحافی سلطان شاہد کی پہلی کتاب ہے، جو اپنے عنوان کے عین مطابق ان کی صحافتی زندگی کے تجربات و مشاہدات نیز نشیب و فراز سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ۱۴۴ رصفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں انتخاب، خاکہ اور پیش لفظ کے علاوہ ۴۵ رابواب ہیں جن میں ایسے ایسے دلچسپ، معلومات افزا بلکہ سبق آموز واقعات بھی مندرج ہیں کہ قاری کو ناول کا سا لطف ملتا ہے اور ایک بار شروع کر دینے کے بعد ختم کئے بغیر کتاب رکھ دینے کو جی نہیں کرتا ہے۔ سارے ابواب ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہیں کہ ایک کے بعد دوسرے کو بھی پڑھنے کے لئے دل بے چین ہو جاتا ہے یعنی تجسس بڑھا کر دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔ مصنف کا کمال ہے کہ اس کتاب سے ہر طبقہ کے لوگ لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ عام قاری کے علاوہ خاص طور پر بنگال کی صحافت پر کام کرنے والے محققین حضرات کے لئے یہ کتاب بہت ہی مفید ہے اس کا اندازہ بعض ابواب کے عنوانات سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ روزنامہ ''آبشار''، ''عکاس کا سفر''، ''صحافت ایک منصب''، ''اخبارات کے مختلف شعبے''، ''کچھ آزاد ہند کے متعلق'' اور ''عجیب و غریب واقعات'' وغیرہ۔ یہ سارے ابواب بنگال بالخصوص کلکتہ کی اردو صحافت کی تاریخ وغیرہ کے متعلق کافی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں خاص طور سے ایک باب بعنوان ''مشہور اخباری ہستیاں'' ایسا ہے جس کے ذریعہ کلکتہ کے صحافی حضرات کے تعلق سے بھی بہت ساری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں اور یہ ایسی باتیں ہیں جو عموماً کہیں اور نہیں ملتیں کیوں کہ صحافت پر لکھتے وقت اخبارات و رسائل کی تاریخ اور اس کی صحافتی اسکیم کا ذکر تو ملتا ہے اور بعض میں صحافی کے حالات زندگی میں رقم کر دیے جاتے ہیں لیکن ان کی شخصیت پر روشنی ڈالنا ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مذکورہ کتاب اس لئے بھی اہم اور دلچسپ

اور معلومات افزا ثابت ہوتی ہے کہ اس میں وسیم الحق ، راقم لکھنوی ، ابراہیم ہوش ، رئیس احمد جعفری ، جاوید نہال ، احسن مفتاحی ، منیر نیازی ، سجاد نظر ، سلیمان خورشید ، راز عظیم ، عمر حیات خاں ، جہانگیر کاظمی ، امان اللہ محمد ، عبد السلام عاصم ، سلامت مرزا ، اشہر ہاشمی ، محمد عالمگیر ، خورشید اختر فرازی ، اسمٰعیل نظر ، انجم عظیم آبادی ، عظمت جمیل صدیقی ، افضل اقبال ، محمد جلیل الدین شعلہ ، ابوالکلام رحمانی ، شوکت عظیم ، محمد جہانگیر ، جاوید اختر ، فاروق شفق ، جمال الدین احمد ، محمود یسین ، شکیل احمد ، جمیل احمد ، قیصر بیگ ، بدر نظامی ، سغیر الدین کمال کے تعلق سے ایسی ایسی باتیں مندرج ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں ۔ پھر یہ کہ خود مصنف کے بارے میں بھی ساری تفصیلات حاصل ہو جاتی ہیں ۔ اس کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جن کا تعلق خاص اندرون دفتر سے ہے جنہیں پڑھ کر نہ صرف ایسی خاص باتوں سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ حیرت اور عبرت بھی حاصل ہوتی ہے مثلاً مصنف کے ساتھ وسیم الحق کا ناروا سلوک جس سے انکی شخصیت کا نہایت ہی تاریک پہلو بھی ابھر کر سامنے آجاتا ہے ۔ ان کا آخری باب '' تانتی باغ کی تاریخ '' بیان کرتا ہے جو اس علاقہ کے لوگوں کیلئے بھی بہت مفید ، دلچسپ اور معلوماتی ہے ۔ مصنف نے یہ باب لکھنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ دراصل اسی علاقے میں انکی پیدائش ہوئی تھی ۔ غرض یہ کتاب صرف پڑھنے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس سے بار بار استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے ۔

....

● **نامِ کتاب: کلکتہ کے نئے اور پرانے بازار مصنف: شکیل افروز اشاعت: ۲۰۱۲ء**
قیمت: ۲۰۰ روپئے رابطہ: 12/4B پٹوار بگان لین ، کولکاتا-9 مبصر: صابر رضا شمسی ارولی (مٹیابرج)

شکیل افروز ایک معتبر ادیب وصحافی ہیں ۔ ماشاء اللہ آٹھ ، نو کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں اور تقریباً اتنی ہی کتابیں منتظر اشاعت ہیں ۔ آپ کا قلم رواں ہے اور کسی بھی موضوع پر وہ کبھی بھی قلم اٹھا سکتے ہیں ۔ پیش نظر کتاب '' کلکتہ کے نئے اور پرانے بازار '' ان کی تحقیقی کاوش ہے ۔ اس کتاب کو لکھنے کے لئے اُنہیں کافی مشقت کرنی پڑی ہوگی اس میں شامل عنوانات اس بات کے گواہ ہیں کہ اُنہیں ایک ایک لفظ کے لئے ستر ستر کنوئیں جھانکنے پڑے ہوں گے تب کہیں جا کر درست حقیقت تک رسائی ہوئی ہوگی ۔

انھوں نے اس میں تقریباً چوالیس بازاروں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے جو نہایت معلوماتی اور دلچسپ ہے ۔ جس سے نہ صرف بیرونی قاری مستفید ہوں گے بلکہ مقامی لوگوں کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا ۔ وہ حقائق جو عام نظروں سے ہمیشہ پوشیدہ رہے اُنہیں بھی انھوں نے نہایت ہی ایمانداری و دیانت داری سے اپنے قاری کے سامنے رکھ دیا ہے کہیں کہیں اختصار سے بھی کام لیا ہے ۔ مگر وہ وقت کی قلت اور ضرورت کے مدنظر کیا گیا ہے ۔

انھوں نے نہایت عرق ریزی سے معلومات اکٹھا کی ہیں ان کے حسنِ ترتیب کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے ۔ دراصل یہ کلکتہ کے نئے پرانے بازاروں کی ایک معتبر ڈائریکٹری بھی ہے ۔

صرف ایک جگہ ان کا اختصار قاری کو ذرا سا بے چین کرتا ہے کہ انھوں نے جب آفرین گنج بازار (خضر پور) کا ذکر کیا تو سبزیوں ' مسالوں ' پھل ' تیل ' کپڑوں وغیرہ کے ساتھ ضمناً جانوروں کی خرید و فرخت کا تذکرہ کر دیا ہے مگر

حقیقت یہ ہے کہ ابھی چند برسوں پہلے تک خضر پور آرفن گنج بازار صرف خضر پور گوروہاٹ کی وجہ سے جانا پہچانا جاتا تھا اور کولکاتا کا یہ مویشی بازار ہندوستان بھر میں مشہور تھا جسے چند برسوں پہلے حکومت نے بند کر دیا اور اس سے جڑے ہزاروں کاروباریوں کو جن میں سے بیشتر مسلم تھے، نقصان پہنچا۔ دراصل اس کی وجہ سے اس پورے علاقے کی جو رونق تھی وہ ماند پڑ گئی۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ ابھی مصنف سے قارین کی بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں انھوں نے جو اپنی رائے ''سرِ بازار'' کے عنوان سے جو لکھی ہے وہ بھی قابلِ تعریف ہے کیونکہ انھوں نے اس میں بازار کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور ہندوپاک اور برصغیر ایشیا میں بازار کا جو تصور تھا اسے بیان کرتے ہوئے تا حال اور کولکاتا کے بازاروں کا ذکر کیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

● **نام کتاب: خاموشی کی چیخ شاعر: ڈاکٹر فراز حامدی بہ اشتراک حلیم صابر اشاعت: ۲۰۱۵ء**
قیمت: ۶۰ روپے ناشر: ادبی دنیا پبلی کیشنز، جے پور، راجستھان مبصر: صابر رضا رہبر مصباحی اروَلی (ٹمیا برج)

پیش نظر کتاب جاپانی صنفِ سخن ''رینگا'' کا مجموعہ ہے جس کے شاعر ڈاکٹر فراز حامدی اور حلیم صابر ہیں۔ جاپانی صنفِ سخن ہائیکو میں دو اضافی مصرعوں کے ساتھ رینگا آج بھی مقبول ہے۔ اگر چہ یہ صنفِ سخن جاپان میں کافی پرانی ہے مگر اردو شاعری میں اس کا تعارف بہت بعد میں ہوا۔

اس صنفِ سخن میں دو شاعر مل کر ۵-۷-۵ اور ۷-۷ سلیبلز پر مبنی پانچ مصرعے کہتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ڈاکٹر فراز حامدی ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے اشتراک سے رینگا کا پہلا مجموعہ منظر عام پر لا چکے ہیں۔ ''خاموشی کی چیخ'' میں اوّل تین مصرعے ان کے اور آخر کے دو مصرعے ڈاکٹر فراز حامدی صاحب کے ہیں۔

اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصناف کو اپنانے کی صلاحیت موجود ہے جو اس کے زندہ زبان ہونے کا بین ثبوت بھی ہے۔ نئے نئے تجربات اس زبان میں ہوتے رہتے ہیں۔

حلیم صابر اور فراز حامدی نے اس مختصر جاپانی صنفِ سخن میں بھی انسانی جذبات و خیالات کے ترجمانی کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱)

ان پہ جمی تھی
ایسے کھلے تھے گلشن میں
میلے کچیلے پھول
ہوتے صاف خوشبودار
تو بنتے وہ گلے کے ہار

(۲)

پنچھی اُڑ نہ سکا
ٹوٹ گیا جب تارِ جاں
پھر وہ جُڑ نہ سکا
مارا بچے نے پتھر
خون سے بھر گئے بال و پر

حسبِ روایت ڈاکٹر فراز حامدی اور جناب حلیم صابر نے بھی مجموعے کی ابتدا حمدیہ و نعتیہ رینگا سے کی ہے:

(۲)	(۱)
شافعِ محشر آپؐ	اللہ اللہ کر
پیارے محمد صلِ علیٰ	سارے جہاں کا مالک ہے
افضل و برتر آپؐ	وہ ربّ اکبر
برعرش و بر روئے زمیں	سب پہ کرم اس رب کا ہے
آپؐ کا ہمسر کوئی نہیں	پالن ہار جو سب کا ہے

حلیم صابر صاحب کی انصاف پسند طبیعت کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے کتاب میں شامل تیسرے رینگے میں ہی واضح کر دیا کہ اس میں شامل تین مصرعے ان کے اور باقی کے دو مصرعے ڈاکٹر فراز حامدی کے ہیں۔ آپ بھی دیکھیں:

شعر ادھورے تھے
صرف اس میں سہ مصرعے ہی
میرے پورے تھے
رینگا پورے تب ہو پائے
جب کہ فرازؔ حامدی آئے

کتاب کا عنوان ہی قاری کو چونکاتا ہے "خاموشی کی چیخ" مگر دونوں شاعروں نے اس کی بھرپور توضیح کی ہے:

خاموشی کی چیخ
کھینچتی ہے رشتوں کے بیچ
جب کہ خط تنیخ
ملنے سے ہو گے مجبور
دونوں ہو جاتے ہیں دور

کتاب میں شامل 106 رینگوں کو پڑھ کر قاری کو مایوسی نہیں ہوگی۔ فکر و فن کا یہ مجموعہ کسی خوبصورت گلدستے سے کم نہیں ہے۔ طباعت، کاغذ اور قیمت مناسب ہے۔

● **نام کتاب: کتاب "دوہا غزل: دوہا گیت" چند آراء مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اشاعت: ۲۰۱۵ء قیمت: ۵۰ روپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶ مبصر: صابر رضا شمسی ارولی (ٹمیا برج)**

لوگ علاقے کے نام سے جانے جاتے ہیں مگر بھیکن پور بھاگلپور (ہم اردو والوں کے لئے) ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ نہ صرف لکھنے کا ہنر جانتے ہیں بلکہ چھپنے چھپانے کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں نہ صرف ملک گیر بلکہ عالمی اردو زبان و ادب میں اپنی مخصوص پہچان رکھتے ہیں۔ لکھنا پڑھنا اور چھپتے رہنا ان کی زندگی ہے اور یہی چیز انھیں بعد از مرگ زندہ رکھے گی۔

کتاب "دوہا غزل: دوہا گیت" شائع ہو کر شرف قبولیت پا چکی ہے اور اب اس کتاب پر آنے والی قیمتی آراء

کا انتخاب شائع کر کے انھوں نے اردو ادباء وشعراء کو نئی راہ دکھائی ہے اس سے انھیں بھی حوصلہ ملے گا کہ اگر کسی کتاب کو شرفِ قبولیت ملی ہے تو اس کا اظہار بھی ہونا چاہئے۔

پیش نظر کتاب میں ہر وہ رائے شامل ہے جو ان کی طبیعت کے مطابق ہے اور جو طبیعت کے غیر مطابق ہے۔ اس سے ان کی انصاف پسندی اور طبیعت کی بلندی کا پتہ چلتا ہے۔ خطوط کی ترتیب میں مرقومہ تاریخ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کے ۹ ربرسوں بعد اس کتاب پر آئی آراء کا انتخاب اور خود ۹ رصفحے کا طویل پیش لفظ ڈاکٹر صاحب کی تخلیقی، تنقیدی اور ادارتی صلاحیتوں کا بیّن ثبوت ہیں۔

اردو ایک زندہ زبان ہے اس لئے اس میں ہیئت، فارم اور دوسری زبانوں کے اصناف کے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ دوہا غزل اور دوہا گیت کے تعلق سے خود ڈاکٹر صاحب اپنے پیش لفظ ''گفتنی'' میں صفحہ نمبر ۱۲ر پر رقم طراز ہیں:

> ''دوہا غزل اور دوہا گیت تخلیقی اعتبار سے مالا مال ہیں۔ ان میں عقیدے، تہذیب اور ورثے سے بے پناہ محبت ہے، فطرت اور حسن سے لگاؤ ہے، ذات کے حوالے سے ماورائے ذات کو جاننے اور پہچاننے کا عمل ہے......... زندگی کی سچی تصویروں کو تازہ کاری کے عمل سے گذارنے کا ہنر دوہا غزل اور دوہا گیت کے شاعروں کو بخوبی آتا ہے۔''

کتاب میں شامل ۷۱ رخطوط تنوع اور آراء کے اعتبار سے نہایت اہم اور کارآمد ہیں۔ صفحہ نمبر ۲۱ر پر محبوب راہی صاحب نے ۲۲رجنوری ۲۰۰۷ء کو جو خط لکھا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ایک بات تو بالکل آفاقی سچ ہے کہ آدمی خط میں کھل جاتا ہے انھوں نے کتاب ملنے کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر فراز حامدی اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نئی اصنافِ سخن میں شرکت کی دعوت کو اہمیت نہ دی مگر پس نوشت جو لکھتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تجربات کی کامیابی سے انھیں بعد میں پچھتاوا ہوا تھا۔

> ''پسِ نوشت: دوہا غزل ایک نہیں درجنوں لکھی جاسکتی تھیں کہ یہ بہر حال غزل ہے۔ کاش مجھے اس کے لئے کہا جاتا۔ انشا اللہ ڈھیر لگا دیتا۔ خیر!''

بظاہر کسی کتاب پر آئی آراء کی اشاعت عجیب معلوم ہوتی ہے مگر اس سے فی زمانہ رجحانات ومیلانات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ سرورق دیدہ زیب، کاغذ اچھا اور قیمت مناسب ہے دعا کہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کا سفر جاری رہے۔

....

● نام کتاب: پاپولر میرٹھی، ذکر، فکر اور فن مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اشاعت: ۲۰۱۳ء
قیمت: ۳۰۰ رروپے ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: صابر رضا شمسی ارولی (مٹیا برج)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اردو زبان وادب کے ان جیالوں میں ہیں کہ جن سے اردو زبان وادب کا علم بلند ہے، وہ عالمی اردو ادب میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ بیک وقت مصنف، مولف، شاعر اور ادیب ہیں۔ عمرِ عزیز کا قیمتی حصہ اردو زبان وادب کی خدمت میں لگایا ہے۔ وہ بے غرض، بے لوث اور بلا امتیاز لشکرِ اردو کے سپاہیوں کی

ستائش وحوصلہ افزائی میں لگے ہوئے ہیں۔ تقریباً تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ آج بھی اردو کی خدمت میں لگے ہیں اور امید ہے کہ رہتی سانسوں تک یہ رشتہ برقرار رہے گا انشاءاللہ۔

پیشِ نظر کتاب سید اعجاز الدین شاہ پاپولر میرٹھی کے فکر وفن پر مشتمل مقالوں کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں مختلف مشاہیر علم وادب کی جانب سے لکھے گئے ہیں۔ ۲۲۰ صفحات کی اس ضخیم کتاب میں تقریباً ۴۲ اہلِ قلم کے تنقیدی وتاثراتی مضامین شامل ہیں جن میں پاپولر میرٹھی کے فکر وفن کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

پاپولر پوری اردو دنیا میں سچ مچ پاپولر ہیں اور کسی بھی عالمی بین الاقوامی یا قومی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔ معتبر شعراء کی لسٹ میں صرف ان کا نام سامعین کو کھینچ لانے کے لئے کافی ہے۔ ان کے فن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ خود پر طنز کرتے ہیں اور سامعین وقارئین خود پر محسوس کرتے ہیں۔ برجستگی ایسی کہ آپ چوٹ پر بلبلا جائیں مگر تڑپنے کی اجازت نہیں ہوتی :

دستخط تو تمہیں بھی آتے تھے

ابا! تم بھی وزیر بن جاتے

ساری دنیا میں مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں یکساں مقبول ایسا البیلا شاعر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ جہاں جہاں اردو ہندی بولنے اور سمجھنے والے ہیں انہیں وہاں بلایا جاتا ہے۔ وہ اخوت' بھائی چارگی اور سیکولرازم کی زندہ وجاوید مثال ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے بڑی جانفشانی' عرق ریزی اور استقلال سے تقریباً نصف صد اہلِ قلم کی آراء اس کتاب میں جمع کر کے اسے کتابی شکل دی ہے۔ دراصل یہ کتاب پاپولر فہمی میں بیحد مددگار ہے اور آنے والے ریسرچ اسکالروں کے لئے یہ ایک ریفرنس بک کا کام کرے گی کہ ایک ساتھ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا اس میں جائزہ لیا گیا ہے اس میں شامل تمام مضامین عمدہ ہیں۔ انتخاب مولف کی تنقیدی بصیرت کا مظہر ہے۔ کاغذ عمدہ' طباعت دیدہ زیب' قیمت مناسب ہے۔

صفحہ نمبر ۶ / پر نقد پارے کے عنوان سے '۲۱۶ تا ۲۱۹' میں جو نام شامل ہیں ان میں سے کچھ چھپنے سے رہ گئے ہیں جیسے ڈاکٹر دیوسروپ' اقبال درانی اور یٰسین مراد آبادی اور جن کے نام فہرست میں نہیں ہیں ان کی آراء دو دو بار صفحہ نمبر ۲۱۷ / اور ۲۱۸ / پر موجود ہیں جیسے افضل صدیقی اور احمد علوی۔ یقیناً یہ پروف کی غلطیاں ہیں جو آئندہ ایڈیشن میں درست کر لی جائیں گی انشاءاللہ۔

● نام کتاب: شہر نگاراں کلکتہ شاعر: حلیم صابر اشاعت: ۲۰۱۳ء قیمت : ۴۰ / روپے
ناشر: اخبارِ مشرق پبلی کیشنز' کولکاتا' مغربی بنگال مبصر: صابر رضا شمسی ارولی (مٹیابرج)

اردو دنیا میں حلیم صابر کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔ اچھے شاعر وادیب ہیں۔ ان کا قلم نظم ونثر میں یکساں جولانیاں دکھا رہا ہے۔ مرزا غالب نے کلکتے کا ذکر کیا تو اور دوسرے ادباء و

شعراء کو کلکتے کا حسن اپنی طرف کیوں نہ راغب کرے۔ پھر ابھی شہرِ نشاط کولکاتا پر اردو ادب کے شعراء و ادباء بطور خاص توجہ دے رہے ہیں یا یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا وہ اس شہر کے زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم کی طویل تحقیقی اور تاثراتی نظم "یہی کولکاتا ہے" کی اشاعت ان کے شعری مجموعہ "نیلم کی آواز" اور "تمثیلِ نو" میں ہو چکی ہے۔ پیشِ نظر کتاب "شہر نگاراں کلکتہ" کی اشاعت ۲۰۱۳ء ہے۔ جس کا انتساب "بزمِ شہر نشاط" کے روحِ رواں جناب بلال حسن کے نام معنون ہے۔ حلیم صابر اپنی کتاب کے بارے میں پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ:

"شہرِ نشاط کلکتہ سے متعلق جو منظوم تخلیقات مختلف اوقات میں اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں ان سب کو یکجا کر کے کتابی شکل پیش کرنے کی میری کوشش کامیاب ہوئی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ زیرِ نظر کتاب "شہر نگاراں کلکتہ" اخبارِ مشرق پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔"

اور آخر میں لکھتے ہیں کہ:

"بہر حال میں نے اس نظم کو تھوڑی سی وسعت دے کر کلکتے سے متعلق دیگر اصنافِ سخن پر جو کچھ بعد میں لکھا اس کو بھی اس کتاب میں شامل کر لیا۔ اب یہ کتاب صرف کلکتہ سے متعلق منظومات پر مشتمل ہے۔"

اس کتاب میں اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کیونکہ حلیم صابر خود کلکتے کے ہیں اور انھوں نے زندگی کی طویل مسافت اسی شہر کی خاک نوردی میں طے کی ہے۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا وہ اس نظم میں من وعن رکھ دیا ہے۔ اگر اس کتاب کو بغور پڑھا جائے تو اس میں کلکتے کی بستی کی پوری تاریخ مل جائے گی اس طویل نظم کو انھوں نے تین حصوں میں بانٹا ہے۔ پہلا رخ، دوسرا رخ اور مشترکہ رخ نظم کے پہلے رخ میں ۴۶؍ اشعار ہیں جس کو پڑھنے سے قاری کے ذہن و دل میں کلکتے کا ایک اجمالی خاکہ ابھرتا ہے۔ دوسرے رخ میں کلکتے کا حال زار بیان کیا گیا ہے اسے پڑھتے ہوئے قاری کو شہر آشوب کی یاد آجاتی ہے۔ اس میں ۳۶؍ اشعار ہیں نظم کے تیسرے پڑاؤ یعنی "مشترکہ رخ" میں کل ۱۹؍ اشعار ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے رخ میں جو تلخیاں محسوس کی گئی ہیں انھیں شاعر معتدل کرنا چاہتا ہے۔

ان کے علاوہ "سلام اے شہرِ کلکتہ" کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم، ۸؍ رباعیاں" دوہے، ماہیے، ہائکو، سانیٹ، ترائیلے شاعر کی قادر الکلامی پر دال ہے۔ ۳۲؍ صفحوں کی یہ کتاب کلکتہ کا بھرپور تعارف کراتا ہے۔ سرورق خوبصورت اور معنی خیز ہے۔ قیمت ۴۰؍ روپے ہے جو مناسب ہے۔

....

- نام کتاب: شعرائے متقدمین مصنف: حلیم صابر صفحات: ۱۲۸ قیمت: ۱۰۰؍ روپے اشاعت: ۲۰۱۳ء تعداد: ۴۰۰ ناشر: اخبارِ مشرق پبلی کیشنز، کولکاتا۔ ۷۰۰۰۱۷ مبصر: صابر رضا رہبر مصباحی ارولی (مٹیا برج)

"شعرائے متقدمین" حلیم صابر کے ان مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے جو روزنامہ "اخبارِ مشرق" میں جولائی ۲۰۱۲ء سے ہفتہ وار لگاتار شائع ہوتے رہے۔ عرصۂ دراز سے ادب کے طلباء کو ایسی کسی کتاب کی ضرورت محسوس

ہوتی رہی تھی کہ جس میں مختصراً شعراء متقدمین کے بارے میں ساری باتیں مل جاتیں ان کے حالاتِ زندگی، رنگ شاعری، زبان دانی اور ہم عصروں کا بیان ہو۔ یا ایسی کوئی کتاب جو ان کے نصاب میں شامل شعراء کی مکمل جانکاری دے، جسے پڑھ کر وہ امتحانی ضروریات پوری کر سکیں اور اس کمی کو حلیم صابر کی کتاب ''شعراء متقدمین'' نے بہت حد تک پورا کر دیا۔ اس میں انھوں نے ۲۶ ربہت اہم شعراء کے کلام کا اجمالی جائزہ لیا۔ ان کے حالاتِ زندگی اور ان کے رنگِ شاعری پر قلم اٹھایا۔

کہنے کو یہ کتاب طلبا و طالبات کے لئے کارآمد ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ اردو ادب کے شائقین و قارئین کے مطالعہ کی تربیت میں بھی اہم رول ادا کرے گی کیونکہ بہت سے ادبا و شعراء ایسے ہیں کہ جن کا مطالعہ بکھرا ہوا ہے۔ اس میں حلیم صابر صاحب نے انھیں ایک دائرے میں باندھ کر رکھنے کی غیر محسوس کوشش کی ہے۔ انھوں نے جلال الدین رومی، امیر خسرو، ملا وجہی، قلی قطب شاہ تا انشاء اللہ خان انشاء، راسخ عظیم آبادی، غلام سجاد نقشبندی، محمد علی فدوی تک احاطہ کیا ہے۔ اس کے بعد ان کا ارادہ ''شعرائے متوسطین اور شعرائے متاخرین'' لکھنے کا ہے۔ اللہ تعالی ان کی عمر اور ارادے میں برکت عطا فرمائے۔ ۱۲۸ر صفحے کی اس کتاب میں انھوں نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ دراصل یہ کتاب کسی حد تک تحقیقی کتاب کے زمرے میں رکھی جا سکتی ہے کیوں کہ ایک ایک بات کے لئے مصنف کو کئی کتابیں دیکھنی پڑی ہوں گی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ ان کتابوں کے نام آخر میں شامل کرتے کہ جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے۔

سرورق عمدہ، طباعت نفیس، قیمت مناسب اور کتاب غلطیوں سے پاک ہے۔

....

- **نام کتاب: عادل اسیر دہلوی کی ادبی خدمات مصنف: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن ص: ۱۳۲ قیمت: ۱۷۵ر روپے**

اشاعت: ۲۰۱۵ء ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶

مبصر: ڈاکٹر شبانہ آفریں جاوید، گیسٹ لیکچرار، شعبہ اردو، سریندر ناتھ ایوننگ کالج سیالدہ، کلکتہ

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن نے عادل اسیر دہلوی کی ادبی خدمات پر نہایت خوبصورتی سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ عادل اسیر دہلوی ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں جو بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، مترجم، صحافی اور ناقد ہیں۔ ان کا ذہنی سفر، ادب اطفال سے شروع ہوا اور بچوں کے لئے بے شمار نظمیں لکھیں جس کا واحد مقصد اصلاح معاشرہ تھا کیونکہ ان کے خیال میں کسی بھی اچھے معاشرے کے لئے بچوں کے ذہن کی صالح طور پر آبیاری کی جائے تو انہیں بچوں کے بڑے ہونے پر ایک اچھا اور اچھے لوگوں کا معاشرہ بن سکے گا۔ یہی ان کی بنیادی سوچ تھی جس کے بنا پر انہوں نے اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بچوں کے ادب خلق کرنے میں صرف کیا۔ بچوں کی رباعیاں، بچوں کے دوہے، بچوں کے گیت، بچوں کی نظمیں، گیت مالا، پھول مالا، ننھی منی نظموں، آ پہیلی بوجھ پہیلی، پیارے پیارے ننھے منے گیت، بلبلے بلبلے، اکڑ بکو، آسان نظمیں، بوجھو تو جانے، پہیلیاں، ہمارے سائنس داں، دلکش کہانیاں، کہاوتوں کی کہانیاں، گلستاں کی کہانیاں، سچ کا انعام وغیرہ بچوں کے لئے اس کی کتابیں شائع ہو چکی

ہیں۔ عادل اسیر دہلوی کی نثری ہو یا شعری پیش کش وہ ہمیشہ دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔

عادل اسیر دہلوی نے اپنی شعر گوئی کی ابتدا غزل گوئی سے کی تھی لیکن جلد ہی وہ ادب اطفال کی تخلیق کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے ادب اطفال کی روایت کو اسماعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر، یکتا امروہوی، شفیع الدین نیر، تلوک چند محروم، علامہ محمد اقبال، کرشن چندر، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ سے آگے بڑھانے کا کام بخوبی انجام دیا۔ ادب اطفال کے علاوہ ترجمہ اور ترتیب کا بھی نمایاں نام کیا اور اردو ادب میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔ ان کی ۵۸ رباعیوں کا مجموعہ "ترانے" کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے عموماً اخلاقیات اور سماجیات کو اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے یہاں شاعری خواہ کسی فارم میں ہو وہ سماجی واخلاقی اصلاح کا بہترین ذریعہ بنی ہے اس لئے غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا موضوع یہیں سے مختلف ہوتا ہے۔ "ترانے میں بھی ان کا یہ جذبہ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت عادل اسیر دہلوی نے فراق، امجد حیدر آبادی، یگانہ چنگیزی، دارا شکوہ اور غنی کاشمیری کی رباعیوں کی ترتیب اور ترجمہ کر کے ایک بیش بہا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان تمام شعرا کی رباعیوں کا انتخاب ایک ایک رسالہ کی شکل میں کرتے وقت ان کا الگ الگ تعارف اور ادبی تفصیلات کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے فراق، امجد حیدر آبادی، دارا شکوہ اور غنی کاشمیری کے معلق بہت ہی اہم جانکاری قاری کو بڑی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ دارا شکوہ اور غنی کاشمیری کا تعلق فارسی ادب سے ہے۔ ان کی تفصیلی معلومات انہوں نے فراہم کر کے اردو قارئین پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اتنے پر انہوں نے اکتفا نہیں کیا بلکہ عمر خیام، حضرت سیف الدین باخرزیؒ، خواجہ میر درد کی فارسی رباعیوں کا ترجمہ کر کے اردو قالب میں ڈھالا۔ دارا شکوہ کے حالات اور ان کی مشہور زمانہ تخلیق "مجموع البحرین" کا اردو ترجمہ کر کے دارا شکوہ کے تعلق سے پھیلی بہت ساری بدگمانیوں کا سد باب کر دیا ہے۔ اس کتاب میں ہندو مت اور مذہب اسلام کے مشترک افکار و نظریات میں ہم آہنگی کو دونوں مذاہب کی مقدس کتابوں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ دارا شکوہ نے ہندوستانی مذہبی رواداری، بھائی چارگی اور حب الوطنی کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ قابل صد مبارک باد ہے۔

انشاء اللہ خاں انشاء نے اردو زبان و ادب کی ترقی میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ان کی تخلیقات مختلف الجہات رہی ہے۔ اس میں رانی کیتکی کی کہانی اہم ہے۔ عادل اسیر دہلوی نے اپنی کتاب کو بھی نہایت سلیس اور آسان زبان میں مرتب کیا ہے۔ اس سلسلہ میں رباعیات انیس بھی ان کے ذریعہ ترتیب دی گئی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ عادل اسیر دہلوی نے فراق، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، امجد حیدر آبادی، یگانہ چنگیزی، دارا شکوہ، غنی کاشمیری، میر انیس کی رباعیوں کو ترتیب دیا اور فارسی کلام کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو، کی پہیلیوں کو حضرت امیر خسروؒ کی مختلف کتابوں سے انتخاب کر کے ۲۷۵ ر پہیلیاں یک جا کر دی ہیں۔ یہ ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ عادل اسیر دہلوی نے رباعیات مستزاد کی ترتیب، اشاعت کر کے اردو والوں پر بڑا ہی احسان کیا ہے۔ مستزاد رباعی پر سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے اور اس کی تعریف اور اقسام بھی بیان کیے ہیں۔ اردو کے تیرہ ایسے شعراء کی رباعیاں منتخب کی ہیں۔ جنہوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس

طرح فارسی کے ۲۸ رشعراء کی تخلیقات اس میں شامل کی گئی ہیں۔ گویا شعراء کی کل تعداد ۱۴۱ راور رباعیوں کی ۱۱۲ رتک پہنچتی ہے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مستزاد رباعیوں پر طبع آزمائی کرنے والے صرف دو شاعر میر درد اور میر تقی میر ہی نظر آتے ہیں۔ رباعیات میں مستزاد کا اضافہ ادبی حلقہ میں کیا جانا چاہئے۔ فارسی میں مستزاد رباعیاں امیر خسروؔ، نظیر، انشاء اور غالب کے یہاں ملتی ہیں مگر اردو مستزاد رباعیوں کی ان کے یہاں دریافت نہیں ہو سکی ہیں۔ عادل اسیر دہلوی کی یہ کاوش بہت ہی اہم ہے۔

بچوں کے ادب کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے عادل اسیر دہلوی نے چار مزید کتابیں ترتیب دی ہیں پہلی کتاب بچوں کے اسماعیل ہیں جس میں مولوی اسماعیل میرٹھی کی پندرہ نظمیں شامل ہیں جس کا مقصد بچوں کی ذہن سازی ہے۔ اس کے علاوہ مولوی اسماعیل میرٹھی کے حالات زندگی اور ان کی شاعری پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے دوسری کتاب بچوں کے اقبال ہے جو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اقبال کی سوانح حیات اور منتخب نظموں کا تعارف پیش کیا ہے۔ تیسری کتاب سچ کا انعام ہے جس میں پانچ اخلاقی کہانیاں ہیں جس میں بچوں کو ہمیشہ سچ بولنے کا درس دیا گیا ہے۔ چوتھی کتاب ''ہمارے سائنس داں'' ہے جس میں ہندوستان کے چار بڑے سائنس داں، ڈاکٹر چندر شیکھر وینکٹ رمن، ڈاکٹر میگھ ناتھ شاہا، ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا، اور اچاریہ جگدیش چندر بوس کی حیات اور خدمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ سعدیؒ کی گلستاں سے ساٹھ اور فارسی کے مشہور ہجو گو شاعر نظام الدین عبداللہ زاکانی کے رسالے، رسالہ دلکشا سے منتخب حکایات کا اردو ترجمہ بالترتیب 'گلستان کی کہانیاں' اور 'دلکش کہانیاں' ترتیب دے کر اپنے ملی جذبوں کا بہت خوبصورتی سے عادل اسیر دہلوی نے اظہار کیا ہے۔ عادل اسیر دہلوی کی تخلیق، پھول ہی پھول، رنگ برنگے پھول، آ پہیلی بوجھ پہیلی'' اور کہہ مکرنی، بچوں کے اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ ان کتابوں سے انہیں شاعری کی ایک پرانی صنف کہہ مکرانی سے روشناس ہونے کا موقعہ ملے گا۔

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن نے عادل اسیر دہلوی کی ان تمام کاوشوں پر مضامین کے ذریعہ گفتگو کی ہے جس سے عادل اسیر دہلوی کی ادبی خدمات کا بخوبی احساس ہو جاتا ہے۔ عادل اسیر دہلوی نے یقیناً بچوں کے ادب کے حوالے سے نمایاں ادبی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اور بچوں کے ادب کا ایک ذخیرہ خلق کر دیا ہے ان کی تخلیقات اور نگارشات کو ادبی حلقوں میں نمایاں پذیرائی ملنی چاہئے۔ ساہتیہ اکادمی نے ان کے انہیں کارناموں سے متاثر ہو کر انہیں انعام سے سرفراز کیا تھا۔ حالانکہ یہ ایوارڈ کوئی ادبی پیمانہ نہیں ہوتا مگر تاہم انعام پانے والے کی ادبی حیثیت سماج کو بتانے میں ضرور معاون ہوتا ہے۔ عادل اسیر دہلوی نے اپنی جوانی میں ہم سب کو داغ مفارقت دیا جس کا قلق بھی ہم اردو والوں کو یقینی ہونا چاہئے۔ کیونکہ اردو کے بجھتے چراغ کو ایسے ایسے اہل قلم زندہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ عادل اسیر دہلوی نے تمام کتابیں ہمارے بچوں کے لئے، بڑوں کے لئے، بگڑتے معاشرے کے لئے صحیح رہنمائی کا ضرور کام کریں گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں کو عام کیا جائے اور ہر گھر تک پہنچایا جائے۔ یہ ہمارا ادبی فریضہ بھی ہے۔ عادل اسیر دہلوی اپنے معاشرے، اپنی زبان، اپنی قوم کے ایک اچھے مفکر، مدبر اور رہنما تھے۔ انکے خیالات کی تبلیغ ہونی چاہئے۔

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن نے عادل اسیر دہلوی کی ادبی خدمات پر یہ کتاب ترتیب دے کر ایک بہت اچھا کام کیا

ہے۔ کتاب کی کمپوزنگ، سرورق طباعت اور گٹ اپ خوبصورت ہے۔ قیمت بھی واجبی ہے۔ اس کتاب کی پذیرائی ہر حلقہ میں ہونی چاہئے۔

....

● **نام کتاب: ششماہی ادب وثقافت (شمارہ-۱ ستمبر ۲۰۱۵ء) مدیر: پروفیسر محمد ظفر الدین ص:۱۹۶ قیمت: درج نہیں ہے ناشر: مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد-۳۲ (تلنگانہ) مبصر: ڈاکٹر شبانہ آفرین جاوید (کولکاتا)**

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کا ششماہی رسالہ ''ادب وثقافت'' کا پہلا شمارہ ستمبر ۲۰۱۵ء زیر تبصرہ ہے۔ اس بات کی خوشی ہے کہ مانو نے اردو ادب کے حوالے سے مراکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کے زیر اہتمام یہ رسالہ شائع کیا ہے۔ اس رسالے کا مزاج خالص ادبی ہے۔ ادب کا تعلق انسانی تہذیب وثقافت سے کافی گہرا ہے۔ اس ضمن میں سماج کی تمام تر اچھائیاں و برائیاں ضبط تحریر میں لائی جاسکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کا معیار اس کے ادب کے معیار سے سمجھا اور پرکھا جاتا ہے۔ اس لئے ادب کو کسی سماج کے تہذیبی وثقافتی معیار کا پیمانہ کہہ سکتے ہیں۔ زیر نظر رسالہ ادبی سرمایہ سے مالا مال ہے۔ اس کے مشمولات میں اردو کے ممتاز قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں جو ادب کے طالب علموں اور محققین کے لئے سودمند ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس رسالہ کی فہرست میں جن دانشوروں کے مضامین شامل ہیں اس سے اور کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اقبال کی شاعری کے نئے گوشے کی تلاش کر کے یہ بات بڑے وثوق سے کہی ہے کہ اقبال کو ان کی تمام تر تخلیقی عمل سے ہی نہیں پہچانا جاسکتا انہیں سمجھنے کے لئے جتنی ادبی آگہی کی ضرورت ہے اتنی ہی خود آگہی کی ضرورت ہے اس مضمون کو اقبال شناسی کا ایک اہم حصہ سمجھا جانا چاہئے۔ چونکہ اقبال کی دوررس نظروں نے آنے والے زمانے کو دور سے دیکھ لیا تھا اسلئے ان کے خیالات کا بھرپور اطلاق آج کے بڑھتے ہوئے Electronic Media پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر عبداللہ نے اردو شاعری کے حوالے سے تہذیبی روایت کو لازمی قرار دیتے ہوئے بہت سے نادر نمونے پیش کئے ہیں۔ انہوں نے مکمل طور پر تہذیب وتمدن کے حوالے سے متعدد اصطلاحوں کی وضاحت کی ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک کے شاعری کے تہذیبی وحدت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون ہندوستانی قومی روایت اور اردو شاعری، اس شمارے کا ایک اہم ترین مضمون ہے۔ تقریباً ۳۲ صفحے کے اس مضمون میں پروفیسر موصوف نے تہذیبی روایت کو لازمی قرار دیا ہے۔ عبدالستار دلوی نے سرتیج بہادر سپرو کے اردو دوستی اور سیاسی سوجھ بوجھ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک گراں قدر مضمون لکھا ہے۔ ان کے نزدیک مشترکہ تہذیب کی بڑی اہمیت تھی۔ سرتیج بہادر سپرو کو اردو والے دھیرے دھیرے فراموش کئے جا رہے تھے اس مضمون کے ذریعہ ان کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستانی تہذیبی روایت کے خیال کی توسیع پروفیسر رحمت یوسف زئی، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی کے بھی مضامین کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جس میں بالترتیب قومی یکجہتی کے فروغ اور منظوم داستانوں میں ہندوستانی تہذیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مضامین ہندوستانی تہذیب اور اردو زبان کے شعری سرمایہ کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں

گے۔ اسی طرح پروفیسر فیروز احمد نے جن ناتھ آزاد کی شخصیت کو تہذیب و زبان کے حوالے سے باریکی سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے عصمت چغتائی کے ناول دل کی دنیا کا بغور جائزہ لیا ہے اور اس ناول میں پوشیدہ اشاروں کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے فیض کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی نظموں کا مختلف زاویہ سے مطالعہ کیا ہے۔ اور ان کی بین الاقوامی شہرت کو بیان کیا ہے۔ اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ فیض احمد فیض ایک جداگانہ سوچ کے شاعر تھے جنھوں نے عالمی امن آشتی کی بھی تمنا کی تھی اور اس جذبہ صداقت پر مقام عمر قائم رہے۔

فیض کے حوالے سے یہ بہت اہم مضمون ہے۔ اس شمارے میں شریک دیگر مضامین ہاشمی بیجاپوری کی تہذیبی اہمیت، انشائیہ نگاری میں تشبیہ کا عمل، جمہوری ہند میں صوفیا کرام، اردو رباعی ایک جائزہ، حفیظ میرٹھی کی غزل، دکنی مثنویوں میں قومی یکجہتی کے عناصر، ہندوستانی موسیقی کے فروغ میں امیر خسرو کا حصہ ایسے مضامین ہیں جس کا مطالعہ خصوصاً اردو کے طلباء محققین اور عموماً اردو شائقین کے لئے نہایت اہم اور فائدہ بخش ہیں۔ زیر تبصرہ رسالہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی اردو دوستی اور اردو کے فروغ کے صالح مقاصد کا عکاس ہے۔ اس رسالے کو اردو کے ہر گھر میں ہاتھوں ہاتھ قبول کرنا چاہئے۔ میرے خیال سے یہ ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ یہ اردو زبان اور اردو تاریخ کا ایک نمونہ ہے۔ مرکز برائے اردو زبان کے تمام اراکین ایسا قیمتی رسالہ شائع کرنے کے لئے قابل تحسین ہیں۔

- **کتاب کا نام: تنقید اور تفہیم (مجموعہ مقالات) مصنف: پروفیسر ظفر حبیب ص: ۲۵۶ قیمت: ۱۴۰ روپے**
  ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-۶ مبصر: ڈاکٹر عرش منیر (کولکاتا)

پروفیسر ظفر حبیب کا نام ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے وہ نہ صرف ایک ہر دل عزیز استاد رہے ہیں بلکہ وہ بیک وقت تنقید نگار، افسانہ نویس، محقق، انشاء پرداز اور شاعر بھی ہیں۔ ان کی علمی قابلیت اور دانشورانہ استعداد ان کے زیر نگرانی ہونے والے تحقیقی کاموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اردو کے چند کثیر الجہات قلم کاروں میں ان کا نام بھی شامل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''تنقید اور تفہیم'' پروفیسر ظفر حبیب کے ۱۲ ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ گرچہ یہ مضامین تنوع رکھتے ہیں لیکن چند مضامین اپنے اندر بے پناہ وسعتِ فکر سموئے ہوئے ہیں جن سے سوچ و حقائق کے نئے زاویے کو توانائی ملتی ہے۔ ''قارئین کے نام'' میں مضمون نگار نے کتاب کی اشاعت سے متعلق حقائق گوش گذار کرنے کے علاوہ پندرہ سال تک اپنی ادبی غیر حاضری کا سبب بتایا ہے۔ چند مضامین جیسے سرسید احمد خان اور راجہ رام موہن رائے کی روشنی میں انہوں نے ۱۷۷۲ء-۱۸۹۸ء تک کے درمیان ہندستان کی تہذیبی، ثقافتی، علمی و فکری سرگرمیوں اور تبدیلیوں کے جائزہ دو محسنینِ قوم و ملت ایک سرسید احمد خاں اور دوسرے راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی سرگرمیوں اور تحریکیوں کے حوالے سے لیا ہے۔ ''آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے ہندوستان کی تاریخ'' کے علاوہ یہ مسلمانوں کے بتدریج زوال کی ایک حقیقی تصویر ہے۔ ''نئی غزل کے سرخیل رفیع الدین راز'' بھی اپنے

اندر ایک فکری وسعت لئے ہوئے ہے۔ ''ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت اور ان کے متوازی نئی غزل کی تاریخ'' اپنے اندر سمیٹے یہ مضمون خاصے کی چیز ہے۔

''سالک لکھنوی (بے سروپا جائزہ) بے سمت زندگی کا قصہ''، ''ڈاکٹر وہاب اشرفی کی خودنوشت''، ''کیا طنز و مزاح دوسرے درجہ کا ادب ہے''، ''طنز، مزاح، ظرافت، مزاح نگاری اور ہجو نگاری کو سامنے رکھ کر اس صنف کا فکری اور فنی جائزہ ہے۔ ''بہار میں اردو کا ہجویہ ادب ۱۹۸۰ء کے بعد'' بہار میں اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایات سے بحث کے علاوہ ''بہار میں اردو تحقیق: سمت و رفتار'' پر تنقیدی بحث کے ساتھ ''ادب اور اخلاقی قدریں'' فکر کی آزادی تحریر کی آزادی، اظہار و خیال کی آزادی کے بغیر حقیقی ادب کو ضابطۂ تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں۔ تعمیر پسند افسانہ نگار اور ابن فرید ڈاکٹر ابن فرید کے افسانوی مجموعے یہ ایسے مضامین ہیں جن پر بطور تخلیق کار انہوں نے اپنے تنقیدی رویے کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ''اختر قادری کی شاعری کے تعمیر پسندانہ رجحانات'' پر مضمون لکھ کر انہوں نے اپنے استاد کا حق ادا کر دیا ہے۔ ''صوبہ بہار کی تواریخ'' ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ ڈاکٹر ظفر حبیب نے منصفانہ طور پر تمام موضوعات کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ہر موضوع اپنے اندر گہرے مطالعے، تنقیدی شعور اور تخلیقی حقائق کو لئے ہوئے ہے۔ بطور مصنف ان کے گہرے مشاہدے نے مضامین کو وہ رنگ عطا کیا ہے جو قاری کے ذوق کی تسکین کا بھرپور سامان فراہم کرتا ہے۔ یہ کتاب یقیناً قاری پر اپنا گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کافی مفید بھی ثابت ہوگی۔

- **کتاب کا نام:** گورا (ناول) **مصنف:** رابندر ناتھ ٹیگور **مترجم:** ایم علی **ص:** ۶۴۰ **قیمت:** برائے مفت تقسیم **ناشر:** ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی **مبصر:** ڈاکٹر عرش منیر (کولکاتا)

ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام شہرۂ آفاق شاعر و ناول نگار رابندر ناتھ ٹیگور کے شاہکار ناول ''گورا'' کا ترجمہ بنگلہ زبان سے براہ راست اردو میں مشہور و معروف مترجم جناب ایم علی نے کیا ہے۔ ترجمے کا فن اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ مترجم دونوں زبانوں پر بیک وقت عبور رکھتا ہو۔ گورا کو بنگلہ سے اردو زبان کے قالب میں ڈھالتے ہوئے انہوں نے کس قدر عرق ریزی اور محنت سے کام لیا ہے یہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ بلکہ اگر مبالغہ آرائی اسے نہ سمجھا جائے تو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ترجمہ کے بجائے تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور جیسے شہرۂ آفاق، کثیر الجہات، شاعر، ادیب، دانشور، مصور اور موسیقار جن کی ذہنی آبیاری بنگال کی سرزمین پر ہوئی جنہوں نے نہ جانے کتنی نظمیں، مضامین، افسانے، ڈرامے، ناول اور کہانیاں لکھیں جن پر متعدد فلمیں بن چکی ہیں۔ ایسے فنکار جن کی تخلیقات کے ترجمے نہ صرف انگریزی بلکہ دیگر عالمی زبانوں میں بھی ہوئے۔ ان پر قلم اٹھانا یا ان کی تخلیقات کے ترجمے کو ضابطہ تحریر میں لانا خاصا مشکل کام ہے۔ کیونکہ ایسی تخلیقات جو ادب عالیہ میں اضافی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی وجہ سے انہیں عالمی ادب کا سب سے بڑا اعزاز ''نوبل پرائز'' سے نوازا گیا۔ ایسی تخلیقات اپنے مترجم پر بہت ذمہ داریاں عائد کر دیتی ہیں۔ جن کو ملحوظ رکھنا ان کے لئے ضروری

ہو جاتا ہے۔ ''گورا'' رابندناتھ ٹیگور کا سب سے طویل ناول ہے جسے انہوں نے ۱۹۰۹ء میں لکھا تھا۔ اس ناول میں وسعت فکر نے اس ناول کو دلچسپ بنا دیا ہے اس کی تخلیق ایسے بنگال میں ہوئی جب ہندوؤں کا دو طبقہ ایک قدامت پرست ہندو طبقہ اور دوسرا کسی قدر آزاد خیال اور ترقی یافتہ فرقہ جب کسی بھی ذات پات اور مذہبی نابرابری کو نہیں مانتا تھا اور یہ لوگ برہمو سماج کے بھگت تھے۔ یہ ایک دوسرے سے فکری اور ذہنی طور پر نبرد آزما تھے۔

سماج میں عورتوں کی جو حیثیت تھی اس پر بھی ٹیگور نے سوال قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں ہمیں قومیت اور قوم پرستی کے عناصر بھی بڑے شد و مد سے نظر آتے ہیں۔ جب ناول کا ہیرو گورا یہ کہتا ہے کہ میں صرف بھارت واشی ہوں میں کسی بھی مذہب کا نہیں ہوں۔ غرض کی ناول کے ترجمہ میں ایم علی صاحب نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس کی اصل روح برقرار رہے۔ اور وہ اس میں بہت ہی کامیاب ہیں۔ وہ لوگ جو بنگلہ زبان سے ناواقف ہیں انہیں ایسے جامع تراجم کے ذریعہ بنگلہ ادب سے بھی بھرپور شناسائی میں مدد ملے گی۔ غرض کے یہ کتاب کافی بہترین ہے اور ذوق مطالعہ کو تسکین فراہم کرنے کے لائق ہے۔

● **نام کتاب: سیرتِ امہات المومنینؓ (حصہ-اول) مرتب: ڈاکٹر محمد طاہر اشاعت: ۲۰۱۵ء**
قیمت: ۳۰۰ روپے رابطہ: شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ، یوپی مبصر: ڈاکٹر عرشِ منیر (کولکاتا)

امہات المومنین یعنی تمام ایمان والوں کی مائیں اور ان ماؤں کی سیرت عہدِ حاضر کے ظلمت کدے میں مینارۂ نور ہیں۔ آج کے اس پرآشوب دور نے جہل اور ظلمت کو انسانی زندگی کا حصہ بنا دیا ہے۔ مغربی تہذیب نے ہمارے معاشرے کو پوری طرح پراگندہ کر دیا ہے۔ عریانیت اور فحاشی نے نوجوان نسل کو تباہ کر دیا ہے۔ ایسے حالات میں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ امہات المومنین کی پاک اور سادہ زندگی کا مطالعہ ان کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکے۔ اس کتاب میں شامل تمام مقالات قابلِ قدر ہیں، جنھیں نہایت ہی عرق ریزی اور جگر سوزی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ ڈاکٹر محمد طاہر صاحب کا ایک بے مثال کارنامہ ہے جسے کافی عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے کتاب میں ایسے قلم کاروں کو شامل کیا ہے جن کے مقالات اپنے موضوع کے اعتبار سے کافی معلومات افزا ہیں۔

آج دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بلاشبہ زیادہ ہے جو اپنے دین سے غافل ہیں۔ انھیں مقدس، پاکیزہ اور دینی زندگی کا کوئی علم نہیں ہے اور ایسے میں سیرتِ امہات المومنین کا مطالعہ یقیناً وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، جو نوجوان نسل کو اسلامی زندگی اور اس کی پاکیزگی سے روشناس کرانے میں اہم ثابت ہوگی۔ اس میں استقبالیہ ڈاکٹر محمد طاہر کا ہے اور پروفیسر عبدالماجد قاضی، ابوصالح دل محمد سلفی، ڈاکٹر نصرت جہاں، ڈاکٹر مشرف علی، مولانا عبدالولی انصار زبیر اعظمی الحمدی، ڈاکٹر افتخار احمد، ظل الرحمٰن فائق بندوی سلفی، محمد اسلم مبارک پوری، راشد حسن، پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی، ابوالقاسم عبدالعظیم، شاداب عالم، احسن جمیل عبدالبصیر مدنی، ڈاکٹر شریف الدین، مولانا عبدالمعید مدنی، ڈاکٹر محمد عقیل، محمد جنید بن عبدالمجید مکی، عبدالمبین فیضی، عظمت اللہ ندوی، انوار احمد اعظمی، ڈاکٹر محمود حافظ عبدالرب مرزا، عبدالرحیم ریاضی، محمد تحسین زماں، محمد مظہر الاعظمی اور ناصر ثناء اللہ کے مقالات شامل ہیں۔ ان قلم

کاروں نے امہات المومنین کی سیرت پر روشنی ڈالنے کی بھرپور سعی کی ہے۔

بہرحال مرتب کا یہ کارنامہ قابلِ صد ستائش و تحسین ہے۔ امید ہے کہ اردو دنیا میں اس کا شایانِ شان استقبال کیا جائے گا۔ پیشکش ہر اعتبار سے معیاری ہے۔

....

• **کتاب کا نام: ایک روٹی سات پہاڑ مصنفہ: نزہت طارق ظہیری اشاعت: ۲۰۰۷ء ص: ۷۲**
قیمت: ۸۰ روپے رابطہ: لائن بازار، پورنیہ، بہار مبصر: ایاز احمد روہوی (کولکاتا)

"ایک روٹی سات پہاڑ" نزہت طارق ظہیری کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں زیادہ تر افسانے خواتین کی نفسیات کی عکاسی اور چبھتے ہوئے موضوعات کی عکس ریزی کرتے ہیں۔ ان افسانوں کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کرداروں کی مناسبت سے حقیقی انداز میں ان ہی کا لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے جس کی وجہ سے افسانوں میں فطری حسن پیدا ہو گیا ہے۔ نزہت ظہیری کے اس افسانوی مجموعہ کا عمیق گہرائی سے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے تخیل پر مبنی افسانے رقم نہیں کئے ہیں بلکہ ذاتی مشاہدہ سے پیدا شدہ احساسات و تجربات کو افسانے کی شکل دی ہے۔ انہوں نے متعلقہ کرداروں کے حالات زندگی، ان کے مسائل، ان کی جدوجہد اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو افسانے کی شکل میں منظر عام پر لا کر قارئین کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجموعہ میں شامل سبھی افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔ دراصل یہ افسانے مصنفہ نے خواتین کے خلاف زیادتی، جہیز، ناخواندگی اور بچہ مزدوری نیز مزدوروں کے مسائل کے پس منظر میں قلمی جہاد چھیڑنے کی ایک بڑی سائنٹفک اور دلچسپ کوشش ہے جس کی سراہنا کی جانی چاہئے۔ گاؤں سے لے کر شہر تک کے سماج کی تلخ سچائیاں ان کے افسانوں میں اس طرح نمایاں ہیں جن کے اثرات سے ذہن و دل کو جھٹکنا ممکن نہیں۔ افسانہ "ایک روٹی سات پہاڑ" میں مصنفہ نے کس طرح پر تاثیر انداز میں مزدوروں کی بے بسی اور ان سے منسلک خواتین کی مجبوری اور کربناکی کو بیان کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

> "بی بی جی! سارا کریا کرم اسی پاپی پیٹ کی خاطر ہے۔ میرا مرد زندہ ہوتا تو پنجاب چلا جاتا، سب دلدّر دور ہو جاتا، یہ رکشہ اور تاڑی دونوں نے مل کر اس کی جان لے لی، کمائی دھمائی بند، نہ دوا نہ دارو۔ خون تھوکتے تھوکتے آخر مر گیا۔"

درج بالا مکالمہ سماج کے دبے کچلے یاس ومحرومی کی کرب ناکی سے دوچار طبقے کی اچھی تصویر پیش کرتی ہے۔ دوسری طرف نئے دور میں گھریلو ملازمہ کی زندگی میں نئی بیداری اور حق کی خاطر نئی جنگ کی تیاری نظر آتی ہے اسے افسانہ نگار نے "چوڑیوں کے کھنکناہٹ" میں اپنے مخصوص اسلوب میں یوں اظہار کیا ہے:

> "یہ کہانی نہیں بی بی، ہم لوگوں کی زندگانی ہے۔ آپ ہی کہئے، میری روشن کوئی ایری غیری ہے۔ استانی ہے، پڑھوتی کرتی ہے۔"

الغرض مصنفہ نے اپنے تمام افسانوں میں سماج کے ناخواندہ، محروم ونامراد اور افلاس زدہ افراد کے مسائل کو

انتہائی حقیقی اسلوب کے ذریعہ دلچسپ انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت ادھورا چھوڑنے کا دل نہیں کرتا۔ یہ مصنفہ کی تحریری عظمت کی ایک بڑی دلیل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس افسانوی مجموعہ کی گوناگوں انفرادی خوبیوں کی بنا پر اس کی پذیرائی کی جائے گی۔

....

- **کتاب کا نام: ''دیوانِ اوجؔ'' شاعر: تلمیذ داغ عبداللطیف اوجؔ مرتب: محمد ثناء الہدیٰ قاسمی قیمت: ۲۵۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۵ء رابطہ: امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار مبصر: ایاز احمد روہوی (کولکاتا)**

''دیوان اوج'' عبداللطیف اوج کا ایک ایسا قلمی دیوان ہے جسے مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نے دریافت کرنے کے بعد بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے ترتیب دے کر اس گرانقدر ادبی ذخیرے کو کتابی شکل میں منظر عام پر لایا ہے۔ اس دیوان کے تعلق سے یہ کہنا بہتر ہوتا کہ یہ عبداللطیف اوج کی گمنام شعری کاوش کا وہ ادبی سرمایہ ہے جسے ثناء الہدیٰ قاسمی نے ضائع ہونے سے بچالیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے کہ انہوں نے شاگردِ داغ عبداللطیف اوج کو گمشدگی سے نکال کر دنیائے ادب میں روشناس کرادیا ہے۔ ثناء الہدیٰ صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی اس کاوش سے تحقیقی کام کرنے والوں کو مدد ملے گی نیز بہار کی اردو شاعری کے تخلیقی پہلو کو بھی اعتبار ملے گا اور عظمت کے دریچے وا ہوں گے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ترتیب وتدوین کا کام نہایت کٹھن ہوتا ہے خاص طور پر قدیم قلمی مخطوطات کی تدوین کے لئے قدیم رسم الخط کا جانکار ہونا ضروری ہے۔ خود مرتب نے بھی 'حرف چند' میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''املا اور رسم الخط قدیم ہے، ان کو اون، اس کو اوس، کہا کو کھا، چرا کو چورا، استاد کو اوستاد لکھا ہے۔'' اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ثناء الہدیٰ صاحب نے اس قلمی دیوان کو نئی روشنائی عطا کر کے ایک لازوال کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس دیوان میں تقریباً ڈیڑھ ہزار منتخب اشعار شامل کئے گئے ہیں جو ہر رنگ وآہنگ کے اعتبار سے ایک امتیازی وصف رکھتے ہیں۔ اوج کے اشعار میں عشق ومحبت، وصل وہجر، تڑپنے اور مچلنے کا ذکر خوب آیا ہے۔ محبوب کی بے وفائی اور حسن وعشق کے معاملات کے ذکر سے اوج کے اشعار بھرے پڑے ہیں لیکن ان میں سوقیانہ پن نہیں ہوتا بلکہ معنوی اعتبار سے ان اشعار میں وسعت وگہرائی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے:

سکھادو تم ہمیں بیداد کرنا بتادیں ہم تمہیں فریاد کرنا
اگر باقی ستم رہ جائے کوئی پس مردن ستم ایجاد کرنا

....

اے شیخ ہم میں آپ میں اتنا ہی فرق ہے حوریں عزیز آپ کو ہم کو صنم عزیز
سمجھے نہ بے مزا تو کبھی میرے درد کو ناصح اگر یہ درد تجھے بھی ہوا کرے

دو شعر اور دیکھیں، کلام میں ایسی ندرت اور غنائیت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے:

وصل کی شب میں زیادہ بس نہ حجت کیجئے اب گلے مل جائیے بوسہ عنایت کیجئے

نامہ جب دیتا ہوں قاصد کو تو جوش رشک سے — دل یہ کہتا ہے مجھے بھی ساتھ رخصت کیجئے

بہر حال ۲۲۴ صفحات کی اس کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور معنی خیز ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی۔

....

● کتاب کا نام: 'دعوت فکر وعمل' مصنف: مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی مرتب: قمر عالم ندوی قیمت: ۲۵۰؍روپے
رابطہ: امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، بہار مبصر: ایاز احمد روہوی (کولکاتا)

مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ موصوف عرصے سے امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ سے منسلک ہیں۔ علاوہ ازیں ایک جادو بیاں مقرر، جید عالم دین، ادیب اور ایک مستند محقق کی حیثیت سے ان کی اپنی ایک شناخت ہے۔ مرتب کے مطابق مفتی صاحب طالب علمی کے زمانے سے اب تک پرورش لوح و قلم کرتے رہے ہیں اور بڑے اہم عنوانات پر مضامین و مقالات سپرد قلم کیے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے مضامین کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع سے ہٹ کر ایک جملہ بھی لکھنا گوارا نہیں کرتے۔ ان میں لفاظی اور طوالت نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین کو ایک بار پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ ان کے مقالات میں صالح ادب کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ جو بات کی جاتی ہے وہ صاف اور عیاں ہوتی ہے۔

مفتی صاحب کی یہ کتاب کل نو ابواب پر مشتمل ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ ہر عنوان اہمیت کا حامل ہے خصوصی طور پر باب دوم کے تحت ''محمد مصطفیٰ ﷺ کی تاریخ ولادت و رحلت پر ایک نظر'' میں اس فکری تحقیق کے ساتھ عنوان کا احاطہ کیا گیا کہ چند صفحات میں حضور پرنور کی حقیقی تاریخ ولادت و رحلت کی پوری تفصیل سما گئی ہے۔ ''بہار میں اردو تحریک کے پچاس سال'' میں مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی نے ریاست بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنوانے کی تاریخی جدوجہد میں ان واقعات کا احاطہ کیا ہے جس نے اردو کو اس کا جائز حق دلوانے میں سیاست کو زیر کر دیا اور اردو کو اس کا جائز مقام مل گیا مگر بعد کے ایام میں جب اردو تحریک سے جڑے لوگ دو خانوں میں تقسیم ہو گئے تو دوبارہ اردو کی ترقی پر زوال آ گیا اور آج حالت یہ ہے کہ اردو بس صرف کاغذ پر دوسری سرکاری زبان بن کر رہ گئی ہے۔ ہماری غفلت، بے پروائی اور اپنی زبان سے بے اعتنائی نے اردو زبان کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا کے سارے مضامین اس لائق ہیں کہ انہیں توجہ کے ساتھ پڑھا جائے تاکہ ہماری علمی، فکری، تحقیقی اور عملی پرواز کو وسعت ملے۔ مجھے امید ہے کہ مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کی یہ کتاب ''دعوت فکر وعمل'' حقیقی معنوں میں قارئین کو فکر وعمل کی دعوت دے کر ہی دم لے گی۔ ہمیں چاہئے کہ ایسی کتابوں کی قدر کرتے ہوئے ہم بار بار اسے پڑھیں اور انہیں زندگی کو حقیقی طور پر صالح اور متحرک بنائیں۔

....

• **نام کتاب: سیرتِ امہات المومنینؓ (حصہ-دوم) مرتب: ڈاکٹر محمد طاہر اشاعت: ۲۰۱۵ء**
قیمت: ۲۰۰ روپے رابطہ: شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ، یوپی مبصر: ایاز احمد روہوی (کولکاتا)

زیرِ تبصرہ کتاب کو ہاتھوں میں لیتے میرا ذہن و دل ایک ایسی روحانی کیفیت سے سرشار ہوا جس کی سرمستی میں بھول گیا کہ کیا واقعی میں اس کتاب پر تبصرہ کے لائق بھی ہوں۔ معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ شاید اس کتاب پر تبصرہ کی کوشش کر کے میں سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰؐ کی خصوصی سفارش کا حقدار بن کر اللہ کے حضور سرخروئی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس کتاب کی عمیق گہرائی سے مطالعہ کے بعد ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے نبیؐ نے توسیع دین کی خاطر مختلف قبیلوں اور خاندانوں کی خواتین سے شادیاں کیں تاکہ ان کی عداوت میں کمی آجائے۔ چنانچہ جب ہم آپ کی ازواج مطہرات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کی سب مختلف قبائل اور باوقار خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں جس کی وجہ سے ان قبیلوں کی عداوت رک گئی اور آپؐ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد طاہر کی یہ کتاب دراصل شبلی کالج (اعظم گڑھ) کے سیمینار بموضوع ''سیرتِ امہات المومنینؓ'' میں پیش کیے گئے مقالوں پر مشتمل ہے۔ اس میں امہات المومنین کے مختلف اوصاف اور ان کے مقام و مرتبہ کا تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں تاریخی شواہد کے ساتھ ایسے واقعات کو بیان کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امہات المومنین نے کیسی پاک اور معطر زندگی بسر کی تھی نیز ان کی زندگیاں اور ان کا کردار مسلم معاشرہ کے لیے آج بھی مثالی ہے۔ انھوں نے نو مولود مسلم معاشرہ کی تکمیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھیں کے ذریعہ بہت سے عائلی قوانین اور رسول اللہ ﷺ کی عائلی زندگی کے بارے میں ہمیں جانکاری ملتی ہے۔ ان نفوسِ قدسیہ نے عورتوں کے معاملات و مسائل کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کر کے خیرِ امت ہونے کا بہترین ثبوت دیتے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کا کام کیا۔ ازواجِ مطہرات نے نہ صرف خود سیکھا اور علم حاصل کیا بلکہ دوسروں کو بھی سکھایا۔ کفایت شعاری، خودداری، بلند حوصلگی، فیاضی و سخاوت اور عزتِ نفس میں ازواجِ مطہرات کی زندگیاں اعلیٰ معیار کی تھیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا جز بن کر دعوتِ حق کو پھیلانے میں معاون کردار ادا کیا۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد طاہر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ''امہات المومنین'' کی زندگی پر ایسی جامع تاریخی کتاب ترتیب دے کر قومِ مسلم کے لئے غور و فکر اور عبرت کے دروازے وا کر دیئے ہیں۔ یقیناً اس کی پذیرائی انتہائی ایمانی حرارت کے ساتھ کی جائے گی۔

....

• **کتاب کا نام: تفہیم و تعبیر مصنفہ: رضوانہ پروین ص: ۱۴۴ قیمت: ۱۵۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۴ء**
رابطہ: اوم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ ۴ مبصر: احمد معراج، کولکاتا

مرد اساس سماج میں روزِ اول سے ہی عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کی سازش ہوتی رہی ہے۔ جیسے جیسے عورتوں میں اپنے حقوق کے تعلق سے شعور پیدا ہوتا گیا ویسے ویسے ان کے اندر احتجاجی کیفیت پیدا ہونے لگی جس نے بعد میں ایک نظریہ، مظاہرہ یا تحریک کی صورت اختیار کر لی جسے ہم تانیثیت یا Feminism کے نام سے

جانتے ہیں۔ خواتین نے نہ صرف صدائے احتجاج بلند کیا بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی موجودگی کا احساس بھی دلایا۔ آج تک خواتین کے ادبی کارناموں کا تنقیدی جائزہ اس طرح نہیں لیا گیا جو ان کا حق ہے۔ شاید اس کی ایک اہم وجہ خواتین تنقید نگار کی عدم موجودگی بھی ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب ایسی خواتین قلم کار سامنے آ رہی ہیں جن میں تنقیدی و تحقیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ پچھلے چند برسوں کے دوران نئی نسل سے تعلق رکھنے والی جو خواتین تنقید و تحقیق کی طرف متوجہ ہوئی ہیں ان میں ایک نام رضوانہ پروین کا بھی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ''تفہیم و تعبیر'' رضوانہ پروین کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ بقول مصنفہ ''یہ بھی مضامین ڈگری اور ایم۔اے۔ کے طالب علموں کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ان مضامین میں جس طرح موضوع و کردار پر باتیں کی گئی ہیں وہ طالب علموں کے لئے مشعل راہ ہیں کہ وہ کس طرح اپنے نصاب میں شامل ناول، افسانے اور ناولٹ کے ساتھ ساتھ شعراء کے متعلق اپنے جوابات کم سے کم صفحات میں موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے کیسے تیار کریں اور لب ولباب میں رسائی آسان ہو۔'' ان پندرہ مضامین میں سے آٹھ کا تعلق فکشن سے ہے۔ تین مضامین شاعری اور دو تنقید کے حوالے سے ہیں جب کہ دو شخصی مضامین ہیں۔ فکشن سے متعلق آٹھ مضامین کا اس کتاب میں شامل ہونا اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ رضوانہ پروین کا فطری رجحان فکشن کی طرف ہے۔ ان آٹھ مضامین میں سے چھ صرف خواتین کے حوالے سے ہیں جن کے عنوانات اس طرح ہیں:

تحریک نسواں اور خواتین فکشن نگار، غزال ضیغم کے افسانوں میں نسوانی حسیت، صالحہ عابد حسین کے ناولوں میں عورت کا کردار، شکیلہ اختر کے افسانوں میں بہار کے سماجی مسائل کی عکاسی، ویدک عہد کی سیتا اور سیتا میر چندانی: ایک تقابل، مجاز کی شاعری میں عورت کا تصور۔ ان چھ مضامین کے ذریعہ مصنفہ نے فکشن نگاری میں خواتین کی خدمات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل وہ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ خواتین قلم کار کسی بھی صنف ادب میں پیچھے نہیں ہیں۔ سرورق پر مشاہیر ادب کی تصاویر کتاب کی خوبصورتی میں اضافہ کا باعث ہے۔ یہ کتاب رضوانہ پروین کی اولین کاوش ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

....

- **کتاب کا نام: مکتوبات مشاہیر مصنفہ: ترتیب و تزئین: ڈاکٹر شاہد رضوی ص: ۱۲۸ قیمت: ۲۰۰ روپے**
اشاعت: ۲۰۱۳ء ناشر: خانقاہ منعمیہ قمریہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی مبصر: احمد معراج، کولکاتا

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مکتوب ایک اہم نثری صنف ہے۔ اس کے ذریعے ہمیں مکتوب نگار کے حوالے سے وہ معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں جو کسی اور جگہ سے دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ مشاہیر ادب کے خطوط ادبی نقطۂ نظر سے کافی اہم ہوتے ہیں۔ خطوط کی مدد سے اس دور کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی احوال کا پتہ چلتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب پروفیسر محفوظ الحسن کے نام لکھے گئے مشاہیر علم و ادب کے خطوط کا مجموعہ ہے جسے ان کے عزیز شاگرد ڈاکٹر شاہد رضوی (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی) نے بڑی کوششوں اور جانفشانی کے بعد منظر عام پر لایا ہے۔ ڈاکٹر شاہد رضوی نے ''خطوط نگاری کا فن اور یہ خطوط'' کے عنوان سے ۲۶ صفحات پر مشتمل

مقدمہ قلم بند کیا ہے۔ اس مقدمہ میں ان تمام مکتوب نگار حضرات (پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبدالودود، پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، اعجاز صدیقی ورشید حسن خاں، پروفیسر حکم چند نیر، پروفیسر مختار الدین آرزو، پروفیسر قمر رئیس، مظہر امام، وہاب اشرفی، اقبال متین، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر سید محمد حسنین، رضا نقوی واہی، ڈاکٹر اطہر شیر، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، رام لعل نابھوی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی) کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے جن کے خطوط اس کتاب میں شامل ہیں۔ پروفیسر محفوظ الحسن صحافت سے کبھی بھی منسلک نہیں رہے۔ ہاں انہوں نے رسالہ ''مشام'' کی بہت دنوں تک سرپرستی ضرور کی۔ اس حوالے سے بھی جو خطوط ان کے پاس آئے وہ اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں موجود زیادہ تر خطوط معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ عام طور پر اختر شیرانی کو اردو کا پہلا سانیٹ نگار تصور کیا جاتا ہے لیکن پروفیسر محفوظ الحسن نے تحقیق کر کے یہ بات ثابت کی ہے کہ پہلے سانیٹ نگار ہونے کا شرف ڈاکٹر عظیم الدین کو حاصل ہے۔ پروفیسر محفوظ الحسن کی تحریر کے تعلق سے مختار الدین احمد، مظہر امام اور قمر رئیس کی رائے ملاحظہ کیجئے:

''سانیٹ والی بحث بہت اچھی ہے۔ کہیں کہیں تو آپ کی تحریر پر کلیم احمد کی تحریر کا گماں ہوا۔'' (صفحہ نمبر: ۴۲)

''آپ کی نثری/تنقیدی تحریروں کا ہمیشہ سے مداح رہا ہوں۔۔۔ایسی صاف شفاف رواں دواں نثر لکھنے والے کہاں ہیں۔ (ص: ۶۰)

''آپ کی نثر صاف شفاف ہے۔ کہیں بھی سطحیت اور گنجلک پن کا احساس نہیں ہوتا۔ (ص: ۶۲)

اس کتاب میں مکاتیب کی عکسی تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں جو بقول پروفیسر علیم اللہ حالی ان خطوط کو زیادہ مستند بناتی ہیں۔

مشاہیر کے خطوط ادبی سرمایہ ہیں۔ انہیں منصۂ شہود پر لانا واقعی اہم کام ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تزئین کے لئے ڈاکٹر شاہد رضوی کو مبارک باد پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

- **کتاب کا نام: تاریخ کوروڈیہہ (بھاگلپور) جلد دوم مصنف: ڈاکٹر ارشد جمیل ص: ۲۶۷**

قیمت: ۲۰۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۵ء رابطہ: موضع کوروڈیہہ، بھاگلپور (بہار) مبصر: احمد معراج، کولکاتا

تحقیق کا محنت طلب ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وقت طلب بھی ہوتا ہے۔ اس دشوار گذار راہ سے وہی شخص بہ آسانی گذر سکتا ہے جو بالغ نظر اور صابر ہونے کے علاوہ تحقیق کے اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ سال میں ہزاروں کی تعداد میں ادبی کتابیں اردو زبان میں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر کتابوں کا تعلق شاعری سے ہوتا ہے۔ نثری کتابیں کم منظر عام پر آتی ہیں۔ ان میں بھی تحقیقی کتابیں کبھی کبھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ایک اہم تحقیقی کتاب ہے جس میں کوروڈیہہ کے ماضی و حال کی تاریخ کو بڑی عرق ریزی سے قلم بند کیا گیا ہے۔ کوروڈیہہ بہار کا ایک قدیم علمی اور تاریخی علاقہ ہے۔ اس کا اصل نام عصمت اللہ پور تھا۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر ارشد جمیل ہیں جو ایل این متھلا یونیورسیٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ اس کتاب

کے سلسلے میں دو اقتباسات پیش خدمت ہیں جن سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''اپنے شہر یا گاؤں کو تاریخی و معاشرتی اعتبار سے جاننے اور سمجھنے کی خواہش عین فطری ہی نہیں ضروری بھی ہے۔ اس فطری اور ضروری خواہش کی تکمیل کے لئے تحقیق و جستجو کی مشکل راہوں سے گذر کر معلومات جمع کرنا اور انہیں تحریری صورت میں محفوظ کر دینا ایک اہم اور مفید کام ہے۔ ڈاکٹر ارشد جمیل کی زیر تصنیف ''تاریخ کوروڈیہہ'' اس طرح کے کام کی ایک عمدہ مثال ہے۔''

(پروفیسر سید شاہ ضیاء الرحمن، سابق صدر، شعبۂ اردو، متھلا یونیورسٹی)

کوروڈیہہ کے ماضی و حال کو اس سرزمین کے چشم و چراغ ڈاکٹر محمد ارشد جمیل، استاد، شعبۂ اردو، متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ (بہار) جو کہ دینی و دنیوی علوم کا حسین امتزاج ہیں، کی قرطاس ابیض پر پیش کرنے کی یہ کوشش دراصل اس علاقہ کی شناخت کے تحفظ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

مذکورہ کتاب میں بھاگلپور کے گرد و نواح میں تعلیم و معاشرت، کوروڈیہہ ماضی اور حال کے آئینہ میں، یادوں کے چراغ اور تذکرۂ معاصرین عنوانات کے تحت بھرپور مواد جمع کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ایک سو سے زائد علمی و مذہبی شخصیتوں کے احوال و کوائف درج ہیں۔ میرے علم کے مطابق کوروڈیہہ کے حوالے سے یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ اس کوشش کے لئے ڈاکٹر ارشد جمیل کو مبارکباد پیش نہ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی۔ ۲۶۷ رصفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۲۰۰ روپے ہے جو واقعی بہت کم ہے۔

....

- کتاب کا نام: مہکی مہکی رات (شعری مجموعہ) شاعرہ: سیدہ نفیس بانو شمع ص: ۲۴۰ قیمت: ۲۰۰ روپے اشاعت: ۲۰۱۴ء، ناشر: ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی مبصر: احمد معراج، کولکاتا

سیدہ نفیس بانو شمع ایک اچھی فکشن نگار ہونے کے علاوہ ایک سنجیدہ اور زود گو شاعرہ بھی ہیں۔ ان کی شاعری نے نہ صرف قارئین بلکہ ناقدروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دہلی اردو اکاڈمی، اترپردیش اردو اکاڈمی اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے انہیں انعامات سے سرفراز کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''مہکی مہکی رات'' ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے تین مجموعے ''کائنات بھر سناٹا'' جان کونین (مذہبی شاعری)، ''کچھ درد کے صحراسے''، منصۂ شہود پر آکر اپنی موجودگی کا احساس دلوا چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ کے مطالعہ کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیدہ نفیس بانو شمع نے مختلف موضوعات کے علاوہ نسوانی جذبات کو فکر کی گہرائی کے ساتھ خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں خارجیت کے بجائے داخلیت کا رنگ گہرا ہے۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ ''مہکی مہکی رات'' کتنا چھوٹا اور سادہ سا نام ہے مگر کیا آپ محسوس کر سکتے ہیں اس کی وسعت کو، اس کی اتھاہ گہرائیوں کو، اس میں امڈتے ہوئے سیلاب کو، اس کے آتشیں پیکر کو سیدہ نفیس بانو شمع نے سہل ممتنع میں اچھے اچھے اشعار کہے ہیں۔ دلی جذبات کو عام الفاظ میں قرینے سے پیش کرنے کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ زبان و بیان کی روانی اور سادگی ان کے کلام کی اہم خوبی ہے۔ کتاب کے دونوں فلیپ پر معروف نقاد حقانی القاسمی

کی تحریر موجود ہے جس میں اختصار کے ساتھ سیدہ نفیس بانو شمع کی شاعری پر خوبصورت گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب میں کئی مشاہیر ادب (ڈاکٹر تابش مہدی، پیغام آفاقی، سید ضیاء علوی) کے مضامین شامل ہیں جن سے محترمہ کی شاعری و شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کتاب کی طباعت اور کاغذ دونوں عمدہ ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مجموعہ کو پڑھتے وقت قارئین لہجے کی شگفتگی ضرور محسوس کریں گے۔

آخر چند اشعار اس مجموعے سے پیش خدمت ہیں:

اذاں ہوں خود میں اپنی اور خود اپنی امامت ہوں	نگاہِ یار سے پوچھو کہ دل کشی کیا ہے
جسے وہ دیکھ لے پل میں حسین ہو جائے	نگاہِ یار سے پوچھو کہ دلکشی کیا ہے
کفر کے فتوے سناتی رہی دنیا مجھ کو	اور میں ہوگئی مومن اسے سجدہ کر کے
نہ جانے کون سے منزل پہ عشق پہنچا ہے	کہ اس کے قرب میں بھی سوگوار رہتی ہوں
ترے ہی نام سے اب لوگ مجھ کو پہچانیں	فنا کی منزل میں شاہد بقا ہوئی میری

....

● کتاب کا نام: سفر کے اڑتالیس دن مصنف: ڈاکٹر مختار احمد مکی ص: ۲۰۶ قیمت: ۲۰۰ روپے
اشاعت: ۲۰۱۵ء رابطہ: ریحان ہاؤس، پروفیسر کالونی، آزاد نگر، جمشید پور–۸۳۲۱۱۰ مبصر: احمد معراج، کولکاتا

ڈاکٹر مختار احمد مکی کی یہ کتاب حرمین شریفین کا روزنامچہ ہے۔ انھوں نے مذہبی فریضہ انجام دینے کے لیے حج کا سفر کیا تو تاریخی حقائق پیش کرنے کے لیے تفصیلات لکھیں تا کہ دوسروں تک پہنچا کر طریقۂ صحابہ ادا کر سکیں۔

حج کے سفرنامے شائع ہوتے رہتے ہیں اور قاری تک پہنچتے بھی رہتے ہیں لیکن سوچنے کی کیفیت پیدا کرنے والی کتاب بہت کم منظر عام پر آتی ہے۔ ڈاکٹر مکی نے اپنے تجربے کو روزنامچہ بنا کر جس طرح تزئین و زیارت کی اونچی عمارت کھڑی کی ہے اس سے الفاظ پگھل پگھل کر آنکھوں کی روشنی بنتے ہیں۔ انھوں نے روحانی شوق کو لکھتے وقت شوقِ بندگی کی زیارت کرائی ہے اور معبود کی عبدیت کے سعادت مند بنے ہیں۔ عقیدت کا شگفتہ لالہ زار حرمین شریفین میں جلوہ زار بنتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ۲۰۱۴ء میں حج کی سعادت حاصل کی تھی اور ۴۸ دن مکہ و مدینہ میں گزارے تھے جس میں انھیں فکر و تلاش سے گزرنا پڑا تھا اور وقت کی پر قوت کے ساتھ چلنا پڑا تھا۔ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے۔

ڈاکٹر مکی نے ماضی کی باتیں بھی جوڑنے کی کوشش کی ہیں جس سے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے اور ان کی عبادت کو اعتبار ملا ہے۔ اس کتاب میں حضور ﷺ کے پہلے اور آخری حج، اصطلاحات حج، مکہ مکرمہ کے چند تاریخی مقامات، مدینہ منورہ کے قرب و جوار کے چند تاریخی مقامات اور رسول ﷺ کے روضۂ مبارک پر مختصراً مواد دیا گیا ہے۔

● کتاب کا نام: وقارِ علم و حکمت: کوثر چاند پوری مصنف: ڈاکٹر نازنین خان ص: ۲۲۸ قیمت: ۲۰۰ روپے
اشاعت: ۲۰۱۴ء رابطہ: شملہ ہلز، فردوس کالج، بھوپال–۴۶۲۰۰۲ (ایم پی) مبصر: احمد معراج، کولکاتا

کوثر چاند پوری قابلِ ذکر حکیم کے ساتھ معروف افسانہ نگار بھی تھے۔ ۸ر اگست ۱۹۰۰ء کو چاند پور (یوپی) میں پیدا ہوئے اور وفات ۱۳ر جون ۱۹۹۰ء میں دہلی میں ہوئی۔ انھوں نے حکمت کے ساتھ ادب کی بھی خدمت کی ہے۔ کم وبیش ۶۵ر سال تک قلم رواں دواں رکھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں مجموعے کی تعداد ۱۳ر ہوئی۔ ان کے ۱۷ر ناول بھی شائع ہوئے اور بچوں کے لئے کہانیوں کی ۲۵ر کتابیں طبع ہوئیں۔ تاریخ، رپورتاژ، طنز ومزاح، تحقیق وتنقید اور صحافت سے بھی خود کو جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ زندگی کے عصری مسائل کو انھوں نے اپنی تحریروں میں احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے فن سے پختہ شعور کا پتہ چلتا ہے اور حسن وعشق کی اعتدال پسندی میں حدت وحرارت نظر آتی ہے۔ انھوں نے کسان اور محنت کش طبقہ، دفتری ملازمین، جاگیرداری اور زمین داری کے تانے بانے، حکومت کی پالیسیوں کا انجذاب، خانگی امور کے تاریک پہلو اور معاشرہ کے نشیب وفراز کو حسن وجمال کے ساتھ اپنے ناول اور افسانے میں پیش کیا ہے۔ بیانیہ کی دلکشی اور اثر انگیزی ان کی تحریر میں ملتی ہے۔ یہ خوبیاں توانا تحریک کا درجہ رکھتی ہیں، جس میں انسان دوستی کے جذبات انگڑائیاں لیتے ہیں اور فراخ دلی کو آئینہ دکھاتے ہیں۔

ادب کی حکمت آمیز شخصیت کوثر چاند پوری کی تحریریں معاشرتی نظام کی کمزوریوں کی عکاسی کرتے ہیں اور عادات واخلاق اور ان کی ترجمانی کرنے کا احساس بیدار کرتی ہیں۔ اس کتاب میں کوثر چاند پوری کی حالاتِ زندگی، افسانہ نگاری، ناول اور ناولٹ نگاری، سوانح نگاری، تنقید نگاری، رپورتاژ نگاری، طنز ومزاح نگاری، بحیثیت بچوں کے ادیب اور بحیثیت طبیب مواد دیا گیا ہے اور ان کے ایک افسانہ ''یدِ بیضا'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

....

● **کتاب کا نام: ادراک مرتب: ڈاکٹر عمر غزالی ص: ۲۴۰ قیمت: ۳۷۵ر روپے**
اشاعت: ۲۰۱۵ء رابطہ: ۱۴۸/ جی، چترنجن ایونیو، کلکتہ۔ ۷ مبصر: احمد معراج (کولکاتا)

اکثر یہ شکایت سنی جاتی ہے کہ نئی نسل کے قلم کاروں میں قابلیت کی کمی ہے۔ ان کے اندر تنقیدی وتحقیقی صلاحیت کا فقدان ہے۔ لیکن کیا کبھی اس کی وجہ جاننے کی کوشش ایماندارانہ طریقے سے کی گئی ہے؟ کیا نئی نسل کی تربیت اس انداز سے کی جارہی ہے، جیسے پہلے کی جاتی تھی؟ کیا نئے لکھنے والوں کی ذہنی آبیاری اس طریقے سے ہورہی ہے جیسی پچھلے وقتوں کے اساتذہ کیا کرتے تھے؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کے قلم کاروں میں صلاحیت کی کمی بالکل نہیں ہے۔ کمی ہے صرف صحیح رہنمائی، تربیت اور ایسے پلیٹ فارم کی جہاں وہ اپنے ہنر کا مظاہرہ کرسکیں۔ نئی نسل کے ریسرچ اسکالرز کو ایسے ہی صحت مند پلیٹ فارم مہیا کرانے کی ایک سنجیدہ کوشش کے طور پر اس کتاب کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر عمر غزالی ہیں جو ہگلی محسن کالج (بردوان یونیورسٹی) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر عمر غزالی نئی نسل کے تازہ کار اور فعال قلم کار ہیں۔ اب تک ان کی ۹ر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''ادراک'' میں مرتب کے علاوہ بیس قلم کاروں کے مقالے شامل ہیں جن کی فہرست اس طرح ہے: ''اردو ادب میں طنز ومزاح کا آغاز وارتقاء'' (روشن آراء)، ''اردو رباعیات وقطعات اقبال: ایک مطالعہ''

(محمد مشتاق امانوی)، ''علامہ راشد الخیری کے افسانوں میں اصلاح نسواں وحقوق نسواں کا تصور'' (جاوید اقبال)، ''مختار الدین احمد آرزو کی تحقیقی بصیرت'' (محمد عابد حسین) ''راجندر سنگھ بیدی کے نمائندہ افسانوں کا سماجیاتی مطالعہ'' (تمنا پروین)، ''آل احمد سرور کا تنقیدی رویہ'' (تبسم آرا)، ''فورٹ ولیم کالج کے بنگالی ہندو مصنفین کی نثری خدمات: ایک اجمالی جائزہ'' (محمد علی انصاری)، ''رابعہ سلطانہ ناشاد کی غزل گوئی کے بنیادی عناصر'' (ناہید نیلوفر)، ''علامہ راشد الخیری کے ناولوں میں چند نمائندہ نسوانی کردار'' (نکہت پروین) ''جاوید نہال کے نمائندہ افسانوں کا تنقیدی مطالعہ'' (محمد یحییٰ خاں)، ''ہاجرہ مسرور کے افسانوں میں تانیثیت'' (ارشاد علی)، ''مغربی بنگال میں اردو مجلّوں کی روایت: راجہ بازار کے مجلّوں کی روشنی میں'' (اشرف جعفری)، ''مغربی بنگال میں نئی اردو غزل کی روایت'' (خورشید انور)، ''قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کے فروغ میں غیر مسلم شعرائے اردو کا کردار: ایک اجمالی جائزہ'' (صوفی ظفر شاہد)، ''بنگال میں تحقیق وتنقید کا ایک معروف نام: ڈاکٹر جاوید نہال'' (جاوید اختر)، ''محمد حسن کی ڈرامہ نگاری'' (شائستہ پروین)، ''وقیع منظر اور ان کی شاعری کے رنگ'' (انتخاب اقبال)، ''اردو فکشن میں خواتین'' (شاذیہ حسن)، ''سیماب: ایک تعارف'' (رضا مظہر انصاری)، ''بنگال کا ایک ترقی پسند شاعر- پرویز شاہدی'' (انور سراج)، ''مکیش کوہستانی: بحیثیت غزل گو'' (ڈاکٹر عمر غزالی) موضوعات پر مقالے لکھے گئے ہیں ان پر بردوان یونیورسٹی میں ریسرچ کا کام جاری ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر عمر غزالی نے لکھا ہے جب کہ پیش لفظ، معروف شاعر ومحقق پروفیسر یوسف تقی نے قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر عمر غزالی کے چند جملے پیش خدمت میں جن سے کتاب کے عنوان اور اہمیت پر روشنی پڑتی ہے:

''ہر سنجیدہ ادیب مقدور بھر اپنے فکر وادراک کی روش پر کائنات کی وسعتوں کو چھونے کی سعی کرتا ہے۔ ہمارے ریسرچ اسکالرز نے بھی اپنی بساط کے مطابق اپنے ادراک کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے لئے ''ادراک'' کا لفظ مناسب معلوم ہوا۔ اس کتاب میں شامل تمام مقالے تحقیقی نوعیت کے ہیں جن میں تنقید کی زیریں لہریں آپ کو مچلتی دکھائی دیں گی۔ البتہ ہر کسی کا انداز جدا، ہر کی اڑان الگ ہے۔ کسی کسی میں بلا کی روانی ہے۔ کسی میں نازک خرامی، کسی میں ساحل کو چومنے کی جستجو اور للک ہے تو کسی میں گرداب میں تبدیل ہونے کی ہمک۔ یعنی جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب بننے کے مصداق یہ تمام مقالے کسی نہ کسی نہج پر ہمیں دعوت مطالعہ ضرور دیتے نظر آتے ہیں اور انہیں ہم محض طالب علمانہ کوشش کہہ کر بالکل نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

اس کتاب کی طباعت میں عمدہ کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے لیکن کمپوزنگ کی غلطیاں پڑھتے وقت کھٹکتی ہیں۔ نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کے مقالات کو کتابی صورت میں شائع کر کے ڈاکٹر عمر غزالی نے یقیناً قابل تعریف اور قابل تقلید کام کیا ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی۔

....

● **نام کتاب: حیات عبدالرحمٰنؒ نام مؤلف: وصی احمد شمسی ص: ۲۷۴ قیمت: ۲۵۰ اشاعت: ۲۰۱۲ء ناشر: انجمن تعمیر ملت (رجسٹرڈ)، روپس پور، دھمسائن، ضلع دربھنگہ (بہار) مبصر: احمد معراج (کولکاتا)**

یہ سچ ہے کہ جو لوگ اپنے بزرگوں کے کارنامے یاد نہیں رکھتے، آنے والی نسلیں انہیں بھی بھلا دیتی ہیں۔ اپنے اکابرین کی تاریخ کو فراموش کرنا گویا اپنی شناخت کو بھولنا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وصی احمد شمسی جیسے لوگ زندہ ہیں جو اپنے بزرگوں کے کارنامے نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ انہیں دنیا کے سامنے پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''حیات عبد الرحمٰن'' یکتائے روزگار شخصیت حضرت مولانا عبد الرحمٰن علیہ الرحمہ (امیر شریعت خامس امارت شرعیہ بہار واڑیسہ) کے احوال و افکار کا احاطہ کرتی ہے۔ روزانہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس دنیائے آب و گل میں آتے ہیں، ایک مدت تک قیام کرتے ہیں اور پھر کوچ کر جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں جن کی زندگیاں منبع رشد و ہدایت بن جایا کرتی ہیں۔ حضرت مولانا عبد الرحمٰن کا شمار بھی ایسی ہی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ حضرت مولانا عبد الرحمٰنؒ کے حوالے سے یہ پہلی کتاب ہے جس میں ان کی زندگی کے تمام گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی تقریظ ڈاکٹر ارشد جمیل (شعبہ اردو، ایل این ایم یو، دربھنگہ) نے لکھی ہے جبکہ مقدمہ قاری شبیر احمد (ناظم، مدرسہ اسلامیہ، شکرپور، دربھنگہ) نے تحریر فرمائی ہے۔

حضرت مولانا عبد الرحمٰنؒ سے وصی احمد شمسی کا رشتہ بڑا گہرا رہا ہے۔ وصی احمد شمسی صاحب بیک وقت ان کے حقیقی بھانجا، فرمانبردار شاگرد اور مرید خاص ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے چھوٹے داماد بھی ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر ارشد جمیل کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''انہوں (وصی احمد شمسی) نے پہلی بار حضرت مولانا کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق اندرون خانہ سے ہے۔ عموماً سوانحی کتابوں میں شخصیت کے ان ہی جہتوں پر روشنی پڑتی ہے جو خارجی زندگی سے متعلق ہوتی ہیں اور داخلی زندگی خفا میں ہی رہتی ہے۔ کچھ شخصیت ایسی بھی ہوتی ہے کہ باہر کے لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات اور تعلقات بہت ہی بہتر ہوتے ہیں اور گھر والوں کے ساتھ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہی شخصیت عظیم اور قابل تقلید ہوتی ہے جن کی زندگی میں افراط و تفریط اور تضاد نہیں ہوتا۔ ان کے افعال و اقوال میں یکسانیت ہوتی ہے اور وہ عمدہ کردار کے نمونے ہوتے ہیں۔''

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب: حضرت مولانا عبد الرحمٰنؒ کی حیات و خدمات پر مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مشاہیر اہل قلم کے مقالات۔ دوسرا باب: امیر شریعت کی وفات پر مختلف ارباب فکر و نظر کے تعزیت نامے، تاثرات اور مختلف رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین کے تراشے۔ تیسرا باب: مولانا عبد الرحمٰن کے فکر انگیز اور سبق آموز خطبات، ایمان افروز تحریر و تقریر اور بیش قیمتی مکاتیب کے نمونے۔ چوتھا باب: امیر شریعت کے اساتذہ، مشائخ اور مشہور تلامذہ و مریدین کے حالات۔ پانچواں باب: امیر شریعت کی ذاتی و خانگی نیز قومی و علمی زندگی کے قابل ذکر حالات۔ خاتمہ: منظوم خراج عقیدت، عکس تحریر، خودنوشت امیر شریعت، محترمہ رابڑی دیوی اور لالو پرساد کے اخباری بیان، شجرہ نسب اور جناب صفی اختر (سکریٹری، امور انتظامی، آل انڈیا ملی کونسل و معاون مدیر، ملی اتحاد، نئی دہلی) کا مختصر تاثراتی مضمون ''علم و معرفت کا در یتیم''۔ کتاب کافی دیدہ زیب ہے۔ میری نظر میں یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

راہ و رسم

● **ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، نئی دہلی:** حسن طباعت اور کتابت سے مزین اور مرصع اور اس کے ساتھ بڑے ہی گراں قدر مضامین کا مجموعہ ''تمثیل نو'' کا جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء موصول ہوا۔ باعث صد شکر گزار ہوں۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے تحت جہاں اہم ادبی اور ثقافتی خبریں دی گئی ہیں، وہاں دوسری طرف وفیات کے تحت ڈھائی درجن سے اوپر معروف و نامور شخصیتوں کو ان کے ناقابل فراموش اور کارناموں پر خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ''گوشۂ ڈاکٹر سید تقی عابدی'' اور ''گوشۂ پروفیسر منصور عمر'' کے تحت ان دونوں حضرات کی ادبی خدمات پر متعدد مضامین زیادہ پسند آئے۔ دیگر مضامین میں مادری زبان کی اہمیت، روداد کولکاتا، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی :شناسا ادبی چہرہ، مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریری جہت، حسن امام درد: یادیں اور باتیں، سید منظر امام: ایک ہمہ جہت شخصیت، مولانا مناظر احسن گیلانی ایک نامور عالم دین اور محقق، اکیسویں صدی میں مغربی بنگال میں اردو ناول اور جنگ آزادی میں اردو زبان کا رول، دربھنگہ کا ادبی منظرنامہ (بیسویں صدی کے حوالے سے) اور ڈاکٹر امام اعظم (ریجنل ڈائرکٹر، مانو کولکاتا) سے گفتگو سب سے زیادہ پسند آئے۔

● **زبیر رضوی (مدیر ''ذہن جدید'') نئی دہلی:** آپ نے ''تمثیل نو'' کے تازہ شمارے سے نوازا، بے حد شکریہ۔ ''ذہن جدید'' کا شمارہ آپ کے نام پوسٹ کیا گیا ہے۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ کا شہر دربھنگہ بہار کے ایسے شہروں میں ہے جو اردو زبان و ادب کے سلسلے میں سب سے زیادہ فعال اور سرگرم ہے۔

● **ابواللیث جاوید، نئی دہلی:** ''تمثیل نو'' (جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء) میرے پیش نظر ہے۔ اعلان کے مطابق حیدرآباد کے ادبی پیش رفت پر موضوعاتی شمارہ شائع ہونا تھا۔ آپ کی پریشانیاں میں خوب سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ 'اردو والوں' کی حد درجہ بے حسی نے ہی اردو کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ رسالوں کے ایڈیٹرز کے دفتر میں مضامین اور دوسری تخلیقات کا انبار لگا رہتا تھا۔ بیچارے مدیران کی پریشانیاں ہوتی تھیں کہ کسے شائع کریں اور کسے واپس کریں۔ آخر وہ ہمدردان اردو کیسے دل و گردہ کے مالک تھے۔ آج کوئی بھی کسی کے متعلق کھلے دل سے کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتا۔ اردو کی درس و تدریس سے منسلک لوگ صرف سیمینار، مشاعرے، انٹرویوز میں ہی شوق سے شامل ہوتے ہیں کیوں کہ وہاں زرِ مبادلہ حاصل کرنے کی کافی گنجائش ہے۔ اب مضامین لکھنا ایک کاروباری حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ آپ بددل قطعی نہ ہوں۔ اپنے موضوعاتی شماروں کی اشاعت جاری رکھیں۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی اور ڈاکٹر منصور عمر کے گوشے پسند آئے۔ صفحہ ۴۱ ر تا ۸۷ ر مغربی بنگال اور کولکاتا سے ہی متعلق ہے جس میں آپ کی نظم ''یہی کولکاتا ہے'' بھی شامل ہے۔ یہ نظم دراصل کولکاتا کی تعریف نہیں بلکہ تاریخ ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ کولکاتا پر اردو میں اب تک لکھی جانے والی تمام نظموں میں یہ نظم اول نمبر پر ہے۔ آپ بہت بہت مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اردو زبان و ادب میں اپنی نگارشات سے جو کچھ اضافہ کیا ہے وہ ان کی زبان سے محبت کی غمازی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر منصور عمر کی رحلت سے ادب

میں جو خلا، پیدا ہوا ہے، اس کی تلافی قطعی ممکن نہیں ہے۔ نارنگ ساقی، ڈاکٹر جاوید نہال، مناظر عاشق ہرگانوی، پرویز شاہدی، حسن امام درد، مولانا لطف الرحمٰن ہرسنگھ پوری، جگر مرادآبادی، اسلم چشتی، سید منظر امام، مولانا مناظر احسن گیلانی، شمیم مظفر پوری، منظر کاظمی، ڈاکٹر شہباز نبی، ڈاکٹر ذاکر حسین، فیاض رفعت وغیرہم پر کئی حوالوں سے مضامین اور دیگر مضامین جن میں کچھ نصابی نوعیت کے بھی ہیں، اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حیدرآباد کا خصوصی شمارہ نہ شائع ہونے کی صورت میں ان مضامین کی شمولیت ناگزیر ہوگئی۔ اس بار افسانوی اور شعری حصہ بھی اچھا خاصا ہے۔ ہر بار کی طرح آپ کا اداریہ، کتابوں پر تبصرے اور مکتوبات کے حصے لاجواب ہیں۔

● **نقشبند قمر نقوی بخاری، امریکہ:** "تمثیل نو" جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء بھی بہت دلچسپ دستاویزی حیثیت کا رسالہ موصول ہوا، یعنی ایک سال بعد شائع ہوا، پھر بھی بہت اچھا شائع ہوا۔ اول تو اس کی ضخامت ہی حیرت انگیز، رسالہ کیا مکمل کتاب ہے۔ اور پھر اس تاریخی ادبی حیثیت کے ساتھ کہ تین سو باسٹھ سے زائد صفحات، اللہ اللہ، یہ آپ ہی کی ہمت ہے کہ اتنا ضخیم رسالہ مرتب کیا ہے اور اس میں مضامین بھی ایسے ایسے نادر شامل کیے کہ کلکتے کو دریائے ہگلی میں واقع ہونے والا شعروادب کا جزیرہ بنادیا، جس کے گرد نظم ونثر کا تلاطم برپا ہے۔ اور پھر وہ "گوشے" بھی ہیں، وہ بھی ایسے حسین جیسے ڈاکٹر سید تقی عابدی اور پروفیسر منصور عمر۔ مشکل یہ ہے کہ میں کس مضمون کی تعریف کروں۔ ڈاکٹر ندیم احمد نے جگر کی عشقیہ شاعری پر نظم آرائی کی ہے۔ رفیق جعفر نے اسلم چشتی کی گیت کاری پر گیت لکھا، البتہ جنگ آزادی میں اردو زبان کا رول مزید تفصیل اور طوالت کا طلب گار تھا۔ منظومات بھی اچھے ہیں اور مضامین بھی جن سے بعض، واقعی بہت معلومات فراہم کرتے ہیں۔ آپ کی کوشش اور ادارت قابل توصیف ہیں۔

● **پروفیسر عبدالمنان، کولکاتا:** "تمثیل نو" (جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء) نظر نواز ہوا۔ اس کی ضخامت کو متقدر اور مانع تخلیقات نے جس حسن اسلوبی اور جامع انداز سے گھیرا ہے جس کی وجہ سے اردو ادب کی صحافتی تاریخ میں اس کا مقام لائق تحسین نظر آتا ہے۔ یہ شمارہ جدید شعری و ادبی رجحان کا ترجمان یوں ہے کہ یہ (شمارہ) ۳۷۶ر صفحات پر مشتمل بے شمار فکری زاویوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ حمد یہ کلام کے علاوہ کولکاتا کی مختصر ادبی تاریخ، گوشہ ڈاکٹر سید تقی عابدی، گوشۂ پروفیسر منصور عمر اور غزلوں میں مظہر امام، شاداں فاروقی، اکبر حسین اکبر، احسان ثاقب، امام اعظم، انجم عثمانی، حلیم صابر، کامران غنی صبا، شاکر خلیق، امان خاں دل، رونق شہری، مشتاق دربھنگوی وغیرہ اہم ہیں اور کتابوں پر تبصرے بھی خوب ہیں۔ مضامین میں مادری زبان کی اہمیت، ڈاکٹر منصور عمر کی تنقید نگاری، ڈاکٹر منصور عمر کا جمال آشنا شعری افق، اردو کے عصری تقاضے اور اردو کی صورت حال، جاوید نامہ: انسان سازی کا زندہ جاوید شاہکار اور تجزیہ وقطعات برائے اردو جریدہ "تمثیل نو" وغیرہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بیان کی وارفتگی، سلاست اور خیال کی ندرت کے لحاظ سے اس رسالے کو اردو کی بے لوث خدمت کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ تکنیکی اور سائنسی چاہت کے دور میں اردو ادب کی خدمت کے لئے دل ونظر کے علاوہ جیب خاص کی فیاضی وفراخ دلی کا ثبوت دینا تاریک راہوں میں شمع جلانا ہے۔ اس فعل کی انجام دہی کے لئے جنون صفتی کے ساتھ آگے بڑھنا دیدہ و دل کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ امام اعظم کی علم دوستی، ادب نوازی اور اردو کی خدمت کی داد دیجئے کہ انہوں نے ضخیم رسالہ

بعنوان ''تمثیل نو'' کی اشاعت سے بنگال کی سرزمین کو شاداب بنایا اور انفرادیت کا سکہ جمانے میں کامیابی حاصل کی۔اس شمارے کے علاوہ جتنے شمارے بھی تخلیق پذیر ہوئے ہیں ان کی ادبی شان امام اعظم کی عظمت کی دلیل ہے۔میں دعا گو ہوں کہ وہ اسی طرح اردو کی خدمت کا جنون پیش کرتے رہیں اور جس طرح درجنوں شعری ونثری تخلیقات سے اردو کی آبیاری کا ثبوت دیا ہے اسی طرح تیز رفتاری کی راہ میں زنجیر سلاسل کے لے جانے سے احتراز کریں۔ تو ان کا نام امر رہے گا۔امام اعظم کی نظم کلکتے کی ادبی، سماجی، ثقافتی اور علمی حقیقت کا جس جذبے کے ساتھ وضاحت کرتی ہے اس میں شعریت اور حقیقت کا ایسا آویزہ ملتا ہے جو ہم نشینی کے ساتھ یگانگت اور ہم جہتی کے تیر چلاتا ہے اور ٹیگور کی نگری کو وحشت اور پرویز کا دیار بنا دیتا ہے۔آرٹ کی لہر، سیاست وثقافت کی رفتار اور مادیت کی گرم بازاری کی یورش امام اعظم کو اسیر کر لیتی ہے تو ان کا حساس دل پیم رواں اور ہر دم جواں نظر آتا ہے اور وہ صراحت اور حقائق کے ساتھ ان باتوں پر مرکوز کرتے ہیں جو کولکاتا کی شان کی وضاحت میں مدد کرتے ہیں۔اس طویل نظم میں فکری تموج اور کشادہ دلی نظر آتی ہے وہ اہلِ کولکاتا کے مزاج ومرجے کی غمازی کرتی ہے۔

● **انجم عظیم آبادی، کولکاتا:** ''تمثیل نو'' کا شمارہ بابت جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء مطالعے میں رہا۔ادار یہ اردو والوں کو دعوت فکر دیتا ہے۔رسالہ دربھنگہ اور کولکاتا کے شعراء وادباء کے مابین پل کا کام کر رہا ہے۔دونوں مقامات کے اہل علم ایک دوسرے سے زیادہ متعارف ہو رہے ہیں۔صنعت توشیح کے برتنے کا چلن کلکتے میں نہیں ہے جبکہ دربھنگے میں اس صنعت کو بحسن وخوبی برتا جا رہا ہے، جو مذکورہ بالا صنعت کی زندگی کی علامت ہے۔ڈاکٹر امام اعظم ''یہی کولکاتا ہے'' اچھا سلسلہ ہے۔کلکتے کے حوالے سے بعض باتیں کلتے والوں کو بھی چونکانے والی ہوتی ہیں۔ ''سوناگاچھی'' معیاری نظم ہے۔اگر وہ چاہیں تو اپنی دیگر نظموں میں اسے بھی جگہ دے سکتے ہیں۔گوشۂ ڈاکٹر سید تقی عابدی ان کی ادبی کاوشوں اور صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔احسان ثاقب کی زود گوئی اور زورِ بیان کا میں معترف ہوں۔حالی کی صد سالہ سالگرہ کا آنکھوں دیکھا حال (تقی عابدی) صرف معلوماتی ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے اس زمانے کے انتظام وانصرام اور طور طریقوں سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔ڈاکٹر ایم۔صلاح الدین نے اپنے مضمون ''رہ گئے تھے رخ جو تاریکی میں اب روشن ہوا'' میں حضرت ناطق لکھنوی کو بھی شامل کیا ہے۔اور کرنا بھی چاہئے تھا کہ ناطق جیسے باکمال واستادِ فن شاعر کو ہم لوگوں نے فراموش کر رکھا ہے جبکہ وہ علامہ آرزو لکھنوی اور علامہ رضا علی وحشت کلکتوی کے نہ صرف ہم عصروں میں تھے بلکہ ان کی استادانہ صلاحیت مسلم الثبوت تھی۔ڈاکٹر امام اعظم کے مضمون ''ڈاکٹر سید تقی عابدی: اقبال اور غالب کے مخفی گوشے'' میں تقی عابدی کے مضمون کے اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے علاج میں کوتاہی برتی گئی۔ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔اس عہد میں میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جس قدر آج ترقی یافتہ ہے، پھر یہ کہ مسلمانوں کو یونانی ادویات وطریقۂ علاج پر بھی اعتقاد تھا۔اقبال بھی انہیں میں شامل رہے۔اقبال کو گزرے ۷۲ سال ہو گئے اس قصے کو اب دوہرانا کیا؟ عابدی صاحب نے (Anemia) کا ترجمہ ''کم خونی'' کیا ہے جو درست نہیں۔کم خونی سے کم خون کرنے والا ظاہر ہو رہا ہے۔اصل ترجمہ ''قلتِ خون'' ہے۔زیر مطالعہ شمارے کے مخصوص شاعر غفران امجد کے اشعار نے متاثر کیا۔بلاشبہ انہیں اس کا حق پہنچتا ہے۔

احسان ثاقب کی برفانی غزل اچھی لگی۔ احمد معراج کے مضامین ''سید منظر امام: ایک ہمہ جہت شخصیت'' اور ''ڈاکٹر شہناز نبی کی نظم گوئی: اگلے پڑاؤ سے پہلے'' اچھے لگے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں توازن برقرار رکھا ہے اور دیانت دارانہ تحریر کے لئے یہ ضروری ہے۔ کلکتے پر شمس جلیلی نے بھی اچھی نظم کہی ہے۔ ان کی اس نظم کو فنی پختگی کا مظہر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ بیشتر مشمولات قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہیں۔ پھر بھی شعری تخلیقات کا انتخاب مزید توجہ کا مستحق ہے۔ تبصرے اچھے ہو رہے ہیں۔

● **ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی، رام پور (یوپی):** آپ کی متحرک شخصیت ادبی میدان میں روز بروز نئے شگوفے کھلاتی رہتی ہے چنانچہ ''تمثیل نو'' جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء کا تازہ شمارہ بہت سے نئے موضوعات کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ شہر کولکاتا کی مختصر تاریخ شمس جلیلی نے نہایت عمدگی سے اپنی نظم میں سموئی ہے جس سے اس شہر کے ماضی و حال کا خوب تعارف ہوتا ہے۔ گوشۂ سید تقی عابدی اور گوشۂ پروفیسر منصور عمر بھی معلومات افزا ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مضامین اچھے ہیں خصوصیت سے شاہد اقبال کا مضمون ''اکیسویں صدی میں مغربی بنگال میں اردو ناول'' خاصے کی چیز ہے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے تحت آپ اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں سے بہت اچھی طرح روشناس کرایا ہے۔ خدا کرے آپ ہمیشہ مستعد و فعال رہیں۔

● **فاروق راہب، موتیہاری (مشرقی چمپارن):** ''تمثیل نو'' کا شمارہ جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء باصرہ نواز ہوا۔ بصیرت افروز اور تشنہ کاموں کی پیاس بجھانے والا شمارہ ہے۔ بے شک یہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تمام تخلیقات صرف عمدہ اور معیاری ہی نہیں، ذہن کو آسودگی بھی بخشتی ہیں۔ اس اہم پیشکش کے لئے آپ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر رستم انصاری نے ''سرفروشی کی تمنا...... '' شعر کو رام پرساد بسمل کے نام سے منسوب کر دیا ہے جبکہ یہ بسمل عظیم آبادی کا شعر ہے۔ اس سلسلے میں کئی مضامین مختلف جرائد میں آچکے ہیں۔ ظفر مجیبی کی ترتیب کردہ کتاب ''عندلیبان غزل'' میں بہار و جھارکھنڈ کے غزل گو شعراء کا ہی تذکرہ ہے۔ اس کے دوسرے حصے کو وہ ترتیب دے رہے تھے جو ان کے انتقال کی وجہ سے منظر عام پر نہیں آسکا۔

● **کرشن پرویز، کھرار، موہالی (پنجاب):** طویل مدت کے بعد ''تمثیل نو'' کا شمارہ جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء ملا۔ یاد آوری اور ارسال نامے کے لئے شکریہ۔ کوئی زمانہ تھا جب اردو رسائل ہر شہر کے ریلوے اسٹیشن بک اسٹال پر دستیاب ہوتے تھے لوگ اپنی پسند کا رسالہ خرید کر پڑھتے تھے۔ مگر اب سیاسی جوڑ توڑ نے اردو کو پنجاب سے پنجاب بدر (بشیر بدر نہیں) کر دیا ہے۔ ''شمع''، ''بیسویں صدی'' جیسے رسائل سے تمام ہندوستان کی ادبی خبریں مل جاتی تھیں اس کمی کو ''تمثیلِ نو'' پوری کر رہا ہے۔ اس شمارے سے کئی ایسی جانکاریاں ملیں جن کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ فی الحال پورا پرچہ تو نہیں پڑھ پایا کیوں کہ عمر ۸۰ سال ہوگئی ہے زیادہ دیر بیٹھ کر پڑھنا مشکل ہو گیا ہے پھر چیدہ چیدہ دیکھا ہے تو لگا کہ اس بار پروف ریڈنگ ٹھیک سے نہیں ہو پائی۔ جیسے صفحہ ۱۲۸ر گرم سورج کا لہو جسے لکھا ہے گرم سوج کا لہو۔ صفحہ ۱۸۰ر پر جگر صاحب کے اشعار میں کچھ الفاظ کی غلطی ہے۔ صفحہ ۲۳۳ر پر ڈاکٹر ذاکر حسین کی پیدائش ۱۹۷۹ء لکھی اور وفات ۱۹۶۹ء لکھی ہے۔ اگر پیدائش ۱۹۷۹ء ہے تو ۲۹ر نومبر ۱۹۴۰ء کو جامعہ ملیہ کی بنیاد کے

موقع پر کیسے حاضر ہو گئے۔ اسی طرح حمیرا محمود آفریدی صاحبہ نے معاصر اردو شاعری کا نسائی لہجہ بیسویں صدی کے قبل صرف دو شاعرات کا ذکر کیا ہے جب کہ یہ تعداد ۲۰ ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس وقت شاعرات کے کلام کو اہمیت نہیں دی گئی۔ مجموعی طور پر سب مضامین اپنی جگہ خوب ہیں۔

● **نجم عثمانی، دھنباد:** ''تمثیل نو'' کا شمارہ نمبر ۲۸ ر زیر مطالعہ ہے۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے معیاری ہے۔ ضخامت کی وجہ سے مکمل طور پر مطالعہ کرنا آسان نہیں۔ ڈاکٹر منصور عمر اور ڈاکٹر سید تقی عابدی پر گوشے شامل کر کے آپ نے اس شمارے کو دستاویزی حیثیت عطا کر دی ہے۔ منصور عمر مرحوم کی اچانک موت نے ادبی حلقوں کو مغموم کر دیا۔ بہار کے اہم اردو شعرا پر مشتمل تحقیقی کتاب ''بہار کے چند نامور شعراء'' (تین جلدوں میں) مظفر مہدی کے ساتھ ترتیب دے کر شائع کرنا مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب کی آخری دو جلدوں کی ایک ساتھ اشاعت کے فوراً بعد منصور عمر صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ آپ نے گوشہ شائع کر کے مرحوم کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ حمیرا محمود آفریدی کا مضمون ''معاصر اردو شاعر کا نسائی لہجہ'' ایک اہم مضمون ہے۔ نسائی لہجے کی شاعری کے حوالے سے پروین شاکر سب سے بڑا نام ہے۔ احمد معراج کا مضمون ''سید منظر امام: ایک ہمہ جہت شخصیت'' ایک وقیع مضمون ہے۔ سید منظر امام صاحب یقینی طور پر ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ موصوف کی دو آزاد نظمیں نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ کاش سید منظر امام شاعری کا شغل جاری رکھتے۔ آپ نے شہر کولکاتا کی منظوم تاریخ ''یہی کولکاتا ہے'' شامل اشاعت کی ہے۔ اس نظم میں شہر کولکاتا کی مختصر تاریخ اور کولکاتا کے تمام ادباء و شعراء وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں جو کولکاتا میں تھے یا نہیں۔ شاید یہ بات آپ کے ذہن سے نکل گئی کہ پروفیسر محمود واجدی بھی بسلسلۂ ملازمت کولکاتا میں مقیم تھے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خزاں کے پھول بہار کے دن'' انجمن ترقی اردو کلکتہ نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔ چند دنوں قبل میں نے ایک نظم ''گہوارۂ علم و ادب مسکن شرفاء'' بغرض اشاعت ارسال کی تھی۔ یہ میرے وطن مولود پیر بیگھہ کی مختصر ادبی تاریخ ہے۔ آئندہ ریسرچ کا یہ ایک اہم موضوع ہو سکتا ہے۔ تعلیمی اعتبار سے یہ گاؤں گیا ضلع کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔ باقر علی باقر شاگردِ غالب کے بھائی آرہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ میرے دادا سید الفت حسین مرحوم فوج میں ویٹرنری ڈاکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ خود باقر صاحب کے نواسے حیدر آباد میں انجینئر تھے اور ''دیوانِ باقر'' حیدر آباد میں ہی شائع ہوا تھا۔

● **احسان ثاقب، نوادہ:** دنیائے ادب کا نمائندہ جریدہ ''تمثیلِ نو'' کا میں بہت پرانا قاری ہوں۔ جب بھی اس کا کوئی نیا شمارہ آیا، میں نے نہایت توجہ سے اس کا مطالعہ کیا اور مجھ جیسے مبتدی کو بہت کچھ سیکھنے سمجھنے کا موقع ملا۔ عام طور پر اس میں شامل نثری اور شعری حصے معیاری اور مربوط ہوتے ہیں۔ یوں تو اردو کے تعلق سے بہت ساری کوششیں ہو رہی ہیں اور اس سلسلے میں بہ بانگِ دہل کچھ لوگ یہ اعلان کرتے بھی نظر آتے ہیں کہ اردو میں زندگی کی جو تھوڑی بہت چمک باقی ہے، وہ ان ہی کے دم سے ہے۔ ادبی اور شعری ارتقائی تسلسل کے سراغ اور شناخت کے یہ دعوے اور تذکرے کتنے مدلل اور تخلیقی ہوتے ہیں اگر ایمان داری سے جانچا اور پرکھا جائے تو اس کی چوک اور غفلت سامنے آ جاتی ہے۔ ادب اور تہذیب کا خاصہ یہ ہے کہ لازماً اسے زمینی حقائق کا پابند ہونا پڑتا ہے، جہاں نہ

مفر کی گنجائش رہتی ہے نہ گریز کی۔ وہاں بھی کچھ اردو کے بانکے جیالے خود کو میاں مٹھو بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہاں یہ بھی ایک ایماندارانہ سچائی ہے کہ آج بھی اردو کے چہرے کی چمک بڑھانے والے لوگ لڑکھڑا کر ہی سہی، مگر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اردو کے تعلق سے مایوسی کی جملہ بازی کرنے والوں کو ان کے احساسات و بیانات کو ازسرِ نو غور کرنے کی ہدایت دے رہے ہیں، جو زبان لفظ لفظ روشنی کے پس منظر میں اپنا سفر طے کرتی آ رہی ہے، صدیوں سے تراش و خراش اور تعمیر و ترقی میں نشو و نما پانے والی زبان کیوں کر محرکات و حالات سے متاثر ہو سکتی ہے۔ اتنا یاد رکھیے کہ کل بھی اردو زندہ تھی، آج بھی زندہ ہے اور کل بھی رہے گی۔ یہ زبان شعر و ادب اور اپنے قیمتی فن پاروں کے ذریعہ اسی جی داری سے گرمِ سفر اور متحرک رہے گی۔ کچھ کم نظر لوگ جست مار کر خود کو بڑا بننے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمیشہ احساسِ ندامت کے شکار ہوتے ہیں۔ ان کے لیے عرض ہے کہ پتہ نہیں کتنے اور کیسے کیسے اہلِ قلم اور علمی و ادبی شخصیتیں اپنے من میں ڈوب کر اس زبان کے لیے سراغِ زندگی تلاش کر چکی ہیں کہ تادمِ قیامت اس کی سرخروئی باقی رہے گی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مبارک باد کے مستحق تو وہ صحافتی حلقے ہیں، اس لیے بھی کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور عوامی مقبولیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اردو سے اصل لگاؤ تو ان ہی کا ہوتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اردو کے منظر نامے پر ان کے نام کی تختی بھی لگنی چاہیے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی کلکتے کی مختصر منظوم تاریخ ''یہی کولکاتا ہے!'' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ دیگر تخلیقات بھی لائق ستائش ہیں۔ آپ کی ادارت میں ''تمثیلِ نو'' آج جس بلندی پر ہے، وہ ہر کوئی جانتا ہے۔ میں اس شعر کے ساتھ اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

● **راشد جمال فاروقی، دہرادون (اتراکھنڈ):** مدتوں بعد ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ نمبر ۲۸ رموصول ہوا۔ اتنی مدت بعد کہ میرا پتہ (یعنی کوارٹر نمبر) بھی بدل چکا ہے۔ آپ اپنے پرچے پر بڑی محنت کرتے ہیں۔ تمام اردو دنیا کی ہلچل کا نقشہ سامنے لے آتے ہیں۔ جو لوگ رخصت ہو گئے ان کی تفصیلی روداد بھی مل جاتی ہے۔ کل ہی شمارہ ملا ہے کہیں کہیں سے پڑھ رہا ہوں۔ کولکاتا کی منظوم تاریخ ''یہی کولکاتا ہے!'' خوب ہے۔ مرحوم پروفیسر منصور عمر پر کچھ کچھ پڑھ سکا ہوں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی اردو کے مجاہد ہیں۔ میری ان سے کئی بار کی ملاقات ہے۔ فیاض رفعت کا اور منور رانا کا انٹرویو بھی پڑھ لیا ہے۔ مجھے سوانحی اور انٹرویو قسم کی تحریریں بہت اپیل کرتی ہیں۔

● **رفیق شاہین، علی گڑھ:** ''تمثیل نو'' (جون ۲۰۱۴ء تا جولائی ۲۰۱۵ء) موصول ہوا۔ ضخیم و جسیم بھی ہے اور معیاری و جعفری بھی۔ اس شمارے کو تو آپ نے معیار و وقار کے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ سارے مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں جو بصارت اور بصیرت میں اضافہ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔ افسانے بھی عصرِ حاضر کے غماز ہیں جو موثر بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ بالخصوص ابو اللیث جاوید اور لیٰسین احمد کے افسانوں نے زیادہ متاثر کیا۔ شعری گوشہ بھی باتمکنت و باوقار ہے۔ یہ پہلا منفرد رسالہ ہے جس نے اکتالیس کتابوں پر معیاری تبصرے ایک ہی شمارے میں پیش کیے ہیں جو مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، فہیم انور، اشرف احمد جعفری، ڈاکٹر منور حسن کمال، صابر رضا شمسی اور شاہد اقبال کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ بہرکیف یہ ایک یادگار دستاویز کی حیثیت

رکھتا ہے جس کے لئے بجا طور پر آپ تحسین و تہنیت کے مستحق ہیں۔

● **شمس فریدی، جمشید پور:** ایک طویل انتظار کے بعد "تمثیل نو" (جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء) دستیاب ہوا۔ سراپا ممنون ہوں۔ تمہاری محبت ہے کہ تم "تمثیل نو" بھجوا دیتے ہو۔ اتنی کاوش اور محنت کر کے رسالہ بہر حال شائع ہو رہا ہے۔ یہ بہت قابل قدر و تحسین ہے۔ اردو زبان و ادب کی اشاعت و فروغ کے لئے تم ہمہ دم مصروف ہو یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ زیر نظر شمارہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سب سے زیادہ اہم تمہارا اداریہ "مجھے کچھ کہنا ہے" ہے۔ میں اداریہ کو ایک "خبرنامہ" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ تم نے مابعد واردات و واقعات کو اس اداریہ میں قلم بند کر دیا ہے۔ وفیات ۲۰۱۴ء سے تادم تحریر کی حیثیت ایک دستاویز کی ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔

مضامین سب کے سب قابل مطالعہ ہیں۔ "ذہن جدید" سے زبیر رضوی کی تحریر پر مظہر امام کی شخصیت اور شاعری پر اختصار میں بے حد اہم ہے۔ مظہر امام کی گوناگوں شخصیت کا زبیر رضوی نے اچھا خاکہ کھینچا ہے۔ مظہر امام بااصول انسان تھے، نفاست پسندی ان کی فطرت میں رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھے ناقد اور دانشور تھے اور بہت سنبھل کر کسی پر اپنی رائے زنی کرتے تھے۔ آزاد غزل کو اردو ادب میں منوانے کی بلاشبہ بہت کوشش کی۔ ان کے حوارین نے تو آزاد غزلوں کے بہت مجموعے شائع کئے لیکن خود انہوں نے دس سے زیادہ غزلیں نہیں کہیں اور نہ ہی آزاد غزل کا مجموعہ بذات خود شائع کیا۔ زبیر رضوی کا یہ خیال سو فیصدی درست ہے کہ ان کا یہ تجربہ اردو ادب میں ناکام رہا۔ ان کی شاعری کو بہر حال اردو ادب فراموش نہیں کر سکتا۔ ان کے بہت سے اشعار آج بھی بہت مقبول ہیں۔ وہ بلاشبہ قابل احترام شخصیت کے حامل تھے۔ یہی کولکاتا ہے (ایک منظوم مختصر تاریخ) بہت خوب ہے۔ گرچہ یہ نظم روزنامہ "عکاس" اور پندرہ روزہ اخبار "سرپرست" میں شائع ہو چکی ہے۔ تمہارے مجموعۂ شعری "نیلم کی آواز" میں بھی شامل ہے۔ بہت پسند کی جانے والی نظم ہے۔ اس نظم کی مقبولیت میں اور بھی اضافہ ہوگا۔

ڈاکٹر منصور عمر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان کا گوشہ بھی زیر نظر شمارہ میں شامل ہے۔ ان پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر عبدالمنان، پروفیسر رئیس انور، ڈاکٹر امام اعظم اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کے مضامین سے منصور عمر کی شاعری اور شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ منصور عمر بہت مخلص اور پیارے آدمی تھے۔ وہ جمشید پور دوبار مجھ سے ملنے آئے تھے اور اپنی پیاری شخصیت کا نقش میرے دل پر چھوڑ گئے۔

ان کی نظم "فلسطین" چند اچھی نظموں میں شمار ہوگی۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی پر بھی گوشہ شامل اشاعت ہے۔ ان کی اب تک غالباً ۴۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں جرمنی (برلن) میں ان کی کتاب "فیض فہمی" کی رسم رونمائی ہوئی تھی۔ اس میں میں بھی شامل تھا اور ان پر سپاس نامہ بھی پیش کیا ہے۔ فیض پر لکھے ہوئے تمام مضامین کو انہوں نے یکجا کر دیا ہے اور خود ان کے پچاس مضامین فیض فہمی میں شامل ہیں۔ وہ بے حد مخلص انسان ہیں۔ وہ بڑے محقق ہیں اور شاعر بھی ہیں۔ دوسرے مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ "تمثیل نو" کا منظوم حصہ بھی بہت اچھا ہے۔ غزلیات اور منظومات سب کے سب قابل مطالعہ ہیں۔ خصوصی مطالعہ شہر کولکاتا میں روداد کولکاتا (شمس جلیلی)، "نقیب، دلچسپ نقابت اور ہوٹنگ" انجم عظیم آبادی نے بہت دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔

• **شمس جلیلی (ایڈووکیٹ) پورنیہ:** آپ نے تازہ شمارے میں میری نظم روداد کو لگا تا کی جو Placing کی ہے اس کے لئے جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ آپ کے اداریہ میں اردو زبان وادب سے متعلق کچھ فکر انگیز باتوں کا ذکر کیا ہے۔ واقعی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خود اردو والوں کا اردو کی طرف جو رویہ ہے وہ باعث تشویش ہے لیکن دانشوروں کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ ایسا ہے کیوں؟ تقسیم ہند سے پہلے اردو والوں پر ہندی زبان و ادب کا بوجھ نہ تھا اور نہ ملازمت کے لئے انگریزی اردو کے علاوہ ہندی کی بھی ضرورت تھی۔ تقسیم ہند کے بعد سے ایک پرچہ اردو کا ہٹا دیا گیا۔ لڑکے اردو میں کمزور ہوتے چلے گئے۔ ہندی لازمی ہوتی چلی گئی اب تو اردو اختیاری ہے پھر وہ بھی نہیں۔ اردو کے ٹیچر پروفیسر کے بچوں نے بھی بڑی تعداد میں اردو پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو جنہیں ش اور قاف کی فکر ہے وہی اردو اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ جن کی تعداد روز بروز کم ہوتی چلی جارہی ہے۔ ہر جگہ grass root کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ''تمثیل نو'' کا ایک شمارہ ''اکیسویں صدی میں اردو'' پر بھی تھا جس موقع پر میں نے حضرت سعدی کا مشہور شعر کوٹ کیا تھا:

اگر پر کوہساراں باراں نیارد   بروزے خشک تر دود جلہ رودے

جس طرح آج ہم اردو چھوڑ رہے ہیں اسی طرح ایک زمانے میں فارسی سے لوگوں کی دوری پر افسوس کرتے تھے۔ اگر بچے حرف ابجد نہیں جانیں گے تو پھر زبان وادب کیوں کر زندہ رہ سکتے ہیں۔ خدانخواستہ ایک دن ایسا بھی نہ آجائے کہ قرآن شریف کو عربی میں پڑھنے کی بجائے اس کا دیوناگری ترجمہ ہی پڑھنے پر لوگ اکتفا نہ کر لیں۔ بنگال کے علاوہ تلگو، ملیالم اور کنڑ زبان والے تو قرآن شریف کو عربی میں پڑھنے کے علاوہ نماز کے قاعدے اور احادیث اپنی علاقائی زبان میں پڑھتے ہیں۔ شاید ابھی وہ دن بہت دور ہے جب مسلمان قرآن کا ترجمہ اپنی علاقائی زبان میں پڑھنے پر اکتفا کریں گے۔ اداریہ میں آپ نے اس تلخ حقیقت کا خود بھی اعتراف کیا ہے کہ اردو پڑھنے والا یا اردو کتابوں رسالوں کے قاری کی تعداد روز بروز گھٹتی جارہی ہے۔ دیکھئے تہذیب کے دل دادہ کب تک اردو کے ساتھ عشق نباہ سکیں گے۔ خدا نہ کرے کہ ایک قیمتی خزانہ دفن ہو جائے۔

• **پروفیسر ایم کمال الدین، دربھنگہ:** جولائی ۲۰۱۴ء- جون ۲۰۱۵ء کا تمثیلِ نو بہ تشکیل نو بہ حجم نو بہ غیر مشمولاتِ نوع بہ نو نظر نواز ہوا۔ آنکھیں خیرہ ہوئیں کہ کیا یہ وہی ''تمثیلِ نو'' ہے۔ اب تو:

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن   جوانی کی راتیں امنگوں کے دن

لیے ہوئے چودھویں کا چاند بنا ہوا ہے۔ اس کے ایام طفلی بھی دیکھے ہوا ہوں لیکن ادھر کئی برسوں سے میں زندگی کے سفر میں مختلف منزلوں سے گزرتا رہا۔ زندگی جو بچ گئی تو یوں کام آئی کہ میں نے سال رواں میں حج کا فریضہ انجام دے دیا۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ ''تمثیل نو'' سے بھی ملاقات شاید ہوئی تھی۔

دربھنگہ میں مشتاق احمد نوری نے اکاڈمی کو پہنچا دیا۔ شاید یہ میری کسی بھی ادبی محفل میں تین برسوں کے اندر پہلی شرکت تھی۔ اسی میں آپ (ڈاکٹر امام اعظم) نے وہ ایک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم تھی، یہ شمارہ پیش کیا۔ میں بھی جھجکا کیوں کہ میری آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں اور وہ بچہ ''تمثیلِ نو'' خاصا تومند اور روشن نظر آیا۔ گھر آیا تو محض الٹ

پلٹ کر کے چھوڑ دیا۔ غور سے دیکھا تو عش عش کر گیا کہ اتنی ساری تخلیقات شعری، نثری، تحقیقی، اطلاعاتی ۳۷۶ کو اپنی قلمرو میں شامل کیے ہوئے ہے۔ میں تو سب کچھ پڑھنے سے رہا۔ پھر یہ کہ میرے دل نے کہا کچھ پسندیدہ چیزیں پڑھ جاؤں۔ پہلے اداریہ نظر آیا "مجھے کچھ کہنا ہے تو لیجیے جناب "مجھے بھی سننا ہے۔" سنا تو امید و بیم کے درمیان اردو متبسم نظر آئی۔ ایسے ہی موقع کے لیے میں نے ایک شعر کہا تھا :

جب چل پڑے سفر کو پتھر نہیں گننا — تم اپنی پشت پر لگے خنجر نہیں گننا

ڈاکٹر امام اعظم کا سفر جاری ہے۔ یہی خوشی کی بات ہے۔ شہر کولکاتا اس لحاظ سے یکہ و تنہا ہے اس کو موضوع بنا کر عمدہ اور جذباتی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بنگلہ زبان میں اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کے پیش نظر نام ور شعرا نے دلچسپ اور ادبی نقطۂ نظر سے پر جوش نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں اس کی عشوہ طرازیوں کو منعکس کرتے ہوئے اسے ایشیا سے بھی تشبیہ دے ڈالی ہے اور درحقیقت اس کا ایک علاقہ اپنی خاص تجارت کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے اور جو کوئی اس طرف جاتا ہے مسحور ہو جاتا ہے۔ اس پر میں نے ۱۹۸۱ء میں نیشنل لائبریری کلکتہ میں اچھا خاصا ذخیرہ دیکھا تھا۔ اردو میں بھی ہر عہد میں اس شہر پر شاہ کار تخلیقات شعر و ادب معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ ان میں حرمت الاکرام کی شہرہ آفاق نظم "کلکتہ اک رباب" کی یاد آرہی ہے۔ شمس جلیلی کی نظم "روداد کلکتہ" رواں اور سلیس ہے۔ اس میں کلکتہ کی عظمت تاریخ و تہذیب سب کچھ ہے لیکن درد آشنا دل یہ بھی کہتا ہے :

آسماں میں چھید کرتے اونچے اونچے ہیں محل — سوتے ہیں فٹ پاتھ پر لاکھوں یہاں خانہ خراب
نفس اکساتا ہے مجھے کہ ہو حسیں کچھ ارتکاب — دل مگر خائف تھا کہ ہوگا خدا سے پھر حساب

کچھ ہوا ہے ضرور لیکن شمس جلیلی صاحب اقبالیہ بیان دینا نہیں چاہتے۔ آخر وکیل بھی تو ہیں! ۔ ڈاکٹر امام اعظم کا مضمون کولکاتا کی "مختصر ادبی تاریخ" اور اسی کا منظوم تاریخی بیان "یہی کولکاتا ہے!" بہت مختصر اور بے حد جامع ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی نگارشات پر پورا کا پورا کولکاتا نچھاور کردوں۔ حافظ شیرازی نے یہ تمنا کی تھی :

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا — بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

ڈاکٹر شبانہ خاتون شمن کا مضمون "ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریری جہت" بھی اچھا مضمون ہے اور ڈاکٹر مظفر مہدی کے حوالوں سے عمق پیدا ہوا ہے۔ سیّد منظر امام : ایک ہمہ جہت شخصیت پر اس لیے نظر رک گئی کہ گذشتہ سال امیر منزل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ میں میری پہلی ملاقات ہوئی اور خدا نہ کرے کہ آخری ہو۔ ان کی شبیہ میرے ذہن کے فریم میں کس چکی ہے۔ احمد معراج کے مضمون میں سیّد منظر امام کا یہ شعر توجہ کش ہوا:

جب تک جیے مسیح کئی تھے مرے قریب — مرنے لگے تو پاس مرے چارہ گر نہ تھا

اچھا ہوا کہ کوئی چارہ گر نہیں تھا ورنہ وقت سے پہلے ہی دونوں میں ٹھن جاتی۔ "منصور عمر...... ملنے کے نہیں" ان کی وفات کے دو دن کے بعد لکھا تھا اور قومی تنظیم پٹنہ میں چھپا بھی تھا مگر گوشۂ منصور میں وہ ملے اور ملانے والوں نے اچھی طرح ملایا۔ آپ قابلِ مبارک باد ہیں۔ یہ شمارہ اپنے گیٹ اپ، تصاویر و ترتیبی اعتبار سے اہم رسالوں سے آنکھ ملاتا نظر آتا ہے۔ آپ کو ملنے والی مبارک بادیوں کے لشکر میں میری مبارک بادی بھی شامل ہے۔ کہیں گم نہ ہو جائے۔

• **سید محمود احمد کریمی (ایڈوکیٹ) دربھنگہ:** ''تمثیل نو'' کا شمارہ جون ۲۰۱۴ء-۲۰۱۵ء زیر نظر ہے۔ شمارۂ ہذا اپنی گوناگوں صفات سے متصف دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ جریدۂ ہذا کے مطبوعہ مضامین ''خصوصی مطالعہ'' گوشۂ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی، گوشۂ پروفیسر منصور عمر (مرحوم)، افسانے، تبصرے، تجزیے سب اعلیٰ تخلیقی معیار کے حامل ہیں نیز ان کے تخلیق کار، مضمون نگار، اور افسانہ نویس مستند اور مسلم الثبوت ماہرین فن ہیں۔ ان حضرات نے اپنی تخلیقات کے ارقام میں نہایت عرق ریزی سے کام لیا ہے اور قارئین کرام کیلئے جو حقائق اور مواد مطالعہ (Reading Materials) پیش کیا ہے وہ سب نہایت مفید، معلوماتی اور کارآمد ہیں، جس میں اردو ادب کی ترویج کی Unflagging Spirit کارفرما ہے۔ لہٰذا تمام اہلِ قلم حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں :

حَمـاکَ اللّٰـہ عَن شرِّ النَّوائب
جَزاکَ اللّٰـہ فی الـدّارین خیرا (حافظ شیرازی)

جریدہ ہذا کی غزلیں اور نظمیں بھی معیاری ترنم بردار باعثِ فرحت ارواح ہیں۔ بقول علامہ اقبالؔ :

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

ڈاکٹر سید تقی عابدی کے متعلق یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ ایک بہترین معالج ہی نہیں، بلکہ اپنی مخصوص کارکردگی اور خداداد صلاحیتوں کی بناء پر بین الاقوامی شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ ایک فقید المثال محقق، ایک اعلیٰ معیار کے مصنف اور بہترین دانشور بھی ہیں۔ بحیثیت شاعر بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی، پروفیسر رئیس انور، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد اور ڈاکٹر سرور کریم کے مضامین یقیناً قابلِ ستائش ہیں۔ شمس جلیلی کی نظم ''روداد کولکاتا'' اور ڈاکٹر امام اعظم کی منظوم ادبی تاریخ ''یہی کولکاتا ہے!'' جاذبِ توجہ اور معیاری ہیں۔ ڈاکٹر سرور کریم نے ''دربھنگہ کا منظرنامہ'' پیش کر کے دربھنگہ کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کو قارئین تمثیل نو کے سامنے پیش کرنے کی مستحسن سعی کی ہے وہ قابلِ قدر اور باعثِ پذیرائی ہے۔

• **پروفیسر طارق جمیلی، پورنیہ:** قارئین عموماً مدیر اور اس کے رسالہ کی تعریف میں آسمان زمین ایک کر دیتے ہیں لیکن ''تمثیل نو'' ایک ایسا رسالہ ہے جس کی تعریف کئے بغیر طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ تعریف و تحسین کے اتنے پہلو شامل و داخل ہیں کہ تعریف کرنے پر آجائیں تو ''تمثیل نو'' سے بھی زیادہ ضخیم اور طویل خط نما تاثرات قلم بند ہو جائیں گے۔ تبصرہ تقریباً ہر رسالہ ہوا کرتا ہے لیکن ''تمثیل نو'' میں تبصروں کی تعداد پچاس ساٹھ بھی نظر آتی ہے۔ تعداد کے اعتبار سے امام اعظم بھی مناظر عاشق ہرگانوی کی طرح ایک ادبی کارنامہ انجام دینے کے قائل اور مائل نظر آتے ہیں۔ ادبی سرگرمیوں کی روداد کی شمولیت کے اعتبار سے بھی یہ گوشہ دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ وفیات کا گوشہ صرف خبر نہیں ہوا کرتا بلکہ مرحومین کی حیات و خدمات کا مختصر مضمون ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا میرا یہ کہنا کہ تمثیل نو کا ہر شمارہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن تمثیل نو کا ۲۷واں شمارہ جو پیش نظر ہے اس میں ایک شاہ کار نظم ''یہی کولکاتا ہے!'' شامل ہے۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس نے ''کلکتہ ایک رباب'' کو حافظہ کی شاہراہ سے دور کر دیا ہے۔ اس نظم کی مقبولیت

کے پیش نظر ''یہی کوا کاتا ہے'' کے عنوان سے امام اعظم ایک کتاب بہت جلد شائع کرنے والے ہیں۔

● **تشنہ اعجاز، بگہا، مغربی چمپارن** : ''تمثیلِ نو'' کی اشاعت اگر چہ دیر سے ہو رہی ہے مگر پھر بھی ہر شمارہ بھر پور اور لائقِ مطالعہ رہتا ہے۔ بہترین موضوعات اور تخلیقات نے مزین قاری کے مزاج و مذاق کا لحاظ و خیال لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کا کوئی بھی شمارہ احتیاط سے رکھنے کے لائق ہے اور قاری کے دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ اب جو رسالے نکل رہے ہیں، وہ چند لوگوں کے ہی پسند کئے ہوتے ہیں۔ لکھنے والے بہت ہیں مگر قاری کم۔ بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری رسالے جو نکل رہے ہیں وہ قاری کی پسند کے خلاف ہوتے ہیں۔ ایسے ایسے موضوعات دیکھنے کو مل رہے ہیں جس سے قاری کی روح کانپ جا رہی ہے۔ تانیثیت، نسائیت، رجائیت، مابعد جدیدیت یا تحقیقی و تدقیقی مضامین دیکھ کر ہم سے بیشتر قاری پوچھتے ہیں یہ کیا ہے؟ اسے ہم پڑھ کر کیا سمجھیں گے؟ ہم لوگ تو کچھ نہیں پا رہے ہیں۔ پہلے جو رسالے چھپتے تھے تو اس وقت کے قاری باشعور ہوش مند ہوتے تھے تب اکثر و بیشتر رسالوں میں آپ بیتی، سفرنامے، ادبی معرکہ آرائی اور بھی دلچسپ موضوعات ہوتے تھے۔ رسالے کافی پسند کیے جاتے تھے۔ اس وقت کے مدیرانِ گرامی قاری کا لحاظ رکھتے تھے۔ اردو کے کئی رسالے قاری کی بے توجہی کے شکار ہونے کے سبب بند ہو گئے۔ اب تو بہت سے مدیر حضرات اپنی من مانی سے قاری پر پسند ناپسند موضوعات تھوپتے ہیں۔ قاری ادب سے گئے ہیں۔ اپنی پسند کے چلتے اردو سے قاری کو مدیر حضرات بد دل نہ کریں۔ ہمیں نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اردو کے پرانے قاری آج کے بیشتر رسائل دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔ شاعری میں بھی دم نہیں ہوتا۔ بہت سے اشعار پہلے کے جرائد میں شائع ہوتے تھے تو لوگ زبانی یاد کر لیتے تھے۔ اب تو زبان پر کوئی شعر چڑھتا ہی نہیں۔ ادھر میں حوادثِ زمانہ کا بہت شکار رہا۔ دونوں گھر گاؤں اور شہر والے اس میں تالے لگے ہوئے ہیں۔ اہلیہ بیمار بغرض علاج معالجہ ممبئی مقیم ہیں۔ دونوں صاحب زادگان غیر ممالک میں رہتے ہیں۔ وہ انڈیا آ کر اپنا اپنا وقت لگا کر چلے گئے۔ میں بھی ممبئی گیا تھا۔ مدیر ''تحریر نو'' برادرم ظہیر انصاری نے بہت مدارات کی۔ ان کا میں بے حد شکر گذار ہوں۔ میرے اعزاز میں چند مخصوص اور سنجیدہ افراد کے ساتھ عشائیہ بھی دیا۔ محترم ایم کاویانی، جناب ایوب واقف صاحبان سے ملاقات رہی۔ بہت سے لوگوں سے جو اردو کے قاری ہیں ان سے ملنے اور سمجھنے کے مواقع ملے۔ وقت کی کمی اور گھریلو پریشانیوں کے تحت میں زیادہ روز نہ رہ سکا۔ مگر وہاں جو محبت ملی، جو خلوص ملا میرے دل پر ثبت ہے۔

● **ڈاکٹر عالمگیر شبنم، دربھنگہ**: ''تمثیلِ نو'' کا تازہ شمارہ مجھ تک پہنچا شکریہ۔ آپ ہمیشہ وقت پر جریدہ کی ترسیل کر کے مجھے اپنے احسانات کے بوجھ تلے دابتے جا رہے ہیں۔ ہر شمارہ میں آپ کی تخلیقی ہنر مندی اور زیادہ ابھر کر آتی جا رہی ہے۔ گویا سمندر اپنے بطن سے قیمتی موتی بکھیرتا جا رہا ہے۔ ''تمثیلِ نو'' اپنی جسامت اور مواد دونوں کی وجہ سے ملک کے گنے چنے جریدوں میں شامل ہے جس کا اعتراف عام قارئین کو بھی ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ رسالہ اور بھی مزین ہو کر شائقین کی بھوک مٹاتا رہے۔ موجودہ شمارہ میں دیگر شماروں کی طرح اداریہ بہت جاندار ہے۔ اداریہ میں آپ نے اردو کی زبوں حالی پر نظر ڈالی ہے اور اردو کے فروغ کے لئے مشورے بھی دیئے ہیں یہ

مشورے نہایت قیمتی ہیں۔ اداریہ میں اردو اور صحافتی خبریں کے عنوان سے اردو زبان و ادب سے وابستہ تخلیق کاروں کی تفصیلی خبریں شامل ہیں۔ مشمولات میں گوشہ پروفیسر منصور عمر اور گوشہ ڈاکٹر سید تقی عابدی شامل جریدہ ہیں۔ گوشہ پروفیسر منصور عمر میں ''سوانحی کوائف کے تحت ان کی حیات وخدمات دونوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ''منصور عمر کا جمال آشنا شعری افق'' کے تحت ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے مرحوم منصور عمر کی تخلیقات کا فنی جائزہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر عبدالمنان نے ''گرم سورج کا لہو'' کے عنوان سے مرحوم منصور عمر کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر رئیس انور نے ''منصور عمر یادوں کی بستی میں'' عنوان کے تحت ان کی شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے ''نقد ادب کا ایک توانا قلم کار'' کے تحت پروفیسر منصور عمر کی تخلیقات کا فنی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے ''ڈاکٹر منصور عمر کی تنقیدی نگاری کے عنوان سے مرحوم منصور عمر کے تنقیدی شعور پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ بھی تجزیے اور تبصرے منصور عمر کی شاعری، ان کی تنقیدی بصیرت اور جمالیاتی شعور کو سمجھنے میں بھرپور معاون ہیں۔ گوشہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے تحت کل گیارہ مضامین شامل ہیں۔ جس میں سید تقی عابدی کے شعری سفر، ان کا تنقیدی شعور اور ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں۔ جریدہ میں شامل دیگر مضامین میں پروفیسر سید عزیز الدین حسین ہمدانی کا ''مادری زبان کی اہمیت''، منیر سیفی کا ''میخانہ اردو کا پیر مغاں: نارنگ ساقی''، ''بنگال کے اردو ادب کی ارتقاء کا سنگ میل: ڈاکٹر جاوید نہال'' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے ڈاکٹر جاوید نہال کے افسانوں کا جائزہ لیا ہے نیز ان کی صحافتی خدمات پر بھی بھرپور نظر ڈالی ہے اور ان کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ملک مقبول احمد نے ''پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی: شناسا ادبی چہرہ'' کے تحت ملک کے مقبول ناقد اور تخلیق کار پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی سوانح وسیرت سے لے کر تخلیقی کاوشوں کا احاطہ کیا ہے اور ان کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ آج اردو ادب میں تخلیق کاروں کی صف میں پروفیسر ہرگانوی کا نام سرفہرست ہے۔ سید محمود احمد کریمی نے ''علامہ اقبال کی تخلیقی قوت'' کے عنوان سے علامہ اقبال کے تخلیقی گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر تو قیر عالم نے ''پرویز شاہدی پر ایک نظر'' کے عنوان سے مرحوم پرویز شاہدی کی تخلیقات غزل اور نظم دونوں (رقص حیات اور تثلیث حیات) پر گہری نظر ڈالی ہے اور ان کی فنی خوبیوں کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ اظہر نیر نے ''حسن امام درد: یادیں اور باتیں'' کے عنوان سے حسن امام درد کی حیات اور ان سے وابستہ یادوں کا خوبصورت انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ارشد جمیل نے مجاہد آزادی مولانا لطف الرحمٰن ہر سنگھ پوری کے عنوان سے مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ مولانا لطف الرحمٰن میرے قریبی رشتہ دار تھے وہ متبحر عالم دین، سچے اور پکے مسلمان اور تحریک آزادی کے علمبردار تو تھے ہی ساتھ ہی ساتھ وہ نہایت خلیق انسان تھے۔ انہوں نے کئی کتابچے اور دو کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ڈاکٹر ارشد جمیل نے ان پر مضمون لکھ کر ایک گمنام مجاہد آزادی کو زندہ کرنے کا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر ندیم احمد نے ''جگر کی عشقیہ شاعری'' پر روشنی ڈالی ہے تو حمیرہ محمود آفریدی نے ''معاصر اردو شاعری کا نسائی لہجہ''، رفیق جعفر نے ''اسلم چشتی اور ان کی گیت کاری''، ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ نے ''اردو میں خاکہ نگاری''، ڈاکٹر رستم انصاری نے ''جنگ آزادی میں اردو زبان کا رول''، ڈاکٹر شبانہ خاتون شمن نے مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریری جہت''،

شاہد اقبال نے ''اکیسویں صدی میں مغربی بنگال میں اردو ناول''، ضیاء اللہ نے ''شاعری کی وجودیاتی تشکیل میں تخیل کا تفاعل'' اور احمد معراج نے سید منظر امام ایک ہمہ جہت شخصیت''، رخسانہ اطہر نے ''مولانا احسن گیلانی ایک نامور عالم دین اور محقق''، شاداں پروین نے ''اردو کے ایک اہم تخلیقی نثر نگار: شمیم منظر پوری''، یاسمین خاتون نے ''مثلیث حیات: ایک جائزہ''، اشوک کمار جیشا نے ''منظر کاظمی کے افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی'' اور احمد معراج نے ''ڈاکٹر شہناز نبی کی نظم گوئی: اگلے پڑاؤ سے پہلے''، ڈاکٹر احسان عالم نے ''ڈاکٹر ذاکر حسین: ایک عظیم معمارِ قوم وملت'' اور ڈاکٹر سرور کریم نے ''دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ'' پیش کیا ہے۔ یہ بھی مضامین کافی قیمتی اور معلوماتی ہیں۔ ڈاکٹر سرور کریم ایک نوجوان ادیب ہیں ان کا مضمون ''دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ'' جاری ہے۔ امید ہے کہ ان کا یہ مقالہ جلد ہی ضخیم کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے آئے گا۔ جریدہ میں شامل انٹرویو، افسانے، منظوم خراج عقیدت، غزلیں اور تبصرے اور خطوط وغیرہ اردو ادب کے ذخیرہ میں قیمتی اضافہ ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے کولکاتا کی منظوم تاریخ ''یہی کولکاتا ہے'' لکھ کر اس شمارہ کو تاریخی دستاویز کی حیثیت عطا کر دی ہے۔

● **حیدر وارثی، دربھنگہ :** رسالہ ''تمثیلِ نو'' روز افزوں ترقی کی منزل تیزی سے طے کر رہا ہے۔ مدیر رسالہ ڈاکٹر امام اعظم اس کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ پابندی سے اتنا وقیع رسالہ منظرِ عام پر لا رہے ہیں، جس کیلئے معتبر سے معتبر ترین ادبی شخصیات ان کو وقتاً فوقتاً مبارک بادی کے کلمات سے نوازتے رہتے ہیں۔ ''تمثیلِ نو'' کا زیرِ نظر شمارہ پروفیسر منصور عمر اور ڈاکٹر سید تقی عابدی پر اہم گوشہ کی حیثیت سے قاری کے سامنے آیا۔ اس شمارے میں ان دونوں شخصیات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور ان کی نگارشات پر بصیرت افروز مضامین تحریر کئے گئے۔ دیگر مشمولات، مضامین، منظومات، غزلیات سارے کے قابلِ مطالعہ ہیں۔ بطور خاص منظوم مختصر تاریخ ''یہی کولکاتا ہے!'' خوب ہے۔ انھوں نے ہر زاویہ سے کولکاتا کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ نثری نظم کے فارم میں لکھی گئی یہ تاریخ یاد رکھی جائے گی۔ انھوں نے نثر میں بھی مختصر تاریخ لکھی ہے۔ یہ بھی معلوماتی ہے۔

● **صابر فخر الدین، یادگیر، کرناٹک:** ''تمثیلِ نو'' جولائی ۲۰۱۴ء-جون ۲۰۱۵ء موصول ہوا۔ آپ کی شہر کولکاتا کی منظوم مختصر تاریخ دلہن کی پیشانی پر جھومر کی طرح لگی اور اس نظم کی گونج بہت دور تک جائے گی کیوں کہ اس نظم کا کلیدی مصرعہ ہاں وہی جو پہلے کلکتہ تھا/اب کولکاتا ہے، آپ کے اندرونی کرب کو ظاہر کرتا ہے جو ہم سب کا کرب ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے کہ تحت آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں وہ کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ ہوتا ہے۔ رسالے کی دیگر تمام چیزیں بہتر لگیں خصوصیت سے طلعت صلاح الدین کی آپ سے گفتگو، ڈاکٹر سرور کریم کا ''دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ''۔

● **ڈاکٹر ایم صلاح الدین، دربھنگہ:** ''تمثیلِ نو'' کا شمارہ جولائی ۲۰۱۳ء-جون ۲۰۱۴ء نظر نواز ہوا شکریہ، بھائی! آپ کے صحافتی ذوق وشوق کی طرفگی تو ہر قدم پر قاری کو مبہوت کرنے پر تلی ہے۔ اس شمارہ کو اکیسویں صدی کے تناظر میں مغربی بنگال کی ادبی پیش رفت کا ایسا آئینہ بنا دیا ہے جو مغربی بنگال کی ادبی تاریخ کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ آپ کا اداریہ 'جام جہاں نما' تو ہوتا ہی ہے۔ یہاں دلکش 'جام کلکتہ نما' بھی بن گیا ہے۔ مغربی بنگال میں ادبی پیش رفت کا خصوصی گوشہ پورے ادبی منظر نامے کو ہشت پہلو نگینہ کی سی تابندگی بخش رہا ہے اور اس پر خصوصی تعارف

کا گوشہ آپ کے تفنن طبع کی داد مانگ رہا ہے، سو یہ تحریر اسی کا موجب ہے۔ ویسے تو تمام پختہ و ناپختہ قلم کاروں کی نگارشات وتخلیقات وقیع، جاذب توجہ اور مرغوب نظر ہیں کہ یہ ایک شاعر و ناقد مدیر کی نظر انتخاب کے ثمرات ہیں لیکن اکمل یزدانی جامعی اور پروفیسر شاکر خلیق کی نگارشات کو کلکتہ کے حوالے میں جوڑ دینا آپ کی دوربینی پر دال ہے۔ ڈاکٹر محمد نسیم نے فراق شناسی کا نیا گوشہ منور کیا ہے، قابل تحسین ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے قلم پر تو قلم چلنے سے شرمندہ ہے البتہ پروفیسر عبدالمنان کا اسلوبِ تبصرہ نگاری پہلی بار دیکھا اور نثار ہوگیا۔ گویا آپ نے کولکاتا میں بھی اپنا نقشِ کالحجر ثبت کر ہی دیا۔ بہت خوب!

● **شارق عدیل، ایٹہ (یوپی)** : ایک زمانے کے بعد "تمثیلِ نو" کی صورت دیکھنے کو ملی ہے۔ ماشاءاللہ یہ پہلے سے کافی تندرست ہوگیا ہے۔ سب آپ کی ادارت کے کرشمے ہیں، ورنہ اس وقت اردو رسالوں کی سانسیں اکھڑی ہوئی ہیں اور یہی سبب ہے کہ مذکورہ شمارے میں کئی ایسی چیزیں راہ پا گئی ہیں جو اس نے قبل بھی دوسرے درجہ کے رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ دوستی نباہیے لیکن مذکورہ بیماری سے "تمثیلِ نو" کو ضرور بچانے کی کوشش کیجیے چوں کہ "تمثیلِ نو" اپنے عہد کی قابلِ اعتبار آواز ہے۔

● **ڈاکٹر عبدالحق امام، گورکھ پور**: "تمثیلِ نو" (جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء) موصول ہوا۔ اس شمارے کی خصوصیت تو یہ ہے کہ پہلے آپ نے شہر کولکاتا کو لیا اور وہاں کے شاعروں اور ادیبوں پر مضامین بھی شائع کیے ہیں۔ لیکن اس میں سب سے اہم کام جو آپ نے کولکاتا کی مختصر ادبی تاریخ ۔ کو منظوم کر کے اردو ادب میں ایک اضافہ کیا ہے جیسا کہ عنوان ہی ہے "یہی کولکاتا ہے!" منظوم مختصر تاریخ پہلے آپ نے کلکتہ کی تعریف اس کے بعد جغرافیائی منظر نامہ جیسے ہگلی، ہوڑہ برج، مٹیا برج، ٹیگور، واجد علی شاہ، سوناگاچھی کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی موسیقیت اردو، عربی، فارسی کے ادباء و شعراء کا ذکر کرتے ہوئے سیاسی، سماجی، سائنسی، ٹکنالوجی شخصیتوں کے نام سے روشناس کرایا ہے۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اسے کتابی شکل میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا کام آپ نے ایک بڑے فنکار سے لوگوں کو روشناس کرایا وہ ہیں ڈاکٹر سید تقی عابدی جو تقریباً ۵۰ رکتابوں کے مؤلف و مصنف ہیں اور ان پر آپ نے گوشہ نکال کر حق ادا کر دیا اور ان پر آپ نے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی جیسے جید اور مستند قلم کار سے مضمون لکھوایا دوسرے ڈاکٹر ایم صلاح الدین، ڈاکٹر رشید گل و ڈاکٹر مجیر احمد، آزاد، احسان ثاقب اور آپ نے ان پر مضمون لکھ کر بڑا کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ تیسرا کام پروفیسر منصور عمر مرحوم پر بھی گوشہ نکال کر ان کا حق ادا کر دیا۔ مرحوم ادھیڑ عمر میں ہی داغ مفارقت دے گئے ابھی باحیات ہوتے تو نہ جانے کتنی تصنیفات سامنے آتیں پھر بھی ۱۸ کتابوں کو شائع کر کے اردو ادب پر بہت احسان کیا۔ مرحوم منصور عمر صاحب ملک ہی نہیں بیرونِ ملک کے ادبی رسائل میں چھپتے رہتے تھے۔ اس طرح دو دو گوشے نکال کر اور بڑے بڑے فنکار اور تخلیق کار سے ان شخصیتوں پر مضمون لکھوانا یہ آپ ہی کے بل بوتے کی بات ہے۔

● **اختر کاظمی، بھیونڈی، ممبئی**: سہ ماہی "تمثیلِ نو" کا تازہ مشترکہ شمارہ موصول ہوا جو دیگر مشمولات کے ساتھ ساتھ پروفیسر منصور عمر اور سید تقی عابدی کے خصوصی گوشوں کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے"

کے عنوان سے آپ اداریہ ہر ایک شمارے میں سب سے زیادہ توجہ کا باعث ہوتا ہے۔ جس سے ایسی خبروں کی بھی خبر ملتی ہے جن سے ہم آج کی بھاگتی دوڑتی مصروف زندگی میں قطعاً بے خبر ہوتے ہیں۔ چینی نژاد اُردو کے معروف شاعر شید اچینی (جمشید پور) کے انتقال کی خبر بھی اسی رسالہ سے ملی۔ ساتھ ہی برادرم بزرگ ڈاکٹر منظر کاظمی (مرحوم) کے افسانوں کے تعلق سے اشوک کمار بیٹھا کا مضمون ''منظر کاظمی کے افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی'' اور نثار احمد صدیقی کے ذریعہ لیا گیا انٹرویو 'اردو فکشن پر فیاض رفعت سے مکالمہ'' بہت ہی خوب ہے جو اُردو افسانوں کے مختلف جہات کے در وا کرتا ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر کولکاتا کے تعلق سے ایڈوکیٹ شمس جلیلی کا منظوم بیانیہ اور آپ کا تحریر کردہ کولکاتا کی مختصر ادبی تاریخ ''یہی کولکاتا ہے'' ۔ کے مطالعہ کے بعد نہ صرف یہ کہ کولکاتا کی ادبی، ثقافتی تاریخ کے علم میں مزید اضافہ ہوا بلکہ کولکاتا کی جغرافیائی حد بندی، قدیم وجدید سرکاری وغیر سرکاری تاریخی اور تفریحی مقامات کا علم ہوا اور یہ بھی علم ہوا کہ وہاں کی ایسی قابل دید چیزیں کن علاقوں اور کن محلوں میں وقوع پذیر ہیں۔ تاہم کولکاتا کی نثری اور منظوم شعری تاریخ کے مطالعہ کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ آپ نے جہاں بڑی عرق ریزی سے کولکاتا کی ہر ایک علمی، ادبی، سماجی، صحافتی اور دیگر میدانوں میں برسر پیکار رہنے والے اصحاب کا تذکرہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ یاد آتا ہے کہ روزنامہ ''عکاس'' کسی زمانے میں ''عکاس'' ویکلی ہوا کرتا تھا اور ۷۶-۱۹۷۰ء کے درمیانی عرصہ میں یہ بڑے اخباری سائز کا فلمی اخبار ہوا کرتا تھا جس کے مخصوص ادبی صفحہ پر میری متعدد کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔ تاہم یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب یہ اخبار روزنامہ ہوگیا ہے اور جناب کریم رضا مونگیری کی ادارت میں پروان چڑھ رہا ہے۔ دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ ڈاکٹر سرور کریم کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور بے حد معلوماتی ہے۔ تیسری قسط کا انتظار رہے گا۔ شاداں پروین کا مضمون شمیم مظفر پوری کے افسانوں اور ان کی ناول نگاری کا مکمل محاسبہ کئے ہوئے ہے۔ مرحوم کے افسانے اکثر فلمی ماہنامہ شمع دہلی کی زینت ہوا کرتے تھے۔ مجموعی طور پر اس بار تمثیل نو، اردو زبان وادب کا انسائیکلو پیڈیا کی صورت میں پیش ہوا ہے، جس میں تمام ادباء وشعراء کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ تمام تاثراتی، تجزیاتی اور تبصراتی مضامین حتیٰ کہ خطوط کا کالم بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔

● **شفیق الدین شایاں، کولکاتا:** ''تمثیل نو'' کا شمارہ نمبر-۲۸ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر شہر نشاط کولکاتا کی دلفریب تصاویر نمایاں ہیں اور دو عظیم شخصیات کی بھی خوبصورت تصویریں آویزاں ہیں اور ان تصویروں سے ان حضرات کی شخصیت چھن چھن کر آرہی ہیں۔ اس صحت مند پرچہ سے اس کے مدیر جناب امام اعظم کی شخصیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس پرچے میں سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں مواد بہت ہے اور ایسی ایسی تحریریں ہیں جس سے نئے تو نئے پرانے قلمکاروں کو بھی روشنی ملے گی اور معلومات میں اضافہ بھی ہوگا۔ ایوان تبصرہ بھی بہت خوب ہے۔ مبصروں میں کچھ ذہین اور نئے قلم کار بھی شامل ہیں جس سے بہت خوشی ہوئی اور روایت سے ہٹ کر یہ کام ہوا۔ نئے قلمکاروں میں جیسے اشرف احمد جعفری، فہیم انور، صابر رضا ہاشمی، ڈاکٹر شبانہ خاتون شمن، احمد معراج، شاہد اقبال، سید ایاز احمد روہوی، ڈاکٹر سعیدہ امان وغیرہ۔ نقشبند قمر نقوی بخاری کا مضمون (ضابطہ سخن) بہت روشن آمیز ہے۔ اس قسم کے مضمون سے لوگوں کو خصوصی طور پر شعراء حضرات کو فیضیاب ہونا چاہئے۔ آج بھی بہت سے ایسے استاد

بنے ہوئے ہیں جو اپنے سفید بال اور ڈگری کا ڈھونس جمائے ہوئے ہیں لیکن اندر سے فن شاعری کے معاملے میں ڈھول کی طرح ہیں۔ آواز تو بہت دور تک جاتی ہے لیکن اندر سے کھول ہیں۔ آج کل اک وبا چلی ہوئی ہے۔ جو لوگ Ph.D. کئے ہوئے ہیں وہ بھی ڈاکٹر اپنے نام کے ساتھ لگا رہے ہیں اور جو لوگ معالج کے معمولی ڈاکٹر ہیں یا کمپاؤنڈر ہیں وہ بھی اپنی شان بڑھانے کے لئے لگائے ہوئے ہیں۔ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے یہ کون سے ڈاکٹر ہیں۔ ادب کے لئے سند یافتہ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونا بہتر ہے۔ گوشۂ پروفیسر منصور عمر اور گوشۂ ڈاکٹر سید تقی عابدی پر تمام تخلیقات صحت مند ہیں۔ شعبۂ شعر وسخن میں بہت سی غزلیں اور نظمیں ہیں۔ انجم عظیم آبادی کی نظم اور انشائیہ دونوں کی روداد بھی بیان کر رہی ہے۔ شعبۂ شعر وسخن میں بہت سے غزلیں اور نظمیں ہیں۔ انجم عظیم آبادی کی نظم اور انشائیہ دونوں ہی بہتر ہیں۔ مسلم نواز کا مطلع بہت عمدہ ہے اور اشرف یعقوبی کا تیسرا شعر بہت پسند آیا۔ یوسف تقی کا تیسرا شعر کامیاب ہے۔ مصطفےٰ اکبر کی غزل پسند آئی۔ حلیم صابر کی نظم میں ایک پیغام ہے۔ ارشد مینا نگری کا گیت عمدہ ہے۔ غفران امجد کے تمام اشعار صحت مند ہیں۔ مشتاق دربھنگوی اور اصغر شمیم کا مطلع اچھا لگا۔ اس شمارے میں تمام افسانے اور مضامین دعوت قراءت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تاثراتی خطوط بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ آج کے دور میں اردو ورسائل نکالنا تپتے ہوئے صحرا میں برہنہ پا چلنے کے برابر ہے اور وہ بھی اتنا ضخیم پرچہ بلکہ ایک شمارہ ہی دوسرے پرچوں کے کئی شمارے کے مقابل ہیں۔ اس شمارے میں جہاں پرانے قلمکاروں کی شمولیت کثرت سے ہیں وہیں نئے چہرے بھی نظر آرہے ہیں۔ جو ایک خوش آئند بات ہے اردو کی ترقی یوں ہی نہیں ہوگی بلکہ اسی طرح کی کاوشوں اور تبلیغ کی ضرورت ہے۔ وفیات کا کالم بھی صحت مند ہے۔ امام اعظم کی طلسمی نثری نظم "یہی کولکاتا ہے!" میں تاریخ کی گونج سنائی دیتی ہے جو بہت سے لکھنے پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے اور خصوصی طور پر مرحومین پر قطعۂ تاریخ لکھنے والے کو نظم اور وفیات کا کالم مدد کر سکتی ہے۔ سعدیہ صدف کی فکر اچھی ہے۔

● **ڈاکٹر احسان عالم، دربھنگہ:** "تمثیل نو" کا شمارہ ۲۸ جولائی ۲۰۱۴ء تا جون ۲۰۱۵ء موصول ہوا۔ دیگر شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ رسالہ کا اداریہ "مجھے کچھ کہنا ہے" ۳۵ صفحات پر محیط ہے اور اپنے اندر بہت ساری خبریں اور جانکاریاں سمیٹے ہوئے ہے۔ پیش نظر شمارہ میں تین گوشے "گوشۂ شہر کولکاتا"، "گوشۂ ڈاکٹر سید تقی عابدی" اور گوشۂ پروفیسر منصور عمر (مرحوم)" ہے۔ تینوں گوشے اپنے اپنے عنوان سے متعلق وافر جانکاری مہیا کراتے ہیں۔ اس شمارے کے مضامین بھی کافی علم افزا ہیں۔ "مادری زبان کی اہمیت" پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی، "علامہ اقبال کی تخلیقی قوت" سید محمود احمد کریمی، "مجاہد آزادی مولانا لطف الرحمٰن ہرسنگھ پوری"، "دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ" سرور کریم خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی تمام مضامین، انٹرویو، افسانے، نظمیں، غزلیں، خطوط، تبصرے بڑے ہی دلچسپ ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم سرزمین دربھنگہ سے صاف ستھرا اور جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان پابندی کے ساتھ نکال رہے ہیں اس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہندوستان میں جہاں اردو کے قارئین کا دائرہ سمٹتا جا رہا ہے وہاں ڈاکٹر امام اعظم اپنے رسالہ "تمثیل نو" کی اشاعت کر کے بڑے حوصلہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔ میں تقریباً آٹھ سال سے اس رسالہ کو پابندی کے ساتھ

پڑھ رہا ہوں۔ رسالہ لگاتار اپنی ترقی کی منزلوں کی جانب گامزن ہے۔ آپ کی مصروفیتوں کا مجھے علم ہے اس کے باوجود اس طرح ضخیم اور معلوماتی رسالہ نکالنا جس کی حیثیت دستاویزی ہے، بڑے ہی دل گردے کا کام ہے۔

● **ڈاکٹر عرش منیر، کولکاتا:** ''تمثیلِ نو'' کا شمارہ جولائی ۲۰۱۴ء - جون ۲۰۱۵ء کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس بار آپ نے کولکاتا کی مختصر ادبی تاریخ اور منظوم مختصر تاریخ ''یہی کولکاتا ہے!'' کو پیش کر کے ''تمثیلِ نو'' کے حسن میں چار چاند لگا دیا ہے۔ اپنے مختصر سے قیام کے دوران کولکاتا اور اس کی تہذیبی، تاریخی، علمی و ادبی سرگرمیوں کا شاید ہی کسی نے اتنی باریک بینی اور دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا ہوگا۔ اپنے اداریہ میں آپ نے ایک اہم سوال قائم کیا ہے کہ حکومت وقت کے سیاسی فکر وعمل اپنی جگہ لیکن پھر بھی حکومت اردو کے بعض اداروں کو خطیر رقم دے رہی ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ یہ خطیر رقم صد فیصد مناسب جگہ خرچ کی جا رہی ہے کہ نہیں؟ عموماً گھر کو آگ گھر کے چراغ سے ہی لگتی ہے۔ آج مخلص اور ایماندار اردو داں کی ضرورت ہے جو اپنی زبان کی ترقی و ترویج پوری ایمانداری کے ساتھ کر سکے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی اور پروفیسر منصور عمر (مرحوم) پر گوشے سیر حاصل مضامین پر مشتمل ہیں۔ دیگر مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں، مکتوبات، تجزیہ، تبصرے اس شمارہ کے مشمولات کی ہمہ گیری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ غرض اس ضخیم اور افادیت سے بھرپور رسالہ کا ایک ایک صفحہ حرف معتبر اور نئے ذائقے سے آشنا کرانے والا اور قابل ستائش ہے۔

● **محمد شہاب الدین ویشالوی (ادب نواز)، کولکاتا:** ''تمثیلِ نو'' کا تازہ شمارہ ''شہر کولکاتا کی منظوم مختصر تاریخ'' نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ جس میں گوشۂ ڈاکٹر سید تقی عابدی اور پروفیسر منصور عمر بھی شامل ہیں، کثیر الجہات افکار و نظریات کا آئینہ دار ہے۔ حسبِ سابق یہ شمارہ بھی آپ کی ادبی، صحافتی، تنقیدی اور تخلیقی بصیرت کا غماز ہے بلکہ موسیقیت اور غنائیت کا خوشگوار پہلو بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس منظوم تاریخ میں آپ نے کلکتہ کے تاریخی تعارف کے ساتھ مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات، ان کی سرگرمیوں، فن اور انفرادیت پر انتہائی خوبصورت اور رواں انداز میں ذکر کر کے اس منظوم تاریخ میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

● **محمد آفتاب عالم (ریسرچ اسکالر) کولکاتا:** ''تمثیلِ نو'' (جولائی ۲۰۱۴ء - جون ۲۰۱۵ء) ہر اعتبار سے وقیع ہے۔ رسالے کے تمام محتویات اہم ہیں۔ جستہ جستہ میں نے پڑھا۔ رسالے کو آپ جس طرح پیش کرتے ہیں کہ یہ کبھی پرانا نہیں لگتا۔ جب پڑھتا ہوں تازہ لگتا ہے۔ اداریہ، تبصرے اور خطوط میں سب سے پہلے پڑھ گیا۔ بہت معلوماتی ہے۔ ''یہی کولکاتا ہے!'' کے عنوان سے آپ کی تاریخی نظم ڈرامائی کیفیت لئے ہوئے ہے۔ مبارک باد۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی اور پروفیسر منصور عمر پر گوشے اہم ہیں۔ منصور عمر کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ جہاں وہ شاعر، ناقد اور محقق تھے وہیں ماہرِ عروض اور بیحد مخلص انسان بھی تھے۔ میری ملاقات دربھنگے میں ان سے ہوئی تھی۔ بیبا کی اور بذلہ سنجی بھی ان کی صفات میں شامل تھیں۔ ان کا بے وقت جانا ادب کے لئے بڑا نقصان ہے۔ اللہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین۔

....

ڈاکٹر امام اعظم

کتاب ''سائنس پڑھو اور آگے بڑھو'' (مصنف: عبدالودود انصاری)

یہ عہد سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے۔ سائنس کی ترقی نے دنیا کو انسان کی مٹھی میں لا دیا ہے۔ اس لیے سائنس کی تعلیم اور استفادہ آج کی اولین ضرورت بن چکی ہے۔ جس قوم نے سائنسی علوم کی تعلیم حاصل کی، اس کو بروئے کار لا کر ملک و ملت کی خدمات انجام دیں، ان کا نام آج سنہرے حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔ اللہ کا کرم و احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اللہ نے ہمیں قرآن حکیم جیسی مکمل کتاب رشد و ہدایت کے لیے نازل کی ہے۔ اس میں غور کرنے اور اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کی حقیقت وصفات جاننے کی جانب راغب کیا گیا ہے۔ جبھی تو تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے سائنسی ایجادات میں نمایاں کارکردگی دکھائی۔ اس طرح سائنس ہمارا دلچسپ اور اہم موضوع ہے۔ اس کی تعلیم دینا اور اس کی طرف لوگوں کو راغب کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس اہم اور بنیادی مشن کو آگے بڑھانے والوں میں ایک نام جناب عبدالودود انصاری کا ہے۔ موصوف نالی کل، ہگلی میں واقع اردو میڈیم گورنمنٹ ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل ہیں یعنی اساتذہ کی تربیت کرتے ہیں اس لیے بچوں کی نفسیات، حرکات و اعمال سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ سائنس میں ان کی گہری عملی دلچسپی ہے۔ یہ بچوں کے لیے سائنسی مضامین لکھتے رہے ہیں جو بچوں کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ صرف بچوں کے لئے مضامین یا کتابیں ترتیب نہیں دیتے ہیں بلکہ مسلمانوں کو اس جانب فعال بنانے کی خاطر اپنی تحریر قارئین کے سپرد بھی کردیتے ہیں۔ اب تک ان کے سیکڑوں سائنسی مضامین ملک کے رسالوں اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان سے اردو زبان میں شائع ہونے والے واحد سائنسی ماہنامہ ''سائنس'' نئی دہلی کی مجلس ادارت میں شامل ہیں۔ ان کی اب تک بیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے ''مسلمانوں کی سائنسی پسماندگی: منظر پس منظر''، ''قوموں کے عروج و زوال میں سائنس اور ٹکنالوجی کا کردار'' کتابوں کا مطالعہ ہمیں ایک ہمدرد قوم اور ایماندار معلم کی حیثیت سے عبدالودود انصاری کا تعارف کراتا ہے۔ ''سائنس پڑھو اور آگے بڑھو'' ان کے مضامین کی کتابی صورت گری ہے۔ ''سائنس کیا ہے اور ہم کیوں پڑھیں؟''، ''ٹکنالوجی کیا ہے اور کیوں ضروری ہے''، ''چندا ماما''، ''سورج بادشاہ''، ''بادل کالے کالے''، ''کہرا اور کہاسا''، ''بارش برسے رم جھم، رم جھم''، ''زمین اپنا گھر''، ''ہم زمین پر''، ''ابونصر فارابی - ایک عظیم فلسفی''، ''خوارزمی - الجبرے کا موجد''، ''ابوالقاسم زہراوی - ایک ماہر سرجن''، ''خوش رہو - محمد رشید ضیا ایوبی''، ''شاباش - انجینئر محمد سلیم''، ''برف کی کہانی - خط کی زبانی''، ''کوہ نور کی کہانی''، ''ریڈیم بابو''، ''چمبک مہاراج''، ''آپ دوا کیسے کھائیں گے!!''، ''گلاب - پھولوں کا راجہ''، ''کنول - ایک قومی پھول''، ''سورج مکھی - قدرت کا تحفہ''، ''اونٹ - ریگستان کا جہاز''، ''پنگوئن - انوکھا جانور''، ''مور ناچے - چھم چھم''، ''کھجور - ایک اصول ثانی'' اور ''قاتل پودے'' مضامین سے اس کتاب کے محتویات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان مضامین میں موضوعاتی تنوع ہے جو عنوانات سے ظاہر ہے۔ ان میں شخصیات سے واقف کرانے کا جذبہ بھی ہے اور نباتات و چرند و پرند کے بارے میں معلومات کا خزانہ بھی پوشیدہ ہے۔ یہ مضامین سائنس کے تعلق سے بچوں کی دلچسپی کو سامنے رکھ کر پیش کیے گئے ہیں۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی ہمیں یہ لگتی ہے کہ انھوں نے بچوں کی نفسیات تک رسائی حاصل کر لی ہے، اس لیے ان تک معلومات پہنچانے کا جو طریقہ اور زبان انھوں نے اختیار کیا ہے، وہ نہایت موزوں اور سود مند ہے۔ اس کتاب میں مشمولہ سائنس مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ سب میں گیان و گیان کی باتیں اور ہمدردانہ افکار موجود ہیں۔ بچوں کو سائنس کی جانب راغب کرنے اور ان کے اندر جدید ٹکنالوجی سے دلچسپی پیدا کرنے میں یہ مضامین معاون ہو سکتے ہیں۔ موصوف نے اس کتاب کا انتساب مغربی بنگال کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر قدرت خدا کے نام کیا ہے، جن کی سائنسی خدمات کو بھلا دیا گیا۔ یہ مصنف کی اہلِ علم و فضل سے عقیدت اور تعین قدر کے جذبے کو واضح کرتا ہے۔ ☆☆☆

۲۸ر مارچ ۲۰۱۵ء کو ڈاکٹر خالد سیف اللہ کی رہائش گاہ واقع دھنباد (جھارکھنڈ) میں ایک نشست کے موقع پر
ڈاکٹر امام اعظم، پروفیسر سید منظر امام، شان بھارتی، احمد فرمان جناب نجم عثمانی اور ڈاکٹر خالد سیف اللہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

'مسکان فاؤنڈیشن' رشرا، ہگلی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک شاندار تعلیمی جلسے مورخہ ۲۱ر اگست ۲۰۱۵ء میں (دائیں سے)
ڈاکٹر امام اعظم، جناب خواجہ احمد حسین، جناب شمس الزماں انصاری، جناب بلال حسن، محترمہ نازیہ الٰہی خان و دیگر حضرات

''چھپا یا گھیرا''، کولکاتا میں جشنِ استقبال سالِ نو (یکم جنوری ۲۰۱۶ء) کے موقع پر (دائیں سے) جناب احمد کمال حشمی،
ب فراغ روہوی، جناب شبیر احمد، ڈاکٹر امام اعظم، جناب مشتاق احمد نوری (سکریٹری، بہار اردو اکاڈمی) اور جناب جمیل منظر

ں سینٹر کولکاتا میں ۴ر فروری ۲۰۱۶ء کو مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی (نائب ناظم، امارتِ شرعیہ، پٹنہ) کی کتاب ''حرفِ آگہی'' کا اجراء کرتے
ڈاکٹر امام اعظم۔ دیگر افراد میں کمال احمد صدیقی، اشرف احمد جعفری، مولانا رئیس احمد رحمانی (کولکاتا)، ایم نصر اللہ نصر (ہوڑہ)،
محمد شہاب الدین ویشالوی (ادب نواز)، مولانا نور الحق رحمانی (پھلواری شریف) اور مولانا ضمیر الدین قاسمی (کولکاتا)

BIHURD00640/04/1/2005-T.C. ISSN-2249-636X **Rs. 150/-**

Monthly **TAMSEEL-E-NAU** **JULY : 2015-JUNE : 2016**

Vol-15, Issue : 29

Mobile : 08902496545
09431085816

E-Mail : imamazam96@yahoo.com

Hony **Editor : Dr. Imam Azam**, Gangwara, Darbhanga-846007 (Bihar)

مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے "جشنِ اقبال" کے دوران ہوٹل گرانڈ اوبرائے، کولکاتا میں ۳۰ رمئی ۲۰۱۵ء کو (دائیں سے) ڈاکٹر امام اعظم
ڈاکٹر خالد ندیم (سرگودھا، پاکستان)، ولید اقبال (نبیرۂ علامہ اقبال)، پروفیسر شارب ردولوی، ڈاکٹر شکیل اختر اور ڈاکٹر اقبال مسعود

این ایل فورس، گارڈن ریچ کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سیمینار بعنوان "اردو ناولوں میں عورتوں کے مسائل" منعقدہ مورخہ ۳۰ رجنوری
۲۰۱۶ء بمقام اکاڈمی آف فائن آرٹس، کولکاتا میں کتاب "منٹو: فن اور شخصیت" کا اجراء کرتے ہوئے (دائیں سے) ڈاکٹر مجیر احمد آزاد،
ڈاکٹر امام اعظم، پروفیسر شمیم انور، ڈاکٹر نوشاد عالم، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، جناب احمد جاوید اور ڈاکٹر افتخار احمد